بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد ہشتم

سورۃ آل عمران آیات ۶۰ تا ۱۹۵

از رشحات قلم

شیخ الحدیث والتفسیر حضرت علامہ

مولانا عبدالرزاق بھترالوی حطاروی

ناشر: جامعہ مہر العلوم راولپنڈی

کتاب لاریب کی توضیحات وتشریحات، علوم عقلیہ ونقلیہ کی روشنی میں
علمی وتحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لئے قدیم وجدید مسائل پرابحاث کا حسین مرقع
تفسیر القرآن بالقرآن، ارشادات نبویہ، اقوال صحابہ وتحقیقات اسلاف اورروایات صحیحہ پر مشتمل تفسیر

مسمی بہ

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد ہشتم

سورۃ آل عمران آیات 70تا165

از رشحات قلم

محقق اہلسنت
شیخ الحدیث والتفسیر حضرت علامہ
مولانا عبدالرزاق بھترالوی، حطاروی
مہتمم وشیخ الحدیث جامعہ جماعتیہ مہر العلوم راولپنڈی

ناشر: جامعہ جماعتیہ مہرالعلوم راولپنڈی

- نام کتاب:........................ نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن
  سورۃ آل عمران آیات 70 تا 165
- تالیف:........................ شیخ الحدیث علامہ **عبد الرزاق** بھتر الوی حطاروی
- کمپیوٹر گرافکس:........................ **محمد اسحاق** ہزاروی
- کمپوزر:........................ افضال احمد، تنویر احمد ہزاروی
- کمپوزنگ سنٹر:........................ مہر العلوم کمپوزنگ سنٹر راولپنڈی
- بار طباعت:........................ اول مارچ 2008ء
- صفحات:........................ 832   23 × 36/8

ملنے کے پتے

- **جامعہ جماعتیہ مہر العلوم** شکریال راولپنڈی
- جامع مسجد غوثیہ F.6/1 اسلام آباد
- اسلامک بک کارپوریشن کمیٹی چوک راولپنڈی
- مکتبہ امام ابو حنیفہ مسلم ٹاؤن راولپنڈی
- اسلامک یونیورسٹی بک سینٹر H.10 اسلام آباد

اور ہر اچھے بکسٹال سے خرید فرمائیں

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ

يَاَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَO (آیۃ نمبر ۷۰)

(1) اے کتابیو! اللہ کی آیتوں سے کیوں کفر کرتے ہو، حالانکہ خود گواہ ہو۔ (کنزایمان)

(2) اے اہل کتاب! کیوں کفر کرتے ہو تم اللہ کی آیتوں سے، حالانکہ تم خود گواہی دیتے ہو۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالیٰ نے پہلے اہل کتاب کے اس گروہ کا ذکر فرمایا جن کو سمجھ اور شعور ہی حاصل نہ تھا کہ تو راۃ میں نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والی آیات پائی گئی ہیں۔ اب اس آیۃ کریمہ میں ان کے علماء کا ذکر کیا جا رہا ہے جو کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والی آیات اور آپ کے اوصاف کو بیان کرنے والی آیات کو جانتے تھے، لیکن جاننے کے باوجود کفر کرتے تھے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"لِمَ" (لام کے نیچے کسرہ اور میم پر فتحہ) اصل میں "لـمـا" ہے۔ یہ مرکب ہے لام جارہ اور ما استفہامیہ سے "مَـا" کے آخر الف کو تخفیف کیلئے حذف کر دیا گیا، اور حرف جار کو گویا کہ اس کا عوض (بدل) سمجھ لیا گیا ہے، الف چونکہ برطرف تھا اسی وجہ سے عربی قوانین کے مطابق تخفیف کیلئے اسے ہی حذف کرنا تھا، اور میم کا فتحہ برقرار رکھ دیا تا کہ الف کے حذف ہونے دلالت کرے، یہی قانون ﴿عَمَّ يَتَسَاءَلُوْنَ﴾ کے لفظ "عَمَّ" اور ﴿فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ﴾ کے لفظ "بِمَا" میں جاری ہے، اور وقف کی حالت میں ان کے آخر میں "ھاء" بڑھا دی جاتی ہے "فبمہ" "لمہ" پڑھ لیا جاتا ہے۔
(ماخوذ از کبیر)

یہاں اللہ کی آیات سے مراد کیا ہے؟

اس آیۃ کریمہ میں جو ذکر کیا گیا ہے کہ "اے اہل کتاب کیوں کفر کرتے ہو تم اللہ کی آیتوں سے" ان آیات سے مراد میں کئی احتمال ہیں، جو تمام ہی پائے جاتے ہیں، ان میں کوئی تعارض نہیں۔

(ا) "قال ابن عباس هي التوراة والانجيل وكفرهم بها من جهة تغيير الاحكام وتحريف الكلام"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی آیات سے مراد توراۃ وانجیل ہیں۔ مراد یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی کتب توراۃ وانجیل کی آیات میں مذکور احکام کو بدل کر اور اللہ تعالیٰ کے کلام میں تحریف کر کے کیوں کفر کرتے ہو۔

(۲) **اولایات التی فی التوراۃ والانجیل من وصف النبی ﷺ والایمان به کما بین فی قوله تعالی یجدونه مکتوبا عندهم فی التوراۃ والانجیل"**

یا آیات سے مراد وہ آیات ہیں جو توراۃ انجیل میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف پر دلالت کررہی ہیں، ان پر انہوں نے ایمان نہ لایا، بلکہ ان سے کفر کیا، اسی کا تذکرہ یہاں کیا گیا کہ تم اللہ تعالیٰ کی آیات سے کیوں کفر کرتے ہو۔

• یہی مضمون اللہ تعالیٰ کے دوسرے ارشاد گرامی میں بھی موجود ہے ﴿یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ﴾ وہ پاتے ہیں اسے لکھا ہوا اپنے پاس توراۃ وانجیل میں، یعنی نبی کریم ﷺ کے اوصاف ان کی کتب توراۃ وانجیل میں موجود تھے، لیکن انہوں نے ان آیات پر ایمان نہ لایا بلکہ کفر کیا۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

❁ **واخرج عبد بن حمید وابن جریر وابن المنذر عن قتادة فی قوله "یَا اَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰیَاتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ "قال تشهدون ان نعت نبی الله محمد ﷺ فی کتابکم ثم تکفرون به وتنکرونه ولا تؤمنون به وانتم تجدونه مکتوبا عندکم فی التوراۃ والانجیل النبی الامی"**

عبد بن حمید اور ابن جریر اور ابن المنذر نے قتادہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿یَا اَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰیَاتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اے اہل کتاب تم گواہی بھی دیتے ہو کہ اللہ کے نبی محمد ﷺ کے اوصاف ہماری کتابوں میں موجود ہیں، پھر تم ان سے کفر کرتے ہو، اور ان کا انکار کرتے ہو، اور ان کے ساتھ ایمان نہیں لاتے ہو، جبکہ تم توراۃ وانجیل میں ان کے اوصاف کو لکھا ہوا پاتے ہو کہ وہ نبی امی ہوں گے "تو پھر تم اللہ کی آیات سے کفر کیوں کرتے حالانکہ تم گواہی دیتے ہو" (درمنثور)

(۳) اللہ تعالیٰ کی آیات سے مراد میں تیسرا قول یہ ہے جو قتادہ، سدی، ربیع، ابن جریج رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے۔

او القرآن من جهة قولهم " اِنَّمَا یُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ" "اِنْ هٰذَا اِلَّا اِفْكُ افْتَرٰى" "اِنْ هٰذَا اِلَّا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ"

کہ اس آیۂ کریمہ میں "آیات الله" سے مراد قرآن پاک ہے یعنی اے اہل کتاب تم قرآن پاک کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو۔

یہود ونصاریٰ کے قرآن پاک سے کفر کو رب تعالیٰ نے کئی آیات کریمہ میں ذکر کیا ہے۔ ﴿اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ﴾ یہود و نصاریٰ قرآن پاک کا انکار اس طرح کرتے تھے کہ وہ کہتے تھے، ''یہ قرآن اسے کوئی انسان سکھا تا ہے'' اور کبھی یوں کہہ کر انکار کرتے ﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ افْتَرٰىهُ﴾ یہ تو نہیں مگر ایک بہتان جو انہوں نے بنالیا ہے اور کبھی یوں کہہ کر انکار کرتے ﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ یہ تو نہیں مگر پہلے لوگوں کی داستانیں۔

(۴) اور اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرنے کا یہ مطلب ہے

''او الايات التى اظهرها على يديه من انشقاق القمر وحنين الجذع وتسبيح الحصى وغيره ذلک''

کہ وہ نبی کریم ﷺ کے معجزات کا انکار کرتے تھے، آپ کے چاند توڑنے کا وہ انکار کرتے تھے، اور مسجد نبوی میں ستون سے سہارا لگا کر خطبہ منبر پر پڑھنے پر ستون کے رونے کو وہ نہیں مانتے تھے اور کنکریوں کا آپ کے ہاتھ مبارک میں تسبیحات پڑھنے کا وہ انکار کرتے تھے، اور اس قسم کے معجزات کا وہ انکار کرتے تھے، اس کا تذکرہ بھی اس آیۃ کریمہ میں موجود ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی آیات یعنی جو معجزات اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو عطاء کر رکھے ہیں ان سے کفر کیوں کرتے ہو۔

(۵) ''او محمد ﷺ والاسلام'' اللہ کی آیات سے مراد نبی کریم ﷺ اور دین اسلام ہیں۔ یعنی حضرت محمد ﷺ اور دین اسلام جو کہ اللہ تعالیٰ کی آیات (نشانیاں) ہیں، ان کا انکار کر کے تم کفر کیوں کرتے ہو؟ (البحر المحیط)

❁ واخرج ابن جرير وابن ابى حاتم عن ابن جريج '' لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ''على ان الدين عند الله الاسلام ليس لله دين غيره''

اس مقام میں اللہ تعالیٰ کی آیات سے مراد دین اسلام ہے، یعنی جب تم خود گواہی دیتے ہو کہ دین اللہ تعالیٰ کو پسند اسلام ہی ہے، اس دین کے بغیر کوئی پسندیدہ دین نہیں۔ یعنی دین اسلام کے آجانے کے بعد پہلے دین منسوخ ہو چکے ہیں، رب کا اب پسندیدہ دین صرف اسلام ہے اس کا اعتراف کرنے کے باوجود تم کفر کیوں کرتے ہو۔ (البحر المحیط)

(۶) ومنها ما فى هذين الكتابين ان ابرهيم عليه السلام كان حنيفا مسلما''

اور مراد اللہ تعالیٰ کی آیات سے ہے کہ توراۃ وانجیل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اوصاف ذکر ہیں کہ بیشک ابراہیم تمام باطل دینوں سے جدا (اور) مسلمان تھے (اسلام پر قائم تھے) لیکن یہود نے اس کا انکار کر کے آپ کو یہودی کہا، اور نصرانیوں نے اس کا انکار کر کے نصرانی کہا، اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرتے ہیں۔ قرآن

پاک کی فصاحب وبلاغت واضح ہوئی کہ مختصر الفاظ مبارکہ کتنے بڑے مطالب کو حاوی ہیں، اسلئے کہ تمام مطالب کو بیک وقت ﴿لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ﴾ کے الفاظ مبارکہ شامل ہیں۔

﴿وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ﴾ ''حالانکہ تم خود گواہی دیتے ہو۔''

ان الفاظ مبارکہ کے بھی کئی مطالب، ایک وہی جو اعلی حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ سے واضح ہے'' حالانکہ تم خود گواہ ہو'' **راقم** نے بھی یہی نقل کیا ہے، وہ مسلمانوں کے سامنے گواہی دیتے تھے کہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف ہماری کتابوں میں موجود ہیں آپ آخری اور سچے نبی ہیں، قرآن پاک سچی کتاب ہے، لیکن عوام کے سامنے انکار کردیتے تھے کہ توراۃ وانجیل میں محمد ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والی کوئی آیات موجود نہیں۔ ''ثم اذا خلا بعضهم مع بعض شهدوا بصحتها'' پھر جب آپس میں وہ ایک دوسرے سے ملتے تو نبی کریم ﷺ کی نبوت کے صحیح ہونے کی شہادت دیتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا ﴿تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ﴾ تم ٹیڑھا پن (کج روی) تلاش کرتے ہو حالانکہ تم خود گواہ ہو۔ (کبیر)

علم غیب نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے:

''واعلم ان لتفسير الآية بهذا القول يدل على اشتمال هذه الآية على الاخبار عن الغيب لانه ﷺ اخبرهم بما يكتمونه فی انفسهم ويظهرون غيره ولاشک ان الاخبار عن الغيب معجز''

جان بیشک آیۃ کریمہ کی اس تفسیر سے یہ واضح ہوگیا کہ یہ آیۃ کریمہ غیبی خبروں پر مشتمل ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ان کو خبر دی جو وہ اپنے نفسوں میں چھپاتے تھے، اور ظاہر اور کرتے تھے، یقینی بات ہے یہ غیب کی خبر ہے، علم غیب نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے۔ (کبیر)

(وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ) ای تعترفون فيمابينكم على سبيل الكتمان انه نبی حق مذكور نعته فی التوراة والانجيل''

حالانکہ تم اعتراف کرتے ہو آپس میں چھپے ہوئے طریقہ سے کہ یہ نبی تو برحق ہیں، یہ تو وہی نبی ہیں جن کے اوصاف توراۃ وانجیل میں مذکور ہیں۔

یعنی اس تفسیر کے مطابق ﴿وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ﴾ کا معنی ہوا، حالانکہ تم اعتراف کرتے ہو'' **وانتم تعلمون بالمعجزات انه نبی حق''** یا معنی یہ ہوا ﴿وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ﴾ حالانکہ تم جانتے ہو، یعنی تم نبی کریم ﷺ کے معجزات

کو دیکھ کر تم جانتے ہو کہ وہ نبی برحق ہیں۔ (ماخوذ از مظہری)

"وقیل المعنی وانتم تشہدون بمثلہامن آیات الانبیاء التی انتم مقرون بہا" (قرطبی)

اور معنی ﴿ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴾ کا یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے سامنے نبی کریم ﷺ کے اوصاف "جو تمھاری کتب میں ہیں" کا اقرار کرتے ہو جیسے کہ دوسرے انبیاء کرام کے اوصاف و معجزات کا اقرار کرتے ہو۔

تعجب یہی ہے تم پر کہ یہ جاننے، ماننے، اقرار کرنے اور گواہی دینے کے باوجود تم انکار کرتے ہو اور کفر کرتے ہو، درحقیقت ان کو اس پر توبیخ کی گئی (یعنی ڈانٹ دی گئی ہے۔)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (آیة نمبر ۷۱)

(1) اے کتابیو! حق میں باطل کیوں ملاتے ہو اور حق کیوں چھپاتے ہو حالانکہ تمہیں خبر ہے۔ (کنزالایمان)

(2) اے اہل کتاب! تم کیوں ملاتے ہو حق کو باطل کے ساتھ اور کیوں چھپاتے ہو حق کو حالانکہ تم جانتے ہو۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

علمائے یہود کے دو طریقے تھے۔ ایک قسم کے وہ لوگ تھے اور ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ سے کفر کرتے تھے باوجود اس کے کہ اپنے دلوں سے جانتے تھے کہ بیشک یہ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔ اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں ان کا ہی ذکر ہے اور ان کو کفر سے باز رہنے کا حکم دیا۔ اور **دوسری قسم** کے وہ لوگ تھے جو لوگوں کے دلوں میں شبہات ڈالتے تھے اور دلائل و بینات کو مخفی رکھتے تھے تاکہ لوگ ایمان نہ لائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں ان دوسری قسم کے لوگوں کو اس غلط طریقہ سے منع فرمایا۔

"فالمقام الاول مقام الغوایة والضلالة والمقام الثانی مقام الاغواء والاضلال"

پہلی قسم کے لوگوں کا مقام بھٹکنا اور گمراہ ہونا ہے اور دوسرے قسم کے لوگوں کا مقام بھٹکانا اور گمراہ کرنا ہوتا ہے۔ (کبیر)

﴿یٰۤاَھْلَ الْکِتَابِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾

''اے اہل کتاب تم کیوں ملاتے ہو حق کو باطل سے''

"ای تخلطون الحق الذی انزل علی موسی من آیات التوراۃ بالباطل الذی کتبته ایدیکم بالتحریف"

یعنی اے اہل کتاب کیوں ملاتے ہو اس حق کو جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا گیا یعنی توراۃ کی آیات کیوں ملاتے ہو باطل سے جو تمہارے ہاتھوں نے تحریف کر کے لکھا ہے۔ (مظہری)

خیال رہے راقم کا ترجمہ تفسیر مظہری کے مطابق ہے۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ و تفسیر خازن:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ یہ ہے ''اے کتابیو! حق میں باطل کیوں ملاتے ہو، تفسیر خازن نے اس مقام پر یوں بیان کیا۔

(۱) وذلک ان علماء الیھود والنصاری کانوا یعلمون بقلوبھم ان محمدا رسول من عند اللہ وان دینه حق وکانوا ینکرون ذلک بالسنتھم وکانوا یجتھدون فی القاء الشبھات والتشکیکات وذلک ان الساعی فی اخفاء الحق لایقدر علی ذلک الا بھذہ الامور، فقوله تعالی (لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ) معناہ تحریف الرورۃ وتبدیلھا فیخلطون المحرف الذی کتبوہ بایدیھم بالحق المنزل"

اس آیۃ کریمہ کا شان نزول یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کے علماء اپنے دلوں سے جانتے تھے کہ بیشک محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اور بیشک آپ کا (رب تعالیٰ کی طرف سے لایا ہوا) دین حق ہے، لیکن وہ زبان سے انکار کرتے تھے، اور کوشش کرتے رہتے تھے کہ دوسرے لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات ڈالیں، کیونکہ حق کو مخفی رکھنے کی کوشش کرنے والا اسی قسم کے ہتھکنڈے (حیلے) استعمال کر کے اپنے مقاصد میں بظاہر کامیابی سمجھتا ہے، (در حقیقت وہ ذلیل ہی ہوتا ہے) رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ باطل کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے توراۃ میں تحریف کر دی تھی، یعنی اس میں تبدیلی کر دی تھی'' تو وہ اپنے ہاتھوں سے لکھی تحریف شدہ کو ملا دیتے تھے حق سے جو رب تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا تھا''

خازن کے ان الفاظ:

"فیخلطون المحرف الذی کتبوہ بایدیھم بالحق المنزل"

کو بار بار دیکھیں اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو بھی دیکھیں تو یقیناً خازن کے مطابق پائیں گے۔

دونوں تراجم میں کوئی تعارض نہیں:

چاہئے تو یوں ترجمہ کرلیا جائے اے اہل کتاب تم کیوں ملاتے ہو حق کو باطل سے؟ یا یوں ترجمہ کرلیا جائے اے اہل کتاب تم باطل کو حق سے کیوں ملاتے ہو۔ ان دونوں تراجم میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ دونوں ترجمے صحیح ہیں، اسلئے کہ "تلبس" کا معنی ہے خلط ملط کردینا، دو چیزوں کو آپس میں ملا دینا، لھذا، "لِمَ تَلْبِسُوْنَ" کا لفظ دونوں معانی کو شامل ہے "یعنی حق اور باطل کو کیوں خلط ملط کرتے ہو"

(۲) "وقیل ھو خلط الاسلام بالیھودیۃ والنصرانیۃ"

اور اس کا یہ معنی بھی لیا گیا ہے کہ اسلام کو یہودیت ونصرانیت سے کیوں ملاتے ہو؟ جبکہ اسلام حق ہے اور یہودیت ونصرانیت تحریف کے بعد باطل ہو چکی ہیں، اور اسلام کے آنے کے بعد منسوخ ہو چکی ہیں، پھر تم اسلام اور یہودیت کو خلط ملط کیوں کرتے ہو۔ (خازن)

(۳) "ان المراد اظھارھم الاسلام وابطانھم النفاق" اس آیۃ کریمہ کا اور مطلب یہ ہے وہ اسلام کو ظاہر کرتے تھے اور دل میں منافقت کرتے تھے، تو ان کو کہا گیا، اسلام اور کفر کو تم کیوں خلط ملط کرتے ہو۔

(۴) "ان المراد الایمان بموسی وعیسی والکفر بمحمد علیھم الصلوۃ والسلام"

کہ وہ اہل کتاب یہ دعوی کرتے تھے کہ ہم موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام سے ایمان رکھتے ہیں لیکن محمد (ﷺ) پر ایمان نہیں لاتے، بلکہ اس سے ہم کفر کرتے ہیں۔ تو رب تعالیٰ کے ارشاد کا ایک مطلب یوں بھی ہے اے اہل کتاب تم اپنے دعوی کے مطابق موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کے ساتھ محمد ﷺ کے ساتھ کفر کرنے کو کیوں ملاتے ہو۔

(۵) "ان المراد مایعلمونہ فی قلوبھم من حقیۃ رسالتہ ﷺ وما یظھرونہ من تکذیبہ"

وہ نبی کریم ﷺ کی حقانیت کو دل سے مانتے تھے اور ظاہر طور پر آپ کی تکذیب کرتے تھے، تو ان کو کہا گیا اے اہل کتاب تم دل سے حق کو ماننے کے ساتھ ظاہری کفر کو کیوں ملاتے ہو۔ (ماخوذ از روح المعانی)

قرآن پاک کی فصاحت بلاغت کو دیکھا جائے کہ ایک چھوٹا سا جملہ ﴿لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ کتنے معانی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

﴿وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ﴾ ''اور کیوں تم چھپاتے ہو حق کو''

طلباء کرام بخوبی جانتے ہیں کہ معطوف سے پہلے والے الفاظ کا تعلق معطوف سے بھی ہوتا ہے ﴿وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ﴾ کا عطف ہے ﴿تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ﴾ پر''اس لئے ''لم'' کا لفظ معطوف علیہ اور معطوف دونوں سے متعلق ہے، اسی لئے معنی یہ ہے''اور کیوں تم چھپاتے ہو حق کو''

حق کو چھپانے کی کوشش کرنے والوں کے دو طریقے:

''اعلم ان الساعی فی اخفاء الحق لا سبیل له الی ذلک الامن احدو جهین اما بالقاء شبهة تدل علی الباطل واما باخفاء الدلیل الذی یدل علی الحق''

جان لو بیشک حق کو چھپانے کی کوشش کرنے والوں کے دو طریقہ واردات ہیں۔ایک یہ کہ وہ لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات ڈال کر باطل کی طرف انہیں مائل کرتے ہیں۔ان کا ذکر رب تعالی نے ان الفاظ مبارکہ سے کردیا ﴿لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ (تم کیوں ملاتے ہو حق کو باطل سے)

اور دوسرا طریقہ ان کا یہ تھا کہ وہ حق پر دلالت کرنے والے دلائل کو مخفی رکھتے تھے تا کہ ان دلائل کو دیکھ کر کوئی ایمان قبول نہ کرلے، ان کا ردان الفاظ مبارکہ سے کیا ﴿وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ﴾ ''اور کیوں چھپاتے ہو تم حق کو''

وہ حق کو کیسے چھپاتے تھے؟

''فالمراد ان الآیات الموجودة فی التوراة الدالة علی نبة محمدا کان الاستدلال بها مفتقرا الی التفکر'' ''والتامل والقوم کانوا یجتهدون فی اخفاء تلک الالفاظ التی کان بمجموعهایتم هذا الا استدلال، مثل ما ان اهل البدعة فی زماننا یسعون فی ان لایصل الی عوامهم دلائل المحققین''

مراد اس سے یہ ہے کہ توراۃ میں موجود آیات جو حضرت محمد ﷺ کی نبوت پر دلالت کرتی تھیں، جن میں غور وفکر کر کے آپ پر ایمان لانا آسان تھا، ان آیات کو قوم سے مخفی رکھتے تھے تا کہ یہ لوگ ایمان نہ لاسکیں، جیسا کہ اہل بدعت ہمارے زمانہ میں کوشش کرتے ہیں کہ محققین کے دلائل عوام تک نہ پہنچ سکیں۔ (کبیر)

علماء اہل سنت و جماعت آجکل اسی کسی مپرسی کا شکار ہیں، میڈیا تک ان کی رسائی نہیں، یہ وقت خرید نے کی طاقت نہیں رکھتے یا راقم کی طرح ہر سنی عالم دین یہی سمجھتا ہے کہ نفع اس کا کم ہے نقصانات زیادہ ہیں، گوشہ نشینی ہی بہتر ہے۔

﴿وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ "حالانکہ تم جانتے ہو۔"

اس کے چند مطالب ہیں:

(۱) **احدھا انکم تعلمون انما تفعلون ذلک عناداو حسدا**" ان میں سے ایک مطلب یہ ہے کہ بیشک تم جانتے ہو کہ نبی کریم ﷺ سچے نبی ہیں اور قرآن پاک سچی کتاب ہے، اور تمہاری کتب میں ان کا تذکرہ موجود ہے، پھر تم حق و باطل کو ملاتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو تو اس کی وجہ صرف حسد اور عناد ہے۔

(۲) **وثانیھا(وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ)ای انتم ارباب العلم والمعرفۃلاارباب الجھل والخرافۃ**"
دوسرا مطلب یہ ہے، حالانکہ تم جانتے ہو" یعنی تم علم والے اور معرفت تمہیں حاصل ہے، تم جاہل نہیں ہو، بے سمجھ نہیں ہو، پھر تم حق و باطل کو کیوں ملا رہے ہو، اور حق کو تم کیوں چھپا رہے ہو، یہ کام تو جاہل لوگوں اور بے سمجھ لوگوں کا ہے۔

(۳) **وثالثھا(وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ)ان عقاب من یفعل مثل ھذہ الافعال عظیم**" اور تیسرا مطلب ہے کہ "حالانکہ تم جانتے ہو" کہ اس قسم کے افعال پر سخت عذاب ہوگا، پھر جاننے کے باوجود تم حق و باطل کو کیوں ملا رہے ہو، اور حق کو کیوں چھپاتے ہو؟

(کبیر)

معتزلہ کا مذہب:

معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے، وہ ان دونوں آیات سے اپنے موقف پر یہ دلیل پیش کررتے ہیں کہ اللہ تعالی کا ارشاد گرامی "لِمَ تَكْفُرُوْنَ" اور "لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ" اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ وہ اپنے کفر اور اپنے فعل حق و باطل کے ملانے کے خود ہی خالق تھے اور کوئی ان کا خالق نہیں تھا۔

اہل سنت و جماعت کا مذہب:

یہ ہے کہ بندہ اپنے افعال کا کاسب ہے، خالق تمام افعال کا اللہ تعالی ہے رب تعالی کا ارشاد گرامی ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا ہے اور تمہارے اعمال کو) یہ بات واضح ہے کہ حادث چیز کا خالق ہونا ضروری ہے، ایسا ممکن نہیں کہ حادث چیز بغیر خالق و صانع کے معرض وجود میں آجائے، اور اگر بندے کو خالق ہونا

ضروری ہے، ایسا ممکن نہیں کہ حادث چیز بغیر خالق وصانع کے معرض وجود میں آجائے، اور اگر بندے کے خالق مانا جائے تو وہ اور ارادہ کا محتاج ہوگا، پھر ارادہ کیلئے اور ارادہ کی محتاجی ہوگی، یہ سلسلہ چلتا رہے گا ختم نہیں ہوگا، یہ محال ہے، طلباء کرام اصطلاحی الفاظ ذہن میں رکھیں "دور یا تسلسل" لازم آئے گا یہ دونوں محال ہیں۔ اسلئے یقیناً خالق اللہ تعالی کو ہی ماننا پڑے گا، البتہ بندہ اپنے افعال کا کاسب ہے، یعنی ان پر عمل کرتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر بتصرف)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْ اُنْزِلَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ○ (آیۃ نمبر ۷۲)

(1) اور کتابیوں کا ایک گروہ بولا وہ جو ایمان والوں پر اترا صبح کو اس پر ایمان لاؤ اور شام کو منکر ہو جاؤ شاید وہ پھر جائیں۔ (کنزالایمان)

(2) اور کہا اہل کتاب کے ایک گروہ نے ایمان لاؤ اس پر "جو اتارا گیا ان پر جنہوں نے ایمان لایا" صبح کو، اور کفر کرو اس کے آخر میں، شاید کہ وہ پھر جائیں۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

یہود ونصاری کے مختلف مکروفریب کے حیلے تھے کہ وہ مسلمانوں کو کس طرح دین سے پھیریں یا جنہوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا وہ اسلام سے دور کس طرح رہیں۔ ان کے ایک مکر کو اس سے پہلے مذکورہ آیۃ کریمہ میں ذکر آچکا ہے کہ وہ حق وباطل کو ملاتے تھے، اور ان کے ایک اور مکر کو اس آیۃ کریمہ میں ذکر کیا جارہا ہے۔

شان نزول:

میں چند وجوہ پائی گئی ہیں، جو تمام ہی معتبر ہیں۔

(۱) یہود ونصاری نے نئے نئے مسلمانوں کے دلوں میں شک ڈالنے اور ان کو اسلام سے پھیرنے کا حیلہ نکالا کہ بعض لوگ ہم سے صبح کے وقت ایمان لے آئیں اور شام کے وقت انکار کردیں، صبح اور شام سے مراد بھی معین اوقات

نہیں بلکہ ان کا کہنا یہ تھا کہ بعض اوقات میں ایمان لے آؤ کہ جو کتاب اور شریعت نازل ہوئی ہے (حضرت) محمد ﷺ پر ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں کچھ دیر کے بعد اسکا انکار کردو کہ یہ شریعت تو اس طرح نہیں جس طرح ہماری کتب میں اس کا ذکر ہے۔ جب لوگ اس تکذیب کا مشاہدہ کریں گے تو وہ کہیں گے کہ اہل کتاب کا انکار کرنا حسد اور عناد کی وجہ سے نہیں ورنہ یہ لوگ ابتدائی طور پر ایمان ہی نہ لاتے۔

جب یہ لوگ اہل کتاب ہیں، دین کو سمجھتے ہیں تو یقیناً انہوں نے مکمل غور فکر اور کامل تحقیق کے بعد ہی اس شخص کو چھوڑا ہے، تو پتہ چلتا ہے کہ "انــه كـذاب" وہ مدعی نبوت (معاذ اللہ) جھوٹا ہے، اسی طرح نئے نئے مسلمانوں کو ہم اسلام سے پھیرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

"وقیل تو اطأ اثناعشر رجلا من احبار یھود خیبر علی ھذا الطریق"

(۱) یہ مکروفریب کا جال بچھانے والے اور یہ منصوبہ تیار کرنے والے خیبر کے یہود میں سے بارہ شخص تھے جو بظاہر اہل علم تھے۔ اگر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ بدترین جاہل تھے، نبی کریم ﷺ کی شان سے اور آپ پر ایمان لانے والے صحابہ کرام کی شان سے بے خبر تھے۔

(۲) شان نزول کی اور وجہ یہ ہے کہ یہود و نصاری کے رئیس لوگ ایک دوسرے کو کہنے لگے کہ ہم سے کچھ لوگوں کو منافق ہو جانا چاہئے جو مسلمانوں سے بظاہر اچھا سلوک کریں اور ان سے محبت کا دعوی کریں، اور بظاہر ایمان لے آئیں، لیکن شرط یہ ہے وہ اپنے دین پر پختگی سے قائم رہیں، اور علیحدگی میں اپنے بھائیوں سے ملتے رہیں۔ کچھ دیر کے بعد نئے مسلمانوں کے دلوں میں شکوک پیدا کئے جائیں کہ یہ دین اور یہ نبی تو سچے نہیں، ہماری کتب میں تو اور اوصاف مذکور ہیں جو ان میں نہیں پائے جاتے، قرآن پاک میں منافقین کا تذکرہ بہت ہے۔

(۳) یہود و نصاری میں سے بعض لوگوں نے دوسرے بعض کو مشورہ دیا کہ کچھ لوگ ایمان لے آؤ۔ کچھ دیر کے بعد ایمان سے پھر جانا، لیکن یہ نہ کہنا کہ یہ دین مکمل طور پر جھوٹا ہے، اگر تم نے مکمل دین کو جھوٹا کہا تو تمہاری بات کو عام لوگ تسلیم نہیں کریں گے۔

"ولـكـن صـدقـوه فـي بـعـض و كذبوه في بعض حتى يحمل الناس تكذيبكم له على الانصاف لاعلى العناد فيقبلو اقولكم"

البتہ یہ طریقہ اختیار کرو کہ بعض مسائل کو سچا کہو، اور بعض کو جھوٹا، یعنی نئے نئے اسلام کو قبول کرنے والے ضعیف الاعتقاد لوگوں کو کہو کہ اس دین کی یہ یہ باتیں تو سچی معلوم ہوتی ہیں، لیکن یہ یہ باتیں جھوٹی بھی ہیں۔ اس طرح

لوگ تم پر اعتبار کرلیں گے کہ یہ لوگ تو بڑی انصاف کی بات کرتے ہیں، سچ کو سچ کہتے ہیں اور جھوٹ کو جھوٹ کہتے ہیں، لیکن جس دین میں جھوٹ کی آمیزش ہو، اس دین پر ہمیں بھی قائم نہیں رہنا چاہئے۔ (ماخوذ از کبیر)

یہ تمام وجوہ ہی شان نزول ہیں:

یہود ونصاری کے مختلف لوگوں کی مختلف سوچیں تھیں، اس بات پر تو متفق تھے کہ مسلمانوں کو ان کے دین سے پھیر دیا جائے، لیکن کیسے پھیرا جائے اس میں ان کے اپنے اپنے خیالات اور اپنے مکروفریب تھے، ان تمام کے مکر وفریب کا ذکر کرنے کیلئے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا گیا۔

"وجه النهار" اور "آخره" سے کیا مراد ہے؟

اس میں کئی وجوہ ہیں وہ تمام ہی معتبر ہیں۔

(۱) "وجه النهار" سے مراد صبح، اور "آخره" سے مراد شام ہے، اہل کتاب کے کچھ لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس صبح آئے تو دوسرے ضعیف الاعتقاد لوگوں کو کہا کہ یہ سچے نبی ہیں، یہ دین حق ہے تم اس پر قائم رہو، اور یہود ونصاری میں سے اپنے سے گھٹیا لوگوں کو بھی یہ مشورہ دیا کہ تم اس کی تابعداری کرو، ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ ہم ایک مرتبہ توراۃ میں دیکھ لیں کیا وہی اوصاف اس شخص میں پائے گئے یا نہیں، شام کو وہ واپس لوٹے کہنے لگے۔

"وقد نظرنا فی التوراة فلیس هوبه ،یقولون انه لیس بحق"
ہم نے توراۃ کو دیکھا ہے، لیکن یہ شخص وہ نبی نہیں جس کے اوصاف توراۃ میں ذکر ہیں، کیونکہ اس میں وہ اوصاف نہیں پائے گئے۔

"وانما ارادوا ان یلبسوا علی السفلة وان یشککوا فیه"
انہوں نے ارادہ یہ کیا تھا کہ ہمارے گھٹیا لوگوں اور جاہل لوگوں پر خلط ملط ہو جائے، وہ شک میں پڑ جائیں تاکہ وہ ایمان نہ لائیں، دوسرا مقصد ان کا ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کو راہ راست سے پھیرنا بھی تھا۔ (ماخوذ از قرطبی)

(۲) کعب بن اشرف اور اس کے ساتھی بعض بعض کو کہنے لگے کہ صبح صبح قبلہ کے معاملہ میں جو آیات نازل ہوئیں ان پر ایمان لے آؤ اور صبح کی نماز کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے ادا کرو، پھر شام کو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرو، تاکہ لوگ دیکھ کر پھر جائیں کہ یہ اہل کتاب ہیں، ان کو کوئی چیز باطل نظر آئی، اسی لئے یہ پھر گئے ہیں۔ ان لوگوں نے اسی پر عمل کیا، صبح کی نماز کعبہ شریف کی طرف متوجہ ہو کر ادا کی اور ظہر کی صخرہ یعقوبی (جو بیت

المقدس میں ہے) کی طرف متوجہ ہوکر نماز ادا کی، رب تعالی نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر ان کی چالبازی سے نبی کریم ﷺ کو مطلع فرمادیا۔ (خازن وکبیر)

"وجـــه الــــنهـــار" کا معنی ہے"دن کا اول حصہ"لغت میں ہر وہ چیز جس کی طرف توجہ کی جائے اسے "وجہ" کہہ لیا جاتا ہے، نئی کوالٹی میں آنے والے کپڑے کو"وجہ الثوب" کہا جاتا ہے، کیونکہ اسے دیکھنے کیلئے اسی کی طرف چہرے اٹھتے ہیں۔ یہ کہا جائے کہ "اتیته بوجه النهار" یا کہا جائے "اتیته بصدر النهار" یا یہ کہا جائے "اتیته بشباب نهار" سب کا ایک ہی معنی ہے "میں اس کے پاس صبح آیا"

فائدہ: اللہ تعالی نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر مؤمنین کو مطلع فرمادیا، اس میں چند فوائد حاصل ہو رہے ہیں۔

(۱) غیب نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے:

یہود ونصاری کا یہ حیلہ اور مکروفریب لوگ سے مخفی تھا، کوئی ایک بھی اس پر مطلع نہیں تھا، "فلما اخبر الرسول عنها کان ذلک اخبارا عن الغیب فیکون معجزا" جب رسول اللہ ﷺ نے یہ غیبی خبر دی تو آپ کا یہ معجزہ بن گیا۔

(۲) مسلمان محفوظ رہے:

اللہ تعالی نے مؤمنوں کو جب مطلع فرمادیا کہ یہود ونصاری اس قسم کے حیلے کررہے ہیں۔

"لم یحصل لهذه الحیلة اثر فی قلوب المؤمنین"

تو یہود ونصاری کے مکروفریب کا مؤمنوں کے دل میں کوئی اثر نہیں ہوا۔

اگر مؤمنوں کو مطلع نہ کیا جاتا تو ہوسکتا تھا کہ کچھ ضعیف الاعتقاد حضرات ان لوگوں کے مکروفریب کا شکار ہوجاتے اور ایمان سے پھر جاتے "العیاذ باللہ"

(۳) یہود ونصاری ذلیل وخوار ہوئے:

ان القوم لما افتضحوا فی هذه الحیلة صار ذلک رادعالهم عن الاقدام علی امثالها من الحیل والتلبیس"

یہود ونصاری اس حیلہ میں جب ناکام ہوگئے تو رب تعالی نے ان کے مکرہ فریب کی خبر دے کر بے نقاب کر

دیا ان کی ذلت ورسوائی کا ذکر کر کے گویا کہ ان کو تنبیہ کر دی کہ آئندہ اس قسم کے ہتھکنڈوں سے باز آجانا، کہاں تمہارے باطل حیلے اور کہاں نبی کریم ﷺ اور مؤمنوں کی بلند شان۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ ''شاید وہ پھر جائیں''

یعنی یہود ونصاریٰ نے حیلہ سوچا کہ صبح ایمان لے آؤ اور شام کو پھر جاؤ ہوسکتا ہے یہ لوگ ایمان سے پھر جائیں تفسیر کبیر سے جو تین وجوہ تفصیلاً ذکر کر دی گئی ہیں کہ رب تعالیٰ نے ان کے حیلے سے مطلع فرمادیا، ان میں دوصورتوں کے مضمون کو خازن میں مختصر الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے، اگر طلباء کرام عبارت یاد کرنا چاہیں تو ان کے فائدہ کیلئے خازن کی عبارت ذکر کی جارہی ہے۔

''ولمادبروا هذه الحيلة اخبر الله تعالى نبيه ﷺ بها فلم تتم لهم ولم يحصل لها اثر فى قلوب المؤمنين ولولا هذاالاعلام من الله تعالى لكان ربما اثر ذلک فى قلوب بعض من كان فى ايمانه ضعف'' (خازن)

جب انہوں نے اس حیلہ کی تدبیر کی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو مطلع فرمادیا تو وہ لوگ اپنے حیلہ میں ناکام ہوگئے، اور مؤمنوں پر ان کے حیلہ کا کوئی اثر نہ ہوا، اگر ان کی چالبازی کی خبر نہ دی جاتی تو ہوسکتا تھا کہ کچھ ضعیف ایمان والوں پر اس کا اثر ہوتا اور وہ پھر جاتے۔

تنبیہ: آیۃ کریمہ سے اتنا تو واضح ہوا کہ یہود ونصاریٰ نے ایک دوسرے کو اس حیلہ اور مکروفریب کا مشورہ دیا کہ ایسا کرو، اور یوں کہو۔

''واماامتثال الامر من المامورات فمسكوت عن بيان وقوعه وعدمه''

کیا انہوں نے اس حیلہ پر عمل بھی کیا تھا؟ یا نہیں، بعض نے بعض کی بات کو مانا تھا یا نہیں؟ اس کا بظاہر ذکر اس آیۃ کریمہ میں نہیں۔

''وعن بعضهم ان فى الاخبار ما يدل على وقوعه''

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ آیۃ کریمہ سے تقریباً یہ سمجھ آرہا ہے کہ انہوں نے اپنے حیلہ پر عمل تو کیا تھا لیکن وہ اس میں ناکام رہے اور ذلیل وخوار ہوئے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

تفسیر کبیر اور خازن سے یہی بات سمجھ آرہی ہے کہ انہوں نے حیلہ کیا اور اس میں ناکام ہو کر ذلیل وخوار ہوئے، تفسیر البحر المحیط نے لکھا ہے۔

"واسباب النزول تدل علی وقوعه"

آیۃ کریمہ کے نزول کی وجوہ اسی پر دلالت کر رہی ہے کہ انہوں نے اپنے اس حیلہ پر عمل کیا۔ وہ اپنا حیلہ کرنے کے باوجود ناکام رہے، مسلمانوں کو اسلام سے نہ پھیر سکے۔

تنبیہ: کفار کی چاپلوسی پر اعتماد نہ کرنا چاہیئے، بسا اوقات ان کی نمازیں، روزے، بلکہ ان کا کلمہ طیبہ پڑھنا سیاسی ہوتا ہے نہ کی دینی، غضب تو دیکھو کہ یہود نے مسلمانوں کو بہکانے کیلئے ایمان قبول کر کے نمازیں پڑھ کر مرتد ہونے کی ٹھان لی۔

خیال رہے کفار کی یہ تدبیریں اب بھی باقی ہیں، ہر سال بعض یہودی فرمان مصطفوی کے نام سے اشتہار چھاپتے ہیں جس میں لکھتے ہیں کی شیخ احمد خادم روضہ رسول اللہ ﷺ نے حضور ﷺ کی خواب میں زیارت کی کہ ان سے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس ہفتہ میں اتنے مسلمان مرے جن میں سے پچانوے فی صدی کافر ہو کر مرے اور پانچ فی صد مسلمان، میں خدا کے سامنے اپنی امت کی بدعملیوں سے سخت شرمندہ ہوں، فلاں سنہ میں سورج مغرب سے نکلے گا، فلاں سنہ میں یاجوج وماجوج ظاہر ہوں گے اور فلاں سنہ میں لوگوں کی صورتیں مسخ ہوں گی، اور جو اس مضمون کو نہ مانے وہ کافر ہے وغیرہ وغیرہ یہ سب یہود کی حرکتیں ہیں تا کہ مسلمان ان حالات کو سن کر اسلام سے بددل ہوں، اور ان پیشنگوئیوں کی غلطی معلوم کر کے بانی اسلام ﷺ سے پھر جائیں اور سوچیں کہ بارہا ایسی پیشنگوئیاں ہوئیں مگر ظاہر کچھ بھی نہ ہوا، حالانکہ روضۂ مطہرہ کے خدام میں سے کسی کا نام شیخ احمد نہیں، سیدھے سادھے مسلمان اسے وحی سمجھ کر چھاپتے اور شائع کرتے ہیں یہ یہودیوں کی وہی پرانی چال ہے۔ (تفسیر نعیمی)

****

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اَنْ یُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ اَوْ یُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝ (آیۃ نمبر ۷۳)

(1) اور یقین نہ لاؤ مگر اس کا جو تمہارے دین کا پیرو ہو، تم فرمادو کہ اللہ ہی کی ہدایت ہدایت ہے (یقین کا ہے کا نہ لاؤ) اس کا کہ کسی کو ملے جیسا تمہیں ملا، یا کوئی تم پر حجت لاسکے تمہارے رب کے پاس، تم فرمادو کہ فضل تو اللہ ہی کے ہاتھ ہے جسے چاہے دے اور اللہ وسعت والا علم والا ہے۔ (کنزالایمان)

(2) اور نہ لاؤ تم ایمان مگر ان کیلئے جنہوں نے تمہارے دین کی تابعداری کی، آپ فرمادیجئے بیشک ہدایت اللہ ہی کی ہدایت ہے، کسی ایک کو دیا جائے مثل اس کے جو تمہیں دیا گیا، یا حجت لاسکے تم تمہارے رب کے ہاں، فرمادیجئے بیشک فضل اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے دیتا ہے وہ جسے چاہے، اور وسعت والا، علم والا ہے۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

مفسرین کرام کا اتفاق ہے کہ یہود کے بقیہ کلام کی حکایت بیان کی گئی ہے، جب ان میں سب بعض نے بعض کو کہا کہ تم صبح ایمان لاؤ، شام کو پھر جاؤ شاید کہ یہ لوگ بھی پھر جائیں، اس کے بعد ان کا یہ کلام جو اس آیۃ کریمہ میں ذکر کردیا گیا۔

﴿وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ﴾

''اور نہ ایمان لاؤ مگر ان کیلئے جنہوں نے تابعداری کی تمہارے دین کی''

اعلیٰ حضرت وعلامہ رازی رحمھما اللہ:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے ''اور یقین نہ لاؤ مگر اس کا جو تمہارے دین کا پیرو ہو'' (کنزالایمان)

حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے ''کہ مت ناتو کسی کی بات سوائے ان لوگوں کے جو پیروی کرتے ہیں

تمہارے دین کی۔ان کی بزرگوں کے تراجم علامہ رازی رحمہ اللہ کی تفسیر کبیر کی اس عبارت کے مطابق ہیں''

"ولاتصدقوا الانبیا یقرر شرائع التوراة فاما من جاء بتغییر شئ من احکام التوراة فلاتصدقوه،وھذا ھو مذھب الیھود الی الیوم"

اور نہ تصدیق کرو یعنی یقین نہ لاؤ،مت مانو سوائے اس نبی کے جو توراۃ کے احکام کو ہی بیان کرے اور ان کے مطابق ہی عمل کرے،جو نبی توراۃ کے احکام میں سے کچھ بھی بدل دے،اس کی بات پر یقین نہ کرو،اس کی بات کو مت مانو،یہی مذہب یہود کا آج تک چل رہا ہے،کہ جو ہماری چال چلے وہ تو کچھ ہمارے قریب ہے،اور جو ہماری چال نہ چلے وہ ہم سے دور ہے،ہم اسے سرنہیں اٹھانے دیں گے،وہ نصاری کو اپنے ساتھ ملائے ہوئے ہیں،یایوں کہیں یہود نصاری سے ملکر مسلمانوں پر مظالم ڈھارہے ہیں۔بعض مسلمان یہود ونصاری سے مل کر دوسرے مسلمانوں کو مروار ہے ہیں،افسوس اے مسلمان تیری عقل کہاں گئی۔

تنبیہ: ابھی تفسیر کبیر سے جو عبارت پیش کی ہے،اس تفسیر کیلئے یہ جاننا بھی ضروری ہے۔

وعلی ھذا التفسیر تکون"اللام"فی قوله(الالمن تبع)صلة زائدة فانه یقال صدقت فلانا،ولایقال صدقت لفلان،وکون ھذااللام صلة زائدة جاز کقوله تعالی(ردف لکم)والمراد ردفکم"

اس تفسیر کیلئے یہ ضروری کہ لام کو زائد مانا جائے جو ﴿اِلَّا لِمَنۡ تَبِعَ﴾ میں ہے کہ یہ فقط اتصال کیلئے ہے اور زائد ہے،جیسا کہ اللہ تعالی کے ارشاد گرامی ﴿رَدِفَ لَكُمۡ﴾ میں لام معنوی لحاظ پر زائد ہے اور رابطہ کیلئے،اسی وجہ سے اس کا معنی"رَدِفَکُمۡ"والا ہے۔

تنبیہ: طلباء کرام تو سمجھتے ہیں کہ بعض اوقات کسی لفظ کا کسی جگہ معنی نہیں ہوتا وہ دوکلموں یا دوکلاموں کے درمیان رابطہ کا کام دے رہا ہوتا ہے،اس حرف کو زائد کہتے ہیں،جو صرف معنوی طور پر زائد ہوتا ہے،زائد کو (معاذاللہ) کوئی بے فائدہ کہہ کر اپنے ایمان کا جنازہ نہ نکالے۔

راقم اور روح البیان وتفسیر کبیر:

راقم نے جو ترجمہ کیا ہے وہ روح البیان سے لیا ہے،اور تفسیر کبیر نے بھی دوسرا معنی وہی لکھا ہے،اصل میں راقم کی کوشش ہوتی ہے کہ دینی مدارس کے طلباء کرام کے سامنے تمام بحثیں آجائیں تاکہ وہ بھرپور فائدہ حاصل کرسکیں۔

(ولاتؤمنوا)ای لاتقروا بتصدیق قلبی)الالمن تبع دینکم)ای لاھل دینکم لالمن تبع

محمدا واسلم لما قالت الطائفة المتقدمة لاتباعهم اظهروا الایمان بالقرآن اول النهار كان من بقية كلامها لهم الكم لاتصدقوا بحقيه الاسلام والقرآن بقلوبكم لكن لاتظهروه للمسلمين ولاتقروا بذلک الا لاهل دينكم" (روح البیان)

اورتم دل سے تصدیق کر کے اقرار نہ کرو (یعنی ایمان نہ لاؤ) مگران کی وجہ سے جنہوں نے تمہارے دین کی تابعداری کی، ان کی وجہ سے ایمان لانا مقصود نہیں جنہوں نے محمد ﷺ کی تابعداری کی اوراسلام قبول کیا۔ جب اس سے پہلی آیۃ میں گذر چکا ہے کہ ایک گروہ نے اپنے متبعین (پیروی کرنے والوں) کو کہا"تم قرآن پر ایمان کو دن کے اول حصہ میں ظاہر کرو" تو اس آیۃ کریمہ میں ان کے کلام کا بقیہ حصہ ذکر کیا" تم اسلام اور قرآن کی حقانیت کو دلوں سے تسلیم نہ کرنا"، لیکن مسلمانوں کے سامنے اپنے ایمان کا نہ اظہار کرنا اور نہ اقرار کرنا مگر بوجہ اپنے دین والوں کے۔

تفسیر کبیر نے دوسرا معنی ان الفاظ سے بیان کیا:

(ولاتؤمنوا الالمن تبع دينكم)اى لاتاتوا بذلک الایمان الا لاجل من تبع دينكم، كانهم قالوا ليس الغرض من الاتيان بذلک التلبيس الابقاء باعكم على دينكم فالمعنى ولاتاتوا بذلک الايمان الالاجل من تبع دينكم"

یعنی تم ایمان نہ لاؤ مگر بوجہ ان کے جنہوں نے تمہارے دین کی تابعداری کی، گویا کہ انہوں نے کہ یہ ایمان لانے کا مکروفریب اور ملمع سازی صرف اپنے متبعین کو دین پر قائم رکھنا مقصود ہو، اب آیۃ کریمہ کا معنی واضح ہوگیا "ولاتاتوا بذلک الایمان الالاجل من تبع دينكم" "اور ایمان نہ لاؤ مگر بوجہ ان کے جنہوں نے تمہارے دین کی تابعداری کی" اس صورت میں ﴿لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ﴾ میں لام تعلیلیہ ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

آیۃ کریمہ کا مختصر مطلب:

یہود جو رئیس تھے انہوں نے اپنے پیروی کرنے والے لوگوں کو یہ کہا کہ تین باتوں کو ذہنوں میں رکھو ایک یہ کہ (پہلے معنی کے مطابق) کسی کو بات پر یقین نہیں لانا، ہاں البتہ صرف ان کی بات کو ماننا جو تمہارے دین کے متبع ہوں، (اور دوسرے معنی کے مطابق مطلب یہ ہے) کہ دل سے ایمان نہ لانا البتہ ایمان کا اظہار اور اقرار بھی صرف اپنے دین والوں کے فائدہ کیلئے کرنا کہ کہیں وہ ایمان نہ لے آئیں، جب تم صبح ایمان کا صرف اظہار کر کے شام کو پھر جاؤ گے تو ہمارے دینی بھائی یہ دیکھ کر اپنے دین پر قائم رہیں گے کہ اگر یہ دین سچا ہوتا تو ہمارے اہل علم ایمان لاکر نہ

پھرتے، دوسری چیز کی ترغیب دیتے کہ اللہ تعالی نے جو انعامات تمہیں عطاء کر رکھے ہیں وہ کسی اور کو عطا نہیں کئے گئے، (لھذا تم اپنے دین پر قائم رہنا صرف زبانی، کلامی اسلام کا اظہار کرنا) تیسری چیز تم یہ یاد کرلو کہ وہ لوگ قیامت کے دن بھی تمہارے ساتھ حجت و دلیل میں غالب نہیں آئیں گے۔ یہ تین چیزیں رئیس یہودیوں نے اپنے متبعین کو سکھائیں تا کہ یہ ظاہری طور پر ایمان لائیں اور دل میں اپنے دین کو ہی پختہ رکھیں، پھر البتہ ظاہری طور پر لائے ہوئے ایمان سے بھی پھر جائیں۔ رب تعالی نے اپنے محبوب ﷺ سے ان کو دو جواب دلائے۔ ایک یہ کہ اے محبوب ''آپ فرما دو کہ بیشک ہدایت اللہ کی طرف سے ہدایت ہے'' یعنی ہدایت دینا جب اسی کے قبضہ قدرت میں ہے تو تمہاری یہ تدبیر باطل و برباد ہو کر رہ جائے گی کہ صبح ایمان لا کر شام پھر جاؤ تو لوگ اسلام سے پھر جائیں گے، یہ احمقانہ تدبیر ہے۔ اور دوسرا جواب یہ دیا گیا ''اے محبوب آپ فرما دو' بیشک فضل اللہ تعالی کے قبضۂ قدرت میں ہے جسے چاہتا ہے وہ عطاء کرتا ہے بیشک اللہ تعالی وسعت والا علم والا ہے'' یعنی تمہاری یہ نصیحت بھی باطل ہے کہ اللہ تعالی کے انعامات صرف یہود پر ہی ہیں وہ جسے چاہے اپنے انعامات سے نواز دے، جب فضل اسی کے قبضہ قدرت میں تو تمہارا یہ کہنا بھی باطل ہے کہ قیامت کے دن حجج و دلائل میں ان پر کوئی غالب نہیں آئے گا۔

﴿قُلْ اِنَّ الْھُدٰی ھُدَی اللّٰہِ﴾ ''آپ فرما دیجئے بیشک ہدایت اللہ ہی کہ ہدایت ہے''

''قل یا محمد للمرؤساء(ان الهدی هدی الله)یهدی به من یشاء الی الایمان ویثبته علیه فاذا کانت الهدایة والتوفیق من الله فلایضر کیدکم وحیلکم، وهو اعتراض مقید لکون کیدهم غیر مجدلطائل''

یہ جملہ معترضہ ہے اس میں بتانا یہ مقصود ہے کہ یہود و نصاری کا مکر و فریب باطل ہے اس میں کسی قسم کا ان کو نفع نہیں۔ اسلئے اے محمد مصطفی ﷺ یہود و نصاری کے رئیسوں کو آپ فرما دیں بیشک ہدایت اللہ ہی کی ہدایت ہے'' وہ جسے چاہے ایمان کی ہدایت عطاء فرماتا ہے، اور ان کو اس پر ثابت قدم رکھتا ہے، جب ہدایت اللہ تعالی کی طرف سے ہے اور اسی کی توفیق سے ہے تو اے یہود و نصاری تمہارا مکر و فریب نبی کریم ﷺ اور مومنین کو نقصان نہیں پہنچا سکتا'' (روح البیان)

ان الفاظ مبارکہ سے ہی یہ حاصل ہو گیا ''فمن یهدی الله فلا مضل له'' جس کو اللہ ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں، اور اسی سے اللہ تعالی کے اس ارشاد گرامی کا بھی پتہ چل گیا۔

﴿یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ﴾ (سورۃ الصف پارہ ۲۸ آیہ نمبر ۸)

''وہ ارادہ رکھتے ہیں کہ اللہ کا نور بجھا دیں اپنے مونہوں سے، حالانکہ اللہ مکمل کرنے والا ہے اپنے نور کو

اگرچہ ناپسند کریں کافر۔" (ماخوذ از روح المعانی)

﴿اَنْ یُّؤْتٰی اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ اَوْ یُحَآجُّوْکُمْ عِنْدَ رَبِّکُمْ﴾

یہ کہ کسی ایک کو دیا جائے مثل اس کے جو تمہیں دیا گیا، یا حجت لا سکے تمہارے رب کے ہاں۔"

ان الفاظ مبارکہ کے مختلف مطالب بیان کئے گئے، اصل میں تراکیب میں جب مختلف احتمال ہوں تو یقیناً معانی بھی مختلف ہوتے ہیں، زیادہ فہم کے قریب خازن اور صاوی سے ایک معنی پیش کر رہا ہوں، جو طلباء کی سمجھ کیلئے زیادہ بہتر ہے"

(۱) (قل ان الهدی هدی الله)ای ان الدین دین الله و البیان بیانه و هذا خبر من الله تعالی ثم اختلفوا فیه فمنهم من قال هذا کلام معترض بین کلامین و مابعده متصل بالکلام الاول و هو اخبار عن قول الیهود بعضهم لبعض و معنی الآیة و لاتؤمنوا الالمن تبع دینکم و لاتؤمنوا ان یؤتی احد مثل ما اوتیتم من العلم و الحکمة و الکتاب و الآیات من فلق البحر و انزال المن و السلوی علیکم و غیر ذلک من الکرامات و لاتؤمنوا ان یحاجوکم عندربکم لانکم اصح دینا منهم فلما اخبر الله تعالی عن الیهود بذلک قال فی الناء ذلک قل ان الهدی هدی الله و المعنی ان الذی انتم علیه انما صار دینا بحکم الله و امره فاذاً مر بدین آخروجب اتباعه و الانقیاد لحکمه لانه هو الذی هدی الیه و أمربه ،وقیل معناه قل لهم یامحمد ان الهدی هد الله وقد جئتکم به و لن ینفعکم فی دفعه هذا الکید الضعیف"

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿قُلْ اِنَّ الْهُدٰی هُدَی اللّٰهِ﴾ کا مطلب یہ ہے (اے محبوب) آپ فرما دیجئے ہدایت اللہ ہی کی ہدایت ہے" یعنی دین اللہ ہی کا دین ہے، اور بیان اللہ ہی کا بیان ہے۔ اب ترکیبی لحاظ پر ایک احتمال یہ ہے کہ یہ جملہ معترضہ ہے، یعنی فعل "وَلَا تُؤْمِنُوْٓا" اور اس کے معمولات ﴿اَنْ یُّؤْتٰٓی اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ﴾ اور ﴿اَوْ یُحَآجُّوْکُمْ عِنْدَ رَبِّکُمْ﴾ کے درمیان واقع ہے، اس ترکیب کے لحاظ پر مطلب یہ ہے کہ یہود کے بعض لوگوں نے جو بعض کو کہا، اس کی حکایت رب تعالیٰ نے بیان فرمائی، اس لحاظ پر آیۂ کریمہ کا معنی یہ ہوا۔ اور نہ ایمان لاؤ مگر ان کیلئے جنہوں نے تمہاری تابعداری کی، اور نہ ایمان لاؤ اس پر کہ کسی اور کو دیا جائے مثل اس کے جو تمہیں دیا گیا یعنی جو علم تمہیں دیا گیا، کتاب و حکمت تمہیں دی گئی، اور نشانیاں تمہیں گئیں، یعنی دریا کا تمہارے لئے پھاڑنا، اور من و سلویٰ تم پر نازل کرنا، اور طرح طرح کی کرامات سے تمہیں نوازنا (یہ نعمتیں کسی اور نہیں دی جائیں یہ صرف تمہاری ہی شان

ہے)اور تم اس پر ایمان نہ لاؤ کہ وہ کسی قسم کی حجت ودلیل میں تم پر غالب آسکیں گے۔اس لئے کہ تمہارا دین ان کے دین سے زیادہ صحیح ہے۔رب تعالیٰ نے یہود کے تین اقوال کا ذکر فرمایا تو درمیان میں ذکر فرمایا ﴿قُلْ اِنَّ الْهُدٰی هُدَی اللّٰهِ﴾ (آپ فرمادیجئے بیشک ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے)یعنی جس دین پر تم ہو وہ اللہ کے حکم سے ہی دین بنا تھا،اب رب تعالیٰ نے جب اسے منسوخ فرما کر دوسرے دین کا حکم دیا ہے تو تمہارے لئے ضروری ہو چکا ہے کہ تم اسی کی تابعداری کرو، کیونکہ ہدایت تو وہی جو رب تعالیٰ کی ہدایت ہے،صرف تمہاری عقل اور سوچ کی بات نہیں۔اور بعضوں نے کہا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اے محبوب آپ فرمادیں کہ بیشک ہدایت اللہ ہی کی ہدایت ہے جو میں نے تمہارے پاس دین لایا ہے، وہی اللہ کی ہدایت ہے،لھذا یہ کمزور قسم کے تمہارے مکروفریب اور گھٹیا تمہاری چالیں تمہیں نفع نہیں پہنچا سکتیں،اور نہ ہی دین کو ختم کر سکتی ہیں۔ (خازن)

طلباء کرام خازن کی عبارت اور ترجمہ کو دیکھنے کے بعد" صاوی کو دیکھیں تو (ان شاء اللہ)اس میں سے بھی یہ مطالب سمجھنے آسان ہوں گے۔یہ مطلب جو بیان کیا گیا ہے اس کی دارومدار ﴿لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ﴾ کے لام کا معنی علت اور انتفاع کا لینے پر ہے۔

(۲) اگر لام زائد ہو تو معنی یہ ہوگا نہ یقین لاؤ اور نہ مانو سوائے ان کی باتوں کے جنہوں نے تمہاری تابعداری کی،اور یہ نہ مانو کہ کسی اور کو اس کی مثل دیا جائے گا جو تمہیں دیا گیا ہے،اور یہ نہ مانو اور اس پر یقین نہ لاؤ کہ کوئی تم پر دلائل میں تمہارے رب کے ہاں تم پر غالب ہوگا۔

(۳) تیسرا معنی لام کو صلہ کا بناتے ہوئے یہ ہوگا۔

"لاتظهروا ایمانکم بأن یؤتی احدمثل اوتیتم اویحاجوکم عندربکم الالمن تبع دینکم"

کہ تم اپنے ایمان کو ظاہر نہ کرو کہ کسی اور کو تمہاری مثل انعامات دئے جائیں گے،یا کوئی اور اللہ کے ہاں تم پر دلائل میں غالب آسکے گا۔ہاں یہ باتیں صرف اپنے متبعین کے سامنے ظاہر کر سکتے ہو۔

"ولاتفشوه الی المسلمین کیلا یزید ثباتهم ولاالی المشرکین کیلا یدعوهم الی الاسلام"

یعنی مسلمانوں کے سامنے یہ ظاہر نہ کرنا کہ ہماری آسمانی کتابوں میں یہ مذکور ہے کہ آخری نبی آئیں گے اور ان کا دین دین اسلام ہوگا،تو یہ تمہاری باتیں سن کر مسلمان دین پر اور پختہ طریقے سے قائم ہوں گے،اسلئے مسلمانوں پر یہ باتیں ظاہر نہ کریں،اور مشرکین کو بھی یہ نہ بتائیں ورنہ مسلمان ان کو اپنے دین کی طرف پھیرلیں گے،اور ان کو یہ

کہیں گے کہ ہمارا دین سچا ہے کیونکہ اس کی حقانیت کا تذکرہ پہلی آسمانی کتب میں بھی موجود ہے۔ (ماخوذ از مظہری)

خیال رہے یہی معنی تفسیر ابن کثیر اور صابونی میں ذکر کیا گیا ہے۔

(ولاتؤمنوا الالمن تبع دینکم)ای لاتطمئنوا او تظھروا سرکم وماعندکم الالمن تبع دینکم ولاتظھروا مابایدکم الی المسلمین فیؤمنوا بہ ویحتجوا بہ علیکم"

یعنی تم یقین نہ کرو اور اپنے راز ظاہر نہ کرو، اور جو تمہاری کتب میں موجود ہے اسے ظاہر نہ کرو سوائے ان کے جنہوں نے تمہاری تابعداری کی، اور جو چیزیں تمہارے علم میں ہیں، انہیں مسلمانوں پر ظاہر نہ کریں ورنہ وہ اپنے ایمان پر پختہ طریقہ سے قائم رہیں گے، اور تم پر دلائل میں غالب آجائیں گے کہ جب ہماری دین اور ہمارے نبی کریم ﷺ کا ذکر تمہاری کتب میں موجود ہے تو کیا وجہ ہے کہ تم ہمیں دین سے پھیرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ (صابونی)

(۴) اور ایک معنی اس صورت کے مطابق ہے جس میں "اَنْ یُّـؤْتٰـی" میں "لا" کو مقدر مانا گیا، جسطرح ﴿یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اَنْ تَضِلُّوْا﴾ میں "لا" مقدر ہے، اصل میں معنوی طور پر اسطرح ہے ﴿یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ لِئَلَّا تَضِلُّوْا﴾ (اللہ بیان کرتا ہے تمہارے لئے تا کہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ) اب یہاں معنوی طور پر عبارت یوں ہوگئی۔

"ولاتؤمنوا الالمن تبع دینکم لئلایؤتی" یعنی لاتصدقوھم لئلا یعلموا مثل ماعلمتم فیکون لکم الفضل علیھم بالعلم ولئلا یحاجوکم عندربکم فیقولوا عرفتم ان دیننا حق ولم تؤمنوا"

اب مطلب یہ ہوا کہ "تم ان کی تصدیق نہ کرنا تا کہ انہیں ایسا علم حاصل نہ ہو جائے جو تمہیں حاصل ہے یہ اس لئے ضروی ہے کہ تمہاری علمی برتری ان پر قائم رہے، اور رب تعالی کے ہاں وہ تم پر حجت نہ پیش کر سکیں، اور رب کے تمہیں یہ نہ کہیں کہ تم ہمارے دین کی حقانیت کو جانتے تھے لیکن تم نے ایمان نہیں لایا۔ (ماخوذ از مظہری)

﴿قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ﴾

فرما دیجئے بیشک فضل اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے عطاء کرتا ہے جسے چاہے۔

یہ ان لوگوں کا رد ہے جنہوں نے اپنے یہود و نصاری کو کہا کہ کسی ایک کو تمہاری مثل انعام و اکرام نہیں دیا جائے گا "وفی الحقیقۃ ھو ردلدعواھم من اولھا الی آخرھا" حقیقت میں ان کے دعوی کا اول سے آخر تک رد ہے۔ نبی کریم ﷺ کو خطاب فرماتے ہوئے اللہ تعالی نے فرمایا اے محبوب آپ فرما دیں بیشک فضل اللہ تعالی کے قبضہ

قدرت میں ہے جسے چاہے عطاء کرتا ہے۔

"ای الامور کلها تحت تصرفه وهو المعطی المانع یمن علی من یشاء بالایمان والعلم والتصرف التام ویضل من یشاء فیعمی بصره وبصیرته ویختم علی قلبه وسمعه ویجعل علی بصره غشاوة وله الحجة والحمکة البالغة"

یعنی تمام امور رب تعالیٰ کے تصرف میں ہیں وہی عطاء کرنے والا ہے، وہی اپنی مہربانیوں سے کسی کو دور کرنے والا ہے، جس پر چاہے اس پر احسان فرماتا ہے یعنی اسے ایمان وعلم اور تصرف تام عطاء فرماتا ہے۔ اور جسے چاہے گمراہ کرتا ہے اور اس کی بصارت اور بصیرت کو گم کر دیتا ہے۔ اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دیتا ہے، اور اس کی آنکھوں پر پردہ کر دیتا ہے، رب تعالیٰ کے قبضۂ قدرت پر حجت اور حکمت بالغہ ہے۔ (صابونی)

﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ "اور اللہ وسعت والا، علم والا ہے"

اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے، یعنی بہت بڑے فضل والا ہے، "وہ علم والا ہے، یعنی وہ جانتا ہے کہ کون اس کی اہلیت رکھتا ہے کہ اس پر فضل کیا جائے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ○ (آیۃ نمبر ۷۴)

(1) اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے جسے چاہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ (کنزالایمان)

(2) خاص کرتا ہے اپنی رحمت سے جسے چاہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

جب اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے، یعنی بہت بڑے فضل والا ہے، اور''وہ علم والا ہے''یعنی جانتا ہے کہ کون اس کے فضل کا مستحق ہے'' تو اس آیۃ کریمہ میں یہ ذکر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جسے چاہے خاص کرتا ہے، اور اللہ ہی بہت بڑے فضل والا ہے، نصاریٰ اور یہودی کا یہ دعویٰ کہ اللہ تعالیٰ کا احسان اور فضل صرف ہم پر ہے جو ہمیں اس نے انعام واکرام عطاء کیا ہے وہ کسی اور کو عطاء نہیں کیا، یہ (ان کا دعویٰ) باطل ہے۔

''اختصکم ایھا المؤمنون من الفضل بمالایحد ولایوصف بما شرف به نبیکم محمدﷺ علی سائر الانبیاء وھداکم به الی اکمل الشرائع''

اس آیۃ کریمہ سے یہود ونصاریٰ کے دعویٰ کو رد کر کے مؤمنین کو بتایا گیا ہے کہ! اے مومنو اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے فضل سے خاص کیا ہے۔ اتنے بڑے فضل سے تمہیں نوازا ہے جس کی کوئی حد اور کوئی وصف نہیں بیان کیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام پر تمہارے نبی کو افضل بنایا، جس کی وجہ سے تمہیں تمام امتوں سے افضل بنایا، اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں سیدالانبیاء اور افضل الانبیاء کے ذریعے کامل شریعت کی ہدایت دی۔ تو اب اے مؤمنو تم خود ہی سمجھ جاؤ کہ تم سے کوئی افضل نہیں۔ یہود کے غلط دعویٰ اور باطل نظریات کے ڈھنڈورا پیٹنے سے کہیں بدظن نہ ہونا۔ (ماخوذ از صابونی)

(یختص برحمته من یشاء) یعنی بنبوته ورسالته وقیل بدینه الذی ھو الاسلام وقیل بالقرآن (من یشاء) یعنی من خلقه وفیه دلیل علی ان النبوة لاتحصل الابالاختصاص والتفضل لابالاستحقاق لانه تعالی جعلھا من باب الاختصاص وللفاعل ان یفعل مایشاء الی من یشاء بغیرا استحقاق''

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جسے چاہے خاص کرتا ہے، یعنی نبوت اور رسالت اپنی مخلوق سے جسے چاہے عطاء کرتا ہے۔ اور جسے چاہے دین اسلام عطاء فرما کر اور قرآن پاک عطاء فرما کر اپنی رحمت سے خاص فرمالیتا ہے۔ آیۃ کریمہ سے ایک اور دلیل حاصل ہوگئی کہ نبوت صرف اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہوتی ہے، رب تعالیٰ جسے چاہے

نبوت کیلئے خاص کردے، اور وہی جانتا ہے کہ نبوت کا اہل کون ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے ''اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ'' اللہ زیادہ جانتا ہے کہ منصب رسالت کسے عطاء کرتا ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے نبوت استحقاق (حقدار ہونے) کی وجہ سے ملی ہے، اس لئے کہ اللہ تعالی نے اپنے اس خصوص فضل کو اپنی مشیت سے خاص کردیا ہے کہ (اللہ تعالی اپنی رحمت سے جسے چاہے خاص کردے) اللہ تعالی فاعل مختار ہے، فاعل مختار جسے چاہے اس کے استحقاق کے بغیر ہی عطاء کردے۔ (از خازن)

فائدہ جلیلہ: ان دونوں مذکورہ آیات سے صوفیاء کرام نے اس عظیم فائدہ کا ذکر کیا ہے کہ

''لاتعاشروا الامن یوافقکم علی احوالکم و طریقتکم فان من لایوافقکم لایرافقکم واللہ اعلم''

کہ ان لوگوں سے تعلقات رکھو جو تمہارے حالات کے مطابقت تمہارے موافق ہو، اور تمہارے طریقہ پر چلیں، جو لوگ تمہارے موافق نہیں وہ تمہارے رفیق نہیں ن سکتے، ''واللہ اعلم'' (قرطبی)

یہود کی دو چالوں کے دو بیان:

یہود نے ایک چال یہ چلی کہ اپنے بعض لوگوں کو کہا کہ تم صبح ایمان لے آؤ اور شام کو کفر اختیار کرلو، تا کہ ضعیف الاعتقاد مسلمان اسلام سے پھر جائیں، تو رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿قُلْ اِنَّ الْهُدٰی هُدَی اللّٰهِ﴾ بیشک اللہ تعالی کی کامل ہدایت اور اسی کی کامل قوت بیانیہ کے ہوتے ہوئے تمہارے یہ کمزور حیلے، گھٹیا قسم کے مکروفریب کسی کام کے نہیں، تم نے اپنے ان مقاصد میں ناکام ہی ناکام ہونا ہے، دوسری چال ان کی یہ تھی کہ وہ اپنے لوگوں کو اپنے عقائد پر قائم رکھنے کیلئے اور اس غرض کیلئے کہ یہ ہماری ہر بات پر عمل کرتے رہیں تو انہوں نے کہا کہ جو کتاب اور احکام اور حکمتیں اور نبوت تمہیں عطاء کی گئی ہے وہ کسی اور کو عطاء نہیں کی گئی، تو رب تعالی نے ان کے رد میں ذکر فرمایا۔ ﴿قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ﴾ فرمادیجئے فضل اللہ تعالی کے قبضہ قدرت میں عطاء کرتا ہے وہ جسے چاہتا ہے۔ (کبیر)

فضل سے مراد رسالت ونبوت بھی ہے:

اور ہر قسم کا زیادہ احسان بھی ہے۔

''الفضل ھوفی اللغة عبارة عن الزیادة واکثر مایستعمل فی زیادة الاحسان و الفاضل الزائد علی غیرہ فی خصال الخیر ثم کثراستعمال الفضل حتی صار لکل نفع قصد

به فاعله الاحسان الی الغیر"

فضل کا لغوی معنی ہے ''زیادہ ہونا'' اکثر طور پر احسان کی زیادتی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔اسی لئے جو دوسروں پر اچھے کاموں میں زیادہ فوقیت رکھتا ہو اسے ''فاضل'' کہا جاتا ہے۔ پھر عام طور پر ہر نفع مند چیز پر اور دوسروں پر احسان کرنے کے معنی میں ''فضل'' کا استعمال ہونے لگا۔ (کبیر)

بندوں پر رب تعالی کے انعامات کی کوئی حد نہیں:

"ویحصل من مجموع الآیتین انها لانهایة لمراتب اعزاز الله واکرامه لعباده وان قصر انعامه واکرامه علی مراتبه معینة وعلی اشخاص معینین جهل بکمال الله فی القدرة والحکمة"

ان دونوں آیتوں کے مجموعہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالی اپنے بندوں کو جو اعزاز و اکرام عطاء فرماتا ہے اس کی کوئی حد نہیں، اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اللہ تعالی اپنے بندوں کو چند معین قسم کے اعزاز و اکرام سے نوازتا ہے ،یا یہ کہے کہ چند آدمیوں کو وہ اعزاز و اکرام سے نوازتا ہے تو یہ کہنا درحقیقت جہالت ہے کہ وہ رب تعالی کے قدرت وحکمت میں بے حد کمال کو نہیں جانتا۔ (کبیر)

ہاں اتنی بات واضح ہے کہ رب تعالی کا فضل مؤمنیں کو حاصل ہے، کافر اس سے محروم ہیں پھر خصوصی کمالات وانعامات بندوں کے مراتب کے مطابق حاصل ہوتے ہیں۔

وَمِنْ اَهْلِ الْکِتَابِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ یُّؤَدِّهٖ اِلَیْکَ وَمِنْهُمْ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِیْنَارٍ لَّا یُؤَدِّهٖ اِلَیْکَ اِلَّا مَادُمْتَ عَلَیْهِ قَآئِمًا ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ وَیَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْکَذِبَ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ○ (آیۃ نمبر ۷۵)

(1) اور کتابیوں میں کوئی وہ ہے کہ اگر تو اس کے پاس ایک ڈھیر امانت رکھے تو وہ تجھے ادا کردے گا اور ان میں سے کوئی وہ ہے کہ اگر ایک اشرفی اس کے پاس امانت رکھے تو وہ تجھے پھیر کر نہ ادا کرے گا مگر جب تک تو اس کے سر پر کھڑا رہے، یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان پڑھوں کے معاملہ میں ہم پر کوئی مؤاخذہ نہیں اور اللہ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھتے ہیں۔ (کنز الایمان)

(2) اور بعض اہل کتاب وہ ہیں کہ تم ان کے پاس امانت رکھو کثیر مال وہ ادا کردیں گے تمہاری طرف اور ان میں سے بعض وہ ہیں کہ تم ان کے پاس ایک دینار امانت رکھو تو نہیں ادا کریں گے وہ تمہاری طرف مگر یہ کہ تم لگاتار اس پر کھڑے رہو، یہ بے شک اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی راہ (پکڑ کی راہ) اور وہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق: اس آیۃ کریمہ کا تعلق ماقبل سے دو وجہ سے ہے۔

پہلی وجہ: اس لئے پہلی آیۃ کریمہ میں یہود کے ایک جھوٹ کا ذکر کیا کہ وہ کہتے ہیں کہ رب تعالیٰ کا فضل صرف ہم پر ہے اور کسی کو رب تعالیٰ نے ان نعمتوں سے نہیں نوازا ہے جن سے ہمیں نوازا ہے، اب اس آیۃ کریمہ میں ان کا امانت میں خیانت کے ارتکاب کا ذکر کیا جارہا ہے، اور اسی آیۃ کریمہ سے ان کے جھوٹے ہونے پر دلیل قائم کی گئی، وہ اس طرح کہ

"انه تعالی بین ان الخیانة مستقبحة عند جمیع ارباب الادیان وهم مصرون علیها فدل هذا علی کذبهم"

اللہ تعالیٰ نے جب ان کی خیانت کا ذکر فرمایا تو اسی سے پتہ چل گیا کہ وہ جھوٹے ہیں، کیونکہ خیانت تو

تمام دینوں والوں کے نزدیک قبیح (بری) چیز ہے۔ جب وہ خیانت پر قائم رہنے پر اصرار کر رہے ہیں تو ان کے جھوٹے ہونے پر ان کا اپنا عمل ہی دلیل کیلئے کافی ہے۔

دوسری وجہ: پہلی آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود کے ان قبیح (برے) احوال کا تذکرہ کیا جن کا تعلق دین سے تھا یعنی انہوں نے کہا (وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ) تم ایمان نہ لاؤ مگر بوجہ ان کہ جنہوں نے تابعداری کی تمھارے دین کی۔

"حکی فی ھذہ الآیۃ بعض قبائح احوالھم فیما یتعلق بمعاملۃ الناس وھو اصرارھم علی الخیانۃ والظلم واخذاموال الناس فی القلیل والکثیر"

اس آیۃ کریمہ میں یہود کے ان برے احوال کا ذکر کیا جا رہا ہے جو لوگوں کے معاملات سے تعلق رکھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ وہ لوگ خیانت پر اصرار کرتے ہیں، اور لوگوں کا مال ناحق طریقے سے لے لیتے ہیں، خواہ وہ مال قلیل ہو یا کثیر ہو۔ (ماخوذ از کبیر)

شان نزول:

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ عبداللہ بن سلام کے پاس دو ہزار دوسو اوقیہ سونا بطور امانت رکھا، جب اس نے طلب کیا تو عبداللہ بن سلام نے وہ سونا اسے واپس لوٹا دیا (اوقیہ کا وزن چالیس درھم کے برابر ہے یعنی ساڑھے دس تولے کا ایک اوقیہ ہے) اسی طرح آپ کے دوسرے ساتھی بھی امانت کا یوں ہی پاس کرتے تھے اور علامہ بغوی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ قریش کے ایک شخص نے فخاص ابن عازورا یہودی کے پاس ایک دینار بطور امانت رکھا تو اس نے خیانت کر لی، وہ ایک دینار واپس نہ لوٹایا تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو پہلے فریق کی تعریف اور دوسرے فریق کی مذمت میں نازل کیا۔ (ماخوذ از مظہری)

آیۃ کریمہ کے نزول سے تنبیہ:

اخبر تعالی ان فی اھل الکتاب الخائن والامین والمؤمنون لایمیزون ذلک فینبغی اجتناب جمیعھم"

اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں یہ خبر دی ہے کہ اہل کتاب میں سے بعض خیانت کرنے والے ہیں، اور بعض امانت کا پاس کرنے والے ہیں، مؤمن چونکہ ان میں فرق نہیں کر سکتے تھے تو گویا کہ تمام اہل کتاب سے اجتناب کا حکم دیا گیا۔ (قرطبی)

قرطبی کی اس عبارت سے راقم کے موقف کو تائید حاصل ہوگئی کہ عبداللہ بن سلام نے جب کثیر مال امانت رکھا ہوا واپس کر دیا تو اس وقت وہ یہودی تھے، مؤمن اور صحابی نہیں تھے۔ البتہ امانت کا پاس کرنے کی برکت اور رسول اللہ ﷺ کی نظر عنایت کی وجہ سے ان کو ایمان نصیب ہوگیا۔ اگر یہ مطلب لیا جائے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے ایمان لانے کے بعد امانت واپس کی جس کا تذکرہ اس آیۃ کریمہ میں ہے تو علامہ قرطبی رحمۃ اللہ تعالی کے قول "فینبغی اجتناب جمیعھم" کا کوئی مطلب نہیں نکل سکتا۔

اعتراض: تفسیر مظہری میں تو یوں بیان کیا گیا ہے "ومن اھل الکتاب یعنی عبداللہ بن سلام واشباھہ مومنی اھل الکتاب" جن اہل کتاب کے امانت لوٹا دینے کا ذکر ہے اس سے مراد اہل کتاب سے ایمان لانے والے عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی ہیں۔

اسی طرح روح البیان نے بیان کیا ہے " فاھل الامانۃ من اھل الکتاب ھم الذین اسلموا" جن اہل کتاب کے متعلق ذکر ہے کہ وہ امانتیں ادا کر دیتے ہیں خواہ ڈھیروں مال ہی ان کے پاس رکھا جائے، اس سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ ان تفاسیر سے تو پتہ چلتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا اسلام لانے کے بعد امانت واپس کرنے کا ذکر ہے، حالت یہودیت میں مراد لینا کیسے صحیح ہے۔

جواب: ان تفاسیر میں یہ ذکر نہیں کہ آپ نے اسلام لانے کے بعد امانت واپس کی، بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے امانت واپس کی جب کہ وہ ڈھیروں مال تھا، اور انہوں نے اسلام بھی قبول کرلیا تھا

"واللہ اعلم باالصواب"

آیۃ کریمہ میں مذکور قنطار سے مراد:

"والقنطار عبارۃ عن المال الکثیر والدینار عبارۃ عن المال القلیل"

قنطار سے مراد کثیر مال اور دینار سے مراد قلیل مال ہے، اگرچہ حقیقی معنی کے لحاظ سے قنطار کا معنی ڈھیر جمع کیا ہوا، اور دینار سونے کا ایک سکہ ہے، جسے اشرفی بھی کہا جاتا ہے اور دینار بھی جو اس کا مشہور نام ہے، یہ ساڑھے چار ماشے کا وزن ہے۔ اب مطلب یہ ہوگیا:

"منھم من یؤدی الامانۃ وان کثرت مثل عبد اللہ بن سلام واصحابہ ومنھم من لایؤدیھا وان قلت وھم کفار اھل الکتاب مثل کعب الاشرف واصحابہ وفنحاص بن عاوزراء"

بعض اہل کتاب امانت ادا کر دیتے اگر چہ وہ بہت کثیر مال ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی امانتیں لوٹا دیا کرتے تھے اور بعض اہل کتاب وہ ہیں کہ جو امانتیں واپس نہیں کرتے اگر چہ وہ مال بہت تھوڑا ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ کعب بن اشرف اور اس کے ساتھی اور فخاص بن عازوا (یہ وہی شخص ہے جس کا ذکر شان نزول میں آچکا ہے) (ماخوذ از خازن)

خازن میں بھی "وھم کفار" ذکر کیا گیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ امانتیں ادا کرنے والے مسلمان تھے اور نہ ادا کرنے والے کافر تھے، لیکن راقم کا موقف وہی ہے جو ذکر دیا گیا کہ بعض اہل کتاب امانتیں واپس کر دیتے ہیں اگر چہ کثیر مال ہی کیوں نہ ہو یہ وہی ہیں جو بعد میں اسلام لے آئے اور بعض ان میں سے وہ ہیں جو امانتیں واپس نہیں کرتے اگر چہ وہ مال قلیل ہی کیوں نہ ہو، یہ وہ لوگ ہیں جو کفر پر ہی قائم رہے۔

"وَمِنْهُمْ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَادُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا"

اور ان میں سے بعض وہ ہیں کہ تم ان کے پاس امانت رکھو ایک دینار تو وہ نہیں ادا کریں گے تمہاری طرف مگر یہ کہ تم لگا تار اس پر کھڑے رہو۔

یعنی بعض اہل کتاب کے پاس تم تھوڑا مال بطور امانت رکھ دو تو وہ تمہیں نہیں لوٹائیں گے، ہاں اگر تم ان سے لگا تار مطالبہ کرتے رہو تو وہ مال لوٹانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ "اِلَّا مَادُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا" کا حقیقی معنی تو یہ ہے "مگر یہ کہ تم ہمیشہ اس کے اوپر کھڑے رہو" یہ حقیقی معنی تو متعارف نہیں، البتہ مجازی معانی میں سے کوئی ایک لے لیا جائے۔

مجازی معانی:

(۱) "قال ابن عباس یرید تقوم علیه وتطالبه بالالحاح والخصومة والملازمة"

حضرت ابن عباس ﷺ فرماتے ہیں اس پر کھڑا رہنے کا مقصد یہ ہے کہ تم اس سے بار بار مطالبہ کرتے رہو، اور جھگڑا کرتے رہو، اسے لازم پکڑو، یعنی اس کا پیچھا نہ چھوڑو، تا کہ وہ تمہاری امانت ادا کرنے پر مجبور ہو جائے۔

(۲) "الا مدة دوامک علیه یا صاحب الحق قائما علی راسه متوکلا علیه بالمطالبة له والتعنیف بالرفع الی الحاکم واقامة البینة علیه"

اس پر کھڑے رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اے صاحب حق تم اس کے سر پر کھڑے رہو، یہ بھروسہ رکھتے ہوئے (یہ توکل کرتے ہوئے) کہ یہ ادا کر دے گا اور اسے دھمکی دی جائے کہ میں اپنا یہ مقدمہ عدالت میں لے جاؤں گا اور دعوی پر تمہارے خلاف گواہ قائم کروں گا۔ دھمکی سے کام چل جائے تو بہتر ورنہ اپنا مقدمہ حاکم کے پاس لے جائے اور اپنے دعوی پر گواہ قائم کر دے تا کہ حاکم اسے امانت واپس کرا دے۔

(۳) تو امانت ایسے لوگوں کے پاس رکھ کر وہیں کھڑا رہ اور جلدی ہی لوٹا لے تو وہ تمہیں واپس کر دیں گے اگر تو نے دیر کی اور وہاں سے واپس لوٹ آیا تو تجھے وہ امانت واپس نہیں کریں گے۔ (خازن)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ و مدارک:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تفسیر مدارک التنزیل المعروف بالنسفی کے مطابق ہے۔

(الا ما دمت علیه قائما) الا مدة دوامک علیه یا صاحب الحق قائما علی رأسه ملازما له یؤده"

یعنی مطلب یہ ہوا کہ بعض اہل کتاب کے پاس اگر تم نے ایک دینار امانت رکھ دیا تو تمیں ادا نہیں کریں گے سوائے اس کے کہ اے صاحب حق تم ان کے سر پر کھڑے رہو، انہیں لازم پکڑے رہو، انکا پیچھا نہ چھوڑو تو وہ تمہیں تمہاری امانت ادا کریں گے، اگر تم نے انہیں یوں ہی چھوڑ دیا کہ یہ خود ہی ادا کر دیں گے تو وہ ادا نہیں کریں گے۔

آیئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو ایک مرتبہ پھر دیکھیں اور تفسیر مدارک کو پھر دیکھیں تو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تفسیر مدارک کے مطابق خوب ترین با محاورہ ترجمہ نظر آئے گا۔ (اور ان میں سے کوئی وہ ہیں کہ اگر ایک اشرفی اس کے پاس امانت رکھے تو وہ تجھے پھیر کر نہ دے گا مگر تو اس کے سر پر کھڑا رہے" (کنز الایمان)

﴿ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ﴾

"یہ بیشک اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی راہ (پکڑ کی راہ)"

بعض اہل کتاب جو امانت میں خیانت کر لیتے تھے وہ اس پر دلیل یہ دیتے تھے کہ ہم ان ان پڑھ لوگوں کی خیانت کر لیں تو ہمیں کوئی گرفت (پکڑ) نہیں ہوگی۔ ان کا یہ کہنا ہمیں کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ اس کے چند مطالب ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) یہود اپنے دین میں سخت شدت رکھتے تھے، ان کا عقیدہ یہ تھا "یحل قتل المخالف ویحل اخذ ماله بای طریق کان" کہ مخالف کو قتل کرنا حلال ہے اور اس کا مال جس طرح بھی حاصل کر لو وہ حلال ہے، مخالف کا مال حاصل کرنے کے لئے حلال طریقے کی ضرورت نہیں۔

وروی فی الخبر انه لما نزلت هذه الأیة قال ﷺ "کذب اعداء الله مامن شیء کان فی الجاهلیة الا وهو تحت قدمی الا الامانة فانها مؤداة الی البر والفاجر"

روایت بیان کی گئی ہے کہ جب یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے دشمن جھوٹے

ہیں، زمانہ جاہلیت کی کوئی چیز نہیں مگر وہ میرے قدموں کے نیچے ہے (یعنی زمانہ جاہلیت کے تمام رسم ورواج، طور طریقے سب میری شریعت نے ختم کر دیئے) سواء امانت کے وہ ادا کی جائے خواہ مال امانت رکھنے والا نیک ہو یا برا۔

(۲) دوسری وجہ ''یہود کے یہ کہنے کی کہ ہم ان پڑھوں کا مال کھاتے رہیں تو ہم پر کوئی مؤاخذہ (پکڑ) نہیں'' یہ تھی کہ وہ یوں کہہ رہے تھے ''نحن ابناء الله واحباؤه'' والخلق لناعبيد فلاسبيل لاحد علينا اذا اكلنا اموال عبيدنا'' کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں (معاذ اللہ) اور مخلوق ہماری غلام ہے، کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم کسی کا مال کھالیں تو وہ ہم سے پوچھیں کیونکہ ہم جس کا مال بھی کھائیں گے وہ ہمارا غلام ہوگا، غلام کا مال آقا کو کھانا جائز ہے۔

(۳) تیسری وجہ ان کے قول کی یہ تھی کہ وہ معاذ اللہ اسلام لانے والوں کو مرتد سمجھ رہے تھے، کہ انہوں نے دین کو چھوڑ دیا ہے، لھذا دین کو چھوڑ دینے والے کا مال حلال ہے، خواہ جس طرح بھی اس کا مال کھالیا جائے۔ (ماخوذ از کبیر)

راہ کی نفی کا مطلب:

ان کا یہ کہنا ''نہیں ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی راہ'' اس کا یہ مطلب ہے ''نفی السبيل المراد منه نفي القدرة على المطالبة والالزام'' ''ہم پر کوئی راہ نہیں'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ گویا کہ یوں کہہ رہے تھے کہ ہم جب ان لوگوں کا مال لے لیں تو یہ ہم سے مطالبہ کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتے، اور نہ ہی یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم پر ہمارا مال دینا لازم ہے۔ (از کبیر)

ہمیں کوئی عذاب دینے والا نہیں، ہماری کوئی گرفت نہیں کرسکتا، ہمارا کوئی مؤاخذہ نہیں کرسکتا۔

﴿وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾

''اور وہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ حالانکہ وہ جانتے بھی ہیں''

ان الفاظ مبارکہ کے چند مطالب ہیں۔

✿ ''ایک مطلب اس کا یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں تو راۃ میں مذکور ہے کہ مخالف کے مال میں خیانت کر لینا جائز ہے'' ان کا یہ قول سراسر جھوٹ پر مبنی ہے، ''اور وہ جانتے بھی تھے کہ ہم جھوٹے ہیں'' ''ومن كان كذلك كانت خيانة اعظم وجرمه افحش'' جو شخص اس طرح ہو اس میں بہت بڑی خیانت پائی جاتی ہے اور وہ بہت بڑا مجرم ہوتا ہے۔

✿ "الثانی انهم یعلمون کون الخیانة محرمة" دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ جانتے بھی تھے کہ خیانت حرام ہے، پھر وہ یہ کہہ رہے تھے کہ حلال ہے، رب تعالیٰ ہم سے کوئی مؤاخذہ نہیں کرے گا، یہ ان کا کہنا اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھنا ہی تھا۔

✿ "الثالث انهم یعلمون ما علی الخائن من الاثم" اس کا تیسرا مطلب یہ ہے کہ وہ جانتے تھے کہ خیانت کرنے والے پر کتنا عظیم گناہ ہے، لیکن یہ جاننے کہ باوجود وہ کہہ رہے تھے کہ یہ جائز ہے کہ مخالف کا مال خیانت کر کے کھالیا، اس کی ہمیں رب تعالیٰ نے اجازت دے رکھی ہے، یہ ان کا کہنا سراسر اللہ تعالیٰ پر جھوٹا افتراء باندھنا تھا۔
(ماخوذ از کبیر بوضاحت)

یہود کا عجیب قول یا احمقانہ قول یہ بھی تھا کہ وہ یہ کہہ رہے تھے کہ تمام مال ہمارے تھے، عرب کے لوگوں نے ہم پر ظلم کر کے ہم سے مال چھین لیا، اس لئے ہم پر کوئی گناہ نہیں کہ ہم اپنا مال ان سے لے لیں خواہ خیانت کر کے ہی کیوں نہ لے لیں۔

گذشته سے پیوسته : ابن ابی حاتم نے مالک بن دینار سے عجیب وغریب بات دینار کو دینار کہنے کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے یوں بیان فرمائی۔

انما سمی الدینار دینار الانة "دین و نار" ومعناه ان من اخذه بحقه فهو دینه ومن اخذه بغیر حقه فهو نار"

دینار کو دینار کہنے کی وجہ یہ ہے "دین" اور "نار" سے مرکب ہے، جو شخص جائز طریقے سے مال حاصل کرے تو اس کے لئے یہ دین ہے اور جو ناجائز طریقے سے حاصل کرے اس کے لئے یہ "نار" (آگ) ہے۔ (روح المعانی)

امانت کے متعلق احادیث مبارکہ:

✿ **وعن انس قال قلماخطبنارسول الله ﷺالا قال لا ایما ن لمن لاامانةله ولا دین لمن لا عهد له"**
(رواه البهیقی فی شعیب الایمان، مشکوة کتاب الایمان)

حضرت انس فرماتے ہیں بہت کم ہی آپ نے ہمیں خطبہ دیا ہوگا جس میں یہ ارشاد فرمایا ہوگا "اس شخص کا (کامل) ایمان نہیں جسے امانت کا پاس نہیں، اور اس کا دین (پریقین) نہیں جو وعدہ پورا نہیں کرتا۔

وضاحت حدیث:

" قلما " کے دو مطلب ہیں ایک تو یہ کہ "ما" مصدریہ ہو، اب اس صورت میں معنی یہ ہوگا "قل خطبة

خطبنا " کم ہی آپ نے ہمیں خطبہ دیا" جس میں یہ نہ کہا ہوالخ" اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ "ما" کافہ ہو، اور وہ نفی میں استعمال ہوتا ہے اور اس پر استثناء دلالت کرتا ہے، اب معنی یہ ہوگیا "ما وعظنا الا قال فیھا لا ایمان لمن لا امانۃ لہ " الخ آپ نے ہمیں کوئی نصیحت نہیں فرمائی مگر یہ کہ اس میں فرمایا اس شخص کا ایمان (کامل) نہیں جسے امانت کا پاس نہیں"

(لا ایمان) ای علی وجہ الکمال (لمن لا امانۃ لہ) فی النفس والاھل والمال وقیل فیما استؤمن علیہ من حقوق اللہ وحقوق العباد التی کلف بھا"

حدیث شریف میں امانت کا وسیع تر مفہوم لیا گیا ہے" آپ کے ارشاد گرامی" لا ایمان لمن لا امانۃ لہ" کا مطلب یہ ہے کہ "اسے کامل ایمان حاصل نہیں جو اپنے نفس اور اہل اور مال میں خیانت کا لحاظ نہیں کرتا، جس شخص کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کا مکلّف بنایا گیا ہے، اسے چاہیے کہ وہ ان کو پورا کرے۔

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس وسیع مفہوم کی وضاحت کررہا ہے۔

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا﴾ (سورۃ الاحزاب آیہ نمبر ۷۲)

بے شک ہم نے بامانت پیش فرمائی آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر تو انہوں نے اس کے اٹھانے کا انکار کیا اور اس سے ڈر گئے، اور آدمی نے اٹھالی، بے شک وہ اپنی جان کو مشقت میں ڈالنے والا بڑا نادان ہے۔

صدر الافاضل مولنا نعیم الدین مراد آبادی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں، حضرت ابن عباس ﷺ نے فرمایا کہ امانت سے مراد طاقت وفرائض ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر پیش کیا انہیں کو آسمانوں، زمینوں، پہاڑوں پر پیش کیا تھا کہ اگر وہ انہیں ادا کریں گے تو ثواب دیئے جائیں گے، نہ ادا کریں گے تو عذاب کئے جائیں گے، حضرت ابن مسعود ﷺ نے فرمایا کہ امانت نمازیں ادا کرنا، زکوۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا، خانہ کعبہ کا حج، سچ بولنا، ناپ اور تول میں اور لوگوں کی دولتیوں میں عدل کرنا۔

بعضوں نے کہا کہ امانت سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن کا حکم دیا گیا اور جن کی ممانعت کی گئی، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے فرمایا کہ تمام اعضاء کان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ سب امانت ہیں، اس کا ایمان ہی کیا جو امانت دار نہ ہو، اور حضرت ابن عباس ﷺ نے فرمایا کہ امانت سے مراد لوگوں کی ودیعتیں اور عہدوں کا پورا کرنا ہے، تو ہر مؤمن پر فرض ہے کہ نہ کسی مؤمن کی خیانت کرے، نہ کافر معاہد کی، نہ قلیل کی نہ کثیر کی، (آیۃ کریمہ کی مکمل تفسیر ان

شاء اللہ اپنی جگہ پر ہی آئے گی)

(ولا دین)علی طریق الیقین (لمن لا عهد له)بان غدر فی العهد والیمین ، "ولا دین لمن لا عهد له"

(اسے دین حاصل نہیں جسے وعدہ کا پاس نہیں)یعنی اس شخص کو دین پر کامل یقین حاصل نہیں جو وعدہ کر کے پھر جائے،اور قسم اٹھا کر پوری نہ کرے۔

تنبیہ : "لا ایمان لمن لا امانة له" میں اگر چہ بظاہر طور پر مطلقا ایمان کی نفی سمجھ آ رہی ہے لیکن اس کی وضاحت علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ ان الفاظ سے کرتے ہیں۔

" هذاالکلام وامثاله وعیدلایراد به الانقلاع بل الزجر ونفی الفضیلة دون الحقیقة وقیل یحتمل ان یراد به الحقیقة فان من اعتاد هذه الامور "

یہ کلام ہو یا اس کی مثل اور کلام ہو جس میں کسی عمل کے چھوڑنے پر وعید فرمائی گئی، بظاہر ایمان کی نفی ہو رہی ہو،اس میں حقیقت ایمان کی نفی نہیں، بلکہ زجر پائی گئی ہے،اور فضیلت کی نفی ہے یعنی نفی کمال ایمان کی ہے،نفی اصل ایمان کی نہیں۔

ہاں البتہ ایک شخص ان امور کی عادت بنا لے،امانت میں خیانت کرنے کو جائز مانے،جھوٹ کو جائز مانے، اور وعدہ توڑنے کو جائز مانے تو وہ حقیقی طور پر کافر ہے۔اسی حدیث کی شرح مرقاۃ میں طبرانی کی معجم کبیر میں بیان کردہ روایت کو ذکر کیا،جس میں مزید چیزوں کا ذکر ہے،فائدہ کے لئے اسے ذکر کیا جا رہا ہے۔

- **عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺلا ایمان لمن لا امانة له ولا دین لمن لا عهد له والذی نفس محمد بیده لا یستقیم دین عبد حتی یستقیم لسانه ولا یستقیم له حتی یستقیم قلبه ولا یدخل الجنة من لا یأمن جاره بوائقة فقیل ما البو ائق یا رسول الله قال غشمه وظلمه وایما رجل اصاب مالا من حرام وانفق منه لم یبارک له فیه وان تصدق منه لم یقبل منه وما بقی فزاده الی النار الا ان الخبیث لا یکفر الخبیث ولکن الطیب یکفر "** (رواه الطبرانی فی معجمه الکبیر)

حضرت ابن مسعود ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس شخص کا ایمان (کامل) نہیں جسے امانت کا پاس نہیں،اور اس شخص کا دین (پر یقین) نہیں جسے وعدہ کا پاس نہیں،قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے اس شخص کا دین درست نہیں جس کی زبان درست نہیں،اور اس شخص کی زبان درست نہیں جس کا دل درست نہیں،اور وہ شخص (ابتدائی طور پر) جنت میں داخل نہیں ہو

گا جس کے پڑوسی اس کے بوائق سے محفوظ نہ ہوئے، آپ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ ﷺ "بوائق" سے مراد کیا ہے، آپ نے فرمایا اس کے مظالم اور بے جا زیادتیاں ہے۔

یعنی جس شخص کے مظالم اور بے جا زیادتیوں سے اس کے پڑوسی محفوظ نہ ہوئے تو وہ ابتدائی طور پر جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ اور جس شخص نے حرام مال حاصل کیا اور اسے خرچ کیا اس شخص کو اس مال میں کوئی برکت حاصل نہیں ہوگی، اور اگر اس نے وہ حرام مال صدقہ کیا تو اس سے وہ قبول نہیں کیا جائے گا، اس سے جو مال بچ گیا وہ آگ میں لے جانے کا ذریعہ ہوگا۔ خبردار ناپاک لوگ ناپاک چیز کا انکار نہیں کرتے، لیکن پاک لوگ ناپاک (اور حرام) چیزوں کا انکار کرتے ہیں، یعنی ان سے اجتناب کرتے ہیں۔ (وضاحت حدیث از مرقاۃ ج اصفحہ نمبر ۱۰۹)

❁ **عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ آیة المنافق ثلاث زادمسلم وان صام وصلی وزعم انه مسلم ثم اتفقا اذا حدث کذب واذا وعد اخلف واذا ائتمن خان.**

(مشکوۃ باب علامات النفاق)

حضرت ابوھریرہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا منافق کی تین علامتیں ہیں، مسلم میں یہ الفاظ زائد ہیں اگر چہ اس نے روزہ رکھا ہو اور نماز ادا کی ہو، یعنی وہ اپنے آپ کو مسلمان ہونے کا دعوہ بھی کرے، پھر بخاری اور مسلم کے آگے الفاظ ایک ہی ہیں، جن کا مطلب یہ ہے جب کلام کرے جھوٹ بولے اور جب وعدہ کرے تو خلاف کرے، اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے۔

وضاحت حدیث:

اس حدیث شریف میں پہلے اور آخری جملے بخاری اور مسلم کے اتفاقی ہیں درمیان میں الفاظ "وان صام وصلی" زائد ہیں۔

"**آیة المنافق**" کا مطلب یہ ہے کہ منافق کی علامت جو اس کی بری نیت اور فساد پر مبنی افعال پر دلالت کرتی ہے، وہ تین ہیں:

(اصل النفاق من یظهر خلاف ما یضمر ثم غلب علی من یظهر الاسلام ویبطن الکفر)

نفاق کا اصل میں معنی یہ ہے کہ جو وہ دل رکھتا ہے (فساد اور برے عقائد وغیرہ) ظاہرا اعمال اس کے خلاف ہوں، یعنی ظاہری طور پر اس کے عمل بہتر ہوں اگر چہ ان میں پوشیدہ ہو، لیکن نفاق کا غالب استعمال اس میں ہو رہا ہے کہ اسلام کو ظاہر کرے اور کفر کو پوشیدہ رکھے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

حدیث شریف میں بظاہر وہم ہوتا ہے کہ "آیۃ" مفرد ہے، اور "ثـــلاث" جمع پر دلالت کر رہا ہے تو ان دونوں میں مطابقت کیسے؟ ''نشانی منافقت کی تین ہیں'' کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ "آیۃ" مفرد ذکر کر کے مراد جنس آیۃ لیا گیا ہے، اب معنی یہ ہوگا "کـل واحـد منهـا آیة " ہر ایک ان میں سے علامت ہے، اور دوسرا احتمال یہ بھی ہے "او ان العلامة انما تحصل باجتماع الثلاث " کہ تینوں مل کر علامت نفاق ہوں۔ پہلا معنی زیادہ معتبر ہے کہ ہر ایک ایک علیحدہ علیحدہ علامت ہے، اس معنی کو صحیح ابن عوانہ کی حدیث سے تائید حاصل ہے جس میں یوں ذکر ہے "علامات المنافق ثلاث "منافق کی علامتیں تین ہیں۔

اعتراض : حدیث پاک سے ظاہر طور پر یہ سمجھ آ رہا ہے کہ تین میں حصر پائی گئی ہے، یعنی منافقت کی تین علامتوں میں اسے بند کیا گیا ہے کہ کوئی چوتھی علامت نہیں، حالانکہ دوسری حدیث میں چار علامات کا ذکر کیا گیا ہے، تو ان میں کس طرح تطبیق دی جائے گی؟

جواب : مسلم شریف کی ایک روایت میں جو علاء بن عبدالرحمٰن نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی اس میں حصر نہیں پائی گئی، اس کے الفاظ یہ ہیں "من عـلامة المنافق ثلاث "منافق کی علامتوں میں سے تین علامتیں یہ ہیں الخ۔

"فیکون قد اخبر ببعض العلامات فی وقت وبعضها فی وقت آخر"

نبی کریم ﷺ نے کسی وقت میں منافقت کی بعض علامتوں کا ذکر فرمایا کہ اس وقت ان کے ذکر کی ہی ضرورت تھی، اور کسی دوسرے وقت میں دوسری علامات کو ضرورت کے پیش نظر بیان فرما دیا، لھذا دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں۔

مسلم شریف میں جو الفاظ زائد مذکور ہیں "وان صام وصلی وزعم انه مسلم "ان کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وہ روزہ رکھے اور نماز ادا کرے اور دعوی کرے کہ میں کامل مسلمان ہوں، پھر بھی اس میں تین خصلتیں اس کی منافقت پر دلالت کرتی ہیں۔

"زعم" کا معنی "ادعی" کیا گیا، اور "انـــه مسـلم " میں تنوین کو تعظیم کے لئے لیا گیا ہے اسی لئے اس کا معنی کیا گیا ہے "انـه مسـلم ای کامل " اب راقم کے ترجمہ کو دیکھیں ''اور دعوی کرے کہ میں کامل مسلمان ہوں'' تو مرقاۃ کے مطابق پائیں گے، اور طلباء کرام کو بخوبی علم ہے کہ کہیں غائب کے صیغوں سے مراد تکلم ہوتا ہے، اسی لئے راقم نے ترجمہ تکلم کا کیا ہے۔

(اذا حدث کذب) منافقت کی ایک علامت یہ ہے کہ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، "وهو اقبح الثلاثة" تین علامتوں میں سے بری علامت جھوٹ بولنا ہے۔

"**واذا وعد اخلف**" (اور جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے) یہ منافقت کی دوسری علامت ہے، مستقبل میں اچھا کام کرنے کی خبر دینا "وعد " ہے۔"اذ وعد یغلب فی الخیر واو عد فی الشر""وعد" کا لفظ غالباً خیر کے لئے استعمال ہوتا، اور "اوعـد "کا لفظ زیادہ طور پر شر کیلئے استعمال ہوتا ہے، یعنی دھمکی دینا اسے وعید کہا جاتا ہے، مہربانی کرنے کو وعد کہا جاتا ہے، اگر چہ علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے یوں ارشاد فرمایا "الخلف فی الوعید من مکارم الا خلاق "وعید (دھمکی) کی مخالفت اچھے اخلاق کا اظہار ہے، یہ علامت نفاق نہیں۔کسی شاعر نے کہا:

"وانی اذا او عدته او وعدته لمخلف ایعادی ومنجز موعدی"

بے شک میں جب کسی کو وعید کروں (دھمکی دوں) یا وعدہ کروں، تو وعید کی میں خلاف ورزی کر لیتا ہوں اور وعدہ پورا کرتا ہوں۔

لیکن راقم کا اس میں موقف یہ ہے کہ صراحۃً جھوٹ منع ہے خواہ وعد میں ہو یا وعید میں، بلکہ شروع میں ہی ایسے الفاظ کو شامل کیا جائے کہ بغیر جھوٹ کے وعید کو چھوڑ دے۔جیسے ہم طلباء کو کہتے ہیں اگر تم نے مدرسہ سے بہت غیر حاضریاں کیں، اسباق یاد نہ کیے تو ہم تمہیں مدرسہ سے نکال دیں گے، تاہم ہماری طرف سے پوری کوشش ہوگی کہ ہم کوئی سخت قدم نہ اٹھائیں آپ کا نقصان نہ ہو، لیکن آپ بھی اپنے نفع ونقصان کو اپنے اپنے ذہنوں میں رکھتے ہوئے، اچھے اخلاق سے کام لیں۔اس قسم کے جملوں سے "وعید " سے نکلنے کی پہلے ہی راہ رکھ دی گئی ہے۔

آہ! ہم کتنے بے قدر ہیں:

الخلف فی الوعید (وعید کی خلاف ورزی) کا مسئلہ استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا غلام رسول رضوی رحمہ اللہ (شیخ الحدیث فیصل آباد) نے مقدمہ مسلم الثبوت سے عربی حاشیہ میں بہت خوبصورت انداز میں حل فرمایا ہے، آپ کا عربی حاشیہ مختصر لیکن جامع و مانع اور کتاب کو حل کرنے میں بہت آسان ہے، اس حاشیہ کو پڑھ کر بار بار دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالی اس کے محشی کے مزار پر انوار پر ان گنت رحمتیں نازل فرمائے۔

لیکن مقام افسوس یہ ہے کہ تنظیم المدارس کے کورس سے مسلم الثبوت کو نکال دیا گیا ہے جس کی وجہ سے عظیم شخصیت کا عظیم کام بھی علماء کرام اور طلباء کرام کی نظروں سے غائب ہو گیا۔راقم بھی اہلسنت و جماعت کے طلباء کرام

کے فائدہ کے لئے دن رات ایک کئے ہوئے، صحت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دنیاوی کاموں سے مکمل اجتناب کرتے ہوئے حواشی تیار کررہا ہے، تلخیص المفتاح، نورالایضاح، قدوری، کنزالدقائق کے عربی حواشی طبع ہوچکے ہیں، ھدایہ اولین کے حاشیہ کا کام جاری ہے، جزء اول ختم ہوچکی ہے، جزء ثانی کا حاشیہ ترتیب دے رہا ہوں، دعا ہے اللہ تعالی کی مہربانی سے یہ کتب تنظیم المدارس میں جاری رہیں تاکہ طلباء کرام محشی کے لئے دعاء فرماتے رہیں۔ اگرچہ راقم کے اردو حواشی مراح الارواح، میزان الصرف، سراجی کے بھی طبع ہوچکے ہیں، لیکن اردو حواشی کوئی معیاری کام نہیں۔

سؤال : جھوٹ بولنا اور وعدہ کے خلاف بظاہر ایک ہی صورت نظر آتی ہے، دونوں میں جھوٹ بولنا لازم آتا ہے، پھر وعدہ کی خلاف ورزی کو علیحدہ ذکر کیوں کیا؟

جواب : "ان الاخلاف قد یکون بالفعل وھو غیر الکذب الذی ھو لازم التحدیث ولیس فیہ ما یدل علی وجوب الوفاء بالوعد"

وعدہ کی خلاف ورزی کبھی فعل (عمل) سے بھی ہوتی ہے ضروری نہیں کہ زبان سے ہی وعدہ خلافی ہو، لیکن جھوٹ کا تعلق زبان سے ہے کیونکہ جھوٹی بات پر جھوٹ کا اطلاق ہے وعدہ کے خلاف فعل کو جھوٹ سے تعبیر نہیں کیا جاتا۔

اور دوسرا فرق یہ ہے کہ جھوٹ کے لئے ضروری نہیں اس سے پہلے وعدہ بھی پایا جائے، اور وعدہ خلافی میں یقیناً پہلے وعدہ پایا جاتا ہے۔ "واذا ائتمن خان" اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے وہ اس میں خیانت کرے، یعنی منافقت کی تیسری علامت امانت مین خیانت کرنا ہے۔

"وحق الامانۃ ان تؤدی الی اھلھا فالخیانۃ مخالفۃ لھا"

امانت کا حق یہ ہے کہ حقدار کو وہ ادا کردی جائے، حقدار کو امانت نہ دینا، امانت میں خیانت کرنا ہے جو علامت منافقت ہے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"ائتمن" باب افتعال ہے اور ماضی مجہول ہے، بعض روایات "اتمن" بھی آیا ہوا ہے۔ جو اصل میں "ائتمن" ہی ہے، ہمزہ کو واؤ بنایا گیا، اور واؤ کو تاء سے بدلا گیا اور تاء کو تاء میں ادغام کیا گیا "اتمن" میں تاء مشدد ہے۔

سؤال: "فان قیل ھذاالحدیث مشکل من حیث ان ھذہ الخصال قد توجد فی المسلم المجمع علی عدم الحکم بکفرہ"

یہاں سؤال یہ ہے کہ یہ حدیث بظاہر مشکل نظر آتی ہے کہ جن تین خصلتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی مسلمانوں میں بھی پائی جاتی ہیں، حالانکہ اجماع امت اس پر ہے کہ مسلمان میں اگر یہ عیوب پائے جائیں تو اسے کافر نہیں کہا جائے گا۔

جواب: "**قلنا اللام فی المنافق اما تکون للجنس فھو اما علی التشبیہ لنفاق العمل الذی لاینافی الاسلام او ان المراد الا عتیاد**"

اس سؤال کا جواب یہ ہے کہ "آیة المنافق" میں المنافق پر الف لام جنسی ہے، اور یہ بیان کیا گیا ہے، کہ یہ علامتیں جس میں پائی جائیں گی وہ منافق کے مشابہ ہے، نفاق عملی اعلام کے منافی نہیں، کیونکہ ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے، البتہ نفاق قلبی، اعتقادی ایمان کے منافی ہے، کیونکہ دونوں کا ایک جگہ جمع ہونا ممکن نہیں، یعنی جس کا عقیدہ بھی منافقوں والا ہو وہ حقیقی منافق ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو ان خصلتوں کو عادت بنالے، اور ان پر بار بار عمل کرے، جب ان کی کوئی پرواہ نہیں کرے گا تو ان کو جائز سمجھنے لگے گا، جب جائز سمجھے گا تو کافر ہو جائے گا، اب اس پر حقیقی منافقت کا اطلاق بھی جائز ہو جائے گا (وضاحت حدیث از مرقاۃ ج نمبر ا صفحہ ۱۲۶)

❁ **وعن عبداللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ ﷺ اربع من کن فیہ منافقا خالصا ومن کانت فیہ خصلة منھن کانت فیہ خصلة من النفاق حتی ید عھا اذا ائتمن خان واذا حدث کذب واذا عاھد غدر واذا خاصم فجر**" (رواہ البخاری و مسلم، مشکوۃ باب علامات النفاق)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چار (خصلتیں) جس میں پائی جائیں وہ شخص خالص منافق ہے، جس میں ایک خصلت پائی جائے اس میں منافقت پائی گئی یہاں تک کہ اسے چھوڑ دے (وہ چار یہ ہیں) جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے، اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے، اور جب وعدہ کرے تو اسے توڑ دے، اور جب جھگڑا کرے تو فجور سے کام لے (یعنی گالی نکالے)

وضاحت حدیث:

دونوں حدیثوں سے واضح ہوا کہ منافقت کی علامتیں پانچ ہیں اس لئے کہ "**واذا عاھد و غدر**" کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں ایک معنی "**نقض العھد ابتداء**" ابتدائی طور پر ہی وعدہ کو توڑ دے اور دوسرا معنی علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ بیان کیا ہے "**اذا خالف ترک الوفاء**" جب قسم اٹھالے تو اسے پورا نہ کرے۔

راقم کے نزدیک "واذا وعد اخلف" عام ہے، جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے" یہ ہر قسم کے وعدہ کو شامل ہے، اور "واذا عاهد غدر" خاص ہو جائے کیونکہ "غدر" کا اطلاق زیادہ طور پر جنگی وعدہ کو توڑنے پر بولا جاتا ہے، کہ جب جنگ میں وعدہ کرے کہ ہم تم پر حملہ نہیں کریں گے تو پھر حملہ کر دے وعدہ توڑ دے تو یہ علامت منافقت ہے۔

حدیث شریف میں جو یہ ذکر ہے کہ جن میں ایک خصلت پائی گئی تو وہ منافقت کی خصلت ہوگی اس کی وضاحت تو پہلے جن دو حدیثوں کا ذکر کیا گیا ہے ان سے سمجھ آ گئی۔ البتہ آپ کا ارشاد "اربع من کن فیه منافقا خالصا" "جس میں چار خصلتیں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے" اس میں مشکل یہ درپیش آ رہی ہے کہ چار عیوب جب پائے جائیں تو پھر بھی وہ گنہگار ہوگا، کافر نہیں ہوگا، آپ کے ارشاد گرامی میں "خالص منافق ہونے کا" کیا مطلب ہے؟ اس کے چند جواب دیئے گئے ہیں کہ یہ حدیث ظاہر پر مبنی نہیں، بلکہ اس کی تاویلات پائی گئی ہیں۔ اس کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے۔

"من اجتمعت فيه هذه الخصال واستمرت فبالحرى ان يكون منافقا"

جس شخص میں یہ چار خصلتیں پائی جائیں اور وہ ان پر قائم رہے اور ان کی عادت بنا لے تو لائق یہ ہے کہ وہ خالص منافق ہو جائے، کیونکہ ہمیشہ کی عادت ان افعال کے جواز کی طرف پہنچا دے گی جو یقیناً کفر ہے، دعوی ایمان کا اور حرام کاموں جائز سمجھنا خالص منافقت ہی ہے۔

"وقيل يحتمل ان يكون المراد كالمنافق بحذف اداة التشبيه مثل زيد اسد"

اور دوسرا معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ حدیث شریف میں حرف تشبیہ محذوف ہے، یعنی حدیث شریف معنوی لحاظ پر اس طرح ہوگی "اربع من كن فيه كان كالمنافق الخالص" جس میں چار خصلتیں پائی گئی وہ خالص منافق کی طرح ہے، طلباء کرام سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ حرف تشبیہ عام طور پر محذوف ہوتا رہتا ہے، عام محاورہ عرب میں "زيد اسد" استعمال ہوتا ہے، جس کا معنی ہوتا ہے "زيد كالاسد" "زید شیر کی طرح ہے، یہ معنی نہیں کہ زید حقیقی طور پر شیر ہے۔

ويحتمل ان يكون هذا مختصا باهل زمانه فانه عليه الصلوة والسلام عرف بنور الوحى بواطن احوالهم وميز بين من آمن به صدقا ومن اذعن له نفاقا"

اور تیسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے زمانہ کے چند لوگوں کا تذکرہ کیا ہو اور آپ کو نور وحی سے ان کے باطن احوال پر مطلع فرما دیا گیا، جن کے اعتقادات سے بھی آپ کو باخبر کر دیا گیا، آپ کو معلوم تھا کہ سچے

مسلمان کون ہیں، اور خالص منافق کون ہیں، آپ نے ان کے درمیان فرق کرنے کے لئے یہ ارشاد فرمایا، البتہ خالص منافقوں کے نام ذکر نہیں فرمائے کہ ہوسکتا ہے کہ توبہ کرلیں، ان کو لوگوں کے سامنے رسواء نہ کیا جائے۔

"ولان ترک التصریح اوقع فی النصیحة وادل علی الشفقة واجلب علی الدعوة الی الایمان وابعد عن النفور والمخاصمة والالتحاق باالمخالفین"

صراحۃً (واضح طور پر) کسی کی برائی کا نہ ذکر کرنا نصیحت کے لئے بہت نفع مند ہے، اور شفقت پر دلالت کرتا ہے، اور ایمان کی دعوت کی طرف کھینچنے میں مفید ہے، اور کسی کو نفرت دلانے اور جھگڑا پیدا کرنے سے یہ طریقہ دور ہے، اور مخالفین کو اپنے ساتھ ملانے میں فائدہ مند ہے، "واذا خاصم فجر" کا وسیع مفہوم بیان کیا گیا ہے، ایک معنی تو ذکر کردیا گیا ہے "واذا خاصم فجر ای شتم" اور جب جھگڑا کرے تو گالی دے لیکن ایک معنی یہ بیان کیا گیا ہے "ورمی بالاشیاء القبیحة" اور بری چیزوں کو کسی طرف منسوب کرنا، یعنی کسی کو ناحق طور پر بری تہمت لگانا، کسی کی طرف برائی کو منسوب کرنا، کسی پر بدگمانی کرنا، اور کسی کی غیبت کرنا وغیرہ سب کو یہ شامل ہے، یعنی یہ سب چیزیں منافقت کی علامت ہیں، آپ کا یہ ارشاد "جوامع الکلم" صفت میں آتا ہے کہ الفاظ مختصر ہوں اور مطالب زیادہ ہوں۔ (وضاحت حدیث ماخوذ از کبیر مرقاۃ ج نمبر ا صفحہ نمبر ۱۲۸)

فائدہ جلیلہ : حضرت یوسف علیہ السلام کی بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے اپنے باپ سے جھوٹ بولا، وعدہ خلافی کی لیکن یہ گناہ کے کام تھے، کفر نہیں، وہ چونکہ نبی نہیں تھے اسلئے ان سے گناہ سرزد ہونا ممکن تھا، اسی لئے انہوں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا:

﴿قَالُوْا يٰاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا اِنَّا كُنَّا خَاطِئِيْنَ﴾ (سورۂ یوسف، آیۃ نمبر ۹۷)

بولے اے ہمارے باپ ہمارے گناہوں کی معافی مانگئے بے شک ہم خطاوار ہیں۔

"ان الانبیاء معصومون قبل النبوة وبعدها عن کبائر الذنوب وصغائرها ولوسهوا علی ما هو الحق عند المحققین" (ماخوذ از مرقاۃ ج نمبر ا صفحہ نمبر ۱۲۷)

البتہ انبیاء کرام نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد چھوٹے اور بڑے گناہوں سے محفوظ رہتے ہیں ان سے بھول کر بھی کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا، محققین کا یہی مذہب ہے۔

نجوم الفرقان کے دوسرے حصہ میں حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر میں تفصیل دیکھئے۔

❁ عن ابن عمر ان النبی ﷺ قال ان اللہ عزوجل اذا اراد ان یهلک عبدا نزع منه الحیاء فاذا نزع منه الحیاء لم تلقه الا مقیتا ممقتا فاذا لم تلقه الا مقیتا ممقتا نزعت منه

الامانةفاذانزعت منه الامانةلم تلقه الاخائنامخونافاذا لم تلقه الاخائنامخونا نزعت منه الرحمةفاذانزعت منه الرحمةلم تلقه الارجيماملعنافاذالم تلقه الارجيماملعنانزعت منه ربقة الاسلام " (رواه ابن ماجه)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا، تحقیق اللہ تعالیٰ جب کسی کو ہلاک کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اس سے حیاء کو دور کر دیتا ہے، جب حیاء کو اس سے نکال دیا گیا تو تم اس کو نہیں پاؤ گے سوائے اس کے کہ وہ شدید قابل نفرت ہوگا، جب تم نے اسے نہ پایا سوائے شدید قابل نفرت کے تو اس سے امانت کو ہٹا دیا گیا، جس سے امانت کو ہٹا دیا گیا تو اسے نہیں پاؤ گے سوائے خائن ہونے کے اور خیانت میں شدید طور پر اسے مبتلاء پاؤ گے، جب تم کسی کو نہ پاؤ سوائے شدید خائن ہونے کے تو اس سے رحمت کو دور کر دیا گیا، جس سے رحمت کو دور کر دیا گیا اسے تم نہیں پاؤ گے سوائے راندے ہوئے لعنت کے مرتکب کے، جس کو تم نہ پاؤ سوائے راندے ہوئے ملعون کے اس (کی گردن) سے اسلام کا ڈورا (دھاگہ) اتار دیا گیا ہے۔ (منقول از قرطبی)

حدیث شریف کے ترجمہ سے واضح ہو گیا کہ جسے حیاء حاصل نہ ہو وہ قابل نفرت ہے، ہاں محبوب وہی جسے حیاء حاصل ہو، جو شخص قابل نفرت ہو وہ امین نہیں ہوگا بلکہ خیانت کرنے والا ہوگا، یعنی امین وہی ہوگا جو قابل محبت ہوگا، خیانت کرنے والا رحمت سے دور ہوگا، جسے رحمت ہی حاصل نہ ہو یقیناً رحمت سے دور قابل لعنت اور دربار خداوندی سے ہانکا ہوا ہوگا، ایسا شخص گویا کہ اسلام سے بہت دور ہوگا۔

ودیعت اور امانت میں فرق:

"الوديعةخاصة و الامانةعامةفان الوديعةهي المستحفظ قصداو الامانة هي الشيء الذي وقع في يده وان من غير قصدبان هبت الريح والقت ثوب انسان في حجرانسان "

ودیعت خاص ہے کیونکہ ودیعت میں خود اپنے ارادے سے کسی سے حفاظت طلب کی جاتی ہے کہ ہمارا یہ مال تم اپنی حفاظت میں رکھ لو، امانت عام ہے کیونکہ کسی شخص کا مال دوسرے کے ہاتھ میں آجائے تو وہ امانت ہی کہلائے گا جیسا کہ ہوا نے کوئی کپڑا اڑا کر کسی دوسرے کے پاس پہنچا دیا ہو۔

اسی طرح کسی سے کوئی چیز نفع اٹھانے کے لئے عاریة (مانگ کر) لی، وہ بھی امانت کے درجہ میں ہی ہے، اس کی کئی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ ہر ودیعت کو امانت ضرور کہہ لیا جائے گا، لیکن ہر امانت ودیعت نہیں، دینی مدارس کے طلباء کرام اپنی اصطلاح میں کہیں گے کہ ودیعت اور امانت میں نسبت عموم وخصوص مطلق کی پائی گئی ہے۔

ودیعت کے متعلق چند ضروری مسائل:

الودیعۃ امانۃ فی ید المودع اذا ھلکت یضمنھا "

جس کے پاس حفاظت کے لئے مال رکھا جائے اس کے پاس وہ مال امانت ہوتا ہے، امانت خود بخود ہلاک ہو جائے تو اس شخص پر کوئی ضمان لازم نہیں۔ جیسا کہ مکان گر گیا، مکان کو آگ لگ گئی، چوروں، ڈاکوؤں نے مال لے لیا، ان تمام صورتوں میں (مودع) جس کے پاس امانت رکھا گیا اس پر کوئی ضمان لازم نہیں ہے۔

"لقولہ ﷺ لیس علی المستعیر غیر المغل ضمان ولا علی المستودع غیر المغل ضمان "

اس پر دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جس نے عاریۃً کوئی چیز لی اس پر کوئی ضمان لازم نہیں سوائے اس کے کہ اس نے کوئی خیانت کی، اور جس کے پاس امانت رکھی گئی اس پر کوئی ضمان لازم نہیں سوائے خیانت کرنے کے، یعنی نفع اٹھانے کیلئے مانگ کر لے جانے والا، یا امین اگر خیانت کر لیں تو ان پر ضمان لازم نہیں۔ (ھدایۃ کتاب الودیعۃ)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

حدیث شریف میں جو لفظ "مغل" استعمال ہے یہ اغلال سے لیا ہوا ہے، "اغلال" ہر قسم کی خیانت پر بولا جاتا ہے، لیکن "غلول" صرف مال غنیمت کی خیانت پر بولا جاتا ہے۔ اور دوسری توجہ اس طرف کر لیں کہ حدیث شریف پر اعتراض کیا گیا ہے یہ حدیث مرفوع نہیں، تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے "واجیب بانہ مسند عن عبداللہ بن عمر عن النبی ﷺ" کہ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مسند ثابت ہے۔ (العنایۃ)

ضمان لازم نہ ہونے پر عقلی دلیل:

چونکہ لوگ اپنے کاروبار کے سلسلہ میں اپنا مال کسی کے پاس بطور امانت رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں، اگر مال کے خود ہلاک ہو جانے پر ضمان لازم آئے تو کوئی شخص اپنے پاس کسی کی امانت رکھنے کے لئے تیار نہیں ہوگا، اسی طرح لوگوں کے فائدہ والے کام معطل ہو کر رہ جائیں گے۔ (ھدایۃ)

امانت کی حفاظت کون کون کر سکتے ہیں؟

جس شخص کے پاس مال بطور امانت رکھا گیا ہے وہ خود اس مال کی حفاظت کرے یا اس کی زوجہ، یا اس کے عیال

حفاظت کریں تو مال ہلاک ہو جائے تو کوئی ضمان لازم نہیں آئے گی، اس لئے کہ ان کو حفاظت کا حق حاصل ہے۔ عیال میں اس کی زوجہ، اس کی اولاد، اس کے والدین اور اس کے گھر میں رہنے والا خادم جو ماہانہ تنخواہ لیتا ہو، یا سال بعد ایک مرتبہ ہی سال کی تنخواہ لیتا ہو، وہ خادم عیال میں داخل نہیں جو یومیہ (ہر دن کی) مزدوری لے لیتا ہے، اسی طرح شاگرد جو اپنے پاس رہیں اور ان پر اعتماد کیا جائے وہ بھی عیال میں داخل ہوتا ہے، قیمتی اشیاء کے سٹور کی چابیاں اسے ہی دے دی جاتی ہیں جس پر اعتماد ہو، اگر والدین یا اولاد کا خرچ تو اس کے ذمہ لازم ہے لیکن وہ اس کے گھر نہیں رہتے تو ان کو امانت والے مال کی حفاظت کا حق حاصل نہیں، کیونکہ مال امانت رکھنے والے نے اس شخص اور اس کے گھر پر اعتماد کیا ہے، اور اگر بڑا بیٹا یا بڑی بیٹی باپ کے گھر میں رہتے ہوں، ان کا خرچ باپ پر لازم نہیں، بلکہ وہ اپنا علیحدہ خرچ کرتے ہیں تو وہ بھی عیال میں داخل ہیں، ان کو بھی باپ کے پاس رکھی ہوئی امانت کا حق حاصل ہے۔ (هدایه، کفایة)

تنبیه : عیال کو امانت کی حفاظت کرنے کا حق اسی وقت دیا جا سکے گا جب غالب گمان یہ ہو کہ یہ خیانت کرنے والے نہیں "فان علم ذلک و حفظ بهم ضمن" اگر اس شخص کو معلوم ہو کہ میرے گھر کے افراد تو مال میں خیانت کر لیتے ہیں تو پھر بھی ان سے حفاظت کراتا ہے تو مال کے نقصان اسے ضمان دینا لازم آئے گا۔ (عناية)

فائده : اگر ایک شخص نے کسی کا مال اپنے گھر بطور امانت رکھا ہوا ہے، اس گھر کو آگ لگ گئی تو اس نے مال پڑوسی کو دے دیا یا اس نے حفاظت والا مال اپنے پاس کشتی میں رکھا ہوا تھا اسے کشتی کے غرق ہونے کا خطرہ ہوا اس نے مال ساتھ دوسری کشتی میں کسی کو دے دیا، وہ مال دوسرے شخص کے پاس ہلاک ہو جائے، اور اس کے پاس دو گواہ بھی ہوں کہ اس نے مال ہلاکت سے بچانے کیلئے دوسرے کو دیا تھا تو اس پر کوئی ضمان نہیں۔ (هدایه)

اگر گواہ نہ ہوں تو ضمان لازم آئے گی تا کہ لوگ بغیر کسی ثبوت کے جھوٹے دعوے نہ کر سکیں۔

مسئلہ ۱: اگر امانت رکھنے والے نے اپنا مال طلب کیا تو امین نے اسے مال نہیں دیا، حالانکہ وہ مال دینے پر قادر بھی تھا تو اس صورت میں اگر مال ہلاک ہو جائے تو اس پر ضمان لازم آئے گی، کیونکہ اس نے مال کو اپنے پاس روک کر حد سے تجاوز کیا۔ (هدایه)

مسئلہ ۲: اگر امین نے امانت والے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا لیا جسے جدا کرنا مشکل ہو گیا جیسا کہ گندم کے ساتھ گندم کو ملا لیا، جو کے ساتھ جو کو ملا لیا تو اس صورت میں ضمان لازم آئے گی، اگر مال خود مل گیا کہ بوریاں پھٹ گئیں اور امین کے دانے اور جس نے امانت رکھی اس کے دانے آپس میں مل گئے تو یہ دونوں اس غلہ میں شریک ہوں گے۔ (هدایه)

مسئلہ ۳: اگر امین امانت والے مال سے کچھ خرچ کرلیا، پھر اتنا ہی مال اس میں لوٹا دیا، اگر مال ہلاک ہوگیا تو تمام مال کی ضمان اس پر لازم آئے گی، اس لئے کہ غیر کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر یہ تجاوز کرنے والا بن گیا، گویا کہ اس نے مال خود ہلاک کیا، لہذا ضمان لازم ہے۔ (هدایه)

مسئلہ ۴: اگر کسی شخص کے پاس سواری امانت رکھی گئی وہ اس پر سوار ہوگیا، یا کپڑا رکھا گیا اس نے وہ پہن لیا، یا غلام رکھا گیا تو اس نے اس سے خدمت لے لی، یا ان چیزوں کو کسی دوسرے کے پاس امانت رکھ دیا، اگر ان چیزوں میں کوئی نقصان نہیں تو ضمان لازم نہیں آئے گا، اگرچہ امانت میں مال دار کی اجازت کے بغیر تصرف کرنے کی وجہ سے وہ شخص گنہگار ہوا۔ اور اگر ان تصرفات سے مال میں نقصان لازم آیا تو ضمان لازم آئے گی، کیونکہ اس نے تجاوز کیا ہے۔ (هدایه وعینی)

مسئلہ ۵: اگر امین شخص امانت والے مال کو حفاظت کیلئے سفر میں اپنے ساتھ رکھے تو وہ مال ہلاک ہو جائے تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس پر ضمان لازم نہیں کیونکہ اسے یہ حق تھا کہ جس طرح بھی حفاظت کر سکے حفاظت کرے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ سفر میں خطرات ہوتے ہیں اس لئے امانت والا مال سفر میں ساتھ نہ لے جائے، مال کو ساتھ لے جانے پر مال کے ہلاک ہونے پر ضمان لازم آئے گی، اصل میں یہ اختلاف، اختلاف زمان کی وجہ سے تھا، امام صاحب رحمہ اللہ کے وقت سفر میں وہ خطرات نہیں تھے جو صاحبین کے زمانہ میں تھے۔ (هدایه مع حاشیه)

راقم کے نزدیک آجکل کے دور میں امانت والے مال کو سفر میں ساتھ رکھنا ممکن نہیں، آجکل جب گھر میں امانت رکھنے کے لئے کوئی تیار نہیں کہ ڈاکو امانت کے ساتھ ساتھ ہمارا مال بھی لوٹ کر لے جائیں گے، تو سفر میں تو مال کے ساتھ جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

ہاں یہ خیال رہے کہ اگر مال دار نے سفر میں مال کو ساتھ لے جانے سے منع کیا تھا، امین پھر بھی ساتھ لے گیا مال کے ہلاک ہونے پر بالاتفاق اس پر ضمان لازم آئے گی۔ (ہدایہ)

مسئلہ ۶: جب دو آدمی مل کر کسی کے پاس کوئی چیز بطور ودیعت (امانت) رکھیں، تو پھر ان میں سے، ایک شخص آئے اور مطالبہ کرے کہ ہماری امانت واپس کردو، تو وہ امانت واپس نہ کی جائے جب تک کہ دونوں مل کر نہ آئیں۔ یہی امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے، اسی پر فتوی ہے، اس لئے کہ اگر تمام مال واپس لوٹائے گا تو دوسرے کا مال اس مطالبہ کرنے والے کو دینا لازم آئے گا جو جائز نہیں، اور اگر اس کا حصہ تقسیم کر کے دے دیا گیا تو پھر بھی درست نہیں، کیونکہ امین کو یہ حق ہی حاصل نہیں کہ دو شخصوں کی مشترک چیز ان دونوں میں سے کسی ایک غائب ہونے پر تقسیم کردے۔ (ماخوذ از هدایه)

استاذی المکرم مولانا غلام یوسف گجراتی رحمہ اللہ جن سے راقم نے ابتدائی صرف کی کتب پڑھیں، انہوں نے صبح کی نماز کے بعد درس قرآن پاک میں ایک مرتبہ امام شافعی رحمہ اللہ کے فضائل بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ دو شخص ان کی والدہ کے پاس کوئی چیز امانت رکھ گئے، اور ساتھ ہی یہ کہہ گئے کہ جب تک ہم دونوں نہ آئیں تو یہ چیز واپس نہیں کرنی۔ چند دنوں بعد ان میں سے ایک آیا تو اس کے مطالبہ کرنے پر آپ کی والدہ نے وہ چیز اسے واپس کردی، ایک دو دنوں کے بعد دوسرا شخص آیا کہ ہماری امانت ہمیں واپس کرو، تو امام شافعی رحمہ اللہ کی والدہ نے کہا کہ تمہارا دوسرا ساتھی امانت لے گیا ہے، اس نے جھگڑا شروع کر دیا تو وہ بہت پریشان ہوئیں، امام شافعی اس وقت نابالغ بچے تھے لیکن بہت زیادہ ذہین تھے، انہوں نے والدہ کی پریشانی کو دیکھ کر کہا، اے اماں جی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ اس شخص کو کہو تم اکیلے کیوں آگئے ہو، اپنے دوسرے ساتھی کو بھی ساتھ لاؤ تاکہ تمہاری امانت تمہیں واپس کی جائے، یہ کہنے پر وہ واپس چلا گیا، پھر لوٹ کر نہیں آیا۔

مسئلہ: "وفی الجامع الصغیر اذا نهاه ان یدفع الی احد من عیاله فدفعها الی من لابد منه لایضمن"
جامع صغیر میں یہ مذکور ہے اگر کسی شخص نے مال امانت رکھا اور امین کو منع کیا کہ یہ میری امانت میرے اہل وعیال کو نہیں دینی، تو امین نے اس کی زوجہ کو دے دی تو ضمان لازم نہیں آئے گی، کیونکہ عیال میں بعض وہ افراد ہوتے ہیں جن سے چھٹکارا نہیں ہوتا، زوجہ بھی ان میں سے ہی ہے، لیکن زوجہ کو مال دینے پر اسی وقت ضمان لازم نہیں آئے گی جب وہ امانت میں خیانت کرنے میں مشہور نہ ہو۔

"وان کان له منه بد ضمن لان الشرط مفید فان من العیال من لایؤتمن علی المال"

اگر عیال میں وہ اشخاص ہوں جن کو مال دینا کوئی ضروری نہ ہو جیسے بڑی اولاد ہے تو ان کو امانت نہ لوٹائی جائے کیونکہ عیال میں بعض وہ افراد ہوتے ہیں جن کو مال دینے میں اعتماد نہیں کیا جاتا، اس لئے اس کا یہ شرط لگانا کہ میرے عیال کو میری امانت نہ لوٹانا ان کے حق میں مفید ہے، کیونکہ امانت میں خیانت کرنے میں جو مشہور ہوں ان کو مال لوٹانا ضمان کا سبب ہوگا۔ (ماخوذ از هدایه)

❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊
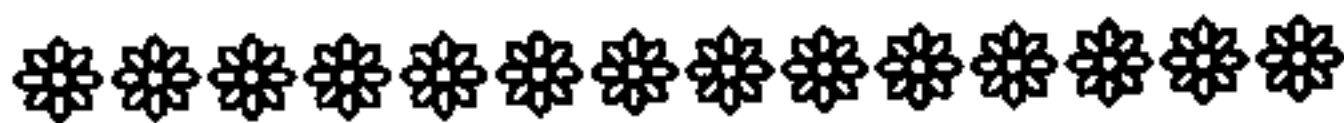
بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَO (آیۃ نمبر ۷۶)

(1) ہاں کیوں نہیں جس نے اپنا عہد پورا کیا اور پرہیز گاری کی اور بے شک پرہیز گار اللہ کو خوش آتے ہیں۔ (کنزالایمان)

(2) کیوں نہیں، جس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور تقویٰ اختیار کیا بیشک اللہ پسند کرتا ہے پرہیز گاروں کو۔ (نجوم الفرقان)

﴿بَلٰی﴾ ''کیوں نہیں!''

اثبات لما نفوه ای بلی علیهم فیهم سبیل" جب یہود نصاری نے کہا "**لیس علینا فی الامیین**" نہیں ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی راہ (یعنی پکڑ کی راہ) تو رب تعالی نے ان کا رد فرمایا، ارشاد فرمایا "بلی" یہ ایک لفظ ان کے نفی جملہ کو رد کر کے حکم کو ثابت کر رہا ہے، اب صرف ایک لفظ کا مطلب یوں ہوگا کیوں نہیں ان پر ان پڑھوں کے معاملہ میں پکڑ کی راہ ضرور پائی گئی ہے۔ (ماخوذ از تفسیر ابی السعود)

سبحان اللہ! قرآن پاک کی فصاحت کیا ہی خوب ہے کہ بظاہر ایک لفظ نظر آتا ہے، لیکن کثیر معانی پر مشتمل ہے۔

خیال رہے کہ تفسیر ابی السعود سے جو قول لیا گیا ہے وہ زجاج نحوی کا ہے، اس قول کے مطابق ''بلی'' پر وقف تام ہے، اور اس کے بعد جملہ استینافیہ ہے'' اس قول کے مطابق مکمل آیہ کریمہ کا یوں مطلب ہوگیا، ہاں کیوں نہیں اہل کتاب (یہود و نصاری) کو عرب لوگوں کے مال کھانے پر پکڑ ہوگی جن کو یہ ان پڑھ کہتے تھے، اور ان کا یہ دعوی باطل ہے کہ ہمیں ان کے معاملہ میں کوئی پکڑ نہیں۔ (بات یہاں ختم ہوگئی آگے نئی بات شروع ہے) کہ جس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور تقوی اختیار کیا (وہی اللہ تعالی کے محبوب ہیں) کیونکہ اللہ تعالی پرہیز گاروں سے ہی محبت کرتا ہے۔

''**والثانی ان کلمة (بلی) کلمة تذکر ابتداء الکلام آخر یذکر بعده وذلک لان قولهم لیس علینافیمانفعل جناح قائم مقام قولهم نحن احباء الله تعالی ان اهل الوفاء بالتهد واتقی هم الذین یحبهم الله تعالی لاغیرهم، وعلی هذا الوجه فانه لایحسن الوقف علی (بلی)**''

اور دوسرا قول اس میں یہ ہے کہ لفظ ''بلی'' کبھی ابتداء کلام میں آتا ہے، اس کے بعد والا جملہ اسی پر مرتب ہوتا ہے، اس قول کے مطابق، ان کا یہ کہنا ﴿لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ﴾ (نہیں ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی راہ گرفت) کا مطلب یہ ہے کہ ہم جو بھی کرتے رہیں ہم پر کوئی بھی گناہ نہیں، یہ جملہ معنوی اعتبار سے ان کے اس قول

کے مطابق ہے "نحن احباء الله وابناء وہ" ہم اللہ کے محبوب اور اس کے بیٹے ہیں، تو اللہ تعالی نے ان کے دعویٰ کو باطل اور جھوٹا ظاہر کرنے کیلئے ارشاد فرمایا ﴿بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ﴾

اب اس کا مطلب یہ ہو گیا کہ ان کا قول درست نہیں بلکہ وعدہ کی وفاء کرنے والے اور تقویٰ اختیار کرنے والے ہی وہ لوگ ہیں جن سے اللہ تعالی محبت کرتا ہے، ان کے بغیر کسی اور سے محبت نہیں کرتا، اس قول کے مطابق لفظ ''بلیٰ'' پر وقف نہیں ہوگا، اس قول کے مطابق ترجمہ یوں ہوگا ایسا نہیں، بلکہ وہ جس نے وفاء کی عہد کی اور پرہیزگاری کی (وہی اللہ کے محبوب ہیں) بے شک اللہ تعالی پسند کرتا ہے پرہیزگاروں کو۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

حروف ایجاب چھ ہیں، نَعَمْ ، بَلٰی ، اِیْ ، اَجَلْ ، جَیْرِ ، اور "اِنَّ" نعم اور بلی، میں ابن حاجب رحمہ اللہ نے کافیہ میں بیان کیا "فنعم مقررة لما سبقها وبلى مختصة بايجاب النفى" "نعم" ماقبل مضمون کی تقریر کے لئے آتا ہے، اور ''بلی'' نفی کے ایجاب کے لئے خاص ہے، اس کی وضاحت میں علامہ جامی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا:

(فنعم مقررة لما سبقها) اى محققة لمضمونه استفهاما كان او خبرا فهى فى جواب اقام زيد بمعنى قام زيد وفى جواب الم يقم زيد بمعنى لم يقم زيد ، وبلى فى جواب الم يقم زيد بمعنى قام زيد ، فمعنى بلى فى جواب (الست بربكم) انت ربنا ، ولو قيل فى موضع بلى ههنا نعم لكان كفرا فان معناه حينئذلست بربنا "

"نعم" ماقبل مضمون کی توثیق کرتا ہے، خواہ استفہام ہو، خواہ خبر ہو، اگر پہلے کلام مثبت ہو تو مثبت کی توثیق کرتا ہے، جیسا کہ کوئی پوچھے "اقام زید" (کیا زید کھڑا ہے) تو جواب میں "نعم" کہا جائے تو معنی ہوگا "قام زید" ہاں (زید کھڑا ہے) اور اگر کوئی پوچھے "الم یقم زید" (کیا زید نہیں کھڑا؟) تو جواب میں کہا "نعم" (ہاں) تو اس مقام پر نفی کی توثیق ہے، یعنی جواب یہ ہوگا "لم یقم زید" ہاں (زید نہیں کھڑا) اگر "الم یقم زید" (کیا زید نہیں کھڑا) کے جواب میں "بلی" آجائے تو معنی یہ ہوگا "قام زید" کیوں نہیں بلکہ زید کھڑا ہے۔

اسی وجہ سے رب تعالی نے یوم میثاق کو جب اولاد آدم علیہ السلام سے پوچھا "الست بربکم" کیا میں تمہارا رب نہیں؟ تو جواب میں "قالو بلی" انہوں نے کہا کیوں نہیں، یعنی تو ہمارا رب ہے۔ اس مقام پر اگر جواب میں "نعم" بولا جائے تو کفر لازم آئے گا کیونکہ وہ تو نفی کی نفی سے توثیق کیلئے آتا ہے، اس صورت میں، یعنی جواب میں "نعم" بولنے سے

معاذ اللہ معنی یہ ہو جاتا ہاں (تو ہمارا رب نہیں) تو اس سے کفر لازم آتا۔

البتہ یہ خیال رہے کہ کبھی عرف میں "نعم" "بلی" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن عرف قانون نہیں بلکہ مختلف علاقہ جات کے مختلف عرف ہوتے ہیں، بعض علاقوں میں اس طرح استعمال ہوتا ہے کہ کوئی کہے:

"یا زید الیس لی علیک الف درهم وقال زید نعم یکون اقرار ا وتفوم مقام بلی لتقریر الالبات بعد النفی"

اے زید کیا میرے تجھ پر ہزار درھم نہیں؟ تو زید اس کے جواب میں کہے "نعم" تو یہ بعض علاقوں کے عرف کے مطابق اقرار ہو جائے گا کہ ہاں مجھ پر تمہارے ہزار درھم ہیں، اس صورت میں، نعم، بلی کے معنی میں استعمال ہوگا۔
(ماخوذ از شرح جامی، بحث الحروف صفحہ نمبر ۳۶۱)

طلباء کرام! یہ بحث طویل اس لئے ذکر کی کہ راقم کو تفسیر نعیمی کی یہ بحث سمجھ نہیں کہ اس میں سہو ہے یا کہ نحو کی کسی اور کتاب سے آپ نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے، قبلہ مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا بلی، نعم، اور ای، جیر سب جواب کے حروف ہیں، بمعنی ہاں" مگر فرق یہ کہ "نعم" نفی کے اثبات کے لئے آتا ہے، بلی منفی کے اثبات کیلئے (راقم کو سہو ہی نظر آتا ہے) (نعیمی)

عظمت قرآن پر جان قربان:

قرآن پاک کی فصاحت کو بیان کرنا بھی میرے جیسے ہیچمدان کیلئے تو ممکن ہی نہیں، البتہ علماء کرام کے بیان سے نقل کر کے طلباء کرام کو کچھ فائدہ پہنچا دیتا ہوں علامہ رازی رحمہ اللہ کیا خوب بیان فرماتے ہیں۔

"واعلم ان هذالآية دالة على تعظيم امر الوفاء بالعهد وذلك لان الطاعات محصورة فى امرين التعظيم لامر الله، والشفقة على خلق الله فالوفاء بالعهد مشتمل عليهما معا، لان ذلك سبب لمنفعة الخلق فهو شفقة على خلق الله ولما امر الله به كان الوفاء به تعظيما لامر الله فثبت ان هذه العبارة مشتملة على جميع انواع الطاعات والوفاء بالعهد كما يمكن فى حق الغير يمكن ايضافى حق النفس لان الوافى بعهدالنفس هو الآتى بالطاعات والتارك للمحرمات لان عند ذلك تفوذالنفس بالثواب عن العقاب"

اس آیۃ کریمہ سے یہ فائدہ حاصل ہو رہا ہے کہ وعدہ کو پورا کرنا اور وعدہ کے امر کو معظم سمجھنا ضروری ہے، اس لئے کہ طاعات کو دو چیزوں میں منحصر کر دیا گیا۔

(۱) اللہ تعالی کے امر کی تعظیم، یعنی اللہ تعالی کے امر کو معظم سمجھنا۔ (۲) اللہ تعالی کی مخلوق پر شفقت کرنا۔

"من اوفی بعهده" ان دو چیزوں کو شامل ہے، اسلئے کہ وعدہ کو پورا کرنا مخلوق کے نفع کا سبب ہے، تو واضح ہوا کہ وعدہ کو پورا کرنا اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر شفقت کا ذریعہ ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جب وعدہ پورا کرنے حکم دیا ہے تو وعدہ کو پورا کرنے میں اللہ تعالیٰ کے امر کی تعظیم بھی پائی جائے گی۔

واضح ہوا کہ ارشاد باری تعالیٰ میں "بلیٰ من اوفی بعهده" بہت مختصر الفاظ مبارکہ ہیں، لیکن فصاحت وبلاغت کے لحاظ پر بہت عظیم کلام ہے، جو کہ تمام طاعات پر مشتمل ہے، آیۃ کریمہ سے اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جس طرح اور لوگوں سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا لازم ہے، اسی طرح اپنے آپ سے کئے گئے وعدے پورے کرنے بھی لازم ہیں، انسان نے اپنے نفس سے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ طاعات کو لائے گا، اور حرام کاموں کو چھوڑ دے گا، لھذا جب اپنے نفس سے کئے گئے ان دعوؤں کو پورا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اسے ثواب عطا فرمائے گا، اور عذاب سے بچائے گا۔ (کبیر)

صرف لفظ "بلیٰ" سے یہود کے من گھڑت اقوال کو رد کر دیا گیا کہ تمہارا یہ کہنا کہ ہم عرب لوگوں کا جو مال ہڑپ کرتے رہیں ہمیں کوئی گرفت نہیں، یہ باطل ہے، یعنی انہوں نے جب یہ کہا کہ ہمیں کوئی مؤاخذہ (پکڑ) نہیں، ہم جو بھی کرتے رہیں، تو رب تعالیٰ نے ہمیں کوئی عذاب نہیں دینا، تو ان کے رد میں صرف لفظ "بلیٰ" ذکر فرمادیا، کیوں نہیں؟ یعنی تمہیں رب تعالیٰ نے اپنی گرفت میں تو لینا ہی ہے۔

یہود کے من گھڑت اقوال کی ایک جھلک دیکھیے، تفہیم میں بیان کیا گیا ہے "تلمود میں کہا گیا ہے کہ اگر اسرائیل کا بیل کسی غیر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کر دے تو اس پر کوئی تاوان نہیں، مگر غیر اسرائیلی کا بیل اگر اسرائیل کے بیل کو زخمی کرے تو اس پر تاوان ہے۔ اگر کسی شخص کو کسی جگہ کوئی گری پڑی چیز ملے تو اسے دیکھنا چاہیے کہ گرد و پیش آبادی کن لوگوں کی ہے اگر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے اعلان کرنا چاہیے، غیر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے بلا اعلان ہی چیز رکھ لینی چاہیے۔

ربی اشماعیل کہتا ہے کہ اگر امی اور اسرائیل کا مقدمہ قاضی کے پاس آئے تو قاضی اگر اسرائیلی قانون کے مطابق اپنے مذہبی بھائی کو جتوا سکتا ہے تو اس کے مطابق جتوائے، اور کہے کہ یہ ہمارا قانون ہے، اور اگر امیوں کے قانون کے تحت جتوا سکتا ہو تو اس کے تحت جتوائے اور کہے کہ یہ تمہارا قانون ہے، اور دونوں قانون ساتھ نہ دیتے ہوں تو پھر جس حیلے سے بھی وہ اسرائیلی کو کامیاب کر سکتا ہو کرے، ربی شموایل کہتا ہے کہ غیر اسرائیلی کی غلطی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

(تالمود ک مسلینی، پال آئزک ھرشوں، لندن ۱۸۸۰ء صفحات ۳۷، ۲۱۰، ۲۲۱)

آج تک یہود ونصاریٰ یہی کہہ رہے ہیں کہ ہم ایٹم بم بنائیں اور ان کو استعمال کریں تو ہماری مرضی کی بات ہے ہمیں اس میں اختیار ہے، کوئی دوسرا ملک ایٹم بم بنائے گا تو یہ ہمارے لئے قابل برداشت نہیں، ہم اس کے ایٹم بم کو اور اس

کے ملک کو تباہ کر دیں گے۔ ان کی یہ بڑھک سن کر ایٹمی قوتیں مفلوج ہو گئیں، ایٹم کے تذکرے ختم ہو گئے، موجد ہیرو سے زیرو بنا دیئے گئے، **مقام افسوس** مسلمان اتنے زیادہ ڈرپوک کیوں ہو گئے؟

فوائد : **"التقوی تعم وفاء ما عاهدوا الله علیه من الایمان بمحمد ﷺ وبما جاء به مما یتعلق بتکمیل القوة النظریة والعملیة"**

تقوی عام ہے، وعدہ کی وفاء کو شامل ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کیا ہوا وعدہ کہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لاؤ گے ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى﴾ اس وعدہ کو شامل ہے، اور تقوی اس چیز سے بھی متعلق ہے کہ قوت نظریہ اور قوت عملیہ کی تکمیل جن کاموں سے ہو سکے وہ کئے جائیں۔

سبق آموز حکایت:

ایک جوان نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا کہ میں دنیا کی خوبصورت چیزوں کو نہیں دیکھوں گا، ایک دن وہ بازار سے گزرا تو اس نے موتیوں سے مرصع ایک کمر بند دیکھا، تو اس کی طرف کچھ دیر تعجب سے دیکھا، پھر آگے چلا گیا، ابھی آگے چلا ہی تھا کہ دکاندار کو کمر بند نظر نہ آیا، وہ جلدی سے اپنی دکان سے نکلا تو اس اللہ کے بندے کو پکڑ لیا کہ تو تو عیار و مکار ہے، میری دکان سے کمر بند تو نے چوری کر لیا ہے، وہ پکڑ کر حاکم کے پاس لے گیا، حاکم نے اس کے ظاہر حال کو دیکھ کر کہا یہ چور نہیں ہو سکتا یہ تو نیک شخص ہے، دکاندار نے کہا میرا کمر بند اس اس طرح تھا، دکان کے پاس یہی کھڑا ہوا تو وہ کمر بند گم ہو گیا، آپ اس کی تلاشی لیں، تلاشی لینے پر وہ کمر بند اس کی کمر سے باندھا ہوا مل گیا، بادشاہ نے بھی کہا تو تو بڑا عیار ہے، کیا تجھے شرم نہیں آتی لباس تو نیک لوگوں کا پہنتا ہے اور پھر چوریاں بھی کرتا ہے۔

اس جوان سے کمر بند کو دیکھ کر کہا **"مولای الا قالة الهی لا اعود الی مثلها"** اے میرے مولی میں باز آ گیا، میں باز آ گیا (میری پناہ، میری پناہ) اور میرے اللہ میں آئندہ ایسا کام نہیں کروں۔

اس نے وہ کمر بند چوری تو نہیں کیا تھا، قدرتی طور پر اس کی کمر کے ساتھ اس طرح باندھ دیا گیا تھا کہ اسے پتہ بھی نہ چل سکا، بادشاہ نے کہا اسے خوب مارو، جب اس کے کارندوں نے اس شخص کے کپڑے اتار دیئے تاکہ اسے خوب ماریں **"فاذاهم بصوت یسمع ولا یری یقول دعوه ولا تضربوه انما اردنا تأدیبه"** اچانک ایک غیبی آواز آئی، آواز تو سنی جا رہی تھی لیکن بولنے والا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا، وہ آواز یہ آ رہی تھی کہ اسے نہ مارو، ہم نے تو اسے ادب سکھانے کا ارادہ کیا، **"فوثب السلطان الی الفتی وقبله بین عینیه"** بادشاہ جلدی سے جوان طرف آگے بڑھا، اس کی درمیان آنکھوں کے

بوسہ لیا، اس جوان سے پوچھا تمہارا معاملہ کیا ہے؟ اس نے بتایا میرا رب تعالیٰ سے وعدہ یہ تھا کہ میں دنیا کی اچھی چیزوں کو نہیں دیکھوں گا، لیکن بازار سے گزرتے ہوئے مجھے یہ کمر بند خوبصورت نظر آیا تو میں نے اسے دیکھنا شروع کر دیا تھا، آگے کا رب تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ میرے ساتھ کیا ہوا، پھر اس نے آیۃ کریمہ کا یہ حصہ پڑھا ﴿وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا﴾ وہ اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں.......... وہی لوگ سچے ہیں اور وہی لوگ پرہیزگار ہیں۔

کمر بند کے مالک دکاندار نے بھی اس جوان کی خدمت میں یوں عرض کیا "**سالتک باالله الا ما قبلتها منی واجعلنی فی حل**" میں اللہ تعالیٰ کے لئے تم سے سوال کرتا ہوں جو مجھ سے تم ضرور قبول کرو وہ سوال یہ ہے تم مجھے معاف کردو، "**فقال الیک عنی لیس هذا من صنعتک انما الصنع لصاحب الصنع ولامؤثر فی الوجود غیر الحق ولیس فی الدار غیرہ دیار**" اس جوان نے کمر بند والے دکاندار کو کہا میں نے تمہیں معاف کر دیا، درحقیقت تمہارا یہ کام ہی نہیں، یہ کام تو کام والے کا ہی ہے، وہی قادر مطلق ہے، اس کام میں سوائے حق تعالیٰ کے اور کوئی مؤثر نہیں، یہ سب جہان اسی کا ہے، اس کے جہان میں اور کوئی جہان نہیں۔

اس حکایت سے یہ سبق حاصل ہوا "**فعلی العاقل ان یوفی بعهده فی السراء والضراء ویجتهد فی محافظته**" کہ عقلمند شخص کے لئے ضروری ہے کہ اپنے وعدہ کو ہر حال میں پورا کرے خواہ خوشی میں ہو یا پریشان حالی میں ہو، اس وعدہ کو پورا کرنے کی پوری پوری کوشش کرے۔

راقم کو اس حکایت سے اور یہ فائدہ سمجھ آیا کہ اللہ تعالیٰ بعض اوقات آزمائش میں مبتلا کرتا ہے، بظاہر ان کا وہ گناہ نہیں ہوتا جس میں انہیں پکڑ لیا جاتا ہے، خناس لوگ اللہ کے پیاروں پر انگشت زنی کرتے ہیں (ان کی طرف انگلیاں اٹھاتے ہیں) دیکھو جی اس صوفی، اس مولوی کی طرف اس نے یہ کام کیا ہے یہ تو کتنا برا کام ہے، انہیں پتہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ کسی اور گرفت میں ہیں، حقیقت سے باخبر صرف رب تعالیٰ ہی ہوتا ہے، ایک مرتبہ موسلا دھار بارشوں کی وجہ سے لاہور شہر سیلاب کا منظر پیش کر رہا تھا، گلبرگ جیسی جگہ بھی جھیل کا منظر پیش کر رہی تھی،

عبد القادر حسن (سابقہ کالم نگار روزنامہ جنگ) نے اس پر ایک مضمون لکھا کہ یہ درحقیقت مرغی کے چوزوں کے خون کو مال روڈ سے دھونے کے لئے آیا، کیونکہ جب مرغبانی پر ٹیکس لگایا گیا تو مرغی کا کاروبار کرنے والوں نے چوزوں کو مختلف رنگ لگا کر مال روڈ پر بطور احتجاج چھوڑ دیا جو گاڑیوں کی زد میں آ کر مر گئے تھے اس خون کو دھونے کیلئے رب تعالیٰ نے سیلابی بارشوں کا انتظام کیا۔

اس پر اس نے ایک صاحب کشف بزرگ کا واقعہ نقل کیا کہ دو شخص قتل کے ملزم قرار دئے گے، وہ جیل میں تھے، ان کے لواحقین ایک نیک بزرگ کے پاس دعاء کرانے کے لئے گئے، اس نے کہا اللہ تعالی خیر کرے ابھی گھوڑی بہت روتی ہے اور اس کا بچھیرا بہت روتا ہے، اس بزرگ کا یہ اشارہ جیل میں قیدیوں کے لواحقین کو نہ سمجھ آسکا، انہوں نے قیدیوں کو بزرگ کی بات سنائی تو انہوں نے سمجھ لیا، وہ کہنے لگے کہ ہم نے ایک مرتبہ چوری کی تھی، چوری کیا ہوا مال اسی گھر سے گھوڑی کو کھول کر اس پر لا دلیا تھا، اس گھوڑی کا بچھیرا بار بار گھوڑی کے آگے آجاتا جو ہمارے سفر میں رکاوٹ بن رہا تھا تو ہم نے اس بچھیرے کو مار کر ایک کنویں میں پھینک دیا تھا، یعنی وہ دونوں قیدی درحقیقت گھوڑی کے بچھیرے کو قتل کرنے کے جرم میں مبتلاء تھے، لیکن بظاہر ان پر کسی شخص کو قتل کرنے کا الزام تھا، وہ حقیقت میں اس شخص کے قتل کے شریک نہیں تھے، اللہ تعالی ہی حقائق کو جانتا ہے، وہی علیم وخبیر ہے۔

راقم نے کئی مرتبہ اپنا موقف تقریر میں دہرایا ہے کہ نواز شریف اور شہباز شریف میرے خیال میں لاہور میں مساجد کو شہید کرنے اور جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے اور لاہور کو خوبصورت بنانے کے زعم باطل کے جرم کی وجہ سے جلا وطن کر دئے گئے، ورنہ طیارہ فراڈ کیس فراڈ کیس ہی تھا

اور سبق حاصل یہ ہوا کہ ہر چیز کو اللہ تعالی کی طرف سمجھے، اسی کی طرف رجوع کرے۔

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خوی　　　چو بگذشت برعارفی جنگ جوی

کتنا اچھا کہا بہلول اچھی عادت والے نے۔ جب وہ گزرا ایک عارف جنگجو (لڑائی کرنے والے) پر

گر ایں مدعی دوست بشناختی　　　بہ بیکار دشمن نہ پرداختی

اگر یہ مدعی معرفت اپنے دوست (اللہ تعالی) کو پہچانتا، تو بیکار دشمن سے (لڑائی کرنے) مشغول نہ ہوتا،

گر از ہستی حق خبر داشتی　　　ہمہ خلق را نیست پنداشتی

اگر اسے یہ خبر ہوتی کہ اللہ تعالی کی ذات موجود ہے، تو تمام مخلوق نہ ہونے کے برابر سمجھتا،

"فاذا وقفت على هذا الخبر فقم فى تربية نفسک الى ان تصل الى الهوية المطلقة مميطالثام الاثنينة مشاهدا وجود الحق فى كل شئى رزقنا الله واياكم مشاهدته"

جب یہ بات تمہیں سمجھ آجائے کہ حقیقی موجود اللہ تعالی ہی ہے، مخلوق تمام فانی ہے تو تم اپنے نفس کی یوں تربیت کرو کہ تمہاری رسائی ذات مطلق (باری تعالی) کی طرف ہو، دوئی کو مٹا دو فنا فی اللہ کا درجہ حاصل کرو تا کہ ہر چیز میں تمہیں وجود باری تعالی کا مشاہدہ حاصل ہو، اللہ تعالی ہمیں اور آپ کو اپنا مشاہدہ عطا فرمائے "آمین"

(ماخوذ از روح البیان مع خیالات راقم)

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلَا یُکَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَلَا یُزَکِّیْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ○ (آیة نمبر ۷۷)

(۱) وہ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے ذلیل دام لیتے ہیں آخرت میں اُن کا کچھ حصہ نہیں، اور اللہ نہ ان سے بات کرے نہ ان کی طرف نظر فرمائے قیامت کے دن، اور نہ انہیں پاک کرے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (کنزالایمان)

(۲) بیشک وہ جو حاصل کرتے ہیں اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے گھٹیا مال، یہ وہ ہیں کہ نہیں حصہ ان کا آخرت میں اور نہیں کلام کرے گا ان سے اللہ اور نہ ہی نظر (رحمت) کرے گا ان کی طرف قیامت کے دن اور نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کیلئے عذاب ہے دردناک'' (نجوم الفرقان)

شانِ نزول:

میں چند وجوہ ذکر کی گئی ہیں، لیکن ان میں کوئی تعارض نہیں، وہ تمام وجوہ ہی حقیقت میں شان نزول ہیں، یعنی کئی واقعات کے بعد آیۃ کریمہ کا نزول ہوا۔

(۱) قال عکرمة نزلت فی رء و س الیهود کتموا ما عهد الله الیهم فی التوراة فی شان محمد وبدلوه وکتبوا بایدیهم غیره وحلفوا انه من عندالله لئلا یفوتهم الماکل والرشا التی کانت لهم من اتباعهم "

شان نزول کی ایک وجہ عکرمہ ﷺ کی روایت میں مذکور ہے کہ یہ آیۃ کریمہ یہود کے سرداروں کے متعلق نازل ہوئی جنہوں نے چھپا دیا نبی کریم ﷺ کی شان کو، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے توراۃ میں ان سے وعدہ لیا کہ اسے حق طور پر بیان کرنا، لیکن انہوں نے نبی کریم ﷺ کی شان کو تبدیل کر دیا، اپنے ہاتھوں سے آپ کے اوصاف کو تبدیل کر کے لکھ دیا، اور قسمیں اٹھائیں کے توراۃ میں اللہ تعالیٰ نے یہی بیان فرمایا ہے، اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کی تابعداری کریں۔ یہ اوصاف تبدیل کرنے، توراۃ میں لئے گئے وعدہ کو توڑنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان کی رشوت اور امیر لوگوں سے ملنے والا مال بند نہ ہو جائے۔ (معالم التنزیل للبغوی)

وہ یہود کے سرکردہ لوگ تھے جن کا تذکرہ اس روایت میں موجود ہے۔

"واخرج ابن جریر عن عکرمة قال نزلت هذه الآية "ان الذين يشترون بعهد الله وايمانهم ثمناقليلا "في ابی رافع و كنانة بن ابى الحقيق و كعب ابن اشرف وحيى بن اخطب"

ابن جریر نے حضرت عکرمہ ﷺ سے روایت کی کہ یہ آیۃ کریمہ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا﴾ ابورافع، کنانہ بن حقیق، کعب بن اشرف اور حیی بن اخطب یہود کے متعلق نازل ہوئی جن کی کوشش سے نبی کریم ﷺ کے اوصاف توراۃ میں تبدیل کردیئے گئے (درمنثور)

(۲) عن ابی وائل عن عبدالله قال قال رسول الله ﷺ من حلف على يمين صبر يقتطع بها مال امرئی مسلم لقی الله يوم القيامة وهو عليه غضبان فانزل الله تعالى تصديق ذلك، ان الذين يشترون بعهد الله ايمانهم ثمنا قليلا" (رواه البغوی باالاسناد علی طریق البخاری)

ابووائل حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص قسم اٹھاتا ہے اور اس کے ذریعے کسی مسلمان کا مال لے لیتا ہے، قیامت کے دن وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوگا، رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کی تصدیق کے لئے اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا۔ (معالم التنزیل للبغوی ومظہری)

(۳) دخل الاشعث بن قيس فقال ما يحدثكم ابو عبد الرحمن ؟فقالو كذاكذا فقال في انزلت كانت لی بئر فی ارضی ابن عم لی فاتيت رسول الله ﷺ فحدثته فقال هات بينتك او يمينه قلت اذا يحلف عليها يا رسول الله فقال رسول الله ﷺ "من حلف على يمين صبر وهو فيها فاجر يقتطع بها مال امرئی مسلم لقی الله يوم القيامةوهو عليه غضبان"

اشعث بن قیس آئے انہوں نے پوچھا ابوعبدالرحمٰن اس آیۃ کے متعلق کیا کہتے ہیں، ان کو بتایا گیا کہ اس اس طرح وہ بیان کرتے ہیں تو انہوں نے کہا یہ آیۃ کریمہ میرے حق میں نازل ہوئی، میرا ایک کنواں چچا کے بیٹے کی زمین میں تھا (وہ مجھے دے نہیں رہا تھا) میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ کو بتایا، آپ نے فرمایا، گواہ پیش کرو یا قسم اٹھاؤ (یہ اس وقت کا واقع ہے جب مدعی سے بھی قسم لے کر فیصلہ کیا جاتا تھا) میں قسم اٹھانے پر پختہ طریقہ سے تیار ہوگیا۔ میں نے کہا میں قسم اٹھاتا ہوں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو قسم اٹھا کر اپنے بھائی کا مال لے لے تو اللہ تعالیٰ سے قیامت کے دن اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر ناراض ہوگا، تو آپ کے ارشاد کی تائید میں یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔ (معالم التنزیل للبغوی)

(۴) واخرج مسلم وابو داؤد والترمذی عن وائل بن حجر قال جاء رجل من حضر موت

ورجل من كندة الى النبی ﷺ فقال الحضرمی یا رسول الله ان هذا قد غلبنی علی ارض كانت لابی قال الكندی هی ارض كانت فی یدی از رعها لیس له فیها حق فقال النبی ﷺ للحضرمی الک بینة قال لا قال ذلک یمینه فقال یا رسول الله ان الرجل فاجر لایبالی علی ما حلف علیه ولیس یتورع عن شیٔ فقال لیس لک منه الا ذلک فانطلق لیحلف فقال رسول الله ﷺ لما ادبر لئن حلف علی مال لیأ کله ظلما لیلقین الله وهو عنه معرض"

مسلم، ابوداؤد، ترمذی نے وائل بن حجر سے روایت بیان کی کہ ایک شخص حضرموت سے اور دوسرا کندہ سے نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، حضرمی نے کہا یا رسول اللہ یہ شخص مجھ پر غالب آ گیا ہے، میرے باپ کی طرف سے مجھے ملی ہوئی زمین پر اس نے قبضہ کرلیا ہے، کندی نے کہا یہ زمین میرے قبضہ میں ہے، میں اس میں کھیتی باڑی کررہا ہوں، اس شخص کا اس میں کوئی حق نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے حضرمی کو کہا، کیا تمہارے پاس گواہ ہیں؟ اس نے کہا میرے پاس گواہ تو نہیں۔ آپ نے فرمایا پھر وہ دوسرا شخص قسم اٹھالیتا ہے، حضرمی نے کہا یا رسول اللہ ﷺ وہ شخص تو فاجر ہے، وہ قسم اٹھانے میں کوئی پرواہ نہیں کرے گا، اسے پرہیزگاری تو کچھ بھی حاصل نہیں، تو آپ نے فرمایا تمہارے لئے اس کے بغیر اور کوئی فیصلہ نہیں، تو وہ کندی شخص قسم اٹھانے کیلئے چلا، تو نبی کریم ﷺ انے اس کے پھر جانے پر فرمایا کہ اگر کوئی شخص دوسرے بھائی کا مال ظلماً کھانے کے لئے قسم اٹھائے گا، تو اللہ تعالی سے جب ملاقات کرے گا تو اللہ تعالی اس سے اعراض فرمائے گا، یعنی رب تعالی اسکی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا۔ تو اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔ (منقول از در منشور)

علامہ بغوی نے ایک روایت علقمہ سے بیان کی کہ کندی شخص کا نام امرؤ القیس تھا اور حضرمی کا ربیعہ بن عبدان تھا جب امرؤ القیس نے قسم اٹھانے کا ارادہ کیا تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی تو وہ اٹھانے سے رک گیا "واقر لخصمه بحقه ودفعه الیه" اور اپنے مدعی کے حق کو تسلیم کرلیا، زمین اس کے حوالے کردی۔ (معالم التنزیل)

(5) اور شان نزول یہ بیان کیا گیا "عن ابی امامة ان رسول الله ﷺ قال من اقتطع حق امرئی مسلم بیمینه حرم الله علیه الجنة واوجب له النار قالوا وان كان شیئا یسیرا یارسول الله؟ قال وان كان قضیبا من اراک قالها ثلاث مرات" (رواہ مالک وابن سعد واحمد ومسلم والنسائی وابن ماجہ در منشور)

حضرت ابوامامہ کہتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے اپنی قسم کے ذریعے کسی مسلمان کا حق مارا تو اللہ تعالی نے اس پر جنت کو حرام کردیا، اور اس کے لئے جہنم کو ثابت کردیا" صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ اگرچہ وہ چیز تھوڑی بھی ہو، آپ نے فرمایا ہاں اگرچہ وہ پیلو درخت کی شاخ ہی ہو، (اس کی جھوٹی قسم کے ذریعے حاصل کرنے پر

جنت حرام ہوگئی جہنم ثابت ہوگئی) یہ جواب آپ نے تین مرتبہ ارشاد فرمایا، آپ کی تائید کیلئے اللہ تعالی نے اس آیۃ کریمہ کونازل فرمایا۔ (معالم التنزیل للبغوی)

(٦) عن عبد الله بن ابی اوفی ان رجلا اقام سلعة وهو فی السوق فحلف بالله لقد اعطی بها مالم یعط لیوقع رجلا من المسلین "فنزلت"

(رواہ ابن ابی حاتم ورواہ البخاری من غیر وجہ عن العوام حاشیہ صابونی)

عبداللہ بن ابی اوفی فرماتے ہیں بیشک ایک شخص (یہود میں سے) اپنا سامان بازار میں لے کر کھڑا ہے وہ (جھوٹی) قسم اٹھا رہا ہے کہ یہ چیز میں اسے دوں گا جو مجھے اتنی رقم اس کے بدلے دے گا جو مجھے پہلے نہیں دی گئی، (کیونکہ مجھے پہلے اس کے بدلے اتنا مال مل رہا تھا) وہ اصل میں کسی مسلمان کو پھنسانا چاہتا تھا، تو یہ آیۃ کریمہ (اس کی مذمت میں) نازل ہوئی۔ (معالم التنزیل للبغوی)

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِاللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًاقَلِیْلًا اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ﴾

''بیشک وہ جو حاصل کرتے ہیں اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے گھٹیا مال، یہ وہ ہیں کہ نہیں حصہ ان کا آخرت میں''

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ وتفسیر تبصیر الرحمٰن:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا الفاظ کا ترجمہ کیا ہے، اور وہ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے ذلیل دام لیتے ہیں آخرت میں ان کا کچھ حصہ نہیں۔ آپ کا یہ ترجمہ تفسیر تبصیر الرحمٰن کے کامل طور پر مطابق ہے، آیئے ذرا دیکھیں، غور کریں۔

(اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِاللّٰهِ) ای یاخذون بدله بتغیيره (وایمانهم) ای بایمانهم الکاذبة یبدلونها فیاخذون (ثمنا قلیلا) اشیأحقیرا من الدنیاالحقیرة التی لانسبة لجمعها الی ادنی مافوتوه (اولئک لاخلاق) ای لانصیب (لهم فی الاخرة) (تبصیر الرحمن)

بے شک وہ جو لیتے ہیں اللہ تعالی کے عہد کے بدلے (یعنی اللہ کے وعدے کو توڑ کر اس کے بدلے لیتے ہیں) اور اپنی قسموں کے بدلے یعنی جھوٹی قسموں کے ذریعے کہ اپنی قسموں کو تبدیل کر کے جھوٹ سے حاصل کرتے ہیں حقیر دنیا کا حقیر مال اسلئے کہ دنیا کے تمام مال کو وہ حیثیت حاصل نہیں ہوتی جو ان چیزوں کو حاصل تھی جن کو انہوں نے تبدیل کردیا ''یعنی اللہ تعالی کے عہد اور اپنی قسموں کو انہوں نے توڑ دیا'' آخرت میں انکا کچھ حصہ نہیں'' راقم نے بھی تقریبا اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہی نقل کیا۔

خیال رہے کہ "شراء کا معنی'' بیچنا اور خریدنا'' دونوں معنی آتے ہیں، بیچنا ہو یا خریدنا ہو تو ہر ایک میں ایک شخص کی طرف سے مال دیا جاتا ہے دوسرے کی طرف سے اس کے بدلے میں مال دیا جاتا ہے۔ اس لئے اس کا معنی تبدیل کرنا، حاصل کرنا، لینا وغیرہ کیا جاتا ہے۔

ہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے اگر "ثمنا قلیلا" کا معنی ''تھوڑا مال'' کیا جائے تو پھر بھی درست ہے، کہ یہ حقیقی معنی ہے، لیکن پھر بھی اس کی وضاحت کی ضرورت ہوگی کہ دنیا کا تمام مال ہی تھوڑا ہے۔ جیسا کہ رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ﴾ (آپ فرما دیجئے دنیا کا سامان تھوڑا ہے) یعنی دنیا کا تمام مال حقیر ہونیکی وجہ تھوڑا ہی ہے۔

﴿أُولٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ﴾ "یہ وہ ہیں کہ نہیں حصہ ہوگا ان کا آخرت میں"

یعنی اللہ تعالی کے عہد کو توڑ کر اور جھوٹی قسمیں اٹھا کر یہ آخرت کی نعمتوں اور ثواب کو حاصل نہیں کر سکیں گے۔

﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ﴾ "اور نہیں کلام فرمائے گا ان سے اللہ"

یعنی وعدہ توڑنے والوں اور جھوٹی قسمیں اٹھانے والوں کے ساتھ اللہ تعالی کلام نہیں فرمائے گا۔

اعتراض: سورۃ المومنون میں رب تعالی کا ارشاد گرامی ہے ﴿قَالَ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ﴾ سورۃ المومنون آیۃ (۱۰۸) سے پتہ چلتا ہے کہ رب تعالی ان سے کلام فرمائے گا؟

پہلا جواب: اجیب بان قوله تعالی "ولایکلمهم الله "ای کلام رضافلاینافی انه یکلمهم کلام غضب"

کہ یہاں جو ذکر ہے کہ اللہ تعالی ان سے کلام نہیں فرماء گا اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی ان سے رحمت اور رضاء مندی کا کلام نہیں فرمائے گا۔ اور سورۃ المومنون میں جس کلام کا ذکر ہے اس سے مراد ناراضگی کا کلام ہے یعنی غیظ و غضب والا کلام کیا جائے گا اور رضاء مندی اور رحمت والا کلام نہیں کیا جائے گا۔

دوسرا جواب: ولایکلمهم اصلا و آیات الکلام علی لسان الملائکة ویشهد لذلک قوله تعالی "ونادوا یامالک لیقض علینا ربک"

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ رب تعالی کافروں سے بالکل کلام نہیں فرمائے گا ان سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی ان سے فرشتوں کے ذریعے کلام فرمائے گا۔ جیسا کہ رب تعالی کا ارشاد گرامی ہے۔ ﴿وَنَادَوْا يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ﴾ اور وہ پکاریں گے اے مالک! کوئی فیصلہ کر ہی دے ہم پر تیرا رب۔

مالک نام ہے جہنم کے بڑے سردار فرشتے کا، وہ مالک سے درخواست کریں گے کہ تم اللہ پر ہمارا پیغام پہنچادو کہ وہ ہمیں موت عطا کردے ہم پر مکمل فیصلہ کردے یعنی ہمیں نیست و نابود کرے (ہمیں مٹا ہی دے) اس آیۃ کریمہ سے پتہ چلا کہ فرشتوں کے ذریعے بات ہوگی۔ (ماخوذ از صاوی)

لیکن راقم کو پہلا جواب قوی نظر آیا، کیونکہ رب تعالیٰ ان کو منع فرمادے گا کہ "تم میرے ساتھ کلام نہ کرو" وہ رب تعالیٰ سے کلام فرشتہ کے ذریعے کریں گے، اور رب تعالیٰ ناراضگی کا کلام ان سے خود ہی فرمائے گا "واللہ اعلم بالصواب"

آیۃ کریمہ میں وعید شدید:

دنیا کے حقیر مال کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو توڑ دینے اور جھوٹی قسمیں اٹھا کر لوگوں کا مال ہڑپ کر جانے والوں کے لئے اس آیۃ کریمہ میں وعید شدید (سخت گرفت کا حکم) پائی گئی ہے۔ پانچ قسم کے سزاؤں کا تذکرہ کیا، چار سے یہ ذکر فرمایا کہ وہ ثواب سے محروم ہوں گے اور پانچویں سے یہ ذکر فرمایا کہ وہ شدید عذاب میں واقع ہوں گے۔

"ان الثواب عبارة عن المنفعة الخاصة المقرونة بالتعظيم"

بیشک ثواب سے مراد یہ ہے کہ کسی کو خالص نفع پہنچایا جائے، ساتھ ساتھ اس کی تعظیم بھی کی جائے۔

"فالاول وهو قوله "اولئك لاخلاق لهم في الآخرة "اشارة الى حرمانهم عن منافع الآخرة"

ان کی پہلی سزا رب تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی کہ "ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا آخرت میں" اس سے یہ بیان فرمادیا گیا کہ وہ آخرت میں نفع حاصل کرنے سے محروم رہیں گے۔

واما الثلاثة الباقية وهي قوله تعالى "ولا يكلمهم الله ولا ينظر اليهم ولا يزكيهم "فهو اشارة الى حرمانهم عن التعظيم والاعزاز"

باقی تین سزاؤں کا جو تذکرہ فرمایا کہ "ان سے اللہ تعالیٰ کلام نہیں فرمائے گا، اور ان کو دیکھے گا نہیں اور ان کو پاک نہیں کرے گا" ان سزاؤں کے تذکرہ سے یہ بیان فرمادیا گیا کہ وہ لوگ تعظیم اور اعزاز سے محروم ہوں گے۔

"واما الخامس وهو قوله "ولهم عذاب اليم "فهو اشارة الى العقاب"

پانچویں سزا جس کا ذکر فرمایا کہ "ان کو دردناک عذاب ہوگا" اس سے بہت واضح فرمادیا کہ وہ رب تعالیٰ کے شدید عذاب میں مبتلاء ہوں گے۔

خیال رہے کہ ان کی دو سزاؤں ﴿أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ﴾ اور ﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ﴾ کو تفصیل طور پر بیان کیا جاچکا ہے، اب باقی تین کو ذکر کیا جارہا ہے۔

﴿وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ ''اور نہیں نظر (رحمت) کرے گا ان کی طرف قیامت کے دن۔''

راقم نے ترجمہ میں نظر کے بعد بریکٹ میں، رحمت کا لفظ بڑھایا ہے، اسلئے کہ رب تعالی کے ارشاد گرامی ﴿وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ﴾ کا معنی یہ ہے ''انه لاينظر اليهم بالاحسان'' کہ بیشک وہ ان طرف احسان کی نظر نہیں کرے گا، عام طور پر کہا جاتا ہے "فلان لاینظر الی فلان" فلاں شخص فلاں کی طرف نظر نہیں کرتا، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص اسے شمار میں ہی نہیں لاتا اور نہ ہی اس پر احسان کرتا ہے، اس مجاز کا سبب یہ ہے "ان من اعتد بالانسان التفت اليه واعاد نظره اليه مرة بعد اخرى" کہ بیشک جب کوئی انسان کسی دوسرے شخص کو شمار میں لائے تو اس کی طرف توجہ کرتا ہے، اور بار بار اسے دیکھتا ہے۔ اللہ تعالی کے نظر کرنے سے مراد بھی ''کسی کو شمار میں لانا اور اس پر احسان کرنا'' ہے۔

اسی سے واضح ہو گیا کہ اللہ تعالی کے نظر نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو شمار میں ہی نہیں لائے گا اور ان پر احسان نہیں گا۔

"ولا يجوز ان يكون المراد من هذاالنظر الرؤية لانه تعالى يراهم كما يرى غيرهم"

آیۃ کریمہ نظر میں سے مراد رویت (دیکھنا) نہیں، کیونکہ اللہ تعالی کی شان کے لائق جو دیکھتا ہے وہ اس شان سے اس کو بھی ایسے ہی دیکھے گا جیسے اوروں کو دیکھے گا۔

"ولا ان يكون المراد من النظر تقليب الحدقة الى جانب المرئى التماسا لرؤيته لان هذا من صفات الاجسام وتعالى الهنا عن ان يكون جسما"

یہاں نظر نہ کرنے سے مراد یہ بھی نہیں کہ وہ آنکھ کی پتلی سے ان کو نہیں دیکھے گا، اسلئے کہ آنکھ کی پتلی جسموں کی ہوتی ہے، اللہ تعالی جسم سے پاک ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

بعض حضرات نے کہا ہے کہ "نظر" کے بعد "الی" آئے تو اس کا معنی ''دیکھنا'' آتا ہی نہیں۔ بلکہ جب بعد میں ''لام'' آئے تو معنی ''دیکھنا'' آتا ہے۔ یہاں ﴿وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ﴾ ہے، ''ولا ينطر لهم'' نہیں۔ لیکن یہ قول عربی زبان سے ناواقفی کی علامت ہے، اس لئے کہ ''نظر'' کے بعد ''الی'' آئے یا ''لام'' آئے دونوں ہی، دیکھنے کے معنی میں استعمال ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

احادیث مبارکہ:

یہاں چند احادیث مبارکہ ذکر کی جارہی ہیں جن کا وعدہ توڑنے اور جھوٹی قسموں کے ساتھ متعلق ہیں، اگر چہ زیادہ احادیث کا ذکر پہلے پارہ میں بھی آچکا ہے، لیکن سلف صالحین مفسرین کرام کی تفاسیر سے نقل کررہا ہوں، سلف صالحین کا انداز یہی ہے کہ کسی دوسری آیۃ کریمہ کی تفسیر سے متعلق جن احادیث کا ذکر ہوتا ہے انہیں دوبارہ ذکر کردیتے ہیں۔

❁ **عن ابی ذر قال قال رسول الله ﷺثلاثة لا یکلمهم الله ولا ینظر الیهم یوم القیامة ولا یزکیهم ولهم عذاب الیم ، قلت یا رسول الله من هم؟خسروا وخابوا، قال واعاده رسول الله ﷺثلاث مرات قال المسبل والمنفق سلعته بالحلف الکاذب والمنان "**

حضرت ابوذر ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین سے (قسم کے لوگوں سے) قیامت کے دن اللہ تعالی کلام نہیں کرے گا اور ان کی طرف نظر رحمت نہیں کرے گا، اور ان کو پاک نہیں کرے گا اور ان کو دردناک عذاب دے گا۔ (حضرت ابوذر کہتے ہیں) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ کون ہوں گے؟ وہ خسارے میں ہوں گے، رسوا ہوں گے، وہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے تین مرتبہ اپنے کلمات کو دہرایا، پھر آپ نے فرمایا (تکبرانہ انداز پر) چادر کو گھسیٹنے والا اور جھوٹی قسم کے ذریعے اپنے سامان کو اچھا کر کے دکھانے والے، اور احسان جتلانے والا۔ (ماخوذ از صابونی وابن کثیر)

❁ **قال احمد عن سهل بن معاذ بن انس عن ابیه ان رسول الله ﷺقال ان الله تعالی عبادالا یکلمهم یوم القیامة ولا یزکیهم ولا ینظر الیهم ، قیل ومن اولئک یا رسول الله ؟قال متبرئی من والدیه راغب عنهما ومتبرئی من ولده ورجل انعم علیه قوم فکفر نعمتهم وتبرأ منهم "**

حضرت انس ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالی کچھ بندوں سے قیامت کے دن کلام نہیں کرے گا اور ان کو پاک نہیں کرے گا اور ان کی طرف نظر رحمت نہیں کرے گا، آپ سے پوچھا گیا، یا رسول اللہ وہ کون ہوں گے؟ آپ نے فرمایا وہ شخص جو اپنے والدین سے بیزار ہو کر ان سے اعراض کرلے، اور وہ شخص جو اولاد سے بیزار ہوجائے، اور وہ جس پر کسی قوم کے انعامات ہوں وہ ان کی ناشکری کرے ان سے بیزار ہوجائے۔ (ماخوذ از صابونی وابن کثیر)

❁ **عن ابی هریرة ؓقال قال رسول الله ﷺثلاثة لایکلمهم الله یوم القیامة ولا ینظر الیهم ولا یزکیهم ولهم عذاب الیم رجل منع ابن السبیل فضل ماء عنده ، ورجل حلف علی سلعته بعد العصر یعنی کاذبا ورجل بایع اماما فان اعطاه وفی له وان لم یعطه لم یف له "**

(رواه احمد وابو داؤد والترمذی وقال الترمذی حدیث حسن صحیح)

حضرت ابوھریرہ ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین (قسم کے لوگوں) سے قیامت کے دن اللہ تعالی کلام نہیں فر

مائے گا، اور ان کی طرف نظر رحمت نہیں کرے گا، اور ان کو پاک نہیں کرے گا، اور ان کو دردناک عذاب ہوگا "(ایک) وہ شخص جو اپنی ضرورت سے زائد پانی سے مسافر کو روکے، اور (دوسرا) وہ شخص جو عصر کے بعد اپنے سامان کو بیچنے کیلئے جھوٹی قسموں کے ذریعے اچھا کر کے دکھائے، اور (تیسرا) وہ شخص جو امام (حاکم) کی بیعت کرے پھر اگر وہ اسے مال دے تو یہ وعدہ کو پورا کرے، اور اگر وہ اسے مال نہ دے تو یہ وعدہ کو پورا نہ کرے۔ (ماخوذ از ابن کثیر و صابونی)

❁ واخرج الحرث ابن ابی اسامة والحاکم وصححه عن کعب بن مالک سمعت رسول الله ﷺ یقول من اقتطع مال امرئی مسلم بیمین کاذبة کانت نکتة سوداء فی قلبه لا یغیر ها شیء الی یوم القیامة "

کعب ابن مالک فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا جس شخص نے کسی مسلمان کا مال جھوٹی قسموں کے ذریعے (ناحق طور پر) لے لیا تو اس کے دل پر سیاہ نکتہ چھا جائے گا، قیامت کے دن تک کوئی چیز اسے تبدیل نہیں کر سکے گی۔ (ماخوذ از در منثور)

❁ واخرج عبد الرزاق عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ ان الیمین الکاذبة تنفق السلعة وتمحق الکسب"

حضرت ابو ھریرہ ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک جھوٹی قسم سامان کو رائج کر دے گی اور کسب کو مٹا دے گی، یعنی جھوٹی قسم کے ذریعے سامان کو اچھا دکھا کر بیچا جا سکے گا، لیکن اس سے حاصل ہونے والی آمدنی بے برکت ہو جائے گی اور مٹ جائے گی۔

❁ واخرج عبد الرزاق عن ابی سوید سمعت رسول الله ﷺ یقول ان الیمین الفاجرة تعقم الرحم وتقل العدد وتدع الدیار بلاقع "

ابو سوید فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا بیشک جھوٹی قسم رحم (بچہ دانی) کو بانجھ کر دیتی ہے، اور تعداد کو کم کر دیتی ہے، اور شہروں کو ویران کر دیتی ہے۔ (ماخوذ از در منثور)

حقوق العباد اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرے گا:

(ولا یزکیهم) ای لا یثنی علیهم والظاهر ان معناه لا یغفر الله ذنبه لانه من حقوق العباد وفیه القصاص لامحالة "

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی "ولا یزکیهم" کا ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی تعریف نہیں کرے گا، لیکن

زیادہ ظاہر معنی یہ ہے کہ اللہ تعالی ان لوگوں کے گناہ معاف نہیں کرے گا جو وعدہ توڑ کر یا جھوٹی قسمیں اٹھا کر دوسرے لوگوں کا مال ہڑپ کر جائیں، کیونکہ یہ حقوق العباد سے ہے، اس کا بدلہ ضروری ہے، یعنی اللہ تعالی نے حقوق العباد کو معاف نہیں کرنا۔

عن عائشة رضی الله عنهاقالت قال رسول اللهﷺالدواوين ثلاثة فديوان لا يعباالله به شيئاوديوان لا يترک الله منه شيئاوديوان لا يغفر الله اما الديوان الذی لا يغفر الله فهو الشرک واماالديوان الذی لا يعباالله به شيئا فظلم العبد نفسه فيما بينه وبين ربه من صوم ترکه او صلوة ترکهاواماالديوان الذی لا يترک منه شيئافظلم العباد بعضهم بعضا القصاص لا محالة"

(رواہ الحاکم واحمد وروی الطبرانی مثلہ من حدیث سلمان وابی ھریرۃ والبزار مثلہ من حدیث انس)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دفاتر تین (قسم) کے ہیں۔

(۱) ایک وہ دفتر ہے جس کی اللہ تعالی کو کوئی پرواہ نہیں۔

(۲) اور دوسرا دفتر وہ ہے جس سے اللہ تعالی کسی ذرا بھر چیز کو بھی نہیں چھوڑتا۔

(۳) اور تیسرا دفتر وہ ہے کہ اللہ تعالی اس کی بخشش نہیں فرمائے گا۔

(دفاتر سے مراد نامہ اعمال ہے، یعنی لوگوں کے اعمال کے دفاتر تین قسم کے ہوں گے) لیکن وہ دفتر جس کی اللہ تعالی نے مغفرت (بخشش) نہیں کرنی وہ ہے شرک، لیکن وہ دفتر جس کی اللہ تعالی کو کوئی پرواہ نہیں وہ ہے بندے کا اپنے نفس پر ظلم کرنا یعنی بندے اور رب تعالی کے درمیان جو چیزیں ہیں روزہ چھوڑ دے یا نماز چھوڑ دے (یعنی حقوق اللہ کو پورا نہ کرنا) (رب تعالی کو اس کی پرواہ نہیں چاہے تو اس کو معاف فرما دے اور چاہے تو عذاب میں مبتلاء کر لے) لیکن وہ دفتر جس میں سے اللہ تعالی کسی چیز کو بھی نہیں چھوڑے گا یہ بندوں کا ایک دوسرے پر ظلم کرنا، ان کا بدلہ ضرور دلایا جائے گا، (یعنی حقوق العباد کو اللہ تعالی کبھی معاف نہیں فرمائے گا، بلکہ ان کا بدلہ دلائے گا) (مظہری)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَاِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِيۡقًا يَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡكِتٰبِ لِتَحۡسَبُوۡهُ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الۡكِتٰبِ وَيَقُوۡلُوۡنَ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ وَيَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ○ (آیۃ نمبر ۷۸)

(1) اور ان میں کچھ وہ ہیں جو زبان پھیر کر کتاب میں میل کرتے ہیں کہ تم سمجھو یہ بھی کتاب میں ہے اور وہ کتاب میں نہیں اور وہ کہتے ہیں یہ اللہ کے پاس سے ہے اور وہ اللہ کے پاس سے نہیں اور اللہ پر دیدہ ودانستہ جھوٹ باندھتے ہیں۔ (کنز الایمان)

(2) اور بے شک ان سے ایک فریق پھیرتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب میں تا کہ تم اسے گمان کرو کتاب سے حالانکہ نہیں ہے وہ کتاب سے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ نہیں ہے وہ اللہ کی طرف سے اور وہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول : اس آیۃ کریمہ کے شان نزول میں دو قول بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) ایک قول یہ بیان کیا ہے کہ آیۃ کریمہ یہود کے چند اشخاص کے متعلق نازل ہوئی وہ کعب بن اشرف اور مالک اور حیی بن اخطب اور ابو یاسر اور شعبہ بن عمرو اشاعر۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تورات سے اپنے خلاف دلائل کو تبدیل کر دیا گیا۔

(۲) روی الضحاک عن ابن عباس ﷺ ان الآیۃ نزلت فی الیہود والنصاری جمیعا وذلک انہم حرفوا التوراۃ والانجیل والحقوا بکتاب اللہ تعالٰی مالیس منہ"

ضحاک حضرت ابن عباس ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ یہ آیۃ کریمہ یہود ونصاری دونوں فریقوں کے متعلق نازل ہوئی کیونکہ انہوں نے توراۃ وانجیل میں تحریف کی اور کتاب اللہ میں ان چیزوں کو ملا دیا جو اللہ تعالٰی کی کتابوں میں توراۃ وانجیل میں نہیں تھیں۔ واللہ کو دوسرا قول زیادہ معتبر نظر آتا ہے اگرچہ تفسیر کبیر میں پہلے قول کو ترجیح دی گئی ہے۔

"**یلوون**" ماخوذ ہے "لیّ" سے جو اصل میں "لوی" ہے "سید" والے قاعدے کے مطابق واؤ کو یاء کیا اور یاء کو یاء میں ادغام کیا۔ "اللی فتل الحبل" لوی کا معنی رسی بٹنا۔ "لوی یدہ" ہاتھ کو پھیرنا یا مروڑنا۔ لوی راسہ" سکر کو پھیرنا۔ رب تعالٰی کا ارشاد گرامی ہے "لووا رؤوسھم" انہوں نے اپنے سروں کو پھیرا۔ لوی لسانہ

بکذا" کنایة عن الکذب و تخرص الحدیث " اس نے اپنی زبان کو اس طرح پھیرا یعنی جھوٹی بات کی اور انکل سے بات کی یعنی من گھڑت کلام پیش کیا۔ رب تعالی کے اس ارشاد گرامی "یلوون السنتھم بالکتاب " میں یہی معنی ہے" وہ اپنی زبانوں کو کتاب میں پھیرتے ہیں" یعنی جھوٹ بولتے ہیں اور من گھڑت باتوں کو اللہ تعالی کی کتابوں تورات اور انجیل میں شامل کرتے ہیں۔ (مفردات راغب)

"والمعنی یحرفون الکلم ویعدلون به عن القصد " مطلب یہ ہے کہ وہ کلمات میں تحریف کرتے ہیں اور حق سے اسے پھیر دیتے ہیں۔ (قرطبی)

خیال رہے کہ "لویت الغریم "کا معنی یہ بھی ہے کہ" میں نے قرض خواہ کو ٹال دیا" وفی الخبر "لی الواجد ظلم "، جس شخص کے پاس مال ہو وہ قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول سے کام لے تو یہ ظلم ہے۔ (روح المعانی)

"وفی الحدیث لی الوجد یحل عرضه وعقوبته" جس شخص کے پاس مال ہو وہ قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول سے کال لے تو اسکی بے عزتی کرنا اور اسے سزا دینا جائز ہے۔ (قرطبی)

﴿لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ﴾ "تا کہ تم اسے گمان کرو کتاب سے"

یہ خطاب ہے مؤمنین کو "لتحسبوه " میں منصوب کی ضمیر "محرف " تحریف شدہ کلام کی طرف لوٹ رہی ہے جس پر سیاق وسباق دلالت کر رہا ہے یعنی ماقبل اور مابعد سے یہ بات واضح ہو رہی ہے۔ علامہ آلوسی نے اسی مسئلہ کو ان الفاظ سے بیان فرمایا:

"لتحسبوه من الکتاب "ای لتظنوا ایھا المسلمون ان المحرف المدلول علیه (روح المعانی)

﴿وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ﴾ "حالانکہ وہ کتاب سے نہیں"

یعنی وہ اللہ کی کتابوں توراۃ وانجیل میں تحریف کر کے مؤمنوں کو یہ گمان دلانا چاہتے ہیں کہ یہ تحریف شدہ عبارت بھی اصل توراۃ وانجیل کا حصہ ہیں حالانکہ وہ توراۃ وانجیل کا حصہ نہیں۔

﴿وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾

"اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں"

یعنی وہ بہت کھلے انداز میں بغیر اشارہ کے یہ کہتے ہیں کہ ہم جو کلام پیش کر رہے ہیں کہ یہ اللہ تعالی نے نازل

فرمایا ہے اسی مسئلہ کو علامہ آلوسی رحمہ اللہ ان الفاظ سے پیش کرتے ہیں۔

"ویزعمون صریحا غیر متمکن بالتوراۃ والتعریض ان المحرف او المشابہ نازل من عنداللہ ولیس ھو نازلا من عنداللہ" (روح المعانی)

تنبیہ: راقم نے "وما ھو من الکتاب" اور "وما ھو من عنداللہ" کا ترجمہ حال والا کیا ہے جو روح المعانی کی اس عبارت سے لیا ہے۔ "والواو للحال والجملۃ حال من ضمیر المبتدأ فی الخبر" واؤ حال کے لئے اور خبر میں جو ضمیر مبتداء کی طرف لوٹ رہی ہے یہ جملہ اس سے حال واقع ہو رہا ہے۔

﴿وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ "اور وہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ حالانکہ وہ جانتے ہیں"

"وھم یعلمون" کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ

"(وھم یعلمون) انھم کا ذبون علیہ سبحانہ وھو تسجیل علیھم بان ما افتروہ عن عمد لا خطاء"

وہ جانتے ہیں کہ بیشک وہ جھوٹے ہیں، اللہ تعالی نے ان کے اس فعل پر مہر لگا دی، پختہ طریقے سے بیان فرمادیا کہ وہ جو افتراء باندھتے تھے، جھوٹ بولتے ہیں وہ جان بوجھ کر، غلطی سے نہیں۔

اعلی حضرت رحمہ اللہ نے اسی قول کے مطابق ترجمہ کیا ہے "اور اللہ پر دیدہ ودانستہ جھوٹ باندھتے ہیں" اور دوسرا مطلب یہ ہے" "وقیل (یعلمون) ما علیھم فی ذلک من العقاب" "وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ان پر اس جھوٹ کی وجہ سے شدید عذاب آئے گا" راقم نے کوشش کی ہے کہ الفاظ مبارکہ کا لغوی ترجمہ بھی ہو اور ان دونوں مطالب کو شامل بھی ہو، راقم کا ترجمہ یہ ہے "اور وہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ حالانکہ وہ جانتے ہیں۔

خیال رہے اعلی حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ قرآن پاک کنز الایمان کو اور تفاسیر کو دیکھتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ آپ راجح قول کے مطابق ترجمہ کرتے ہیں اور ادب واحترام کا لحاظ کرتے ہیں۔ اور راقم کا خیال ہوتا ہے کہ طلباء کرام کو دوسرا مطلب بھی ذہن نشین ہو جائے اور ترجمہ میں ہی تمام اقوال سمٹ آئیں تو ان کو سمیٹ لیا جائے۔ اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اصل ہے راقم کا ترجمہ زیادہ مقامات آپ کے ترجمہ کی ہی نقل ہے، یہ بات واضح ہے کہ اصل اور نقل میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

معتزلہ کا استدلال:

معتزلہ نے اپنے مذہب پر اس آیۃ کریمہ سے یہ دلیل پیش کی ہے کہ بندے کا برا فعل اللہ تعالی کی تخلیق نہیں، ورنہ یہ سچا آتا "اولٰئک المحرفون بقولھم ھو من عند اللہ تعالی" کہ ان لوگوں کی تحریف اللہ تعالی کی طرف

سے ہے کیونکہ ان کی تخلیق ہے، ان لوگوں کا دعوی ہی یہ تھا "ان التحریف من عند الله و بخلقه " کہ ان کی تحریف اللہ تعالی کی طرف سے ہے اور اسی کی تخلیق ہے، لیکن رب تعالی نے ان کے دعوے کو رد کردیا کہ ان کی تحریف اللہ تعالی نے نازل نہیں کی اور نہ ہی اللہ تعالی کے حکموں میں سے کوئی حکم ہے۔

اس تمام بحث سے یہ واضح ہوگیا کہ لوگوں کے برے افعال اللہ تعالی کی تخلیق نہیں، بلکہ بندوں کی اپنی تخلیق ہیں، یہ ہیں دلائل جبائی اور کعبی معتزلیوں کے۔

معتزلہ کا رد:

ان المقصود بالنفی کما اشرنا الیه نزوله من عنده سبحانه وهو اخص من کونه من فعله وخلقه ونفی الخاص لا یستلزم نفی العام فلا یدل علی مذهب المعتزلة القائلین بأن افعال العباد مخلوقة لهم لا لله تعالی "

یہود ونصاری کا دعوی یہ تھا کہ ہماری تحریف اللہ تعالی نے نازل فرمائی ہے تو اللہ تعالی نے ان کا رد فرمایا کہ وہ جھوٹے ہیں، اللہ تعالی نے ان کی تحریف کو نازل نہیں فرمایا۔ یہود ونصاری کا یہ عوی ہی نہیں کہ ہماری تحریف اللہ تعالی کا فعل اور اس کی تخلیق ہے، جب ان کا یہ دعوی ہوتا تو ان کے قول کے رد سے سمجھ آتا کہ بندوں کے برے افعال رب تعالی کی تخلیق نہیں۔

معتزلہ کا یہ کہنا ہی سراسر جھوٹ ہے کہ یہود ونصاری کا یہ دعوی تھا "ان التحریف من عند الله و بخلقه" کہ بیشک تحریف اللہ تعالی کی طرف سے ہے اور اس کی تخلیق سے ہے۔ ان کا دعوی تو قرآن پاک نے صرف اتنا بیان کیا "ویقولون هو من عند الله" وہ کہتے کہ یہ اللہ تعالی کی طرف سے ہے' انہوں نے "من عندالله" کے ساتھ "وبخلقه" کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ ان کا دعوی خاص ہے، نفی بھی خاص کی ہے اور یہ قانون بھی دینی طلباء پر مخفی نہیں "نفی الخاص لا یستلزم نفی العام" خاص کی نفی سے عام کی نفی نہیں ہوتی۔

جب ان کا دعوی صرف اتنا تھا کہ یہ اللہ تعالی کی طرف سے (یعنی اس نے جو نازل کیا ہے وہی ہے) تو اسی قول کا رد کیا ﴿وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ یہ اللہ کی طرف سے (نازل) نہیں۔ اس سے یہ ثابت کرنا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ "یہ اللہ تعالی کی تخلیق نہیں" یہ باطل اور جھوٹ ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

یہ حقیقت ہے کہ یہود ونصاری کی طرح معتزلہ بھی جھوٹے ہیں۔ پرانے مذاہب باطلہ کو آج کل پھر اجاگر کیا جارہا ہے لیکن وہ پہلے بھی باطل تھے آج بھی باطل ہیں اور آئندہ بھی انشاء اللہ باطل ہی رہیں گے۔ یہود ونصاری نے

اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں کیسے تحریف کی؟ اس مسئلہ میں دو قول بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) ایک قول یہ ہے "فذهب جمع الى انه ليس فى التوراة سوى كلام الله وان تحريف اليهود لم يكن الا تغييرا وقت القراءة او تاويلا باطلا للنصوص واما انهم يكتبون ما يرومون فى التوراة على تعدد نسخها فلا"

ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ توراۃ میں صرف اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور بیشک یہود کی تحریف یہ تھی کہ پڑھتے ہوئے الفاظ کو اس طرح بدل دیتے تھے کہ اس سے مطالب تبدیل ہو جاتے تھے، اور کبھی الفاظ مبارکہ کے باطل مطالب پیش کرتے تھے، لیکن انہوں نے توراۃ میں اپنی طرف سے کوئی الفاظ شامل نہیں کئے۔ ان لوگوں نے اپنے دعویٰ پر ابن منذر اور ابن ابی حاتم کی وہب ابن منبہ کی روایت کو پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں۔

"ان التوراة والانجيل كما انزلهما الله تعالى لم يغير منهما حرف ولكنهم يضلون بالتحريف والتاويل وكتب كانوا يكتبونها من عند انفسهم ويقولون ان ذلك من عند الله وما هو من عند الله فأما كتب الله تعالى فانها محفوظة لا تحول"

کہ توراۃ وانجیل کو جس طرح نازل فرمایا اسی طرح رہیں، ان میں کسی ایک حرف کو بھی تبدیل نہیں کیا گیا لیکن وہ تحریف یعنی انداز بیان اور غلط مطالب بیان کرنے سے گمراہ ہوئے، وہ اپنی طرف سے مطالب توراۃ وانجیل سے علیحدہ لکھ کر پیش کرتے اور کہتے یہ تھے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا تھا، اصل کتابوں کو وہ تبدیل نہ کر سکے بلکہ وہ محفوظ رہیں۔

ان حضرات کی اور دلیل یہ ہے کہ

"ان النبیﷺ كان يقول لليهود الزامالهم "انتو بالتوراة فاتلوها ان كنتم صادقين"

بیشک نبی کریمﷺ یہود کو الزامی جواب کے طور پر یوں ارشاد فرماتے تھے "تم توراۃ لے آؤ اور اسے پڑھو اگر تم سچے ہو" اگر اصل توراۃ میں تبدیلی ہوتی تو نہ نبی کریمﷺ لانے کا ارشاد فرماتے، اور نہ ہی وہ توراۃ لانے سے رکتے۔ لیکن وہ توراۃ لانے سے رک جاتے تھے، اس کی وجہ یہی تھی کہ توراۃ میں تبدیلی نہیں تھی اسی وجہ سے ان کا موقف ثابت نہیں ہوتا تھا۔ وہ توراۃ کو پیش کرنے سے ہچکچاتے تھے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

(۲) دوسرے حضرات کا قول یہ ہے "وذهب آخرون الى انهم بدلوا وكتبوا ذلك فى نفس كتابهم" کہ انہوں نے اصل کتاب کو تبدیل کر دیا تھا اور اپنی طرف سے اس میں لکھ دیا تھا، ان حضرات کی دلیل قرآن پاک کی آیات ہیں جو ظاہر طور پر دلالت کر رہی ہیں کہ انہوں نے الفاظ کو تبدیل کیا۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ ﴿فَوَيۡلٌ

لِلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْھِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ ﴾ (تو بربادی ہے ان کے لئے جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھوں سے پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے)۔ اسی طرح اور ارشاد گرامی ہے ﴿یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ﴾ وہ کلمات کو اپنی جگہ سے پھیر دیتے ہیں اس پر حضرت ابن عباس ﷺ کی ایک روایت بھی دلالت کر رہی ہے۔

عن ابی عباس ﷺ انہ قال ان النفر الذین لا یکلمھم اللہ یوم القیامۃ ولا ینظر الیھم کتبوا کتابا شوشوہ فیہ نعت محمد ﷺ و خلطوہ بالکتاب الذی کان فیہ نعت محمد ﷺ ثم قالوا ھذا من عند اللہ"

حضرت ابن عباس ﷺ نے فرمایا کہ بیشک کچھ وہ لوگ ہیں جن سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نہ ہی کلام فرمائے گا اور نہ ہی نظر رحمت فرمائے گا یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی طرف سے لکھا تو نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو منتشر کر دیا اور آپ کے اوصاف کو خلط ملط کر دیا پھر کہنے لگے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی وکبیر)

راقم کا موقف:

اس مسئلہ میں یہ ہے کہ ابتدائی طور پر وہ صرف اتنی تحریف کرتے تھے کہ لفظوں کی حرکات وغیرہ کو تبدیل کر دیتے تھے اور پڑھنے کا انداز تبدیل کر کے معانی تبدیل کر دیتے تھے اور مطالب تبدیل کر دیتے تھے کہ ان الفاظ کا یہ مطلب نہیں بلکہ یہ مطلب ہے۔ آہستہ آہستہ وہ ترقی کرتے چلے گئے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں اپنے الفاظ بھی داخل کر دئے راقم کا موقف انشاء اللہ دونوں قولوں میں شاندار تطبیق ثابت کرے گا۔

انجیلوں کی تعداد:

انجیلوں کی تعداد چار ہے۔

(1) **انجیل متی:** یہ انجیل عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے آٹھ سال بعد بارہ حواریوں نے فلسطین کی سرزمین پر سریانی زبان میں لکھی۔

(2) **انجیل مرقس:** یہ انجیل عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے بارہ سال بعد شہر روم میں فرنگی زبان میں ستر شخصوں نے مل کر لکھی۔

(3) **انجیل لوقا:** یہ انجیل بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے بعد ستر شخصوں نے مل کر شہر سکندریہ میں یونانی زبان میں لکھی۔

(4) **انجیل یوحنا:** یہ انجیل عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے تیس سال بعد آپ کے ایک

دوست نے رومی شہروں میں سے ایک شہر اقسس میں انگریزی زبان میں لکھی۔

ان چار انجیلوں میں سے کوئی بھی اصلی انجیل نہیں، اصل انجیل تو صرف وہی ہے جو حضرت عیسی علیہ السلام پر نازل ہوئی، یہ سب انجیلیں آپ کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے بعد بنائی گئیں، جو یقینی طور پر من گھڑت انجیلیں ہیں۔

"یؤید وقوع التغیر فی کتب اللہ وانھا لم تبق کیوم نزلت وقوع التناقض فی الاناجیل وتعارضھا وتکاذبھاوتھافتھا ومصا متھا بعضھا ببعض"

اللہ تعالی کی کتابوں میں حقیقی طور پر ردوبدل کردیا گیا، وہ آج اپنی اصل حالت میں نہ رہیں، اس پر انجیلوں کی تعداداور ان کا اختلاف تائید کررہا ہے، کہ انجیلیں ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ان کے دلائل ایک دوسرے کے مخالف ہیں، یہ انجیلیں ایک دوسری کی تکذیب کررہی ہیں۔ایک دوسری کے خلاف تصادم ان میں پایا گیا ہے۔ (ماخوذازروح المعانی)

انجیلوں کا اختلاف:

چار انجیلوں کا ایک دوسری سے اس طرح اختلاف پایا گیا ہے کہ ان میں مذکور واقعات اور قصص (قصے) ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ایک انجیل میں واقعات کا دوسری انجیل کے واقعات کے خلاف پائے جانے سے یہ واضح طور پر معلوم ہورہا ہے۔

"وفیھا ما تحکم الضرورۃ بانہ لیس من کلام اللہ تعالی اصلا"

کہ ان مذکورہ انجیلوں میں سے کوئی ایک انجیل بھی اللہ کا کلام بالکل نہیں۔

آئیے انجیلوں کے اختلاف پر نظر ڈالئے تو مسئلہ نکھر کرواضح ہوجائے اور شاید یہود ونصاری کے چیلے، چمچے، کڑچھے بھی کچھ سمجھ جائیں۔

متی انجیل : کا بیان یہ ہے کہ عیسی علیہ السلام کو جب سولی پر چڑھایا گیا تو آپ کے ساتھ دو چوروں کو بھی سولی چڑھایا گیا، ایک کو آپ کی دائیں جانب اور دوسرے کو آپ کی بائیں جانب سولی چڑھایا گیا، وہ دونوں چور یہود کے ساتھ مل کر عیسی علیہ السلام سے مزاح اڑارہے تھے اور آپ کو عار دلارہے تھے۔

لوقا کا بیان : لوقا انجیل میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک عیسی علیہ السلام سے مزاح اڑارہا تھا اور دوسرا اسے یہ کہہ رہا تھا کہ تو اللہ تعالی سے کیوں نہیں ڈرتا، ہمیں اسی وجہ سے تو سزادی جارہی ہے۔اس شخص نے آپ کے متعلق کوئی بیہودہ بات نہیں کی، پھر اس نے حضرت عیسی علیہ السلام کو کہا "اے میرے سردار میرا ذکر ملکوت میں رب تعالی کے حضور کر

دینا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا" ہاں تمہارے ساتھ پکا وعدہ ہے کہ تم میرے ساتھ جنت الفردوس میں رہو گے۔

بیان اختلاف:

ولا یخفی ان هذا یؤول الی التناقض فان اللصین عند متی کافران وعند لوقا احدهما مؤمن والأخر کافر"

متی اور لوقا دونوں میں اختلاف واضح نظر آرہا ہے کہ متی کے مطابق دونوں چور کافر تھے کیونکہ دونوں اللہ کے نبی سے مزاح اڑا رہے تھے، اور لوقا کے بیان کے مطابق ایک ان دونوں میں سے مؤمن تھا اور دوسرا کافر تھا۔

مرقس اور یوحنا اس بیان سے خالی ہیں:

"**واغفل هذه القصة مرقس ویوحنا**" مذکورہ بالا واقعہ جو متی انجیل اور لوقا انجیل نے ایک دوسرے کے خلاف بیان کیا ہے، وہ واقعہ مرقس اور یوحنا نے سرے سے بیان ہی نہیں کیا۔ واضح ہوا کہ چار کی چار من گھڑت انجیلیں ایک دوسرے کے مخالف اور متصادم ہیں۔

ایک اور اختلاف دیکھئے:

لوقا انجیل نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت یسوع (عیسیٰ علیہ السلام) نے فرمایا ہے کہ انسان دو انسانوں کو ہلاک کرنے کیلئے نہیں آیا بلکہ زندہ رکھنے کیلئے آیا ہے اور دوسری انجیلوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان روئے زمین پر کوئی سلامتی لے کر نہیں آیا، بلکہ تلوار اور جلانے والی آگ لے کر آیا ہے۔

"**ولاشک عن هذا تناقض احدهما یقول جاء رحمة اللعلمین والأخر یقول جاء نقمة علی الخلائق اجمعین**"

یہ بات بغیر کسی شک وشبہ کے ثابت ہے کہ ان دونوں قوموں میں تناقض (مخالفت) ہے۔ ایک انجیل سے یہ سمجھ آرہا ہے کہ انسان سب کیلئے رحمت بن کر آیا ہے، اور دوسری انجیلوں سے یہ سمجھ آرہا ہے کہ انسان لوگوں کیلئے عذاب بن کر آیا، انسان صرف انتقامی کاروائیوں کیلئے آیا ہے۔

انجیلوں کا ایک اور اختلاف دیکھئے:

متی انجیل میں ہے کہ حضرت یسوع (عیسیٰ علیہ السلام) نے اپنے بارہ شاگردوں کو کہا کہ تم آئندہ بارہ کرسیوں پر

بیٹھو گے، تم ایسے دیندار ہو گے جیسے اسرائیل علیہ السلام (یعقوب علیہ السلام) کے بارہ بیٹے دیندار تھے۔ پھر آپ نے ان تمام کی قیامت کے دن کامیابی کی خبر دی۔ پھر اسی متی انجیل اور دوسری انجیلوں نے اس کے خلاف بیان کیا کہ ان شاگردوں میں سے ایک یہودا تھا جس نے یہودیوں سے تیس درھم رشوت لے کر حضرت عیسی علیہ السلام کا انکو پتہ دے دیا، بلکہ کے سپاہیوں کو ساتھ لے آیا اور حضرت عیسی علیہ السلام کو ان کے حوالے کر دیا، آپ نے فرمایا اس کیلئے بربادی ہو، کاش یہ بیدار ہی نہ ہوتا۔ متی کے ایک قول کے مطابق بارہ نیک تھے، قیامت میں وہ سب اللہ تعالی کے مقرب تھے، اور دیندار تھے اور متی کے دوسرے قول کے مطابق ایک ان میں سے بدترین گنہگار تھا۔

ایک ہی انجیل کے دو قول ایک دوسرے کے مخالف ٹھہرے جو انجیل کے من گھڑت ہونے پر دلالت کر رہے ہیں، صحیح انجیل تو صرف وہ تھی جو عیسی علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ (روح المعانی)

تفسیر نعیمی سے ایک خوبصورت اقتباس:

اس امت میں بھی بعض لوگ یہود سے پیچھے نہ رہے، بلکہ انہوں نے ان سے چار قدم آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے الہامات اس پر گواہ ہیں کہ کچھ عبارتیں اپنی اور کچھ قرآن پاک کی آیتیں ملا کر کہتے ہیں کہ یہ مجھے الہام ہوا۔

"یا ایتھا المراۃ توبی توبی انا رادوہ الیک وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا الی یوم القیامۃ"

یہ مرزا جی کا الہام ہے ماشاء اللہ مخمل کے کپڑے میں ٹاٹ کا پیوند۔ اب ذرا ترجمہ سنئے:

> ''اے محمدی بیگم (مرزا جی کی عرشی منکوحہ) توبہ توبہ کر (تو دوسرے کے نکاح میں کیوں چلی گئی) اے مرزا جی ہم اس عورت کو تم پر لوٹائیں گے اور تمہارے متبعین کو قیامت تک کفار پر غالب رکھیں گے، (حالانکہ مرتے دم تک محمدی بیگم مرزا جی کے ہاتھ نہ آئی)

یہ ہے ''یَلْوٗنَ اَلْسِنَتَھُمْ'' کی کھلی مثال مگر چونکہ قرآن پاک کا رب تعالی محافظ ہے، اس لئے یہ تحریفیں مٹ گئیں، قرآن پاک اپنے اصلی سے جگمگا تا رہے گا (جگمگا رہا ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک جگمگا تا رہے گا) (نعیمی)

مودودی صاحب کی کذب بیانی:

مودودی صاحب ﴿یَلْوٗنَ اَلْسِنَتَھُمْ﴾ کی تفسیر یوں بیان کرتے ہیں، اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ

کتاب الٰہی کے معانی میں تحریف کرتے ہیں، یا الفاظ کا الٹ پھیر کر کچھ سے کچھ مطالب نکالتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کتاب کو پڑھتے ہوئے کسی خاص لفظ یا فقرے کو جو ان کے مفاد یا ان کی خود ساختہ عقائد ونظریات کے خلاف پڑتا ہو، زبان کی گردش سے کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔

اس کی نظیریں قرآن کو ماننے والے اہل کتاب سے بھی مفقود نہیں ہیں، مثلاً بعض لوگ جو نبی کی بشریت کے منکر ہیں آیۃ ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ میں "انما" کو "ان ما" پڑھتے ہیں، اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ "اے نبی کہہ دو کہ تحقیق نہیں ہوں میں بشر تم جیسا" (تفہیم القرآن)

اس کے متعلق اتنا ہی کہنا آسان ہے "لعنة الله على الكذبين" کیونکہ نبی کریم ﷺ کی نورانیت کے منکر کو تو بہت لوگ ملتے ہیں، لیکن نبی کریم ﷺ کی بشریت کا کوئی منکر نہیں۔

ہاں البتہ اہلسنت وجماعت کا یہ مذہب ہے کہ نبی کریم ﷺ حقیقت میں نور ہیں اور ظاہر طور پر بشر ہیں۔ آج تک کسی اہل سنت وجماعت کے عالم نے یہ معنی نہیں کہا جو مودودی صاحب نے اہل سنت وجماعت کی طرف منسوب کیا ہے "اللهم انا اعوذبك من الكذبين" "انما" کا لفظ حصر کیلئے آتا ہے "ما" اور "الا" کا معنی دیتا ہے۔

بعض حضرات مختصر معنی بیان کر دیتے ہیں۔ ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ "فرمادیجئے بیشک میں بشر ہوں تمہارے جیسا" (یہ ترجمہ کامل نہیں) کامل ترجمہ جو طلباء کو ہم کراتے ہیں وہ یہ ہے "فرمادیجئے جز ایں نیست میں بشر ہوں تمہارے جیسا" عام فہم ترجمہ یہ ہے "سوائے اس کے نہیں کہ میں بشر ہوں تمہارے جیسا" کبھی یوں ترجمہ کیا جاتا ہے "فرمادیجئے میں نہیں مگر تمہارے جیسا بشر" اس ترجمہ سے مودودی صاحب غلطی کا شکار ہوئے ہیں کہ آپ نے کسی سنی مولوی کی تقریر سنی اور لفظ "مگر" کی طرف توجہ نہ کر سکے، خبط حواسی اور ضد کی وجہ سے انہوں نے یوں سمجھ لیا کہ وہ مولوی یوں ترجمہ کر رہا تھا "فرمادیجئے کہ میں نہیں ہوں تمہارے جیسا بشر" "مگر" کو مودودی صاحب نہ سن سکے، "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" کے متعلق جھوٹی الزام تراشی علماء اہلسنت پر، اللہ تعالیٰ جھوٹے الزامات سے محفوظ رکھے، دجال جس کی ایک آنکھ نہیں ہوگی اس (کانڑے) سے نبی کریم ﷺ نے پناہ طلب کرنے کے متعلق اسی وجہ سے ارشاد فرمایا کہ وہ جھوٹا اور مکار ہوگا۔

عن قتادة قال سمعت رسول الله ﷺ ما منى نبى الا وقد انذر امته الا عور الكذاب الا انه اعور وان ربكم عزوجل ليس يا عور مكتوب بين عينيه ك ف ر "

(مسلم ۲ باب ذکر الدجال صفحہ نمبر ۴۰۸)

حضرت قتادہ صفرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، کوئی نبی نہیں مگر یہ کہ اس نے اپنی امت کو یک چشم گل (کانڑے) چھوٹے سے ڈرایا، خبردار وہ یک چشم گل (کانڑا) ہوگا، بیشک تمہارا رب عزوجل یک چشم گل نہیں اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لکھا ہوگا ''ک ف ر'' کہ وہ کافر ہوگا۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ○ (آیۃ نمبر ۷۹)

(1) کسی آدمی کا حق نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکم و پیغمبری دے پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ، ہاں یہ کہے گا کہ اللہ والے ہو جاؤ اس سبب سے کہ تم کتاب سکھاتے ہو اور اس سے کہ تم درس کرتے ہو۔ (کنز الایمان)

(2) نہیں ہے کسی بشر کیلئے کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور نبوت دے، پھر وہ کہے لوگوں سے ''تم ہو جاؤ میرے بندے سوائے اللہ کے، اور (وہ کہے گا) لیکن ہو جاؤ اللہ والے اس سبب سے کہ تم سکھاتے ہو کتاب، اور اس سبب سے کہ تم پڑھتے رہتے ہو۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول :

شان نزول کی چند وجوہ ہیں جو تمام ہی مجموعی طور پر پائی گئی ہیں، یعنی چند واقعات کے بعد آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

(1) حضرت ابن عباس ﷺ نے بیان فرمایا کہ ابو رافع قرظی نے بیان فرمایا کہ جب اہل نجران سے یہود و نصاری کا ایک وفد رسول اللہ ﷺ کے پاس جمع ہوا تو آپ نے ان کو دعوت اسلام دی، تو وہ کہنے لگے۔

''اترید یا محمد ان نعبدک کما تعبد النصاری عیسی ابن مریم''

اے محمد! کیا تم یہ ارادہ رکھتے ہو کہ ہم تمہاری عبادت کریں جیسا کہ نصاری عیسی ابن مریم کی عبادت کرتے تھے۔

ان اہل نجران میں ایک نصرانی تھا، جسے رئیس کہا جاتا تھا، وہ کہنے لگا "او ذاك تريد منا يا محمد" اے محمد کیا واقعی تم ہم سے یہی ارادہ رکھتے ہو؟"فقال رسول الله ﷺ "معاذالله ان نعبد غير الله او نامر بعبادة غيره" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "معاذ اللہ" (اللہ کی پناہ) ہم اللہ کے بغیر کسی اور کی عبادت کریں یا کسی اور کی عبادت کا حکم دیں۔

"فانزل الله آية" اس واقعہ پر اللہ تعالی نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔

(2) عبد بن حمید حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ یہ آیۃ کریمہ اس وقت نازل ہوئی جب ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا۔

> يارسول الله نسلم عليك كما يسلم بعضنا على بعض افلا نسجد لك ؟ قال، لا، ولكن كونوا اكرموا نبيكم واعرفوا الحق لاهله فانه لاينبغي ان يسجد لاحد من دون الله"
>
> یارسول اللہ ہم آپ کو ایسے ہی سلام کرتے ہیں جیسے ہمارے بعض بعض کو سلام کرتے ہیں، کیا ہم آپ کو سجدہ نہ کرلیا کریں؟ آپ نے فرمایا نہیں، لیکن تم اپنے نبی کی عزت کرو، اور حق کو پہچانوں کہ اس حق کا حقدار کون ہے، کسی کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرے۔

(3) یہود کے بعض لوگ بعض کی عبادت کرتے تھے، اور اللہ تعالی کی کتابوں میں تحریف کردیتے تھے، اور کہتے یہ تھے کہ یہ اللہ کی کتاب میں ہے، ان کا یہ کہنا اللہ تعالی کی طرف منسوب ہوتا تھا، تو اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا گیا۔ (از روح المعانی)

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾

"نہیں ہے کسی بشر کیلئے کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور نبوت دے پھر وہ کہے لوگوں سے تم ہو جاؤ میرے بندے سوائے اللہ کے"

ان الفاظ مبارکہ کے چند مطالب ہیں:

(1) بالفرض محال "انهم لو ارادوا ان يقولوا ذلك لمنعهم الله عنه"

اگر وہ یہ کہنے کا ارادہ کریں کہ ہمیں خدا کہو، تم اللہ کے سواء ہمارے بندے بن جاؤ تو اللہ تعالی ان کو منع کردے گا۔

اس پر دلیل یہ ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴾ (سورۃ الحاقۃ آیہ نمبر۴۴،۴۵) ''اور اگر وہ ہم پر ایک بات بھی بنا کر کہتے، ضرور ہم ان سے بقوت بدلہ لیتے''

سورۃ الحاقہ کی آیات مبارکہ کا اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہی یہ بتا رہا ہے کہ یہ کلام بالفرض محال پر مبنی ہے، کہ ''اگر وہ بات بناتے ہم ان کو گرفت میں لیتے'' نہ انہوں نے کہا نہ ہی ان کی پکڑ ہوئی، اسی طرح یہاں بھی یہی مطلب ہے کہ اگر بالفرض محال وہ ارادہ کرتے تو رب تعالیٰ ان کو روک دیتا، نہ انہوں نے ارادہ کیا نہ ہی روکنے کی ضرورت درپیش آئی۔

(2) دوسرا مطلب یہ ہے ''الثانی ان الانبیاء علیھم السلام موصوفون بصفات لا یحسن مع تلک الصفات ادعاء الالھیة والربوبیة''
کہ انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ نے کامل صفات عطاء فرمائی ہیں جن کے ہوتے ہوئے ان سے تصور ہی ممکن نہیں کہ وہ اپنی الوہیت اور اپنی ربوبیت کا دعویٰ کریں۔

(3) ومنھا ان اللہ تعالی آتاھم الکتاب والوحی وھذا لا یکون الا فی النفوس الطاھرة والارواح الطیبة والنفس الطاھرة یمتنع ان یصدر عنھا ھذہ الدعوی''
اور اس کے مطالب سے یہ مطلب ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے ان کو کتاب عطاء فرمائی اور ان کی طرف وحی کی یہ منصب صرف پاکیزہ نفوس اور پاکیزہ ارواح کو ہی حاصل ہوسکتا ہے، اور پاکیزہ نفوس سے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنی الوہیت و ربوبیت کا دعویٰ کریں۔

انبیاء کرام کے نفوس کی طہارت اور ان کی ارواح کے طیب ہونے پر ارشادات باری تعالیٰ روز روشن کی طرح دلالت کر رہے ہیں۔ ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ ''اللہ خوب جانتا ہے کہ کہاں (منصب) رسالت کو رکھتا ہے''

﴿وَلَقَدِ اخْتَرْنَاهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعَالَمِيْنَ﴾ (الدخان ۳۲)
''اور تحقیق ہم نے اس کو چن لیا ہے علم پر اس جہان والوں پر''

﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ ''اللہ ہی پسند فرماتا ہے ملائکہ سے پیغام پہنچانے والوں کو اور لوگوں سے رسولوں کو''

(4) اللہ تعالیٰ نبوت ان ہستیوں کو عطاء فرماتا ہے جن کی قوت نظریہ اور قوت عملیہ کامل ہو، قوت نظریہ کو کمال حاصل ہوتا ہے علوم اور معرفت حقیقیہ سے، اور قوت عملیہ کو کمال حاصل ہوتا ہے جب وہ برے اخلاق سے پاک ہو،

جب رب تعالی بعض شخصیات کو قوت نظریہ اور قوت عملیہ میں کمال عطاء فرما دیتا ہے، ان میں سے جن کو منصب رسالت کا اہل سمجھتا ہے ان کو منصب رسالت عطاء فرما دیتا ہے ایسی ہستیوں سے یہ ممکن نہیں کہ وہ خود اپنی الوہیت (خدائی) کا دعوی کر بیٹھیں۔

(5) ان اللہ تعالی لایشرف عبدہ بالنبوۃ و الرسالۃ الا اذا علم منہ انہ لا یقول مثل ھذالکلام"

اللہ تعالی کو چونکہ معلوم ہوتا ہے کہ میرے اس بندے نے منصب رسالت و نبوت پر فائز ہو کر اپنے معبود ہونے کا کوئی دعوی نہیں کرنا ان کو ہی نبوت عطاء کرتا ہے۔

(6) اللہ کے رسول دعوی کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے احکام پہنچا رہے ہیں، وہ اپنے اس دعوی کی صداقت پر معجزات کے ذریعے دلیل قائم کرتے ہیں کہ رب تعالی کی طرف سے ہمیں جو معجزات عطاء کر دئے گئے ہیں وہی ہماری صداقت کے لئے کافی ہیں۔

"فلو امرھم بعبادۃ نفسہ فحینئذ تبطل دلالۃالمعجزۃ علی کونہ صادقا و ذلک غیر جائز"

اگر نبی اپنی عبادت کرنے کا حکم دیں کہ تم ہماری عبادت کرو تو ان کا معجزات کے ذریعے اپنی نبوت پر دعوی کی صداقت پر دلیل قائم کرنا ممکن نہیں رہتا، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ نبی اپنی صداقت معجزات کے ذریعے ظاہر کرے اور پھر دعوی خدائی بھی کرے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ﴾ میں بشر سے مراد کون ہے، بعض حضرات نے بیان کیا ہے "بشر" سے مراد حضرت عیسی علیہ السلام ہیں اور کتاب سے مراد "انجیل" ہے یعنی عیسی علیہ السلام کے لائق نہ تھا کہ آپ کو انجیل اور حکم اور نبوت عطاء کی گئی تو آپ نے یہ کہا ہو کہ تم میرے بندے بن جاؤ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ آیۃ کریمہ میں بشر سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں اور کتاب سے مراد قرآن پاک ہے چونکہ ہم یہود کے جواب میں آیہ کریمہ نازل ہوئی جب انہوں نے کہا "یا محمد اترید ان نعبدك و نتخذك ربا" اے محمد ﷺ کیا تم یہ ارادہ رکھتے ہو کہ ہم تمہاری عبادت کریں اور تمہیں رب مانیں۔ اگرچہ نبی کریم ﷺ نے یوں جواب دے دیا:-

"قال معاذاللہ ان آمر بعبادۃ غیر اللہ و مابذلک امرنی اللہ و مابذلک بعثنی فانزل اللہ ھذہ آلایۃ"

اللہ کی پناہ کہ میں کسی کو اللہ کے غیروں کی عبادت کو حکم دوں مجھے اللہ تعالی نے نہ ہی اس کا حکم دیا ہے اور نہ ہی اسکے لئے مجھے مبعوث کیا ہے تو آپ کے اس ارشاد پر اللہ تعالی نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما دیا۔

لیکن زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ "بشر" سے مراد عام ہو اور کتاب سے مراد بھی عام ہو جو ہر آسمانی کتاب کو شامل ہو۔

ما کان لبشر ای ماینبغی لبشر ولجمیع بنی آدم لاواحدلہ من لفظہ کالقوم و الرھط

ویوضع موضع الواحد والجمع"

لفظ بشر واحد اور جمع دونوں پر اطلاق ہوتا ہے جس طرح قوم اور رھط کا کوئی اور مفرد نہیں یہ خود ہی مفرد ہیں لیکن جمع پر بولے جاتے ہیں ایسے ہی لفظ بشر کا کوئی اور مفرد نہیں یہ خود مفرد ہے اور اس کا اطلاق مفرد پر بھی ہوتا ہے اور جمع پر بھی۔

اس لحاظ سے معنی یہ ہوگا کہ بنی آدم سے کسی بشر کے یہ لائق نہیں کہ اسے کتاب، حکم اور نبوت دی جائے تو وہ کہے کہ میرے بندے ہو جاؤ۔ (ماخوذ از خازن)

عموم الفاظ کا لحاظ کرتے ہوئے یہ آیۂ کریمہ تمام انبیاء کرام اور تمام آسمانی صحیفوں اور کتابوں کو مشتمل ہے۔خیال رہے کہ خازن کی طرح ہی معالم التنزیل میں بھی ہے اور کبیر میں بھی تقریباً یہی ہے۔"والحکم "یعنی الحکمة والسنة او امضاء الحکم 'حکم عطاء کرنے سے مراد یہ ہے کہ 'اللہ تعالی اسے حکمت عطاء کرے اور سنت عطاء کرے یا معنی یہ ہوگا کہ حکم جاری کرنے کی اجازت دی جائے۔ (مظہری)

"والحکم ای الفهم والعلم وقیل امضاء الحکم عن الله عز وجل "

حکم کا مطلب علم وفہم ہے، یعنی اللہ تعالی اسے علم وفہم عطا کردے، اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالی اسے اپنے احکام جاری کرنے کی اجازت دے دے۔ (معالم التنزیل للبغوی)

چونکہ لفظ"حکم" وسیع تر مفہوم کے پیش نظر کئی معانی اور مطالب پر مشتمل تھا، اسی وجہ سے اعلی حضرت رحمہ اللہ نے اپنے ترجمہ میں حکم کا معنی بھی حکم ہی کیا ہے تاکہ تمام مطالب کو شامل ہو جائے، راقم نے بھی یہی معنی نقل کیا ہے۔

"والنبوة "ای المنزلة الرفیعة " نبوت سے مراد 'بلند مرتبہ' ہے، نبی چونکہ اللہ تعالی اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ ہیں، بحیثیت نورانیت کے رب تعالی سے فیض لیتے ہیں، اور بحیثیت بشر ہونے کے بندوں تک وہ فیضان پہنچاتے ہیں، اس منصب کی وجہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اللہ تعالی کی مخلوق میں سب سے بلند مقام انبیاء کرام کا ہے، پھر انبیاء کرام میں سے بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے، تفصیل تیسرے پارے کی ابتداء نجوم الفرقان میں دیکھئے۔

﴿ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾

"پھر وہ کہے لوگوں سے تم ہو جاؤ میرے بندے اللہ کے سواء"

"العباد جمع عبد قال القاضي وهو هنا من العبادة ولم يقل عبيدا لانه من العبودية وهي لا تمنع ان تكون لغير الله تعالى ولهذا يقال هؤلاء عبيد زيد ولا يقال عباده"

عباد جمع ہے عبد کی، قاضی اور ابو زید نے کہا کہ ''عباد'' عبادت سے لیا ہوا ہے، اسی وجہ سے ''عبید'' نہیں کہا گیا، کیونکہ رب تعالی کے غیروں کی عبادت منع ہے، عبودیت منع نہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ کہا جاسکتا ہے "ھؤلاء عبید زید" یہ زید کے غلام ہیں، لیکن یہ کہنا جائز نہیں "ھؤلاء عباد زید" یہ زید کے بندے ہیں۔ (روح المعانی)

نتیجہ: واضح ہے کہ بندوں کی غلامیت تو پائی گئی ہے لیکن بندوں کی عبادت نہیں پائی گئی۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ''میں تین ترکیبیں پائی گئی ہیں''

(1) مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ متعلق ہوجائے ''عبادا'' کے کیونکہ اس میں فعل والا معنی بھی موجود ہے ''عبادت کرو''

(2) ''عبادا'' صفت اول ہو اور مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ صفت ثانیہ ہو۔

(3) ''عبادا'' حال واقع ہو اور مِنْ دُوْنِ اللّٰہ صفت کی وجہ نکرہ مخصصہ ہوجائے۔ (از روح المعانی)

"وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ" لیکن ہو جاؤ اللہ والے یہاں کچھ الفاظ پوشیدہ ہیں، مطلب یہ ہے "وَلٰكِنْ يَقُوْلُ لَهُمْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ" (لیکن وہ ان کو کہتے ہیں ہوجاؤ اللہ والے) "رَبّٰنِيّٖنَ" بظاہر ایک لفظ ہے لیکن کثیر معانی پر مشتمل ہے۔

(1) اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ "ربانی" اصل میں "ربی" ہے جس میں یا نسبت کی پائی گئی ہے، یعنی منسوب ہے رب کی طرف، مفہوم یہ حاصل ہوا کہ وہ اللہ کو جاننے والا ہے اور اس کی طاعت (فرمانبرداری) پر ہمیشہ عمل کرنے والا ہے، جسطرح کہا جاتا ہے "رجل الھی" اس میں بھی یاء نسبت کی ہے، معنی اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالی کی معرفت اور اس کی طاعت کی طرف متوجہ ہونے والا، الف اور نون "ربانی" میں مبالغہ کیلئے ہے جو اس صفت کے کمال پر دلالت کررہا ہے، یعنی وہ کہیں گے خالص اور کامل اللہ والے ہوجاؤ۔

جب کسی کو یہ کہنا مقصود ہو کہ وہ بالوں والا ہے تو کہا جاتا ہے "ھو شعری" اور جب یہ کہنا مقصود ہو کہ وہ زیادہ بالوں والا ہے تو کہا جاتا ہے "ھو شعرانی" داڑھی والے کو کہتے "لحیی" اور لمبی اور گھنی داڑھی والے کو کہتے ہیں "لحیانی" اسی طرح گردن کی طرف نسبت کرنی تو کہا جاتا ہے "رقبی" اور جب موٹی گردن والا کہنا ہو تو کہا جاتا ہے "رقبانی"

(2) دوسرا مطلب یہ ہے کہ "ربانیون" کا مطلب ہے ''اصحاب علم'' واحد اس کا ہے "ربانی"

"ھو الذی یرب العلم ویرب الناس ای یعلمھم ویصلحھم ویقوم بامرھم"

اس صورت میں "ربانی" کا مطلب علم حاصل کرنے والا، اور لوگوں کی تربیت کرنے والا، یعنی لوگوں کو علم سکھانے والا، اور ان کی اصلاح کرنے والا، اور ان کے معاملات کو درست کرنے والا، اس صورت میں بھی الف ونون مبالغہ کیلئے ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے "ریان، عطشان، شعبان اور عریان "ان سب میں مبالغہ کا معنی پایا گیا ہے۔ زیادہ سیر آب" زیادہ پیاسا، زیادہ سیر، زیادہ ننگا۔

اس صورت میں اور پہلی صورت میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں "الف ونون" زائد ہیں، اور دوسری صورت میں کلمہ کے ہیں۔

(3) الربانی هو الذی یرب الناس فالربانیون هم ولاة الامة و العلماء"

"ربانی" اسے کہا جاتا ہے جو لوگوں کی تربیت کرے، لھذا حکام اور علماء کو "ربانیون" کہا جائے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴾

"اور اس سبب سے کہ تم پڑھاتے ہو کتاب اور اس سبب سے کہ تم پڑھتے رہتے ہو"

خیال رہے کہ "تُعَلِّمُوْنَ" میں دو قرأتیں ہیں ایک تخفیف والی، یعنی یہ لفظ ماخوذ ہے "علم یعلم علما" سے اور دوسری قرأت میں تشدید ہے، یعنی "تُعَلِّمُوْنَ" تعلیم سے ماخوذ ہے۔

"وکلاهما صواب لانهم کانو یعلمونه فی انفسهم ویعلمونه غیرهم"

دونوں قرأتیں درست ہیں، یعنی وہ خود علم حاصل کرتے ہیں، اور غیروں کو علم سکھاتے ہیں۔ (کبیر)

وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُوْنَ (اور اس سبب سے کہ تم پڑھتے رہتے ہو) "تَدْرُسُوْنَ" کا معنی "درس الکتاب" (اس نے کتاب پڑھی) اور "درس العلم" سے لیا ہوا ہے، درس العلم (اس نے علم حاصل کیا) یعنی اسباق کو یاد کر کے علم کے اثرات کو حاصل کیا۔

"ولما کان تناول ذلک بمداومة القراة عبر عن ادامة القراة بالدرس"

جب علم حاصل کرنے کیلئے بار بار پڑھنا پڑتا ہے، جب لگا تار پڑھتے رہیں تو علم حاصل ہوتا رہتا ہے ورنہ حاصل کئے ہوئے مسائل بھول جاتے ہیں، اس لئے ہمیشہ پڑھنے کو جاری رکھنے کو درس کہا جاتا ہے، اللہ تعالی کے ارشاد گرامی "ودرسوا مافیه" میں یہی معنی لیا گیا ہے (وہ پڑھتے رہو جو اس میں ہے) اور رب تعالی کے ارشاد گرامی "وَبِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُوْنَ" میں بھی یہی معنی استعمال ہے۔ (مفردات راغب)

راقم نے مفردات راغب کو ہی دیکھ کر ترجمہ لکھا ہے"اور اس سبب سے کہ تم پڑھاتے ہو کتاب اور اس سبب سے کہ تم پڑھتے رہتے ہو"

فائدہ جلیلہ گذشتہ سے پیوستہ:

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ﴾ "کسی بشر کیلئے نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے کتاب اور حکم اور نبوت عطاء کرے" ﴿ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ﴾ "پھر وہ لوگوں کو کہے تم میرے بندے ہو جاؤ" اس مقام پر تین چیزوں کا ذکر کیا "کتاب" اور "حکم" اور "نبوت" "اشارة الی ثلاثة اشیاء و ذکرھا علی ترتیب فی غایة الحسن" ان تین چیزوں میں بہت اچھی ترتیب رکھی گئی ہے۔

وذلک لان الکتب السماوی ینزل اولا، ثم انه یحصل فی عقل النبی فهم ذلک الکتاب، والیه الاشارة بالحکم، فان اهل اللغة والتفسیر اتفقوا علی ان هذا الحکم هو العلم قال تعالی "وآتیناه الحکم صبیا" یعنی العلم والفهم، ثم اذا حصل فهم الکتاب فحینئذ یبلغ ذلک الی الخلق وهو النبوة فما احسن هذا الترتیب"

آسمانی کتابوں کو پہلے نازل کیا جاتا ہے، پھر نبی کی عقل میں اس کتاب کا علم وفہم ڈال دیا جاتا ہے، اسی کا ذکر "حکم" سے کیا کیونکہ اہل لغت اور اہل تفسیر کا اس پر اتفاق ہے کہ اس مقام میں "حکم" سے مراد "علم" ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی "وَاٰتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا" میں "حکم" سے مراد "علم وفہم" ہے، یعنی ہم نے عطاء کیا اسے (یحییٰ علیہ السلام کو) علم وفہم بچپن میں، پھر جب کتاب کی سمجھ عطاء کر دی جاتی ہے تو اس وقت نبی مخلوق کو تبلیغ کرتے ہیں، وہ ہے نبوت، اب دیکھئے کتاب کا ذکر پہلے، حکم (علم وفہم) کا ذکر اس کے بعد، اور نبوت کا ذکر اس کے بعد، کتنی ہی اچھی ترتیب رکھی گئی ہے۔ (از تفسیر کبیر)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

لفظ "ما" دونوں جگہ مصدر کیلئے ہے، تقدیر عبارت کی یہ ہے۔ "کونوا ربانیین بسبب کونکم عالمین ومعلمین وبسبب دراستکم الکتاب" (بلکہ وہ کہتے ہیں) تم اللہ والے ہو جاؤ بسبب عالم اور معلم ہونے کے اور بسبب تمہارے کتاب پڑھنے کے۔ (کبیر)

فائدہ عظیمہ: دلت الآیۃ علی ان العلم والتعلیم والدراسۃ توجب کون الانسان ربانیا" آیۃ کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ علم اور تعلیم اور درایۃ سے انسان ربانی بن جاتا ہے، لیکن صرف علم حاصل کرنا مقصود نہیں، بلکہ مقصود یہ ہے۔

"وما ذاک الاان یکون بحیث یکون تعلمہ للہ وتعلیمہ و دراسۃ للہ وبالجملۃفان یکون الداعی لہ الی جمیع الافعال طلب مرضاۃ اللہ والصارف لہ عن کل الافعال الھرب عن عقاب اللہ"

کہ وہ علم و تعلیم و درایۃ صرف اللہ تعالی کیلئے ہو، اس میں دنیا کا مال حاصل کرنا، ریاء کاری اور چرچا مقصود نہ ہو، تمام افعال میں مقصد اللہ تعالی کی رضاءمندی حاصل کرنا ہو، اور تمام افعال پر مقصد اللہ تعالی کے عذاب سے بچنا مقصود ہو۔

"فمن اشتغل بالتعلیم والتعلیم لالھذاالمقصود ضاع سعیہ وخاب عملہ"

جس شخص نے علم حاصل کرنے میں اللہ تعالی کی رضامندی کو مدنظر نہ رکھا اس کی کوشش ضائع ہوگئی اور اس کے عمل ضائع چلے گئے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "نعوذباللہ من علم لا ینفع وقلب لایخشع" ہم اللہ کی پناہ پکڑتے ہیں اس علم سے جس میں نفع نہ ہو، اور اس دل سے جس میں خشوع نہ ہو۔ (ماخوذ از کبیر بتقدیم وتاخیر)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَلَا یَاْمُرَکُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِکَۃَ وَالنَّبِیّٖنَ اَرْبَابًا اَیَاْمُرُکُمْ بِالْکُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝

(آیۃ نمبر ۸۰)

(1) اور نہ تمہیں یہ حکم دے گا کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا ٹھہرا لو کیا تمہیں کفر کا حکم دے گا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو لئے۔ (کنزالایمان)

(2) اور نہیں تمہیں حکم دے گا کہ تم ٹھہرا لو فرشتوں اور نبیوں کو رب، کیا حکم دے گا تمہیں کفر کا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو گئے۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول :

تقریبا وہی جو پچھلی آیۃ میں گزر چکا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قریش کو کہا کہ تم فرشتوں کی عبادت نہ کرو اور یہود

کو کہا تم عزیز علیہ السلام کی عبادت نہ کرو، اور نصاریٰ کو کہا تم عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت نہ کرو، تو ان سب کی طرف سے یہ جواب تھا "الترید ان نتخذک ربا" کیا تم ارادہ رکھتے ہو کہ ہم تمہیں رب ٹھہرالیں۔ اس وقت یہ آیۃ کریمہ اور اس سے پہلے جو آیۃ ہے یہ نازل ہوئیں۔

پہلی آیۃ کریمہ کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی بشر کے لائق نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے کتاب اور علم وفہم اور نبوت عطاء کرے تو وہ لوگوں کو کہے کہ تم میرے بندے ہو جاؤ، بلکہ وہ تو کہتا ہے تم اللہ والے ہو جاؤ کیونکہ تم اہل کتاب ہو کہ کتاب پڑھتے ہو اور پڑھاتے ہو۔ اس آیۃ کریمہ کا تعلق چونکہ ماقبل سے ہی ہے، اس لئے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی بشر کے لائق نہیں کہ اسے کتاب، اور علم وفہم، اور نبوت عطاء کی جائے تو وہ تمہیں حکم دے کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب ٹھہرالو، کیا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نبی تمہیں حکم دے کہ تم اسلام لانے کے بعد کافر ہو جاؤ؟ ایسا نہیں ہو سکتا، کبھی نہیں ہو سکتا۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

راقم نے ابھی جو دونوں آیات کا خلاصہ بیان کیا ہے وہ اسی ترکیب کے مطابق ہے جس میں "ولا یامرکم" کو منصوب پڑھا گیا ہے، اور عطف اس کا "یقول" پر ہے تو یقینی بات ہے کہ معطوف علیہ سے پہلی عبارت ساتھ ملے گی اور یہ بھی خیال رہے کہ خلاصہ سے یہ بھی سمجھ آ رہا ہے کہ "ولا یامرکم" میں "لا" زائد ہے نفی والا معنی "ماکان لبشر" سے سمجھ آ رہا ہے۔ زیادہ مفسرین کرام کا رجحان اسی ترکیب کی طرف تھا اسی لئے راقم نے دونوں آیات کا خلاصہ اسی ترکیب کے مطابق تحریر کر دیا ہے۔

دوسری ترکیب یہ ہے کہ "ولا یامرکم" مرفوع ہے اور جملہ استینافیہ ہے، اس کا عطف "یقول" پر نہیں، اور "لا" بھی زائد نہیں، بلکہ تاکید نفی کیلئے ہے۔ جملہ استینافیہ کبھی سوال کے جواب میں بھی آتا ہے، اس ترکیب کے لحاظ پر ضمناً سوال ہوگا کہ نبی یہ حکم تو نہیں دیتے کہ تم ہمارے بندے ہو جاؤ، لیکن کیا یہ حکم دیتے ہیں کہ فرشتوں کو اور ہمارے بغیر دوسرے نبیوں کو خدا ٹھہرالو؟ تو اس کا جواب دیا گیا کہ نبی تمہیں حکم نہیں دیتے کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب ٹھہرالو۔
(ماخوذ از کبیر وروح المعانی)

ابھی تک جو بحث کی ہے اس کے مطابق "ولا یامرکم" کی مرفوع ضمیر نبی کی طرف لوٹ رہی ہے۔ پہلی ترکیب کے مطابق بشر کی شان کے لائق نہیں کہ وہ تمہیں حکم دے کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو خدا ٹھہرالو۔

دوسری ترکیب کے لحاظ پر پھر تین احتمال ہیں ایک یہ کہ مرفوع ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف لوٹ رہی ہے

"وقال ابن جریج لا یأمرکم محمد" ابن جریج نے کہا آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ محمد (ﷺ) تمہیں حکم نہیں دیتے کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو خدا ٹھہرالو۔ "وقیل لا یأمرکم الانبیاء" اور ایک قول یہ بیان کیا گیا ہے کہ تمام انبیاء کرام میں سے کوئی نبی بھی تمہیں حکم نہیں دیتا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو خدا ٹھہرالو۔ اس صورت میں ضمیر مرفوع ہر نبی کی طرف لوٹ رہی ہے۔

تیسرا احتمال یہ ہے "قال الزجاج ولا یأمرکم الله" کہ مرفوع اللہ کی طرف لوٹے اور معنی یہ ہو کہ "اللہ تمہیں حکم نہیں دیتا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو اپنا رب ٹھہرالو" یہ قول زجاج کا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

ملائکہ اور انبیاء کرام کی تخصیص کی وجہ:

انما خص الملائکۃ والنبیین بالذکر لان الذین وصفوا من اھل الکتاب بعبادۃ غیر اللہ لم یحک عنھم الاعبادۃ الملائکۃ وعبادۃ المسیح وعزیر فلھذا المعنی خصھما بالذکر"
جن اہل کتاب (اور مشرکین مکہ) کو خطاب ہے وہ صرف ملائکہ اور حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت عیسی علیہ السلام کی عبادت کرتے تھے، اسلئے ملائکہ اور انبیاء کرام کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا۔ (ماخوذ از کبیر)
(ایأمرکم) استفھام بمعنی الانکار ای لا یفعل ذلک"
رب تعالی کے ارشاد گرامی "ایأمرکم" میں ہمزہ استفہامیہ (سوالیہ) انکار کے لئے استعمال ہے "کیا وہ تمہیں حکم دے گا کہ تم اسلام لانے کے بعد کافر ہو جاؤ؟ نہیں، یہ حکم وہ ہرگز نہیں دے گا۔ (از کبیر)
علامہ زمخشری نے کہا "قولہ بعد اذانتم مسلمون دلیل علی ان المخاطبین کانوا مسلمین وھم الذین استأذنوا الرسول ﷺ فی ان یسجدوا لہ"
کہ اللہ تعالی کا ارشاد گرامی "بعد اذانتم مسلمون" اس پر دلیل ہے کہ مخاطبین وہ مسلمان تھے جنہوں نے نبی کریم ﷺ سے آپ کو سجدہ کرنے کی اجازت طلب کی تھی۔ (کشاف)

راقم کا موقف یہ ہے کہ ظاہر کو دیکھتے ہوئے کشاف کا قول بھی درست ہے، لیکن جب خطاب اہل کتاب کو ہو تو اس وقت مطلب یہ ہوگا کہ تمہارے کتاب کو ماننے کے بعد کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے گا؟ ہرگز یہ حکم نہیں دے گا۔ جب تم کتاب کو ماننے کا دعوی کرتے ہو تو صرف اللہ کو معبود مانو، حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت عیسی علیہ السلام تو اس کے بندے ہیں، معبود نہیں۔ (لکھنے کے بعد مظہری کو دیکھا تقریبا یہی اس میں بیان کیا گیا)

جب خطاب مشرکین مکہ کو ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اسلام قبول کرلو تاکہ تم فرشتوں کی عبادت کرنا چھوڑ

دو، کیونکہ اللہ تعالی اور اس کے نبی تمہیں اسلام لانے کے بعد فرشتوں کی عبادت کا حکم ہرگز نہیں دیں گے۔

فائدہ: فحرم الله تعالى على الانبياء ان يتخذوا الناس عبادا بتألهون لهم ولكن الزم الخلق حرمتهم وقد ثبت عن النبی ﷺ انه قال لا يقولن احدكم عبدی وامتی وليقل فتای وفتاتی ولايقل احدكم ربی وليقل سيدی" (قرطبی)

اللہ تعالی نے انبیاء کرام پر حرام کر دیا ہے کہ وہ لوگوں کو اپنا بندہ بنالیں اور ان کو کہیں کہ تم ہماری عبادت کرو، البتہ مخلوق پر لازم کر دیا ہے کہ وہ ان کی تعظیم و تکریم کریں، اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا، تم میں سے ہرگز کوئی شخص عبدی (میرے عبد) اور "امتی" (میری باندی) نہ کہے، بلکہ "فتای" (میرے جوان) اور "فتاتی" (میری جوان) کہے۔ یعنی جب کوئی اپنے غلام کو "عبدی" کہے، یا اپنی غلامہ کو "امتی" کہے تو اس سے کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ "عبدی" اور "امتی" کہنے والا اپنے آپ کو معبود سمجھتا ہے، لیکن "فتای" اور "فتاتی" کہنے میں یہ احتمال نہیں۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص کسی کو "ربی" (میرے رب) نہ کہے، بلکہ "سیدی" (میرے سردار) کہے کیونکہ "ربی" کہنے میں وہم یہ پایا جاتا ہے کہ یہ اسے اپنا معبود سمجھ رہا ہے، لیکن "سیدی" کہنے میں یہ وہم نہیں پایا جاتا۔

آیۃ کریمہ سے معتزلہ کا استدلال:

جبائی معتزلی نے آیۃ کریمہ سے دلیل یہ پکڑی ہے کہ یہ کہنا درست نہیں "اللہ تعالی سے کفر، اس سے جاہل ہونا ہے" اور اسی طرح یہ کہنا بھی درست نہیں کہ "اللہ تعالی پر ایمان لانا، اللہ تعالی کی معرفت کا حاصل ہونا ہے" یہ قول کیوں درست نہیں اس لئے کہ اللہ تعالی نے یہاں ان کا کفر بھی ثابت کیا "ایامرکم بالکفر" سے، لیکن ان کو عارف باللہ بھی ثابت کیا ہے۔

"فلما حصل الكفر ههنا مع المعرفة بالله دل ذلك على ان الايمان به ليس هو المعرفة والكفر به تعالى ليس هو الجهل به"

جب یہ پتہ چل گیا کہ اس آیۃ کریمہ میں جن لوگوں کو خطاب کیا جا رہا ہے وہ کافر بھی تھے اور ان کو اللہ تعالی کی معرفت بھی حاصل تھی، تو اسی سے پتہ چل گیا کہ صرف یہ کہنا کہ "اللہ تعالی پر ایمان لانے سے ہی اس کی معرفت حاصل ہوتی ہے، اور اس سے کفر کرنے سے اس سے جہالت حاصل رہتی ہے یہ قول درست نہیں۔

معتزلہ کی دلیل کا رد:

والجواب ان قولنا الكفر بالله هو الجهل به لاتعنی به مجرد الجهل بكونه موجودا

بل نعتی به الجهل بذاته وبصفاته السلبية وصفاته الاضافية انه لا شريک له في المبعودية فلما جهل هذا فقد جهل بعض صفاته"

ان کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ ہمارا قول کہ "اللہ تعالٰی سے کفر اللہ تعالٰی سے جہالت کی وجہ سے ہے" بالکل درست نہیں، کوئی غلط نہیں، کیونکہ ہمارا یہ مطلب نہیں وہ اللہ تعالٰی کے موجود ہونے کو بھی نہیں جانتے، بلکہ ہمارا یہ مطلب ہے کہ وہ اللہ تعالٰی کی ذات اور صفات سلبیہ اور صفات اضافیہ سے جاہل ہوتے ہیں، اگر وہ یہ جانتے تو اللہ تعالٰی کے ساتھ کوئی شریک نہ ٹھہراتے۔ جب وہ اللہ تعالٰی کے ساتھ شریک ٹھہرانے کی ممانعت سے جاہل تھے تو اس کی وجہ ہی یہ تھی کہ وہ اللہ تعالٰی کی صفات سے جاہل تھے۔ (ماخوذ از کبیر)

نتیجہ یہ واضح ہوا کہ وہ اللہ تعالٰی کے وجود کی معرفت رکھنے کے باوجود کافر تھے، کیونکہ وہ اللہ تعالٰی کی بعض صفات سے جاہل تھے، کاش کہ ان کو اہلسنت وجماعت کا علم حاصل ہوتا تو وہ ظاہری علم رکھنے کے باوجود اس قسم کے لغویات نہ کہتے۔ "ایامرکم بالکفر بعداذ انتم مسلمون" کی تفسیر میں صابونی میں یوں ذکر ہے۔

"ای لایفعل ذلک الامن دعاالی عبادة غیر الله ومن عاد الی عبادة غیر الله فقددعا الی الکفر"

تمہارے ایمان لانے کے بعد اللہ اور اس کے نبی تو تمہیں کفر کا حکم نہیں دیں گے، ہاں مگر وہ شخص جو غیر اللہ کی عبادت کی دعوت دے گا، اور جو غیر اللہ کی عبادت کی دعوت دے وہ کفر کی دعوت دے گا، انبیاء کرام نے تو اللہ تعالٰی کی عبادت کرنے اور اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرانے کا حکم دیا ہے۔

ارشاد باری تعالٰی ہے ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ (سورۃ الانبیاء آیۃ نمبر ۲۵) "اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول مگر ہم وحی کرتے اس کی طرف کہ بیشک کوئی معبود نہیں سوائے میرے، تو میری ہی عبادت کرو" (از صابونی)

تنبیہ: یہ بات واضح ہے کہ کوئی مسلمان صاحب علم اللہ تعالٰی کے بندوں میں وہ صفات کبھی بھی نہیں جانتا جو اللہ تعالٰی کی صفات ہیں، ہاں اگر اللہ تعالٰی خود ہی انبیاء کرام کو "رؤف، رحیم، حمید، حلیم" بنادے تو یہ اس کی مرضی ہے۔

پھر بھی فرق واضح ہوگا کہ اللہ تعالٰی کی صفات ذاتی ہیں اور بندوں کی یہ صفات عطائی ہیں۔ اگر کوئی صاحب علم یہ کہہ دے کہ اللہ تعالٰی رؤف ہے، رحیم ہے اور نبی کریم ﷺ بھی "رؤف" اور "رحیم" تو یہ سن کر کوئی کہہ دے کہ یہ تو شرک ہوگیا، تو چاہیئے یہ کہ وہ اپنی جہالت کا علاج کرائے اور ذاتی وعطائی کا فرق سمجھے۔

"اللهم انا نعوذبک من الضالین المتعصبین المعاندین"

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ O (آیۃ نمبر ۸۱)

(1) اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے ان کا عہد لیا جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول کہ تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائے تو تم ضرور ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا فرمایا کیوں تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا بھاری ذمہ لیا، سب نے عرض کی ہم نے اقرار کیا فرمایا تو ایک دوسرے پر گواہ ہو جاؤ اور میں آپ تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔ (کنزالایمان)

(2) اور یاد کرو جب لیا اللہ نے (پختہ) وعدہ نبیوں سے، جب میں تمہیں عطاء کروں کتاب اور حکمت، پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول جو تصدیق کرنے والا ہو اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور بر ضرور اس پر ایمان لانا، اور تم ضرور بر ضرور اس کی امداد کرنا، فرمایا کیا تم نے اقرار کر لیا، اور (کیا) تم نے لے لیا ہے اس پر میرا بھاری ذمہ، ان تمام نے کہا ہم نے اقرار کر لیا ہے، فرمایا تم گواہ ہو جاؤ، اور میں تمہارے ساتھ گواہوں سے ہوں۔ (نجوم الفرقان)

سب سے پہلے تسکین الجنان سے ایک ورق دیکھئے:

راقم کی سب سے پہلی تصنیف ''تسکین الجنان فی محاسن کنزالایمان'' ہے۔

﴿ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ﴾

''پھر آوے تمہارے پاس کوئی رسول''	(محمود الحسن صاحب)
''کل اگر کوئی دوسرا رسول آئے''	(مودودی صاحب)
''پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے''	(عبدالماجد صاحب)

''پھر تمہارے پاس کوئی اور پیغمبر آئے''	(اشرف علی صاحب)
''پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے''	(فتح محمد صاحب)
''پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول''	(اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

وجہ فرق آوے، آئے اور تشریف لائے میں ثابت ہے، ہر ذی شعور کے فہم وادراک سے بعید نہیں کہ ''تشریف لائے'' جسطرح ادب واحترام پر دال ہے، اسی طرح لفظ آوے اور آئے میں کیسے ادب واحترام؟ دوسرا فرق (جو در حقیقت مقصود بیان ہے) ''کوئی رسول'' عام ہے، اور ''وہ رسول'' خاص ہے۔

اس فرق کو سمجھنے کیلئے، پہلے اس آیۃ کریمہ کا کچھ مطلب ذہن نشین کریں، یہ وہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام سے وعدہ لیا کہ جب میں تمہیں کتاب وحکمت عطاء کردوں، پھر تمہارے پاس وہ رسول تشریف لائیں جو تمہاری کتاب وحکمت کی تصدیق کرنے والے ہوں تو ضرور بر ضرور ان پر ایمان لانا اور ان کی امداد کرنا، پھر رب تعالیٰ نے ان کو فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کرلیا اور اس میرے وعدے کو قبول کرلیا؟ تو انہوں نے عرض کیا ہم نے اقرار کرلیا۔

اب اس مفہوم کے سمجھنے کے بعد واضح ہوا کہ یہاں جن رسول مقبول ﷺ کے متعلق انبیاء کرام سے وعدہ لیا گیا وہ خاص رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ اگر یہاں یہ وہم پیش کیا جائے کہ آیۃ کریمہ میں لفظ ''رسول'' نکرہ ہے، اس کے مطابق ''کوئی رسول'' ہی ترجمہ ٹھیک ہے ''وہ رسول'' یہ تو خاص ہے، یہ ترجمہ کیسے درست ہے۔

تو اس جواب یہ دیا جائے گا کہ نکرہ کا تنوین تعظیم سے خاص ہو جانا نحو کی کتب میں موجود ہے، اور تنوین کا تعظیم کیلئے ہونا بھی علم معانی میں مذکور ہے۔ جب معنیٰ ''وہ رسول'' کیا جائے گا تو تخصیص ہوگی، جس سے مراد نبی کریم ﷺ ہی ہوں گے، اسی پر تفاسیر بھی دلالت کررہی ہیں۔

﴿ثُمَّ جَاءَ كُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَ الْحِكْمَةِ ''وهو محمد ﷺ﴾ (جلالین)

''پھر تمہارے پاس وہ رسول تشریف لائے جو تصدیق کرنے والے ہوں تمہاری کتاب وحکمت کی وہ محمد ﷺ ہیں''

یہ حکم اگرچہ بظاہر انبیاء کرام کو ہے لیکن ان کی امتیں بھی ان کے تابع ہونے کی وجہ سے اس حکم میں داخل ہیں۔ ''واممم تبع لهم فی ذلک'' (جلالین) انبیاء کرام کی امتیں بھی ان کے تابع ہونے کی وجہ سے اس حکم میں داخل ہیں۔

اب یہاں پر اگر یہ وہم پیش کیا جائے کہ انبیاء کرام سے وعدہ لینے اور اقرار کرانے کی وجہ کیا ہے جبکہ نبی کریم ﷺ آخر الزمان ہیں، انبیاء کرام نے تو آپ کا زمانہ پانا ہی نہیں تھا، اس کا جواب صاوی میں ہے، سوال وجواب اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

قولہ "اقررنا" جواب عن سؤال مقدر تقدیرہ ماذا قالوا حینئذ وثمرۃ المعاھدۃ علی محمد مع علم اللہ انہ لایأتی فی زمن نبی من الانبیاء الثواب علی العزم بالاتباع والعقاب علی العزم بعدم الایمان فجمع الانبیاء یثابون علی الایمان بمحمد ومن عزم علی عدم الایمان بہ لو ظھر عوقب"

سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ انبیاء کرام میں سے کوئی نبی، حضور ﷺ کے زمانہ میں نہیں آئیں گے تو اس وعدہ واقرار کا کیا فائدہ؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہاں مقصود یہ ہے کہ جو نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کا عزم کرے اس کو ثواب دیا جائے گا، اور جو ایمان نہ لانے کا عزم کرے اسے عذاب دیا جائے گا۔ گویا جمیع انبیاء کرام کو نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کا ثواب دینا مقصود تھا، اور اگر یہ ظاہر ہو جائے کہ کسی نے نبی کریم ﷺ پر ایمان نہ لانے کا ارادہ کیا ہے تو اس کو عذاب دیا جائے گا، یعنی اس حکم میں انبیاء کرام کے ساتھ چونکہ ان کی امتیں بھی داخل ہیں، اس لئے امتوں میں سے جس شخص نے ایمان نہ لانے کا عزم کیا وہ عذاب میں داخل ہوگا۔

اب اس بیان کے بعد سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں رہی کہ یہ حکم نبی کریم ﷺ کے متعلق ہی ہے لھذا ایسا معنی کرنا جو عموم پر دال ہے جس سے مقصد واضح نہ ہو یقیناً اس سے بہتر وہی ترجمہ ہوگا جو تخصیص پر دلالت کرے گا اور مقصد کو واضح کرے گا۔ "ولتنصرنہ" ای الرسول وھو محمد ﷺ "(تم اس کی امداد کرنا) اس سے مراد بھی محمد رسول اللہ ﷺ ہی ہیں کہ تم ان کی امداد کرنا" جلالین" (تسکین الجنان صفحہ نمبر ۸۶،۶۷)

تنبیہ: تسکین الجنان میں راقم نے "اس سے بہتر وہی ترجمہ ہوگا" تحریر کر کے اشارہ کر دیا تھا کہ یہ ترجمہ جو کنز الایمان ہے یہ بہتر ہے اگر چہ اس میں دوسرے اقوال بھی ہیں وہ مرجوح ہیں۔ مرجوح اقوال مرجوح ہی ہوتے ہیں، تاہم زیادہ وضاحت انشاء اللہ قریب ہی خازن کے حوالہ سے آرہی ہے۔

﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ﴾ "اور یاد کرو جب لیا اللہ نے (پختہ) وعدہ نبیوں سے"

"اذ" سے پہلے اگر "اذکر" واحد کا صیغہ مقدر ہو تو خطاب نبی کریم ﷺ کو ہوگا، اب مطلب یہ ہوگا یاد کرو ان واقعات کو جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر بیان کئے ہیں، ان میں سے ایک واقعہ انبیاء کرام سے عہد لینے کا بھی ہے، اسے بھی آپ یاد کریں۔ اور اگر "اذکروا" جمع کا صیغہ مقدر ہو تو خطاب اہل کتاب کو ہوگا، جو واقعات ان کی کتاب میں آچکے تھے ان میں سے ایک واقعہ یہ بھی تھا کہ "اے اہل کتاب یاد کرو جب اللہ نے وعدہ لیا نبیوں سے" (خازن)

عجیب دل چسپ مسئلہ:

اصل المیثاق فی اللغة عقد مؤکد بیمین ومعنی میثاق النبیین ماولقوا به علی انفسهم من طاعة الله فیما امرهم به ونهاهم عنه"

میثاق کا اصل لغت میں معنی ہے "وہ عقد جس کو قسم اٹھا کر پختہ کیا جائے" انبیاء کرام سے رب تعالی نے جو وعدہ لیا وہ مطلق تھا، لیکن انبیاء کرام نے خود اپنے آپ پر اللہ تعالی کے امور کی طاعت کر کے اور منہیات سے رک کر اس وعدہ کو پختہ کر لیا تھا۔ (خازن)

وعدہ کی نسبت جب اللہ تعالی کی طرف کریں تو ترجمہ صرف وہی ہوگا جو اعلی حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے کیا ہے (اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے ان کا عہد لیا) "کنز الایمان" اور اگر نسبت انبیاء کرام کی طرف کرو تو مطلب یہ ہوگا "یاد کرو جب اللہ نے نبیوں سے وعدہ لیا جسے نبیوں نے اپنے آپ پختہ کر لیا" (خازن)

راقم نے اپنے ترجمہ میں بریکٹ میں اسی وجہ سے (پختہ) کا لفظ بڑھایا تا کہ طلباء کرام کو اس عجیب اور دل چسپ مسئلہ کی طرف اشارہ مل جائے، کہ قرآن پاک میں کیا خوب فصاحت پائی گئی ہے، کہ ایک ایک لفظ میں کتنے مطالب پائے گئے ہیں۔

مقام توجہ: اس مقام پر مختلف اقوال کا ذکر کیا جا رہا ہے، بعد میں راجح قول کا ذکر کر دیا جائے گا، اگرچہ تسکین الجنان سے جو بحث ذکر کی ہے اسی سے راجح قول کا کافی حد تک پتہ چل چکا ہے۔

"وذکروا فی معنی "اخذ المیثاق وجهین "احدهما انه ماخوذ من الانبیاء والثانی انه ماخوذ لهم من غیرهم"

میثاق لینے کی اہل علم نے دو وجہ ذکر کی ہیں، ایک یہ کہ یہ وعدہ انبیاء کرام سے لیا گیا۔ دوسری وجہ یہ بیان کی گئی انبیاء کرام کیلئے یہ وعدہ اوروں سے لیا گیا،

یہی وجہ ہے کہ آیۃ کریمہ کے معنی اور مطلب میں اہل علم کا اختلاف نظر آتا ہے۔ **"فذهب القوم الی ان الله تعالی اخذ المیثاق من النبیین خاصة"** کچھ حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ وعدہ خصوصی طور پر انبیاء کرام سے لیا گیا ہے۔ انبیاء کرام سے یہ وعدہ ان کی اپنی نبوت اور کتاب کی تبلیغ سے پہلے کا ہے، وعدہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ ہر نبی اپنے بعد آنے والے نبی پر ایمان لائے۔ یعنی:

"فاخذ المیثاق من موسی ان یؤمن بعیسی ومن عیسی ان یؤمن بمحمد ﷺ"

موسیٰ علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا وعدہ لیا گیا، اور عیسیٰ علیہ السلام سے محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا وعدہ لیا گیا۔

امداد کرنے کا کیا مطلب ہے؟ امداد کرنے کا مطلب یہ ہے۔

"وینصره ان ادرکه وان لم یدرکه ان یأمر قومه بنصرته ان ادرکوه"

کہ اگر پہلے نبی بعد میں آنے والے نبی کو پالیں تو خود ان کی امداد کریں، اور اگر خود نہ پائیں تو اپنی امت کو وصیت کر جائیں کہ اگر تم نے بعد میں آنے والے نبی کو پالیا تو ان کی امداد کرنا۔

"وقیل انما اخذ المیثاق من النبیین فی امر محمد ﷺ خاصة"

اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ محمد ﷺ کے متعلق نبیوں سے وعدہ لیا گیا ہے۔

اس قول میں پھر کچھ حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ ذکر نبیوں کا ہے مراد ان کی امتیں ہیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ انبیاء کرام کی طرف مبعوث نہیں ہوئے، بلکہ اور لوگوں کی طرف مبعوث ہوئے ہیں جن میں پہلے انبیاء کرام پر ایمان رکھنے والے اہل کتاب بھی تھے۔ (لیکن یہ قول بہت ہی ضعیف ہے کہاں کہاں تاویلیں کریں گے، ذکر نبیوں کا مراد ان کی امتیں ہیں) پھر "لما اتیتکم من کتاب وحکمة" کی بھی تاویل کرنی پڑے گی (لھذا یہ قول تو عقل سے بہت بعید ہے)

وقیل اخذ الله المیثاق علی النبیین وامهم جمیعافی امر محمد ﷺ فاکتفی بذکر الانبیاء لان العهد مع المتبوع عهد مع الاتباع وهو قول ابن عباس"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام اور ان کی امتوں سے وعدہ لیا کہ جب میرے آخری نبی محمد ﷺ تشریف لے آئیں تو تم ان پر ایمان لانا اور ان کی امداد کرنا، البتہ ذکر صرف انبیاء کرام کا کیا کیونکہ جو وعدہ متبوع (جس کی تابعداری کی جائے) سے لیا جائے وہی تابع سے بھی لیا جاتا ہے۔

"قال علی بن ابی طالب مابعث الله نبیاآدم فمن بعده الااخذ علیه العهد فی امر محمد ﷺ واخذ هو العهد علی قومه"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی سے وعدہ لیا کہ جب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تشریف لے آئیں تو تم ان پر ایمان لانا اور ان کی امداد کرنا، اور یہی وعدہ انبیاء کرام نے اپنی اپنی امتوں سے لیا۔

"وقیل ان المرادمن الآیة ان الانبیاء کانوا یاخذون العهد والمیثاق علی امهم بانه اذابعث محمد ﷺ ان یؤمنو به وینصرونه"

ایک اور قول اس میں یہ ہے کہ آیۃ کریمہ میں انبیاء کرام سے مراد یہ ہے کہ انبیاء کرام اپنی اپنی امتوں سے وعدہ لیتے

رہے کہ جب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تشریف لائیں تو تم ان پر ضرور بر ضرور ایمان لانا اور ان کی ضرور بر ضرور امداد کرنا۔

راجح قول:

راقم نے تمام اقوال انصاف سے بیان کر دیئے ہیں، تاہم صحیح اور معتبر قول وہی ہے جو تسکین الجنان کے حوالے سے جلالین اور صاوی سے بیان کیا، اس میں کوئی تاویل نہیں، حقیقی معنی مراد لیا گیا ہے مجازی معنی نہیں لیا گیا، قانون یہی ہے کہ جب حقیقی معنی صحیح ہو سکے تو مجازی معنی کی ضرورت نہیں، اور جب بغیر تاویل کے معنی درست ہو تو تاویل کی ضرورت نہیں۔ جلالین میں جو بیان کیا گیا ہے وہی مدارک التنزیل للنسفی میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ مظہری نے بھی قیل وقال کے بعد آخری فیصلہ کن قول یہی کیا۔

"وجاز ان یکون تخصیص العھد لمحمد ﷺ لاظھار فضله"

جائز ہے کہ یہاں جس رسول ﷺ کے تشریف لانے کا ذکر ہے وہ حضرت محمد ﷺ ہوں آپ کی فضیلت کو ظاہر کرنے کیلئے آپ کیلئے انبیاء کرام سے وعدہ لیا گیا، آپ کی خصوصیت کے پیش نظر آیۃ کریمہ میں آپ کا ہی خصوصی طور پر تذکرہ کیا گیا۔

آیئے علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی خوبصورت عبارت دیکھئے، آپ رقم طراز ہیں:۔

ومن ھنا ذھب العارفون الی انه ﷺ ھو النبی المطلق و الرسول الحقیقی و المشرع الاستقلالی و ان من سواہ من الانبیاء علیھم الصلوۃ السلام فی حکم التبعیة له ﷺ"

عارفین حضرات نے یہی بیان کیا ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں جن رسول معظم کا ذکر ہے وہ نبی مطلق، رسول حقیقی مستقل شریعت لانے والے یعنی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اور دوسرے انبیاء کرام نبی کریم ﷺ کے تابع ہیں۔ (روح المعانی)

تنبیه: روح المعانی سے کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت اصلی ہے اور باقی انبیاء کرام کی نبوتیں عارضی ہیں" معاذ اللہ یہ قول سراسر باطل ہے" اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ انبیاء کرام کو اس معظم رسول کی تابعداری کا حکم دیا گیا وہ مطلق نبی ہیں کہ جب صرف "رسول اللہ کہا جائے، یا صرف "اللہ کا نبی" کہا جائے تو اس سے مراد صرف محمد رسول اللہ ﷺ ہی ہوتے ہیں۔ وہ چونکہ ساری مخلوق کی تخلیق کا باعث ہیں، لھذا وہ باعث تخلیق انبیاء کرام بھی ہیں، اس لحاظ پر آپ کو حقیقی نبی ہونے کا حق حاصل ہوا، کہ حقیقت میں آپ ہی باعث ایجاد کائنات ہیں۔ باقی شریعتیں منسوخ ہو گئیں، لیکن نبی کریم ﷺ کی شریعت منسوخ نہ ہوئی، نہ ہی قیامت تک منسوخ ہو گی، اس لئے آپ کا لقب بن

گیا آپ مستقل شریعت لانے والے ہیں۔علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اپنی اس عبارت سے پہلے ایک حدیث بیان کی جس سے **راقم** کی یہ وضاحت بخوبی سمجھ آجائے گی۔وہ حدیث پاک یہ ہے۔

اخرجه ابو يعلى عن جابر قال،قال رسول الله ﷺ "لاتسألوا اهل الكتاب عن شئى فانهم لن يهدوكم وقد ضلوا فامان تصدقوا بباطل واما ان تكذبوا بحق وانه والله لوكان موسى حيا بين اظهركم ماحل له الاان يتبعنى "

مسند ابویعلی میں حضرت جابر ﷺ سے روایت ذکر کی گئی ہے،رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اہل کتاب سے کسی چیز کا سوال نہ کرو،وہ تمہیں ہرگز ہدایت نہیں دے سکیں گے،وہ تو خود گمراہ ہیں۔(ان کی بات کی مان کر) یا تم باطل کی تصدیق کرو گے،یا تم حق کی تکذیب کرو گے،بیشک قسم ہے اللہ تعالی کی اگر موسی علیہ السلام تمہارے درمیان زندہ موجود ہوتے تو ان کے لئے جائز نہ ہوتا سوائے میری تابعداری کے۔

حدیث پاک سے واضح ہوگیا کہ انبیاء کرام میں سے کوئی نبی بھی رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ظاہری حیات میں ہوتے تو ان پر لازم ہوتا کہ وہ نبی کریم ﷺ کی تابعداری کرتے۔ (راقم کی وضاحت)

"اعلم ان المقصود من هذه الآيات تعديدتقرير الاشياء المعروفةعنداهل الكتاب ممايدل على نبوةمحمدا قطعالعذرهم واظهار العنادهم ومن جملتهاماذكره الله تعالى فى هذا الآية"

یقین کرلو بیشک مقصود ان آیات سے چندان چیزوں کو بیان کرنا تھا جو اہل کتاب کے نزدیک مشہور ومعروف تھیں اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت پر دلالت کرتی ہیں،تا کہ ان کا عذر ختم ہو جائے کہ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں تو علم نہیں تھا، اور بیان کرنا یہ مقصود تھا کہ ان کا عناد ظاہر ہو جائے کہ ان کا نبی کریم ﷺ پر ایمان لانا صرف عناد کی وجہ سے تھا۔اور اس آیۃ کریمہ سے اس بات کو واضح کر دیا کہ

"انه تعالى اخذالميثاق من الانبياء الذين آتاهم الكتاب والحكمة بانهم كلما جاء هم رسول مصدق لما معهم آمنوابه ونصروه واخبرانهم قبلوا ذلك"

بیشک اللہ تعالی نے جب انبیاء کرام سے وعدہ لیا کہ جب ان کو اللہ تعالی کتاب وحکمت عطاء کردے،اور ان کے پاس وہ رسول معظم تشریف لائیں جو ان کی کتب وشرائع کی تصدیق کریں تو ان پر ایمان لانا اور ان کی امداد کرنا۔

رب تعالی کے اس حکم کو انبیاء کرام نے تسلیم کرلیا،جس پر" قالوااقررنا" واضح طور پر دلالت کررہا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

اسی طرح انبیاء کو نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کی امداد کرنے کا اجروثواب حاصل ہوگیا۔

اعتراض: جب نبی کریم ﷺ کی شریعت پہلی شریعتوں کی ناسخ ہے تو کس طرح ان کی تصدیق کرنے والی ہے۔

جواب: المراد به حصول الموافقة في التوحيد والنبوات واصول الشرائع" مراد اس سے توحید ،نبوت اور اصول شرائع میں متفق ہونا ہے، اختلاف صرف تفاصیل میں تھا، وہ حقیقت میں کوئی اختلاف نہ تھا۔

"ان جميع الانبياء عليهم السلام متفقون على ان الحق في زمان موسى عليه السلام ليس الاشرعه ، وان الحق في زمان محمد ﷺ ليس الاشرعه"

تمام انبیاء کرام کا اس پر اتفاق رہا کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں آپ کی شریعت حق پر تھی، اور بیشک نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں آپ کی ہی شریعت حق ہے۔ (کبیر)

﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ "ضرور بر ضرور تم ان پر ایمان لانا اور ضرور بر ضرور ان کی امداد کرنا"

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

لام موطأ للقسم ہے، اسلئے قسم مقدر ہے، اور مبتداء کی خبر "لاظهار دين الحق" بھی محذوف ہے، اسلئے معنوی طور پر عبادت یوں بن گئی۔

"والله لتصدقنه برسالته وتنصرنه على اعدائه لاظهار دين الحق"

قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ضرور بر ضرور تم ان کی رسالت کی تصدیق کرنا اور ضرور بر ضرور ان کی ان کے دشمنوں کے خلاف امداد کرنا دین حق کے اظہار کیلئے۔ (از روح البیان)

﴿قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ﴾ "کہا کیا تم نے اقرار کر لیا"

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام سے وعدہ لینے کے بعد یہ ارشاد فرمایا "ءَاَقْرَرْتُمْ" کیا تم نے اقرار کر لیا کہ اس نبی معظم پر ایمان لانا اور اس کی امداد کرنی ہے۔

"والاستفهام للتقرير والتاكيد عليهم لاستحالة حقيقة الاستفهام في حقه تعالى"

اس مقام پر استفہام تقریر و تاکید کیلئے ہے، حقیقت استفہام رب تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں کہ وہ سوال کرے کیا تم نے اقرار کر لیا ہے، مجھے بتاؤ، جب رب تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے تو اسے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اصل مقصود انبیاء کرام سے اقرار کرانا ہے تاکہ ان کو اقرار کا ثواب بھی حاصل ہو جائے۔ (از روح البیان)

﴿وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰی ذٰلِکُمۡ اِصۡرِیۡ﴾ ''اور (کیا) تم نے لے لیا اس پر میرا بھاری ذمہ"

یہ جملہ بھی استفہام تقریری کیلئے ہے، اسی لئے علامہ آلوسی نے بیان کیا ہے "ھل اخذتم" (کیا تم نے لیا) راقم نے بھی اسی وجہ سے بریکٹ میں لفظ (کیا) زیادہ کیا ہے۔

"(اصری) ای عقدی الذی عقدته علیکم" ''اصری'' کا مقصد یہ ہے کہ ''میرا وہ عقد جو میں نے تم پر باندھا ہے"

"والاصر الثقل الذی یلحق الانسان لاجل ما یلازمه من العمل"

"اصر" اس بوجھ کو کہا جاتا ہے جو انسان کو اس کے عمل کی وجہ سے لاحق ہوتا ہے۔

"والاصر ھھنا العھد الثقیل لانه ثقل علی صاحبه من حیث انه یمنع عن مخالفته ایاه"

"اصر" کا اس آیۃ کریمہ میں معنیٰ ''بھاری وعدہ'' ہے۔ کیونکہ جس طرح بوجھ ادھر ادھر حرکت سے روکتا ہے، اسی طرح بھاری وعدہ بھی اس کی مخالفت سے روکتا ہے۔ (از روح البیان)

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اسی لئے خوبصورت ترجمہ یوں تحریر کیا۔

(واخذ تم علی ذلکم اصری) ای قبلتم عھدی والاخذ بمعنی القبول کثیر فی الکلام"

کیا تم نے میرا وعدہ قبول کرلیا ہے۔ "اخذ" کا معنیٰ قبول کرنا "کلام اللہ" میں کئی جگہ استعمال ہے۔ جیسا کہ "ولا یؤخذ منھا فدیۃ" (اور نہیں قبول کیا اس سے فدیہ) اسی طرح "ویاخذ الصدقات" قبول کرتا ہے صدقات کو۔

﴿قَالُوۡۤا اَقۡرَرۡنَا﴾ ''ان تمام نے کہا اقرار کرلیا ہے"

یعنی اے اللہ تعالیٰ تو نے ہم سے جو وعدہ لیا ہے محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے اور ان کی امداد کرنے کا ہم اس کا اقرار کرتے ہیں، یعنی اس قول سے انبیاء کرام کو اقرار کا ثواب مل گیا۔

خیال رہے کہ چونکہ "اصر" کا معنیٰ بھی پختہ وعدہ ہے، جس کا ترجمہ ''بھاری ذمہ داری'' بزرگوں نے کیا تو راقم نے بھی وہی نقل کیا، یہی وجہ ہے کہ صرف عہد کے اقرار کا سوال کیا گیا اور اسی کا اقرار کر لینے کا جواب دیا گیا، اصر کے متعلق نہ سوال کیا گیا اور نہ ہی جواب دیا گیا کیونکہ وہ ضمنا خود بخود ذکر ہوگیا۔ (از روح البیان)

﴿قَالَ فَاشۡهَدُوۡا وَاَنَا مَعَكُمۡ مِّنَ الشّٰهِدِيۡنَ﴾

''فرمایا تم گواہ ہو جاؤ اور میں تمہارے ساتھ گواہوں سے ہوں"

یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم گواہ ہو جاؤ، جو ارشاد فرمایا ''تم گواہ ہو جاؤ'' اس کے چند مطالب ہیں۔

(1) الاول فليشهد بعضكم على بعض بالاقرار واناعلى اقراركم واشهاد بعضكم بعضا من الشاهدين "

پہلا مطلب یہ کہ بعض تمہارے بعض پر اقرار کرنے کے گواہ ہو جاؤ، اور تمہارے اقرار کرنے اور بعض کے بعض پر گواہ بننے پر میں بھی گواہ ہوں گا۔

اس میں زیادہ تاکید پائی گئی ہے، اور ان کو پھرنے سے ڈرایا گیا ہے، اس لئے کہ جب انہیں معلوم ہوگا کہ ہمارے بعض بعض پر گواہ ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی ہم پر گواہ ہے تو وہ کبھی اس سے پھرنے کا تصور بھی نہیں کر سکیں گے۔

(2) الثاني ان قوله فاشهدوا خطاب للملائكه"

اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ "فاشهدوا" میں خطاب فرشتوں کو ہے کہ "اے فرشتو تم ان کے اقرار پر گواہ ہو جاؤ" اور میں بھی اس پر گواہ ہوں۔

(3) الثالث ان قوله (فاشهدوا) اى ليجعل كل احد نفسه شاهدا على نفسه ونظيره قوله "واشهدهم على انفسهم الست بربكم قالوا بلى شهدنا على انفسنا" وهذا من باب المبالغة "

تیسرا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے نفسوں پر، اپنے اقرار پر گواہ ہو جاؤ، یہ اسی طرح جس طرح آیۃ کریم ﴿وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی شَهِدْنَا عَلٰی اَنْفُسِنَا﴾ میں تمام لوگوں کو یوم میثاق میں ان کے اپنے ہی نفسوں پر گواہ بنایا گیا۔

(4) الرابع "فاشهدوا" اى بينوا هذاالميثاق للخاص والعام لكى لا يبقى لاحد عذر فى الجهل به واصله ان الشاهد هوالذى يبين صدق الدعوى"

چوتھا مطلب یہ ہے کہ "فاشهدوا" کا معنی یہ ہے کہ یہ وعدہ جو اللہ تعالیٰ نے تم سے لیا ہے اسے خاص وعام کے سامنے بیان کرو، تاکہ کسی ایک کو عذر باقی نہ رہے کہ مجھے پتہ نہیں، اصل میں شاہد کو شاہد کہنے کی وجہ ہی یہ ہے کہ وہ دعویٰ کی سچائی کو بیان کرتا ہے کہ مدعی کا یہ دعویٰ سچا ہے۔

(5) الخامس "فاشهدوا" اى فاستيقنوا ما قررته عليكم من هذاالميثاق وكونو فيه كالمشاهد للشىء المعاين له"

پانچواں مطلب یہ ہے کہ "گواہ بن جاؤ" یعنی جو تم نے اپنے آپ اقرار کرلیا ہے اس وعدہ کا یقین کرلو اس طرح ہو جاؤ جس طرح گواہ کسی چیز کا معاینہ اور مشاہدہ کر کے یقین کر لیتا ہے، یقین کے بعد وہ گواہی دیتا ہے۔

(6) السادس اذا قلنا ان اخذالميثاق كان من الامم فقوله "فاشهدوا" خطاب الانبياء

علیھم السلام بان یکون شاھدین علیھم "
چھٹا مطلب یہ ہے کہ جب یہ خطاب انبیاء کرام کی امتوں کو بھی ان کی تابعداری کی وجہ سے ہے تو "گواہ ہو جاؤ" کا حکم انبیاء کرام کو ہے کہ تم اپنی اپنی امتوں پر گواہ ہو جاؤ کہ انہوں نے بھی اقرار کیا تھا۔ (از کبیر)
اللہ تعالیٰ کے گواہ ہونے سے مزید تاکید پیدا ہوگئی، اور جس حکم کو لازم کیا گیا ہے وہ زیادہ پختہ ہوگیا، کہ جب اللہ تعالیٰ بھی گواہ ہے تو یقیناً اس حکم جس کو ماننے کا ہم نے اقرار کیا ہے وہ بہت پختہ ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

فَمَنْ تَوَلّٰی بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ○ (آیۃ نمبر ۸۲)

(1) تو جو کوئی اس کے بعد پھرے تو وہی لوگ فاسق ہیں۔ (کنز الایمان)

(2) تو جو کوئی پھر گیا بعد اس کے تو وہی لوگ فاسق (حد سے تجاوز کرنے والے) ہیں۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے رابطہ:

اللہ تعالیٰ جب تمام مخفی چیزوں کو جانتا ہے، اس پر کوئی چیز مخفی (پوشیدہ) نہیں، لیکن اس نے مصلحت کیلئے دوسرے لوگوں کو گواہ بنایا تاکہ ایک حکم میں تاکید پائی جائے، اب اس آیۃ کریمہ میں مزید تاکید کا ذکر کیا کہ جس نے اس رسول یعنی محمد ﷺ پر ایمان لانے سے اعراض کیا اور آپ کی امداد کرنے سے انکار کیا تو وہ فاسق ہوں گے۔ (ماخوذ از کبیر)

(الفاسقون) المتمردون الخارجون عن الطاعة من الکفرة فان الفاسق من کل طائفة من کان متجاوزا عن الحد"
"فاسقون" سے مراد سرکش لوگ، کفر کی وجہ سے طاعت سے خارج ہونے والے لوگ ہیں، اس لئے کہ اصل فسق کا معنی حد سے تجاوز کرنا، ہر گروہ میں جو حد سے تجاوز کرے وہ فاسق ہے۔ (روح البیان)

"(الفاسقون) ای الخارجون عن الایمان" فاسقون" سے مراد ایمان سے نکل جانے والے لوگ ہیں، کیونکہ "فاسق" کا معنی "خارج" (نکل جانے والا) ہے۔ (قرطبی)

اعتراض: جب پہلے دلائل سے بیان کر دیا گیا کہ اس سے پہلے آیۃ کریمہ میں مختار قول یہی ہے کہ وعدہ انبیاء

کرام سے لیا گیا اور "ثم جاء کم رسول" سے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ یعنی مطلب یہ ہوا کہ یاد کرو جب اللہ نے وعدہ لیا نبیوں سے کہ جب میں تمہیں کتاب وحکمت دوں پھر تمہارے پاس وہ رسول آئیں جو تصدیق کرنے والے ہوں اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور برضرور ایمان لانا، اور ان کی ضرور برضرور امداد کرنا۔ انبیاء کرام کا اپنے اقرار کے بعد پھرنا اور ان کا فاسق ہونا کیسے صحیح ہے؟

پہلا جواب: یہ بات بھی پہلے ذکر ہو چکی ہے کہ اگرچہ خطاب انبیاء کرام کو ہے لیکن ان کی امتیں بھی ان کے تابع ہونے کی وجہ سے اس حکم میں داخل ہیں۔

"قال فی التیسیر والتولی لایقع من الانبیاء ولا یوصفون بالفسق لکن له وجهان احدهما ان المیثاق کان علی الانبیاء وامهم علی التبعیة والتولی من الامم خاصة"

تیسیر میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ بھی یقینی بات ہے کہ انبیاء کرام کا اپنے وعدہ اور اقرار سے پھرنا ممکن نہیں، اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ انبیاء کرام کو (معاذ اللہ) فاسق کہنا بھی ممکن نہیں۔ تو اس مشکل کے حل کی دو وجہ بیان کی گئی، پہلی وجہ یعنی پہلا جواب یہ ہے کہ خطاب جب انبیاء کرام اور ان کی امتوں کو بھی ہے، تو اس آیۃ کریمہ میں امتوں کا تذکرہ ہے۔

اب مطلب یہ ہو گیا کہ انبیاء کرام کو گویا کہ یوں خطاب ہے "کہ اے انبیاء کرام تمہاری امتوں میں جو لوگ اس عہد واقرار سے پھر گئے وہ فاسق ہو جائیں گے، یعنی ایمان سے خارج ہوں گے۔ (روح البیان)

قرطبی رحمہ اللہ نے بھی اسی کے مطابق تفسیر کی:

"فمن تولی من امم الانبیاء عن الایمان بعد اخذ المیثاق" (فاولئک هم الفاسقون) ای الخارجون عن الایمان"

انبیاء کرام کی امتوں میں سے جو شخص وعدہ سے پھر گیا وہ لوگ ایمان سے نکل جانے والے ہیں۔ (قرطبی)

دوسرا جواب: انبیاء کرام کی عصمت ان سے محنت کو زائل نہیں کرتی، یعنی یہ یقینی بات ہے کہ انبیاء کرام کا وعدہ سے پھرنا اور ان کا (معاذ اللہ) فاسق و کافر ہونا تو ممکن نہیں کیونکہ وہ معصوم حضرات ہیں، لیکن انبیاء کرام پر رب تعالیٰ نے عصمت کی وجہ سے محنت کو زائل نہیں کیا۔ ان پر احکام لازم کیے گئے اور ان کو حرام کاموں سے منع کیا گیا، لھذا مطلب یہ ہوا کہ اے انبیاء کرام بالفرض المحال "اگر تم وعدہ سے پھر گئے تو تم فاسق ہو جاؤ گے" جو کلام "بالفرض المحال" پر مبنی ہوتی ہے اس سے مراد حقیقت نہیں ہوتی، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ﴿قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ

الْعَابِدِیْنَ﴾ ''آپ فرمادیجئے اگر بالفرض اللہ تعالیٰ کی اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرنے والا ہوتا'' یعنی نہ رب تعالیٰ کی اولاد ہے نہ ہونی ہے تو رب تعالیٰ کی اولاد جب ہونی ہی نہیں تو ہم ان کی عبادت کریں یہ متصور نہیں ،اب مسئلہ نکھر کر سامنے آ گیا کہ انبیاء کرام کا وعدہ سے پھرنا جب ممکن نہیں تو ان کا فاسق ہونا بھی ممکن نہیں ،البتہ بالفرض محال کلام سے دوسرے لوگوں کو تاکیدی حکم دے دیا گیا کہ اے عام لوگو اگر تم وعدہ سے پھر گئے تم نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لایا اور ان کی امداد نہ کی تو تم کافر ہو جاؤ گے ، بالفرض اگر انبیاء کرام سے بھی پھرنا ممکن ہوتا تو ان پر بھی فسق کا حکم لگایا جاتا ،البتہ انبیاء کرام پر ایک حکم فرض کر کے ان کو محنت میں مبتلاء کر کے ان کو ثواب کا مستحق بنا دیا۔
(ماخوذ از روح البیان بالوضاحت)

گذشتہ سے پیوستہ:

قال علی وابن عباس رضی اللہ عنہما مابعث اللہ نبیامن الانبیاء الااخذ علیہ المیثاق لئن بعث اللہ محمداوھو حی لیؤمنن بہ ولینصرنہ'' وامرہ ان یاخذالمیثاق علی امتہ لئن بعث محمد وھم احیاء لیؤمنن بہ ولینصرنہ''

حضرت علی اور حضرت ابن عباس ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام میں سے کسی نبی کو مبعوث نہیں فرمایا مگر یہ کہ اس سے وعدہ لیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اگر تمہاری زندگی میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا تو تم ان پر ضرور بر ضرور ایمان لانا ،اور ہر نبی کو یہ حکم دیا کہ تم نے اپنی اپنی امتوں سے وعدہ لینا ہے کہ اگر تمہاری زندگی میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہو جائیں تو تم ان پر ضرور بر ضرور ایمان لانا اور ان کی ضرور بر ضرور امداد کرنا۔

''وقال الحسن البصری وقتادۃ اخذ اللہ میثاق النبیین ان یصدق بعضھم بعضا''

حضرت حسن بصری اور حضرت قتادہ رحمھما اللہ کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام سے وعدہ لیا کہ بعض کی تصدیق کریں۔

''وھذالایضاد ما قالہ علی وابن عباس ولا ینفیہ بل یستلزمہ ویقتضیہ''

حضرت حسن بصری اور حضرت قتادہ رحمھما اللہ کا قول حضرت علی اور حضرت ابن عباس ﷺ کے قول کے منافی نہیں ، بلکہ یہ تو ان کے قول کو لازم کرتا ہے اور اس کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ پایا جائے مطلب یہ واضح ہو گیا کہ ہر نبی جو دوسرے نبی کو اپنی زندگی میں پالے تو اس کی تصدیق کرے ،اور ہر نبی پر واجب ہے کہ اگر اس کی زندگی میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائیں تو وہ ان پر ضرور بر ضرور ایمان لائیں اور ان کی ضرور بر ضرور امداد کریں۔

ارشاد مصطفوی ﷺ سے مسئلہ واضح ہوتا ہے:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "لو کان موسی وعیسی حیین لما وسعھما الا اتباعی" اگر موسیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام دونوں زندہ ہوتے تو ان کو سوائے میری اتباع کے کوئی چارۂ کار حاصل نہ ہوتا۔

اوصاف مصطفیٰ کریم ﷺ کا تقاضا:

نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ نے ایسے اوصاف سے متصف کردیا کہ وہ خود ہی اس کا تقاضا کرتے ہیں کہ ہر نبی پر آپ کی تصدیق وامداد لازم ہے۔

"فالرسول محمد خاتم الانبیاء صلوات اللہ وسلامہ علیہ دائما الی یوم الدین"

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تمام انبیاء کرام کے خاتم ہیں، قیامت تک آپ کی شریعت قائم ودائم رہے گی آپ کی شریعت بھی منسوخ نہیں ہوتی، آپ کے بعد تا قیامت کوئی نبی نہیں آتا۔

"ھو الامام الاعظم الذی لو وجد فی ای عصر وجد لکان ھو الواجب الطاعۃ المقدم علی الانبیاء کلھم ولھذا کان امامھم لیلۃ الاسراء لما اجتمعوا ببیت المقدس"

نبی کریم ﷺ امام اعظم ہیں جس زمانہ میں بھی دوسرے انبیاء کرام آپ میں موجود ہوں تو امامت آپ کا ہی حق ہے، یہی وجہ تھی کہ معراج کی رات کو جب تمام انبیاء کرام بیت المقدس میں جمع ہوئے، تو نبی کریم ﷺ نے ہی ان کی امامت کرائی ، آپ کو امام الانبیاء ہونے کا شرف حاصل ہوگیا۔

"وکذلک ھو الشفیع فی المحشر فی اتیان الرب جل جلالہ لفصل القضاء بین عبادہ"

محشر کے دن حساب وکتاب شروع کرنے کیلئے صرف آپ کی شفاعت کو ہی قبول کیا جائے گا، جس سے پتہ چلا کہ قیامت کے دن آپ کے سید الانبیاء ہونے کا سب کو پتہ چل جائے گا، کوئی براہ راست رب تعالیٰ کے پاس آپ کے وسیلہ کے بغیر پہنچنے کا دعویٰ نہیں کرسکے گا۔

"وھو المقام المحمود الذی لایلیق الا لہ" مقام محمود پر جلوہ گری صرف آپ کو ہی حاصل ہوگی کسی اور نبی کو یہ منصب نہیں ہوگا، اس سے آپ کا افضل الانبیاء ہونا واضح ہوجائے گا۔ ان تمام اوصاف سے آپ کا تمام انبیاء کرام سے یکتا ہونا سمجھ آیا کہ آپ کو جو خصوصیات وکمالات حاصل ہیں وہ دوسرے انبیاء کو حاصل نہیں۔

جب انبیاء کرام پر لازم تھا کہ ان کی زندگی میں جو نبی بھی موجود ہو وہ اس کی تصدیق کریں، تو اسی سے اور

زیادہ واضح ہوگیا کہ تمام انبیاء کرام کو "واذاخذ اللہ میثاق النبیین" آیۃ کریمہ میں خصوصی طور پر اور تاکیدی طور پر حکم دیا کہ تمام پر لازم ہے کہ جس نبی کی زندگی میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئیں تو ان پر وہ ایمان لائیں اور ان کی امداد کریں۔ (ماخوذ از صابونی وابن کثیر)

مقصد یہی تھا کہ تمام انبیاء کرام کو یہ اقرار کر کے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کے امتی ہونے کا شرف حاصل ہو جائے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

اَفَغَيْـرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ○ (آیۃ نمبر ۸۳)

(1) تو کیا اللہ کے دین کے سواء اور دین چاہتے ہیں اور اسی کے حضور گردن رکھے ہیں جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہیں خوشی سے اور مجبوری اور اسی کی طرف پھریں گے۔ (کنز الایمان)

(2) تو کیا اللہ کے دین کے غیر کو وہ چاہتے ہیں، حالانکہ اسی کے حضور گردن رکھے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں خوشی سے اور مجبوری سے، اور اسی کی طرف پھیرے جائیں گے۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

جب اللہ تعالیٰ نے پہلی آیۃ کریمہ میں بیان فرمایا کہ تمام انبیاء کرام پر لازم ہے کہ وہ حضرت محمد ﷺ پر ایمان لائیں اور ان کی امداد کریں، پھر انبیاء کرام کے واسطہ سے خطاب ان کی امتوں کو بھی ہے۔ اس کے بعد اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا، جس میں عجیب انداز پر بیان کیا گیا ہے۔

طلباء کرام ذرا عجیب دل چسپ مسئلہ دیکھئے:

الهمزة للاستفهام والمراد استنكار ان يفعلوا ذلك اوتقرير انهم يفعلونه" (کبیر)

"افغیر" میں ہمزہ یا تو استفہام انکاری کیلئے ہے، کیا وہ اللہ کے دین کے سواء دین کو وہ چاہتے ہیں؟ نہیں وہ تو یہ نہیں

چاہتے، یہ اسی وقت ہوگا جب خطاب انبیاء کرام کو ہو، اور یا ہمزہ استفہام تقریری ہے، یعنی کیا وہ اللہ کے دین کے علاوہ کوئی اور دین چاہتے ہیں؟ ہاں وہ تو اور دین چاہتے ہیں، یہ اسی وقت ہوگا جب خطاب ان کی امتوں کو ہوگا۔

مطلب واضح ہوا کہ انبیاء کرام کی شان کے تو لائق نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کے بغیر اور دین تلاش کریں، البتہ ان کی امتوں کے لوگ حسد کی وجہ سے نبی کریم ﷺ پر ایمان نہیں لائیں گی، وہ گویا کہ اللہ کے دین کو چھوڑ کر اور دین تلاش کرر ہے ہوں گے۔

تنبیہ: اس آیۃ کریمہ کا شان نزول علامہ بغوی اور علامہ آلوسی اور علامہ قرطبی رحمہم اللہ نے یہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ یہودی اور نصرانی مل کر نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین میں اختلاف کرر ہے تھے، ایک فریق کہہ رہا تھا ہمارا دین ہی دین ابراہیمی ہے، ہم ان کے زیادہ قریب ہیں، دوسرا فریق کہہ رہا تھا ہمارا دین ہی دین ابراہیمی ہے ہم ان کے زیادہ قریبی ہیں۔ وہ دونوں فریق نبی کریم ﷺ کو کہنے لگے کہ آپ ہمارے درمیان فیصلہ فرمادیں کہ کون حق پر ہے؟

"فقال علیه الصلوة والسلام کلاالفریقین بریء من دین ابراهیم علیہ السلام"

تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا دونوں فریق ابراہیم علیہ السلام کے دین سے دور ہیں۔

"فقالو امانرضی بقضائک ولا ناخذبدینک فنزلت هذه الآیة"

وہ کہنے لگے ہم تمہارے فیصلہ پر راضی نہیں اور نہ ہی تمہارے دین کو تسلیم کرتے ہیں، تو اس آیۃ کریمہ کا نزول ہوا کہ "کیا یہ اللہ تعالیٰ کے دین کے سواء کوئی اور دین چاہتے ہیں"

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس شان نزول پر اپنا موقف یوں بیان کیا ہے:

"ویبعد عندی حمل هذه الآیة علی هذاالسبب لان علی هذاالتقدیر تکون هذه الآیة منقطعة عما قبلها"

میرے نزدیک نزول کی یہ وجہ بعید ہے کیونکہ اس شان نزول سے تو آیۃ کریمہ ماقبل سے منقطع ہو جائے گی (کٹ جائے گی)

راقم کا موقف یہ ہے کہ جب ﴿واذ اخذ الله میثاق النبیین الآیة﴾ آیۃ کریمہ میں انبیاء کرام کی امتیں بھی داخل ہیں تو شان نزول جس کو ذکر کیا گیا ہے اس سے آیۃ کریمہ ماقبل سے منقطع نہیں ہوگی، بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ یہ تو وہ لوگ ہیں جن کو ان کے انبیاء کرام بتا کر دنیا سے تشریف لے گئے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا اور ان کی امداد کرنا، اب یہ لوگ فیصلہ کرانے کیلئے آئے لیکن فیصلہ تسلیم نہیں کرتے اور دین مصطفیٰ کریم ﷺ کو بھی تسلیم نہیں کرتے،

کیا یہ اللہ کے دین کے سواء اور کوئی دین چاہتے ہیں؟ راقم نے جس انداز پر بیان کیا ہے، اسے طلباء کرام بار بار پڑھیں تو ان شاء اللہ ما قبل سے منقطع نہیں پائیں گے۔

﴿وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا﴾

''حالانکہ اسی کے حضور گردن رکھے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں خوشی سے اور مجبوری سے''

''الاسلام ھو الاستسلام والانقیاد والخضوع'' ''**ولہ اسلم**'' کا مطلب یہ ہے کہ اسی کو تسلیم کیا ہے، اسی کے سامنے سر جھکایا ہے، اسی کے سامنے گردن رکھی، اسی کے سامنے عجز کا اظہار کیا۔ زمین و آسمان میں جو ہیں وہ اس کے حضور سر جھکائے ہیں، گردن رکھے ہیں، اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب بیان کرتے ہوئے چند وجہ بیان کی گئی ہیں۔

''الاول، وھو الاصح عندی ان کل ما سوی اللہ سبحانہ ممکن لذاتہ و کل ممکن لذاتہ فانہ لا یوجد الا بایجادہ ولا یعدم الا باعدامہ فاذن کل ما سوی اللہ فھو منقاد خاضع لجلال اللہ فی طرفی وجودہ وعدمہ وھذا ھو نہایۃ الانقیاد والخضوع''

ان میں سے پہلی وجہ:

جو میرے نزدیک زیادہ صحیح ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سواء تمام چیزیں ممکن لذاتہ ہیں، اور جو چیز ممکن لذاتہ ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے موجود کرنے کے بغیر موجود نہیں ہوسکتی، اور اللہ تعالیٰ کے معدوم کرنے کے بغیر معدوم نہیں ہوسکتی، جب تمام مخلوق اپنے وجود و عدم میں رب تعالیٰ کے سامنے سر جھکائے ہو گردن رکھے ہوئے ہے، تو یہی مطلب ہے ﴿وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ﴾ کا۔

دوسری وجہ: یہ ہے جو ہر شخص کے ذہن میں آسکتی ہے، اور اسے ماننے کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں، کہ ''طوعا و کرھا'' کو ساتھ ملا کر مفہوم یوں ہوگیا کہ نیک مسلمان خوشی سے دین کے متعلق چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی طاعت کرتے ہیں اور مسلمان کئی چیزوں کو جو ان کی طبیعت کے مخالف ہوتی ہیں یعنی مرض اور فقر اور موت وغیرہ مجبوری سے مانتے ہیں کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لاحق ہیں۔ حق تو یہ تھا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے جب یہ چیزیں انسان کو حاصل ہوتی ہیں تو خوشی سے ان کو تسلیم کیا جاتا لیکن انسان اپنی فطرت کی وجہ سے مجبوری سے ان کے سامنے سر جھکاتا ہے۔ لیکن کافر لوگ اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر کو ٹالنے کی طاقت نہیں رکھتے تو مجبوری سے رب تعالیٰ کو مانتے ہیں دین سے تو ان کا تعلق ہی نہیں ہوتا، باقی امور میں بھی ان کا ماننا مجبوری کی وجہ سے ہے خوشی سے نہیں۔

تیسری وجه: مسلمان خوشی سے اسلام قبول کرتے ہیں، لیکن کئی کافر موت کے وقت رب تعالیٰ کو مانتے ہیں، لیکن اس وقت ماننا ان کیلئے نفع مند نہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا﴾ ''توان کے ایمان نے انہیں کام نہ دیا جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا''

چوتھی وجه: تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے کو خوشی سے تسلیم کرتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ (سورۃ العنکبوت، آیہ نمبر ۶۱) ''اور اگر تم ان سے پوچھو کس نے بنائے آسمان اور زمین اور کام میں لگائے سورج اور چاند تو ضرور کہیں گے اللہ نے''

لیکن **تکلیفی** کام جو ان کے ذمہ لازم ہیں، یا ان کو درد و آلام کا پہنچنا، ان چیزوں کو کہیں مجبوری سے انہیں ماننا پڑے تو مانتے ہیں، ورنہ خوشی سے نہیں مانتے۔

پانچویں وجه: یوم میثاق کو تمام لوگوں نے خوشی سے اللہ تعالیٰ کو تسلیم کیا تھا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى﴾ ''اور اے محبوب یاد کرو جب تمہارے رب نے اولاد کی پشت سے ان کی نسل نکالی، اور انہیں خود ان پر گواہ کیا، کیا میں تمہارا رب نہیں؟ سب بولے کیوں نہیں'' (یعنی ہاں اے اللہ تو ہمارا رب ہے) یہ سب لوگوں نے خوشی سے تسلیم کیا، لیکن دنیا میں آ کر رب تعالیٰ کی ربوبیت کو مسلمانوں نے خوشی سے مانا، اور کافروں نے مجبوری سے۔

چھٹی وجه: حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اہل سماء نے (آسمان والوں نے) اللہ تعالیٰ کو خوشی سے تسلیم کیا، لیکن اہل ارض (یعنی زمین والوں) میں سے بعض نے خوشی سے تسلیم کیا اور بعض نے مجبوری سے خوشی سے اسلام لانے والے مؤمن ہیں، رب تعالیٰ کے عذاب یعنی موت کو دیکھ کر ایمان لانے والے کافر ہیں۔ (ماخوذ از کبیر بالوضاحت)

طاعت اور اطاعت:

قال ابن السکیت یقال طاع له و اطاع" ابن سکیت رحمہ اللہ نے فرمایا "طاع له" (فلاں نے اس کی طاعت کی) کہا جائے، یا کہا جائے "اطاع" (فلاں نے اطاعت کی) ان دونوں کا مطلب ایک ہے۔

"قال الواحدی رحمه الله الطوع الانقیاد، یقال طاعه یطوعه طوعا اذا انقاد له وخضع واذامضی لأمره فقد اطاعه واذاوافقه فقد طاوعه"

واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن سکیت کا قول بھی درست ہے کہ طاعت اور اطاعت ایک ہی معنی میں

استعمال ہوتے ہیں لیکن کبھی فرق بھی کرلیا جاتا ہے۔ جب کسی امر کے سامنے سر جھکا لیا جائے، خشوع وخضوع سے تسلیم کرلیا جائے تو یہ طاعت ہے جب اس پر عمل بھی پایا جائے تو یہ اطاعت ہے، اور اگر خوشی سے اسے دل بھی قبول کر لے تو یہ مطاوعت ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ﴾ ''اور اسی کی طرف وہ لوٹائے جائیں گے''

زمین وآسمان کی تمام مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹایا جانا ہے، جو اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی مخالفت کریں گے کل قیامت کے دن ان کو رب تعالیٰ کے حضور پیش کیا جائے گا وہاں ان کو رب تعالیٰ کے سواء کوئی نفع ونقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ ''وَاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ'' میں دین حق کے مخالفوں کیلئے وعید عظیم پائی گئی۔

فوائد: فعلی العاقل ان یطیع ربه ولا یعصیه بنقض ما عهد الیه یوم المیثاق''

عقلمند شخص کیلئے لازم ہے کہ وہ آیۃ کریمہ کو سمجھے اور یہ سمجھے کہ رب تعالیٰ کی اطاعت اس پر لازم ہے اس کی نافرمانی نہ کرے، میثاق کے دن اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا وعدہ نہ توڑے۔

- فعهد الله مع الانبياء والاولياء والمؤمنين التوحيد واقامة الذين وعدم التفرق فيه وتصديق بعضهم بعضا ودعوة الخلق الى الطاعة وتخصيص العبادة بالله فالله تعالى لا يطلب من العبد الا الصدق فى العبودية والقيام بحقوق الربوبية''

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام اور اولیاء کرام اور مؤمنین سے توحید کا وعدہ لیا کہ صرف میری ہی عبادت کرو، میرے ساتھ کوئی شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور وعدہ یہ لیا کہ دین پر قائم رہو اور آپس میں تفرقہ پیدا نہ کرو اور بعض بعض کی تصدیق کرو، اور رب تعالیٰ نے یہ وعدہ لیا کہ مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طاعت کی دعوت دو، اور عبادت کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص کرو۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے مطالبہ نہیں کرتا سوائے اس کے وہ عبودیت میں سچے دل سے قائم رہیں، اور حقوق ربوبیت کو قائم کریں۔

- شیخ شاذلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جب تمہیں طاعت کی توفیق عطاء فرمائی تو اس نے تم پر ظاہری نعمتوں کی تکمیل فرمادی، اور تمہارے ظاہر وباطن کو اپنے امر کی مخالفت سے بچالیا، تو تمہیں حق پر قائم کردیا، اللہ تعالیٰ تم سے یہی چاہتا ہے کہ تم اس کے مطیع بن کر رہو۔
- حضرت ابراہیم ادہم رحمہ اللہ کو کہا گیا کہ اگر آپ مسجد میں بیٹھ جایا کریں، اور ہمیں کچھ وعظ ونصیحت سنایا کریں تو یہ ہمارے لئے بہتر ہو، آپ نے فرمایا مجھے چار چیزیں تمہارے پاس بیٹھنے اور بات کرنے سے مانع ہیں، اگر وہ چار چیزیں دور ہوگئیں تو میں تمہارے پاس مسجد میں بیٹھ جاؤں گا، آپ سے پوچھا گیا اے ابو اسحٰق (یہ کنیت ہے

ابراہیم ادہم رحمہ اللہ کی) وہ چار چیزیں کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا پہلی چیز ان میں سے یہ ہے کہ مجھے جب وہ وعدہ یاد آتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام اولاد آدم سے لیا، اور اللہ تعالیٰ نے بتادیا یہ لوگ جنتی ہیں، مجھے ان کی کوئی پرواہ نہیں، اور یہ لوگ جہنمی ہیں مجھے ان کی کوئی پرواہ نہیں، (یعنی رب تعالیٰ مستغنی ذات ہے کسی کا جنتیوں والا عمل اس کے اپنے نفع کیلئے ہے، اور جہنم والا عمل اس کے اپنے نقصان کیلئے ہے) "فلم ادرمن ای الفریقین کنت" مجھے معلوم نہیں کہ میں اس وقت کس فریق میں تھا۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بچے کو اس کی ماں کے پیٹ میں تخلیق کرتا ہے اور اس میں روح پھونکتا ہے تو اس پر موکل فرشتہ رب تعالیٰ سے پوچھتا ہے کیا یہ نیک بخت ہے یا بد بخت ہے (رب تعالیٰ جو بتاتا ہے، فرشتہ وہی لکھ لیتا ہے) "فلاادری کیف یخرج جوابی فی ذلک الوقت" مجھے معلوم نہیں اس وقت میرے متعلق کیا جواب تھا۔

تیسری چیز یہ ہے کہ جب ملک الموت فرشتہ (عزرائیل) روح قبض کرنے کیلئے آتا ہے تو وہ رب تعالیٰ سے پوچھتا ہے اے اللہ! کیا یہ مسلمان تھا کہ اس کا روح اسلام پر قبض کروں کہ اس کا خاتمہ بالخیر ہو یا کہ یہ کافر تھا کہ اس کا روح کفر پر قبض کروں کہ اس کا خاتمہ بالشر ہو۔ "فلاادری کیف یخرج جوابی فی ذلک الوقت" مجھے معلوم نہیں کہ اس وقت میرے متعلق کیا جواب ہوگا۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ میں جب رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں تفکر کرتا ہوں۔ ﴿وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ﴾ "جدا ہو جاؤ آج اے مجرمو" "فلاادری من ای الفریق اکون" مجھے معلوم نہیں کہ میں اس وقت کس فریق میں ہوں گا۔ "ففی ھذا شغل شغلنی عن الجلوس لکم والحدیث معکم" یہ چار چیزیں مجھے تمہارے پاس بیٹھنے اور وعظ و نصیحت سے مانع ہیں۔

حضرت ابراہیم ادہم رحمہ اللہ کے اس واقعہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ انسان کو چاہئے کہ وہ اس پر ایمان رکھے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں خیر و شر ہیں، اور اسی کے علم میں ہے کہ کون خیر پر مرے گا، اور کون شر پر مرے گا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کو مد نظر رکھتے ہوئے عمل کرتا رہے، اور اپنی طرف سے کوشش کرتا رہے اور دعاء کرتا رہے کہ اس کا خاتمہ بالخیر ہو۔ آپ کا ارشاد گرامی یہ ہے۔ "اعملوا فکل میسر لما خلق له" عمل کرو ہر شخص جس کیلئے پیدا کیا گیا ہے وہ اس میں آسانی پیدا کرنے والا ہے۔

❁ فلیجا ھذ العاقل فی تزکیه النفس اولا لم الوصیة الی عباداللہ ولایکلف المرء الا بقدر وسعه والناس فی المراتب مختلفون فطوبی لمن وصل الی اعلی المطالب"

عقلمند شخص کو چاہیے کہ وہ پہلے اپنے تزکیہ نفس (نفس کو پاک کرنے) کی کوشش کرے، پھر وہ اللہ کے بندوں کو وصیت کرے، کسی انسان کو اس کی طاقت سے زائد تکلیف نہیں دی جاتی، لوگ مراتب میں مختلف ہیں خوشی کا مقام ان کیلئے ہی ہے جو اعلیٰ مطالب کو حاصل کرلیں۔

بقدر حوصلہء خویش دانہ چنید مرغ ۔۔۔ بصعوہ نتواں داد طعمہء شہباز

اپنی طاقت کے مطابق پرندہ دانہ چن سکتا ہے ۔۔۔ چڑیا محولا باز کو لقمہ کھلانے کی طاقت نہیں رکھتی۔

❁ حضرت شیخ صفی رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ رب تعالیٰ کے قرب کو طلب کرنے والا اپنے خیال میں تمام منازل طے کرلے تو اس پر کوئی اور منزل بھی باقی رہ جاتی ہے جسے اس نے طے کرنا ہے۔ تو آپ نے جواب دیا، ہاں "یبقی علم انه هل کان مقبولا للرب تعالی اولا" ابھی یہ علم حاصل ہونا باقی ہے کہ وہ شخص جو یہ جاننے کی کوشش کرے کہ اس نے جو عبادت کی اور اپنے خیال میں تمام منازل طے کرلیں، وہ اللہ تعالیٰ کے حضور قبول ہوئی ہیں یا نہیں۔

❁ **وفی القشیری ماحاصله ان الولی فی الحال یجوزان یغیر حاله فی المآل ویجوزان یکون من جملة کرامات الولی ان یعلم انه مامون العاقبة عصمنا الله وایاکم بحسن الخاتمة"**

کتاب قشیری میں ہے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ آج کے ولی کا حال کل بدل جائے، انجام ولایت پر نہ ہو، یعنی ایمان وہی معتبر ہے جب موت ایمان پر آئے، کسی شخص نے ایمان لایا، نیکی کے عمل کرتا رہا لیکن "العیاذ باللہ" مرتد ہوگیا اور موت کفر پر آگئی تو اس کے پہلے ایمان سے اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

ایسے ہی اگر کوئی شخص منصب ولایت پر فائز ہوگیا، حقیقۃ وہ اپنے اعمال کے لحاظ پر ولی ہے، لیکن اس کی ولایت پر موت آجائے تو وہ کامیاب ہوگیا، اور اگر وہ بدقسمتی سے بداعمال ہوگیا اور اس کا خاتمہ بداعمالیوں پر ہوا تو اس کا خاتمہ ولایت پر نہیں ہوا، ولی کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے خاتمہ بالخیر کا اسے علم عطاء کردیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم تمام مؤمنین کا خاتمہ بالخیر فرمادے۔ امین ثم امین

ہمہ عالم ہمی گویند ہر آن ۔۔۔ کہ یارب عاقبت محمود گردان

تمام جہان کے (مؤمنین) ہر وقت یہی کہتے ہیں ۔۔۔ کہ اے رب عاقبت اچھی کردے (ماخوذ از روح البیان)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

زیر بحث آیۃ کریمہ میں ﴿اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ﴾ میں ہمزہ استفہام انکاری کیلئے ہے اور فاء عاطفہ پر داخل ہے، اب اس میں دو احتمال ہیں۔

ایک یہ کہ عطف جملہ کا جملہ پر ہو، یعنی ﴿فَأُولٰئِکَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾ پر عطف ہو۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ عطف محذوف مقدر پر ہو، تقدیر عبارت کی یہ ہو "ایقولون فغیر دین الله یبغون" (ماخوذ از مدارک التنزیل للنسفی)

فائدہ جلیلہ: وقال ﷺ لاتسبوا اصحابی فان اصحابی اسلموا من خوف الله واسلم الناس من خوف السیف"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے صحابہ کو گالی نہ دینا، بیشک میرے صحابہ نے اسلام قبول کیا ہے اللہ تعالیٰ کے خوف سے اور باقی لوگ اسلام قبول کریں گے تلوار کے خوف سے۔ (قرطبی)

خیال رہے کہ راقم نے "اسلم" ماضی کا ترجمہ مستقبل کا کیا ہے کیونکہ کئی مقاموں پر ماضی مستقبل کے معنی میں استعمال ہوتی رہتی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلی امتوں کا ذکر ہو تو ترجمہ ماضی والا کیا جائے گا کہ 'اور لوگوں نے اسلام قبول کیا تلوار کے خوف سے۔

گذشتہ سے پیوستہ: "طوعاو کرھا" کی تفسیر میں صوفیاء کرام کا ارشاد گرامی یہ ہے۔

ان الاسلام طوعاھو الانقیاد والامتثال لما امر الله تعالی من غیر معارضة ظلمة نفسانیة وحیلولةحجب الانانیة والاسلام کرھا ھو الانقیاد مع توسط المعارضات والوساوس وحیلولة الحجب والتعلق بالوسائط "

خوشی سے تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مطیع ہو اور اس کے احکام پر عمل کرے یہاں تک کہ نفسانی تاریکیاں اور "انا" (میں ہوں، انداز متکبرانہ) درمیان میں حائل نہ ہوں۔

پہلا اسلام فرشتوں اور انبیاء کرام کے اسلام کی طرح ہے، اور دوسرا اسلام ان لوگوں کی طرح ہے جو کثیر شبہات میں گھرے رہتے ہیں۔ کفار بھی رب تعالیٰ کو مجبوری سے مانتے ہیں ظلمت کفر جوں کی توں برقرار رہتی ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ (آیۃ نمبر ۸۴)

(1) یوں کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف اترا اور جو اترا ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کے بیٹوں پر اور جو کچھ ملا موسیٰ اور عیسیٰ اور انبیاء کو ان کے رب سے، ہم ان میں سے کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے حضور گردن جھکائے ہیں۔ (کنزالایمان)

(2) آپ فرمادیجئے ہم ایمان لائے اللہ پر، اور اس پر جو اتارا گیا ہماری طرف، اور جو اتارا گیا ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کے بیٹوں پر، (اور ہم ایمان لائے) اس پر جو دیا گیا موسیٰ اور عیسیٰ اور نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے، ہم نہیں فرق کرتے کسی ایک کے درمیان ان میں سے (ایمان لانے میں) اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

جب اللہ تعالیٰ نے گذشتہ آیۂ کریمہ "وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ" میں انبیاء کرام سے وعدہ لیا کہ جب تمہیں کتاب وحکمت عطاء کردی جائے تو پھر تمہارے پاس وہ رسول آجائیں جو تصدیق کررہے ہوں اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور بضرور ان پر ایمان لانا اور ضرور بضرور ان کی امداد کرنا۔ اب اس آیۂ کریمہ میں نبی کریم ﷺ کے تصدیق کرنے کی مزید وضاحت فرمائی جارہی ہے۔ (ازکبیر)

مختصر مطلب از ضیاء القرآن:

اپنے حبیب مکرم ﷺ کی زبان پاک سے اس حقیقت عظمیٰ کا پھر اعلان کروایا جارہا ہے کہ دین الٰہی اسلام ہی ہے، سب انبیاء ورسل اپنے اپنے زمانہ میں اس کی تبلیغ فرماتے رہے اور میں بھی اس دین کا داعی اور مبلغ بن کر آیا ہوں، اس لئے وہ تمام مقدس ہستیاں جن کو بارگاہ الٰہی سے نبوت کا شرف بخشا گیا اور ان پر جو کتابیں نازل ہوئیں ہیں اور

میرے ماننے والے ان سب کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں، ہمارا یہ شیوہ نہیں کہ بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں، یہ ہے دین محمدی کی وہ وسعت اور گہرائی جو ہر حق کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، جہاں کسی قومی، وطنی اور نسلی عصبیت کی گنجائش نہیں، اس دین قیم کی روح تمام ان عناصر سے پاک ہے جو انسان کو انسان سے ملنے نہیں دیتے، یہ کسی خاندان یا نسل خدا کا دین نہیں بلکہ رب العالمین کا دین ہے، اور اسی کے داعی کو صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو جمع کرنے کیلئے بھیجا نہیں گیا، بلکہ وہ رحمۃ للعلمین ہے جو سارے عالم انسانیت کی شیرازہ بندی کیلئے مطلع وجود پر جلوہ نما ہوا، اس لئے صرف یہی دین انسانی اتحاد کیلئے اساس محکم ثابت ہوسکتا ہے۔ (ضیاء القرآن)

﴿قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا﴾

''آپ فرمادیجئے ہم ایمان لائے اللہ پر، اور اس پر جو اتارا گیا ہماری طرف''

قرآن پاک کی کیا خوب شان:

''قل'' مفرد کا صیغہ ہے (آپ فرمادیجئے) اور ''اٰمنّا'' جمع کا صیغہ ہے (ہم ایمان لائے اللہ پر) اسی طرح ''عَلَيْنَا'' میں ضمیر جمع کی ہے کہ (ہم ایمان لائے اس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا۔ بظاہر یہ عجیب بات نظر آتی ہے کہ واحد کے صیغہ اور جمع کو کس طرح ایک جگہ استعمال کیا گیا ہے، لیکن جب قرآن پاک کی عظمت سمجھ آئے تو یہ مسئلہ آسانی سے سمجھ آسکتا ہے کہ اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں۔

(۱) (قل آمنا بالله) امر للرسول ﷺ بان يخبر عن نفسه ومن معه من المؤمنين بالايمان بما ذكر وجمع الضمير في قوله تعالى (وماانزل علينا) وهو القرآن لمانه منزل عليهم بتوسط تبليغه اليهم''

''قل'' سے خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، لیکن ''اٰمَنَّا بِاللّٰهِ'' جمع کا صیغہ ذکر کیا گیا کہ اے نبی کریم ﷺ آپ فرمادیجئے کہ میں اور میرے ساتھ مؤمنین ہم سب اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسی طرح ''وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا'' سے مراد تو قرآن پاک ہے، لیکن جمع کی ضمیر ''عَلَيْنَا'' میں لائی گئی کیونکہ قرآن پاک نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا، اور آپ کے واسطہ جلیلہ سے آپ کی امت پر بھی نازل ہوا کہ آپ نے اپنی امت کو قرآن پاک کی تبلیغ فرمادی۔ اب ﴿وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا﴾ ''اور جو نازل کیا گیا ہم پر'' کا مطلب بھی واضح طور پر سمجھ آگیا۔ (تفسیر ابی السعود)

(۲) علامہ رازی رحمہ اللہ نے بھی ایک وجہ یہی بیان کی جو تفسیر ابی السعود سے نقل کی گئی۔

اور وجہ یہ بیان کی گئی "انه تعالی حین خاطبه انماخاطبه بلفظ الواحدان وعلمه انه حین بخاطب القوم یخاطبهم بلفظ الجمع علی وجه التعظیم و التفخیم مثل مایتکلم الملوک و العظماء"
اللہ تعالی نے جب آپ کو خطاب کیا تو لفظ واحد سے خطاب کیا، پھر آپ کو یہ سکھایا کہ جب آپ قوم سے خطاب فرمائیں تو جمع کے صیغے سے خطاب کریں جو آپ کی عظمت اور رفعت شان پر دلالت کرے، یعنی جس طرح بادشاہ اور بڑے لوگ اپنی عظمت شان بیان کرنے کیلئے جمع کے صیغے استعمال کرتے ہیں، اسی طرح آپ بھی جمع کے صیغے اپنے حق میں استعمال کریں۔

راقم کو اس وجہ سے یہ سمجھ آیا کہ کبھی عاجزانہ کلام کو جھوٹے، مکار، دجال ایک آنکھ والے کانڑے حقیقت سمجھ لیتے ہیں، ان جاہلوں کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ کلام عاجزانہ کلام ہے، اسلئے جاہلوں اور کافروں، جھوٹے اور مکاروں کو کبھی یہ بھی بتانا چاہیے کہ میرا منصب ومقام کیا ہے۔

(۳) اللہ تعالی نے پہلے آپ کو لفظ "قــل" سے خطاب فرمایا کہ آپ کو ہی فقط اس کا مکلّف بنایا کہ آپ فرمادیں "میں اس چیز کی تصدیق کرتا ہوں جو تمہارے پاس ہے" یہ کام ہی جب آپ نے کرنا تھا تو خطاب بھی صرف آپ کو ہی کیا گیا۔ لیکن اس کے بعد اللہ تعالی پر اور قرآن پاک پر ایمان لانے کا ذکر کیا گیا تو جمع کے صیغے ذکر کیے گئے
"ثم قال (آمنا) تنبیها علی ان هذاالتکلف لیس من خواصه بل هو لازم لکل المؤمنین"
جن سے اس پر تنبیہ کرنی مقصود تھی کہ ایمان لانے کا مکلّف بنانا صرف نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تمام لوگوں کو اس کا مکلّف بنایا گیا، مؤمنین نے اسے قبول کرلیا، کافروں نے انکار کیا۔

جیسا کہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَانُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ تمام مؤمنوں نے ایمان لایا اس چیز پر جو اللہ نے ان کے رسول پر نازل فرمایا، ہر ایک نے اللہ اور اس کے فرشتوں، اور اس کی کتابوں، اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا (اور یہ کہا کہ) ہم نہیں فرق کرتے اس کے رسولوں کے درمیان کسی ایک پر ایمان لانے میں۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

یہاں زیر بحث آیۃ میں لفظ "علی" ذکر کیا ﴿وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرَاهِيْمَ، الآية﴾ اور سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوا "وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرَاهِيْمَ "الآية، اس میں ایک وجہ فرق یہ بیان کی گئی ہے "علی" استعلاء (بلندی) پر دلالت کرتا ہے، اور "الی" انتہا پر، یہاں اس آیۃ کریمہ میں خطاب نبی کریم ﷺ ہے لهذا مناسب استعلاء ہے،

اور سورۃ بقرہ میں خطاب میں عموم ہے، اس لئے وہاں انتہاء مناسب ہے، اسلئے "الـــی" ذکر کیا کیونکہ اس سے پہلے لفظ "قولوا" ہے جو عموم پر دلالت کررہا ہے، طلباء کرام عربی عبارت یاد کرنا چاہیں تو وہ عبارت یہ ہے۔

"وقد جعل الخطاب هنا للنبی ﷺ فناسبه الاستعلاء وهناک العموم فناسب الانتهاء" (روح المعانی)

تنبیه: کبھی "عـلـی" اور "الـی" کے ذریعے متعدی بنانے میں کوئی فرق نہیں کرتے، بلکہ مبدأ کا لحاظ کریں تو "علی" ذکر کردیا جاتا ہے، اور انتہاء کا لحاظ کریں تو "الی" ذکر کردیا جاتا ہے۔

"ویلاحظ احد الاعتبارین تارة والآخر اخری تفننابالعبارة"

عبارت میں تفنن پیدا کرنے کیلئے کبھی مبدأ کا اعتبار کرلیا جاتا ہے، لفظ "عـلـی" ذکر کردیا جاتا ہے، اور کبھی انتہاء کالحاظ کرلیا جاتا ہے تو لفظ "الی" ذکر کرلیا جاتا ہے۔

وفرق الـراغب بان ماکان واصلا من الملأالأعلی بلاواسطة کان لفظ "علی" المختص بالعلواولی به، ومالم یکن کذلک کان لفظ "الی" المختص بالایصال اولی به"

علامہ راغب اصفہانی نے ایک اور فرق بیان کیا ہے کہ جب ملأ اعلی سے بغیر کسی واسطہ کے پہنچے تو اس کے مناسب لفظ "عـلـی" ہوتا ہے جو استعلاء پر دلالت کرتا ہے، جیسا کہ اس آیۃ کریمہ میں خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، تو یہاں مناسب "علی" کا لفظ ہی ہے۔

اور سورۃ بقرہ میں خطاب عوام کو ہے ان پر بغیر واسطہ کے تو کوئی کتاب نازل نہیں، بلکہ انبیاء کرام کے واسطہ سے ان پر کتب کا نزول ہوا اس لئے وہاں لفظ "الی" کا ذکر کرنا ہی مناسب تھا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

ترتیب ذکری کا فائدہ:

پہلے ذکر فرمایا "اٰمَنَّا بِاللّٰهِ" ہم اللہ پر ایمان لائے، اس کے بعد انبیاء کرام کی نبوت اور ان پر ایمان لانے کا ذکر فرمایا "لان الایـمـان بـالله اصل الایمان بالنبوة" اس لئے کہ اللہ تعالی پر ایمان لانا اصل ہے نبوت پر ایمان لانے کیلئے، کیونکہ اللہ تعالی پر ایمان لانے کے بغیر نبوت پر ایمان ممکن ہی نہیں۔ پھر "وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا" کو "وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ" الآیۃ، سے پہلے ذکر کیا۔

"لان کـتـب سـائـر الانبیـاء حـرفـوهـا وبـدلـوهـا فلا سبیل الی معرفةاحوالها الا بما انزله الله علی محمدﷺ فکان ماانزل علی محمد کالأصل لماانزل علی سائر الانبیاء فلهذا قدمه علیه"

اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء کرام کی کتب میں تحریف کردی گئی تھی، ان کی حقانیت کو پہچاننے میں مشکل

درپیش تھی، اس کا ایک ہی حل تھا کہ پہلے قرآن پاک پر ایمان لایا جائے پھر قرآن پاک کی رہنمائی سے دوسری آسمانی کتب پر ایمان لایا جائے کہ جو کتابیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کرام پر نازل کی گئیں ان پر تو ہمارا ایمان ہے، لیکن جن میں تحریف کردی گئی ان کو ہم نہیں تسلیم کرتے۔

چند انبیاء کرام کے خصوصی ذکر کی وجہ:

﴿وَمَا اُنْزِلَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ﴾

''اور ہم نے ایمان لایا اس پر جو نازل کیا گیا ابراہیم اور اسماعیل اور یعقوب اور ان کے بیٹوں پر''

''انما خص ھؤلاء الانبیاء بالذکر لان اھل الکتاب یعترفون بوجودھم ولم یختلفوا بنبوتھم''

ان انبیاء کرام کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اہل کتاب ان انبیاء کرام کے وجود کا اعتراف کرتے تھے، اور ان کی نبوت کا بھی اعتراف کرتے تھے، ان میں کوئی اختلاف نہیں رکھتے تھے۔ (از خازن)

(والاسباط) اولاد یعقوب وکان فیھم انبیاء'' (مدارک) اور اس پر ایمان ہے جو نازل کیا گیا اسباط پر، اسباط سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہے، کیونکہ آپ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک آنے والے تمام انبیاء کرام آپ کی اولاد سے ہی تھے، چونکہ یعقوب علیہ السلام حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے تھے، اس لئے یہ بھی کہہ لیا جاتا ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے بعد آنے والے تمام انبیاء کرام آپ کی اولاد سے تھے سوائے نبی کریم ﷺ کے کہ آپ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ (وَمَا اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی) اور ہمارا ایمان اس پر بھی ہے جو موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا۔ یعنی ہمارا ایمان توراۃ پر ہے اور انجیل پر بھی، اور موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات پر بھی، ''وَمَا اُوْتِیَ'' ذکر فرمایا'' وَمَا اُنْزِلَ'' ذکر نہیں فرمایا، جس سے کتابوں اور معجزات پر ایمان رکھنے کا ثبوت مل گیا۔

پھر ان دونبیوں کا علیحدہ ذکر کیا، ماقبل کا انداز بیان بدلا جس سے یہ ثابت کیا کہ دونوں ہی اللہ کے نبی تھے یہود کا عیسیٰ علیہ السلام کو نبی نہ ماننا، اور نصاریٰ کا موسیٰ علیہ السلام کو نبی نہ ماننا باطل اور غلط طریقہ ہے۔

حکمت: ﴿وَالنَّبِیُّوْنَ﴾ ''اور ہمارا ایمان تمام انبیاء کرام پر ہے''

کرر فی البقرۃ وما اوتی ولم یکررھنا لتقوم ذکر الایتاء حیث قال لما آتیتکم''

سورۃ بقرۃ میں دوبارہ ''وَمَآ اُوْتِیَ'' ذکر کیا ہے، یعنی وہاں ہے ''وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ'' اور یہاں صرف ذکر ہے ''وَالنَّبِیُّوْنَ'' اس لئے کہ اس مقام پر پہلے ''لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ'' آچکا ہے، جس میں انبیاء کرام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا

گیا'' جب میں تمہیں کتاب وحکمت عطاء کروں'' اسی وجہ سے ''وَمَـآ اُوْتِـیَ'' دوبارہ ذکر نہیں کیا۔ (مدارک) ''مِـنْ رَّبِّهِـمْ'' سے بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ جو ان کے رب تعالی کی طرف سے عطاء کیا گیا ہے اس پر ہمارا ایمان ہے، ان کی امتوں نے ان کی بعد کتابوں میں جب تحریف کر دی تو ہم اسے تسلیم نہیں کرتے۔

تمام انبیاء کرام کی نبوت کے اقرار میں فائدہ:

اس میں چند فوائد کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) ایک یہ کہ جب یوم میثاق کو تمام انبیاء کرام سے وعدہ لیا گیا کہ تم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا اور ان کی امداد کرنا کیونکہ وہ تمہاری تصدیق کرنے والے ہیں۔ تو یہاں نبی کریم ﷺ سے اقرار کرا کے واضح کر دیا کہ ہاں واقعی آپ پہلی کتب اور معجزات کی تصدیق فرمانے والے ہیں۔

(۲) چونکہ بعض اہل کتاب دوسرے بعض کے مخالف تھے کوئی فریق کسی نبی کو تسلیم کرتا اور کسی کو نہیں، اسی طرح جن کو نبی تسلیم نہیں کرتے تھے، یقیناً ان کے معجزات کو بھی تسلیم نہیں کرتے تھے، تو رب تعالی نے نبی کریم ﷺ سے تمام انبیاء کرام پر ایمان لانے کا ذکر فرما کر واضح کر دیا کہ ''الحق تصدیق الکل والاعتراف نبوة الکل'' حق یہ ہے کہ تمام آسمانی کتب اور تمام انبیاء کرام کے معجزات کی تصدیق کی جائے اور تمام انبیاء کرام کی نبوت کو تسلیم کیا جائے۔ (از کبیر)

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾

''ہم نہیں فرق کرتے کسی ایک کے درمیان ان میں سے'' (ایمان لانے میں)

''لانفرق بین احد منهم ''بأن نؤمن ببعض دون بعض کما تفرقت الیهود والنصاری''
ہم ان میں سے کسی ایک کے درمیان تفریق نہیں کرتے کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض پر ایمان نہ لائیں، یہ تو یہود و نصاری کا کام تھا کہ بعض انبیاء پر ایمان رکھتے اور بعض پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔

﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ ''ہم اسی کے فرمانبردار ہیں''

اس ارشاد گرامی کے چند مطالب بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) ہم ان انبیاء کرام کی نبوت کی اقرار کیا ہے اس وجہ سے کہ ہم اللہ تعالی کے سامنے اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہیں، اسی کے حکم و امر کو تسلیم کرتے ہیں، اسی کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہاں سے اس امر کی طرف اشارہ پایا گیا ہے کہ

نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت کے لوگوں نے رب تعالی کے حکم کو خوشی اور عجز سے تسلیم کیا کہ رب تعالی کے حکم کے آگے سر جھکا دیا، گردن رکھ دی، بخلاف پہلے انبیاء کرام کی امتوں کے، جن کا ذکر اس آیۃ کریمہ میں آیا ہوا ہے۔ ﴿اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ﴾ انہوں نے رب تعالی کے اوامر کو خوشی سے تسلیم نہیں کیا۔

(۲) ﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ کا اور یہ مطلب ہے کہ ہم اللہ تعالی کے حکم رضاء مندی سے خوشی سے تسلیم کرتے ہیں، اس کی مخالفت نہیں کرتے، "وتلک صفة المؤمنین بالله وهم اهل السلم" یہ صفت ان لوگوں کو حاصل ہے جو اللہ تعالی پر ایمان رکھتے ہیں اور اسی کے حکم کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ بخلاف کفار کے "والکافرون یوصفون بالمحاربة لله" کہ ان کافروں کو اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ حاصل ہے، جیسا کہ رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ اس آیۃ کریمہ میں کفار کا رب تعالی اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کرنے کا واضح ذکر موجود ہے۔

(۳) تیسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ:

﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ یفید الحصر والتقدیر له اسلمنا لا لغرض آخر من سمعة ورياء وطلب مال، وهذا تنبيه على ان حالهم بالضد من ذلک فانهم لا يفعلون ولا يقولون الا للسمعة والرياء وطلب الاموال، "والله اعلم"

﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ میں حصر کا فائدہ پایا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم صرف اس کی رضاء کیلئے اسے تسلیم کرتے ہیں، اس اطاعت میں اور کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ہمیں چرچا حاصل ہو جائے، ہمیں ریاء کاری مقصود نہیں، نہ ہی رب کی اطاعت میں مال کی طلب کی حرص ہے، بخلاف مؤمنین کی ضد یہود و نصاری، کفار وہ کہیں مجبوری سے رب تعالی کے خالق ہونے کو تسلیم کر لیں تو اس میں بھی ان کا مقصد چرچا حاصل کرنا، ریاء کاری، اور مال کی طلب ہوتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

سبحان الله! مؤمن تیری کیا شان ہے، ہر طرف یہود کے یار، نصاری کے غمخوار دندناتے پھر رہے ہیں لیکن مؤمن رب تعالی اور اس کے رسول ﷺ کے حضور سر جھکائے ہوئے ہیں۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب پہلے ایمان کا ذکر ہو چکا ہے تو "ونحن له مسلمون" جملہ مستدرک ہے، اس

کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ"لیکن ابھی تک جو بحث ذکر کی ہے اس سے واضح ہوا کہ "ونحن له مسلمون" سے مراد صرف اسلام لانا نہیں، بلکہ خوشی اور اعتقاد اور خلوص سے رب تعالی کے حضور سر جھکانا، گردن رکھنا مراد ہے، لھذا یہ جملہ مستدرک نہیں، طلباء کرام روح المعانی کی اس عبارت کو دیکھیں اور راقم کے تذکرہ کو دیکھیں تو ان شاء اللہ ذرا بھر انحراف نہیں پائیں گے۔

(ونحن له مسلمون)ای مستسلمون بالطاعة و الانقیاد فی جمیع اما امر به و نهی عنه او مخلصون له فی العبادة وعلی التقدیرین لاتکون هذه الجملة مستدرکة بعد جملة الایمان کما هو ظاهر. (روح المعانی)

تنبیه: **والاسباط الاحفاد لا اولاد البنات"**

اسباط سے مراد مذکر اور مذکر کی اولاد یعنی بیٹے اور پوتے ہیں لیکن بیٹیوں کی اولاد یعنی نواسے معتبر نہیں۔

اعلی حضرت رحمہ اللہ کا خوب ترجمہ:

آپ نے "الاسباط" کا ترجمہ کیا ہے "ان کے بیٹوں، پر" راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا ہے۔ راقم نے آگے بحث میں "الاسباط" سے مراد "اولاد" بھی ذکر کیا ہے، لیکن صرف اسی خیال سے کہ طلباء کرام ترجمہ کو دیکھ کر ہی سمجھ جائیں گے کہ "اولاد" سے مراد خاص مذکر لیا گیا ہے، اگرچہ حقیقت میں مذکر و مؤنث دونوں کو شامل ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ O

(آیۃ نمبر ۸۵)

(1) اور جو اسلام کے سواء کوئی اور دین چاہے گا، وہ ہرگز اس سے قبول نہ کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں زیاء کاروں میں سے ہے۔ (کنزالایمان)

(2) اور جو شخص چاہے سوائے اسلام کے کوئی اور دین، تو ہرگز وہ نہیں قبول کیا جائے گا اس سے، اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

جب اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں بیان کیا۔ ﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ "اور ہم اسی کی اطاعت کرنے والے ہیں" اس کے پیچھے اس آیۃ کریمہ میں) گویا کہ یہ بیان فرمادیا کہ اللہ کے ہاں معتبر دین صرف دین اسلام ہی ہے۔

"وان کل دین سوی الاسلام فانه غیر مقبول عندالله"

بیشک اللہ کے حضور سوائے اسلام کے اور کوئی دین مقبول نہیں۔

"لان القبول للعمل هو ان یرضی الله ذلک العمل ویرضی عن فاعله ویثیبه علیه ولذلک قال الله تعالی انمایتقبل الله من المتقین"

اللہ تعالیٰ جس عمل کو پسند فرماتا ہے وہی اس کے ہاں قبول ہے، اور اس پر عمل کرنے والوں کو ثواب دیا جائے گا اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "بیشک اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں سے قبول فرماتا ہے" جب اللہ تعالیٰ کے ہاں دین اسلام کے سواء کوئی اور دین پسند نہیں تو یہی وجہ ہے کہ کسی اور دین پر عمل کرنے والے خسارہ پانے والے ہیں، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

شان نزول:

(۱) بارہ شخص مدینہ طیبہ سے (العیاذ باللہ) مرتد ہو کر مکہ میں چلے گئے، جن میں حارث بن سوید انصاری بھی تھا، تو ان کے بارے میں یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ اسلام سے پھر جانے والے، کفر کو اختیار کرنے والے خسارے میں ہیں، رب تعالیٰ کی ناراضگی ان کو حاصل ہے، اور رب تعالیٰ کا غیظ وغضب ان کو حاصل ہونا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی شدید گرفت میں آئیں گے۔ (ماخوذ از معالم التنزیل للبغوی)

مقام توجه: بعد میں مستثنیٰ ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ، الآیۃ﴾ آرہا ہے، جس سے واضح ہو رہا ہے کہ بعض لوگ مرتد ہونے کے بعد پھر اسلام کی طرف لوٹ کر آگئے تھے "فرجع الحارث فاسلم وحسن اسلامه" حارث بن سوید انصاری لوٹ کر آگیا، پھر دوبارہ اسلام قبول کیا، اور اسلام پر صدق دل سے قائم رہا۔ (البحر المحیط)

(۲) شان نزول اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ یہ بنی قریظہ اور بنی نضیر یہود مدینہ کے بارے میں نازل ہوئی کہ وہ نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے آپ کی نبوت کی بشارت دیتے تھے اور گواہی دیتے تھے کہ وہ نبی برحق ہوں گے "فلما بعث وجاء هم بالبينا ت والمعجزات كفروا بغيا وحسدا" جب آپ کو مبعوث فرمایا اور آپ دلائل ومعجزات لے کر آئے تو انہوں نے سرکشی اور حسد کی وجہ سے انکار کیا۔ (ماخوذ از کبیر)

(۳) **"وقيل هي في عامة المشركين"** بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ یہ آیۃ کریمہ عام مشرکین کے متعلق نازل ہوئی، جنہوں نے بھی دین اسلام کے سواء شرک کو پسند کیا وہ سب خسارے میں ہیں۔

(۴) **"الفاظ الآية تعم كل من ذكر وغيرهم"** شان نزول کی جو چند وجوہ بیان کی گئی ہیں، آیۃ کریمہ ان کو بھی شامل ہے، لیکن الفاظ کی عمومیت کی وجہ سے ان تمام لوگوں کے متعلق ہے جو دین اسلام کے سواء اور دین پسند کرنے والے ہیں، یعنی تمام ادیان باطلہ پر عمل کرنے والے خسارے میں ہیں۔ (البحر المحیط)

"الاسلام هنا قيل هو الاستسلام الى الله والتفويض اليه وهو مطلوب في كل زمان ومكان وشريعة، ولذلك فسره الزمخشري بالتوحيد واسلام الوجه لله"

اسلام کا مطلب اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالی کے حضور سر جھکانا ہے اور اپنے آپ کو اللہ تعالی کے حضور پیش کرنا ہے، ہر زمانے، ہر جگہ اور ہر شریعت میں یہی مطلوب رہا کہ بندہ اپنے آپ کو رب تعالی کے سپرد کر دے۔ اسی لئے زمخشری نے اسلام کا معنیٰ "توحید اور اللہ کی رضاء کیلئے سر جھکانا، گردن رکھنا" کیا ہے۔

"وقيل المراد بالاسلام شريعة محمد ﷺ بيّن تعالى ان من تحرى بعد مبعثه شريعة غير شريعة فغير مقبول منه"

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ اس مقام میں اسلام سے مراد نبی کریم ﷺ کی شریعت ہے، یعنی اللہ تعالی نے اس آیۃ کریمہ میں یہ واضح کر دیا ہے کہ جس نے نبی کریم ﷺ کے مبعوث ہونے کے بعد آپ کی شریعت کو چھوڑ کر کسی اور شریعت پر عمل کیا وہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ (البحر المحیط)

❁ **قال النبي ﷺ في الحديث الصحيح "من عمل عملا ليس عليه امرنا فهو رد"**

نبی کریم ﷺ کا ارشاد حدیث صحیح میں یہ ہے کہ "جس شخص نے ہماری شریعت کے بغیر کوئی اور عمل کیا وہ

مردود ہے۔ (منقول از صابونی وابن کثیر)

☆ اخرج احمد والطبرانی فی الاوسط عن ابی هریرةقال قال رسول الله ﷺ تجئی الاعمال یوم القیامة فتجئی الصلوة فتقول یارب اناالصلوة فیقول انک علی خیر وتجئی الصدقة فتقول یارب اناالصدقة فیقول انک علی خیر ثم یجئی الصیام فیقول اناالصیام فیقول انک علی خیر ثم تجئی الاعمال کل ذلک یقول الله انک علی خیر ثم یجئی الاسلام فیقول یارب انت السلام واناالاسلام فیقول الله انک علی خیر الیوم آخذ وبک اعطی قال الله فی کتابه ﴿ وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًافَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ ﴾

مسند احمد اور اوسط طبرانی میں حضرت ابوھریرہ ﷺ سے حدیث بیان کی گئی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اعمال قیامت کے دن (رب کے حضور) آئیں گے، تو نماز حاضر ہوگی، عرض کرے گی اے میرے رب میں نماز ہوں، تو رب تعالی فرمائے گا بیشک تو بھلائی پر ہے، اور صدقہ حاضر ہوگا تو عرض کرے گا، اے میرے رب میں صدقہ ہوں تو رب تعالی فرمائے گا بیشک تو بھلائی پر ہے، پھر روزے (رب تعالی کے حضور) حاضر ہوں گے، تو کہیں گے ہم روزے ہیں، تو رب تعالی فرمائے گا بیشک تم بھلائی پر ہو، پھر تمام اعمال (اسی طرح رب تعالی کے حضور) حاضر ہوں گے، رب تعالی فرمائے گا بیشک تم خیر پر ہو، پھر اسلام حاضر ہوگا تو عرض کہے گا اے میرے رب! تو سلام ہے اور میں اسلام ہوں، تو رب تعالی فرمائے گا بیشک تو بہتری پر ہے، آج میں تیری وجہ سے ہی (کچھ کو) گرفت میں لے رہا ہوں اور (کچھ کو انعامات) عطاء کررہا ہوں۔ اللہ تعالی نے اپنی کتاب (قرآن پاک) میں بیان فرمایا ہے۔

﴿وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًافَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ﴾

''اور جو شخص چاہتا ہے سوائے اسلام کے کوئی اور دین تو ہرگز نہیں قبول کیا جائے وہ اس سے، اور وہ آخرت میں ہوگا خسارہ پانے والوں میں سے'' (ماخوذ از در منثور)

وہ خسارہ کیا ہوگا؟

ان کو خسارہ ہوگا آخرت میں ثواب سے محروم ہوکر، اور ان کو عذاب ہونے کی وجہ سے خسارہ میں مبتلاء ہونا پڑے گا۔ اور نیک اعمال کے ضائع ہونے پر جو افسوس اور حسرت ہوتی ہے وہ خسارہ ہی ہے، اسی طرح دنیا میں باطل دین پر قائم رہ کر اسے جو تھکن اور مشقت حاصل ہوتی ہے وہ بھی اس کیلئے خسارہ ہوگا، غرضیکہ دین حق سے پھرنے والا دین ودنیا میں خسارے میں رہتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَO (آیۃ نمبر ۸۶)

(1) کیونکر اللہ تعالی ایسی قوم کو ہدایت چاہے جو ایمان لا کر کافر ہو گئے اور گواہی دے چکے تھے کہ رسول سچا ہے اور انہیں کھلی نشانیاں آ چکی تھیں اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا۔ (کنز الایمان)

(2) کیسے ہدایت چاہتا ہے اللہ تعالی اس قوم کی جو کافر ہو گئے ایمان لانے کے بعد، حالانکہ وہ گواہی دے چکے تھے کہ بیشک رسول سچا ہے، اور آ چکی تھی ان کے پاس کھلی نشانیاں، اور اللہ نہیں ہدایت دیتا ظالم قوم کو۔ (نجوم الفرقان)

بظاہر اس آیۃ کریمہ میں واقع ہونے والے اعتراضات تفسیر روح البیان کی خوبصورت تفسیر سے خود بخود زائل ہو جاتے ہیں، آیئے ذرا دیکھئے۔

(كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ)الی الحق(قوما كفروا بعد ايمانهم)قيل هم عشرة رهط ارتدوا بعد ما آمنوا ولحقو بمكة وهو الاستبعاد لان يهدى قوما هم معاندون للحق مكابرون فيه غير خاضعين له بان يخلق فيهم الاهتداء ويوفقهم لا كتساب الاهتداء وانما يخلق الاهتداء ويوفق الاكتساب الاهتداء وانما يخلق الاهتداء ويوفق على كسب ذلك ويقدرهم عليه اذا كانوا خاضعين متواضعين للحق راغبين فيه فالمراد من الهداية خلق الاهتداء وقد جرت سنة الله في دار التكليف على ان كل فعل يقصد العبد الى تحصيله فان الله تعالى يخلقه عقيب قصد العبد فكانه تعالى قال كيف يخلق فيهم المعرفة والاهتداء وهم قصدوا التحصيل الكفر وارادوه"

"کیسے ہدایت چاہتا ہے اللہ اس قوم کی جو کافر ہو گئے ایمان لانے کے بعد' بیان کیا گیا ہے وہ دس گروہ تھے جو ایمان لانے کے بعد مرتد ہو گئے تھے اور مکہ میں چلے گئے، ان کی ہدایت کو رب تعالی نے بعید سمجھا کہ یہ لوگ جو حق سے عناد رکھتے ہیں اور اس کی شدید مخالفت کرتے ہیں، رب کے حضور جھکتے ہیں، ان کیلئے رب تعالی کیسے ہدایت پیدا فرما دے، اور ان کو کیسے ہدایت کی توفیق عطاء فرما دے کہ وہ ہدایت کو حاصل کر لیں، اور ان کو کیسے ہدایت پر قادر کر دے، ہاں البتہ جب وہ رب تعالی کے حضور جھک جاتے ہیں، عجز اختیار کر لیتے ہیں، اور رب تعالی سے محبت کرتے ہیں تو ان کو رب کائنات توفیق عطاء کر دیتا ہے کہ وہ ہدایت حاصل کر لیں، اور ان کو ہدایت پا لینے پر قادر کر دیا جاتا ہے۔

ہدایت سے مراد اس مقام میں "خلق اهتداء" ہے، (یعنی ہدایت کا پیدا کرنا اس مقام میں مراد ہے) اللہ تعالی کا طریقہ شریف یہ ہے کہ اس دنیا میں جب کوئی بندہ ہدایت حاصل کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے ارادے کے بعد اللہ تعالی اس کے لئے ہدایت کی تخلیق فرماتا ہے۔ اور بندے جب رب تعالی کے حضور جھک جاتے ہیں، عجز و انکساری اختیار کرتے ہیں، ایمان اور نیک اعمال کا ارادہ کر لیتے ہیں تو اللہ تعالی بھی ان کیلئے معرفت و ہدایت پیدا کر دیتا ہے۔

﴿وَشَهِدُوْا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَاءَ هُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾

"حالانکہ وہ گواہی دے چکے تھے کہ رسول سچا ہے اور آ چکی تھیں ان کے پاس کھلی نشانیاں"

یعنی جو لوگ مرتد ہو گئے وہ پہلے ایمان لا چکے تھے، جب تک وہ خود دوبارہ توبہ کرنے کی اور اسلام کی طرف میلان کی کوشش نہیں کریں گے ان کی معرفت و ہدایت کو رب تعالی کیسے پیدا فرمائے گا۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ "اور اللہ نہیں ہدایت دیتا ظالموں کی قوم کو"

یعنی وہ جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا اور رب تعالی کی معرفت کی طرف توجہ ہی نہ کی، اور کفر کو ایمان پر ترجیح دی، ان کے پاس حق اور رب تعالی کی معرفت کیسے آئے گی۔

اعتراض: فان قيل ظاهر الآية يقتضى ان من كفر بعد اسلامه لايهديه الله ومن كان ظالما لايهديه الله وقد رأينا كثيرا من المرتدين اسلموا وهداهم و كثيرا من الظالمين تابوا عن الظلم"

ظاہر آیۃ کریمہ سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ جس نے اسلام کے بعد کفر اختیار کیا اللہ تعالی اسے ہدایت نہیں دیتا، اور جو شخص ظالم ہو اللہ تعالی اسے بھی ہدایت نہیں دیتا، حالانکہ ہم نے بہت مرتدین کو دیکھا کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور اللہ تعالی نے ان کو ہدایت عطاء فرما دی، اسی طرح کتنے ہی ظالموں کو ہم نے دیکھا کہ وہ ظلم سے تائب ہو گئے، تو آیۃ کریمہ کا مطلب کس طرح درست ہو سکتا ہے کہ مرتدوں اور ظالموں کو رب تعالی ہدایت نہیں دیتا۔

جواب: فالجواب ان معناه لايهديهم ماداموا مقيمين على الرغبة فى الكفر وفى الثبات عليه ولايقبلون على الاسلام واما اذا تحروا اصابة الحق والاهتداء بالادلة المنصوبة فحينئذ يهديهم الله بخلق الاهتداء فيهم"

آیۃ کریمہ کا مفہوم واضح ہے کہ جب تک وہ کفر کی طرف راغب رہتے ہیں، اور کفر پر قائم رہتے ہیں اور اسلام کی طرف توجہ نہیں کرتے، لیکن وہ حق کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور حق پر قائم رہنے کیلئے

دلائل کی طرف متوجہ کرتے ہیں تو رب تعالیٰ ان کیلئے ہدایت کو پیدا کر دیتا ہے، اور وہ ہدایت کو حاصل کر لیتے ہیں۔ (تفسیر آیۃ از روح البیان)

آیۃ کریمہ میں تکرار نہیں:

بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ آیۃ کریمہ کی ابتداء میں ﴿كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ﴾ ذکر فرمایا، اور انتہاء میں ذکر فرمایا ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ یہ تکرار ہے۔ تو اس وہم کا یوں ازالہ کیا گیا۔

"قلت ليس فيه تكرار لان قوله "كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا" انما هو مختص باولئك المرتدين عن الاسلام ثم انه تعالى عمم ذلك الحكم فى آخر الآية فقال "وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ" يعنى جميع الكفار المرتدين عن الاسلام والكافر الاصلى"

کہ اس میں تکرار نہیں اسلئے کہ "كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ" میں ان کفار ومرتدین کا ذکر ہے جن کا پچھلی آیۃ کریمہ کے شان نزول میں بیان کیا جاچکا ہے، یعنی اس میں تخصیص پائی گئی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو عام کر دیا، یعنی تمام کفار خواہ وہ اصلی کافر ہوں یا مرتد ہوں، سب کا ذکر "وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ" میں فرمادیا۔

"وانما سمى الكافر ظالما لانه وضع العبادة فى غير موضعها"

کافر کو اسلئے ظالم کہا گیا ہے کہ وہ عبادت کو اس کی جگہ کے غیر میں رکھتا ہے۔ یعنی وہ رب تعالیٰ کے بغیر اوروں کی عبادت کرتا ہے اس لئے وہ ظالم ہے۔ (خازن)

ظلم کا مطلب یہ ہے کہ "وضع الشئ فى غير محله" کسی چیز کو غیر محل میں رکھنا۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

أُولٰئِکَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَیْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلَائِکَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ٥ خَالِدِیْنَ فِیْهَا لَایُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَاهُمْ یُنْظَرُوْنَ ٥ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ٥ (آیۃ نمبر ۸۷،۸۸،۸۹)

(1) ان کا بدلہ یہ ہے کہ ان پر لعنت ہے اللہ کی، اور فرشتوں اور آدمیوں کی سب کی ٥ ہمیشہ اس میں رہیں نہ ان پر سے عذاب ہلکا ہو نہ انہیں مہلت دی جائے ٥ مگر جنہوں نے اس کے بعد توبہ کی اور آیا سنبھالا تو ضرور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (کنزالایمان)

(2) وہ (لوگ) ان کا بدلہ (یہ ہے) بیشک ان پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی ٥ ہمیشہ رہیں گے اس میں، نہیں ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب، اور نہ ہی ان کو مہلت دی جائے گی ٥ مگر وہ جنہوں نے توبہ کر لی بعد اس کے، اور اپنی اصلاح کر لی تو بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (نجوم الفرقان)

پچھلی آیۃ کریمہ "کَیْفَ یَهْدِی اللّٰهُ قَوْمًا کَفَرُوْا" اور یہ تین آیتیں ملا کر پڑھی جائیں تو ان کا مطلب سمجھنا آسان ہوگا، ابتداء درمنشور کی روایات سے کر رہا ہوں، پھر کبیر وغیرہ سے ان شاء اللہ منقول ہوگا، اس لئے پچھلی آیۃ کریمہ کا ذکر بھی ساتھ ساتھ آتا رہے گا۔

❁ اخرج النسائی وابن حبان وابن ابی حاتم والبیهقی فی سننه من طریق عکرمة عن ابن عباس قال کان رجل من الانصار فاسلم ثم ارتد ولحق بالمشرکین ثم ندم فارسل الی قومه ارسلوا الی رسول الله ﷺ هل الی من توبه ؟فنزلت کیف یهدی الله قوما کفروا بعد ایمانهم، الی قوله فان الله غفور رحیم، فارسل الیه قومه فاسلم"

نسائی اور ابن حبان اور ابن ابی حاتم اور بیہقی نے حضرت ابن عباس کی روایت عکرمہ سے نقل کی کہ انصار سے ایک شخص نے اسلام لایا، لیکن کچھ عرصہ بعد وہ (العیاذ باللہ) مرتد ہوگیا اور مشرکوں سے جاملا، پھر اس پر پشیمان ہوگیا، اس نے اپنی قوم کی طرف پیغام بھیجا کہ تم رسول اللہ ﷺ کی طرف پیغام بھیج کر میرے لئے پوچھو "کیا میری توبہ قبول کی جائے گی" تو ان کے پوچھنے پر "کَیْفَ یَهْدِی اللّٰهُ قَوْمًا کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِم" سے لیکر "غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" تک "چار آیات کریمہ

"نازل ہوئیں۔ (از درمنثور)

یعنی اسے بتایا گیا کہ جب تک کوئی شخص اپنے ارتداد اور کفر پر قائم رہے تو اس کیلئے رب تعالیٰ ہدایت ومعرفت پیدا نہیں فرماتا، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف اگر وہ توبہ کرلے اور اپنی اصلاح کرلے تو اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا ہے کیونکہ وہ "غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" ہے۔

❁ واخرج عبدالرزاق ومسددفی مسنده وابن جرير وابن المنذر والباوری فی معرفة الصحابة قال جاء الحارث بن سويد فاسلم مع النبی ﷺ ثم كفر فرجع الى قومه فانزل الله فيه القرآن كيف يهدى الله قوما كفروا الى قوله رحيم، فحملها اليه رجل من قومه . فقرأها عليه فقال الحارث انک والله ما علمت لصدوق وان رسول الله ﷺ لاصدق منک وان الله عزوجل لاصدق الثلاثة فرجع الحارث فاسلم فحسن اسلامه"

مسند عبدالرزاق وغیرہ میں ذکر کیا گیا کہ حارث بن سوید نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اسلام قبول کیا، پھر کافر ہوگئے، پھر اپنی قوم کی طرف لوٹ کر چلے گئے، (ایک روایت کے مطابق مکہ میں چلے گئے مشرکوں سے جا ملے) تو اللہ تعالیٰ نے "کَیْفَ یَھْدِی اللّٰہُ قَوْمًا کَفَرُوا" سے لے کر "غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" تک چار آیات نازل فرمائیں، تو اس قوم کا ایک شخص (جو مسلمان تھا) یہ آیات حارث کے پاس لے گیا، اور اس پر یہ آیات پڑھیں، تو حارث نے کہا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی مجھے معلوم ہے بیشک تو سچا ہے، اور رسول اللہ ﷺ تم سے بھی زیادہ سچے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ سچا ہے، تو حارث لوٹ آئے، پھر اسلام قبول کرلیا، اور اچھے طریقہ سے یعنی خلوص قلب سے ایمان قبول کرلیا۔ (منقول از درمنثور)

❁ قال عكرمة نزلت فی ابی عامر الراهب والحارث بن سويد بن الصامت ووحوح بن الاسلت فی اثنی عشر رجلا رجعوا عن الاسلام ولحقوا بقريش ثم كتبوا الى اهلهم هل لنا من توبة فنزلت الا الذين تابوا من ذلک "الآيات"

حضرت عکرمہ ؓ نے فرمایا یہ آیات کریمہ نازل ہوئی ہیں ابو عامر راہب اور حارث بن سوید بن صامت اور وحوح بن اسلت وغیرہ بارہ شخصوں کے متعلق جو (العیاذ باللہ) اسلام سے پھر گئے اور قریش سے لاحق ہوگئے، پھر انہوں نے اپنی اہل (یعنی اپنی قوم) کی طرف لکھا کیا ہماری توبہ قبول ہو جائے گی، تو "اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا" وغیرہ آیات نازل ہوئیں۔ (منقول از درمنثور)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

﴿اُولٰئِکَ جَزَاؤُھُمْ اَنَّ عَلَیْھِمْ لَعْنَةَ اللّٰہِ وَالْمَلٰئِکَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ O خٰلِدِیْنَ فِیْھَا﴾

''وہ (لوگ) ان کا بدلہ (یہ ہے) کہ بیشک ان پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں ذکر فرمایا کہ جو لوگ ایمان کے بعد کافر ہو جاتے ہیں ان کو اللہ تعالی کیسے ہدایت دے گا'' یعنی جب تک وہ کفر پر جمے رہے اور ایمان کی طرف انہوں نے میلان نہ کیا تو اللہ تعالی ان کیلئے ہدایت ومعرفت پیدا نہیں فرمائے گا کہ وہ ہدایت پر آجائیں۔اب اس آیۃ کریمہ میں یہ ذکر کیا جارہا ہے کہ صرف ہدایت نہ دینے پر معاملہ محدود نہیں۔

''بل کما لایھدیھم فی الدنیا یلعنھم اللعن العظیم ویعذبھم فی الآخرۃ علی سبیل التابید والخلود''
بلکہ جس طرح ان کو دنیا میں ہدایت نہیں دی جاتی اسی طرح آخرت میں ان پر بہت عظیم لعنت ہوگی اور ان کو عذاب دیا جائے گا، یہ لعنت وعذاب ان کیلئے دائمی ہوگا، اس سے ان کو چھٹکارا حاصل نہیں ہوگا۔ (از کبیر)

اللہ کی لعنت اور فرشتوں اور لوگوں کی لعنت میں فرق:

واعلم ان لعنة اللہ مخالفة للعنة الملائکة لان لعنة بالابعاد من الجنة وانزال العقوبة والعذاب واللعنة من الملائکة ھی بالقول و کذلک من الناس''
اللہ تعالی کی لعنت فرشتوں کی لعنت سے علیحدہ ہے، کیونکہ اللہ تعالی کی لعنت کا یہ مطلب ہے کہ وہ ان کو جنت سے دور رکھے گا، اور ان کو اپنی گرفت میں لے گا اور ان پر عذاب نازل کرے گا، اور فرشتوں اور لوگوں کی لعنت زبانی، کلامی ہوگی کہ ''اللہ کی ان پر لعنت ہو'' (از کبیر)

انتباہ: اولئک جزاؤھم '' کا مطلب یہ "اولئک جزاء کفر ھم" وھناک اولئک علیھم لعنة اللہ'' کہ ان لوگوں کے کفر کی جزاء یہ ہے کہ ان پر اللہ تعالی کی لعنت ہے۔"جزاء کفر" کی تخصیص کی ضرورت کیوں درپیش آئی؟ اس لئے کہ جس کی موت کفر پر آنے کا یقین ہو لعنت اس پر ہی بھیجی جاتی ہے، مؤمن پر لعنت کرنا جائز نہیں۔ ان آیات کریمہ کے شان نزول سے واضح ہو چکا ہے کہ کئی لوگ ایمان کے بعد مرتد ہوئے لیکن پھر وہ توبہ

کر کے ایمان بھی لے آئے، ان پر لعنت بھیجنا جائز نہیں، لھذا یہاں ضروری ہے کہ مطلب یوں ہی بیان کیا جائے کہ وہ لوگ جو کافر ہوئے اور کفر پر ہی مر گئے ان کی جزاء یہ ہے کہ ان پر اللہ کی لعنت ہے، اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی ان پر لعنت ہے۔ لیکن وہ خوش قسمت جو توبہ کر کے پھر ایمان لے آئے، ان کو ہدایت بھی مل گئی، مغفرت اور رحمت بھی حاصل ہوگئی اور وہ لعنت سے بھی بچ گئے۔ (از البحر المحیط)

اعتراض: یہ کیسے کہا گیا ہے کہ لعنت صرف کافروں پر مومنوں پر نہیں، حالانکہ نبی کریم ﷺ ایک جگہ سے گزر رہے تھے تو آپ نے ایک گدھے کے چہرہ کو دیکھا جسے گرم لوہے سے داغ دیا ہوا تھا، تو آپ نے فرمایا "لعن اللہ تعالی من فعل ھذا" اللہ کی اس پر لعنت ہو جس نے یہ کام کیا۔

"وبماصح ان الملائکۃ تلعن من خرجت من بیتھا بغیر اذن زوجھا"

صحیح روایات سے ثابت ہے کہ جو عورت خاوند کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر نکلے اس پر فرشتے لعنت کرتے ہیں، ان روایات سے مؤمنوں پر لعنت کرنے کا جواز ملتا ہے۔

جواب: واجیب بان اللعن ھناک للجنس الداخل فیہ الشخص ایضا"

کہ روایات میں جس لعنت کا ذکر ہے وہ جنس لعنت ہے یعنی مطلقا لعنت میں مؤمنین بھی داخل ہیں۔ (روح المعانی)

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لعنت کا جب معنی یہ لیا جائے کہ "اللہ تعالی ان کو جنت سے دور رکھتا ہے اور دائمی عذاب میں مبتلاء رکھتا ہے" تو یہ لعنت صرف کافروں پر کی جاسکتی ہے، مؤمنوں پر نہیں، فرشتوں اور لوگوں کی یہی لعنت رب تعالی سے کافروں کیلئے ہی طلب کی جاسکتی ہے، مومنوں کے لئے نہیں۔ لیکن جب لعنت کا معنی یہ لیا جائے کہ رب تعالی کے خصوصی تقرب سے دوری تو یہ لعنت مومنوں پر کی جاسکتی ہے، بلکہ یہ لعنت صرف مومنوں پر ہی کی جاسکتی ہے، کیونکہ تقرب الہی ان کو ہی حاصل ہوتا ہے، کافروں کو جب تقرب حاصل ہی نہیں ہوتا تو ان کیلئے دوری کی دعاء کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

سؤال: یہاں سب لوگوں کے لعنت بھیجنے کا ذکر کیوں کیا گیا، حالانکہ کافر کافروں پر لعنت نہیں کرتے۔

پہلا جواب: یہاں مراد یہ ہے کہ ہر شخص کا حق یہ ہے کہ وہ کافر پر لعنت بھیجے خواہ وہ لعنت بھیجے یا نہ بھیجے۔

دوسرا جواب: یوم آخرت میں کافر بھی کافروں پر لعنت کریں گے، رب تعالی کا ارشاد گرامی یہ ہے۔ ﴿كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا﴾ "جب بھی کوئی گروہ (کافروں کا) داخل ہوگا تو لعنت کرے گا اپنے ہم جنس گروہ پر" اور ارشاد باری تعالی ہے۔ ﴿ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم

بَعْضًا﴾ "پھر قیامت کے دن بعض بعض کا انکار کردیں گے اور لعنت بھیجیں گے بعض بعض پر"

"وعلی هذاالتقدیر فقد حصل اللعن للكفار من الكفار"

جب یہ معنی لیا جائے کہ قیامت کے دن سب لوگ کافروں پر لعنت بھیجیں گے تو سب کافروں کی دوسرے کافروں کیلئے لعنت ثابت ہو جائے گی۔

تیسرا جواب: الثالث كان الناس هم المؤمنون والكفار ليسوا من الناس"

رب تعالیٰ نے "الناس" ذکر فرمایا جس کا معنی ہے "انسان" کہ سب انسان لعنت بھیجتے ہیں، اس سے مراد مؤمنین ہیں، کہ حقیقت میں "انسان" صرف مؤمن ہی ہے، کافر تو انسان ہی نہیں، بلکہ وہ تو چوپاؤں سے بھی گھٹیا ہے، جس پر قرآن پاک کی یہ آیت کریمہ دلالت کر رہی ہے۔﴿اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ "وہ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں"

چوتھا جواب: والرابع وهو الاصح عندی ان جميع الخلق يلعنون المبطل والكافر، ولكنه يعتقد فی نفسه انه ليس بمبطل ولا بكافر فاذالعن الكافر وكان هو فی علم الله كافرا فقدلعن نفسه وان كان لايعلم ذلك"

اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق باطل راہ پر چلنے والے اور کافر پر لعنت بھیجتی ہے، البتہ کافر کافر پر تو لعنت بھیجے گا، لیکن اپنے عقیدہ میں اپنے آپ کو وہ کافر نہیں مانتا، وہ کہتا ہے میں تو حق راہ پر ہوں میں کوئی کافر تو نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ کافر ہے، جب وہ باطل راہ پر چلنے والے، اور کافر پر لعنت بھیجے گا تو گویا کہ وہ اپنے آپ پر بھی لعنت بھیج رہا ہوگا۔ (ماخوذ از کبیر)

وعید شدید:

وكل ذلك مستحق لهم بسبب ظلمهم وكفرهم فصلح ان يكون جزاء لذلك"

ہر ظالم اور کافر کی یہی جزاء ہے کہ اس پر لعنت بھیجی جائے کیونکہ وہ مستحق لعنت ہے۔ (کبیر).

اعلیٰ حضرت وعلامہ رازی رحمهما الله :

ثم لما ذكر لعن الثلاث قال اجمعين" (کبیر) پھر جب تین لعنتوں کا ذکر دیا گیا، یعنی اللہ اور فرشتوں اور لوگوں کی لعنت کا ذکر کر دیا گیا تو فرمایا "اجمعین" یہ تینوں کی تاکید ہو گئی کہ "سب کی لعنت ہو" اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ نے ترجمہ فرمایا "لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور آدمیوں کی سب کی" آپ کے ترجمہ میں "سب کی

"علیحدہ مذکور ہے جس سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ "اجمعین" تینوں کی تاکید ہے۔

راقم نے طلباء کرام کے فائدہ کیلئے یہ ترجمہ کیا ہے کہ ان کو دوسری صورت بھی سمجھ آجائے ورنہ بہتر وہی ہے جو علامہ رازی رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ راقم کا ترجمہ تفسیر مظہری سے لیا گیا ہے، آپ رقمطراز ہیں:۔

﴿وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾ المراد به المؤمنون منهم او المراد مؤمنهم و كافرهم اجمعين فان الكفار ايضا يلعنون منكرى الحق وان كانوا لايعرفون الحق بعينه اوهم يلعن بعضهم بعضا يوم القيامة قال الله تعالى يكفر بعضكم بعضا يوم القيامة ، قال الله تعالى يكفر بعضكم ببعض ويلعن بعضكم بعضا"

﴿وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾ (سب لوگوں کی لعنت) سے مراد یہ ہے کہ لوگوں میں سے سب مؤمنین کافروں پر لعنت کرتے ہیں، اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ مراد سب لوگ ہوں خواہ مؤمن ہو یا کافر، کیونکہ کافر بھی حق کے منکرین پر لعنت بھیجتے ہیں، اگرچہ وہ حق نہیں پہچانتے، یعنی وہ خود بھی حق کے منکر ہوتے ہیں لیکن اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں، یا مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن سب ہی کافروں پر لعنت کریں گے۔ جو رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی سے واضح ہے، وہ ارشاد یہ ہے ﴿يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ (ماخوذ از مظہری)

اور تفسیر تبصیر الرحمٰن نے بھی "اجمعین" کو تاکید "والناس" کی بنایا ہے۔

﴿وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾ من المؤمنين الذين آذوهم والكافرين الذين وقعوا فى الكفر بسببهم يتسلطون عليهم مجتمعين"

﴿وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾ سے مراد یا تو کل مؤمنین ہیں جن کو انہوں نے ایذاء دی ہے، اور یا تو صرف کافر مراد ہوں جن کے سبب وہ کفر میں واقع ہوں، وہ ان پر مسلط ہے ہوں۔ (از تبصیر الرحمٰن)

﴿خَالِدِيْنَ فِيْهَا﴾ "وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے"

یعنی وہ ہمیشہ لعنت میں رہیں گے، اس ارشاد گرامی کے چند مطالب ہیں، ایک یہ کہ وہ قیامت کے دن لعنت میں مبتلاء ہوں گے جو ان سے کبھی زائل نہیں ہوگی، ہمیشہ ان پر اللہ اور فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہوتی رہے گی، بلکہ ان کے ساتھی کفار جہنم میں ہوں گے یہ کافر جہنم میں ایک دوسرے پر لعنت کر رہے ہوں گے۔

دوسری وجہ کہ وہ ہمیشہ لعنت میں رہیں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر لعنت کا اثر ہمیشہ رہے گا، لعنت کا اثر

عذاب ہے، یعنی وہ عذاب میں ہمیشہ رہیں گے، لعنت کے اثر میں ہمیشہ رہنا لعنت میں ہی ہمیشہ رہنا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وِزْرًا o خَالِدِيْنَ فِيْهِ﴾ ''جس شخص نے اس سے اعراض کیا بیشک وہ قیامت دن بوجھ اٹھائے ہوگا وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے'' یہاں بھی گناہوں کے بوجھ میں رہنے سے مراد عذاب میں رہنا ہے۔

تیسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ (خالدين فيها) ای فی جهنم'' وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے یعنی جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ اگر چہ جہنم کا ذکر صراحۃ تو پہلے نہیں، لیکن کنایۃ سمجھ آرہا ہے کہ لعنت ذریعہ ہے جہنم میں جانے کا لہذا "فيها" میں ضمیر "جهنم" کی طرف لوٹا دی، اسی وجہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا "فعلى هذا الكناية عن غير مذكور" کہ یہ غیر مذکور سے کنایہ کے طور پر مذکور ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

واعلم ان قوله ﴿خَالِدِيْنَ فِيْهَا﴾ نصب على الحال مما قبله وهو قوله تعالىٰ ﴿عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ﴾

﴿خَالِدِيْنَ فِيْهَا﴾ منصوب ہے کیونکہ ﴿عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ﴾ سے حال واقع ہے، اگر چہ بظاہر یہ مبتداء خبر ہیں لیکن ظرف جب خبر ہو وہاں فاعلیت والا معنی پایا جاتا ہے، کیونکہ عامل وہاں استقر ہوتا ہے، اس لئے حال بنانا صحیح ہے۔ (کبیر بوضاحت)

﴿لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ﴾

''نہیں ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ ہی ان کو مہلت دی جائے گی۔''

مطلب واضح ہوا کہ ان کے عذاب میں کوئی تخفیف نہیں کی جائے گی اور نہ ہی ان کا عذاب ایک وقت سے دوسرے وقت مؤخر کیا جائے گا۔

﴿وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ﴾ معنى الانظار، التاخير، قال تعالىٰ ﴿فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ﴾

"انظار" کا معنی ہے تاخیر، جیسا کہ ﴿فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ﴾ میں "نظرة" کا معنی تاخیر اور مہلت ہے، اسی طرح ﴿وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ان کے عذاب کو مؤخر نہیں کیا جائے گا، ان کو عذاب میں مہلت نہیں دی جائے گی۔

"ان العذاب الملحق بالكافر مضرة خالصة عن شوائب المنافع دائمة غير منقطعة" نعوذ منه بالله"

کافروں کا عذاب مکمل طور پر نقصان اور ضرر پہنچانے والا ہوگا، اس میں ذرا بھر نفع کا کوئی احتمال نہیں ہوگا، حالانکہ دنیا

میں ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی سزا دی جاتی ہے لیکن اس میں نفع پایا جاتا ہے کہ یہ پڑھ جائے، یا یہ سنور جائے، اس کیلئے اس کا انجام بہتر ہو جائے، لیکن کافر کے عذاب میں نفع کا کوئی شائبہ نہیں پایا جائے گا، اور کافر کا اخروی عذاب ختم بھی نہیں ہونا، کیونکہ نہ اخروی زندگی نے ختم ہونا ہے اور نہ عذاب نے، (نعوذ باللہ منہ) ''اللہ کی پناہ ایسے عذاب سے۔'' (کبیر)

﴿اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾

''مگر وہ جنہوں نے توبہ کر لی بعد اس کے اور اپنی اصلاح کر لی تو بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے''

یعنی کافر جب کفر سے توبہ کر کے ایمان لے آئیں اور اچھے عمل کر لیں تو اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے گا، اور اللہ ان پر رحم فرمائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ ''تَابُوْا'' کے بعد ''وَاَصْلَحُوْا'' ذکر فرما کر یہ مسئلہ واضح کر دیا کہ کامیابی کیلئے صرف توبہ کافی نہیں بلکہ توبہ کے بعد ظاہری اور باطنی اصلاح ضروری ہے۔ راقبہ وغیرہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرے، اور باطنی اصلاح یہ ہے کہ ظاہری اصلاح یہ ہے کہ عبادت کرے یعنی حقوق اللہ ادا کرے، اور حقوق العباد کا لحاظ کرے، کسی انسان پر ظلم نہ کرے، کسی کا مال ناحق اپنے قبضہ میں نہ کرے، جب توبہ بھی کرے گا اور اپنی ظاہری اور باطنی اصلاح کرے گا تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس پر رحم فرمائے گا، اس کی بخشش کر دے گا۔

(فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ) کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ دنیا میں ان کی برائیوں کی پردہ پوشی کر کے ان کی مغفرت کرتا ہے کیونکہ وہ غفور ہے، اور آخرت میں اپنی رحمت سے ان کو معاف فرمائے گا کیونکہ وہ رحیم ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ عذاب کو زائل کر کے بخشش فرمائے گا کیونکہ وہ غفور ہے، اور اپنی رحمت سے ثواب عطاء فرمائے گا کیونکہ وہ رحیم ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ﴾ ''(اے محبوب) آپ فرما دیں انہیں جنہوں نے کفر کیا ہے کہ اگر وہ رک جائیں تو بخش دے گا ان کے پہلے گناہ، یعنی وہ کفر سے رک کر ایمان لے آئیں تو اللہ تعالیٰ ان کے پہلے تمام گناہ کر دے گا، قانون شریعت ہی رب تعالیٰ نے اپنے فضل سے یہ مقرر فرما دیا ''ان الاسلام یھدم ما مضی'' بیشک اسلام گذرے ہوئے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ (کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

''فان اللہ'' میں ''فاء'' آئی ہوئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاق و سباق سے (یعنی عبارت کے ماقبل اور

مابعد سے) واضح ہو رہا ہے کہ یہ جزاء اور شرط اس کی مفہوم کلام سے واضح ہے، معنوی طور پر عبارت یوں بن گئی ﴿اِنْ تَابُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ لَھُمْ﴾ "اگر وہ توبہ کر لیں تو بیشک اللہ تعالیٰ ان کی بخشش کر دے گا۔" (ماخوذ از کبیر)

اعتراض : یہ کہنا کس طرح صحیح ہے کہ صرف توبہ کافی نہیں بلکہ اصلاح عقائد و اعمال بھی ضروری ہے، حالانکہ

"ان مجرد التوبة يوجب تخفيف العذاب ونظر الحق اليهم"

صرف توبہ سے ہی عذاب کی تخفیف ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت کا وہ مستحق ہو جاتا ہے۔

"فالظاهر انه ليس تقييدا بل بيان لان يصلح مافسد"

اس سے پتہ چلا کہ "واصلحوا" بخشش کی قید نہیں بلکہ بیان ہے اس چیز کا کہ توبہ خود ہی اصلاح ہے کہ گناہ جو ذریعہ فساد ہیں وہ توبہ سے مٹ جاتے ہیں۔

جواب : یہاں دو لحاظ ہیں ایک یہ کہ ماضی کے گناہوں کی توبہ کر لے تو وہ گناہ تو صرف توبہ سے معاف کر دئے جاتے ہیں، لیکن توبہ یہ ہے کہ "ماضی کے گناہوں پر نادم ہو" اور گناہوں کی معافی طلب کرے، اور مستقبل میں گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لے۔ یہ پختہ ارادہ گناہ نہ کرنے کا مستقبل میں کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ اصلاح عقائد و اعمال بھی ضروری ہے، جواب میں علامہ آلوسی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں۔

"واجيب بانه ليس بوارد لان مجرد الندم والعزم على ترك الكفر فى المستقبل لا يخرجه منه فهو بيان للتوبة المعتدبهافالمآل واحد" (روح المعانی)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ O (آیة نمبر ۹۰)

(1) بیشک وہ جو ایمان لاکر کافر ہوئے پھر اور کفر میں بڑھے ان کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی، اور وہی ہیں بہکے ہوئے۔ (کنزالایمان)

(2) بیشک وہ جنہوں نے کفر کیا ایمان کے بعد، پھر بڑھے اور کفر، ہرگز نہیں قبول کی جائے گی ان کی توبہ، وہی (کامل) بھٹکے ہوئے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

کفر میں زیادتی کیسے؟

اس میں چند وجوہ بیان کی گئی ہیں:

(۱) ایک تو مرتد کا کفر کہ وہ کفر پر قائم رہے، اور اسی پر اسرار کرے "فیکون الاصرار کالزیادة" تو اس کا اصرار کفر میں زیادتی ہے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ کفر کے ساتھ اور کفر ملایا جائے، جیسا کہ اہل کتاب نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ پر ایمان رکھتے ہیں "ثم کفروا به عند المبعث" پھر انہوں نے آپ کی بعثت پر آپ سے کفر کیا۔

"ثم ازدادوا کفرا بسبب طعنهم فیه فی کل وقت، ونقضهم میثاقه وفتنتهم للمؤمنین وانکارهم لکل معجزة تظهر"

پھر وہ اور کفر میں بڑھے، کیونکہ وہ ہر وقت آپ کی نبوت اور آپ پر طعن کرتے، اور وعدہ کر کے توڑ دیتے، اور مؤمنوں کو فتنوں میں مبتلاء رکھتے، اور جب بھی کوئی معجزہ ظاہر ہوتا وہ اس کا انکار کرتے، یہ تھا ان کا کفر میں بڑھنا۔

(۳) کفر میں ان کے بڑھنے کی اور وجہ یہ ہے کہ یہود نے موسیٰ علیہ السلام سے ایمان لایا، پھر عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کا انکار کر کے کافر ہوگئے "ثم ازدادوا کفرا بسبب انکارهم محمد ﷺ والقرآن" پھر وہ حضرت محمد ﷺ اور قرآن پاک کا انکار کر کے کفر میں اور بڑھے۔

(۴) آیۃ کریمہ کے شان نزول کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جو مرتد ہو کر مکہ چلے گئے، اور ان کا کفر اور زیادہ ہوا کیونکہ انہوں نے کہا۔ "نقیم بمکة نتربص بمحمد ریب المنون"

ہم مکہ میں ہی رہیں گے اور محمد (ﷺ) پر حوادثات زمانہ کی انتظار کریں گے۔

(۵) "المراد فرقة ارتدوالم عزمواعلی الرجوع الی الاسلام علی سبیل النفاق فسمی الله تعالی ذلک النفاق کفرا"

اس آیۂ کریمہ میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو مرتد ہو گئے تھے، پھرانہوں نے اسلام کی طرف منافقانہ انداز پر رجوع کرنے کا ارادہ کیا، تو اللہ تعالی نے ان کے اس نفاق کو کفر سے تعبیر کیا، کہ وہ پہلے ہی ارتداد کی وجہ سے کافر تھے پھر منافقت کی وجہ سے اور ہی زیادہ کفر میں بڑھ گئے۔ (کبیر)

(۶) وقیل نزلت فی قوم من اصحابه ممن کان یکفر لم یراجع الاسلام"

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ یہ آیۂ کریمہ ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو کبھی اسلام لے آتے، اور کبھی کافر ہوجاتے ان کا بار بار کفر کی طرف رجوع کرنا حقیقت میں کفر کی طرف بڑھنا تھا، اسی کو رب تعالی نے بیان فرمایا۔
(از روح المعانی)

﴿ثُمَّ ازْدَادُوْ کُفْرًا﴾ ''پھر وہ اور کفر میں بڑھ گئے''

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿اِزْدَادُوْا﴾ ماخوذ ہے ''زیادۃ'' سے، اصل میں ﴿اِزْتَادُوْا﴾ ہے، باب افتعال کی فاءکلمہ میں "زاء" واقع ہے، اسلئے ''تاء'' کو "دال" سے تبدیل کرنا واجب ہوگیا، اسطرح ﴿اِزْتَادُوْا سے ﴿اِزْدَادُوْا﴾ بن گیا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

توبہ کا قبول نہ ہونا کیسے؟

بظاہر یہ مسئلہ مشکل نظر آرہا ہے۔

"انه تعالی حکم فی الآیة الاولی بقبول توبة المرتدین وحکم فی هذه الآیة بعدم قبولها"

کہ اللہ تعالی نے اس سے پہلی آیۂ کریمہ میں مرتدین کی توبہ کی قبولیت کا ذکر فرمایا، اور اس آیۂ کریمہ میں ذکر فرمایا کہ ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، یہ تو دونوں آیتوں میں تناقض پایا گیا ہے، اس تناقض کو کیسے دور کیا جائے۔

''وایضا ثبت بالدلیل انه متی وجدت التوبة بشروطها فانهاتکون مقبولة لامحالة''

اور یہ بات بھی دلائل سے ثابت ہے کہ جب توبہ اپنی شرائط کے ساتھ پائی جائے تو وہ یقیناً قبول کی جاتی ہے، تو اس آیۂ کریمہ میں توبہ کے قبول نہ کئے جانے کی کیا وجہ ہے۔

توبہ کے نہ قبول کرنے کی چند وجوہ:

(۱) اس میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو موت کے وقت توبہ کرتے ہیں، ان کی توبہ نہ قبول کرنیکا ذکر رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں پایا گیا ہے۔

﴿وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا﴾ (النساء آیۃ نمبر ۱۸)

''اور نہیں توبہ ان کی جو گناہوں کا عمل کرتے رہے یہاں تک کہ ان میں سے جب کسی کو موت آئے تو وہ کہے اب میں نے توبہ کی، اور نہ ان کی جو کافر مریں، ان کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے''

یہ جواب حضرت حسن بصری اور قتادہ اور عطاء رحمهم الله نے دیا ہے۔

(۲) صاحب کشاف نے یہ ذکر کیا ہے۔

"قو له تعالی (لن تقبل توبتهم) جعل کناية عن الموت علی الکفر"

اس آیۃ کریمہ میں جن لوگوں کا ذکر ہے کہ ان کی توبہ قبول نہیں کی جاتی اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی موت کفر کی حالت میں آئے، جو کفر کی حالت میں مرے اس کی توبہ قبول نہیں جاتی۔ جو آیۃ کریمہ سورۃ نساء کی جواب میں ذکر کی ہے اس سے یہ مسئلہ واضح طور پر سمجھ آ رہا ہے۔ ﴿وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ﴾ ''اور نہ (توبہ) ان کی جو کافر مریں'' اب آیۃ کریمہ کا معنی یہ ہو گیا۔

"ان اليهود والمرتدين الذين فعلوا مافعلوا ماتون علی الکفر داخلون فی جملة من لاتقبل توبتهم"

بیشک یہود اور مرتدین نے کیا جو کیا، یعنی کفر پر کفر کرتے چلے گئے، پھر موت بھی ان کی کفر پر آئی، اس لئے وہ ان لوگوں میں داخل ہو گئے جن کی توبہ کو نہیں قبول کیا جاتا۔

(۳) انه يحمل هذا علی ما اذا تابوا باللسان ولم يحصل فی قلوبهم اخلاص''

اور جواب یہ دیا گیا ہے کہ آیۃ کریمہ میں جن لوگوں کی توبہ قبول نہ کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو توبہ زبان سے کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں خلوص نہیں پایا گیا۔ ان کا زبان سے توبہ کرنا اور دل سے توبہ نہ کرنا اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں، اس لئے رب تعالیٰ ان کی توبہ قبول نہیں کرے گا۔

(۴) اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے یہ ذکر فرمایا جو لوگ ایمان کے بعد کفر کرتے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ

اور فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہوتی ہے۔ پھر ارشاد فرمایا: ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ وَاَصْلَحُوْا﴾ ''کہ مگر جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کر لی'' اور لوگ اللہ کی رحمت اور بخشش کے مستحق ہو جاتے ہیں، اب اس آیۃ کریمہ میں گویا کہ یہ ذکر فرمایا گیا۔

''انہ لو کفر مرۃ اخری بعد تلک التوبۃ فان التوبۃ الاولی تصیر غیر مقبولۃ وتصیر کانھا لم تکن''

توبہ کے بعد اگر انہوں نے پھر کفر کیا تو وہ پہلی توبہ غیر مقبول ہوگی، گویا کہ پہلے انہوں نے توبہ کی ہی نہیں تھی۔

یہ قول قاضی ابوبکر رازی اور قفال اور ابن انباری کا ہے، اس قول کو بعض حضرات نے پسند کرتے ہوئے یوں کہا۔ ''وھذا الوجہ الیق بالآیۃ من سائر الوجوہ'' ''تمام وجوہ میں سے یہ وجہ زیادہ مناسب ہے''

(۵) لعل المراد ما اذا تابوا عن تلک الزیادۃ فقط فان التوبۃ عن تلک الزیادۃ لاتصیر مقبولۃ مالم تحصل التوبۃ عن الاصل''

آیۃ کریمہ میں بیان کیا گیا: ﴿ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا﴾ ''پھر وہ کفر میں بڑھتے گئے'' جب وہ کفر پر کفر کرتے گئے تو ان میں سے کئی لوگوں نے زیادتی کفر سے توبہ کی لیکن اصل کفر سے توبہ نہیں کی، تو آیۃ کریمہ میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا کہ جو لوگ اصل کفر سے توبہ نہیں کرتے بلکہ صرف زیادتی کفر سے توبہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول نہیں فرماتا۔ (ماخوذ از کبیر)

چند لوگوں کی توبہ قبول نہیں کی جاتی:

وکل مسلم ارتد فتوبتہ مقبولۃ الا احد عشر من تکررت ردتہ ساب النبی ﷺ وساب احد الشیخین والساحر والزندیق والخناق والکاھن والملحد والاباحی والمنافق ومنکر بعض الضروریات باطنا''

ہر مسلمان جو مرتد ہو جائے ''العیاذ باللہ'' اس کی توبہ قبول ہے، سوائے گیارہ آدمیوں کے، ان کی توبہ قبول نہیں۔

(۱) وہ شخص جو بار بار مرتد ہو جائے، یعنی جو شخص اسلام کو کھیل تماشہ بنالے اور بار بار اسلام قبول کرتا رہے، بار بار کفر اختیار کرتا رہے، اس کے اسلام کے ساتھ مزاح اڑانے کی وجہ سے مرتے وقت اسے توبہ کی توفیق ہی نہیں حاصل ہوتی وہ کفر پر ہی مر جاتا ہے۔

(۲) اور نبی کریم ﷺ کو (معاذ اللہ) گالیاں دینے والے کی توبہ قبول نہیں، کیونکہ وہ واجب القتل ہے اسے بھی توبہ کی توفیق حاصل نہیں ہوتی بلکہ وہ کفر پر ہی مرتا ہے۔

(۳) اور حضرت ابو بکر صدیق ﷺ اور حضرت عمر ﷺ میں سے کسی ایک کو گالیاں دینے والے کی توبہ قبول نہیں ہوتی، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ کافر ہو جاتا ہے اور واجب القتل ہو جاتا ہے، وہ بھی کفر پر ہی مرجاتا ہے، وہ بھی توبہ کرنے کی توفیق حاصل ہونے سے محروم ہو جاتا ہے۔

(۴) "**زندیق**" یعنی بے دین شخص کی توبہ قبول نہیں، کیونکہ جن لوگوں کا کوئی دین نہیں ہوتا، ان کو ہر شخص جانتا ہے کہ انہیں راہ راست پر لانا ممکن نہیں ہوتا وہ بھی یوں ہی کفر پر مرتے ہیں، توبہ کی ان کو بھی توفیق حاصل نہیں ہوتی۔

(۵) "**ملحد**" یہ وہ شخص ہوتا ہے جو بظاہر اسلام کا دعوی کرتا ہے لیکن کفریہ عقائد کو اسلام بتاتا ہے، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہود ونصاری سے پیسے لے کر دین کو برباد کرنے کی ناپاک جسارت کی، دین کو برباد تو نہ کر سکے کیونکہ اس کا محافظ اللہ تعالی ہے، لیکن وہ خود توبہ کرنے سے محروم ہو کر کوئی جھوٹا مدعی نبوت بن کر مرا، اور کوئی نیچری (جو کچھ ذہن وضمیر میں یعنی جو من ودھن میں آئے وہی کرے اسے نیچری کہا جاتا ہے) بن کر مرا، توبہ کی توفیق سے یہ لوگ محروم ہو کر مرے۔

(۶) "**اباحی**" یہ وہ لوگ ہیں جو ہر چیز کو مباح کہتے ہیں، کہ یہ بھی جائز ہے، یہ بھی جائز ہے، وہ بھی حلال وحرام میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے توبہ کی توفیق حاصل ہونے کے بغیر ہی مرجاتے ہیں۔

آجکل اباحی لوگوں کی کوئی کمی نہیں، جن لوگوں سے یہ سنو" کچھ نہیں ہوتا جی دین میں کوئی تنگی نہیں، یہ تو مولوی لوگوں نے چیزیں حرام کر رکھی ہیں، سیر وتفریح کیلئے شراب پی لیا تو کیا ہے، ننگی عورتوں کے مجرے دیکھ لئے تو کیا، یہ مولوی لوگ تو تنگ نظر ہیں، قدامت پسند ہیں، یہ تو ہمیں پندرہ سو سال پیچھے لے جانا چاہتے ہیں، ایسے لوگ بغیر توبہ کے کفریات ولغویات بکتے بکتے مرجاتے ہیں۔

(۷) **جادوگر** جو کفریہ کلمات کے ذریعے شیطانوں اور جنوں کو کارساز سمجھ کر ان سے امداد لے کر جادو کرتا ہے وہ بھی کافر ہوتا ہے، بغیر توبہ کے ہی مرجاتا ہے، اس کی موت بھی کفر پر آتی ہے۔

(۸) "**خناق**" جو لوگوں کا گلہ گھونٹ کر ان کو مارتا رہے، اگر یہ کام جائز سمجھ کر کرے تو وہ کافر ہے، اگر اس کو جائز نہ سمجھے تو "والخناق غیر کافر وانما یقتل لسعیه بالفساد" "خناق کافر نہیں لیکن وہ فساد پھیلا رہا ہے" اس لئے اسے قتل کر دیا جائے، اس طرح وہ بھی توبہ کی توفیق حاصل ہونے سے پہلے ہی قتل کر دیا جائے گا۔

(۹) "**کاهن**" یہ وہ شخص ہے جو دعوی کرے کہ میں غیبی خبریں جانتا ہوں ستاروں وغیرہ کے حساب سے، یہ شخص بھی بغیر توبہ کے مرجاتا ہے۔

(۱۰) ''**منافق**'' جو بظاہر مسلمان ہو، اندرونی طور پر کافر ہو، کافروں سے اس کی ساز باز ہو، مسلمان کو نقصان پہنچا رہا ہو، ایسا شخص بھی بغیر توبہ کے کفر پر مرتا ہے، اسلئے اس کی توبہ قبول نہیں۔

(۱۱) بعض ضروریات دین کا باطنی طور پر انکار کرنے والے کی توبہ قبول نہیں ہوتی کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ کی توفیق حاصل ہونے سے پہلے ہی مر جاتا ہے۔ (ماخوذ از شامی بوضاحت)

تنبیہ: ان تمام صورتوں میں توبہ کے نہ قبول کئے جانے کا ایک ہی مطلب ہے کہ ان لوگوں کو توبہ کرنے کی توفیق ہی حاصل نہیں ہوتی، یوں ہی توبہ کے بغیر یہ مردود مر جاتے ہیں۔

کچھ اور لوگ جن کی توبہ قبول نہیں ہوتی:

لیکن یہ لوگ اکثر طور پر توبہ سے محروم رہتے ہیں، لیکن بعض کو اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق عطاء فرما دیتا ہے اور ان کی توبہ قبول کر لیتا ہے، اسی طرح جن لوگوں کا پہلے ذکر کیا، ان میں سے بھی کئی لوگوں کو مرنے سے پہلے توبہ کی توفیق حاصل ہو جاتی ہے، ان کی توبہ کو قبول کر لیا جاتا ہے۔

''فکان المناسب ذکر قطاع الطریق و کذااھل الاھواء و کذاکل من وجب علیه حدزناوسرقة اوقذف اوشرب'' (شامی)

مناسب یہی ہے کہ جن لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی ان میں ان کو بھی شامل کیا جائے ''ڈاکو اور خواہشات نفسانیہ کی وجہ سے دین کی پرواہ نہ کرنے والے اور جن پر حد زنا یا حد سرقہ یا حد قذف ثابت ہو جائے''

لیکن ان کے ساتھ یہ قید لگانی ضروری ہے کہ ان میں سے اکثر توبہ سے محروم رہ جاتے ہیں، ورنہ بعض کو توبہ کی توفیق حاصل ہو جاتی ہے، جیسا کہ حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کی توبہ کی قبولیت کا ذکر خود رسول اللہ ﷺ نے کیا ان شاء اللہ تفصیلی بیان سورۃ نور میں آئے گا۔

﴿وَأُولٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ﴾ ''وہی (کامل) بھٹکے ہوئے ہیں''

''راقم نے اپنے ترجمہ میں بریکٹ میں لفظ ''کامل'' ذکر کیا ہے، اس کی وجہ علامہ رازی رحمہ اللہ کے سؤال و جواب میں دیکھئے۔

سؤال: **﴿وَأُولٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ﴾ینفی کون غیرھم ضالا ولیس الامر کذلک فان کل کافرفھو ضال سواء کفر بعد الایمان اوکان کافرالی الاصل''**

یہاں جن کفار کا ذکر ہو رہا ہے وہ مرتدین ہیں جن کا ذکر گذشتہ چند آیات میں آ رہا ہے۔

﴿وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الضَّآلُّوْنَ﴾ میں مبتداء اور خبر دونوں معرفہ ہیں اور درمیان میں "ھم" ضمیر حصر کیلئے ہے، اس کا معنی تو یہ ہوگا، ''کہ صرف وہی لوگ بھٹکے ہوئے ہیں'' صرف ان پر اس حکم کو بند کرنا کیسے صحیح ہے جبکہ تمام کفار ہی بھٹکے ہوئے ہیں۔

جواب: والجواب ھذامحمول علی انھم ھم الضالون علی سبیل الکمال''

آیہ کریمہ میں جن مرتدین کا ذکر ہے، وہ کامل بھٹکے ہوئے ہیں، اب مطلب واضح ہوگیا کہ تمام کفار ہی بھٹکے ہوئے ہیں لیکن جن مرتدین کا ذکر کیا جا رہا ہے ''وہی تو کامل بھٹکے ہوئے ہیں''

سؤال: جن کفار کا ذکر ہو رہا ہے وہ تو کفر میں گھرے ہوئے ہیں، ہر طرف سے کفر ان پر چھایا ہوا ہے، ان کو ''ضال'' کہنے کا کیا فائدہ ہے؟ کیونکہ اعلی کا حکم گھٹیا پر ہوتا ہے نہ کہ گھٹیا کا اعلی پر، ضلالت کا درجہ ہے کفر سے، تو کافر کو ضال کہنے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا، ہاں البتہ ضال کو کافر کہا جائے تو فائدہ حاصل ہوگا۔

جواب: یہاں ضالون سے مراد کاملون فی الضلالت ہیں وہ عام کافروں سے اوپر درجہ رکھتے ہیں۔

(ماخوذ از کبیر)

بیان کردہ مضمون کی روایات سے تائید:

❁ اخرج البزارعن ابن عباس ان قوما اسلموا ثم ارتدوا ثم اسلموا ثم ارتدوا فارسلوا الی قومھم یسالون لھم فذکروا ذلک لرسول اللہ ﷺ فنزلت ھذہ الآیۃ''

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِھِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا﴾ ھذا خطأمن البزار'' (در منثور)

بزار نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کو نقل کیا ہے کہ ایک قوم نے اسلام قبول کیا، پھر وہ مرتد ہو گئے، پھر اسلام قبول کرلیا، پھر مرتد ہو گئے، تو انہوں نے اپنی قوم کی طرف پیغام بھیجا کہ ہمارے متعلق سؤال کرو ان کی قوم نے رسول اللہ سے سؤال کیا تو یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی۔ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِھِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا﴾

اگرچہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اس روایت کو شان نزول کی وجہ بیان کرنے میں بزار کی خطاء قرار دیا ہے، لیکن خطاء اسی وقت ہو سکتی ہے جب حد مقرر کر دی جائے کہ دو مرتبہ مرتد ہونے کے بعد تیسری مرتبہ توبہ کی جائے تو وہ توبہ قبول نہیں لیکن جب روایت سے مراد بار بار اسلام لانا اور مرتد ہونا لیا جائے تو ان کی توبہ کا نہ قبول کیا جانا اسلام کو کھیل تماشہ سمجھ کر بہت واضح سمجھ آتا ہے، کبیر کا حوالہ گذشتہ اوراق میں دیکھئے۔

❁ واخرج ابن جریر عن الحسن فی الآیة قال الیھود والنصاری لن تقبل توبتھم عند الموت " (درمنشور)

ابن جریر نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے اس آیہ کریمہ کے متعلق روایت ذکر کی، وہ فرماتے ہیں کہ اس آیہ کریمہ میں یہود ونصاری کا ذکر ہے کہ ان کا موت کے وقت توبہ کرنا قابل قبول نہیں ہوگا۔

❁ واخرج عبد بن حمید وابن جریر وابن ابی حاتم عن قتادۃ فی الآیۃ قال ھم الیھود کفروا بالانجیل وعیسی ثم ازدادوا کفرا بمحمد ﷺ والقرآن" (درمنشور)

عبد بن حمید اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم سے حضرت قتادہ سے اس آیہ کریمہ کے متعلق بیان کیا کہ وہ لوگ جن کا ذکر اس آیہ کریمہ میں ہے وہ یہود ہیں جنہوں نے انجیل اور حضرت عیسی علیہ السلام سے کفر کیا، اور پھر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآن پاک سے کفر کرکے اور کفر میں بڑھے۔

❁ واخرج ابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابی العالیۃ فی الآیۃ قال انھا نزلت فی الیھود والنصاری کفروا بعد ایمانھم ثم ازدادوا کفرا بذنوب اذنبوھا ثم ذھبوا یتوبون من تلک الذنوب فی کفرھم ولو کانوا علی الھدی قبلت توبتھم ولکنھم علی ضلالۃ" (درمنشور)

ابن جریر اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم اس آیہ کریمہ کے متعلق ابن عالیہ کی روایت ذکر کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ بیشک یہ آیہ کریمہ یہود ونصاری کے متعلق نازل ہوئی کہ انہوں نے ایمان کے بعد (نبی کریم ﷺ سے) کفر کیا، پھر وہ گناہوں پر گناہ کرتے چلے گئے یہاں تک کہ کفر میں بڑھتے چلے گئے، پھر انہوں نے صرف گناہوں یعنی کفریات کی زیادتی سے توبہ کرنی شروع کی لیکن اصل کفر سے توبہ نہ کی، اسی وجہ سے ان کی توبہ قبول نہیں کی گئی کہ وہ گمراہی میں جوں کے توں رہے، اگر وہ ہدایت پر آنے کی کوشش کرتے تو یقیناً ان کی توبہ قبول کی جاتی۔

❁ واخرج عبد بن حمید وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابی العالیۃ فی قولہ لن تقبل توبتھم قال تابوا من الذنوب ولم یتوبوا من الاصل" (درمنشور)

عبد بن حمید اور ابن جریر اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے ابو عالیہ ﴿لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ﴾ کے متعلق ایک روایت ذکر کی کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زیادتی کفر کے گناہوں سے توبہ کر رہے تھے، لیکن اصل کفر سے توبہ نہیں کر رہے تھے اسی وجہ سے ان کی توبہ قبول نہیں کی جاتی۔

❁ واخرج عبد بن حمید وابن جریر عن مجاھد فی قولہ "ثم ازدادو کفرا" قال تمواعلی کفرھم" (درمنشور)

عبد بن حمید اور ابن جریر نے صحابہ سے روایت ذکر کی کہ ﴿ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا ﴾ ''پھر وہ کفر میں بڑھے''
کا مطلب یہ ہے کہ وہ کامل طور پر کافر ہے، کفران پر چھایا رہا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

اس آیۃ کریمہ میں ﴿لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ﴾ میں ''فاء'' نہیں، اور آنے والی آیۃ کریمہ میں ''فاء'' مذکور ہے ''فَلَنْ يُّقْبَلَ '' اس میں وجہ فرق کیا ہے؟

ولم تدخل الفاء فی "لن يقبل" هنا ودخلت فی "فَلَنْ تُقْبَلَ "لان الفاء مؤذنة بالاستحقاق بالوصف السابق وهناک قال "وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ" وهنا لم يصرح بهذا القيد"

تو اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ ''فاء'' سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ''فاء'' کے بعد والا حکم ماقبل وصف پر مرتب ہے ''فَلَنْ يُّقْبَلَ '' سے پہلے واضح طور پر ''وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ'' ذکر کر دیا گیا، کہ ان کی موت جب کفر پر آئے گی تو ان سے کوئی فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا، (تفصیل انشاء اللہ، قریب ہی آ رہی ہے) لیکن اس آیۃ کریمہ میں کفر کی حالت میں موت کا تذکرہ نہیں، لھذا ''فاء'' کو ذکر نہیں کیا، یہی وجہ ہے کہ توبہ کے قبول نہ کرنے کی چند وجوہ بیان کی گئی ہیں۔
(ماخوذ از البحر المحیط)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ○ (آیۃ نمبر ۹۱)

(1) وہ جو کافر ہوئے اور کافر ہی مرے ان میں کسی سے زمین بھر سونا ہرگز قبول نہیں جائے گا، اگرچہ اپنی خلاصی کو دے ان کیلئے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی یار نہیں۔ (کنز الایمان)

(2) بیشک وہ جنہوں نے کفر کیا اور مر گئے اس حال میں کہ وہ کافر تھے، تو ہرگز نہیں قبول کیا جائے گا ان میں سے کسی ایک کا زمین بھر سونا، اگرچہ وہ فدیہ دیں اس کا (جان چھڑانے کیلئے) ان کیلئے عذاب ہوگا دردناک، اور نہیں ہوگا ان کا کوئی مددگار۔ (نجوم الفرقان)

اعتراض: قیامت کے دن تو کسی کے پاس مال ہی ہونا، تو ان کا فدیہ دینا اور اسے قبول نہ کیا جانا، کا کیا

مطلب ہے۔ جبکہ "انھم فی ذلک الیوم افلس من ابن المذلق" قیامت کے دن ہر شخص مذلق سے بھی زیادہ غریب ہوگا۔

پہلا جواب: یہ کلام تقدیر وفرض پر مبنی ہے، معنوی لحاظ پر تقدیر عبارت کی یہ ہے۔

"لوان الکافر یوم القیامة قدرعلی اعزالاشیاء ثم قدرعلی بذله فی غایة الکثرة نعجزان یتوسل بذلک الی تخلیص نفسه من عذاب الله"

کہ اگر کافر قیامت کے دن زمین بھر سونا دینے پر قادر ہو جائے، پھر وہ کثیر مال خرچ کرنے پر قادر ہو جائے، تو اللہ تعالی کے عذاب سے اپنے آپ کو چھڑانے سے عاجز آ جائے گا۔

"وبالجملة فالمقصود انهم آیسون من تخلیص النفس من العقاب"

حاصل کلام یہ ہے کہ مقصد بیان یہ ہے کہ کفر کی حالت پر مرنے والے اپنے آپ کو اللہ تعالی کے عذاب سے چھڑانے سے ناامید ہو جائیں گے۔ (روح المعانی، وکبیر)

اس جواب پر ایک حدیث بطور تائید دیکھئے۔

❁ عن انس ان النبی ﷺ قال "یحاسب الکافر یوم القیامة، فیقال له ارأیت لوکان لک ملء الارض ذهبا اکنت تفتدی به؟ فیقول نعم، فیقال له، قد کنت سئلت ایسر من ذلک" (قد اخذت علیک فی ظهر ابیک آدم ان لاتشرک بی شیأ فابیت الاان تشرک)

(بخاری، صابونی) صحیح اخرجه البخاری (۳۳۳۴) ومسلم (۲۸۰۵) واحمد (۳.۱۲۷، ۱۲۹) وابویعلی (۴۱۸۲) وابن عاصم فی السنة (۹۹) وابونعیم فی الحلیله (۲.۵۱۳) (البحرالمحیط مع حاشیه) (وصابونی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن کافر سے حساب لیا جائے گا اور اسے کہا جائے گا تیرا کیا خیال ہے کہ اگر تیرے پاس زمین بھر سونا ہوتا تو تو فدیہ دے کر اپنی جان چھوڑا لیتا؟ تو وہ کہے ہاں (میرے رب میں فدیہ دے دیتا) رب تعالی فرمائے گا، میں نے تو تجھ سے اس سے بہت آسان مطالبہ کیا تھا کہ تو نے ایمان لانا!!! اور میرے ساتھ شریک نہیں ٹھہرانا، لیکن تم نے میرے ساتھ شریک ٹھہرانے سے انکار کر دیا۔

❁ وقال الامام احمد عن انس قال قال رسول الله ﷺ ویؤتی بالرجل من اهل الجنة فیقول له یاابن آدم کیف وجدت منزلک فیقول ای رب خیر منزل فیقول سل وتمن فیقول مااسال ولا اتمنی الا تردنی الی الدنیا فاقتل فی سبیلک عشرمرارلمایری من فضل الشهادة ویؤتی بالرجل من اهل النار فیقول له یاابن آدم کیف وجدت منزلک فیقول یارب شرمنزل فیقول له اتفتدی منی بطلاع الارض

ذھبا؟فیقول ای رب نعم،فیقول کذبت قد سألتک اقل من ذلک وایسر فلم تفعل فیرد الی النار" (منقول از صابونی)

مسند احمد میں حضرت انس ﷺ سے حدیث روایت کی گئی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت والے ایک شخص کو (رب تعالیٰ کے حضور) لایا جائے گا، اسے رب تعالیٰ فرمائے گا اے ابن آدم تو نے اپنا مرتبہ کیسے پایا؟ وہ عرض کرے اے میرے رب بہتر مقام پایا، رب تعالیٰ فرمائے گا "سوال کر، اور تمنا کر" وہ کہے گا میں اور تو کچھ سوال نہیں کرتا اور تو کچھ تمنا نہیں کرتا مگر یہ چاہتا ہوں کہ تو مجھے دنیا میں لوٹا دے، تاکہ مجھے تیری راہ میں دس مرتبہ شہید کر دیا جائے (یہ اس کی تمنا اس لئے ہوگی کہ) وہ شہادت کی فضیلت دیکھ رہا ہوگا، اور ایک جہنمی شخص کو لایا جائے گا، رب تعالیٰ اس سے پوچھے گا تو نے اپنا مقام کیسے پایا؟ وہ کہے گا اے میرے رب بہت برا مقام پایا، رب تعالیٰ فرمائے گا (اگر تیرے پاس زمین بھر سونا ہوتا) کیا تو وہ زمین کے ٹیلوں برابر سونا بطور فدیہ دے کر اپنی جان چھوڑا لیتا؟ وہ کہے گا ہاں میرے رب، رب تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹا ہے، میں نے تجھ سے اس سے کم اور آسان سوال کیا تھا (کہ تو ایمان لے آ اور شرک نہ کر) تو نے وہ نہیں کیا، تو اسے آگ کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔

دوسرا جواب: انھم اذا ماتوا علی الکفر فلو انھم کانوا قد انفقوا فی الدنیا ملء الارض ذھبا لن یقبل اللہ تعالی ذلک منھم لان الطاعۃ مع الکفر لاتکون مقبولۃ"

ان سے فدیہ نہ قبول کئے جانے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ جب کافر اپنے کفر پر مر جائیں گے تو قیامت کے دن جب وہ رب تعالیٰ کی گرفت میں آئیں گے تو یہ کہیں گے ہم نے تو دنیا میں زمین بھر سونا خرچ کیا تھا، تو اللہ تعالیٰ ان کے دنیا میں زمین بھر سونا خرچ کرنے کو قبول نہیں کرے گا، کیونکہ کفر کی حالت میں کی گئی نیکیاں قبول نہیں۔ (کبیر)

کاش کہ یہود و نصاریٰ سے پیسے لے کر رفاہ عامہ کا کام کرنے والے نام نہاد مسلمانوں کو یہ بات سمجھ آ جائے کہ کافروں کی کوئی نیکی معتبر نہیں، یہ بہت بڑی حماقت ہے کہ کافروں کو مسلمانوں کا ہمدرد سمجھا جائے۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ "اور ان کیلئے عذاب ہوگا دردناک۔"

رب تعالیٰ نے جب یہ ارشاد فرما دیا کہ کفار اپنی دنیاوی نیکیوں کی وجہ سے، اور آخرت میں ان کے پاس زمین بھر سونا ہوتا تو فدیہ دے کر رب تعالیٰ کے عذاب سے چھٹکارا حاصل نہیں کریں گے۔ "اردفہ بصفۃ ذلک العذاب فقال ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ ای مؤلم" تو اس کے پیچھے اس عذاب کی صفت بیان کی تو ارشاد فرمایا ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ "الیم" فعیل کا وزن ہے جو فاعل کا معنی دے رہا ہے، اور ساتھ ساتھ دوام بھی پایا

گیا ہے، یعنی ان کو دائمی طور پر درد پہنچانے والا عذاب ہوگا۔

﴿وَمَا لَهُمْ مِنْ نّٰصِرِيْنَ﴾ "اور نہیں ہوگا ان کا کوئی مددگار۔"

جب یہ بیان فرمادیا کہ کافروں کی عذاب الیم سے فدیہ دے کر نجات نہیں ہوگی اور دنیا میں مال خرچ کرنے کی وجہ سے بھی نجات حاصل نہیں ہوتی، تو اب ساتھ ہی یہ بیان فرمادیا "انه لا خلاص لهم عنه بسبب النصره والاعانة والشفاعة" کہ بیشک کافروں کی نجات دردناک عذاب سے کسی مددگار، کسی معاون اور کسی شفاعت کرنے والوں سے بھی نہیں ہوگی۔ (کبیر)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

پارہ چہارم

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ وَ مَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیۡمٌ ○ (آیۃ نمبر ۹۲)

(1) تم ہرگز بھلائی کو نہیں پہنچو گے جب تک راہ خدا میں اپنی پیاری چیز خرچ نہ کرو، اور تم جو کچھ خرچ کرو اللہ کو معلوم ہے۔ (کنز الایمان)

(2) تم ہرگز نہیں پاؤ گے (کامل) بھلائی کو یہاں تک کہ تم خرچ کرو اس چیز سے جسے تم پسند کرتے ہو، اور جو چیز تم خرچ کرو، تو بیشک اللہ اسے جاننے والا ہے۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں بیان فرمایا کہ کافر جو مال دنیا میں خرچ کریں خواہ وہ بطور صدقہ خرچ کریں، یا بطور صلہ رحمی، ان کا خرچ کرنا رب تعالی کے حضور قبول نہیں ہوگا، کیونکہ ان کا ایمان نہیں، اسی طرح بالفرض آخرت میں اگر ان کو مال مل جائے اور وہ زمین بھر سونا خرچ کردیں تو ان کا سونا قبول نہیں کیا جائے گا، اس آیۃ کریمہ میں مؤمنوں کو خرچ کرنے کی کیفیت بتائی جارہی ہے کہ انہیں آخرت میں اس سے زیادہ نفع حاصل ہوگا۔ (کبیر)

(تفصیل انشاءاللہ ساتھ ہی آرہی ہے)

مختصر مطلب:

تم ہرگز نہیں پاؤ گے (کامل) بھلائی کو یہاں تک کہ تم اس چیز کو خرچ کرو جسے تم پسند کرتے ہو، قرآن پاک میں کیا خوب فصاحت ہے، کتنا مختصر جملہ لیکن عظیم مطالب کو حاوی ہے، یعنی کامل بھلائی کو اس وقت تک حاصل نہیں کر سکو گے جب تک تم اللہ کی راہ میں اپنی پیاری چیز خرچ نہیں کرو گے۔

وہ پیاری چیز: انسان کا مال ہے، انسان اپنے مال سے محبت کرتا ہے، کسی مال کو اپنے لئے زیادہ نفع مند ہونے کی وجہ زیادہ پسند کرتا ہے، جب اللہ تعالی کی راہ میں وہی پسندیدہ مال خرچ کرے گا تو کامل بھلائی حاصل کر لے گا۔

وہ پیاری چیز: اپنی اولاد بھی ہے، مؤمنین کو گویا کہ یوں بھی بتادیا گیا ہے کہ تم کامل بھلائی اس وقت تک حاصل نہیں کرسکو گے جب تک اللہ کی راہ میں یعنی جہاد میں بوقت ضرورت تم اپنی اولاد قربان نہیں کرو گے، ہاں اگر تم نے اللہ کی راہ میں جہاد "فی سبیل اللّٰہ" میں اپنی پیاری چیز یعنی اولاد کو خرچ کردیا تو تم نے کامل بھلائی حاصل کرلی۔

وہ پیاری چیز: اپنا جاہ وجلال بھی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں اگر اپنا جاہ وجلال قربان کرنا پڑے تو وہ نہ قربان کرے تو کامل بھلائی حاصل نہیں کر سکے گا، کامل بھلائی اسی وقت حاصل ہوگی بوقت ضرورت اپنے جاہ وجلال کو قربان کردے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات لوگوں تک پہنچانے میں لوگ اسے بھٹکا ہوا اور گمراہ کہیں تو بظاہر اس کا جاہ وجلال ضائع ہورہا ہے، لیکن پیاری چیز ''جاہ وجلال'' اللہ کی راہ میں قربان کردے اور یہ سمجھے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو بھی یوں کہا گیا۔

﴿قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾(الاعراف آیۃ نمبر ٦٠)
''اس کی قوم کے سردار بولے بیشک ہم تمہیں کھلی گمراہی میں دیکھتے''

آپ نے یوں جواب دیا﴿قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾(الاعراف آیۃ نمبر ٦١)
''کہا اے میری قوم مجھ میں گمراہی کچھ نہیں، میں تو رب العالمین کا رسول ہوں۔''

اے مؤمن! اے عالم دین! اے طالب دین! تجھے بھی کوئی گمراہ کہے تو تو اپنے جاہ وجلال کو خیال میں نہ لا، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کو لوگوں تک پہنچانا جاری رکھ، ہاں یہود ونصاریٰ اور ان کے حواریین کو صرف یوں کہہ دے میں گمراہ نہیں، میں تو نائب رسول ہوں، تبلیغ دین کو جاری رکھوں گا'' جب لوگ تجھے بے وقوف اور جھوٹا کہیں، تو تجھے یہ یاد ہونا چاہیے کہ حضرت ہود علیہ السلام کو بھی یوں کہا گیا﴿اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ﴾''بیشک ہم تمہیں بے وقوف سمجھتے ہیں، اور بیشک ہم تمہیں جھوٹوں میں گمان کرتے ہیں۔''(اعراف آیۃ نمبر ٦٥)

آپ نے قوم کو یوں جواب دیا﴿قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾(الاعراف آیۃ نمبر ٦٦)
''کہا اے میری قوم میں بے وقوف نہیں، میں تو پروردگار عالم کا رسول ہوں۔''

ہاں تو بھی اے مؤمن! اے عالم دین! اے طالب دین! اپنے ظاہری جاہ وجلال کو اللہ کی راہ میں قربان کرتے ہوئے یوں کہہ میں بے وقوف نہیں، میں جھوٹا نہیں، میں تو نائب رسول ہوتے ہوئے ''اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشاد لوگوں تک پہنچا رہا ہوں۔ ہاں اگر تجھے دیوانہ پاگل کہیں تو تو یہ نہ بھول کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی پاگل اور دیوانہ کہا گیا﴿وَ قَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ﴾(الدخان آیۃ نمبر ١٤)''اور بولے سکھایا ہوا دیوانہ ہے۔''

قربان جاؤں رحمۃ للعلمین پر، رب تعالیٰ نے آپ کی طرف سے یوں جواب دیا﴿مَاۤ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ﴾''تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں۔'' ہاں اے مؤمن! اے عالم دین! اے طالب دین! تو

بھی یہ کہہ دے کہ میں پاگل، دیوانہ نہیں، مجھے تو انبیاء کرام کا وارث ہونے کی وجہ سے یہ القاب مل رہے ہیں، لیکن میں اپنی پیاری چیز اپنے ''جاہ وجلال'' کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کر رہا ہوں تاکہ مجھے کامل بھلائی حاصل ہو جائے۔

وہ پیاری چیز تیری جان بھی:

اگر اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کی ضرورت درپیش آئے تو تو اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنے کے بغیر کامل بھلائی حاصل نہیں کر سکے گا۔ غرضیکہ انسان کے والدین، اقرباء، زوجہ، مکانات، زمین، باغات وغیرہ سب پیاری چیزیں ہیں، بوقت ضرورت ان کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنے سے دریغ نہ کیا جائے۔

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ ''تم ہرگز نہ پاسکو گے (کامل) بھلائی۔''

''تنال'' من نال نیلا اذا اصاب و وجد'' ویقال نال العلم اذا وصل الیہ واتصف بہ''

نال، ینال، نیلا'' کا معنی ہوتا ہے کسی چیز تک پہنچنا، کسی چیز کو ''پالینا'' جیسا کہ کہا جاتا ہے ''نال العلم'' اس نے علم کو پالیا، وہ علم تک پہنچ گیا، وہ علم سے متصف ہو گیا۔ ''البر'' کے مختلف معانی ہیں ''البر'' الاحسان و کمال الخیر'' ''البر'' کا معنی احسان'' یعنی ہرگز تم احسان کو نہیں پاسکو گے یہاں تک کہ تم خرچ کرو اس چیز سے جو تمہیں پسند ہو'' ''البر'' کا معنی کامل بھلائی'' اب معنی یہ ہوگا'' ہرگز نہیں پاؤ گے کامل بھلائی یہاں تک کہ خرچ کرو اس چیز سے جو تمہیں پسند ہو''

بھلائی کے ساتھ ''کامل'' کی قید کا فائدہ:

اصل میں اعتراض یہ ہوتا ہے کہ فقیر جسے ساری عمر مال نہ ملے اور وہ اپنا محبوب مال خرچ نہ کر سکے تو وہ بھلائی سے محروم رہے، یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ اور دوسرا اعتراض یہ تھا کہ رب تعالیٰ نے جب یہ ارشاد فرمایا ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ '' جو شخص ذرہ بھر نیکی کا عمل کرے وہ اسے پالے گا'' تو اس سے پتہ چلا کہ تھوڑا مال اور حقیر مال بھی خرچ کرنے کا فائدہ ہوگا، اور بھلائی کو پالے گا، تو پسندیدہ مال کے خرچ نہ کرنے سے بھلائی کی نفی کیسے درست ہے؟

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ الکامل'' کہ ہرگز تم کامل بھلائی نہیں پاؤ گے یہاں تک وہ چیز خرچ کرو جو تمہیں پسند ہو، اگرچہ اس پر پھر اعتراض ہوتا ہے کہ یہ معنی بھی درست نظر آتا کیونکہ اس معنی کے لحاظ پر لازم یہ آئے گا کہ فقیر ہمیشہ کیلئے کامل بھلائی سے محروم رہے، یہ کس طرح درست ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا'' وقیل الاولی من ھذا ان یقال ان المراد ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ علی الانفاق'' کہ یہ خرچ کرنے سے مقید ہے،

اب مکمل مطلب یہ ہو گیا ''ہرگز تم کامل بھلائی نہیں پاؤ گے خرچ کرنے میں یہاں تک کہ اس چیز سے خرچ کرو جو تمہیں پسند ہو'' یعنی تم تھوڑا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اور جو مال تم خرچ کرو وہ تمہارا پسندیدہ نہ ہو تو پھر بھی تمہیں اس کا ثواب ملے گا، لیکن کامل بھلائی اگر تم اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے حاصل کرنی چاہتے ہو تو اپنا پسندیدہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ (ماخوذ از روح المعانی)

راقم کا اس مسئلہ میں موقف یہ ہے کہ ﴿حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ میں مال خرچ کرنے کی قید ہی نہیں۔ اس لئے ہر شخص جس چیز کا مالک ہے اس میں سے پسند چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو کامل بھلائی پالے گا۔ فقیر اپنی آسائش کا وقت اللہ کی راہ میں خرچ کرے، اپنی پسند قربان کر کے اللہ کو یاد کرے، اپنا آرام قربان کر کے اللہ کو یاد کرے لوگوں کی جھڑکیاں برداشت کر کے اپنا وقار قربان کر کے اللہ کو یاد کرے، اس کا یہی پسندیدہ چیز خرچ کرنا ہے۔

''**البر**'' یعنی الجنة ''''البر'' کا معنی ابن عباس اور ابن مسعود اور مجاہد رضی اللہ عنہم نے ''جنت'' بیان کیا ہے ، وقال مقاتل بن حیان ''التقوی'' مقاتل بن حیان نے ''البر'' کا معنی تقوی بیان کیا ہے۔ ''**وقیل الطاعة وقیل الخیر**'' اور بعض حضرات نے کہا کہ ''البر'' کا معنی طاعت ہے، بعض نے کہا اس کا معنی خیر ہے

''**وقال الحسن لن تکونوا ابرارا**'' حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہرگز نیک نہیں بن سکو گے یہاں تک کہ خرچ کرو اس چیز سے جو تمہیں پسند ہو، لھذا سچ بولے، جھوٹ سے بچ جائے تو انسان نیکی پالیتا ہے، ابرار کی جماعت میں داخل ہو جاتا ہے۔

❁ **اخبرنا احمد بن عبدالله النعیمی انا ابو بکر احمد بن الحسن الحیری انا حاجب بن احمد الطوسی اخبرنا محمد بن حماد الصالحی قال اخبرنا ابو معاویة عن الاعمش عن شفیق عن عبدالله قال قال رسول الله ﷺ علیکم بالصدق، فان الصدق یهدی الی البر، وان البر یهدی الی الجنة، وما یزال الرجل یصدق ویتحری الصدق حتی یکتب عندالله صدیقا وایاکم والکذب فان الکذب یهدی الی الفجور، والفجور یهدی الی النار ومایزال الرجل یکذب ویتحری الکذب حتی یکتب عندالله کذابا''**

(معالم التنزیل للبغوی) (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت عبداللہ (بن مسعود) ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم پر لازم ہے کہ سچ بولو، بیشک سچ بولنا ہدایت دیتا ہے نیکی کی، اور بیشک نیکی ہدایت دیتی ہے جنت کی، اور جو شخص ہمیشہ سچ بولتا ہے اور سچ بولنے کی کوشش کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں اسے ''صدیق'' لکھ لیا جاتا ہے۔ اور تم اپنے آپ کو جھوٹ سے بچا کر رکھو بیشک جھوٹ فجور کی

رہنمائی کرتا ہے، اور فجور آگ کی راہنمائی کرتا ہے، اور ہمیشہ ایک شخص جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ بولنے کی کوشش کرتا رہتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ کے ہاں کذاب لکھ لیا جاتا ہے۔

"وقال الحسن کل انفاق یبتغی به المسلم وجه الله حتی الثمرة ینا ل به هذا البر"

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں مسلمان جب خلوص سے اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے مال خرچ کرتا ہے، تو جو کچھ بھی خرچ کرے یہاں تک کہ ایک پھل (ایک کھجور) بھی خرچ کرنے سے وہ کامل بھلائی حاصل کر لیتا ہے، کیونکہ خلوص سے خرچ کیا ہوا مال اس کا پسندیدہ مال ہے۔ (معالم التنزیل للبغوی)

❁ وقال عطاء ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ ای شرف الدین والتقوی حتی تتصدقو وانتم اصحاء اشحاء"

عطاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ ہرگز تم دین کی شرافت اور تقوی حاصل نہیں کر سکو گے یہاں تک کہ تم صدقہ کرو (یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو) جب کہ تم صحیح ہو اور مال پر حریص ہو، (یعنی ایسے حال میں جبکہ انسان خود بھی مال کا محتاج ہو تو وہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے گا تو وہ اپنا پسندیدہ مال خرچ کرے گا۔) (معالم التنزیل للبغوی)

(عطاء رحمہ اللہ کے اس قول میں "البر" کا معنیٰ "دین کی شرافت اور تقوی لیا گیا")

❁ عن النواس بن سمعان قال سالت رسول الله عن البر والاثم فقال البر حسن الخلق والاثم ماحاک فی صدرک وکرهت ان یطلع علیه الناس منک (رواہ مسلم)

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ سے نیکی اور گناہ کے متعلق پوچھا، تو آپ نے فرمایا "بـر" (نیکی) یہ ہے کہ تم اچھی عادات رکھو، اور گناہ یہ ہے کہ وہ تمہارے سینہ میں کھٹکے (یعنی تمہیں گناہ کرنے کا خیال آئے) تو تم ناپسند سمجھو کہ لوگ تم پر مطلع ہو جائیں۔

"فعلی هذا یکون المعنی علیکم بالاعمال الصالحة حتی تکونوا ابرارا وتدخلوا فی زمرة الابرار"

حدیث مذکور سے "البـر" کا معنیٰ جو واضح کیا گیا، اس سے آیۃ کریمہ کا مطلب یوں بھی بیان کیا جا سکے گا، "ہرگز تم نیک نہیں بن سکو گے یہاں تک کہ تم نیک عمل کرو" جب تم نیک عمل کرو گے تو ابرار بن جاؤ گے، اور اللہ تعالیٰ کے کامل تقرب کے حقدار (کامل ابرار) کے زمرہ میں داخل ہو جاؤ گے۔ (منقول از خازن)

❁ عن ابی هریرة قال اتی رسول الله ﷺ رجل فقال یارسول الله ای الصدقة افضل؟ قال ان تصدق وانت صحیح شحیح تخشی الفقر وتامل الغنی" (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص آیا، اس نے کہا یا رسول اللہ کون سا

صدقہ افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ تم صدقہ کرو جو تم صحیح ہو اور اپنے مال پر بخیل و حریص ہو، تمہیں فقر کا ڈر ہو اور غنا کی امید ہو۔ (منقول از خازن)

بعض حضرات نے "البر" اور "الخیر" میں فرق بیان کیا ہے:

البر هو النفع الواصل الى الغير مع القصد الى ذلك والخير هو النفع مطلقاوان وقع سهواوضدالبر العقوق وضدالخير الشر"

"البر" اس نفع کو کہتے ہیں جو غیر تک اپنے ارادہ سے پہنچائے"لیکن "الخیر "مطلقا نفع کو کہا جاتا ہے، غیر کو وہ نفع تو پہنچ جائے لیکن خواہ بھول کر اسے کوئی چیز دے دی، دینی اور کوتھی، تو اسے "الخیر" کہہ لیا جائے گا، لیکن "البر" نہیں کہا جائے گا "البر" کی ضد "العقوق" ہے، اور "الخیر" کی ضد" الشر" ہے۔ (روح المعانی)

بیان ذیشان:

اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ میں بیان فرمایا "ان من انفق مما احب کان من جملة الابرار" جو شخص اپنی پیاری چیز کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے وہ ابرار (نیک لوگوں) سے ہو جاتا ہے۔ "ابرار" کی شان دوسری آیات میں یوں بیان فرمائی۔ ﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ﴾ "بیشک نیک لوگ چین (نعمتوں) میں ہوں گے۔"

اس کے مقابل یہ ارشاد فرمایا ﴿وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ﴾ (اور بے شک بدکار ضرور دوزخ میں ہیں) اور ارشاد فرمایا ﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا﴾ (سورۃ الدھر، آیہ نمبر ۵)

"بیشک نیک، پئیں گے اس جام میں سے جسکی ملونی کافور ہے" اور ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝ عَلَى الْاَرَائِكِ يَنْظُرُوْنَ ۝ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ۝ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۝ خِتَامُهٗ مِسْكٌ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾ (المطففین)

بیشک نیکوکار ضرور چین میں ہیں، تختوں پر دیکھتے ہیں، تو ان کے چہرے میں چین کی تازگی پہچانے نتھری (خالص) شراب پلائے جائیں گے جو مہر کی ہوئی رکھی ہے، اس کی مہر مشک (خوشبو) پر ہے، اور اسی پر چاہئے کہ للچائیں للچانے والے۔

اورارشادفرمایا:

﴿لَیْسَ الْبِرَّاَنْ تُوَلُّوْ وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّمَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰئِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِیِّیْنَ وَآتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسَاكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّائِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَآتَی الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَاعَاهَدُوْاوَالصَّابِرِیْنَ فِی الْبَاْسَاءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اُوْلٰئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْاوَاُوْلٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (سورة البقره،آیة نمبر۱۷۷)

”کچھ اصل نیکی یہ نہیں کہ منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو، ہاں اصل نیکی یہ ہے ایمان لائے اللہ اور قیامت اور فرشتوں اور کتاب اور پیغمبروں پر، اور اللہ کی محبت میں اپنا عزیز مال دے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور راہ گیر اور سائلوں کو اور گردنیں چھوڑانے میں اور نماز قائم رکھے، اورزکوۃ دے، اوراپنا قول پورا کرنے والے جب عہد کریں اور صبر والے مصیبت اور سختی میں اور جہاد کے وقت یہی ہیں جنہوں نے اپنی بات سچی کی اور یہی پرہیزگار ہیں۔“

ان تمام آیات میں ابرار (نیک لوگوں) کے اجروثواب کوذکرکیا، اورآیۃ کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوْالْبِرَّحَتّٰی تُنْفِقُوْمِمَّاتُحِبُّوْنَ﴾ میں کمال بر (یعنی کامل بھلائی) کاذکرفرمایا۔

نتیجہ یوں واضح ہوا، کہ جب تم اللہ کی راہ میں اپنی محبوب چیز خرچ کروگے تو تم نیک ہوجاؤ گے، جب تم ابرار کی جماعت میں آجاؤ گے تو تم قیامت کے دن اللہ تعالی کی طرف سے چین اور نعمتوں میں ہوگے، اور تمہیں قیامت کے دن وہ پاکیزہ مشروب پلائے جائے گا جس میں کافورملی ہوگی، اوران کوتختوں پر بٹھایا جائے گا کہ وہ جنت کے نظارے کررہے ہوں گے، ان کے چہروں پر چین کی تازگی نظر آرہی ہوگی، خالص پاکیزہ مشروب جس پر مہر لگی ہوگی وہ ان کو پلائی جائے گی، اس کی مہر خوشبو پر ہوگی، وہ ایسے لذت والے مشروب ہوں گے کہ ان کو دیکھ کردوسرے للچانے والے للچارہے ہوں گے۔ خاص کرکے ”لیس البر“ آیۃ کریمہ میں بہت سے اعمال کونیکی کے کام قراردیا گیا ہے، لیکن اس زیربحث آیۃ کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوْالْبِرَّحَتّٰی تُنْفِقُوْامِمَّاتُحِبُّوْنَ﴾ سے یہ ثابت کردیا ”فانکم لا تفوزون بفضیلة البرحتی تنفقوامما تحبون“ کہ بیشک تم نیکی کی فضیلت کوحاصل کرنے میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتے جب تک تم اللہ کی راہ میں اپنی پسندیدہ چیز نہیں خرچ کروگے۔

وهذا یدل علی ان الانسان اذاانفق ما یحبه کان ذلک افضل الطاعات“

اس سے یہ واضح ہو گیا، کہ انسان کا اپنی محبوب اور پسندیدہ چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرنا تمام عبادتوں سے افضل عبادت ہے۔

اعتراض: اس تمام بحث سے تو یہ پتہ چلا کہ جو شخص اللہ کی راہ میں اپنی پسندیدہ چیز خرچ کرتا ہے وہ کامل بھلائی حاصل کر لیتا ہے، وہ ابرار کی جماعت میں آجاتا ہے، اور جنت میں طرح طرح کی نعمتیں حاصل کرے گا، خواہ اور کوئی عبادت کرے یا نہ کرے، یہ کس طرح صحیح ہے کہ فرائض کا تارک صرف اپنی پسندیدہ چیز کو خرچ کر کے کامل بھلائی حاصل کر لے اور جنت کی نعمتوں کا مستحق ہو جائے۔

جواب: انسان اپنی پسندیدہ چیز کو اس وقت تک خرچ نہیں کر سکتا جب تک اسے یہ پتہ نہ ہو کہ وہ اس کے بدلے اعلیٰ چیز حاصل کرے گا۔ انسان دنیا کی چیز میں اسی وقت خرچ کرے گا جب اسے یہ یقین ہو گا کہ اس کے ذریعے آخرت کی سعادت حاصل ہو گی، اور آخرت کی سعادت کا اسی وقت اعتراف کرے جب وہ اللہ تعالیٰ جو صانع، عالم، قادر ہے اس کے وجود کا اقرار کر لے گا۔ جب وہ رب تعالیٰ کے وجود کا اقرار کر لے گا تو وہ خود بخود اپنے آپ کو مکلف سمجھے گا کہ مجھ پر واجب ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے اوامر کو ادا کروں، اور مجھ پر واجب ہے کہ میں نواہی سے اجتناب کروں۔

فاذا تاملت علمت ان الانسان لا یمکنه الفاق الدنیا الا اذا کان مستجمعا لجمیع الخصال المحمودة فی الدین"

ابھی ہم نے جو بیان کیا اگر تو اس میں غور و فکر کرے تو تجھے پتہ چل جائے گا کہ بیشک انسان دنیا کا مال دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رضاء کی خاطر اس وقت خرچ ہی نہیں کر سکتا جب تک دین کے تمام فرائض اور مستحسنات پر عمل نہیں کرے گا، اور نواہی سے نہیں بچے گا۔ دنیاداری، دکھلاوہ، چرچا، نام روشن کرنا خرچ کرنے میں مقصود ہو تو وہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بنتا ہی نہیں بلکہ وہ وبال جان بن کر رہے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

مقام توجہ: جس مال کے خرچ کرنے کی فضیلت بیان کی جا رہی ہے، اس سے مراد کیا ہے؟ اس میں بظاہر اہل علم کا اختلاف نظر آتا ہے کہ اس سے مراد زکوۃ اور صدقات واجبہ ہیں، یا اس سے مراد صدقات مستحبہ ہیں، راقم کا موقف اس میں یہ ہے کہ اس سے مراد صدقات واجبہ اور مستحبہ دونوں ہیں، اس لئے کہ جب حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا یہ قول مراد لیا جائے۔

"وقال الحسن کل شیء انفقه المسلم من ماله طلب به وجه الله فانه من الذین عنی الله سبحانه بقوله ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ حتی التمرة"

کہ مسلمان کوئی چیز بھی اپنے مال میں سے اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل کرنے کیلئے خرچ کرے وہ ان کامل نیک لوگوں میں شامل ہو جاتا ہے، جن کا تذکرہ رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی

تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ میں ذکر کیا، یہاں تک کہ وہ اپنی محبت سے اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے ایک کھجور بھی خرچ کرے گا تو وہ بھی یہ مقام حاصل کر لے گا۔

اسی کے ضمن میں راقم کے نزدیک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول "اراد به الزکوة یعنی حتی تخرجوا زکوة اموالکم" (اس سے مراد زکوۃ ہے کہ تم اپنے مالوں کی زکوۃ ادا کرو) بھی آجاتا ہے۔ اب مطلب یہ گیا کہ (ہرگز تم کامل بھلائی نہیں پاؤ گے یہاں تک کہ تم خرچ کرو اس چیز سے جو تمہیں پسند ہو) خواہ وہ چیز تمہاری جانیں ہوں یا اولاد ہو، یا مال ہو، مال ہو تو عام ہے خواہ زکوۃ ہو، یا صدقہ فطر ہو، یا قربانی ہو، یا صدقات مستحبہ ہوں سب کو یہ آیۂ کریمہ شامل ہے۔ "واللہ اعلم بالصواب"

ابھی تک ذکر کردہ بحث کو بیضاوی میں دیکھئے:

(لَنْ تَنَالُوا الْبِر) ای لن تبلغوا حقیقة البر الذی هو کمال الخیر ولن تنالوا بر الله الذی هو الرحمة والرضی والجنة (حَتّٰی تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ) ای من المال اومایعمه وغیره کبذل الجاه فی معاونة الناس والبدن فی طاعة الله والمهجة فی سبیله"

(ہرگز تم بھلائی نہیں پاؤ گے) اس سے مراد یہ ہے کہ ہرگز تم اس نیکی کی حقیقت نہیں پاؤ گے جس میں کامل بھلائی ہے۔ یعنی حقیقی بھلائی وہی ہے جس میں کمال پایا جائے، اور اس کا مطلب یہ ہے "کہ ہرگز تم اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری کو نہیں پاؤ گے" وہ فرمانبرداری جو رحمت ہے، وہی رب کی رضاء ہے، وہی حصول جنت کا ذریعہ ہے ﴿حَتّٰی تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ یہاں تک کہ خرچ کرو اس چیز سے جسے تم پسند کرتے ہو، یہ حکم عام ہے، مال اور غیر مال سب کو شامل ہے، لوگوں کی معاونت کیلئے اپنے مرتبہ (جاہ وجلال) کو خرچ کرنا بھی اسی میں شامل ہے، اور اللہ کی طاعت میں اپنی جان قربان بھی اسی میں داخل ہے، اور اپنے چہرے کے حسن و جمال اور اپنی آب وتاب کو اللہ کی راہ میں قربان کر دینا بھی اس آیۂ کریمہ میں مذکور ہے۔ (بیضاوی)

کیا ہی شان ہے قرآن پاک کی جس نے ایک جملہ میں بے بہا خزانے اور بے حد سمندر سمو دیے ہیں۔

﴿وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ﴾

"اور جو چیز تم خرچ کرو، تو بیشک اللہ اسے جاننے والا ہے۔"

یہاں علم کا ذکر فرما کر مراد ثواب کا عطاء کرنا لیا گیا ہے، اب تقدیر عبارت کی معنوی طور پر یہ ہوگی

"ومـاتنفقوا من شیء فان الله به یجازیکم قل ام کثر لانه علیم به لایخفی علیه شیء منه" اور جو چیز بھی تم خرچ کرو گے بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں جزاء دے گا، خواہ قلیل ہو یا کثیر ہو، اس لئے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے، اور اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔

اور اس کا مطلب یہ ہے "انـه تـعـالـی یـعـلـم الـوجـه الـذی لاجـلـه یـفعلونه ویعلم ان الداعی الیه اهو الاخلاص ام الریاء ویعلم انکم تنفقون الاحب الاجود ام الاخس الارذل"

بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ مال خرچ کرنے والے کس وجہ سے خرچ کر رہے ہیں، وہ جانتا ہے کہ ان کو خرچ کرنے پر انگیختہ کرنے والا اخلاص ہے یا ریاء (دکھلاوا) اور وہ جانتا ہے کہ خرچ کیا جانے والا مال عمدہ اور پسندیدہ ہے، یا گھٹیا اور رذیل مال ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

مطلب تقریباً مختصر یہ ہو گیا جسطرح کا مال، جس نیت سے خرچ کرو گے رب تعالیٰ اسی کے مطابق تمہیں جزاء دے گا کیونکہ وہ سب کچھ جانتا ہے، کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں۔

پسندیدہ مال رب کی راہ میں خرچ کرنے کی درخشاں مثالیں:

❁ اخـرج مـالـک واحـمـد وعـبـد بـن حـمـیـد والبخاری ومسلم والترمذی والنسائی وابن الـمـنـذر وابـن ابـی حاتم عن انس قال کان ابو طلحة اکثر انصاری بالمدینة نخلا وکان احب امواله الیه بیرحاء وکانت مستقبلة المسجد وکان النبی ﷺ یدخلها ویشرب من ماء فیهـا طیـب فـلـمـا نزلت (لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ) قال ابو طلحة یارسول الله ﷺ یـقـول (لَنْ تَـنَـالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ) وان احب اموالی الی بیرحاء وانها صدقة الله ارجو ابرها عندالله فضعها یارسول الله حیث اراک الله فقال رسول الله ﷺ بخ ذاک مال رابـح ذلـک مـال رابـح وقـد سـمـعـت مـاقـلـت وانی اری ان تـ[illegible]ا فی الاقربین فقال ابوطلحة افعل یارسول الله فقسمها ابو طلحة فی اقاربه وبنی عمه"

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں کہ ابوطلحہ کی مدینہ طیبہ میں بہت کھجوریں تھیں، ان کا سب سے پسندیدہ مال ایک باغ تھا، جس کا نام "بیـرحـاء" تھا، جو مسجد کی قبلہ کی جانب تھا، نبی کریم ﷺ اس باغ میں تشریف لے جاتے تھے، اس میں ٹھنڈا، میٹھا پانی پیتے تھے، جب آیۃ کریمہ ﴿لَنْ تَـنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ نازل ہوئی، تو ابوطلحہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ تو بیشک میرا سب سے پسندیدہ مال میرا باغ "بیـرحـاء" ہے، میں وہ اللہ کی راہ میں صدقہ کر رہا ہوں، مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے کامل

بھلائی عطاء فرمائے گا، اور میرے لئے اللہ تعالی کے اپنے ہاں وہ ذخیرہ بنائے گا، اس لئے یارسول اللہ ﷺ آپ اللہ تعالی کے ارشاد کے مطابق وہ باغ جسے چاہیں عطاء فرمادیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بڑی خوشی کا مقام ہے یہ تمہارے لئے، اور یہ مال تمہارے لئے نفع مند ہوگا، (پھر فرمایا) اور یہ مال تمہارے لئے نفع مند ہوگا۔ (ایک روایت کے مطابق آپ نے دومرتبہ فرمایا "بخ بخ") اور تحقیق میں نے سنا جوتم نے کہا ہے، اور بیشک میری رائے یہ ہے کہ تم یہ باغ اپنے قریبی رشتہ داروں پر تقسیم کردو، ابوطلحہ نے عرض نے کیا یارسول اللہ ﷺ میں یہی کرتا ہوں (جو آپ نے فرمایا ہے) تو آپ نے اپنے قریبی رشتہ داروں، اپنے چچا کے بیٹوں کو وہ دے دیا۔ (منقول از در منشور)

ابوداؤد اور نسائی میں یہ بھی آتا ہے "**فقال رسول الله ﷺ اجعلها فی قرابتک فجعلها فی حسان بن ثابت و ابی بن کعب**" نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ باغ اپنے قریبی رشتہ داروں کو دے دو تو انہوں نے حسان بن ثابت اور ابی بن کعب کو دے دیا (کیونکہ یہ ان کے رشتہ دار تھے) (منقول از در منشور)

طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"**بیرحاء**" اصل میں لفظ "بئر" (با، ہمزہ، راء ہیں) البتہ ہمزہ ساکن ماقبل مکسور کی وجہ سے "یاء" سے تبدیل کرنا بھی جائز ہے، قانون جوازی ہے اسلئے دونوں طرح استعمال ہورہا ہے۔ اور یہ یاد رہے کہ "بئرحاء" مکمل نام ہے، بئر کی اضافت حاء کی طرف نہیں جیسے بئر ذروان اور بئر بضاعۃ میں اضافت پائی گئی ہے۔

اکثر محدثین کرام نے تو مد سے ہی اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ تاہم زمخشری نے فائق میں اسے قصر سے لکھا ہے "بیرحی" بروزن فیعلی، یہ البراح سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے "منکشف ظاہر زمین" پھر اس کی حرکات میں "اختلف الفاظ المحدثین فیھا فیرو ونھا بفتح الیاء و کسرھا معا و بفتح الراء وضمھا والمد فیھا والقصر" مختلف اقوال ہیں، ان کی مجموعی صورت جائز ہے، باء پر فتحہ پڑھیں یا کسرہ (زیر یا زبر) اور راء پر فتحہ پڑھیں یا ضمہ (زیر یا پیش) اور مد سے پڑھیں یا قصر سے۔

اسی طرح حدیث شریف میں "بخ" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو مقام مدح اور رضاء میں استعمال ہوتا ہے، خاء کو سکون سے پڑھا گیا ہے، اور کسرہ اور تنوین سے بھی پڑھا گیا ہے۔ (از شیخ زادہ)

اور طلباء کرام یہ بھی توجہ فرمائیں ﴿مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ میں "مما" اصل میں "من ما" ہے، نون کو میم میں ادغام کیا گیا ہے۔ (مظہری)

❁ واخرج عبد بن حمید والبزار عن ابن عمر قال حضرتنی هذه الآیة(لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ)فذکرت مما اعطانی الله فلم اجد شیأاحب الی من مرجانة جاریة لی رومیة فقلت هی حرة لوجه الله فلوانی اعودفی شیء جعلته لله لنکحتها فانکحها نافعا"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، جب یہ آیۃ کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ میرے سامنے آئی، تو میں نے یاد کرنا شروع کیا کہ اللہ تعالیٰ نے جو مال مجھے دے رکھا ہے اس میں سے زیادہ پسندیدہ چیز کیا ہے؟ میں نے ایسی پسندیدہ چیز کوئی اور نہ پائی جیسی میری رومیہ لونڈی مرجانہ تھی، میں نے کہا یہ اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے آزاد ہے، اب میں اس کی طرف نہیں لوٹوں گا، البتہ اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے اس کی مرضی سے نکاح کردوں گا، پھر آپ نے اپنے غلام نافع سے اس لونڈی کی اجازت سے نکاح کر دیا۔ (از درمنثور)

❁ واخرج عبد الرزاق وابن جریر من طریق معمر عن ایوب وغیره انهاحین نزلت لن تنالوا البر الآیة جاء زید حارثة بفرس له کان یحبهافقال یارسول الله هذه فی سبیل الله فحمل علیهارسول الله ﷺ اسامة بن زید فکان زیداوجد فی نفسه فلمارای ذلک منه النبی ﷺ قال اماان الله قد قبلها"

معمر بن ایوب وغیرہ سے روایت ذکر کی کہ جب یہ آیۃ کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ نازل ہوئی تو حضرت زید بن حارثہ ایک گھوڑی لائے جسے وہ بہت پسند کرتے تھے، عرض کیا یارسول اللہ یہ اللہ کی راہ میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے (وہ گھوڑی ان کے بیٹے کو دے دی) اس گھوڑی پر اسامۃ بن زید کو سوار کو دیا، زید نے اپنے نفس میں گویا کہ کچھ محسوس کیا (انہوں نے سمجھا شائد میرا مال اللہ کی راہ میں قبول نہیں کیا گیا) جب نبی کریم ﷺ نے ان کی کیفیت کو دیکھا تو آپ نے فرمایا "خبردار بیشک اللہ تعالیٰ نے اسے قبول کرلیا ہے" (منقول از درمنثور)

اس حدیث پاک میں ایک اور مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ اگر صدقہ کرنے والا اپنی وسعت سے زیادہ اپنے نیک جذبات سے خرچ کردے تو صدقہ وصول کرنے والے اس سے وصول کرکے، اس کے بیٹے وغیرہ پر وہی چیز یا اس کی چیز جیسی کوئی چیز صدقہ کردیں، تاکہ اسے صدقہ کا ثواب بھی حاصل ہوجائے اور وہ مالی طور پر مجبور اور پریشان حال بھی نہ ہوجائے۔

❁ واخرج ابن جریر عن میمون بن مهران ان رجلا سال اباذرای الاعمال افضل قال الصلوة عمادالاسلام والجهاد سنام العمل والصدقة شیء عجیب فقال یااباذرلقد ترکت شیأهو اوثق عملی فی نفسی لاأراک ذکرته قال ماهو قال الصیام فقال قربة

ولیس هناوتلاهذه الآیة(لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْن)

ابن جریر نے میمون بن مہران سے روایت ذکر کی کہ ایک شخص نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے سؤال کیا کہ اعمال میں سے افضل عمل کیا ہے؟ آپ نے فرمایا نماز اسلام کا ستون ہے، جہاد عمل کی کوہان (بلندی) ہے، اور صدقہ تو عجیب ہی چیز ہے، تو اس شخص نے کہا آپ نے کس چیز کو چھوڑ دیا جو میرے نزدیک بہت مضبوط عمل ہے، جو میں نے آپ کو ذکر کرتے ہوئے نہیں پایا، آپ نے فرمایا وہ کیا، اس نے کہا روزے، آپ نے فرمایا ہاں روزے بھی بڑی قربت کا ذریعہ ہیں، لیکن صدقہ کا عجیب چیز ہونا قرآن پاک کی آیۃ ﴿لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْن﴾ سے ثابت ہے۔ (منقول از در منثور)

❁ **واخرج احمد فی الزهد وابن المنذر وابن ابی حاتم عن مجاهد قال قرأابن عمر وهو یصلی فاتی علی هذه الآیة(لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْن)فاعتق جاریة له وهو یصلی اشار الیها بیده "**

حضرت مجاہد سے مروی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نماز ادا کر رہے تھے، آپ جب اس آیۃ کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْن﴾ پر پہنچے تو نماز پڑھتے ہوئے اپنے ہاتھ کے اشارہ سے اپنی لونڈی کو آزاد کر دیا۔ (منقول از در منثور)

روایت کے انداز سے کہ نماز میں اشارہ کیا سمجھ آتا ہے کہ روایت ضعیف ہے، اگرچہ اشارہ کرنا عمل قلیل ہے تاہم کراہیت سے خالی نہیں۔

❁ **واخرج ابن المنذر عن نافع قال کان ابن عمر یشتری السکر فیتصدق به فنقول له لواشتریت لهم بثمنه طعاما کان انفع لهم من هذا فیقول انی اعرف الذی تقولون ولکن سمعت الله یقول(لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْن)وان ابن عمر یحب السکر"**

ابن منذر نے حضرت نافع سے روایت ذکر کی کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما شکر خرید کر صدقہ کرتے تھے، تو ہم کہتے کہ اگر آپ اسی رقم سے ان کو طعام خرید کر دے دیا کرو تو ان کیلئے زیادہ نفع ہو، تو آپ فرماتے میں آپ کی بات سمجھتا ہوں، لیکن میں نے رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْن﴾ سنا ہے، بیشک حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما شکر پسند فرماتے تھے، (اس لئے شکر کو پسندیدہ چیز سمجھ کر اللہ کی راہ میں خرچ کرتے) (منقول از در منثور)

ام ولد ربیع بن خثیم بھی شکر پسند فرماتی تھیں، اسلئے گھر والوں کو سائل کو شکر دینے کا حکم فرماتیں، اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کو بھی شکر پسند تھی وہ بھی شکر خرید کر فقراء پر تقسیم کرتے تھے۔ (از قرطبی)

❁ واوی شبل عن ابی نجیح عن مجاهد قال کتب عمر بن الخطاب الی ابی موسی الاشعری ان یتاع لہ جاریۃ من سبی جلولاء یوم فتح مدائن کسری فقال سعد بن ابی وقاص فدعا بھاعمر فاعجبتہ فقال ان اللہ عزوجل یقول(لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ)فاعتقھا عمر ؓ"

مجاہد فرماتے ہیں حضرت عمر ؓ نے کسریٰ کے شہر کے فتح ہونے کے دن حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ کی طرف لکھا کہ جلولاء کے قیدیوں میں سے میرے لئے ایک لونڈی خرید لینا، سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں کہ حضرت عمر ؓ نے جب اس لونڈی کو اپنے پاس بلایا تو اس نے آپ کو تعجب میں ڈال دیا، یعنی آپ کو وہ بہت پسند آئی، تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشادگرامی ہے ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ ہے، جس میں پسندیدہ چیز کے خرچ کرنے کے متعلق فرمایا گیا ہے، تو آپ نے وہ لونڈی آزاد کردی۔ (منقول از قرطبی)

❁ روی عن عمر بن عبدالعزیز ؓ انہ کانت لزوجتہ جاریۃ بارعۃ فی الجمال وکان عمرراغبافیھاوکان قدطلبھامنھامرارافلم تعطہ ایاھاثم لماولی الخلافۃ زینتھا وارسلتھاالیہ فقالت وھبتکھایاامیرالمؤمنین فلتخدمک قال من این ملکتھاقالت جئت بھامن بیت ابی عبدالملک ففتش عن تملکہ ایاھافقیل انہ کان علی فلان العامل دیون فلماتوفی اخذت من ترکتہ ففتش عن حال العامل واحضر ورثتہ وارضاھم جمیعاباعطاء المال ثم توجہ الی الجاریۃ وکان یھواھاھوی شدیدافقال انت حرۃ لوجہ اللہ فقیل لم یاامیرالمؤمنین وقدازحت عن امرھا کل شبھۃ قال لست اذا ممن نھی النفس عن الھوی"

روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز ؓ کی زوجہ کے پاس ایک لونڈی تھی جو بہت خوبصورت تھی، آپ اس کی طرف رغبت رکھتے تھے، کئی مرتبہ آپ نے اپنی زوجہ سے مطالبہ کیا کہ تم اپنی یہ لونڈی مجھے ہبہ کردو ،لیکن آپ کی زوجہ نے آپ کو نہ دی، جب آپ والئی خلافت بن گئے تو آپ کی زوجہ نے آپ کے پاس وہی لونڈی مزین کرکے بھیج دی کہ میں نے آپ کو یہ ہبہ کردی، اب آپ کی یہ خدمت کرے گی، آپ نے پوچھا تمہیں اس کی ملکیت کیسے حاصل ہوئی تھی؟ تو آپ کی زوجہ نے بتایا کہ میں یہ اپنے باپ عبدالملک کے گھر سے لائی تھی، آپ نے اس کی تفتیش کی کہ اس کا باپ کس طرح اس لونڈی کا مالک بنا تھا، تو پتہ چلا کہ فلاں عامل پر کچھ قرضے تھے اس کے فوت ہونے پر اس کے ترکہ سے عبدالملک نے شاہی قرضوں کے بدلے یہ لے لی تھی، آپ نے اس عامل کے حال کی تفتیش

کی پھر اس کے ورثاء کو بلا کر اس کو اس لونڈی کی قیمت دے کر راضی کر دیا، پھر آپ اس لونڈی کی طرف متوجہ ہوئے تو آپ کو اس سے شدید محبت ہوگئی، آپ نے اسے اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے آزاد کر دیا، آپ سے پوچھا گیا کہ یہ کیا وجہ ہے اسے آزاد کرنے کی حالانکہ آپ نے تمام شبہات کو دور کر دیا تھا یعنی عامل کے ورثاء کو قیمت دے کر رضاء مند کر دیا تھا، پھر آپ نے اسے آزاد کیوں کر دیا؟ "قال لست ممن نهى النفس عن الهوى" آپ نے فرمایا میں ان لوگوں سے نہیں جو اپنے نفس کو خواہشات سے روک لیتے ہیں، یعنی پسندیدہ چیز پاس ہو، پھر اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی رضاء اور اس کی یاد میں مشغول رہنے کی وجہ سے خواہشات سے روک رکھنا دشوار ہے، اور اپنی پسندیدہ چیز کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دینا آسان ہے اور کامل بھلائی کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ (روح البیان)

❁ حضرت ربیع فالج کی مرض میں مبتلاء ہو گئے، آپ کے دروازے پر جب کوئی سائل آتا تو آپ اپنی زوجہ کو فرماتے کہ اسے شکر کھلا دو، کیونکہ آپ کو شکر پسند تھی، وجہ اس کی رب تعالیٰ کا ارشاد ہی مدنظر تھا ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ حضرت ربیع کی بیماری لمبی ہوگئی، آپ کے دل میں مرغی کا گوشت کھانے کی رغبت ہوئی، چالیس دن تک تو آپ نے اپنی خواہش کو روکے رکھا، لیکن ایک دن اپنی زوجہ کو اپنی شدید رغبت کے متعلق بتا دیا کہ میں چالیس دنوں سے اپنی رغبت کو روک رہا تھا، لیکن آج خواہش کے غالب ہونے پر تمہیں بتا رہا ہوں کہ میں مرغی کا گوشت کھانا چاہتا ہوں، آپ کی زوجہ نے کہا "سبحان الله وای شئی هذاتكف نفسك عنه وقد احله الله تعالى" سبحان اللہ اس میں اپنے نفس کو اس خواہش سے روکنے کی کیا ضرورت تھی؟ جب کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حلال کر دیا ہے، آپ کی زوجہ نے بازار سے مرغی خرید کر پکا دی، جب آپ کے سامنے روٹی اور مرغی کا گوشت رکھا گیا، تو ایک سائل دروازے پر آکر کہنے لگا "تصدقوا على بارك الله فيكم" مجھے صدقہ عطاء کرو اللہ تمہیں برکت عطاء فرمائے، آپ نے کھانے سے ہاتھ ہٹا لیا، اور اپنی زوجہ کو فرمایا یہ روٹی اور گوشت سائل کو دے دو، آپ کی زوجہ نے کہا سبحان اللہ، اتنی خواہش پھر سائل کو دینے کا حکم یہ کیسے؟ آپ نے فرمایا بس وہی کرو جو میں تجھے حکم دے رہا ہوں، آپ کی زوجہ نے کہا کہ اس سے بہتر پر بھی عمل ہو سکتا ہے، آپ نے فرمایا وہ کیسے؟ اس نے کہا اس کھانے کی قیمت سائل کو دے دیں، "قال قد احسنت اء تنی بثمنه" آپ نے فرمایا بہت اچھا مشورہ تم نے دیا ہے، کھانے کی قیمت میرے پاس لاؤ، کھانے کی قیمت لائی گئی، آپ نے وہ رقم کھانے کے ساتھ رکھی اور فرمایا کہ یہ کھانا اور اس کی قیمت تمام ہی فقیر سائل کو دے دو، آپ کی زوجہ نے آپ کے حکم کے مطابق مکمل کھانا اور اس کی قیمت سائل کو دے دی،

سبحان اللہ! کیا ہی خوب ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ پر عمل کیا گیا۔

بہ احسانے آسودہ کردن دلے　　　　بہ از الف رکعت بہر منزلے

احسان کے ساتھ کسی دل کو آرام پہنچانا آسودہ حال کرنا　　ہر منزل میں ہزار رکعت نماز ادا کرنے سے بہتر ہے۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است　　　　از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

دل کو ہاتھ میں لا کہ حج اکبر ہے　ہزاروں کعبہ سے ایک دل بہتر ہے۔ یعنی تو کسی دل کو نہ ستا، کسی مسکین، فقیر، پریشان حال کی دل جوئی کر، یہ بھی حج اکبر کا ثواب رکھتا ہے۔

کعبہ بنیاد خلیل آزر است　　　　دل نظرگاہ جلیل اکبر است

کعبہ کی بنیاد حضرت خلیل اللہ نے رکھی جن کا چچا آزر ہے　دل رب جلیل کی نگاہ میں ہے جو سب سے بڑا ہے۔

"ویقال اذا کنت لاتصل الی البر الا بانفاق محبوبك فمتی تصل الی البار وانت ثو ثر علیه حظوظك"

کیا خوب بیان کیا ہے کہ جب تو اپنی محبوب چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے بغیر کامل بھلائی حاصل نہیں کرسکتا تو تجھے چاہیے کہ تو یہ سمجھ لے کہ تو اسی وقت بار (اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی) تک پہنچ سکے گا جب تو اپنی خواہشات کو اس کی رضاء پر قربان کردے گا۔

"قال القشیری من اراد البر فلینفق بعض ما یحبه ومن اراد البارتعالی فلینفق جمیع مایحبه"

علامہ قشیری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا جو شخص بھلائی حاصل کرنا چاہے وہ بعض محبوب چیزوں کو خرچ کرے، اور جو بارتعالیٰ (اللہ تعالیٰ) کو حاصل کرنے، یعنی اس کا تقرب حاصل کرنے، یعنی اس کا تقرب حاصل کرنے کا ارادہ رکھے تو اپنی تمام محبوب چیزوں کو اس پر قربان کردے۔

"قال القاشانی کل فعل یقرب صاحبه من الله فهو بر ولا یمکن التقرب الیه الابالتبری مماسواه فمن احب من دون الله شیافقد حجب به عن الله واشرک شرکاخفیالتعلق محبته بغیر الله"

قاشانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہر فعل جو انسان کو اللہ تعالیٰ کے قریب کردے وہ "بر" (بھلائی) ہے اللہ تعالیٰ کا قرب اس وقت تک حاصل نہیں ہوگا جب تک اللہ تعالیٰ کے سواء چیزوں سے بیزاری اختیار نہ کرے، جس نے اللہ تعالیٰ کے سواء اور چیزوں سے محبت کی وہ اللہ تعالیٰ سے اسے دور کردے گی، گویا کہ اغیار سے تعلق کی وجہ سے صوفیاء کرام اسے شرک خفی کہیں گے۔

ترا ہر چہ مشغول دارد ز دوست　　　　اگر راست خواہی دلا رامت اوست

ہر وہ چیز جو تجھے دوست سے دور رکھے　　اے دل اگر تو سچ پوچھے تو تو اس غیر چیز کا مطیع ہے۔

اگر یاری از خویشتن دم مزن کہ　　　　شرک است باریار و با خویشتن

اگر تجھے اپنے آپ سے محبت ہے تو رب تعالیٰ کی یاری کا دم نہ مار کہ یہ اپنے یار سے شرک ہے اور اپنے آپ سے دھوکا ہے۔ (ماخوذ از روح البیان)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِيۡلُ عَلٰى نَفۡسِهٖ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰٮةُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِالتَّوۡرٰٮةِ فَاتۡلُوۡهَآ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ O (آیۃ نمبر ۹۳)

(1) سب کھانے بنی اسرائیل کو حلال تھے مگر وہ جو یعقوب نے اپنے اوپر حرام کرلیا تھا توراۃ اترنے سے پہلے "تم فرماؤ" توراۃ لاکر پڑھو اگر سچے ہو۔ (کنزالایمان)

(2) تمام طعام حلال تھے بنی اسرائیل پر مگر وہ جو حرام کئے اسرائیل (یعقوب) نے اپنی ذات پر پہلے نازل ہونے توراۃ کے "آپ فرمادو" تم توراۃ لے آؤ تو پڑھو اسے اگر تم سچے ہو۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں رب تعالیٰ نے مؤمنین کو خطاب فرمایا ﴿لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ﴾ "ہرگز تم بھلائی کو نہیں پاؤ گے یہاں تک کہ تم خرچ کرو اس چیز سے جو تمہیں پسند ہو" اس آیۃ کریمہ میں یہ ذکر کیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت اسرائیل (یعقوب) علیہ السلام بہت شدید مریض ہوگئے، آپ کی بیماری لمبی ہوگئی، آپ نے اللہ تعالیٰ کیلئے نذمانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے بیماری سے عافیت عطاء فرمائی تو میں اپنے آپ پر محبوب کھانا اور پینا حرام کردوں گا، آپ کا محبوب کھانا اونٹ کا گوشت تھا، اور آپ کا محبوب مشروب اونٹنی کا دودھ تھا، آپ نے اپنے آپ پر ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کیلئے اپنے آپ پر حرام کیا، (حدیث پاک کا عربی متن یہ ہے)

وبنی اللہ اسرائیل روی فی الحدیث "انه مرض مرضاشدیدافطال سقمه فنذرلله نذران عافاه الله من سقمه ان یحرم او لیحرمن احب الطعام والشراب الیه وکان احب الطعام الیه لحوم الابل واحب الشراب البانهافعل ذلک تقربا الی الله"

البحرالمحیط میں اس حدیث پر حاشیہ میں یہ الفاظ ہیں "حدیث حسن ان شاء اللہ" بفضلہ تعالیٰ حدیث حسن ہے

پہلی آیۃ کریمہ اوراس آیۃ کریمہ میں وجہِ جامع یہ ہے۔

"هذه الآية وما قبلها في ان كلامنهما فيما ترك مايحبه الانسان وما يؤثره على سبيل التقرب به لله تعالى"

ان دونوں آیتوں میں یہ ذکر ہے کہ انسان اپنی محبوب چیز کواللہ تعالی کی رضاء کی خاطراللہ تعالی کی راہ میں قربان کردے تو اسے اللہ تعالی کا قرب حاصل ہوگااور کامل بھلائی حاصل ہوگی۔

شان نزول اور مختصر مطلب:

قال ابوروق وابن السائب نزلت حين قال النبي ﷺ اناعلى ملة ابراهيم فقالت اليهود فكيف وانت تأكل لحوم الابل والبانهافقال ﷺ ذلك حلال لأبي،ابراهيم ونحن نحله فقالت اليهود كل شئ اصبحنااليوم نحرمه فانه كان محرماعلىٰ نوح وابراهيم حتى انتهى الينا،فانزل الله تكذيبالهم"

ابوروق اورابن سائب نے یہ فرمایا کہ آیۃ کریمہ کا شان نزول یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں ملت ابراہیم پر ہوں،تو یہود نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟تم تو اونٹ کا گوشت کھاتے ہو،اوراونٹوں کا دودھ پیتے ہو،تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ چیزیں میرے باپ ابراہیم علیہ السلام پر حلال تھیں ہم بھی حلال سمجھتے ہیں،تو یہود کہنے لگے ہر چیز جوآج ہم پر حرام ہے وہ نوح علیہ السلام اورابراہیم علیہ السلام پر بھی حرام تھیں،وہی حرمت ہم تک پہنچی ہے تو اس وقت ان کی تکذیب کیلئے یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی،یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کورب تعالی نے فرمایا﴿ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴾ (اے محبوب)''آپ فرمادو تم توراۃ کو لے آؤ،پھراسے پڑھواگرتم سچے ہو"یعنی تم اپنی کتاب توراۃ میں سے ہی یہ نکال کردو کہ یہ چیزیں نوح علیہ السلام اورابراہیم علیہ السلام پر حرام تھیں،اگرتم اپنے دعوی میں سچے ہو،لیکن وہ تو جھوٹے تھے توراۃ کولاکرنہ پڑھ سکے۔ (البحر المحیط)

ایک طویل حدیث پہلے پارہ ﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ﴾ کے بیان میں گزرچکی۔مسنداحمد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ یہود کے ایک وفد نے نبی کریم ﷺ سے چارسوال کئے،ان میں سے ایک سوال یہ تھا"اخبرنا اى الطعام حرم اسرائيل على نفسه" آپ ہمیں خبردیں کون ساطعام حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر حرام کیا تھا؟

فقال انشدكم بالذى انزل التوراة على موسى هل تعلمون ان اسرائيل مرض مرضاشديداوطال سقمه فنذرلله نذرالئن شفاه الله من سقمه ليحرمن احب الطعام

والشراب الیه، وکان احب الطعام الیه لحم الابل واحب الشراب الیه البانها"

تو آپ نے فرمایا میں تم سے اس ذات کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں، کیا تم جانتے ہو کہ بیشک حضرت یعقوب علیہ السلام شدید مریض ہوگئے، اور آپ کی مرض لمبی ہوگئی، تو آپ نے اللہ تعالی کیلئے نذر مانی کہ اگر اللہ تعالی مجھے اس بیماری سے شفاء دی تو میں ضرور بر ضرور اپنے آپ پر محبوب کھانا اور پینا حرام کر دوں گا، آپ کا محبوب کھانا اونٹوں کا گوشت تھا، اور آپ کا محبوب مشروب اونٹوں کا دودھ تھا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"الطعام" بمعنی مطعوم ہے، یا تو اس سے مراد مطلقا تمام مطعومات ہیں جو کھانے اور پینے کی تمام اشیاء کو شامل ہے، اور کبھی اس کا اطلاق صرف ماکولات یعنی کھانے کی چیزوں پر ہوتا ہے۔ (یہاں ماکولات اور مشروبات کھانے اور پینے کی تمام اشیاء کو شامل ہے) اور "الطعام" کا لفظ واحد اور جمع، سب کو شامل ہے۔ (روح المعانی)

"الطعام" پر الف لام جب استغراقی آئے تو اس وقت، اور لفظ "کل" اس پر داخل ہو تو یہ عام مطعومات کو شامل ہوتا ہے، ورنہ صرف "طعام" عام نکرہ کا ہی حکم رکھتا ہے۔ یہاں عمومیت پر "استثناء" بھی دلیل ہے، کیونکہ ﴿اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآئِیْلُ عَلٰی نَفْسِہٖ﴾ اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب کہ ﴿کُلُّ الطَّعَامِ﴾ کا معنی "کل المطعومات" کریں، جیسا کہ ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ میں "الانسان" پر الف لام استغراقی ہے جو عموم افراد پر دلالت کر رہا ہے، جس سے "ایمان والوں" کو مستثنی کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

اعتراض: طعام تو مردار کو بھی شامل ہے اور خنزیر کو بھی شامل ہے، کیا یہ چیزیں بھی حضرت یعقوب علیہ السلام پر حلال تھیں؟ یہ تو عقلا بعید نظر آتا ہے۔

جواب: شان نزول سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ مسئلہ ان چیزوں میں چل رہا تھا جو بنی اسرائیل پر حرام تھیں، وہ کہہ رہے تھے کہ یہ تو حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بھی حرام تھیں، تو نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مقصد یہ تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ چیزیں حرام نہیں تھیں بلکہ ان پر حلال تھیں، جو چیزیں ان پر حلال تھیں وہ تمام بعد میں بھی حلال رہیں، ہاں البتہ وہ چیزیں جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے حلال چیزوں میں سے اپنے اوپر حرام کر دیں وہ ان پر حرام ہوگئیں۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾

"**حل**" واحد، جمع، مذکر و مؤنث کو شامل ہے، اس کا معنی حلال ہونا، اترنا ﴿وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ﴾ "اترنے" کے معنی میں استعمال ہے، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت "کنت اطیب رسول اللہ ﷺ لحلہ ولحرمہ" (میں رسول اللہ ﷺ کیلئے حالت حلت (غیر احرام) میں اور حالت احرام میں خوشبو تیار کرتی تھی) میں "حلال ہونے" یعنی غیر محرم ہونے کے معنی میں استعمال ہے، اور ﴿لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ﴾ میں جمع کیلئے استعمال ہے۔ (البحر المحیط)

اعتراض: آیۃ کریمہ کے ظاہر سے یہ سمجھ آرہا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر اونٹوں کا گوشت اور دودھ حرام کرلیا تھا، آپ کے حرام کرنے سے حرام کیسے ہوگیا۔ جبکہ "ان التحریم والتحلیل انما یثبت بخطاب اللہ تعالی" حرام ہونا یا حلال ہونا تو اللہ تعالی کے ارشاد سے ثابت ہوتا ہے۔

جواب اول: یہ کوئی بعید بات نہیں کہ آپ کے حرام کرنے پر اللہ تعالی نے بھی آپ پر حرام کردیا ہو، یہ کہنا جائز ہے بندے نے اپنے آپ پر ایک چیز کو حرام کیا تو اللہ تعالی نے بھی اس پر حرام کردیا، جیسا کہ بندہ اپنی زوجہ کو اپنے آپ پر طلاق کے ذریعے حرام کرلیتا ہے تو اللہ تعالی بھی اس پر اس کی زوجہ حرام کردیتا ہے، اسی طرح بندہ جب لونڈی کو آزاد کرکے اپنے آپ حرام کرلیتا ہے تو رب تعالی بھی اس پر اس لونڈی کو حرام کردیتا ہے۔

جواب دوم: اله علیه الصلوة والسلام ربما اجتهد فادی اجتهاد الی التحریم فقال بحرمته"
نبی کریم ﷺ نے بسا اوقات اجتہاد کیا، آپ نے اپنے اجتہاد سے کسی چیز کو حرام کیا، تو اللہ تعالی کی طرف سے بھی وہ چیزیں حرام کردی گئیں، اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی اپنے آپ پر اجتہاد سے محبوب کھانے اور پینے کی چیز کو حرام کیا تو اللہ تعالی نے بھی آپ پر حرام کردیا۔

انبیاء کرام کے اجتہاد کے جواز پر چند وجوہ:

(۱) رب تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ﴾ (سورۃ الحشر، آیۃ نمبر۲)

"(تو عبرت لو اے نگاہ والو) اس میں اجتہاد کرنے کا ہی حکم دیا گیا۔"

"ولاشک ان الانبیاء علیهم السلام رؤساء اولی الابصار" یہ بھی یقینی بات ہے کہ انبیاء کرام "نگاہ والوں" کے رئیس ہیں، اسلئے آپ کا نظر کرنا، عبرت پکڑنا، اجتہاد کرنا دوسرے لوگوں کے اجتہاد سے افضل ہے۔

(۲) اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ" (سورۃ النساء، آیۃ نمبر ۸۳)
(تو ضرور ان سے اس کی حقیقت جان لیتے) حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

مسئلہ ۱: مفسرین کرام نے فرمایا اس آیۃ کریمہ میں دلیل ہے جواز قیاس پر اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک علم تو وہ ہے جو نص قرآن وحدیث سے حاصل ہو، اور ایک علم وہ ہے جو قرآن وحدیث سے استنباط وقیاس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

مسئلہ ۲: یہ بھی معلوم ہوا کہ امور دینیہ میں ہر شخص کو دخل دینا جائز نہیں جو اہل ہو اس کو تفویض کرنا چاہیے۔ (خزائن العرفان)

اس آیۃ کریمہ میں رب تعالیٰ نے مستنبطین (مجتہدین) کی مدح فرمائی "والانبیاء اولی بھذا المدح" اور انبیاء کرام اس مدح کے زیادہ مستحق ہیں۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ﴾ (اللہ تمہیں معاف فرمائے تم نے انہیں کیوں اذن دے دیا)

اس آیۃ کریمہ سے بھی یہ واضح ہو رہا ہے، کہ نبی کریم ﷺ نے منافقین کو غزوہ سے واپس لوٹ جانے کی اجازت سے نص سے دی تھی بلکہ اجتہاد سے دی تھی "فلو کان ذلک الاذن بالنص لم یقل لم اذنت" اگر نص سے اجازت دی ہوتی تو آپ کو "لِمَ اَذِنْتَ" نہ فرمایا جاتا، اس آیۃ کریمہ سے بھی نبی کریم ﷺ کا اجتہاد کرنا ثابت ہوا، ساتھ ہی اجتہاد کی فضیلت بھی ثابت ہوگئی۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق سے بڑھ کر اس کی اطاعت کرنے والے انبیاء کرام ہیں، انبیاء کرام کا فعل، عظیم فعل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے خاص مقام حاصل ہوتا ہے۔

"ولاشک ان استنباط احکام اللہ تعالی بطریق الاجتھاد طاعة عظیمة شاقة فوجب ان یکون للانبیاء علیھم الصلوة والسلام فیھا نصیب"

یہ یقینی بات ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں استنباط واجتہاد اللہ تعالیٰ کی عظیم طاعت ہے، اس میں بہت مشقت پائی جاتی ہے، تو ضروری ہے کہ اس عظیم طاعت سے انبیاء کرام کو بہت بڑا حصہ عطاء کیا جائے، خصوصاً انبیاء کرام کو سب سے زیادہ معرفت حاصل ہوتی ہے، ان کی عقلیں سب سے زیادہ منور ہوتی ہیں، اور ان کے ذہن سب سے زیادہ صاف ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی ان کو خصوصی تائید وتوفیق حاصل ہوتی ہے جو ان کو درست راہ پر قائم رکھتی ہے۔

"ثم اذا حکموا بحکم بسبب الاجتھاد یحرم علی الأمة مخالفتھم فی ذلک الحکم کماان الاجماع اذاانعقد علی الاجتھاد فانه یحرم مخالفته"
انبیاء کرام جب اجتہاد سے کسی مسئلہ پر حکم لگادیں تو امت پر ان کی مخالفت حرام ہوجاتی ہے، جیسا کہ اجتہاد پر اجماع منعقد ہوجائے تو اس کی مخالفت حرام ہوجاتی ہے۔

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اونٹوں کے گوشت اور دودھ کو جو اپنے آپ پر حرام کیا تھا وہ اپنے اجتہاد سے کیا تھا، نص سے نہیں، اگر نص سے حرام کیا گیا ہوتا، تو یوں کہا جاتا "الاماحرم الله علی اسرائیل"، لیکن جب یہ نہیں کہا گیا بلکہ حرام کرنے کی نسبت حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف کی گئی، ارشاد فرمایا ﴿اِلَّا مَاحَرَّمَ اِسۡرَائِیۡلُ عَلٰی نَفۡسِهٖ﴾ تو اس سے واضح ہوگیا کہ یہ فعل حضرت یعقوب علیہ السلام کے اجتہاد سے تھا۔ (ماخوذ از کبیر)

جواب سوم: الثالث یحتمل ان التحریم فی شرعه کالنذر فی شرعنافکما یجب علیناالوفاء بالنذر کان یجب فی شرعه الوفاء بالتحریم"
تیسرا جواب یہ ہے کہ احتمال یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں اگر کسی چیز کو اپنے آپ حرام کرلیا جاتا تو اسے حرام سمجھنا اور اس سے بچنا فرض ہوجاتا تھا، جیسا کہ ہماری شریعت میں نذر کا پورا کرنا واجب ہوجاتا ہے۔

اسی سے ایک سوال کا جواب خود بخود آگیا کہ حلال چیز کو حرام کرنا منع ہے، جو کہ رب تعالیٰ کے ارشاد سے واضح ہے ﴿یَاۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤاَحَلَّ اللّٰهُ لَکَ﴾ "اے نبی! کیوں حرام کرتے ہو وہ جو حلال کی ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کیلئے" تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر حلال چیزوں کو کیسے حرام کرلیا تھا؟ اس کا جواب یہ سمجھ آگیا کہ ان کی شریعت میں یہ جائز تھا کہ کسی حلال چیز کو اپنے آپ پر حرام کرلیا جائے، لیکن ہماری شریعت میں منع ہے۔ (ماخوذ از کبیر)
پہلی شریعتوں کے قوانین ان سے ہی سمجھے جائیں ان کو نبی کریم ﷺ کی شریعت پر قیاس نہ کیا جائے۔

جواب چہارم: ہوسکتا ہے کہ یہاں "تحریم" کا مجازی معنیٰ لیا گیا ہو، کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اونٹوں کا گوشت اور دودھ پسند تھے، طبیعت ان کی طرف مائل رہتی تھی تو آپ نے اپنے پر قہر کرتے ہوئے، نفس کو روکنے کیلئے نذر مان لی ہو کہ میں ان چیزوں کو استعمال نہیں کروں گا۔ حقیقی معنیٰ یہاں نہیں کہ آپ نے واقعی اپنے آپ پر حلال چیزوں کو حرام کردیا (لیکن راقم کے نزدیک یہ جواب ضعیف ہے کیونکہ دوسرے جوابات ظاہر کے مطابق ہیں)
(ماخوذ از کبیر)

علامہ رازی رحمہ اللہ کی ایک خوبصورت تحقیق:

اس مقام پر مفسرین کرام کی مختلف بحثیں ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر جن چیزوں کو حرام کیا تھا، وہ بنی اسرائیل پر بھی حرام ہوگئی تھیں یا نہیں؟ کیا ایک مرتبہ ان پر حرام ہوئی تھیں یا دو مرتبہ؟ کبیر میں مختصر اور تحقیقی طور پر خوبصورت انداز پر اس مسئلہ کو ان الفاظ سے حل کیا گیا۔

ظاهر هذه الآية يدل على ان الذى حرمه اسرائيل على نفسه فقد حرمه الله على بنى اسرائيل، وذلك لانه تعالىٰ قال (كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِىٓ اِسۡرَآءِيۡلَ) فحكم بحل كل انواع المطعومات لبنى اسرائيل، ثم استثنى عنه ماحرمه اسرائيل على نفسه فوجب بحكم الاستثناء ان يكون ذلك حراما على بنى اسرائيل" واللہ اعلم

آیہ کریمہ کا ظاہر اس پر دلالت کررہا ہے کہ بیشک جن چیزوں کو حضرت اسرائیل (یعقوب) علیہ السلام نے اپنے آپ پر حرام کیا، وہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد (بنی اسرائیل) پر حرام کردیں۔ یہی وجہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِىٓ اِسۡرَآءِيۡلَ﴾ تمام کھانے (جو نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام پر حلال تھے) وہ حلال تھے بنی اسرائیل کیلئے۔ پھر اس سے مستثنیٰ کیا ﴿اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِيۡلُ عَلٰى نَفۡسِهٖ﴾ (مگر وہ جو حرام کیا یعقوب نے اپنے آپ پر) استثناء کا تقاضا یہ ہے کہ وہ چیزیں بنی اسرائیل پر بھی حرام ہوں۔

﴿مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰىةُ﴾ "پہلے نازل ہونے توراۃ کے۔"

مطلب یہ ہے کہ توراۃ کے نازل ہونے سے پہلے بنی اسرائیل پر تمام کھانے حلال تھے سوائے اس کے جو چیزیں حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر حرام کیں وہی بنی اسرائیل پر بھی اللہ تعالیٰ نے حرام کردیں۔

"اما بعد التوراة فلم يبق كذلك بل حرم الله تعالى عليهم انواعا كثيرة"

لیکن توراۃ کے نازل ہونے کے بعد حکم اس طرح نہ رہا بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر کثیر چیزوں کو حرام کردیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل جب کوئی عظیم جرم کرتے تو اللہ تعالیٰ ان پر کئی حلال چیزوں کو حرام کردیتا تھا، ان پر ہلاکت اور عذاب کو مسلط کردیتا تھا۔

اس مسئلہ پر ارشاد باری تعالیٰ دیکھئے:

﴿فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ﴾ (سورة النساء، آية نمبر ۱۶۰)
"بوجہ ظلم کرنے یہودیوں کے حرام کردیں ہم نے ان پر بعض پاکیزہ چیزیں جو حلال تھیں ان کیلئے"

اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی دیکھئے:

﴿وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِبَغْيِهِمْ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ﴾ (سورة الانعام، آیة نمبر ۱۴۶)

''اور یہودیوں پر ہم نے حرام کیا ہر ناخن والا جانور اور گائے اور بکری کی چربی ان پر حرام کی مگر جو ان کے پیٹھ میں لگی ہو، یا آنت یا ہڈی سے ملی ہو، ہم نے یہ ان کی سرکشی کا بدلہ دیا، اور بیشک ہم ضرور سچے ہیں۔''

﴿قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾

''آپ فرمادیں تو لے آؤ تم توراۃ تو اسے پڑھو اگر تم سچے ہو۔''

بنی اسرائیل قوم نے جب رسول اللہ ﷺ سے جھگڑا کیا اور دعوی کیا کہ جو چیزیں ہم پر حرام ہیں یہ تو پہلے سے ہی حرام چلی آرہی ہیں، کیونکہ نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام پر بھی یہ چیزیں حرام تھیں، بلکہ ان میں سے بعض نے کہا یہ تو آدم علیہ السلام کے زمانہ سے حرام چلی آرہی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ان کی تکذیب کی کہ تم جھوٹے ہو، کیونکہ یہ چیزیں پہلے سے حلال چلی آرہی ہیں، صرف ان چیزوں کو ابتدائی طور پر حرام کیا گیا جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر حرام کیں، تو انہوں نے کہا نہیں بات وہی صحیح جو ہم کہہ رہے ہیں، تو رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دے دیا کہ اے محبوب ''آپ ان کو فرمادو تم توراۃ لے آؤ، اسے پڑھو اگر تم سچے ہو'' (کبیر)

''فلم یأتوا بها و خافوا الفضیحة'' وہ توراۃ نہ لائے کیونکہ ان کو اپنے رسواء ہونے کا خوف تھا۔ (خازن)

یہ یقینی بات ہے کہ وہ توراۃ لاتے تو اپنے دعوی کو توراۃ سے ثابت نہ کرسکتے، اور ذلت ورسوائی کا انہیں سامنا کرنا پڑتا۔

فائدہ عظیمہ: حضرت یعقوب علیہ السلام نے جس بیماری سے شفاء حاصل کرنے کیلئے اپنے آپ پر اپنی محبوب چیزوں کو حرام کردیا تھا، وہ آپ کی بیماری "عرق النساء" کی تھی۔ ''عرق النساء'' وہ بیماری ہے جو ران سے درد شروع ہوتا ہے گٹنے یا قدم تک پہنچتا ہے، (المنجد) اس کا علاج ابن ماجہ شریف میں ذکر فرمایا گیا ہے۔

❁ حدثنا انس بن سیرین انه سمع انس بن مالک یقول سمعت رسول الله ﷺ یقول شفاء عرق النساء الیه شاة (اعرابیة) تذاب ثم تجزأ ثلاثة اجزاء ثم یشرب علی الریق فی کل یوم جزء''

حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا عرق النساء کی شفاء اس میں ہے کہ (عربی انسل) بھیڑ کی لاٹ (دم کی چکی) کو پگھلایا جائے، پھر اس (چربی) کے تین حصے کئے جائیں، پھر ہر روز (یعنی تین دن) نہار منہ اس کا ایک ایک حصہ پئے"

خیال رہے کہ تفسیر نعیمی میں "یشرب علی الریق" کا معنی کیا گیا ہے، پھر اس رگ میں جذب کر دیا جائے جسے ریق کہا جاتا ہے۔

❁ واخرج الثعلبی فی تفسیرہ ایضا "من حدیث انس بن مالک قال قال رسول اللہ ﷺ فی عرق النساء تؤخذ الیة کبش عربی لاصغیر ولا کبیر فتقطع صغارا فتخرج اھالتہ فتقسم ثلاثة اقسام فی کل یوم علی ریق النفس ثلاثا"

تفسیر ثعلبی میں یہ حدیث مذکور ہے، ترجمہ وہی ہے جو بیان ہو چکا ہے "اھالة" کا معنی پگھلائی ہوئی چربی "قال انس فوصفتہ لأکثر من مائة فبرأ باذن اللہ تعالی" حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں "میں نے ایک سو سے زائد آدمیوں کو یہی علاج بتایا، جنہوں نے اس پر عمل کر کے اللہ تعالی کے فضل وکرم سے شفاء حاصل کی۔ (ماخوذ از قرطبی)

شان نبوت:

نبی کریم ﷺ کا مطالبہ کرنا کہ تم توراۃ لاؤ اور اسے پڑھو، اپنا دعوی توراۃ سے ثابت کرو اگر تم سچے ہو، اس سے نبی کریم ﷺ کی شان عظیم واضح ہوئی کہ جس ذات نے کسی مدرسہ میں اور کسی معلم سے تعلیم حاصل نہیں کی، وہ چیلنج کر رہے ہے کہ تم جھوٹے ہو، تمہاری کتاب میں تمہارے دعوی پر کوئی دلیل نہیں، تو آپ کا یہ ارشاد گرامی آپ کی حقانیت پر دلالت کر رہا ہے۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

کفار کے نظریات ہمیشہ ایک رہے:

وکان سبب نزول ھذہ الآیة ان الیھود انکروا تحلیل النبی ﷺ لحوم الابل لانھم لایرون النسخ جائزا فانزل اللہ ھذہ الآیة"

یہود نے نبی کریم ﷺ پر اعتراض کیا کہ تم اونٹوں کا گوشت کیوں حلال مانتے ہو، یہود احکام کے منسوخ ہونے کو نہیں مانتے تھے، تو رب تعالی نے اس آیۃ کریمہ کو نازل کر کے واضح کر دیا کہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں یہ حلال تھا، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر حرام کیا تو رب تعالی نے بھی بنی اسرائیل پر حرام کر دیا، اور ان کو بتایا کہ یہ مسئلہ توراۃ میں موجود ہے اگر تم سچے ہو تو توراۃ لاؤ اور پڑھو، جب ایک چیز کی

حلت منسوخ ہوگئی اور حرمت آگئی تو اب اس کی حرمت منسوخ ہوگئی اور حلت آگئی، یہ تو اللہ تعالی کی مرضی ہے جو چاہے کرے "وبین ذلک بطلان قولهم فی اباء النسخ اذ ماجاز ان یکون مبا حا فی وقت ثم حظر جازت اباحته بعد حظره" واضح ہوگیا کہ یہود کا نسخ کا انکار باطل ہے، بلکہ جائز ہے کہ اللہ تعالی ایک چیز کی کسی وقت اجازت دے اور کسی وقت منع کر دے۔ (احکام القرآن للجصاص)

آج بھی باطل مذاہب والے قادیانی، نیچری وغیرہ نسخ کے قائل نہیں، کیا خوب یہود سے بھائی چارہ۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

فَمَنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (آیۃ نمبر ۹۴)

(1) تو اس کے بعد جو اللہ پر جھوٹ باندھے تو وہی ظالم ہے۔ (کنز الایمان)

(2) تو جنہوں نے گھڑا اللہ پر جھوٹ بعد اس کے، تو وہی ظالم ہیں۔ (نجوم الفرقان)

یعنی جب ان پر دلائل قائم کردئے گئے کہ اونٹوں کا گوشت اور دودھ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حرام نہیں تھے بلکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر یہ حرام کئے بعد میں اللہ تعالی نے بنی اسرائیل پر بھی حرام کردئے، یہ مسئلہ توراۃ میں موجود ہے، اگر تم اپنے دعوی میں سچے ہو تو توراۃ لے آؤ، لیکن وہ رسوائی سے بچنے کیلئے توراۃ نہ لاسکے۔ اس آیۃ کریمہ میں یہ بیان فرمایا گیا کہ اگر ان دلائل کے قائم ہونے کے بعد بھی تم اپنے دعوی پر قائم رہے اور رب تعالی کی طرف تم نے جھوٹ منسوب کیا کہ یہ چیزیں تو اللہ تعالی نے حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حرام کی تھیں تو تم ظالم ہوجاؤ گے۔

﴿فَمَنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ﴾ "تو جنہوں نے گھڑا اللہ پر جھوٹ۔"

"الافتراء، اختلاق الکذب والفریۃ الکذب والقذف" "افتراء" کا معنی ہے جھوٹ گھڑنا، جھوٹ باندھنا، تہمت لگانا، "فریۃ" کا معنی جھوٹ اور تہمت ہے، اصل میں اس کا معنی ماخوذ ہے "فری الادیم" (چمڑا کاٹنا) سے، جھوٹ باندھنے کو "افتراء" اس لئے کہا جاتا ہے کہ کاذب (جھوٹا) بغیر تحقیق کے کلام (منقطع) یعنی جھوٹ گھڑلیتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ﴾ "بعد اس کے۔"

"ای من بعد ظهور الحجة بان التحریم انما کان من جهة یعقوب، ولم یکن محرما قبله"
(تو جنہوں نے گھڑا اللہ پر جھوٹ اس کے بعد) ''اس کے بعد'' کا مطلب کیا ہے؟ مطلب اس کا یہ ہے کہ جب دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر خود ''اونٹوں کا گوشت اور دودھ'' حرام کیا تھا، اس سے پہلے ان پر کوئی چیز حرام نہیں تھیں۔

﴿فَاُولٰئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ "تو وہی ظالم ہیں۔"

یعنی حجت و دلائل حاصل ہونے کے بعد جنہوں نے اللہ تعالی پر جھوٹ باندھا تو وہی ظالم ہیں ''یعنی اللہ تعالی کے عذاب کے مستحق ہیں، اس لئے کہ ان کا کفران کی اپنی جانوں پر ظلم ہے، اور ان لوگوں پر بھی ان کا ظلم ہے جن کو وہ گمراہ کر رہے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

اعتراض: اللہ تعالی پر جھوٹ باندھنا تو ہمیشہ ظلم ہے ''مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ'' یعنی حجت و دلائل کے بعد'' کی قید کیوں لگائی؟

پہلا جواب: وانما قید بالبعدیة مع انه یستحق الوعید بالکذب علی الله تعالی فی کل وقت وفی کل حال للدلالة علی کمال القبح"
یہ بات تسلیم ہے کہ اللہ تعالی پر جھوٹ مطلقا حرام ہے، اور اس سے انسان ہر وقت اور ہر حال میں عذاب کا مستحق ہوتا ہے لیکن جب کسی مسئلہ پر دلائل بھی حاصل ہو جائیں تو دلائل کے بعد نہ تسلیم کرنا اور اپنا من گھڑت اور غلط دعوی کر کے اللہ تعالی کی طرف منسوب کرنا یہ بہت ہی زیادہ برا طریقہ ہے، اور بہت بڑے عذاب کا مستحق ہونا ہے، اور بہت بڑا ظلم ہے۔

دوسرا جواب: وقیل لبیان انه انما یؤاخذ به بعد اقامة الحجة علیه ومن کذب فلیس بمحجوج فیه فهو بمنزلة الصبی الذی لا یستحق الوعید بکذبه، وفیه تأمل"
بعض حضرات نے بیان یہ کیا ہے کہ ﴿مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ﴾ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ دلائل اور حجت کے حاصل ہونے کے بعد اللہ تعالی کی طرف جھوٹ باندھنا کہ یہ اللہ تعالی نے کہا ہے، حالانکہ اللہ تعالی نے نہیں کہا ہوتا'' یہ عذاب کا سبب ہے، لیکن اگر کسی شخص نے جہالت کی وجہ سے کہہ دیا کہ ''اللہ نے یہ کیا ہے'' اور ''اللہ تعالی نے یہ کہا ہے'' حالانکہ وہ اللہ تعالی کا قول و فعل نہیں ہوتا، تو یہ شخص جس نے لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے یہ کہہ دیا تھا، اس کے پاس دلائل نہیں آئے تھے وہ بچے کی طرح معذور سمجھا جائے گا، اسے کسی قسم کی گرفت نہیں ہوگی۔ لیکن اس جواب کے ضعیف

ہونے کی طرف "وفیہ تامل" (اوراس میں تأمل (سوچ) ہے) سے اشارہ فرمادیا کہ بغیر تحقیق کے یہ کہہ دینا کہ یہ ''اللہ تعالی کا ارشاد'' یہ بھی باعث عذاب ہے، وہ مقام ادب ہے جس کا پاس کرنا ضروری ہے۔ (ماخوذ از روح البیان)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

لفظ" من" میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ شرط ہو، اور دوسرا یہ کہ موصولہ ہو، ''وقد روعی لفظها ومعناها" آیۃ کریمہ میں لفظ" من" اور معنی" من" دونوں کا لحاظ کیا گیا ہے، کیونکہ ''لفظ من'' مفرد ہے، اور ''معنی من'' جمع ہے، عموم پر دلالت کر رہا ہے، لفظ کا اعتبار کر کے'' افتری" واحد کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے، اور اس کے معنی کا اعتبار کر کے" اولئك" اشارہ جمع" هم" ضمیر جمع" الظالمون" جمع ذکر کیے گئے۔ اعلی حضرت رحمہ اللہ نے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے مکمل مفرد والا معنی ذکر فرمایا، راقم نے معنی کا اعتبار کر کے مکمل جمع کا معنی کیا ہے، تاہم لفظوں کے ظاہر کو دیکھ کر یہ ترجمہ بھی درست ہے بلکہ لفظوں کے مطابق یہی ہے۔

''تو جس نے جھوٹ باندھا اللہ پر اس کے بعد، تو وہی ظالم ہیں''

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (آیۃ نمبر ۹۵)

(1) تم فرماؤ اللہ سچا ہے تو ابراہیم کے دین پر چلو جو ہر باطل سے جدا تھے اور شرک والوں میں نہ تھے۔ (کنز الایمان)

(2) آپ فرمادیں سچا ہے اللہ تو تابعداری کرو دین ابراہیم کی جو ہر باطل سے جدا تھے اور نہیں تھے مشرکوں سے۔ (نجوم الفرقان)

یہاں تین مطلب بیان کیے گئے ہیں، ایک یہ کہ نبی کریم ﷺ نے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا اے محمد ﷺ آپ فرمادیجئے کہ اللہ تعالی نے جو خبر دی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد پر جو محبوب طعام یعقوب علیہ السلام کے حرام کرنے پر حرام کر دیا گیا، اللہ تعالی نے اس کی خبر دی ہے، اللہ تعالی سچا ہے، اسی سے یہ واضح ہو گیا" فصح

الـقـول بـالـنـسـخ وبطل قول اليهود " کہ اللہ تعالی نے اپنے ارشادات کومنسوخ فرماتا رہتا ہے، جوطعام پہلے حلال تھا وہ بنی اسرائیل پر حرام کیا گیا، پھر نبی کریم ﷺ پر حلال کر دیا گیا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی سچا ہے یہ خبر دینے میں کہ اونٹوں کا گوشت اور دودھ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حلال تھا، بعد میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر حرام کیا۔

تیسرا مطلب یہ ہے وہ اللہ تعالی اس خبر میں صادق ہے کہ جو کھانے کی چیزیں حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حلال تھیں، وہ بنی اسرائیل پر بھی حلال تھیں، کچھ چیزیں جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے پر حرام کیں جو بنی اسرائیل پر بھی حرام کر دی گئیں، اور بعض طعام بنی اسرائیل کے گناہوں کی وجہ سے ان پر بطور سزا حرام کر دئے گئے۔

"فـفـيـه تـعـريـض بـكـذب الـيـهـود والمعنى ثبت ان الله تعالى صادق فيما انزل واخبر وانتم كاذبون يا معشر اليهود"

اس میں تعریضا (اشارۃ) یہود کے جھوٹ کو ذکر کر دیا گیا، معنی یہ ہے کہ ثابت ہے کے بیشک اللہ تعالی اپنے کلام اور خبر میں صادق ہے اور اے یہود تم جھوٹے ہو۔ (خازن)

راقم کے نزدیک تینوں مطالب اس مختصر عبارت میں سمٹ کر آجاتے ہیں" آپ فرما دیجئے اللہ تعالی سچا ہے تمہارا دعوی باطل ہے کہ یہ ارشاد جو ہم پر حرام ہیں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بھی حرام تھیں، بلکہ ان پر حلال تھیں تم پر حرام ہیں، منسوخیت کا انکار کرنا درست نہیں۔

﴿فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ اِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا﴾ "تو تابعداری کرو دین ابراہیم کی جو ہر باطل سے جدا تھے۔"

یعنی اے یہود تم جو یہ کہتے ہو کہ ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے محبت ہے اور ہم ان کے دین پر ہیں، تمہارا یہ کہنا سراسر جھوٹ پر مبنی ہے، دین ابراہیم علیہ السلام تو دین اسلام ہے جس کی طرف نبی کریم ﷺ تمہیں بلاتے ہیں۔

(فَـاتَّـبِـعُـوا مِـلَّـةَ اِبْـرَاهِـيـم) وهي ملة الاسلام التي عليها محمد ﷺ ومن آمن معه حتى تـخـلـصـوا من اليهودية التي ورطتكم في فساد دينكم ودنياكم حيث اضطرتكم الى تحريف كتاب الله "

دین ابراہیم وہ دین اسلام ہے جس کی طرف حضرت محمد ﷺ دعوت دے رہے ہیں، جس نے آپ پر ایمان لایا، اس نے یہودیت سے چھٹکارا حاصل کر لیا، کیونکہ یہودیت نے تمہیں دین ودنیا کے فساد کی دلدل میں پھنسا دیا ہے اور اللہ تعالی کی کتابوں میں تحریف کرنے پر تمہیں یوں لگا دیا ہے جیسے کہ کوئی شخص

اضطراری حالت میں ہوتا ہے۔ (مدارک التنزیل للنسفی)

دین ابراہیم کے اوصاف:

وکان ملته انفاق المال علی الضیفان وبذل الروح عند الامتحان وتسلیم القربان وھذہ ملة الخلة"

آپ کے دین میں یہ چیزیں تھیں "مہمان پر مال خرچ کرنا اور امتحان کے وقت اپنی جان قربان کرنا، اور قربانی کو تسلیم کرنا" یہی چیزیں رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں بھی جاری رکھی گئیں۔ (روح البیان)

﴿حَنِیۡفًا﴾ "جو ہر باطل سے جدا تھے۔"

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ وتفسیر ابی السعود:

"حَنِیۡفًا" کا ترجمہ اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے کیا ہے "ہر باطل سے جدا" راقم نے بھی یہی نقل کیا ہے، آیئے تفسیر ابی السعود کو دیکھئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ آپ کو اسی کے مطابق نظر آئے گا۔
"(حَنِیۡفًا) ای مائلا عن الادیان الزائغة کلھا" آپ تمام ٹیڑھے (باطل) دینوں سے اعراض کرنے والے (جدا) تھے۔ (تفسیر ابی السعود)

﴿وَمَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ﴾ "اور آپ مشرکوں میں سے نہیں تھے۔"

قرآن پاک کی عظمت کو دیکھیں یہ قلیل الفاظ کتنے عظیم معانی ومطالب کو حاوی ہیں۔

(۱) "(وَمَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ) ای فی امر من امور دینه اصلا وفرعا"
کہ ابراہیم علیہ السلام امر دین کے اصول اور فروع میں کسی ایک چیز میں بھی آپ مشرکوں کے ساتھ شریک نہیں تھے۔

(۲) "وفیه تعریض باشراک الیھود" ان مختصر الفاظ مبارکہ سے تعریضا (اشارۃ) یہ بھی سمجھ آ گیا کہ یہود دین کے امور میں مشرکوں کے ساتھ شریک تھے۔

(۳) "وتصریح بانه علیه السلام لیس بینه وبینھم علاقة دینیة قطعیة"
ان الفاظ گرامی سے واضح طور پر یہ بھی سمجھ آ گیا کہ یہود اپنے دعوی میں جھوٹے ہیں کہ ہم دین ابراہیمی پر قائم ہیں، ان کو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین سے کوئی واسطہ نہیں۔

(۴) "والغرض بیان ان النبی ﷺ علی دین ابراھیم علیہ السلام فی الاصول لانہ لایدعو الا الی التوحید والبراءۃ عن کل معبود سواہ سبحانہ"

ان مختصر الفاظ سے اصل مقصد بیان بھی واضح ہوگیا کہ نبی کریم ﷺ اصول دین میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر تھے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف اللہ تعالیٰ کی توحید کی دعوت دی اور رب تعالیٰ کے بغیر تمام باطل معبودوں سے آپ نے اعراض کیا، یہی کام نبی کریم ﷺ نے بھی کئے، تو پتہ چل گیا کہ اصول دین میں آپ دین ابراہیم پر تھے۔

(۵) "ولجملة تذییل لما قبلھا" یہ مختصر جملہ ماقبل تمام مضمون کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے (تفسیر ابی السعود)

میرے **عزیز طلبہ کرام !** "كُلُّ الطَّعَامِ" سے لے کر یہاں تک تمام ابحاث کو دیکھیں، اور خاص کر کے "وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ" کے ضمن میں چار وجوہ کو دیکھیں تو یہ پانچویں وجہ روز روشن کی طرح نکھر کر سامنے آئے گی۔

تین آیات سے حاصل ہونے والے فوائد جلیلہ:

نجم الدین رحمہ اللہ نے تاویلات میں ذکر کیا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو تین قسموں پر پیدا کیا۔ ایک قسم ان سے فرشتے روحانی، علوی، لطیف، اور نورانی مخلوق ہے، ان کی غذا ان کے مناسب ان کو عطاء کی گئی، وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی عبادت یعنی ان کو پیدا ہی عبادت کیلئے کیا گیا ہے۔

مخلوق کی دوسری قسم حیوانی، جسمانی، سفلی، کثیف، ظلمانی ہیں، ان کی غذا ان کے مناسب عطاء کی گئی، ان کی غذا چارہ ہے، ان کو پیدا ہی خدمت گزاری کیلئے کیا ہے، اور اس لئے کہ اس جہان میں یوں ہی کھانے، پینے میں وقت گذار کر چلے جائیں۔

مخلوق کی تیسری قسم انسان ہیں جو ملکی روحانی اور حیوانی جسمانی کا مرکب ہیں، یعنی ان میں فرشتوں والی حالت بھی ہے، اور حیوانوں والی بھی، ان کی غذا ان کے مطابق مقرر کی گئی ہے، ان کی روحانی غذا اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے، اور ان کی جسمانی غذا طعام ہے، اور ان کو عبادت اور معرفت کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔

انسانوں کی ایک قسم یہ ہے:

﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ﴾ ان میں سے بعض وہ ہیں جو اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں، یہ وہ ہیں جن کی

حیوانیت روحانیت پر غالب ہوتی ہے، وہ جسمانی غذا کھانے کی طرف ہی متوجہ رہتے ہیں، روحانی غذا کی طرف ان کی توجہ نہیں ہوتی، گویا کہ ان کی روح حقیقی مرجاتی ہے جس پر ملکی زندگی کی حیات موقوف تھی، اور ان پر حیوانیت غالب ہوجاتی ہے، یہ وہی ہیں جن کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿اُولٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ﴾ وہ لوگ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں، (یہ درحقیقت کافر لوگ ہیں یا گناہوں پر ہمیشہ قائم رہنے والے)

مرو در پے ہر چہ دل خواہدت　　　　کہ تمکین تن نور جاں کاہدت

دل کی ہر مراد کے پیچھے نہ چل　　　　کہ تیرے جسم کے پالنے سے تیری جان کا نور کم ہوجائے گا۔

ز دوران پسی نامرادی بری　　　　اگر ہر چہ باشد مرادت خوری

نفس کے پیچھے چلنے کے دوران تجھے نامرادی حاصل ہوگی جبکہ تیرا مقصد ہی (جانوروں کی طرح) صرف کھانا ہوگا

کند مرد را نفس امارہ خوار　　　　اگر ہوشمندی عزیزش مدار

نفس امارہ انسان کو ذلیل کرتا ہے،　　　　اگر تو عقلمند ہے تو اس کو عزیز نہ رکھ۔

دریغ آدمی زادہ پر محل　　　　کہ باشد چو انعام بل ھم اضل

انسان کی بلند محلات پر اڑان ختم ہوجائے گی　　وہ چوپاؤں کی طرح ہوگا، بلکہ اس سے بھی بھٹکا ہوا ہوگا۔

اور انسانوں کی دوسری قسم یہ ہے:

﴿وَمِنْھُمْ مُّقْتَصِدٌ﴾ اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو میانہ روی پر ہوتے ہیں، یہ وہ لوگ ہوں گے، جن کی روحانیت اور حیوانیت برابر ہوں گی، ہر ایک کے مطابق اسے غذا حاصل ہوگی، وہ نیک عمل بھی کرتے ہیں اور ذکر وعبادت بھی ان کو حاصل ہوتے ہیں یہ ہے روحانیت، اور وہ کھاتے پیتے بھی ہیں خواہش سے، اور کبھی ان سے گناہ صغیرہ بھی سرزد ہوتے رہتے ہیں جو ان کی نیکیوں سے ختم ہوتے رہتے ہیں، اور کبھی ان سے برے اعمال گناہ کبیرہ کی شکل میں سرزد ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو توبہ کی توفیق عطاء فرمادیتا ہے وہ توبہ کرتے ہیں ان کی توبہ کو قبول کرتے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ﴾ (سورۃ ھود، آیۃ نمبر ۱۱۴)

''بیشک نیکیاں برائیوں کو مٹادیتی ہیں۔'' (ان برائیوں سے مراد صغائر گناہ ہیں)

اور رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِھِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَیِّئًا عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ (سورۃ التوبہ، آیۃ نمبر ۱۰۲)

''اور کچھ وہ ہیں جو اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں، انہوں نے ملا رکھے ہوتے ہیں، اچھے عمل اور برے، قریب ہے اللہ تعالیٰ ان کی توبہ کو قبول کرلے، بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

دینی طلباء کرام راقم کے ترجمہ کو دیکھ کر اعتراض نہ کریں کہ ماضی کے صیغوں کا ترجمہ مضارع والا کیوں کیا ہے یہ ترجمہ عموم الفاظ کا لحاظ کرتے ہوئے کیا گیا ہے، خصوصی مورد کا لحاظ نہیں کیا گیا۔

انسانوں کی تیسری قسم یہ ہے:

﴿وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ﴾ ''اور بعض ان میں سے وہ ہیں جو نیکیوں میں سبقت لے جاتے ہیں'' یہ وہ لوگ ہیں جن کی روحانیت حیوانیت پر غالب ہوتی ہے، وہ روحانیت کی غذا کو زیادہ حاصل کرتے ہیں، یعنی ذکر وعبادت میں ان کا وقت زیادہ گزرتا ہے، حیوانیت کی غذا وہ کم استعمال کرتے ہیں یعنی طعام صرف زندگی کو برقرار رکھنے کیلئے کھاتے ہیں، وہ حیوانوں کی طرح صرف کھانے کی تمنا نہیں رکھتے، ان کا نفس مرجاتا ہے اور روحانیت کو قوت و غلبہ حاصل ہوتا ہے، ان تمام قسموں کا ارشاد ان آیات سے مل گیا، کیونکہ جس طرح حضرت یعقوب علیہ السلام کے متعلق ذکر فرمایا، ﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ﴾ ''ہر کھانا بنی اسرائیل کیلئے حلال تھا مگر وہ جو یعقوب علیہ السلام نے اپنے نفس پر حرام کیا۔'' اسی سے یہ مسئلہ سمجھ آگیا کہ اولیا عظام پر حلال کھانے مباح تھے، لیکن انہوں نے اپنے آپ پر خواہشات کو ترک کرتے ہوئے زندگی کی بقاء تک کھانوں کو باقی رکھا، لذات کو چھوڑ دیا۔ ﴿فَمَنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ سے اشارہ ان لوگوں کی طرف مل گیا جو کھانے پینا ہی مقصد حیات سمجھتے ہیں، رب تعالیٰ سے دور رہتے ہیں وہ درحقیقت ظالم ہیں۔

﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ سے تیسری قسم کی طرف اشارہ مل گیا کہ جس طرح ابراہیم علیہ السلام مشرکوں سے نہیں تھے ایسے ہی تم نیکیوں سے گناہوں کی شراکت نہ کیا کرو، اگر غلطی ہوجائے تو توبہ کرنا تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو مٹادے، اور یہ بتادیا کہ ابراہیم علیہ السلام کی محبت کے دعویدارو! انہوں نے تو زندگی بھر مہمان نوازی کی، امتحان کے وقت اپنی جان کو قربان کرنے کیلئے آگ میں جانا پسند کرلیا، اور امتحان کے وقت بیٹے کو ذبح کرنے کیلئے پیش کردیا تم بھی یہی راہ اختیار کرو تو اپنے دعوی میں سچے ہوگے کہ تمہیں ابراہیم علیہ السلام سے محبت ہے ورنہ تم اپنے دعوی میں جھوٹے ہوگے، اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ انسان کو گویا کہ یوں کہا گیا کہ تو سب کو چھوڑ کر صرف مجھے ہی خلیل بنا۔

اگر جز بحق میرود جادہ ات — در آتش فشانند سجادہ ات

اگر اللہ تعالی کے غیر کی طرف تیرا راستہ گیا تو آگ میں تیرا مصلی جھاڑ دیں گے۔

اتباع ملت ابراہیم کی علامت:

"فعلامة اتباع ملة ابراهيم هو الاطاعة للحق والتبری من كل دين سوى الاسلام ومحبة الاولياء وعداوة الاعداء"

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کی علامت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالی کا مطیع ہو، اور سوائے دین اسلام کے باقی باطل دینوں سے دور ہو جائے، اور اولیاء کرام کی محبت اسے حاصل ہو، اور وہ رب تعالی کے دشمنوں سے دور ہو۔

رب تعالی کے قرب کیلئے دل میں خلوص ضروری ہے:

ولو كان المرء آتیا بجميع الطاعات وليس فی قلبه خلوص المحبة فانما يضرب حديدا باردا والله تعالى لايحب القلب المشرک بمحبة غيره من شهوة اوغيرها"

اگر انسان تمام طاعات کو لائے لیکن اس کے دل کی محبت میں خلوص نہ ہو تو وہ ٹھنڈے لوہا کوٹ رہا ہے، اللہ تعالی کو وہ دل پسند نہیں جس میں اللہ کے بغیر کسی اور کی محبت ہو۔

حکایت: محمد ابن حسان رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں لبنان کے پہاڑوں میں پھر رہا تھا وہاں میں نے ایک جوان دیکھا جسے گرم ہوا کی لو نے جلا دیا ہے، وہ مجھے دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا، میں نے اسے کہا اے جوان مجھے کوئی نصیحت کرتا جا، اس نے کہا "احذره تعالى فانه غيور لايحب ان يرى فی قلب عبد سواه" اللہ تعالی سے ڈرو، وہ غیور ہے، وہ پسند نہیں کرتا کہ بندے کے دل میں اس کے غیر کی محبت ہو۔ (ماخوذ از روح البیان)

خیال رہے انبیاء کرام اور اولیاء کرام سے محبت رب تعالی کے غیروں کی محبت نہیں، بلکہ اللہ والوں سے محبت ہے، اللہ والوں سے محبت حقیقت میں اللہ تعالی کی محبت ہی ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ھُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ O (آیۃ نمبر ۹۶)

(1) بیشک سب میں پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کو مقرر ہوا وہ ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور سارے جہان کا راہنما۔ (کنزالایمان)

(2) بیشک سب سے پہلا گھر جو بنایا گیا لوگوں (کی عبادت) کیلئے، وہ ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا اور ہدایت دینے والا ہے سب جہان والوں کیلئے۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول:

روایت کی گئی کہ جب قبلہ کعبہ کو بنالیا گیا تو یہود نے نبی کریم ﷺ کی نبوت میں طعن کیا، اور انہوں نے کہا بیشک بیت المقدس کعبہ شریف سے افضل ہے، اور زیادہ حق یہی ہے کہ قبلہ بیت المقدس ہی ہونا چاہیے کیونکہ بیت المقدس کعبہ سے پہلے بنایا گیا، اور وہ محشر کی زمین ہے، اور وہ انبیاء کرام کی ہجرت کا مقام ہے، اور وہ انبیاء کرام کا قبلہ ہے، وہ مقدس زمین میں ہے، اللہ تعالی نے اس میں تمام جہانوں کیلئے برکتیں رکھی ہیں، اس میں وہ پہاڑ ہے جس پر اللہ تعالی نے موسی علیہ السلام سے کلام کیا، اس لئے بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ بنانا درست نہیں۔ یہود کے ان اقوال پر اللہ تعالی نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا، اور ان کا رد فرمایا کہ تمہارے اقوال درست نہیں کیونکہ سب سے پہلے عبادت کیلئے بننے والا گھر کعبہ شریف ہے جو مکہ میں ہے، سب سے زیادہ برکتیں بھی اسی میں ہیں، اور یہی تمام جہانوں کیلئے ہدایت ہے۔ (روح البیان)

اس آیۃ کریمہ اور اگلی آیۃ کریمہ میں کعبہ شریف کی افضلیت کو اللہ تعالی نے تفصیل سے بیان فرمایا ہے، اس کی وضاحت انشاء اللہ بیان کی جارہی ہے۔

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ﴾

"بیشک سب سے پہلا گھر جو بنایا گیا لوگوں (کی عبادت) کیلئے وہ ہے جو مکہ میں ہے۔"

روایات اور ان میں تطبیق:

❁ اخرج ابن المنذر و ابن ابی حاتم من طریق الشعبی عن علی بن ابی طالب فی قولہ ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ قال کانت البیوت قبلہ ولکنہ کان اول بیت وضع لعبادۃ اللہ"

ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے شعبی کی روایت سے حضرت علی بن ابی طالب ﷺ کی روایت کو ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىۡ بِبَكَّةَ﴾ (بیشک سب سے پہلا گھر جو لوگوں کیلئے بنایا گیا وہ مکہ میں ہے) اس کو مطلب یہ ہے کہ عبادت کیلئے سب سے پہلے بننے والا گھر کعبہ شریف ہے جو مکہ میں ہے اگر چہ لوگوں کے رہائشی گھر اس سے پہلے بھی موجود تھے۔ (از درمنثور)

❁ **واخرج ابن جريج عن الحسن فی الآية قال ان اول بيت وضع للناس يعبد الله فيه للذی ببكة"**

ابن جریج نے حسن سے اس آیہ کریمہ کے متعلق ذکر فرمایا کہ بیشک سب سے پہلا گھر لوگوں کیلئے جو بنایا گیا کہ لوگ اس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں وہ مکہ میں ہے۔ (از درمنثور)

❁ **واخرج ابن ابی شيبة واحمد وعبد بن حميد والبخاری والمسلم وابن جرير والبيهقی فی الشعب عن ابی ذر قال قلت يارسول الله الی مسجد وضع اول قال المسجد الحرام قلت ثم ای قال المسجد الاقصی قلت كم بينهماقال اربعون سنة"**

ابن ابی شیبہ اور احمد اور عبد بن حمید اور بخاری اور مسلم اور ابن جریر اور بیہقی نے شعب ایمان میں حضرت ابوذر (غفاری) ﷺ سے روایت ذکر کی آپ فرماتے ہیں میں نے کہا یارسول اللہ کونسی مسجد سب سے پہلے بنائی گئی؟ تو آپ نے فرمایا مسجد حرام، میں نے کہا پھر کونسی؟ آپ نے فرمایا پھر مسجد اقصی، میں نے کہا ان دونوں کے درمیان کتنا عرصہ کا فرق ہے؟ آپ نے فرمایا چالیس سال۔ (از درمنثور)

❁ **واخرج ابن المنذر عن ابی هريرة قال ان الكعبة خلقت قبل الارض بالفی سنة وهی من الارض انما كانت حشفة علی الماء عليهاملكان من الملئكة يسبحان فلماارادالله ان يخلق الارض دحاهامنهافجعلهافی وسط الارض"**

ابن منذر نے حضرت ابوھریرۃ ﷺ سے روایت بیان فرمائی کہ کعبہ شریف کو زمین سے دو ہزار سال پہلے پیدا کیا گیا، جب کہ وہ پانی پر گول جزیرہ جھاگ کی صورت میں تھا، فرشتے اس کو تیراتے رہتے تھے، جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا زمین کو پیدا فرمانے کا تو اسے پھیلا دیا تو اسے وسط زمین میں رکھ دیا۔ (از درمنثور)

❁ **واخرج ابن جرير وابن المنذر والطبرانی والبيهقی فی الشعب عن ابن عمرو قال خلق الله البيت قبل الارض بالفی سنة وكان اذاكان عرشه علی الماء زبدة بيضاء وكانت الارض تحته كانهاحشفة فدحيت الارض من تحته"**

حضرت ابن عمرو بن العاص فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو زمین سے دو ہزار سال پہلے پیدا کیا، جبکہ عرش پانی پر سفید

جھاگ کی صورت میں تھا، زمین اس کے نیچے چھوٹا سا گول جزیرہ نما تھی، اسی کے نیچے سے زمین کو پھیلایا گیا۔ (از درمنثور)

❁ واخرج البیھقی فی الشعب عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ اول بقعة وضعت فی الارض موضع البیت ثم مھدت منھا الارض وان اول جبل وضعه اللہ علی وجه الارض ابو قبیس ثم مدت منه الجبال"

بیہقی نے شعب ایمان میں حضرت ابن عباس ؓ کی روایت کو ذکر فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک سب سے پہلے زمین کا ٹکڑا بیت اللہ شریف کی جگہ رکھا گیا، پھر اسی سے زمین کو پھیلا گیا، اور بیشک پہلا پہاڑ اللہ تعالی نے زمین پر ابو قبیس رکھا پھر اس سے اور پہاڑ پھیلا دیئے گئے۔ (از درمنثور)

روایات میں بظاہر اختلاف:

ایک روایت میں آ رہا ہے کہ کعبہ شریف کو زمین سے دو ہزار سال پہلے پیدا کیا گیا، اور دوسری روایت میں آ رہا ہے کہ کعبہ شریف اور بیت المقدس میں چالیس سال پائے جاتے ہیں، ان میں تطبیق کیسے پائی جائے، بظاہر تو تعارض نظر آتا ہے۔

وجۂ تطبیق: ایک ہے کعبہ شریف کی ابتدائی تخلیق وہ یہ ہے کہ پہلے تمام پانی تھا، پانی پر ایک جھاگ پیدا کی گئی جو گول تھی، بہت چھوٹا سا ایک جزیرہ نظر آنے لگا، اسی جھاگ کو زمین کے وسط میں رکھا گیا، اور وہاں سے ہی زمین کو پھیلایا گیا، یہ کعبہ شریف کی جگہ ہے جہاں سے زمین کو پھیلایا گیا، جھاگ زمین کی تخلیق اور پھیلاؤ سے دو ہزار سال پہلے پیدا کی گئی، یہ کعبہ شریف کی جگہ کی تخلیق ہے، پھر کعبہ شریف حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ میں تعمیر ہوا۔ چالیس سال کا فاصلہ کعبہ شریف کی اس تعمیر کی بات ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر فرمایا، اور بیت المقدس کی اس تعمیر کی بات ہے جو حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے کی، ورنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کعبہ شریف کی تعمیر اور بیت المقدس کی تعمیر جو حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے کی ان میں بہت زیادہ فاصلہ پایا گیا۔ اگر چہ اسی سؤال کا جواب "کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کعبہ شریف کی تعمیر اور حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی بیت المقدس کی تعمیر میں تو بہت زیادہ فاصلہ ہے، رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کہ چالیس سال کا فرق ہے، یہ کیسے صحیح ہے؟

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے یوں جواب دیا:

"واجیب بان الوضع غیر البناء والسؤال عن مدة مابین وضعیھما لاعن مدة مابین بناء یھما"

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ:

"وضع" اور چیز ہے، اور "بناء" (تعمیر) اور چیز ہے، نبی کریم ﷺ سے سوال وضع کے متعلق تھا "بناء" کے متعلق سوال نہیں تھا، اس لئے آپ نے جو چالیس سال کا ذکر فرمایا اس سے مراد کعبہ شریف کی جگہ کی تخلیق اور بیت المقدس کی جگہ کی تخلیق ہے، جن کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ ہے۔ تاریخ کعبہ تفصیلی طور پر پہلے پارہ نجوم الفرقان کی جلد سوم میں بیان ہو چکی ہے، تاہم اختصار کے طور روح المعانی کے ان الفاظ کو مدنظر رکھا جائے۔

"وحكى ان بناء الملائكة له كان من ياقوته حمراء ثم بناء آدم ثم شيث ثم ابراهيم ثم العمالقة ثم جرهم ثم قصي ثم قريش ثم عبد الله بن الزبير ثم الحجاج"

بیان کیا گیا ہے کہ کعبہ شریف کو ملائکہ نے سرخ یاقوت سے بنایا، پھر آدم علیہ السلام نے تعمیر کی، پھر شیث علیہ السلام پھر ابراہیم علیہ السلام نے پھر قبیلہ عمالقہ نے پھر جرہم قبیلہ نے، پھر نبی کریم ﷺ کے اجداد سے قصی نے، پھر قریش نے، پھر عبداللہ بن زبیر نے، پھر حجاج نے تعمیر کی۔ (روح المعانی)

"بكه" کی وجہ تسمیہ:

بک یبک (ن) مزاحمت کرنا "تباک القوم" لوگوں کا بھیڑ کرنا، ہجوم کرنا (المنجد) اس معنی کی مناسبت سے مکہ شریف کو بکہ کہنے کی وجہ پر یہ روایات دلالت کر رہی ہیں۔

❁ **"واخرج سعيد بن منصور وابن جرير والبيهقي في الشعب عن مجاهد قال انما سميت بكة لان الناس يتباكون فيها الرجال والنساء يعني يزدحمون"**

سعید بن منصور اور ابن جریر اور بیہقی نے شعب ایمان میں مجاہد کی روایت نقل کی کہ مکہ شریف کو بکہ اس لئے کہا گیا ہے کہ وہاں جانے اور طواف وغیرہ میں مرد اور عورتیں ازدحام کرتے ہیں۔ (از در منثور)

(بھیڑ کرتے ہیں، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں) "بک یبک بکا" کا اور معنی ہے "پھاڑنا، فسخ کرنا" (المنجد) اس معنی کے لحاظ پر ایک اور روایت دیکھئے۔

❁ **واخرج ابن ابی حاتم عن محمد بن زيد بن مهاجر قال انما سميت بكة لانها كانت تبك الظلمة"**

ابن ابی حاتم نے محمد بن زید بن مہاجر سے روایت نقل کی کہ مکہ کو بکہ اس لئے کہا گیا ہے کہ جن لوگوں نے ظلم کے طور پر کعبہ شریف کو برباد کرنے کی کوشش کی ان کو تباہ و برباد کر دیا (یعنی چیر پھاڑ دیا)

اس معنی کو علامہ بیضاوی نے خوبصورت انداز میں یوں تحریر کیا "او من بكها اذا دقه فانها تبك اعناق

الجبابرۃ ''بکہ کہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ "بکھا" سے معنوی طور پر ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے توڑ دینا، یہ بھی جابروں اور ظالموں کی گردنوں کو توڑ دیتا ہے اس لئے اسے "بکہ" کہا گیا۔ (بیضاوی)

''تدقھالم یقصدھا جبار الاقصمہ اللہ عز وجل'' جن جابروں اور ظالموں نے ارادہ کیا کعبہ شریف کو نقصان پہچانے کا اللہ تعالی نے ان کی گردنوں کو توڑ دیا۔ بظاہر اس پر یہ وہم پیش کیا گیا کہ حجاج نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو مسجد حرام میں روک لیا تھا، جبل ابی قبیس پر منجنیق نصب کئے، اور وہاں سے پتھروں کے گولے برسائے گئے جو مسجد حرام میں گرے، مسجد حرام کو نقصان پہنچا لیکن حجاج بن یوسف کی گردن نہیں ٹوٹی، تو یہ کہنا کیسے درست ہے کہ "بکہ" جابروں کی گردنوں کو توڑ دیتا ہے؟ اس کا جواب یہ دیا گیا:

''فلیس ذلک اضرار بالبیت وقصدا بالسوء لان مقصود الحجاج کان اخذ عبداللہ''

کہ حجاج بن یوسف کا مقصد بیت اللہ شریف کو نقصان پہچانا نہیں تھا، بلکہ اس کا مقصد حضرت عبداللہ بن زبیر کو پکڑنا تھا، اگر وہ بیت اللہ شریف کو نقصان پہچانے کا ارادہ رکھتا تو اس کی گردن کو وہیں توڑ دیا جاتا۔

(از روح البیان)

مقام توجہ!

کعبہ شریف اور اس کے متصل اردگرد کو "بـــکـــہ" کہا گیا ہے اور باقی مقامات کو مکہ کہا گیا ہے، اس پر چند روایات ملاحظہ ہوں۔

❁ واخرج ابن ابی شیبۃ وعبد بن حمید وابن ابی حاتم عن عکرمۃ قال البیت وماحولہ بکۃ وماوراء ذلک مکۃ''

حضرت عکرمہ ؓ فرماتے ہیں بیت اللہ شریف اور اس کا اردگرد "بکۃ" ہے، اور اس کے سواء مقامات مکہ ہیں۔ (از درمنشور)

❁ واخرج سعید بن منصور وعبدبن حمید وابن ابی شیبۃ وابن جریر وعن ابی مالک الغفاری قال بکۃ موضع البیت ومکۃ ماسوی ذلک''

ابو مالک غفاری فرماتے ہیں بیت اللہ شریف کے مقام کو ''بکہ'' کہا جاتا ہے، اور اس کے سواء مقامات کو مکہ (از درمنشور)

❁ واخرج ابن حریر عن ابن شھاب قال بکۃ البیت والمسجد ومکۃ الحرم کلہ''

حضرت ابن شہاب کی روایت میں یہ ہے کہ بیت اللہ شریف اور مسجد حرام بکۃ ہیں اور باقی تمام حرم مکہ ہے۔ (از درمنشور)

❁ واخرج عبد بن حمید عن مجاھد قال بکۃ الکعبۃ ومکۃ ماحولھا''

حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ کعبہ شریف کو بکہ کہا جاتا ہے، اور اس کے سواء باقی مقامات مکہ ہیں۔ (از در منثور)

راقم کی سوچ میں ابتدائی طور پر تو صرف بیت اللہ شریف یا مسجد حرام کو ہی بکہ کہا گیا، اور اس کے سواء مقامات کو مکہ کہا گیا، پھر عرف عام میں زیادہ مقام پر بکہ بولا جانے لگا، اس پر ایک اور روایت دیکھئے۔

❁ **واخرج ابن ابی حاتم عن ابن عباس قال مکة من الفج الی التنعیم وبکة من البیت الی التنعیم"**

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مقام فج سے لے کر مقام تنعیم تک مکہ ہے، اور مقام تنعیم سے لے کر بیت اللہ شریف تک بکہ ہے۔ (از در منثور)

اور راقم کی سوچ یہ ہے کہ بعد میں عرف عام میں مکہ اور بکہ میں کوئی فرق نہیں کیا گیا، پورے شہر کو مکہ بھی کہا گیا اور بکہ بھی کہا گیا، اس پر ایک روایت مشاہدہ ہو۔

❁ **واخرج ابن جریر عن الضحاک قال بکة ھی مکة"**

ابن جریر نے ضحاک سے روایت کیا ہے کہ بکہ وہ مکہ ہی ہے۔ (از در منثور)

یعنی بکہ اور مکہ ایک ہی شہر کے نام ہیں، راقم نے اپنی سمجھ کے مطابق محاکمہ تیار کر دیا ہے۔ "واللہ اعلم بالصواب"

"بکہ بمعنی ہجوم کرنا" کے مطابق اور روایات:

❁ **واخرج ابن ابی شیبة وعبد بن حمید والبیھقی عن مجاھد قال انماسمیت بکة لان الناس یبک بعضھم بعضافیھاوانه یحل فیھامالا یحل فی غیرھا"**

ابن ابی شیبۃ اور عبد بن حمید اور بیہقی نے مجاہد سے روایت نقل کی کہ بکہ اس لئے نام رکھا گیا کہ بعض لوگ بعض پر ہجوم کرتے ہیں، کیونکہ اس میں بعض وہ کام جائز ہو جاتے ہیں جو دوسری جگہ پر جائز نہیں ہوتے۔ (از در منثور)

❁ **قال قتادہ رأیت محمد بن علی الباقر یصلی فمرت امرأة بین یدیه فذھبت ادفعھافقال دعھا فانھاسمیت بکة لان الناس یبک بعضھم بعضاتمر المرأة بین یدی الرجل وھو یصلی والرجل بین یدی المرأة وھی تصلی لاباس بذلک"**

قتادہ کہتے ہیں میں محمد بن علی باقر کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، ایک عورت ان کے سامنے سے گزرنے لگی تو میں اسے روکنے لگا آپ نے مجھے (اشارہ سے) کہا اس کو چھوڑ دیں۔ اس مقام کا نام بکہ رکھا گیا، کیونکہ لوگ بعض بعض پر ہجوم کرتے ہیں عورت مرد کے نماز پڑھتے ہوئے آگے سے گذر جاتی ہے، مرد عورت کے آگے سے گذر جاتا ہے، حالانکہ عورت نماز پڑھ رہی ہوتی ہے، یہاں کوئی حرج نہیں۔ (شیخ زادہ)

طلباء کے فائدہ کیلئے:

بکہ ایک لغت ہے مکہ میں، یعنی میم کی جگہ باء کو استعمال کیا گیا ہے، عرب حضرات کئی جگہ میم کے مقام پر باء کو استعمال کرتے ہیں "لازب" (چمٹنا) کی جگہ "لازم" اور تیل والی جگہ کو نمیط کہا جاتا ہے، اس کی جگہ " نبیط " بھی استعمال کیا جاتا ہے، اور امر راتب کی جگہ امر راتم بھی استعمال کرتے ہیں " سمد رأسه " (سر کی گوند) کی جگہ سبد راسه بھی استعمال کرتے ہیں۔ (تفسیر ابی السعود)

مکہ کہنے کی وجہ:

❁ وامامكة سميت بذلك لقلة مائهامن قول العرب مك الفصيل ضرع امه وامتكه اذاامتص كل مافيه من اللبن"

مکہ شریف کو مکہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں پانی کم ہوتا تھا اس لئے اسے مکہ کہہ لیا گیا، یہ لفظ ماخوذ ہے مک الفصيل اور امتک الفصيل سے جب اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے تھنوں سے سارا دودھ پی لے۔ (معالم التنزیل للبغوی)

مکہ کہنے کی ایک اور وجہ:

"وقيل لانهاتمك الذنوب اى تزيلها" بعض حضرات نے کہا مکہ کو اس لئے مکہ کہا جاتا ہے کہ یہ وہاں جا کر، عبادت کرنے والوں کے گناہوں کو زائل کرتا ہے۔ (خازن)

مکہ کا نام ام القری:

"وسميت ام القرى لانهااصل كل البلدة " مکہ شریف کو ام القری بھی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ تمام شہروں کا اصل ہے۔ (خازن)

مکہ کا نام ضراح:

قاموس میں ذکر کیا گیا ہے "ان الضراح البيت المعمور فى السماء الرابعة " ضراح اصل میں چوتھے آسمان پر بیت المعمور کو کہا جاتا ہے۔ (مدارک التنزیل للنسفی)

حضرت آدم علیہ السلام نے فرشتوں سے کعبہ شریف کی بنیادوں کو تعمیر کرایا، پھر اس کے اوپر فرشتوں نے بیت المعمور کو رکھ دیا جو بعد میں طوفان نوح کے وقت اٹھا لیا گیا ہے، اصل میں "ضراح" کعبہ کو کہا گیا، پھر مکہ کو بھی ضراح کہا گیا۔

مکہ کے نام:

مکہ ، بکہ ، البیت العتیق ، البیت الحرام ، البلد الامین ، ام القری ،القادس (کیونکہ یہ گناہوں سے پاک کرتا ہے)المقدسہ،الحاطمة ،الرأس ، البلدة ، البنیة، الکعبة ۔ (ابن کثیر وصابونی)

فائدہ جلیلہ: کعبہ شریف کی تعمیر کا حکم دینے والا اللہ تعالی ، اور رب تعالی کا پیغام پہنچانے والا اور(آدم علیہ السلام کے زمانہ کی بنیادوں کی نشاندہی کرنے والا)اور انجینئر جبریل علیہ السلام،اور تعمیر کرنے والے حضرت ابراہیم خلیل اللہ اوران کی معاونت کرنے والے حضرت اسماعیل علیہ السلام،یہی وجہ ہے"قیل لیس فی العالم بناء اشرف من الکعبة " کہ جہان میں کعبہ شریف سے اشرف اور بلند و بالا شان والا کوئی اور مقام نہیں تیار کیا گیا۔(روح البیان)

﴿مُبَارَکًا﴾ "برکت والا"

بیشک پہلا گھر جو بنایا گیا ہے لوگوں (کی عبادت) کیلئے ،وہ جو مکہ میں ہے، برکت والا ہے۔ "مبارکا " پر نصب ہے کیونکہ یہ حال واقع ہورہا ہے،مطلب یہ ہے کہ بیت اللہ شریف کو برکت والا بنایا ہے اس میں اجر وثواب زیادہ رکھا گیا ہے۔بعض عبادات تو ادا ہی مکہ میں ہوتی ہیں جیسے حج اور ھدی کا ذبح کرنا ،اور عمرہ ادا کرنا ،اور بعض عبادات میں وہاں زیادہ ثواب ہوتا ہے جو دوسرے مقامات پر نہیں ہوتا جیسے وہ ادا کی ہوئی نماز اور روزہ اور اعتکاف کا بنسبت دوسرے مقاموں کے زیادہ ثواب رکھتا ہے۔

"ومن ثم قال ابو یوسف رحمه الله من نذر ان یصلی فی المسجد الحرام رکعتین لایجزئی عنه ان یصلی فی غیره "

یہی وجہ ہے کہ امام یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے نذر مانی کہ وہ دو رکعت مسجد حرام میں ادا کرے گا تو اس کیلئے جائز نہیں کہ یہ دو رکعت کہیں اور ادا کرے۔

❁ **لحدیث انس بن مالک قال قال رسول اللهﷺ صلوة الرجل فی بیته بصلوة،وصلوته فی مسجد القبائل بخمس وعشرین صلوة وصلوته فی المسجد الذی یجمع فیه بخمس مائة صلوة وصلوته فی المسجد الاقصی بالف صلوة وصلوته فی مسجدی بخمسین الف سنة وصلوته فی المسجد الحرام بمائة الف صلوة** (رواه ابن ماجة)

امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے اپنے موقف پر یہ حدیث پیش کی جو ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مرد کی نماز گھر میں ادا کرنے پر ایک نماز کا ثواب رکھتی ہے ، اور اپنے قبیلہ کی مسجد

میں (جماعت سے ادا کرنے پر) پچیس درجہ اسے ثواب حاصل ہوگا، اور جامع مسجد میں نماز ادا کرنے پر پانچ سو نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا، اور مسجد اقصی میں نماز ادا کرنے پر ایک ہزار نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا، اور میری مسجد (مسجد نبوی) میں نماز ادا کرنے سے پچاس ہزار نمازوں کا اسے ثواب حاصل ہوگا، اور مسجد حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا۔ (ماخوذ از مظہری و در منشور)

(خیال رہے کہ ایک روایت میں مسجد اقصی میں نماز ادا کرنے سے دس ہزار نماز کا ثواب بھی مذکور ہے)

❁ **وروی الطحاوی عن عطاء بن الزبیر قال ﷺ صلوۃ فی مسجدی ھذاافضل من الف صلوۃ فیماسواہ من المساجد الاالمسجد الحرام وصلوۃ فی المسجد الحرام افضل من مائۃ صلوۃ فی ھذا"**

طحاوی نے عطاء بن زبیر سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری اس مسجد میں نماز ادا کرنا اس کے سواء مساجد میں نماز ادا کرنے سے ہزار درجہ افضل ہے سوائے مسجد حرام کے، کیونکہ مسجد حرام میں نماز ادا کرنا میری مسجد میں نماز ادا کرنے سے سو مرتبہ افضل ہے۔ (ماخوذ از مظہری)

امام ابو حنیفہ وامام محمد رحمہما اللہ کا موقف:

آپ فرماتے ہیں یہ مراتب جو نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائے ہیں، ان کا تعلق فرضی نمازوں سے ہے نفلی نمازوں سے نہیں، تاکہ ایک اور حدیث ان فضائل والی حدیثوں کے متعارض نہ ہو، اس لئے کہ فضائل والی احادیث میں گھر کی نسبت مسجد میں نماز ادا کرنا افضل قرار دیا گیا ہے، حالانکہ دوسری حدیث میں نوافل گھر ادا کرنا افضل قرار دیا گیا ہے، وہ حدیث یہ ہے۔

❁ **عن زید بن ثابت قال قال رسول اللہ ﷺ افضل الصلوۃ صلوۃ المرء فی بیتہ الا المکتوبۃ"** (رواہ البخاری ومسلم)

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مرد کا گھر نماز ادا کرنا افضل ہے سوائے فرض نمازوں کے۔ (از مظہری)

حدیث شریف سے واضح ہوگیا کہ فرض نماز مساجد میں ادا کرنا افضل ہے اور نوافل گھر میں ادا کرنا افضل ہیں، یہی حال مسجد اقصی، مسجد نبوی اور مسجد حرام کا بھی ہے۔ "واللہ اعلم بالصواب"

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ اگر آرام وسکون سے نوافل گھر ادا کر سکے تو گھر ادا کرنا بہتر ہے، اگر گھر مسجد کی

طرح خشوع وخضوع نہ پایا جائے تو مسجد میں ادا کرنا بہتر ہے۔

واخرج الازرقی والطبرانی فی الاوسط عن جابر بن عبدالله قال قال رسول الله ﷺ هذاالبيت دعامة الاسلام من خرج يؤم هذاالبيت من حاج او معتمر كان مضموناعلى الله ان قبضه ان يدخله الجنة وان رده ان يرده باجر اوغنيمة"

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ بیت اللہ شریف اسلام کا ستون ہے، جو شخص اس بیت اللہ شریف کے ارادہ سے حج یا عمرہ کیلئے نکلا اور اس پر وفات آ گئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پر لے رکھا ہے کہ اسے جنت میں داخل کر دے، اور اگر وہ لوٹ آیا تو اللہ تعالیٰ اسے عظیم اجر وثواب عطا فرمائے گا۔

وروى ابن الجوزی فی فضائل مكة عن عبدالله بن عدی بن الحمراء انه سمع رسول الله ﷺ يقول وهو واقف بالحزورة فی سوق مكة والله انک لخير ارض الله واحب ارض الله الى الله عزوجل ولولا انی خرجت منک ماخرجت"

ابن جوزی نے فضائل مکہ میں عبداللہ بن عدی بن حمراء سے روایت ذکر کی کہ بیشک انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا جبکہ آپ مکہ کے بازار مکہ حزوراء میں کھڑے تھے "قسم ہے اللہ تعالیٰ کی (اے بیت اللہ) بیشک اللہ کی زمین میں سے تو بہتر ہے، اور اللہ کی زمین میں سے تو اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے، اگر میں نے تجھ سے ہجرت نہ کرلی ہوتی تو میں اب تجھے چھوڑ کر نہ جاتا۔ (منقول از مظہری)

"وكذاروى ابن الجوزی عن ابی هريرة مرفوعا" اسی طرح ابن جوزی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی یہی حدیث مرفوعاً ذکر کی ہے۔ (مظہری)

کعبہ شریف کی فضیلت کی چند وجوہ:

(۱) کعبہ شریف کی عمارت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنائی جبکہ آپ کے ساتھ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے اور بیت المقدس کی تعمیر حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں سے کرائی۔

"ولا شک ان الخليل اعظم درجة واكثر منقبة من سليمان عليه السلام فمن هذاالوجه يجب ان تكون الكعبة اشرف من بيت المقدس"

جب یقینی طور پر یہ واضح ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا درجہ بلند ہے اور آپ کے فضائل زیادہ ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام سے تو اسی وجہ سے حضرت خلیل اللہ کا تعمیر کردہ کعبہ افضل ہے بیت المقدس سے۔

(۲) کعبہ شریف کا متصل مقام ابراہیم ہے، مقام ابراہیم کی وجہ سے کعبہ شریف کو افضلیت حاصل ہے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بہت بڑی نشانی ہے، مقام ابراہیم یہ پتھر ہے جس پر ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوتے تو یہ نرم ہو جاتا، آپ کے قدموں کے نشان اس میں قائم ہو گئے، آپ نے جب اس سے قدم ہٹائے تو اس میں وہی پتھر کی سختی آ گئی

"فهذه انواع من الآيات العجيبة والمعجزات الباهرة اظهرها الله سبحانه في ذلك الحجر" یہ آیات عجیبہ اور معجزات باہرہ (روشن) اللہ تعالیٰ نے اس پتھر قائم میں کر دیئے۔

(۳) صدیاں بیت گئیں، لاکھوں کی تعداد میں ہر سال لوگ حج کرتے ہیں، مقام منیٰ میں جمرات کو ماری جانی والی کنکریاں آج تک ختم نہیں ہوئیں۔

"وقد جاء في الآثار ان من كان حجة مقبولة رفعت حجارة جمراته الى السماء"
روایات میں آتا ہے کہ جس شخص کا حج مقبول ہو، اسکی جمرات کو ماری جانے والی کنکریاں آسمانوں کی طرف اٹھائی جاتی ہیں۔

(۴) پرندے اکھٹے جماعت (جھنڈ) کی شکل میں اڑتے آتے ہیں، لیکن کعبہ شریف کے قریب پہنچ کر دائیں، بائیں ہو جاتے ہیں، کعبہ شریف کے اوپر سے نہیں اڑتے۔

(۵) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعاء کی ﴿رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا﴾ " اے میرے رب اس مقام کو امن والا شہر بنا دے" رب تعالیٰ نے اس دعاء کو شرف قبولیت بخشا، یہی وجہ ہے کہ وہاں کوئی درندہ کسی جانور کو شکار نہیں کرتا، "وايضا كل من سكن مكة امن من النهب والغارة" اور اسی دعاء کا یہ اثر آج تک جاری ہے کہ وہاں رہنے والے چوری، ڈاکہ، لوٹ مار سے محفوظ ہیں۔

(۶) ابرہہ اشرم نے جب ایک لشکر کی قیادت کی کہ (معاذ اللہ) کعبہ کو شہید کر دے تو قریش اس کے مقابلہ سے عاجز آ گئے کیونکہ وہ ہاتھیوں پر سوار تھے اور مسلح تھے، قریش نے مکہ کو چھوڑ دیا اور کعبہ کو ان کیلئے خالی کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے مقابلہ کیلئے چھوٹے چھوٹے پرندوں (ابابیل) کو بھیجا جو جماعت بعد جماعت آ رہے تھے، حالانکہ وہ بہت چھوٹے چھوٹے پرندے تھے اور ان کی چونچوں میں چھوٹے چھوٹے پتھر تھے جو جہنم کی آگ سے تیار کئے گئے تھے، ان کے ذریعے ہی انہیں ہلاک کرا دیا۔

"وهذه آية باهرة دالة على شرف الكعبة وارهاص لنبوة محمد ﷺ"
یہ واضح نشانی ہے جو کعبہ کی بزرگی پر دلالت کر رہی ہے اور نبی کریم ﷺ کے اعلان نبوت سے پہلے یہ آپ کا معجزہ ہے جسے ارہاص کہا جاتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

عجیب حکمت:

اللہ تعالیٰ نے کعبہ شریف کو ایسی وادی میں رکھا جہاں کھیتی باڑی نہیں ہوسکتی، اس میں چند حکمتیں ہیں۔

(۱) ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہاں کے رہنے والوں اور کعبہ شریف کے خدام کو دنیا کے اسباب سے تعلق توڑ کر صرف اپنی ذات پر توکل کرنے کا حکم دیا۔

(۲) دوسری حکمت یہ ہے کہ وہاں جابر لوگ اور بادشاہ قابض نہ ہوجائیں، کیونکہ وہ تو عیش وعشرت چاہتے ہیں جب ان کو دنیا کی آسائش وہاں نظر نہیں آئے گی تو وہاں مستقل طور پر نظر نہیں ٹھہرائیں گے، بلکہ اس جگہ کو وہ چھوڑ دیں گے "فالمقصود تنزیه ذلک الموضع عن لوث وجو د اهل الدنیا' مقصد یہی تھا کہ اس جگہ کو دنیاداروں کے ملوث ہونے سے بچایا جائے۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ اس جگہ کو خالص عبادت اور زیارت کے لئے مختص کرنا مقصود تھا کہ وہ تجارتی منڈی نہ بن جائے، بلکہ ضرورت کے مطابق اشیاء کی خرید وفروخت کی جائے۔

(۴) چوتھی حکمت اس میں یہ پائی گئی کہ وہاں کی زمین کو کھیتی باڑی کے قابل نہیں رکھا گیا تاکہ لوگوں کو یہ اشارہ دیا جائے کہ تم فقر کو ترجیح دو، اس سے تمہاری دنیا اور تمہاری آخرت امن وحفاظت میں ہوگی۔

(۵) پانچویں حکمت یہ پائی گئی کہ کعبہ شریف جس زمین میں ہے اسے کھیتی باڑی سے خالی رکھا گیا جس سے ایمان والوں کو یہ بتادیا گیا کہ اگر تم رب تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنے دل کو اغیار کی محبت سے خالی رکھو تاکہ اس میں نور ایمان ضوفگن ہوسکے۔

﴿هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ "ہدایت ہے جہان والوں کیلئے۔"

کعبہ شریف کے ہدایت ہونے کا مطلب کیا ہے؟ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ کعبہ شریف قبلہ ہے، اس کی وجہ سے لوگوں کو نماز کی ہدایت ملتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کعبہ شریف کی برکات وفضائل سے رب تعالیٰ کے صانع ومختار ہونے کا علم حاصل ہوتا ہے، اور نبی کریم ﷺ کی صداقت کا پتہ چلتا ہے، تمام وہ دلائل اور نشانیاں جن سے نبی کریم ﷺ کی صداقت کا پتہ چلتا ہے ان سے ہی اللہ تعالیٰ کے صانع ومختار، عالم وقدیر، حکیم وغنی ہونے کا علم حاصل ہوتا ہے، اس لحاظ پر کعبہ شریف ﴿هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ کعبہ شریف جنت کی ہدایت دیتا ہے، اس لئے کہ جو لوگ کعبہ شریف کی طرف متوجہ ہوکر نماز ادا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو جنت عطاء فرماتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ O (آیۃ نمبر ۹۷)

(1) اس میں کھلی نشانیاں ہیں ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ اور جو اس میں آئے امان میں ہو اور اللہ کیلئے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا ہے جو اس تک چل سکے اور جو منکر ہو تو اللہ سارے جہان سے بے پرواہ ہے۔ (کنزالایمان)

(2) اس میں نشانیاں کھلی ہیں، ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ، اور جو شخص داخل ہو اس میں ہوگا امن میں، اور اللہ کیلئے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا ہے، جو طاقت رکھے اس کی طرف راہ پانے کی، اور جس نے کفر کیا تو بیشک اللہ بے پرواہ ہے جہان والوں سے۔ (نجوم الفرقان)

مختصر مطلب تقریبا ترجمہ سے ہی واضح ہے کہ کعبہ شریف اور اس کے مضافات میں بڑی کھلی نشانیاں موجود ہیں، وہاں مقام ابراہیم ہے، اور جو شخص وہاں داخل ہو جاتا ہے وہ امن میں ہو جاتا ہے، اور جس شخص کو وہاں تک جانے کی طاقت حاصل ہو، اس پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالی کیلئے بیت اللہ شریف کا حج کرے یعنی بیت اللہ شریف کا طواف کرے، کیونکہ طواف کرنا حج کے ارکان میں ایک رکن ہے، اور جس شخص نے حج کی فرضیت کا انکار کر دیا تو وہ کافر ہو جائے، اس کے کفر کا اسے ہی نقصان ہوتا ہے، رب تعالی کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ وہ تو جہان والوں سے بے پرواہ ہے۔

﴿فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ﴾

''اس میں نشانیاں کھلی ہیں، ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ۔''

یہاں دو احتمال پائے گئے ہیں، ایک یہ کہ کھلی نشانیوں سے مراد وہی ہوں جن کو فضیلت کعبہ میں ذکر کیا گیا ہے یعنی خوف کرنے والے کو وہاں امن مل جاتا ہے، مریض کو شفاء حاصل ہوتی ہے، کعبہ شریف کو شہید کرنے کی غرض سے آنے والے تباہ و برباد ہوتے ہیں، کعبہ شریف کے اوپر سے پرندے نہیں گزرتے، وغیرھا'' اس لحاظ پر ''مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ'' ماقبل کا بیان نہیں، بلکہ نیا جملہ ہے، اب مطلب یہ ہوگیا ''اس میں کھلی نشانیاں ہیں، اور مقام ابراہیم بھی ہے، ان تمام چیزوں کی وجہ سے کعبہ شریف کو اور زیادہ عظمت حاصل ہوگئی، جبکہ وہ خود بذاتہ بھی معظم و مشرف ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ''مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ'' تفسیر ہو ''آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ'' کی، اب اس صورت میں معنی یہ ہوگا

اس میں کھلی نشانیاں ہیں، وہ مقام ابراہیم ہے۔

اعتراض: فان قیل الآیات جماعة ولا یصح تفسیرھا بشیء واحد" یہ دوسرا احتمال درست نہیں نظر آتا کیونکہ " آیات "جمع ہے، اور" کہ" مَقَامُ اِبْرَاهِيْمَ "" واحد ہے، واحد سے تفسیر جمع کی کیسے صحیح ہے؟

پہلا جواب: یہ ہے کہ" مَقَامُ اِبْرَاهِيْمَ" اگرچہ واحد ہے لیکن آیات کثیرہ کے درجہ میں ہے، اس لئے کہ حضرت ابراہیم ؑ کا معجزہ ہے، جو اللہ تعالی کے عالم ہونے پر دلالت کررہا ہے، اور رب تعالی کے صانع ہونے اور اس کے قادر ہونے اور اس کے ارادہ رکھنے اور اس کی حیات اور اس کے غنی ہونے اور اس کے منزہ (ہر عیب سے پاک) ہونے اور اسکے محدثات کے مشابہ ہونے سے پاک ہونے پر یہ معجزہ دلالت کررہا ہے۔

"فمقام ابراھیم، وان کان شیئا واحدا الا انه لما حصل فیه ھذہ الوجوہ الکثیرة کان بمنزلة الدلائل "

اگرچہ کہ" مَقَامُ اِبْرَاهِيْمَ" ایک ہے لیکن جب اس سے کثیر چیزوں کا علم حاصل ہوگیا تو یہ کئی دلائل کے درجہ میں آگیا۔

دوسرا جواب: "ان مقام ابراھیم اشتمل علی الآیات " یعنی دوسرا جواب یہ ہے کہ بیشک مقام ابراہیم چند آیات پر مشتمل ہے، لھذا حکم جمع میں ہے، کیونکہ حضرت ابراہیم ؑ کے قدموں کا ایک سخت پتھر میں قدموں کا نشان پڑجانا یہ ایک نشانی ہے، اور قدموں کا ٹخنوں تک پتھر میں گڑ جانا یہ دوسری نشانی ہے۔ اور پتھر کا صرف حضرت ابراہیم ؑ کے قدموں کی جگہ نرم ہونا اور ادھر ادھر سے سخت ہونا یہ تیسری نشانی ہے، اور مقام ابراہیم کا آج تک محفوظ رہنا یہ حضرت ابراہیم ؑ کا ایک علیحدہ معجزہ ہے، ورنہ نبی کریم ﷺ کے معجزہ قرآن پاک کے علاوہ دوسرے انبیاء کرام کے معجزات ختم ہوگئے، لھذا مقام ابراہیم کا آج تک محفوظ رہنا یہ چوتھی نشانی ہے۔

"فثبت ان مقام ابراھیم علیه السلام آیات کثیرہ"لھذا ثابت ہوگیا کہ" مَقَامُ اِبْرَاهِيْمَ" کثیر آیات ہیں۔

تیسرا جواب: یہ ہے کہ زجاج نے کہا کہ صرف کہ" مَقَامُ اِبْرَاهِيْمَ" آیات بینات کی تفسیر نہیں، بلکہ" مَقَامُ اِبْرَاهِيْمَ" کے ساتھ "وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا" بھی داخل ہے، دو چیزوں کا جمع پر اطلاق ہوتا رہتا ہے جیسا کہ " فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا "میں استعمال ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے "الاثنان فما فوقھما جماعة" دو اور دو سے اوپر ایک جماعت ہے۔

چوتھا جواب: جب ذکر فرمایا" فِيْهِ آیات" کہ اس میں کثیر آیات ہیں تو مثال کے طور پر دو کا صراحۃ ذکر

کر دیا کہ ان میں کثیر کھلی نشانیوں میں سے ''مَقَامُ اِبْرَاهِيمَ'' بھی ہے اور جو وہاں داخل ہو وہ امن میں بھی رہتا ہے۔
(ماخوذ از کبیر)

''مَقَامُ اِبْرَاهِيمَ'' کی تفصیل پہلے پارہ ''وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيمَ'' میں مکمل طور پر بیان ہو چکی ہے۔

﴿وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾ ''اور جو شخص داخل ہوگا اس میں امن میں ہوگا۔''

حصول امن کی چند وجوہ:

- **الاول ان من دخله للنسک تقربا الی الله تعالی کان آمنا''**
  امن حاصل ہونے کی پہلی وجہ یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کیلئے حج کرنے کیلئے گیا وہ عذاب سے محفوظ رہے گا، اللہ تعالیٰ کی امان میں آجائے گا۔ (کبیر)
- **واخرج عبد بن حمید وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم عن یحیی بن جعدة بن هبیرة فی قوله ومن دخله کان آمناقال آمنامن النار''**
  یحیی بن جعدہ بن ھبیرہ کی روایت میں ہے کہ ''وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا'' کا ایک مطلب یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا وہ آگ سے محفوظ رہے گا۔ (از در منشور)
- **واخرج البیهقی عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ من دخل الیت دخل فی حسنة وخرج من سیئة مغفورا له''**
  حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص بیت اللہ شریف میں آتا ہے اسے نیکیاں حاصل ہوتی ہیں اور برائیاں اس سے دور کر دی جاتی ہیں اور اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔
(از در منشور)

یعنی حج کرنے سے ثواب حاصل ہوگا، اور صغائر گناہ تو اس کے حج کرنے سے ہی مٹا دیئے جائیں گے، اور اسے توبہ کی بھی توفیق عطاء کر دی جاتی ہے تو وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے جیسا کہ بچہ ماں کے پیٹ سے باہر آنے پر گناہوں سے پاک وصاف ہوتا ہے۔ راقم نے یہ وضاحت جو کی ہے، یہ علامہ علی قاری رحمہ اللہ کی وضاحت کے مطابق کہ حج سے صغیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں کبیرہ گناہ صرف توبہ سے معاف ہوتے ہیں، لیکن بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ حج سے صغائر اور کبائر دونوں ہی معاف ہو جاتے ہیں۔ ''واللہ اعلم بالصواب''

- **واخرج ابن المنذر عن عطاء قال من مات فی الحرم بعث آمنایقول الله ومن دخله کان آمنا''**

ابن منذر نے عطاء کی روایت بیان کی ہے کہ جو شخص حرم میں فوت ہو گیا اسے امن میں اٹھایا جائے گا، اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ''وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا'' جو وہاں داخل ہوا امن میں ہو گا۔ (از در منثور)

❁ واخرج البيهقي في الشعب عن جابر قال قال رسول الله ﷺ من مات في احد الحرمين بعث آمنا''

بیہقی نے شعب ایمان میں حضرت جابر کی روایت بیان کی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کی حرمین میں سے کسی ایک میں وفات ہوگئی تو وہ امن میں اٹھایا جائے گا۔ (از در منثور)

یعنی جو شخص حالت ایمان میں مدینہ طیبہ یا مکہ مکرمہ میں فوت ہوا تو قیامت کے دن عذاب سے امن میں اٹھایا جائے گا۔

❁ واخرج البيهقي في الشعب وضعفه عن سلمان قال قال رسول الله ﷺ من مات في احد الحرمين استوجب شفاعتي وجاء يوم القيامة من الآمنين''

بیہقی نے شعب ایمان کے باب میں سلمان کی روایت ذکر کی، رسول اللہ ﷺ نے ذکر فرمایا جو شخص حرمین (حرم مکہ، حرم مدینہ) میں سے کسی ایک میں فوت ہوا وہ میری شفاعت کو پالے گا، اور قیامت کے امن والے لوگوں میں آئے گا۔ (از در منثور)

❁ واخرج الجندي والبيهقي عن انس بن مالك قال قال رسول الله ﷺ من مات في احد الحرمين بعث من الآمنين يوم القيامة ومن زارني محتسباالي المدينة كان في جواري يوم القيامة''

انس بن مالک فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کی حرمین میں سے کسی ایک میں وفات ہوگئی تو وہ قیامت میں امن میں ہوگا، اور جس نے میری زیارت کی ثواب کی غرض سے مدینہ طیبہ میں وہ قیامت کے دن میری پناہ میں ہوگا۔ (از در منثور)

(۲) والثاني يحتمل ان يكون المراد ماأودع الله في قلوب الخلق من الشفقة على كل من التجاء اليه ودفع المكروه عنه''

حصول امن کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کے دلوں میں شفقت رکھ دیتا ہے کہ جو بھی کعبہ میں جائے اسے امن پہنچایا جائے اور اس سے مکروہات کو دور رکھا جائے۔ (کبیر)

یہ صرف انسان تک محدود نہیں بلکہ جانور بھی دوسرے جانوروں پر رحم کرتے ہیں ''وان الجارحة اذا قصدت صيدا فاذا دخل الصيد الحرم كفت عنه'' بیشک جب کوئی شکار کرنے والا، چیرنے پھاڑنے والا

جانور دوسرے جانوروں پر حملہ کرتا ہے تو وہ جانور جس پر حملہ کیا گیا اس نے حرم شریف میں پناہ لے لی، اس کے حرم شریف میں داخل ہوتے ہی حملہ آور جانور اس پر حملہ کرنے سے رک جاتا ہے کہ اس کے دل میں بھی اللہ تعالیٰ نے الفت ڈال دی اور عناد و غضب اس کے دل سے نکال دیا گیا۔ (ماخوذ معالم التنزیل للبغوی)

(۳) وقیل المراد به ان من دخله عام عمرة القضاء مع رسول الله ﷺ كان آمنا، كما قال الله تعالى "لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيۡنَ"

اور بیان کیا گیا ہے کہ مراد اس سے یہ ہے کہ جو شخص نبی کریم ﷺ کے ساتھ عمرہ قضاء کرنے کیلئے جائے گا وہ امن میں رہے گا جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيۡنَ﴾ (سورۃ الفتح، آیہ نمبر ۲۷) ''بیشک تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے اگر اللہ چاہے امن و امان سے۔'' (معالم التنزیل للبغوی)

(۴) چوتھی وجہ اس میں یہ ہے:

"وقيل هو خبر بمعنى الامر تقديره ومن دخله فامنوه كقوله تعالى "فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوۡقَ وَلَا جِدَالَ فِى الۡحَجِّ "اى لا ترفثوا ولا تفسقوا "

کہ اگرچہ صیغے خبر کے ہیں، لیکن معنیٰ ''نہی'' والا ہے، مطلب یہ ہے کہ جو شخص حرم میں داخل ہو جائے اس امن دے دو، یہ ایسے ہی ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ہے: ﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوۡقَ وَلَا جِدَالَ فِى الۡحَجِّ﴾ (سورۃ البقرۃ، آیہ نمبر ۱۹۷) ''میں ہے، یہاں بھی اگرچہ بظاہر معنیٰ خبر والا ہے، لیکن مراد امر ہے۔'' (معالم التنزیل للبغوی)

یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ایسا خوبصورت ترجمہ کیا ہے کہ اس میں خبر اور امر دونوں کی جھلک موجود ہے، ''تو نہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ ہو، نہ کوئی گناہ، نہ کسی سے جھگڑا''

(۵) پانچویں وجہ یہ ہے کہ اس آیۂ کریمہ میں زمانۂ جاہلیت کے طریقہ کو رد کیا گیا ہے، کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں کفار لوگ ایک دوسرے کو حرم میں بھی قتل کر دیتے تھے اور ایک دوسرے کے اعضاء کاٹ دیتے تھے، اس آیۂ کریمہ میں ان سے ضمناً منع کیا گیا، گویا کہ مفہوم یہ ہو گیا "ومن دخل الحرم لايتعرضونه " جو حرم میں داخل ہوا اس کا پیچھا نہ کرو، نہ اسے قتل کرو، نہ اس کے اعضاء کاٹو (چوتھی اور پانچویں وجہ قریب قریب ہی ہیں) حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اور حضرت قتادہ اور جمہور مفسرین کرام نے یہی وجہ بیان کی ہے، (تاہم راقم کے نزدیک جمیع وجوہ ہی معتبر ہیں، جو تمام کی تمام ہی بیک وقت پائی جاتی ہیں) اسی مضمون کو ایک اور آیۂ کریمہ میں بھی پیش کیا گیا ہے۔

"اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَّیُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ" (سورۃ العنکبوت، آیۃ نمبر ۶۷)

"اور کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ ہم نے حرمت والی زمین پناہ بنائی اور ان کے آس پاس والے لوگ اچک لئے جاتے ہیں۔"

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا موقف:

وقال ابو حنیفة رحمه الله معناه من دخله کان آمنا لایجوز قتله، فمن وجب علیه القتل قصاصا او حدا خارج الحرم فالتجأ الی الحرم لایستوفی منه لکنه لایطعم ولا یبائع ولا یشاری حتی یخرج فیقتل، کذا قال ابن عباس"

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا" کا مطلب یہ ہے کہ حرم شریف میں کسی کو قتل نہیں کیا جائے گا، یہ اس وقت جب کہ کسی نے حرم کے باہر قتل کیا اور اس پر قصاص لازم آ گیا تو اسے حرم میں قصاصاً قتل نہیں کیا جائے گا، اسی طرح کسی نے حرم کے باہر کسی کے اعضاء کو عمداً کاٹا، پھر وہ حرم میں آ گیا تو اس کے اعضاء حرم میں نہیں کاٹے جائیں گے، اسی طرح اگر کسی نے حرم کے باہر کوئی جرم کیا اور پھر حرم میں آ گیا تو اس پر حرم میں حد نہیں لگے گی، البتہ اس شخص سے خرید و فروخت منع کر دی جائے گی، اس تک کھانے پینے کی اشیاء نہیں پہنچنے دی جائیں گی تا کہ وہ حرم سے نکل جائے تو اس پر حد نافذ کر دی جائے، یا اسے قصاصاً قتل کر دیا جائے، اگر اس سے اعضاء کاٹنے کا قصاص لینا ہے تو اسکے اعضاء کاٹ دئے جائیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا موقف:

وقال الشافعی وغیرہ یستوفی منه القصاص وان دخل فیه" امام شافعی وغیرہ یہ فرماتے ہیں کہ باہر قتل کر کے یا اعضاء کاٹ کر، یا باعث حد جرم کر کے حرم میں پناہ لینے والے کو حرم میں ہی قتل کر دیا جائے، یا اس کے اعضاء کاٹ دئے جائیں، یا اس پر حد نافذ کر دی جائے، لیکن ہر صاحب علم و دانش امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے موقف کو اعظم ہی سمجھے گا۔

اتفاقی مسئلہ: "واما اذا ارتکب الجریمة فی الحرم یستوفی منه عقوبته" جب کوئی شخص حرم میں ہی جرم کرے تو اس پر اس کے جرم کے مطابق حرم میں اسے سزا دی جائے، اس مسئلہ میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے، زیادہ تفصیل "وَلَا تُقَاتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقَاتِلُوْكُمْ فِيْهِ" (البقرۃ) کی وضاحت کے ضمن میں دیکھئے۔

(ماخوذ از مظہری)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"وَمَنْ دَخَلَهٗ" میں ضمیر منصوب کو بعض مفسرین نے "حرم" کی طرف لوٹایا، اور بعض نے "بیت" کی طرف لوٹایا، البتہ جنہوں نے "بیت" کی طرف لوٹایا انہوں نے بھی مضافات کعبہ کو ساتھ ہی مراد لیا، اسلئے مقصد سب حضرات کا ایک ہی ہے کہ جو شخص حرم میں داخل ہوا وہ امن میں ہوگا۔

دینی طلباء کے فائدہ کیلئے ایک اور بحث:

کبھی قانون "طی الذکر" کا جاری ہوتا ہے، جسے "الذکر المطوی" بھی کہا جاتا ہے، یعنی زیادہ چیزوں کا ذکر کیا جائے، پھر کسی حکمت کیلئے بعض کو ذکر کر کے بحث کو سمیٹ دیا جائے، وہی قانون یہاں بھی جاری کیا گیا، پہلے ذکر کیا گیا "فِیْهِ آیَاتٌ بَیِّنَاتٌ" اس میں کھلی نشانیاں ہیں، (یہ جمع ہے) پھر دو چیزوں کا ذکر کر کے بحث کو سمیٹ دیا گیا، وہ دو چیزیں یہ ہیں "مَقَامُ اِبْرَاهِیْمَ" "وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ آمِنًا" حکمت اس میں یہ ہے کہ بتانا یہ مقصود تھا کہ نشانیاں تو بہت زیادہ ہیں، البتہ ان میں سے دو کا ذکر ان کی اہمیت اور افضلیت کے پیش نظر کر دیا گیا۔

"طی الذکر" قانون کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی دیکھئے، آپ فرماتے ہیں "حبب الی من دنیاکم ثلاث الطیب والنساء وقرة عینی فی الصلوة" مجھے تمہاری دنیا میں سے تین چیزیں پسند ہیں، خوشبو اور اپنی ازواج" اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے، دو کا ذکر کر کے بحث کا لپیٹ دیا گیا، تیسری چیز کا ذکر نہیں کیا، حکمت اس میں یہ ہے کہ دو چیزوں کا ذکر کر کے اور تیسری کا ذکر نہ کر کے اشارہ یہ فرمایا کہ دنیا کا زیادہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ دو کے ذکر کے بعد جملہ استینافیہ کے طور پر ذکر فرمایا "وقرة عینی فی الصلوة" میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے،

"وقرة عینی فی الصلوة "لیست من امور الدنیا وانما هی من الامور الآخرة" یعنی یہ خیال رہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی "وقرة عینی فی الصلوة" امور دنیا کی تیسری چیز نہیں، کیونکہ یہ تو امور آخرت سے ہے، تیسری چیز کا ذکر ہی نہیں کیا۔ (مدارک التنزیل للنسفی، شیخ زادہ)

تنبیه: ابھی جو حدیث پاک بیان کی، وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جسے مسند احمد اور نسائی میں ذکر کیا گیا ہے "حبب الی" کے بعد "من الدنیا" کے الفاظ ابن جوزی کی روایت میں زیادہ کئے گئے۔ (مشکوۃ باب فضل الفقراء)

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تیسری چیز کا بھی ذکر فرمایا، لیکن وہ حدیث موقوف ہے مرفوع نہیں۔

﴿ وعن عائشة قالت كان رسول الله يعجبه من الدنياثلاثة الطعام والنساء والطيب فاصاب اثنين ولم يصب واحدااصاب النساء والطيب ولم يصب الطعام"

''رواہ احمد'' (مشکوۃ باب فضل الفقراء)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، رسول اللہ کو دنیا کی تین چیزیں پسند تھیں طعام، اور اپنی ازواج، اور خوشبو، تو آپ نے ان میں دو پالیں اور ایک نہیں پائی، آپ نے ازواج اور خوشبو کو پالیا، لیکن آپ نے طعام نہیں پایا، "ولم يصب الطعام الا بوصف القلة فاطلاق النفي للمبالغة" طعام نہ پانے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے وافر مقدار میں طعام نہیں پایا، اسی مبالغہ کی نفی ہے، اگرچہ قلیل طعام آپ کو حاصل رہا۔ (مرقاۃ)

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾

''اور اللہ کیلئے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا ہے جو طاقت رکھے اس کی طرف راہ پانے کی۔''

''**ولله**'' اور اللہ کیلئے'' ان الفاظ مبارکہ سے یہ ثابت فرمایا کہ حج اللہ تعالی کی رضاء کیلئے ہو، اس میں دکھلاوا مقصود نہ ہو، اپنا چرچا کرنا مقصود نہ ہو، طلباء کرام یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ ''**لله**'' میں ''لام جار'' کا تعلق ''استقر'' محذوف سے ہے یہ ظرف مستقر ہے۔

﴿**عَلَى النَّاسِ**﴾ لوگوں پر'' یہاں علی لزوم پر دلالت کر رہا ہے، جس سے پتہ چلے کہ معنی یہ ہے لوگوں پر لازم ہے، یعنی ''افترض على الناس'' لوگوں پر حج کرنا فرض ہے۔ ''الناس'' پر الف لام عہد خارجی، جس سے مراد خاص لوگ ہیں، وہ خاص لوگ کون ہیں؟

"المراد بالناس الاحرار العقلاء البالغون فلا يجب الحج على المجانين والصبيان لعدم اهليتهم للخطاب ولا على العبيد بالاجماع"

وہ خاص لوگ یہ ہیں کہ آزاد ہوں، عاقل ہوں، اور بالغ ہوں، ان لوگوں پر حج فرض ہے، پاگل لوگوں پر، بچوں پر حج فرض نہیں، کیونکہ وہ خطاب کے اہل نہیں، یعنی فرضیت کا خطاب عاقل و بالغ کو ہوتا ہے، اگرچہ دکان وغیرہ پر نابالغ بچے کو بھی بھیجا جاسکتا ہے اور غلام پر بھی بالاتفاق حج فرض نہیں۔

مسئلہ ۱۴: فلو حج الكافر او الصبي العاقل او العبد ثم اسلم الكافر وبلغ الصبي واعتق لعبد يجب عليه حجة الاسلام ثانيا بالاجماع"

اگر کافر نے حج کیا، یا عاقل بچے نے حج کیا، یا غلام نے حج کیا، حج کرنے کے بعد کافر نے اسلام قبول کیا، اور بچہ بالغ ہوگیا، اور غلام آزاد کردیا گیا تو ان پر دوبارہ حج فرض ہوگا، پہلا حج کافی نہیں، کافر اگرچہ حج کرتے تھے لیکن ان کا حج تو مقبول ہی نہیں، کسی عبادت کے مقبول ہونے کیلئے ایمان ضروری ہے، البتہ بچے اور غلام کا حج نفلی ہوگا، فرض حج بالغ ہونے کے بعد اور غلام کے آزاد کئے جانے کے بعد ہی ادا کیا جاسکے گا، یہ مسئلہ اجماع امت سے ثابت ہے، اور اجماع امت پر حضرت ابن عباس ﷺ کی روایت تائید کررہی ہے۔

❁ عن ابن عباس ایماصبی حج لم بلغ الحنث فعلیه ان یحج حجة اخری، وایمااعرابی حج لم هاجر فعلیه ان یحج حجة اخری وایماعبد حج لم اعتق فعلیه حجة اخری "رواه الحاکم" والمراد بالاعرابی الذی لم یهاجر من لم یسلم فان مشرکی العرب کانوا یحجون" قال الحاکم صحیح علی شرط الشیخین ورواه ابن ابی شیبة فذکر نحوه وروی ابو داؤد دمر سلا عن محمد بن کعب القرطبی وفی الباب عن جابر وسنده ضعیف وهذه الاحادیث تلقته الامة بالقبول وانعقد علی مقتضاه الاجماع فجازبه تخصیص الکتاب"

حضرت ابن عباس ﷺ فرماتے ہیں جو بچہ حج کرے، بعد میں بالغ ہو اس پر لازم ہے کہ وہ پھر (فرض) حج کرے، جو اعرابی حج کرے پھر ہجرت کرے اس پر (فرض) حج اور ادا کرنا لازم رہے گا، اور جو غلام حج کرے پھر اسے آزاد کردیا جائے تو وہ (فرض) اور ادا کرے، اعرابی سے مراد مشرکین عرب ہیں جو حج کیا کرتے تھے اور "لم یهاجر" سے مراد "لم یسلم" ہے۔ یعنی مشرکین اگر اسلام لانے سے پہلے حج کریں اور بعد میں اسلام لائیں تو فرض حج ان کو پھر ادا کرنا پڑے گا۔ یہ حدیث حاکم نے بیان کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث شرط شیخین پر صحیح ہے، اور اسی کی طرح ابن ابی شیبہ نے بھی حدیث ذکر کی ہے، اور ابوداؤد نے بھی محمد بن کعب قرطبی سے روایت کی ہے، اور اسی مسئلہ میں حضرت جابر ﷺ سے بھی حدیث مروی ہے اگرچہ اس کی سند ضعیف ہے، (لیکن دوسری احادیث کی وجہ سے متعدد طرق سے روایت کا درجہ اسے بھی حاصل ہے جو حسن لغیرہ کے درجہ میں ہے) یہاں سے ایک اعتراض بھی اٹھ گیا، وہ اعتراض یہ تھا کہ قرآن پاک نے تو حج کے فرض ہونے کو مطلق ذکر کیا ہے، تو عاقل، بالغ، آزاد، مسلمان ہونے کی قید درست نہیں۔ تو اس کا جواب واضح ہوگیا کہ یہ احادیث اجماع امت سے مقبول ہیں، اور اس مسئلہ پر اجماع امت ہے لهذا ان احادیث سے قرآن پاک کی آیۃ کریمہ کی وضاحت کرنی درست ہوگئی۔ (ماخوذ از مظہری)

﴿حِجُّ الْبَيْتِ﴾ ''اس گھر کا حج کرنا ہے۔''

ابو جعفر، حمزہ، کسائی اور حفص کی قرأت میں صرف اسی مقام میں ''حج'' کی ''حاء'' کے نیچے کسرہ پڑھا گیا ہے، اور باقی قرآن پاک میں جہاں بھی یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، وہاں ''حاء'' پر فتحہ پڑھا گیا ہے'' اہل نجد کی لغت میں کسرہ ہے، اور اہل حجاز کی لغت میں فتحہ ہے، یہ دونوں فصیح لغتیں ہیں، اور دونوں کا معنی ایک ہے۔ ''وفی المدارک انه بالکسر اسم وبالفتح مصدر'' تفسیر مدارک التنزیل میں ذکر کیا گیا ہے کہ جب کسرہ (زیر) سے پڑھا جائے تو یہ اسم، یعنی ذات حج، اور اگر فتحہ (زبر) سے پڑھا جائے تو مصدر ہے یعنی ''حج کرنا'' ''حج'' کا لغوی معنی ارادہ کرنا، اور اصطلاح میں خاص عبادت جس میں خاص مقامات کی زیارت اور مناسک حج ادا کرنے کا قصد پایا جاتا ہے۔ (ماخوذ از مظہری)

حج فرض ہے:

اس میں اجماع امت ہے کہ حج ارکان اسلام میں سے ایک رکن ہے، مسلمانوں پر فرض ہے جب اس کی تمام شرائط پائیں جائیں۔

❁ **عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ بنی الاسلام علی خمس شهادة ان لااله الا الله وان محمدا رسول الله ﷺ واقام الصلوة وایتاء الزکوة والحج وصوم رمضان''**

(بخاری ومسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، یہ گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی معبود نہیں، اور بیشک محمد اللہ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کرنا اور زکوۃ ادا کرنا، اور حج کرنا، اور رمضان کا روزہ رکھنا۔ (ماخوذ از مظہری)

﴿مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ ''جو طاقت رکھے اس کی طرف راہ پانے کی۔''

استطاعت کی دو قسمیں، ایک استطاعت بنفسہ یعنی وہ آنے جانے پر قادر ہو، اور اس کے پاس واپسی تک کا خرچ ہو، اور سواری ہو۔ اور دوسری قسم ہے ''استطاعت بالغیر'' اگر خود حج نہ کر سکے کہ حج فرض ہو جانے کے بعد معذور ہو گیا، تو کسی اور کو خرچ دے کر حج کرالے۔ (ماخوذ از معالم التنزیل للبغوی)

خیال رہے کہ حج کی تفصیلی بحث دوسرے پارہ میں بیان کی جا چکی ہے، یہاں تو صرف اتنی چیزوں کو ذکر کیا جا رہا ہے جو مفسرین کرام نے آیہ کریمہ کی تفسیر میں نقل کی ہیں، اگرچہ بعض چیزیں وہی ذکر کی جا رہی ہیں جو دوسرے پارہ

میں ذکر ہو چکی ہیں، مفسرین کرام کی تابعداری کی وجہ سے راقم کی بھی مجبوری ہے کہ آیۃ کریمہ کی وضاحت ضروری ہے۔

حج عمر میں ایک مرتبہ فرض ہے:

❁ عن ابی هریرة قال خطبنارسول الله ﷺ فقال ایهاالناس قد فرض علیکم الحج فحجوا فقال رجل اکل عام یارسول الله؟فسکت حتی قالهالاثافقال رسول الله ﷺ لو قلت نعم لوجبت ولمااستطعتم ، ثم قال ذرونی ماترکتکم فانماهلک من کان قبلکم بکثرة سؤالهم واختلافهم علی انبیائهم واذاامرتکم بشیء فأتوامنه مااستطعتم واذانهیتکم عن شیء فدعوه" (رواه احمد ومسلم)

حضرت ابوہریرہ ؓ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا، تو آپ نے فرمایا اے لوگو تحقیق تم پر حج فرض کر دیا گیا، تو تم حج کرو، ایک شخص اٹھے، عرض کیا، کیا ہر سال یا رسول اللہ؟ تو آپ خاموش رہے، یہاں تک کہ آپ نے تین مرتبہ اسے (حج کی فرضیت) کو بیان کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اگر میں "نعم" (ہاں) کہہ دیتا تو حج ہر سال فرض ہو جاتا اور تم طاقت نہ رکھتے، پھر آپ نے فرمایا تم مجھے چھوڑ دیا کرو جب میں تمہیں چھوڑ دوں، بیشک تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہو گئے کہ انہوں نے کثیر سوال کئے اور اپنے انبیاء کرام سے اختلاف پیدا کئے، اور جب میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو تم اس پر عمل کرو جتنی تمہیں طاقت حاصل ہو، اور جب میں تمہیں کسی کام سے منع کر دیا کروں تو اس سے رک جاؤ۔

❁ وعن ابن عباس ؓ قال خطبنارسول الله ﷺ فقال یا ایهاالناس ان الله کتب علیکم الحج ، فقال اقرع بن حابس فقال یارسول الله افی کل عام؟فقال لو قلتهالوجبت ولووجبت لم تعملوابها ولن تستطیعوا ان تعملوابها،الحج مرة فمن زاد فهو تطوع.

(رواه احمد وابوداؤدوالنسائی وابن ماجة)

حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا اور فرمایا اے لوگو! بیشک اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے تو اقرع بن حابس کھڑے ہوئے عرض کیا، کیا ہر سال حج فرض کیا گیا یا رسول اللہ؟ تو آپ نے فرمایا اگر میں ہاں کہہ دیتا البتہ واجب ہو جاتا تم اس پر عمل کرنے کی طاقت نہ رکھتے، حج ایک مرتبہ فرض ہے جو زیادہ ہو گا وہ نفل ہو گا۔ (ابن کثیر و مظہری)

استطاعت بالغیر کا مطلب:

اگر ایک شخص پر حج فرض ہو جائے، آنے جانے کا خرچہ موجود ہے، اور اہل وعیال کیلئے بھی خرچ موجود ہے،

اسے کوئی عذر لاحق نہیں، کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں، اس صورت میں اس پر حج فرض ہو گیا، اب تاخیر کی وجہ سے حج کی فرضیت ساقط نہیں ہوگی، لھذا اسے چاہئے کہ وہ اپنے مال سے کسی سے حج کرائے جب خود کسی عذر کی وجہ سے آنے جانے سے قاصر ہو گیا، زندگی میں حج کرائے یا وصیت کر جائے کہ میرے مال میں سے میری طرف سے کسی کو حج پر بھیجنا، اب عام ہے کہ اس کا کوئی وارث اس کی طرف سے حج کر آئے یا کوئی اجنبی شخص اگر اس نے وصیت نہیں کی تھی تو اب ورثاء پر واجب تو نہیں کہ کسی کو اس کے بدل میں بھیجیں، تاہم اگر چاہیں تو بھیج دیں، میت کو ان شاء اللہ نفلی حج کا ثواب ملے گا، اس حج سے فرض ساقط نہیں ہوگا۔

طلباء کرام! ابھی جو مسئلہ بیان کیا ہے تفسیر مظہری کی اس عبارت میں دیکھیں۔

"من استقر فی ذمته صحیحاثم طرا علیه ضعف وزمانة فانه لا یستحط عنه الحج بل یجب علیه ان یحج عنه غیره من ماله مادام حیااویوص به عند موته واذامات ولم یحج یحج عنه وارثه اویحج عنه اجنبیامن ماله ان شاء" (مظهری)

اس مسئلہ کو کہ حج غیر کی طرف سے قضاء مثل غیر معقول ہے، قیاس سے تو ثابت نہیں، حدیث پاک پیش کی گئی جس سے یہ مسئلہ ثابت ہو جاتا ہے۔ وہ حدیث یہ ہے۔

❁ عن ابن عباس رضی الله عنهما کان الفضل ردف النبی ﷺ فجاء ت امرأة من خثعم فجعل الفضل ینظر الیها وتنظر الیه وجعل النبی ﷺ یصرف وجه الفضل الی الشق الآخر فقالت یارسول الله ان فریضة الله علی عباده فی الحج ادرکت ابی شیخا کبیرا لا یستطیع ان یمسک علی الرجل افاحج عنه قال نعم، وفی روایة لایستطیع ان یستوی علی الراحلة فهل تقضی عنه ان احج عنه قال نعم وذلک فی حجة الوداع" (رواه البخاری ومسلم)

حضرت ابن عباس ﷺ فرماتے ہیں کہ فضل (ابن عباس) نبی کریم ﷺ کے ساتھ آپ کی سواری پر سوار تھے، خثعم قبیلہ کی ایک عورت آئی، فضل اسے دیکھنے لگے وہ ان کو دیکھنے لگی، نبی کریم ﷺ نے فضل کا رخ دوسری طرف پھیر دیا، پھر اس عورت نے عرض کیا یا رسول اللہ اللہ تعالی نے اپنے بندوں پر حج فرض کر رکھا ہے، میں نے اپنے باپ کو بوڑھا پایا، جو طاقت نہیں رکھتے کہ وہ سواری پر سوار ہو سکیں، تو کیا میں ان کی طرف سے حج کر لوں؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ دوسری روایت سے یہ بھی ثابت ہے کہ یہ سؤال حجۃ الوداع کے موقع پر کیا گیا، اس حدیث سے مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ اس شخص پر حج فرض ہو چکا تھا، جو بغیر کسی عذر کے تاخیر کی وجہ سے معاف نہ ہو سکا تو نبی کریم ﷺ نے اس کی بیٹی کو اجازت دی کہ تم باپ کی طرف سے حج کر لو۔ (زیادہ درست قول یہی ہے) بعض حضرات نے کہا کہ وہ عورت اپنی خوشی سے

اپنے باپ کو نفلی حج کر کے ثواب پہنچانا چاہتی تھی، اس کی اجازت نے نبی کریم ﷺ سے اس نے طلب کی، تو آپ نے اسے اجازت دے دی۔ "واللہ اعلم بالصواب"

❁ عن ابن عمر عن النبی ﷺ قال لاتسافر المرأة ثلاثا الا معها ذومحرم "(رواہ البخاری ومسلم)
حضرت ابن عمر ؓ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا عورت بغیر محرم کے تین دنوں کا سفر نہ کرے۔

❁ وفی روایة المسلم لایحل لامرأة تؤمن بالله والیوم الآخر تسافر مسیرة ثلاث لیال الاومعها ذومحرم"
جو عورت اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہے وہ بغیر محرم کے تین راتوں کا سفر نہ کرے۔
ابوداؤد کی روایت میں ہے "الا مع زوج او محرم" بغیر خاوند یا بغیر محرم کے سفر نہ کرے، ان روایات سے واضح ہوا کہ عورت کا بغیر خاوند یا محرم کے حج کرنا جائز نہیں۔ (ماخوذ از مظہری)

جو عورتیں مصنوعی محرم بنا کر حج کرتی ہیں، وہ شریعت کی عدولی کرتی ہیں، اور پیسہ ضائع کرتی ہیں۔

﴿وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾

''اور جس نے کفر کیا تو بیشک اللہ بے پرواہ ہے جہان والوں سے۔''

اس مقام پر "وَمَنْ كَفَرَ" سے مراد ہے "ومن انکر وجوب الحج" جس نے وجوب حج کا انکار کیا۔

❁ اخرج سعید بن منصور وابن جریر عن الضحاک مرسلا انه لما نزل صدر الآیة جمع رسول الله ﷺ ارباب المال فخطبهم وقال ان الله کتب علیکم الحج فحجوا فآمنت به ملة واحدة یعنی المسلمین وکفرت به خمس ملل یعنی المشرکین والیهود والنصاری والصابئین والمجوس فنزل 'وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ"

ضحاک کی روایت میں آتا ہے کہ جب اس آیۂ کریمہ کا اول حصہ نازل ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے تمام دینوں کے لوگوں کو جمع کیا اور ان کو خطبہ دیا، اور فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کر دیا ہے، تم حج کرو' آپ کے اس ارشاد پر ایک گروہ یعنی مسلمانوں نے ایمان لایا (کہ حج کی فرضیت کو تسلیم کیا) اور پانچ گروہوں نے ایمان نہ لایا (وہ پانچ گروہ یہ ہیں) یہود، انصاری، مشرکین، دہریے، مجوسی تو رب تعالیٰ نے نازل فرمایا "وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ" جس نے کفر کیا یعنی حج کا انکار کیا تو بیشک اللہ تعالیٰ تمام جہانوں والوں سے بے پروہ ہے۔

❁ واخرج سعید بن منصور عن عکرمة قال لمانزلت ومن یبتغ غیر الاسلام دینا، الآیة قالت الیهود فنحن مسلمون فقال لهم النبی ﷺ ان الله فرض علی المسلمین حج البیت

فقالوا لم یکتب علینا وابوا ان یحجوا فانزل الله "وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ"

اور وجہ ان الفاظ مبارکہ کے نازل ہونے کی حضرت عکرمہ کی روایت ہے جو سعید بن منصور نے بیان کی ہے وہ فرماتے ہیں جب آیہ کریمہ نازل ہوئی ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ﴾ (سورۃ آل عمران آیہ نمبر ۸۵) "اور جو اسلام کے سواء کوئی دین چاہے گا وہ ہرگز اس سے قبول نہ کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں سے ہے۔" تو یہود نے کہا ہم بھی مسلمان ہیں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر بیت اللہ شریف کا حج فرض کیا، وہ کہنے لگے ہم پر کوئی حج فرض نہیں، انہوں نے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا" وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ"

تنبیہ: حج کے فرض ہونے کے انکار سے کفر لازم آتا ہے، اگر کسی پر حج فرض تھا اس نے حج نہیں کیا وہ گنہگار رہا، کافر نہیں ہوا، اس پر نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی واضح موجود ہے۔

❁ اخرج عبد بن حمید فی تفسیره عن نفیع قال قرأ رسول الله ﷺ هذه الآية فقام رجل من هذيل فقال يارسول الله فمن تركه فقد كفر قال من تركه لايخاف عقوبته ولا يرجو ثوابه"

عبد بن حمید نے اپنی تفسیر میں نفیع سے روایت بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیہ کریمہ پڑھی تو ہذیل قبیلہ سے ایک شخص کھڑا ہوا، سوال کیا یارسول اللہ! کیا حج نہ کرنے والا کافر ہو جائے گا؟ آپ نے فرمایا جس نے حج چھوڑ دیا اسے عذاب کا خوف نہیں اور وہ ثواب کی امید نہیں رکھتا۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہے چاہے وہ تو اسے عذاب دے، چاہے تو اسے معاف کردے، اس نے حج کی فرضیت کا انکار نہیں کیا، اگرچہ بظاہر معلوم ہوتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا خوف نہیں رکھتا اور اس کے ثواب کی امید نہیں رکھتا ہاں اگر یہی چیز بوجہ انکار ہو تو کافر ہو جائے گا۔

❁ وعن علی ﷛ من ملک زادا وراحلة يبلغه الى بيت الله ولم يحج فلا عليه ان يموت يهوديا او نصرانيا" (رواه الترمذی وضعفه)

حضرت علی ﷛ فرماتے ہیں جو شخص زادِ راہ کا مالک ہو گیا اور اسے سواری میسر ہو گئی پھر اس نے حج نہ کیا تو کوئی پرواہ نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے۔ (ماخوذ از مظہری)

قُلْ یٰاَهْلَ الْکِتَابِ لِمَ تَکْفُرُوْنَ بِاٰیَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰی مَا تَعْمَلُوْنَO (آیۃ نمبر ۹۸)

(1) تم فرماؤ اے کتابیو! اللہ کی آیتیں کیوں نہیں مانتے اور تمہارے کام اللہ کے سامنے ہیں۔ (کنزالایمان)

(2) آپ فرما دیجئے اے اہل کتاب! تم کیوں کفر کرتے ہو اللہ کی آیات سے، حالانکہ اللہ مطلع ہے اس پر جو تم عمل کرتے ہو۔ (نجوم الفرقان)

راقم اور روح البیان:

﴿وَاللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰی مَا تَعْمَلُوْنَ﴾ حال من فاعل تکفرون والمعنی لای سبب تکفرون بآیاته عزوجل والحال انه تعالی مبالغ فی الاطلاع علی جمیع اعمالکم وفی مجازاتکم علیها ولاریب فی ان ذلک یسد جمیع انحاء ماتأتونه ویقطع اسبابه بالکلیة"

(روح البیان)

راقم نے ترجمہ روح البیان سے لیا ہے، علامہ اسمٰعیل حقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ﴿وَاللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰی مَا تَعْمَلُوْنَ﴾ ﴿تَکْفُرُوْنَ﴾ کے فاعل سے حال واقع ہے، معنی یہ ہے کہ کس سبب سے تم اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرتے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ کامل طور پر تمہارے اعمال پر مطلع ہے اور تمہیں ان کی جزاء دے گا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تمہاری تمام راہیں بند کر دے گا، اور اسباب مکمل طور پر منقطع کر دے گا۔

آیۃ کریمہ میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ یہود کے علماء کو خطاب ہو، کہ اے یہود کے علماء تم نبی کریم ﷺ کی نبوت کی صداقت کو جاننے کے باوجود انکار کیوں کرتے ہو؟ اور ایک احتمال یہ ہے کہ "آیات" سے مراد مطلقاً اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں جو نبی کریم ﷺ کی نبوت کی صداقت پر دلالت کرتی ہیں، اور خطاب تمام یہود و نصاریٰ کو ہے، یعنی اے یہودیو، اے نصرانیو تم قرآن پاک کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو اور نبی کریم ﷺ کی نبوت کا کیوں انکار کرتے ہو۔ (خازن)

﴿وَاللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰی مَا تَعْمَلُوْنَ......وَالشَّهِیْدُ الْعَالِمُ الْمُطَّلِعُ﴾ "شہید کا اس مقام پر معنی عالم، مطلع ہے" حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم عمل کرتے ہو، یا معنی یوں کیا جائے حالانکہ اللہ تعالیٰ مطلع اس پر جو تم عمل کرتے ہو۔ (روح البیان)

اہل کتاب کو خطاب کی وجہ کیا؟

وتخصیص اهل الکتاب بالخطاب دلیل علی ان کفرهم اقبح لان معرفتهم بالآیات

اقوی وانهم وان زعموا انهم مؤمنون بالتوراة والانجیل فهم کافرون بهما"

اہل کتاب کے ساتھ خطاب کو خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بتانا مقصود یہ ہے کہ ان کا کفر زیادہ قبیح (برا) تھا کیونکہ یہ آیات کو زیادہ جانتے تھے (جو نبی کریم ﷺ کی صداقت پر دلالت کرتی تھیں) یہ اپنے گمان کے مطابق توراۃ وانجیل پر ایمان رکھتے، حالانکہ حقیقت میں توراۃ وانجیل سے کفر کرتے تھے۔ (بیضاوی)

﴿لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ "بآیاته السمعیة والعقلیة" آیات سے مراد عام ہے جو سمعی اور عقلی دونوں کو شامل ہے، یہ ان لوگوں کو توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) کیلئے کہا گیا، کہ اے اہل کتاب (یہود ونصاری) تم اللہ تعالیٰ کی آیات "سمعیہ اور عقلیہ" "جو نبی کریم ﷺ کی نبوت کی صداقت پر دلالت رہی ہیں" کا انکار کیوں کرتے ہو؟ (بیضاوی)

اس آیۂ کریمہ سے یہود ونصاری پر وعید شدید فرمائی کہ اے اہل کتاب تمہارے اعمال کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے، لہذا جو تم اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں تحریف کرتے ہو وہ تمہیں جزا دے گا، اور تمہارا حق کو چھپانا تمہیں نفع نہیں پہنچائے گا۔ (مظہری)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ (آیة نمبر ۹۹)

(۱) تم فرماؤ اے کتابیو! کیوں اللہ کی راہ سے روکتے ہو اسے جو ایمان لائے اسے ٹیڑھا کیا چاہتے ہو اور تم اس پر خود گواہ ہو اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔ (کنزالایمان)

(۲) آپ فرما دیجئے اے اہل کتاب! تم کیوں روکتے ہو اللہ کی راہ سے ان کو جنہوں نے ایمان لایا، ایسے حال میں کہ تم چاہتے ہو اس راہ کو ٹیڑھا کرنا، حالانکہ تم گواہ ہو، اور نہیں اللہ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو۔ (نجوم الفرقان)

اس سے پہلی آیۂ کریمہ میں ذکر فرمایا کہ یہود ونصاری اللہ تعالیٰ کی آیات "جو صداقت رسول اللہ ﷺ پر دلالت کر رہی ہیں" کا انکار کرتے ہیں، ان کا انکار کرنا بہت برا ہے کیونکہ وہ اللہ کی آیات کو اپنی کتاب میں پاتے ہیں،

علم کے ہوتے ہوئے انکار بہت بری چیز ہے۔

اب اس آیۃ کریمہ میں ان کو پھر خطاب کیا " کرر الخطاب والا ستفهام مبالغة فى التقريع و نفى العذر لهم واشعاراهان كل واحد من الامرين مستقبح فى نفسه مستقبل با ستجلاب العذاب "

اب اس آیۃ کریمہ میں ان کو پھر خطاب کیا اوران سے ہی نبی کریم ﷺ کے ذریعے پوچھا، اے اہل کتاب "یہود ونصاریٰ" تم ایمان والوں کو اللہ کی راہ سے کیوں روک رہے ہو ایسے حال میں کہ تم چاہتے ہو اس راہ کو ٹیڑھا کرنا، اس آیۃ کریمہ میں ان کو زیادہ توبیخ کی گئی، ان کے عذر پیش کرنے کی راہ کو مزید بند کردیا گیا، اور یہ بتایا گیا کہ ان کا اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرنا بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستقل ذریعہ ہے، اوران کا مومنوں کو اللہ تعالیٰ کی سیدھی راہ سے ہٹا کر ٹیڑھی راہ پر چلانے کی کوشش یہ بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کو لانے کا مستقل ذریعہ ہے۔ "سبيل الله " اللہ کی راہ سے مراد دین حق ہے، جس پر چلنے کا حکم دیا گیا ہے، وہ ہے اسلام، کہ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے اسلام پر چلو، یہود ونصاریٰ اسلام سے پھیرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، مومنوں کو فتنے میں ڈالنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ یہ راہ راست سے کیسے پھر جائیں، مومنوں کو ایک دوسرے کے خلاف ابھارنے کی اپنی طرف سے سرتوڑ کوشش کرتے ہیں۔ (ماخوذ از بیضاوی)

وجہ اس کی یہی ہے کہ وہ خود گمراہ ہیں، مومنوں کو بھی سیدھی راہ سے ہٹا کر ٹیڑھی راہ پر چلا کر گمراہ کرنا چاہتے ہیں کہ یہ بھی ہماری طرح ہی ہو جائیں۔

راقم اور بیضاوی رحمہ اللہ:

راقم نے " تبغونها عوجا "کا ترجمہ بیضاوی کی اس عبارت سے لیا ہے " تبغونها عوجا " حال من الواو اى باغين طالبين لها اعو جاجا " یعنی "عوجا "تبغونها " کی واو ضمیر سے حال واقع ہے، معنی یہ ہے "ایسے حال میں کہ تم چاہتے ہو اس راہ کو ٹیڑھا کرنا" یعنی تم مسلمانوں پر حق راہ کو خلط ملط کرتے ہو، ان کو وہم میں ڈالتے ہو کہ یہ راہ حق نہیں جس پر تم چل رہے ہو، اور نبی کریم ﷺ کی صفات کو بدل کر پیش کرنا تمہارا مسلمانوں کو راہ راست سے ہٹانے کی ناکام کوشش ہے۔ (ماخوذ از بیضاوی)

﴿وَاَنْتُمْ شُهَدَاءُ﴾ "حالانکہ تم گواہ ہو"

اس مقام میں "وَاَنْتُمْ شُهَدَاءُ" کے معنی میں چند احتمال پائے گئے ہیں۔

(۱) الاول قال ابن عباس رضى الله عنهما يعنى انتم شهداء ان فى التوراة ان دين الله

الذی لایقبل غیرہ ھو الاسلام"

ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں "حالانکہ تم گواہ ہو" کا مطلب یہ ہے کہ توراۃ میں نبی کریم ﷺ کے لانے کا ذکر اور آپ کے اوصاف کا ذکر موجود ہے، آپ کا ایک وصف توراۃ میں یہ بھی مذکور ہے کہ آپ کے تشریف لانے کے بعد صرف دین اسلام ہی مقبول ہوگا، باقی کوئی دین مقبول نہیں ہوگا، اس پر تم گواہ بھی ہو، پھر مسلمانوں کو دین سے پھیرنے کا کیا مطلب؟

(۲) والثانی وانتم شھداء علی ظھور المعجزات علی نبوتہ ﷺ"

دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کو "وَاَنْتُمْ شُهَدَاءُ" کہہ کر یہ بتایا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والے معجزات آپ کو رب تعالیٰ نے عطاء فرمائے، جن پر تم گواہ ہو، پھر مؤمنوں کو ایمان سے پھیرنے کی ناپاک جسارت تمہارے عملوں کو برباد کرنے کا ذریعہ ہے۔

(۳) الثالث وانتم شھداء انہ لایجوز الصد عن سبیل اللہ"

تیسری وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب کو خطاب کرتے ہوئے یوں کہا گیا کہ تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی راہ سے کسی کو روکنا حرام ہے، تو پھر ان کو تم روک رہے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے جس کام پر تم خود گواہ ہو، وہی کام تم کر رہے ہو۔

(۴) الرابع وانتم شھداء بین اھل دینکم عدول یثقون باقوالکم ویعولون علی شھادتکم فی عظام الامور وھم الاخبار والمعنی ان من کان کذلک فکیف یلیق بہ الاصرار علی الباطل والکذب والضلال والاضلال"

چوتھی وجہ یہ بیان کی گئی کہ تم اپنے دین والوں کے نزدیک شاہد معتبر ہو کہ وہ تمہارے اقوال پر اعتبار کرتے ہیں اور تمہاری شہادت پر بڑے بڑے امور میں اعتبار کرتے ہیں، لیکن اس صورت میں خطاب یہود کے اہل علم کو ہے، معنی یہ ہوا کہ جب تم اپنے پیروکار لوگوں کے نزدیک معتبر گواہ ہو تو تمہارا باطل اور جھوٹ، گمراہ رہنے اور گمراہ کرنے پر قائم رہنا کس طرح تمہارے لائق ہے، یعنی لوگ تمہیں علم والا سمجھ کر تم پر اعتبار کرتے ہیں اور تمہیں اپنے بڑے بڑے امور پر گواہ بناتے ہیں، تم تو خود بھٹکے پھرتے ہو اور مومنوں کو بھٹکانے کی کوشش کر رہے ہو۔ (کبیر)

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ "اور نہیں اللہ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو۔"

کنز الایمان مطالب کا حقیقی ترجمان:

اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ دیکھئے "اور اللہ تمہارے کوتکوں سے بے خبر نہیں" برے

اعمال کیلئے آپ لفظ ''کوتکوں'' استعمال فرماتے ہیں، اور اچھے اعمال کیلئے لفظ عمل استعمال فرماتے ہیں، یہ فرق مطالب کو سمجھانے کیلئے بہت خوب ہے۔ ہماری زبان میں لفظ ''کوتکوں'' استعمال نہیں، اس لئے ہم اس حسین اور تحقیقی ترجمہ کے کمال کو سمجھنے کے بغیر ہی گذر جاتے ہیں، بلکہ بعض اوقات سمجھ ہی نہیں پاتے، راقم نے ظاہری الفاظ کے مطابق ترجمہ کردیا ہے، تاہم کنزالایمان کے مطابق ہم اپنے استعمال الفاظ میں ترجمہ کرنا چاہیں تو یوں کرسکتے ہیں ''اور اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں'' ان الفاظ میں اللہ تعالی نے یہود و نصاری کو دھمکی دی کہ تم رب تعالی کی گرفت میں ہو، اس کے عذاب سے بچ نہیں سکو گے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی شخص کا غلام اس کا حکم نہ مانے اور اس کے کہنے پر نہ چلے تو وہ اسے کہے ''لایخفی علی ماانت علیہ، ولست غافلا عن امرک'' تم جس طریقہ پر ہو وہ مجھ سے پوشیدہ نہیں، میں تمہارے کرتوتوں سے غافل نہیں، مطلب اس کا بھی یہ ہے کہ ''تم باز آجاؤ ورنہ میں تمہیں شدید سزا دوں گا۔

عجیب حکمت: اس سے پہلی آیۃ کریمہ کو ﴿وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ﴾ سے ختم کیا، اور اس آیۃ کریمہ کو ﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ سے ختم کیا، اس میں عجیب حکمت یہ پائی گئی کہ پہلی آیۃ کریمہ میں ان کے کفر کا ذکر فرمایا، ان کا کفر ظاہر تھا، اسی کے مطابق اللہ تعالی نے ﴿وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ﴾ ذکر فرمایا کہ اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ لیکن اس آیۃ کریمہ میں ان کے مسلمانوں کو راہ راست سے ہٹانے کی ناپاک جسارت کا ذکر فرمایا یہ کام یہ حیلے، بہانے سے کرتے تھے، تو اس کے مناسب رب تعالی نے ذکر فرمایا ﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ تمہارے کرتوتوں سے غافل نہیں۔

يَـاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كَافِرِيْنَ ○ (آیۃ نمبر ۱۰۰)

(1) اے ایمان والو! اگر تم کچھ کتابیوں کے کہنے پر چلے تو وہ تمہارے ایمان کے بعد تمہیں کافر کر چھوڑیں گے۔ (کنزالایمان)

(2) اے ایمان والو! اگر تم نے فرمانبرداری کی ایک فریق کی ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئے تو وہ تمہیں پھیر دیں گے تمہارے ایمان کے بعد حالت کفر میں۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول:

بہت طویل روایت کی وجہ سے ترجمہ پر اکتفاء کیا جارہا ہے، عربی عبارت روح المعانی، درمنشور، بیضاوی وغیرہ میں دیکھی جائے، یہ بھی خیال رہے شان نزول جو ابھی بیان کیا جارہا ہے وہ روح المعانی اور درمنشور نے ﴿قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِآيَاتِ اللهِ﴾ کی تفسیر میں بیان کیا ہے، اور علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے اس زیر بحث آیۃ کریمہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔

❁ ابن اسحاق، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے زید بن اسلم سے روایت ذکر کی کہ مرشاس بن قیس ایک بوڑھا شخص تھا، زمانہ جاہلیت میں مسلمانوں کے خلاف شدید حسد رکھتا تھا، کفر میں بہت اونچا درجہ رکھتا تھا، مسلمانوں کے خلاف دل میں کھوٹ کینہ اس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتھا، ایک مرتبہ یہ گذر رہا تھا تو اس نے اوس اور خزرج قبائل کے مسلمانوں کو ایک جگہ بیٹھے ہوئے آپس میں باہم شیر وشکر دیکھا، اور یہ دیکھ کر حیران ہوگیا کہ اسلام نے ان میں کس طرح الفت ومحبت پیدا کردی، ورنہ یہ دونوں قبیلے ایک دوسرے کے بہت بڑے دشمن تھے، ان کے درمیان بہت شدید جنگیں لڑی گئیں۔ وہ کہنے لگا بنی قیلہ کے یہ سردار آپس میں متحد ومتفق رہے تو ہمارا کیا بنے گا، یہ تو ہم پر چھا جائیں گے ہمیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ اس نے یہود کے چند نوجوانوں کو کہا تم ان کی مجلس میں چلے جاؤ، ان کو یوم بعات کی لڑائی یاد دلاؤ، اور اس جنگ کے متعلق کہے گئے اشعار ان دونوں کو سناؤ۔ بعات کا دن وہ دن تھا جس میں اوس اور خزرج کے درمیان لڑائی ہوئی، فتح اوس کو حاصل ہوئی تھی، جب یہود کے نوجوانوں نے اس جنگ کے متعلق اشعار اس محفل میں پڑھے جس میں اوس وخزرج آپس میں محبت سے مل جل کر بیٹھے تھے، جب انہوں نے وہ اشعار

سنے، تو ان کے جذبات بھڑک اٹھے، یہاں تک کہ اوس بن قیظی جو اوس قبیلہ کے بنی حارثہ میں سے تھا، اور جبار بن صخر جو خزرج قبیلہ کے بنی سلمہ میں سے تھا، ان کے درمیان تکرار شروع ہو گئی، ایک دوسرے کے خلاف تیز زبانیں کھل گئیں، معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ ایک دوسرے فریق کو کہا گیا آؤ میدان جنگ میں نکلو، ایک مرتبہ پھر دو دو ہاتھ کرتے ہیں، پتہ چل جائے گا بہادر کون ہے، ہر فریق اپنی اپنی بہادری بیان کر رہا ہے، دوسرے کو طعنہ دے رہا تھا۔ دونوں فریق اپنے اپنے ہتھیار لے کر مقام حرہ میں پہنچ گئے، وہی زمانہ جاہلیت کے مطابق ایک دوسرے کو آواز کسنے لگے، آؤ ہمارے مقابل تمہیں پتہ چل جائے، ادھر مصطفیٰ کریم ﷺ کو پتہ چلا، تو آپ چند مہاجرین صحابہ کرام کو ساتھ لے کر ان کے مقابلہ میں میدان جنگ میں پہنچ گئے اور ارشاد فرمایا۔

"یا معشر المسلمین الله الله بدعوی الجاهلیة و انا بین اظهر کم بعد اذهداکم الله الی الاسلام و اکرمکم به و قطع به عنکم امر الجاهلیة و استنقذکم به من الکفر و الف به بینکم ترجعون الی ما کنتم علیه کفارا فعرف القوم الهانزغة من الشیطان و کیدمن عدو هم لهم فالقواالسلاح وبکواوعانق الرجال بعضهم بعضاثم انصرفوامع رسول الله ﷺ سامعین مطیعین قد اطفا الله عنهم کید عدوا الله شاس "

اے مسلمانوں کی جماعت! اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو، کیا تم زمانہ جاہلیت کے طریقہ پر عمل کر رہے ہو، جبکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں اور اس کے بعد جب تمہیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کی ہدایت دی اور تمہیں اللہ تعالیٰ نے مکرم بنایا ہے، اور تم سے جاہلیت کو دور کر دیا ہے، اور تمہارے درمیان الفت ومحبت ڈال دی، کیا تم پھر کفر کی طرف لوٹنا چاہتے ہو؟ (العیاذ باللہ) اب قوم کو بات سمجھ آ گئی کہ ہمارے درمیان اختلافات کو بھڑکانے والا شیطان کا وسوسہ تھا، اور ہمارے دشمن کا مکر وفریب تھا، انہوں نے ہتھیار پھینک دیئے اب وہ پھر ایک دوسرے کے گلے ملنے لگے، اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ واپس لوٹ آئے، آپ کے ارشادات کو (دل وجان سے) سن رہے تھے، آپ کی فرمانبرداری میں مشغول ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں سے دشمنی کی وہ آگ نکال دی جو اللہ کے دشمن شاس یہودی نے بھڑکائی تھی، پہلی دو آیات ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ﴾ سے لے کر ﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ تک شاس بن قیس اور اس کے فعل کے متعلق نازل ہوئیں۔ اور یہ زیر بحث آیۃ کریمہ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِیْعُوْا﴾ سے لے کر ﴿اُولٰٓئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ﴾ تک آیات اوس بن قیظی اور جبار بن صخر اور ان کے ساتھیوں اور ان کے افعال کے متعلق نازل ہوئی جنہوں نے مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکا کر ان کو لڑنے پر آمادہ کر لیا۔ (ماخوذ از درمنثور)

ماقبل سے تعلق:

پہلی دونوں آیتوں میں اہل کتاب یعنی یہود ونصاریٰ کو ڈرایا گیا کہ تم اللہ تعالیٰ کی آیات سے کیوں کفر تے ہو، اور دوسری آیۃ میں ان کو کہا گیا کہ تم مسلمان کو راہ راست سے ہٹانے کی ناپاک جسارت کیوں کر رہے ہو؟ ان دونوں آیتوں میں یہود ونصاریٰ کو کہا گیا تم اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آؤ گے، اب اس آیۃ کریمہ میں مومنوں کو ڈرایا گیا کہ اگر تمہیں یہود ونصاریٰ بھٹکانے کی کوشش کریں تو بھٹک نہ جانا، اگر وہ تمہیں گمراہ کرنے کی کوشش کریں تو گمراہ نہ ہو جانا بلکہ ان کی باتوں کی طرف توجہ بھی نہ کرنا۔ (کبیر)

رب تعالیٰ نے مومنوں کو اس لئے متنبہ کیا:

"ان المؤمنين ان لانوا وقبلوا منهم قولهم ادى ذلك حالا بعد حال الى ان يعود واكفارا والكفر يوجب الهلاك فى الدنيا والدين"

کہ بیشک مؤمنین نے اگر یہود ونصاریٰ کے سامنے نرمی کا مظاہرہ کیا، اور ان کی باتوں کو مان لیا تو وہ آہستہ آہستہ انہیں کافر بنا دیں گے، اور کفر ان کا دین اور ان کی دنیا برباد کر دے گا، آج ہم دیکھتے ہیں یہود ونصاریٰ کے یار مسلمانوں اور اسلام کے غدار نظر آتے ہیں، اور قادیانی اور نیچری بن کر اپنی عاقبت برباد کر بیٹھے۔ "الحفیظ الامان"

کافروں کے یار جب کافر بن گئے تو ان کا دین تو برباد ہونا عقل میں آتا ہے، لیکن ان کی دنیا کیسے برباد ہو جاتی ہے؟ بظاہر تو عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کافروں سے پیسے بٹورنے کیلئے ہی تو ان کے ہمنوا بنے اور یہود ونصاریٰ اپنے یاروں کو بہت مالی امداد کرتے ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے۔

"واما فى الدنيا فبوقوع العداوة والبغضاء وهيجان الفتنة وثوران المحاربة المؤدية الى سفك الدماء"

دنیا ان کی اس طرح برباد ہو جاتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے دشمن بن جاتے ہیں، اور مسلمانوں سے بغض شروع کر دیتے ہیں، وہ فتنہ بھڑکا دیتے ہیں، وہ لڑائی کو بھڑکاتے ہیں، جس سے مسلمانوں کا ہی خون بہاتے ہیں۔ (کبیر)

آج کل ہم علامہ رازی رحمہ اللہ کی بیان کردہ وجوہ کو دیکھتے ہیں تو سو فیصد سچی نظر آرہی ہیں، کل تک جن لوگوں کو مجاہد کہتے کہتے زبانیں نہیں تھکتی تھیں، آج ان کو ہی نام نہاد مسلمان قتل کر کے اپنے دین و دنیا برباد کر رہے ہیں۔

ایک عجیب نکتہ:

اگر چہ آیۂ کریمہ اوس اور خزرج کے حق میں نازل ہوئی جو اسلام لانے اور باہم شیر وشکر ہو جانے کے بعد یہود سے سازش سے ایک دوسرے سے لڑنے کیلئے جنگ میں اتر آئے، لیکن ضمناً یہ خطاب تمام مؤمنین کو ہے۔

"وخاطبهم الله تعالى بنفسه بعد ماامر رسوله ﷺ بخطاب اهل الكتاب اظهار الجلالة قدرهم واشعار ابانهم هم الاحقاء بان يخطابهم الله تعالى ويكلمهم فلا حاجة الى ان يقال المخاطب للرسول ﷺ بتقدير قل لهم"

اللہ تعالیٰ نے جب اہل کتاب یعنی یہود ونصاری کو خطاب کیا تو نبی کریم ﷺ کے ذریعے ارشاد فرمایا ﴿قُلْ يَا اَهْلَ الْكِتَابِ﴾ آپ فرما دیجئے اے اہل کتاب" یعنی وہ ذلیل لوگ ہیں اس لئے اے میرے محبوب میں ان سے براہ راست بات نہیں کرنا چاہتا، اسلئے آپ کو کہتا ہوں "قُلْ" آپ ہی ان کو فرما دیں، لیکن جب مؤمنوں کو خطاب کرنے کی باری آئی تو درمیان میں "قُلْ" کا واسطہ نہیں رکھا، یہ نہیں کہا کہ اے محبوب آپ مؤمنوں کو کہہ دیں، اگر چہ مومنوں تک بھی رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ہی بات تو پہنچی لیکن ان کو جلیل القدر سمجھتے ہوئے رب تعالیٰ نے اس قابل سمجھا کہ ان کو براہ راست کہا جائے ﴿يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ "اے ایمان والو!" (روح المعانی)

"فَرِيْقًا" سے مراد اگر چہ بظاہر "شماس بن قیس" یہودی مراد ہے، لیکن عموم لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے مراد تمام ہی کافر ہیں، کہ تمام کفار یہی چاہتے ہیں کہ مومنین بھی ہماری طرح کافر ہو جائیں۔ (روح المعانی)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"كَافِرِيْنَ" ترکیبی لحاظ پر یا تو "مفعول" ہے، اور "يَرُدُّوْكُمْ" تصییر کے معنی کو متضمن ہے کہ "وہ تمہیں کفر کی طرف پھیر دیں گے" اور یا "حال" واقع ہے، مفعول سے، اس صورت میں معنی ہو "وہ تمہیں لوٹا دیں گے حالت کفر کی طرف" مفعول والا معنی لینا زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس میں ایمان والوں کی طرف ان کے پہلے کفر کی نسبت بھی نہیں، مطلب یہ ہے کہ "اے ایمان والو اگر تم نے اہل کتاب میں سے ایک فریق کی تابعداری کی تو وہ تمہیں کفر کی طرف پھیر دیں گے" لیکن اگر حال والا معنی ہو تو ایمان والوں کا پہلا کفر واضح ہوگا اب مطلب یوں ہوگا "اے ایمان والو اگر تم نے اہل کتاب میں سے ایک فریق کی تابعداری کی تو وہ تمہیں کفر کی طرف لوٹا دیں گے، اور پہلا معنی لینا اس لئے بھی زیادہ معتبر ہے کہ خطاب عام ہے، اس لئے جدی پشتی ایمان والوں کو جب خطاب ہوگا تو دوسرا معنی بغیر تاویل کے درست ہی نہیں ہوگا۔ (ماخوذ از روح المعانی بوضاحت)

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍO (آیة نمبر ۱۰۱)

(1) اورتم کیونکر کفر کرو گے تم پر اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور تم میں اس کا رسول تشریف لایا، اور جس نے اللہ کا سہارا لیا تو ضرور وہ سیدھی راہ دکھایا گیا۔ (کنزالایمان)

(2) اورتم کیسے کفر کرو گے حالانکہ تلاوت کی جاتی ہیں تم پر اللہ کی آیتیں اور تم میں اس کے رسول موجود ہیں، اور جس نے سہارا لگایا اللہ سے تو تحقیق ہدایت دی گئی اسے سیدھی راہ کی۔ (نجوم الفرقان)

"کَیْفَ" اس مقام میں تعجب انکاری کے ہے "کہ تم کیسے کفر کرو گے" تمہاری شان کے لائق نہیں کہ تم کفر تک پہنچ جاؤ"

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا حسین وجمیل ترجمہ:

اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ نے ﴿وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ﴾ کا ترجمہ کیا ہے "اور تم کیونکہ کفر کرو گے" اور یوں ترجمہ نہیں کیا "اور تم کیونکر کفر کرتے ہو" کیونکہ یہ خطاب تو اوس اور خزرج کے مسلمان صحابہ کرام کو ہے جو وقتی طور پر یہود کی سازش سے ایک دوسرے کے سامنے لڑائی کیلئے جمع ہو گئے، ان کو رب تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم یوں ہی یہود کی سازش کا شکار ہوتے رہے تو وہ تمہیں آہستہ آہستہ کافر بنا دیں گے، تم بھلا کیسے کافر ہو گے؟ نہیں نہیں تم کافر نہیں ہو گے تم پر اللہ کے نبی براہ راست اللہ تعالیٰ کی آیات کو تلاوت کر رہے ہیں، خود بنفس نفیس رسول اللہ ﷺ تمہارے درمیان موجود ہیں، لھذا تمہیں چاہیے کہ تم اللہ تعالیٰ پر سہارا لگاؤ، جس نے اللہ تعالیٰ پر سہارا لگایا اسے سیدھی راہ کی ہدایت دے دی گئی۔

اعتراض: وکلمة کیف تعجب، والتعجب انما یلیق بمن لا یعلم السبب وذلک علی الله محال"

کلمہ "کیف" تعجب کیلئے ہے، اکثر مفسرین کرام نے یہی لکھا ہے تعجب تو وہاں ہوتا ہے جہاں اسباب کا علم نہ ہو کہ یہ کیسے ہو گیا؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ پر اسباب کا مخفی رہنا محال ہے، تو اس مقام میں "کیف" کا تعجب کے معنی میں استعمال کس طرح درست ہے؟

جواب: والمراد منه المنع والتغلیظ وذلک لان تلاوة آیات الله علیهم حالا بعد حال مع کون الرسول فیهم الذی یزیل کل شبهة ویقرر کالحجة کالمانع من وقوعهم فی الکفر، فکأن صدور الکفر عن الذین کانوا بحضرة الرسول ابعد من هذا الوجه"

اس مقام میں "کَیْفَ" صرف تعجب کیلئے نہیں کہ اعتراض وارد ہو سکے، بلکہ تعجب اور انکار کیلئے ہے، یعنی استفہام انکاری کیلئے ہے جو تعجب پر دلالت کر رہا ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات ان پر وقتاً فوقتاً (آہستہ آہستہ بوقت ضرورت) تلاوت کی جارہی ہیں، خصوصاً وہ آیات جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کررہی ہیں وہ ان پر رسول اللہ ﷺ تلاوت کر رہے ہیں، اور آپ خود ان میں تشریف فرما ہیں، ان کے شبہات کو آپ خود زائل کر رہے ہیں، ان پر دلائل قائم کر رہے ہیں یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ان کو کفر سے روکا جارہا ہے، پھر ان کا رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں یہود کی سازش کا شکار ہو جانا اور آہستہ آہستہ کفر کی طرف پہنچ جانے کا امکان بعید تھا، اب واضح ہو گیا کہ "کَیْفَ" استفہام انکاری کیلئے ہے ضمناً تعجب بھی پایا گیا ہے، لھذا کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ (ماخوذ از تفسیر کبیر)

اللہ تعالیٰ کی کتاب کا ان پر پڑھا جانا اور نبی کریم ﷺ کا ان مؤمنین میں موجود ہونا کفر سے عقلاً بعید ہے "وجود هاتين الحالتين تنافي الكفر ولا تجامعه" یہ دونوں چیزیں کفر کے مخالف ہیں، اس لئے ان میں کفر کا پایا جانا منع تھا "فلايتطرق اليهم كفر مع ذلك" صحابہ کرام پر قرآن پاک کی آیات کا پڑھا جانا اس پر دلالت کر رہا ہے کہ کفران کے قریب کھٹک بھی نہیں سکتا۔

فرق واضح ہو گیا:

اگر چہ یہاں بھی ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ ہے، اور ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا﴾ میں بھی ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ ہے، لیکن ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا﴾ میں خطاب حقیقت میں کفار کو ہے، لھذا وہاں کفر کا سرزد ہونا حقیقی طور پر پایا گیا ہے، لیکن اس آیۃ کریمہ خطاب مؤمنین کو ہے "وليس المعنى انه وقع منهم الكفر فوبخوا على وقوعه لانهم مؤمنون ولذلك نودوا بقوله "يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا" اس آیۃ کریمہ میں یہ معنی نہیں کہ جن کو خطاب ہے ان سے کفر واقع ہوا اور ان کو اس پر ڈانٹ ڈپٹ دی گئی ہو، بلکہ یہ خطاب تو مؤمنین کو ہے، جس پر پچھلی آیۃ کریمہ واضح طور پر دلالت کر رہی ہے، جس کی ابتداء ہی "يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا" سے کی گئی ہے۔ (البحر المحیط)

البحر المحیط کی اس طویل بحث کو اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ نے اپنے ترجمہ میں خوبصورت انداز پر سمو دیا ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

مقام توجہ: والخطاب قال الزجاج لاصحاب النبی ﷺ خاصة لان النبی ﷺ كان فيهم وهم يشاهدونه وقيل لجميع الامة لان آثاره وسنة فيهم وان لم يشاهدوه"

آیہ کریمہ میں خطاب براہ راست تو آپ کے صحابہ کرام کو ہے کہ آپ ان میں تشریف فرماتھے، اور وہ آپ کا مشاہدہ کرر ہے تھے، لیکن بالواسطہ خطاب آپ کی تمام امت کو ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کے آثار اور آپ کی سنتیں آپ کی تمام امت میں موجود ہیں، اگرچہ براہ راست نبی کریم ﷺ کا صحابہ کرام کے بعد والے لوگ مشاہدہ تو نہیں کرر ہے، لیکن آپ کے آثار اور آپ کی سنتیں گویا کہ آپ کے مشاہدہ پر ہی دلالت کر رہی ہیں۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

﴿وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾

اور جس نے سہارا لگایا اللہ سے تو تحقیق ہدایت دی گئی اسے سیدھی راہ کی۔

"ومن يعتصم بالله "ومن يتمسك بدينه اويلتجئي اليه في مجامع اموره"

بیضاوی رحمہ اللہ نے دو معنی بیان کئے ہیں کہ یا تو "ومن يعتصم بالله" کا معنی یہ ہے "ومن يتمسك بدينه" اور جس اللہ تعالی کے دین کو مضبوطی سے پکڑا تو تحقیق اسے سیدھی راہ دی گئی، اور یا اس کا معنی یہ ہے "ومن يلتجئي اليه في مجامع اموره" جس نے اپنے تمام امور میں اللہ تعالی سے پناہ پکڑی تو اسے سیدھی راہ کی ہدایت دی گئی۔ اس کی مزید وضاحت دیکھئے:

"الاعتصام هو الاستمساك بالشئي واصله من العصمة بمعنى المنع والعاصم المانع واستعصم فلان بالشئي اذا تمسك بالشئي في منع نفسه عن الوقوع في آفة واعتصم الرجل بصاحبه لزمه وتمسك به في الامتناع عما يضر والعصمة المنع يقال عصمة الطعام اى منعه من الجوع"

اعتصام کا معنی ہے "کسی چیز سے سہارا لگانا" اصل میں عصمت کا معنی ہے منع کرنا، اور عاصم کا معنی ہے "منع کرنے والا" اسی طرح کہا جاتا ہے "استعصم فلان بالشئي "فلاں شخص نے ایک چیز سے سہارا لگا کر اپنے آپ کو گرنے سے یا کسی مصیبت میں پھنسنے سے بچا لیا۔ "عصمة" کا معنی ہے منع کرنا، جیسے کہا جاتا ہے "عصمه الطعام" طعام نے اس کی بھوک کو روک دیا۔

اب اس تفصیل کے بعد یہ سمجھا جائے کہ علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے جو دو معانی بیان کئے اس کی وجہ کیا ہے؟

"وبالجملة لابد في الاعتصام من ملاحظة معنى التمسك والتمسك بالله تعالى حقيقة لايتصور فلابد ان يقدر مضاف وهو الذين اويجعل الاعتصام بالله استعارة للالتجاء اليه بان يشبه الالتجاء بالتمسك"

حاصل کلام یہ ہے کہ ''اعتصام'' کا معنی ہے سہارا لگانا، جیسا کہ کسی دیوار وغیرہ سے سہارا لگایا جائے، اس معنی کے لحاظ سے اللہ تعالی سے تمسک (سہارا لگانا) نہیں پایا جا سکتا، اس لئے یا تو ضروری ہے کہ حذف مضاف والا قانون پایا جائے، معنی ہو جائے ''ومن یعتصم بدین اللہ'' جو شخص اللہ تعالی کے دین سے سہارا لگاتا ہے تو تحقیق اسے سیدھی راہ کی ہدایت دے دی گئی، اور یا مجازی طور پر ''اعتصام'' کا معنی ''التجاء'' کرلیا گیا ہے، سہارا لگانے کا مطلب ہے پناہ پکڑنا، اب اس معنی کے لحاظ پر مطلب یہ ہوگا ''اور جس نے پناہ پکڑی اللہ تعالی کی تو تحقیق اسے سیدھی راہ کی ہدایت دے دی گئی۔ (شیخ زادہ)

دینی طلباء کرام کی خصوصی توجہ کیلئے:

وجیء فی الجواب بقد دلالة علی التحقیق والتوقع فان کلمة قد سواء دخلت علی الماضی او المضارع لابد فیها معنی التحقیق ثم انه ینضاف فی بعض المواضع الی هذاالمعنی فی الماضی التقریب من الحال مع التوقع ای بکون مصدره متوقعا لمن یخاطبه واقعا عن قریب کما تقول لمن یتوقع رکوب الامیر ،قدرکب، ای حصل عن قریب ماکنت تتوقعه،ولا شک ان المعتصم بالله متوقع لهدایته وقوله لامحالة اشارةالی مافی قد من معنی التحقیق''

''فقد هدی'' میں لفظ ''قد'' لایا گیا ہے، جو تحقیق اور توقع کا معنی دیتا ہے، لفظ ''قد'' خواہ ماضی پر داخل ہو یا مضارع پر، اس میں تحقیق کا معنی ضرور پایا جاتا ہے، یعنی مضارع پر داخل ہو کر تقلیل کا معنی بھی پایا جاتا اور تحقیق کا بھی ''قد یجئ'' کا معنی ہوگا تحقیق وہ کبھی کبھی آئے گا، اور ماضی پر داخل ہو تو تحقیق کے ساتھ ساتھ اس میں کبھی کبھی ''توقع'' کا معنی بھی پایا جاتا ہے، جیسا کہ کہا جائے ''قدرکب'' جس کے سوار ہونے کی توقع تھی تحقیق وہ قریب زمانہ میں سوار ہو گیا، اب اس تمہید کے بعد معنی یہ ہوا ﴿وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ اور جس نے اللہ تعالی پر سہارا لگایا اسے توقع تھی کہ رب تعالی کی طرف سے اسے سیدھی راہ کی ہدایت حاصل ہوگئی، تحقیق اسے سیدھی راہ کی ہدایت دے دی گئی۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

اهلسنت وجماعت کا مذهب:

اللہ تعالی اپنے بندوں کے تمام افعال کا خالق ہے، جو اس آیۃ کریمہ سے ثابت ہو رہا ہے ''فلما جعل ذلک الاعتصام فعلالهم وهدایة من الله ثبت ماقلناه'' جب اللہ تعالی سے سہارا لگانا بندوں کا فعل ہے اور

ہدایت اللہ تعالیٰ سے حاصل ہوتی ہے تو اس سے ہمارا مذہب ثابت ہو گیا۔

معتزلہ کا مذہب:

وہ کہتے ہیں بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں، وہ اس آیۃ کریمہ کی مختلف توجیہات بیان کرتے ہیں کبھی کہیں گے ہدایت کا مطلب زیادہ رحمت، کبھی کہیں گے ہدایت کا معنی ہے جنت کی راہ، کبھی کہیں گے ہدایت کا معنی اچھے فعل کی تخلیق کی ان کو توفیق دی جاتی ہے، اور کبھی کہیں گے یہ خبر ہے کہ اللہ تعالیٰ پر سہارا لگانے والوں نے اپنے اچھے اعمال کی تخلیق خود کر لی۔ (ماخوذ از کبیر)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ○ (آیۃ نمبر ۱۰۲)

(1) اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان۔ (کنز الایمان)

(2) اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے جیسا کہ حق ہے اس سے ڈرنے کا، اور ہرگز تم نہ مرنا مگر یہ کہ تم مسلمان ہو۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

پچھلی آیۃ کریمہ میں بیان کیا کہ یہود و نصاریٰ چاہتے ہیں تمہیں اسلام سے پھیر دیں، اسلئے ان کی سازشوں سے ہوشیار رہنا، گمراہ کرنے کی ان کی سازش کو ناکام بنا دینا، تاکہ تم دین پر قائم رہ سکو، اور گمراہی سے بچ جاؤ، اب اس آیۃ کریمہ میں تمام طاعات پر قائم رہنے کا حکم دیا، تفسیر کے الفاظ یہ ہیں "لما حذر هم تعالى من اضلال من يريد اضلالهم امرهم بجميع الطاعات" (البحر المحیط)

﴿يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ "اے ایمان والو!۔"

یہ ترجمہ جو نقل کیا گیا ہے، یہ مختصر ہے، ورنہ مکمل الفاظ کا ترجمہ یہ ہے (اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو) پچھلی آیۃ کریمہ میں بھی خطاب ﴿يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے کیا، یہاں دوبارہ ﴿يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے خطاب کیا، جس

سے مسلمانوں کی شرافت وبزرگی کو ظاہر کیا گیا ہے، خاص کر کے جب پچھلی آیۃ کریمہ "اوتوا الکتاب" ذکر کیا گیا ، تو وہم ہوتا تھا کہ شاید یہود ونصاریٰ تو "اہل کتاب" ہیں وہ ہم سے کہیں افضل نہ ہوں، تو اس وہم کا ازالہ "﴿یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے کردیا، (اے ایمان والو) یقینی بات ہے، ایمان مکمل اسی وقت ہوگا جبکہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی رسالت اور قرآن پاک پر بھی ایمان لائے گا، تو گویا ﴿یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ کہہ کر نبی کریم ﷺ کے ایماندار لوگوں کو بتایا گیا کہ تم تمام امتوں سے افضل ہو، اسلئے کہ تمہارے نبی سب نبیوں سے افضل ہیں ، اور تمہاری کتاب سب کتابوں سے افضل ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی بالوضاحت)

﴿اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ﴾ "ڈرو اللہ سے جیسا کہ حق ہے اس سے ڈرنے کا۔"

اس آیۃ کریمہ میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ الفاظ مبارکہ منسوخ ہیں، اور دوسرا یہ کہ یہ منسوخ نہیں، جن حضرات نے کہا ﴿اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ﴾ 'منسوخ ہیں، انہوں نے کہا کہ اس میں روایات موجود ہیں جن سے یہ مسئلہ واضح ہوجاتا ہے۔ (کبیر)

❁ اخرج ابن المبارک فی الزھد وعبدالرزاق والفریابی وعبد بن حمید وابن ابی شیبہ وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم والنحاس فی الناسخ والطبرانی والحاکم وصححہ وابن مردویہ عن ابن مسعود فی قولہ "اتقوا اللہ حق تقاتہ" قال ان یطاع فلا یعصی ویذکر فلا ینسی ویشکر فلا یکفر"

حضرت ابن مسعود ﷛ (موقوف حدیث) بیان فرماتے ہیں ﴿اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے اس کی نافرمانی نہ کی جائے اور اسے یاد کیا جائے اس کی یاد کو چھوڑا نہ جائے ، اور اس کو شکر ادا کیا جائے ، اس کی نعمتوں کا کفران (ناشکری) نہ کی جائے۔ (ماخوذ از درمنثور)

❁ واخرج الحاکم وصححہ وابن مردویہ من وجہ آخر عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ (اتقوا اللہ حق تقاتہ) ان یطاع فلا یعصی وان یذکر فلا ینسی"

حاکم نے مستدرک میں حدیث بیان کی جسے اس نے صحیح قرار دیا اور ابن مردویہ نے بھی ایک اور سند سے حضرت ابن مسعود ﷛ سے مرفوع حدیث بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے ، اس کی نافرمانی نہ کی جائے ، اور اسے یاد کیا جائے اس کی یاد کو چھوڑا نہ جائے۔ (ماخوذ از درمنثور)

✿ واخرج عبد بن حمید عن عکرمة (اتقوا الله حق تقاته)قال ان یطاع فلا یعصی وان یذکر فلا ینسی قال عکرمة قال ابن عباس فشق ذلک علی المسلمین فانزل الله بعدذلک فاتقوا الله مااستطعتم"

عبد بن حمید نے حضرت عکرمہ سے روایت نقل کی کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ﴾ امطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی جائے نافرمانی نہ کی جائے اور اسے یاد کیا جائے اس کی یاد کو چھوڑا نہ جائے، حضرت عکرمہ فرماتے ہیں حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا کہ جب یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی تو مسلمانوں کا اس پر عمل کرنا شاق گذرا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد یہ الفاظ مبارکہ نازل فرمائے ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ تو تم اللہ سے ڈرو جب تک تم طاقت رکھتے ہو۔ (ماخوذ از در منثور)

✿ واخرج ابن مردویه عن ابن عباس فی قوله (اتقوا الله حق تقاته)ان یطاع فلا یعصی فلم یستطیعوا قال الله تعالی فاتقوا الله مااستطعتم"

ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ذکر کی ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے جیسا کہ اس کی اطاعت کا حق ہے اور اس کی نافرمانی نہ کی جائے، تو صحابہ کرام کو اس پر عمل کرنے کی طاقت حاصل نہ ہوئی، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ تو اللہ سے ڈرو جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔ (ماخوذ از در منثور)

صحابہ کرام پر عمل شاق کیوں گذرا؟

✿ واخرج ابن ابی حاتم عن سعید بن جبیر قال لما نزلت هذه الآیة اشتد علی القوم العمل فقاموا حتی ورمت عراقیبهم وتقرحت جباههم فانزل الله تخفیفا علی المسلمین فاتقوا الله مااستطعتم فنسخت الآیة الاولی"

ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر کی روایت نقل کی کہ جب آیۃ کریمہ ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ﴾ نازل ہوئی تو قوم (صحابہ کرام) کا اس پر عمل کرنا مشکل ہوگیا (کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حق یوں ادا کیا) کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کھڑے ہوکر شروع کی یہاں تک کہ ان کے پاؤں سوج گئے، ان کی پیشانیاں زخمی ہوگئیں تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر تخفیف کیلئے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ "تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جتنی طاقت رکھتے ہو" اسی سے پہلی آیۃ ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ﴾ منسوخ ہوگئی۔ (از در منثور)

بعض حضرات نے اس آیۃ کو منسوخ نہیں مانا:

ان حضرات کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) الاول ما روی عن معاذ انه ﷺ قال له هل تدری ما حق الله علی العباد؟قال الله ورسوله اعلم قال هو ان یعبدوه ولا یشرکوا به شیئا" وهذامما لایجوزان ینسخ"

ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا کیا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر کیا حق ہے؟ (یعنی اس سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) اس حق کا کیا مطلب ہے؟ تو انہوں نے عرض کیا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ ہی زیادہ بہتر جانتے ہیں، تو آپ نے فرمایا کہ رب تعالیٰ کا بندوں پر یہ حق ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرائیں' (یہ حکم منسوخ نہیں) کیونکہ نہ اس کی عبادت کو چھوڑنے کی اجازت ہے، اور نہ ہی اس سے شریک ٹھہرانے کی اجازت ہے۔

(۲) والثانی ان معنی قوله "اتقوا الله حق تقاته"ای کما یحق ان یتقی وذلک بان یجتنب جمیع معاصیه"

ان حضرات کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے کہ تمام معاصی سے اجتناب کرو، اگر آیۃ کریمہ کو منسوخ مانا جائے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ بعض معاصی کی اجازت دے دی گئی (معاذ اللہ) ایسا تو ہو نہیں سکتا لھذا آیۃ کریمہ منسوخ نہیں ہو سکتی۔ (ماخوذ از کبیر)

محاکمہ: دونوں قولوں میں محاکمہ اور تطبیق پائی گئی ہے، کسی قسم کا کوئی تعارض نہیں، اسلئے کہ جب ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، کہ تم ساری ساری رات قیام اور سجود میں گذارو جس سے ان کے پاؤں پر ورم آگیا اور ان کی پیشانیاں زخمی ہو گئیں، اس معنی کے لحاظ پر ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ سے منسوخ ہے۔ اور اگر معنی یہ لیا جائے کہ تم اپنی طاقت کے مطابق اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے تو آیۃ کریمہ منسوخ نہیں، اتنا مسئلہ واضح ہے ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔ (راقم)

اعتراض: فان قیل الیس انه تعالیٰ قال ﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "انہوں

نے اللہ کی قدر نہیں جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق تھا، اس سے پتہ چلا کہ مؤمنین نے اللہ تعالیٰ کی قدر کرنے کا جو حق تھا اس طرح قدر نہیں کی، اور دوسری بات یہ سمجھ آئی کہ ''تکلیف مالا یطاق'' جائز ہے، اسی وجہ سے طاقت سے زائد قدر کرنے کا گویا کہ حکم دے کر کہا گیا ہے کہ انہوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسا کہ قدر کرنے کا حق تھا۔

جواب: قلنا سنبین فی تفسیر هذه الآیة انها جاء ت فی القرآن فی ثلاثة مواضع وکلها فی صفة الکفار لافی صفة المسلمین ''

﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ کی مکمل تفسیر تو اپنی اپنی جگہ آئے گی ان شاء اللہ، البتہ اجمالی جواب یہ سمجھ لیا جائے کہ قرآن پاک میں یہ الفاظ مبارکہ تین جگہ پر آئے ہوئے ہیں، ہر جگہ میں کافروں کے حق میں یہ نازل ہوئے ہیں مسلمانوں کے حق میں کہیں بھی نازل نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

حقیقت یہی ہے کہ فتنہ وفساد کی جڑ ہی یہ ہے کہ کافروں کے حق میں نازل ہونے والی آیات کو مسلمانوں پر چسپاں کیا جائے۔

اظہار شکر:

اللہ تعالیٰ کا ان گنت مرتبہ شکر ہے کہ راقم اپنے ذہن سے کوئی چیز تحریر کر دیتا ہے پھر اسے کسی تفسیر سے تائید حاصل ہوتی ہے، دینی مدارس کے میرے پیارے طلباء کرام آیئے! تفسیر خازن کی عبارت کو دیکھیں اور راقم کے محاکمہ کو دیکھیں لفظ بلفظ مطابق پائیں گے۔

''وموجب هذا الاختلاف یرجع الی معنی الآیة فمن قال انها منسوخة قال حق تقاته هو ان یاتی العبد بکل ما یجب لله ویستحقه فهذا یعجز العبد عن الوفاء به فتحصیله ممتنع ومن قال بانها محکمة قال ان حق تقاته اداء ما یلزم العبد علی قدر طاقته فکان قوله تعالی ''فاتقوا الله ما استطعتم'' مفسرًا لحق تقاته لاناسخا ولا مخصصا، فمن اتقی الله ما استطاع فقد اتقاه حق تقواه'' (خازن)

﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ ''اور ہرگز تم نہ مرنا مگر یہ کہ تم مسلمان ہو۔''

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ کی ایک ترکیب یہ ہے کہ یہ جملہ حالیہ ہے، اس کے مطابق مطلب یوں ہو گیا ''و لا

تکونن علی حال سوی حال الاسلام اذا ادرککم الموت" اور ہرگز نہ ہونا کسی حال پر سوائے حالت اسلام کے جب تمہیں موت پائے۔ لفظوں کے مطابق ترجمہ یوں ہوگا "اور ہرگز تم نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو"
(مدارک التنزیل للنسفی)

پہلا معنی:

"ولا تموتن" جمع مذکر مخاطب نہی حاضر معلوم مؤکد بانون تاکید ثقیلہ ہے، لیکن امر کے معنی کو مستلزم ہو، یعنی ﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ﴾ کا مطلب یہ ہے "کونوا علی الاسلام فاذاود علیکم الموت صادفکم وانتم علی الاسلام" تم اسلام پر قائم رہو، جب تمہارے پاس موت آئے تو وہ تمہیں اسلام پر قائم پائے۔
(خازن)

"(ولا تموتن الا وانتم مسلمون)ای حافظوا علی الاسلام فی حال صحتکم وسلامتکم لتموتوا علیه فان الکریم قد اجری عادته بکرمه ، انه من عاش علی شئی مات علیه ومن مات علی شئی بعث علیه فعیاذبالله من خلاف ذلک"

"تم ہرگز نہ مرنا مگر یہ کہ تم مسلمان ہو" اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی صحت اور سلامتی کے حال میں اسلام کی حفاظت کرو، اسلئے کہ رب کریم کی عادت کریمہ یہ ہے کہ جو شخص کسی عمل پر دنیا کی زندگی میں ہوتا ہے اسے اسی حال پر موت دیتا ہے، اس لئے انسان اسلام پر قائم رہے تاکہ موت اسی پر آئے، ایسا نہ ہو" العیاذ باللہ" کہ اسلام سے دور رہ کر کفر پر اس کی موت آجائے، انسان کی یہی بڑی بدقسمتی ہے۔
(ماخوذ از صابونی)

دوسرا معنی:

وقیل معناه"ولا تموتن الا وانتم مسلمون"مخلصون مفضون الی الله امورکم تحسنون الظن به عزوجل"

اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ "ہرگز تم نہ مرنا مگر یہ کہ تم مسلمان ہو" کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری موت ایسی حالت میں آئے کہ تم خلوص سے اپنے تمام امور کو اللہ تعالی کے سپرد کردو، اور اللہ تعالی پر اچھا گمان رکھو۔ (خازن)

✿ **روی الامام احمد عن مجاهد ان الناس کانوا یطوفون بالبیت وابن عباس جالس معه محجن فقال قال رسول الله ﷺ یا ایها الذین آمنوا اتقوا الله حق تقاته ولا تموتن الا وانتم مسلمون ولو ان قطرة من الزقوم قطرت فی دار الدنیا لأفسدت علی اهل**

الدنیامعا یشھم فکیف بمن لیس له طعام الا الزقوم"

(رواہ الترمذی والنسائی وابن ماجة)(ماخوذ از صابونی،ابن کثیر وخازن)

امام احمد رحمہ اللہ نے مجاہد کی روایت نقل کی کہ بیشک لوگ بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے حضرت ابن عباس وہاں بیٹھے ہوئے تھے،آپ کے ہاتھ میں ایک ٹیڑھی نوک والا عصا تھا،آپ فرمارہے تھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رب تعالی کا ارشاد گرامی ہے ﴿یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ ''اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور ہرگز نہ مرنا مگر یہ کہ تم مسلمان ہو'' (اس سے پتہ چلا کہ جہنم میں جہنمیوں کی خوراک تھور کے درخت سے بھی ڈرتا رہے) اگر اس تھور کا ایک قطرہ زمین پر ڈال دیا جائے تو تمام زمین کی معیشت تباہ و برباد ہو کر رہ جائے،تو کیسا حال ہوگا اس شخص کا جس کو اس تھور کے بغیر کوئی اور طعام نہیں ملے گا۔

- **وقال الامام احمد عن عبدالله بن عمرو قال قال رسول الله ﷺ من احب ان یزحزح عن النار ویدخل الجنة فلتدر که منیته وھو یؤمن بالله والیوم الآخر ویأتی الی الناس ما یحب ان یؤتی الیه"**

امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص جہنم کی آگ سے دور رہنا چاہتا ہے اور جنت میں داخل ہونا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ اس کے پاس موت اس حال میں آئے کہ وہ اللہ تعالی پر اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو،اور لوگوں کیلئے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہو۔

(ماخوذ از صابونی وابن کثیر)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًاۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَاؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ O (آیۃ نمبر ۱۰۳)

(1) اور اللہ کی رسی مضبوط تھام لو سب مل کر اور آپس میں پھٹ نہ جانا اور اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو جب تم میں بیر تھا اس نے تمہارے دلوں میں ملاپ کر دیا تو اس کے فضل سے تم آپس میں بھائی ہو گئے اور تم ایک غار دوزخ کے کنارے پر تھے تو اس نے تمہیں اس سے بچا دیا اللہ تم سے یونہی اپنی آیتیں بیان فرماتا ہے کہ کہیں تم ہدایت پاؤ۔ (کنز الایمان)

(2) اور تھام لو اللہ کی رسی کو سب مل کر، اور آپس میں تفرقہ پیدا نہ کرو، اور یاد کرو اللہ کی نعمتوں کو جو تم پر ہیں، جب تم (ایک دوسرے کے) دشمن تھے تو اس نے الفت ڈالی تمہارے دلوں میں، تو ہو گئے تم اس کی نعمت سے آپس میں بھائی بھائی، اور تم جہنم کی آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تمہیں اس سے نکالا، اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لئے اپنی آیات کو تا کہ تم ہدایت پا جاؤ۔ (نجوم الفرقان)

مختصر مطلب:

اللہ تعالیٰ کے دین اسلام اور قرآن پاک پر مضبوطی سے قائم رہو، جس طرح رسی سے کوئی سہارا لے کر اپنے آپ کو گرنے سے بچا لیتا ہے ایسے ہی تم اپنے آپ کو راہ راست سے پھسلنے سے بچانے کیلئے دین اسلام اور قرآن پاک کا مضبوطی سے سہارا لو، اور تمام مسلمان اس پر متفق ہو جاؤ، حق راہ میں کوئی تفرقہ بازی پیدا نہ کرو، جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے ایک دوسرے سے اختلاف رکھے، ایسے اختلاف آپس میں نہ رکھو، تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد رکھو کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے، ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں الفت و محبت ڈال دی جس کی وجہ سے تم ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے، اور جب تم کافر تھے اور ایک دوسرے سے لڑتے تھے اسی وقت تم جہنم کی آگ کے گڑھے کے ایک کنارے پر تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایمان عطاء فرما کر اس آگ سے نکال

کر بچالیا، اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیات کو بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

شان نزول: یہ خطاب بھی اوس اور خزرج کے قبائل کو ہے جن کا ذکر پہلے سے آرہا ہے، تو ان کے متعلق ہی یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی۔ (روح البیان)

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ ''اور تھام لو اللہ کی رسی کو سب مل کر''

''حَبْلُ'' کے مختلف معانی بیان کئے گئے، تاہم تمام کا مقصد ایک ہی ہے، وہ ہے دین اسلام اور قرآن پاک۔

"والحبل لفظ مشترک واصله فی اللغة السبب الذی یوصل به الی البغیة والحاجة"

''حَبْلُ'' لفظ مشترک ہے، اصل لغت میں اس کا معنی سبب ہے جو مقصد اور حاجت تک پہنچائے۔

اور کندھے اور گردن کے درمیان پٹھوں کو بھی حبل کہا جاتا ہے، اور ریتلے مقامات کو بھی حبل کہا جاتا ہے، جیسے ایک اعرابی نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا۔ **"والله ما ترکت من حبل الا وقفت علیه فهل لی من حج"** قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں نے کوئی ریگستان اور ریتلے ٹیلے نہیں چھوڑے مگر یہ کہ میں ان پر ٹھہرا ہوں، کیا میرا حج ہو گیا (آپ نے فرمایا ہاں ہو گیا) یعنی حدیث شریف میں لفظ حبل استعمال ہوا ہے جس کا معنی ہے ریتلے ٹیلے، ''حَبْـــلُ'' کا معنی ''وعدہ'' بھی ہے، اور حبل کا معنی رسی بھی ہے، یہ بھی اصل میں کنوئیں میں ڈول پہنچانے اور پانی نکالنے کا ذریعہ ہے، یہ سب لغوی معانی ہیں۔

(ماخوذ از قرطبی)

اللہ کی رسی سے مراد کیا ہے؟ اس کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں۔

حبل الله بمعنی قرآن:

وروی ذلک بسند صحیح عن ابن مسعود واخرج غیر واحد عن ابی سعید الخذری قال قال رسول الله ﷺ کتاب الله حبل الله الممدود من السماء الی الارض"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سند صحیح سے ثابت ہے، اور کئی راویوں نے حضرت ابو سعید حذری رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی کتاب (قرآن پاک) اللہ کی رسی ہے، جو آسمانوں سے زمین تک پھیلی ہوئی ہے۔

حبل الله بمعنی قرآن وعترت:

واخرج احمد عن زید بن ثابت قال قال رسول الله ﷺ انی تارک فیکم خلیفتین کتاب الله عزوجل ممدود مابین السماء والارض وعترتی اهل بیتی وانهما لن

یفترقا حتی یردا علی الحوض"

مسند احمد میں حضرت زید بن ثابت ﷺ کی روایت آتی ہے وہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں، اللہ کی کتاب جو آسمانوں سے زمین تک پھیلی ہوئی ہے، اور اپنی اہل بیت سے اپنی عترت (اولاد) چھوڑ کر جارہا ہوں، جو حوض کوثر تک وارد ہونے تک ساتھ ہوں گی جدا نہیں ہوں گی۔

حبل الله بمعنی طاعت وجماعت:

وقیل المراد بحبل الله الطاعة والجماعة "وروی ذلک عن ابن مسعود ایضا"

حبل اللہ کا معنی طاعت اور جماعت ہے، یہ روایت بھی حضرت ابن مسعود ﷺ سے مروی ہے، یعنی اللہ تعالی کی طاعت کو لازم پکڑو، اور جماعت کے ساتھ رہو۔

اخرج ابن ابی حاتم من طریق الشعبی عن ثابت بن قطنة المزنی قال سمعت ابن مسعود یخطب وھو یقول ایھاالناس علیکم بالطاعة والجماعة فانھما حبل الله تعالی الذی امربه"

ثابت بن قطنہ مزنی کہتے ہیں میں نے حضرت ابن مسعود ﷺ سے خطبہ میں یہ کہتے ہوئے سنا "اے لوگو تم پر اللہ تعالی کی طاعت لازم ہے، اور تم پر لازم ہے کہ جماعت کے ساتھ رہو، بیشک یہ دونوں چیزیں اللہ تعالی کی رسیاں ہیں، اللہ تعالی نے اپنی رسی کو لازم پکڑنے کا حکم دیا ہے۔

"وفی روایة عنه حبل الله الجماعة وروی ذلک ایضا عن ابن عباس رضی الله عنھما"

ابن مسعود کی ایک اور روایت میں اور حضرت ابن عباس کی ایک اور روایت میں بھی "**حبل اللہ**" سے مراد جماعت لیا گیا ہے کہ تم جماعت کو لازم پکڑو۔

حبل الله بمعنی اخلاص:

روی عن ابی العالیة انه الاخلاص لله تعالی وحده" ابوالعالیہ سے روایت کی گئی کہ "**حبل الله**" کا مطلب ہے اللہ تعالی وحدہ سے اخلاص رکھنا، یعنی حکم یہ دیا گیا کہ تم صرف کامل طور پر اللہ تعالی سے اخلاص رکھو۔

حبل الله بمعنی اسلام:

وعن ابن زید انه الاسلام " ابن زید کی روایت میں آتا ہے کہ حبل اللہ سے مراد اسلام ہے یعنی حکم یہ دیا گیا کہ اسلام پر مضبوطی سے قائم رہو۔

حبل الله بمعنی عهد وامر:

"وعن قتادة انه عهد الله وامره" حضرت قتادہ کہتے ہیں "حبل الله" سے مراد اللہ تعالیٰ کا عہد اور اس کا حکم ہے، یعنی حکم دیا گیا کہ تم اللہ تعالیٰ کے عہد اور اس کے حکم پر مضبوطی سے قائم رہو۔

سب معانی قریب قریب ہیں:

"و کلها متقاربة" ان تمام بیان کردہ معانی میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ (روح المعانی)

اللہ تعالیٰ کے دین کو رسی سے تشبیہ کیوں دی گئی؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح کوئی شخص چھوٹے تنگ راستہ سے گذر رہا ہو تو اسے گرنے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے، لیکن دونوں طرف اگر رسی باندھ دی جائے اور وہ اس رسی کے سہارے پر چلے تو وہ گرنے کے خطرہ سے محفوظ رہتا ہے اسی طرح حق راہ تنگ راہ ہے، اس راہ سے کثیر مخلوق پھسل گئی، جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے دلائل اور بینات سے سہارا لگا لیا وہ اس خوف سے محفوظ رہا۔

"فكان المراد من الحبل ههنا كل شئى يمكن التوصل به الى الحق فى طريق الدين"

رسی سے مراد یہاں ہر وہ چیز ہے جس کے ذریعے انسان دین کی راہ حق میں پہنچ جائے، "وهو انواع كثير" وہ کثیر قسم ہیں، جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، جب یہ معنی کیا جائے "اللہ تعالیٰ کے دین سے مضبوطی سے سہارا لگا لو" تو اس میں وہ تمام معانی آجائیں جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، طلباء کرام بخوبی جانتے ہیں کہ یہاں تشبیہ پائی گئی ہے، استعارہ مکنیہ پایا گیا ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

﴿وَلَا تَفَرَّقُوْا﴾ "اور تفرقہ نہ پیدا کرو۔"

تفرقہ سے ممانعت کی تین وجوہ ہیں جو تمام ہی معتبر ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک تفرقہ بھی ناجائز ہوگا:

(۱) الاول انه نهى عن الاختلاف فى الدين وذلك لان الحق لايكون الا واحدا وما عداه يكون جهلا وضلالا، فلما كان كذلك وجب ان يكون النهى عن الاختلاف فى الدين، واليه الاشارة بقوله تعالى "فماذا بعد الحق الا الضلال"

ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ دین میں اختلاف کرنے سے منع کیا گیا ہے، اسلئے کہ حق صرف ایک ہی ہے اور اس کے سوا جہالت وگمراہی ہے، لھذا ضروری ہے کہ دین میں اختلاف نہ کیا جائے، دین صرف ایک ہے، اسی طرف اللہ تعالی نے اشارہ فرمایا ہے ﴿فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ﴾ (حق کے بعد سوائے گمراہی کے کچھ نہیں)

(۲) والثانی انه نهی عن المعاداة والمخاصمة فانهم كانوا فی الجاهلية مواظبين على المحاربة والمنازعة فنهاهم الله عنها"

''تفرقہ نہ کرو'' کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی نے دشمنی کرنے اور جھگڑا کرنے سے منع کیا، مطلب یہ ہوگیا کہ ایک دوسرے سے دشمنی نہ کرو، اور ایک دوسرے سے جھگڑا نہ کرو۔

(۳) والثالث انه نهی عما یوجب الفرقة ویزیل الألفة والمحبة"

تفرقہ سے ممانعت کی تیسری وجہ ہے کہ تم ایک دوسرے سے ایسا تفرقہ نہ کرو جو تمہارے درمیان واقع ایمانی الفت ومحبت کو ہی زائل کردے۔ (ماخوذ از کبیر)

اصل بنیادی چیز: اصل بنیادی چیز یہی ہے کہ ایک دوسرے سے ایسا تفرقہ نہ رکھو جو بعض کو دین سے ہی دور کردے جیسا کہ اہل کتاب کا ایک دوسرے سے اختلاف تھا، اور ایسا تفرقہ بھی ایک دوسرے سے نہ رکھو جو تمہارے درمیان لڑائی اور دشمنی کا سبب بن جائے اور تم سے ایمان کی وجہ سے دولت محبت والفت نہ چھینی جائے۔

مسائل کی تحقیق کا اختلاف رحمت ہے:

وقد روی عن النبی ﷺ انه قال اختلاف امتی رحمة" نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔

اس حدیث پر معترضین کا حال:

وقد اعترض على حديث اختلاف رحمة رجلان احدهما مغموص عليه فی دينه وهو عمر وبن الجاحظ والآخر معروف بالسخف والخلاعة"

اس حدیث پر دو شخصوں نے اعتراض کیا ہے، ان میں سے ایک بے دین اور جاہل ومتجاہل ہے، وہ ہے عمرو بن جاحظ، اور دوسرا شخص حدیث کی سند میں ضعیف اور متروک سمجھا گیا ہے، وہ ہے اسحاق بن ابراہیم موصلی، اس شخص نے اغانی میں ایک کتاب لکھی جس میں گانے بجانے کے متعلق باطل اقوال نقل کئے:

"لم یرض بما تزود من المها حتی صدر کتابه بذم اصحاب الحدیث وزعم انهم یردون مالایدرون"

اس کتاب میں اس نے اپنے لئے گناہوں کا کافی حد تک توشہ جمع کرلیا تھا، لیکن ان گناہوں پر راضی نہ ہوا بلکہ اس نے اور گناہوں کا انبار اٹھانے کیلئے اصحاب حدیث کی مذمت شروع کردی اور یہاں تک کہنے لگا کہ وہ ایسے ہی روایات ذکر کردیتے ہیں جن کا انہیں علم ہی نہیں ہوتا، کیا ایسا شخص حدیث کی روایات میں معتبر ہوسکتا ہے، کیا ایسے شخص کے اعتراض کی کوئی حقیقت ہے وہ تو خود ہی غیر معتبر ہے، وہ تو خود ہی اصحاب حدیث سے دور ہے اور مردود ہے۔

آیئے عمرو بن جاحظ کی باطل دلیل کو دیکھئے وہ کہتا ہے:

"لو کان الاختلاف رحمة لکان الاتفاق عذابا" وہ کہتا ہے اگر اختلاف امت رحمت ہے تو اتفاق امت عذاب ہوگا، اس کی یہ دلیل اسکی جہالت وحماقت پر دلالت کررہی اس کا موقف ثابت نہیں کررہی،

"والجواب عن هذاالاعتراض انه لایلزم من کون الشئی رحمة ان یکون ضده عذابا ولایلزم هذاولم یذکره الاجاهل او متجاهل وقد قال الله تعالی "ومن رحمته جعل لکم اللیل والنهار لتسکنوافیه"فسمی اللیل رحمة ولم یلزم من ذلک ان یکون النهار عذابا وهو ظاهر لاشک فیه"

عمرو بن جاحظ کے اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ دلیل باطل ہے کہ ایک چیز رحمت ہو تو اس کی ضد عذاب ہو، ایسا قول تو صرف کسی جاہل یا خود ساختہ جاہل کا ہوسکتا ہے، آیئے رب تعالی کے ارشاد گرامی کو دیکھئے ﴿وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ﴾ اور اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لئے رات کو بنایا، اور دن کو تمہارے آرام کیلئے، آیۂ کریمہ میں رات کو رحمت قرار دیا گیا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دن کو عذاب بنایا گیا ہو۔ (حوالہ بعد میں آرہا ہے)

اختلاف کی تین قسمیں ہیں:

احدها فی اثبات الصانع ووحدانیته وانکار ذلک کفر، والثانی فی صفاته ومشیته وانکارها بدعة والثالث فی احکام الفروع المحتملة وجوها فهذا جعله الله تعالی رحمة وکرامة للعلماء وهو المراد بحدیث اختلاف امتی رحمة"

اختلاف کی تین قسموں میں سے ایک یہ ہے کہ رب تعالی کے خالق ہونے اور اس کی وحدانیت میں اختلاف کیا جائے اور اس کا انکار کیا جائے یہ کفر ہے اور انکار کی دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالی کی صفات اور اس کی مشیت میں اختلاف کیا

جائے، صفات ومشیت کا انکار بدعت ہے اور اختلاف کی تیسری وجہ فروعی احکام میں اختلاف کا پایا جاتا ہے، کسی مسئلہ میں کئی وجوہ کا احتمال ہو اپنے اپنے دلائل سے مختلف وجوہ کو ثابت کیا جائے تو اس اختلاف کو اللہ تعالیٰ نے علماء کرام کی عزت افزائی کیلئے رحمت بنایا ہے، یہی وہ اختلاف ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے رحمت قرار دیا، اور ارشاد گرامی (اختلاف امتی رحمۃ) میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔ (مسلم شریف جلد ثانی صفحہ نمبر ۱۵ باب ترک الوصیۃ لمن لیس لہ شئی یوصی فیہ)

واضح ہوا کہ ہر اختلاف جائز بھی نہیں اور ہر اختلاف کو ناجائز قرار دینا بھی حماقت ہے۔

جماعت کو لازم پکڑنا:

❁ وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺان الله لا يجمع امتي او قال امة محمد على ضلالة ويدالله على الجماعة ومن شذشذ في النار "رواه الترمذي"

(مشكوة باب الاعتصام بالكتاب والسنة)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ میری امۃ کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا (راوی کو شک ہے کہ شاید آپ نے "امة محمد" فرمایا ہو کہ اللہ تعالیٰ امت محمد کو گمراہی پر جمع نہیں فرمائے گا) اللہ تعالیٰ کا دست قدرت جماعت پر ہے، جو جماعت سے بکھر گیا وہ بکھر کر آگ میں چلا گیا۔

وضاحت حدیث:

والما حمل الامة على امة الاجابة لما ورد ان الساعة لاتقوم الا على الكفار"

نبی کریم ﷺ کی حدیث پاک میں جس امت کا ذکر ہے وہ امت اجابت ہے یعنی جنہوں نے ایمان قبول کیا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ روایات میں موجود ہے کہ بیشک قیامت نہیں قائم ہوگی مگر کفار پر"

"فالحديث يدل على ان اجماع المسلمين حق" حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ مسلمانوں کا اجماع حق ہے، یعنی اجماع امت شریعت کی قوی دلیل ہے، لیکن اس اجماع سے مراد "والمراد اجماع العلماء ولا عبرة باجماع العوام لانه لايكون عن علم" علماء کا اجماع ہے، کہ جب علماء مجتہدین کسی مسئلہ میں اتفاق کر لیتے ہیں تو وہ ایک قوی دلیل ہوتی ہے، اس اجماع سے مراد عوام کا اجماع نہیں، کیونکہ انہیں علم حاصل نہیں ہوتا۔

جہالت سے کسی مسئلہ پر مجتمع ہو جانا شریعت میں معتبر نہیں، آجکل کے دور میں جہلاء تو بے حیائی کو فروغ دینے میں مجتمع ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے علماء کرام کو اس سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی میں "لا یجتمع امتی علی ضلالة" میں "ضلالة" سے کیا مراد ہے؟

"وقال الابهری قوله علی ضلالة ای علی خطأ وقیل علی کفر ومعصیة"

اس سے مراد خطاء، کفر ومعصیت ہے، یعنی آپ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ میری امت خطاء وکفر ومعصیت پر مجتمع نہیں ہوگی۔

(وید الله) کناية عن النصرة والغلبة او الحفظ والرحمة او معناه احسانه وتوفیقه لاستنباط الاحکام والاطلاع علی ما کان علیه رسول الله ﷺ واصحابه من الاعتقاد والعمل (علی الجماعة) ای المجتمعین علی الدین یحفظهم من الضلالة والخطأ او للتوفیق لموافقة اجماع هذه الامة"

"اور اللہ کا دست رحمت جماعت پر ہے" یعنی اللہ تعالی کی طرف سے ان کو نصرت حاصل ہے، اور ان کو غلبہ حاصل ہے، اور ان کی رب تعالی حفاظت فرماتا ہے اور انہیں رحمت عطاء فرماتا ہے، یا ان کو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے اعتقاد اور عمل کے مطابق احکام استنباط (حاصل کرنے) کی اور ان پر مطلع ہونے کی توفیق عطا فرماتا ہے جو لوگ دین پر مجتمع ہوتے ہیں، اللہ تعالی ان کو گمراہ ہونے اور گنہگار رہونے سے بچالیتا ہے، یا ان کو اس امت کے ساتھ اجماع میں (اجماع امت میں) متفق ہونے کی توفیق عطاء فرمادیتا ہے

"ومن شذ" ای انفرد عن الجماعة باعتقاد او قول او فعل لم یکونوا علیه (شذفی النار) ای انفرد فیها ومعناه الفرد عن اصحابه الذین هم اهل الجنة والقی فی النار"

اور جو شخص جماعت سے اعتقاد یا قول یا فعل سے ہٹ گیا، بکھر گیا، ایسا عقیدہ ایجاد کیا، یا ایسا قول کیا یا ایسا عمل کیا جو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے مخالف اور دین اور شریعت کے مخالف ہو وہ جماعت سے ہٹ کر اکیلا جہنم کی آگ میں پہنچ جائے گا، یعنی جماعت والے صحیح اعتقادات اور صحیح اقوال وافعال جو جنت میں جانے کا ذریعہ تھے ان کو چھوڑنے اور جماعت سے بکھرنے کی وجہ سے جہنم کی آگ میں پہنچ گیا۔ (مرقاۃ جلد اول صفحہ نمبر ۲۴۹)

❁ وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ اتبعوا السواد الاعظم فانه من شذشذ فی النار "رواه ابن ماجة" (مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنة)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سواد اعظم (بڑی جماعت) کی تابعداری کرو، بیشک جو اس سے بکھر گیا وہ آگ میں بکھر گیا۔

وضاحت حدیث:

"**سواد اعظم**" سے مراد بڑی جماعت ہے "والمراد ما علیه اکثر المسلمین" مراد اس سے وہ ہے جس پر اکثر مسلمان ہوں۔

وهذا فی اصول الاعتقاد کان الاسلام واما الفروع کبطلان الوضوء بالمس فلا حاجة فيه الى الاجماع بل یجوز اتباع کل واحد من المجتهدين كالائمة الاربعة"

بڑی جماعت کی تابعداری کرنے کے حکم کا تعلق اعتقادی اصول سے ہے، جیسا کہ ارکان اسلام ہیں، ان میں سب کا متفق ہونا ضروری ہے، لیکن فروع دین میں اجماع امت ضروری نہیں، بعض مسائل میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف بھی ہوگا، جو شخص جس امام کا مقلد ہوگا وہ اسی کی تابعداری کرے گا، اس سے وہ جہنم کی آگ کا مستحق نہیں ہوگا، وضوء کے مسائل کو ہی آپ اپنے سامنے رکھیں امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک عورت کو مس کرنے (چھونے سے) اور ذکر کو مس کرنے سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے، اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب میں وضو نہیں ٹوٹتا، اس طرح کے ائمہ مجتہدین کے نزدیک سینکڑوں مسائل اختلافی ہیں۔ آجکل غیر مقلدین نے اودھم مچا رکھا ہے، ایسے فروعی مسائل کو اصول سے بھی آگے لے جاتے ہیں۔ "اللهم انا نعوذبك من الشر المفسدين"

ماتریدیہ اور اشاعرہ کا اختلاف فروع میں ہے، اصول میں نہیں، جن مسائل میں ان کا اختلاف ہے وہ ظنی ہیں اعتقادی اور یقینی نہیں، بلکہ بعض محققین نے کہا ہے کہ اشاعرہ اور ماتریدیہ کا اختلاف لفظی ہے حقیقی نہیں:

"اتبعوا السواد الاعظم "یدل علی ان اعاظم الناس العلماء وان قل عددهم ولم یقل الاکثر لان العوام والجهال اکثر"

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "بڑی جماعت کی تابعداری کرو" اس سے یہ مسئلہ واضح ہوگیا کہ لوگوں میں سے عظیم مرتبہ والے علماء کرام ہیں، یعنی علماء حق کی تابعداری کرو، وہی عظیم جماعت ہے، صرف آپ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ، اکثر لوگوں کی تابعداری کرو، کیونکہ صرف تعداد کے لحاظ پر زیادہ تو عوام و جہال ہیں، عوام و جہال کا کوئی اعتبار نہیں۔

(**من شذ**) فی الدین (شذ فی النار) جو شخص دین سے ہٹ گیا، دین پر چلنے والی علماء کرام کی عظیم جماعت سے عقیدہ کے لحاظ پر پھر گیا وہ اکیلے نار (آگ) میں پہنچ گیا، اکیلے نار میں پہنچنے کا یہی مطلب ہے کہ جس طرح دین پر چلنے والے علماء کے نظریات و عقائد سے پھر کر علیحدہ ہوگیا، اس طرح آخرت میں اللہ تعالی دیندار لوگوں کو جنت میں

بھیج دے گا اور ان سے پھرنے والے کو ان سے دور کر کے آگ میں بھیج دے گا۔ (مرقاۃ جلد ۱، ص ۲۴۹، ۲۵۰)

❁ عن معاذ بن جبل قال قال رسول الله ﷺ ان الشیطان ذئب الانسان کذئب الغنم یاخذ الشاذة و القاصية و الناحية و ایاکم و الشعاب و علیکم بالجماعة و العامة "رواہ احمد" (مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب و السنۃ)

حضرت معاذ بن جبل ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک شیطان انسانوں کا بھیڑیا ہے جس طرح بھیڑ، بکریوں کا بھیڑیا ہے، بھیڑیا اس بکری کو پکڑتا ہے جو دوسری بکریوں سے علیحدہ ہو جاتی ہے، دور ہو جاتی ہے اور کنارے پر ہو جاتی ہے، تم پر لازم ہے کہ تم اپنے آپ کو علیحدہ ہونے سے بچا لو، جماعت کو لازم پکڑو، اور عامہ کو لازم پکڑو۔

وضاحت حدیث:

"**ذئب الانسان**" سے مراد مفسد و مہلک ہے، یعنی انسانوں کو شیطان فساد اور ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔

"**شاذة**" اس بکری کو کہیں کہ جو دوسری بکریوں سے نفرت کر کے علیحدہ ہو جائے "**قاصية**" اس بکری کو کہتے ہیں جو چرتے چرتے دور نکل جائے اگرچہ دوسری بکریوں سے نفرت نہ کرے۔ "**ناحية**" اس بکری کو کہتے ہیں جو غفلت کی وجہ سے دوسری بکریوں سے دور کنارے پر چلی جائے، یعنی علیحدہ رہنے والی بکری کو بھیڑیا کھا جاتا ہے، تمہیں بھی لازم ہے کہ علیحدہ رہنے سے بچ کر رہو اور جماعت کو لازم پکڑو، تاکہ تمہیں شیطان ہلاکت میں نہ ڈال دے جو انسانوں کیلئے بھیڑیئے کی طرح ہے۔

"و العامة" ای عامة الجماعة یعنی علیکم بمتابعة جمهور العلماء من اهل السنة و الجماعة"

"عامہ کو لازم پکڑو" کا مطلب یہ ہے کہ تم پر لازم ہے کہ عام جماعت کو لازم پکڑو، جمہور علماء اہل سنت و جماعت کی تابعداری کرو۔

اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ وہ عوام جو دین پر قائم ہیں، ان کے ساتھ مل کر تم بھی دین پر قائم رہو، مقصود یہی ہے کہ دین سے دور نہ ہو جانا اور دین پر قائم رہنا۔

یہاں ایک ہی مسئلہ کو تین مرتبہ ذکر کیا، جس میں شدید تاکید پائی گئی، ایک مرتبہ ذکر فرمایا "و ایاکم و الشعاب" تم اپنے آپ کو علیحدہ ہونے سے بچا کر رکھو، اور دوبارہ ذکر کیا "علیکم بالجماعة" تم پر لازم ہے کہ جماعت کو لازم پکڑو، اور تیسری مرتبہ ذکر کیا "و العامة" یعنی "علیکم بالعامة" تم پر لازم ہے کہ جمہور اہل سنت و جماعت کے علماء

کرام کے ساتھ رہو۔ (ماخوذ از مرقاۃ جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۵)

وعن ابی ذر قال قال رسول الله ﷺ من فارق الجماعة شبرا فقد خلع ربقة الاسلام من عنقه "رواه احمد" (مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنة)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی جماعت سے ایک بالشت جدا ہو گیا اس نے اپنی گردن سے اسلام کا ڈورا اتار دیا۔

اس حدیث سے مراد بھی یہی ہے "قال الابهری مفارقة الجماعة ترك السنة واتباع البدعة "جو علامہ ابہری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ جماعت کو چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ سنت کو چھوڑ دے اور بدعت کی اتباع کرے۔ (مرقاۃ جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۵)

وعن مالك بن انس مرسلا قال قال رسول الله ﷺ تركت فيكم امرين لن تضلوا ما تمسكم بهما كتاب الله وسنة رسوله رواه في الموطا" (مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنة)

حضرت امام مالک بن انس رحمہ اللہ سے مرسل روایت آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے تم میں دو چیزوں کو چھوڑا ہے جب تک تم ان سے سہارا رکھو گے ہرگز گمراہ نہیں ہو گے (ایک) کتاب اللہ اور (دوسری) سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔

وضاحت حدیث:

"تركت فيكم امرين" "اى شيئين عظيمين او حكمين بفتحهما"

میں تم میں دو امر چھوڑے جا رہا ہوں، یعنی دو بڑی چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہو، یا آپ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ میں تم میں دو فیصل (دو فیصلہ کرنے والے چیزیں) چھوڑ کر جا رہا ہوں۔

"لن تضلو "اى لن تقعوا فى الضلالة(ما تمسكتم)اى مدة تمسككم (بهما)اى بالامرين معا(كتاب الله)اى القرآن (وسنة رسوله)اى حديث رسوله"

تم ہرگز گمراہی میں واقع نہیں ہو گے جب تک ان دونوں چیزوں سے سہارا لگائے رکھو گے، وہ ہے قرآن پاک اور حدیث پاک، کسی ایک کو بھی چھوڑنے سے گمراہ ہو جاؤ گے۔

(مرقاۃ جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۶)

"حبل الله" سے حدیث پاک کے انکار کرنے والوں کا استدلال باطل ہے، کیونکہ خود میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ نے قرآن پاک اور حدیث دونوں پر سہارا لینے پر زور دیا ہے۔

وعن غضیف (بالمعجمتین مصغرا) بن الحرث الثمالی قال قال رسول الله ﷺ ماحدث قوم بدعة الا رفع مثلها من السنة فتمسک بسنة خیر من احداث بدعة "

(مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب و السنة)

غضیف بن حرث ثمالی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قوم نے نہیں ایجاد کیا بدعت کو مگر اس کی مثل سنت کو اٹھالیا گیا، سنت پر عمل کرنا بدعت کی ایجاد سے بہتر ہے۔

وعن جابر ؓ قال قال رسول الله ﷺ امابعد فان خیر الحدیث کتاب الله وخیر الهدی هدی محمد وشر الامور محدثاتها وکل بدعة ضلالة "

"رواه مسلم" (مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب و السنة)

حضرت جابر ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ''امابعد'' بیشک بہتر کلام اللہ کی کتاب ہے، اور بہتر ہدایت محمد (ﷺ) کی ہدایت ہے، اور شر امور نئی چیزوں کی ایجاد ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

وضاحت حدیث:

نبی کریم ﷺ اپنے کلام کو حمد باری تعالی اور اپنے آپ پر درود پاک سے شروع فرماتے تھے، اس لئے مقصد کو شروع کرنے سے پہلے ''امابعد'' ذکر فرماتے، یعنی ''حمد وصلوۃ'' کے بعد "فان خیر الحدیث کتاب الله" تمام کلاموں سے بہتر کلام اللہ کی کتاب ہے، یعنی اس میں وہ فصاحت وبلاغت ہے جو کسی اور کتاب میں نہیں

"واشتمل علیه من بیان کل شئی تصریحا او تلویحا قال تعالی "ونزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شئی" ای مما یحتاج الیه من امر الدین و الدنیا و العقبی کالعلوم الاعتقادیة و الاعمال الشرعیة و الاخلاق البهیة و الاحوال السنیة وغیرها "

قرآن پاک صراحۃ یا اشارۃ ہر چیز کے بیان پر مشتمل ہے، کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے ﴿ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ﴾ ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جو ہر چیز کا واضح بیان ہے، یعنی دین و دنیا اور آخرت میں جن چیزوں کی محتاجی تھی ان سب کو بیان کر دیا، خواہ ان کا تعلق علوم اعتقادیہ سے ہو یا اعمال شرعیہ سے، خواہ وہ اچھے اخلاق ہوں یا اچھے اعمال ہوں، ''وغیرها'' سب کو قرآن پاک میں واضح طور پر بیان کر دیا۔

فائدہ جلیلہ:

وقد ورد فضل کلام الله علی سائر الکلام کفضل الله علی خلقه، وفیه اشارة واضحة الی ان کلام الله تعالی غیر مخلوق "

اللہ تعالیٰ کی کلام کو تمام کلاموں پر فضیلت حاصل ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق پر فضیلت حاصل ہے، اسی سے ایک اور مسئلہ واضح طور پر حل ہوگیا ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جو اس کی صفت ہے، اس لئے کلام نفسی قدیم ہے، حادث نہیں۔

کون سی بدعت ضلالت ہے؟

و کل بدعة ضلالة "قال فی الازهار ای کل بدعة سیئة ضلالة "

ہر بدعت سیئہ (بری بدعت) گمراہی ہے، یہ مراد نہیں کہ مطلقا ہر بدعت گمراہی ہے۔

"لقوله ﷺ من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها "

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے جس نے اسلام میں اچھا طریقہ جاری کیا اسے اس کا اجر (ثواب) حاصل ہوگا اور جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے ان کا ثواب بھی اسے حاصل ہوگا۔

صحابہ کرام نے نئے کام ایجاد کئے:

"وجمع ابو بکر و عمر القرآن و کتبه زید فی المصحف و جدد فی عهد عثمان ﷺ"

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے قرآن پاک جمع کیا، اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے قرآن پاک کو لکھ کر جمع کیا، پھر حضرت عثمان ﷺ کے دور میں لغت حجاز پر قرآن جمع کیا گیا، یہ سب کام رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھے۔

"قال النووی البدعة کل شئی عمل علی غیر مثال سبق وفی الشرع احداث مالم یکن فی عهد رسول الله ﷺ وقوله کل بدعة ضلالة عام مخصوص"

علامہ نووی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا بدعت ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کی مثال پہلے موجود نہ ہو، اور شریعت میں نیا کام جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھا" "کل بدعة ضلالة " عام مخصوص البعض ہے، یعنی بدعات حسنہ اس سے خارج ہیں اور بدعات سیئہ اس میں داخل ہیں۔

بدعت واجبہ: **البدعة اما واجبة کتعلم النحو لفهم کلام الله ورسوله و کتدوین اصول الفقه والکلام فی الجرح والتعدیل "**

بدعت یا واجب ہوگی، جس طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کو سمجھنے کیلئے علم نحو کا پڑھنا واجب ہے اور اصول فقہ کی تدوین واجب ہے، مسائل میں جرح وتعدیل، یعنی یہ حق ہے، اس میں کمزوری ہے، یہ بحثیں واجب ہیں۔

بدعة محرمة: **واما محرمة کمذهب الجبریة والقدریة والمرجئة والمجسمة،**

والرد علی هؤلاء من البدع الواجبة لان حفظ الشریعة من هذه البدع فرض کفایة "
بدعت کبھی حرام ہوتی ہے، جیسا کہ باطل مذاہب کی ایجاد، یعنی جبریہ فرقہ، قدریہ فرقہ، مرجیہ فرقہ، مجسمہ فرقہ تمام نئی نئی ایجادات ہیں، سب فرقے باطل ہیں، بدعات محرمہ ہیں اوران کا رد کرنا بدعات واجبہ سے ہے، کیونکہ شریعت کی حفاظت کرنا فرض کفایہ ہے۔

بدعة مستحبة: واما مندوبة کاحداث الربط والمدارس وکل احسان لم یعهد فی الصدر الاول "
بعض بدعات مستحب ہیں جیسے سرائے بنانا اور مدارس بنانا اور ہر اچھا کام جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھا لیکن وہ کام اچھا تو یہ بدعت مستحب ہے۔

بدعة مکروہ: واما مکروهة کزخرفة المساجد" مکروہ بدعت یہ ہے کہ مساجد کو ریا کاری کیلئے مزین کرے، لیکن اگر نیت یہ ہو کہ دوسرے گھروں سے اللہ تعالیٰ کا گھر زیادہ حسین نظر آتا ہے تو یہی بدعت مستحب ہو جائے گی۔

بدعت مباحة: واما مباحة کالتوسع فی لذائذ المآکل والمشارب والمساکن "مباح بدعت جس طرح کھانے پینے میں وسعت پیدا کرے، لذت دار کھانے کھائے، اور وسیع مکان میں رہے۔

بدعات کے متعلق خوبصورت ضابطہ:

قال الشافعی رحمه الله ما احدث مما یخالف الکتاب اوالسنة اوالأثر اوالاجماع فهو ضلالة وما احدث من الخیر مما لا یخالف شیئا ذلک فلیس بمذموم"
امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہر وہ نیا کام جو قرآن پاک اور حدیث پاک اور صحابہ کرام کے اقوال اور اجماع امت کے مخالف ہو وہ گمراہی ہے، اور جو نئے کام اچھے ہوں، بھلائی پر مشتمل ہوں اور قرآن پاک، حدیث پاک، اقوال صحابہ، اجماع امت کے مخالف نہ ہوں تو وہ برے کام نہیں، بلکہ اچھے کام اچھے ہی ہیں۔

"وقال عمر ﷺ فی قیام رمضان نعمت البدعة" حضرت عمر ﷺ نے تراویح کے قیام پر صحابہ کرام کو مجتمع دیکھ کر یہ فرمایا یہ کتنی ہی اچھی بدعت ہے" "وروی عن ابن مسعود ما رآه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن" حضرت ابن مسعود ﷺ سے مروی ہے کہ جسے مسلمان اچھا سمجھیں وہ چیز اللہ کے ہاں بھی اچھی ہوتی ہے، اس سے مراد علماء و صلحاء و اتقیاء کا کسی چیز کو اچھا سمجھنا عند اللہ اچھا ہوتا ہے۔

"وفی حدیث مرفوع لا یجتمع امتی علی الضلالة" مرفوع حدیث میں یعنی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے

کہ میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔ (ماخوذ از مرقاۃ جلد اول صفحہ نمبر ۲۱۷)

باطل فرقے اور سیدھی راہ:

وعن عبدالله بن عمرو قال قال رسول الله ﷺ لیأتین علی امتی کما أتی علی بنی اسرائیل حذوا النعل بالنعل حتی ان کان منهم من اتی امه علانیة لکان فی امتی من یصنع ذلک وان بنی اسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین ملة وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین ملة کلهم فی النار الاملة واحدة قالوامن هی یارسول الله قال ماانا علیه واصحابی "رواه الترمذی" وفی روایة احمد وابی داود عن معاویة ثنتان وسبعون فی النار وواحدة فی الجنة وهی الجماعة وانه سیخرج فی امتی اقوام تتجاری بهم تلک الاهواء کما یتجاری الکلب بصاحبه لایبقی منه عرق ولا مفصل الادخله "

(مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنة)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ضرور بر ضرور میری امت پر ایک وقت آئے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر آیا، یہ ان کے ساتھ برابر چلیں گے جیسا کہ جوتا اپنے فرمہ کے برابر ہوتا ہے، یہاں تک کہ ان میں سے اگر کوئی اپنی ماں کے پاس علانیہ (ظاہر) طور پر آیا تو میری امت میں ایسے ہوں گے جو یہی کام کریں گے، بیشک بنی اسرائیل بہتر فرقے بنے اور میری امت کے تہتر فرقے بنیں گے، سب آگ میں جائیں گے، سوائے ایک فرقہ کے، صحابہ کرام نے پوچھا یارسول اللہ وہ ایک فرقہ کون سا ہوگا؟ آپ نے فرمایا وہ جس (راہ) پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔ (یہ ترمذی کی روایت ہے)

اور مسند احمد اور ابوداود کی حضرت معاویہ ؓ سے ایک روایت میں ہے "بہتر فرقے آگ میں جائیں گے اور ایک فرقہ جنت میں جائے گا، یہ جماعت ہے، اور بیشک میری امت میں ایسی قومیں نکلیں گی جن پر خواہشات اس طرح جاری ہوں گی، جیسے کتا کسی شخص کو کاٹ دے تو اس پر اس کے اثرات اس طرح پائے جاتے ہیں کہ اس کی کوئی رگ اور کوئی جوڑ باقی نہیں رہتا مگر اس میں وہ اثرات داخل ہو جاتے ہیں۔

وضاحت حدیث:

"لیأتین علی امتی " "اتیان" کا معنی ہے "سہولت سے آنا" اور جب "علی" سے متعدی ہو تو اس کا معنی غالباً "ہلاکت تک پہنچانا" ہوتا ہے، جیسا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ماتذر من شیء اتت علیه﴾ میں

برباد کرنے اور ہلاک کرنے والا معنی ہی لیا گیا ہے۔

"لیاتین علی امتی کما اتی علی بنی اسرائیل" کے دو مطلب ہیں، ایک مطلب اس کا یہ ہے "لیاتین علی امتی زمان الیانا مثل الاتیان علی بنی اسرائیل" میری امت پر ایک زمانہ (ایک وقت) آئے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر وقت آیا۔ دوسرا معنی یہ ہے:

"لیاتین علی امتی مخالفة لما انا علیه مثل المخالفة التی اتت علی بنی اسرائیل حتی اهلکتهم"

کہ میری امت میرے ہی احکام و شریعت کی اس طرح مخالفت کرے گی جیسا کہ بنی اسرائیل مخالفت کر رہے ہیں، ایک تیسرا معنی مختصر بھی ہوسکتا ہے، جبکہ کاف کو مثل کے مقام پر رکھ کر فاعل مان لیا جائے تو اب مطلب یہ ہوگا "میری امت ضرور بر ضرور بنی اسرائیل کی طرح ہوگی"

"حذو النعل بالنعل" کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ جوتا کو دوسرے جوتے کے برابر کاٹنا، اور دوسرا معنی یہ ہے کہ جوتا کو اس کے قالب (فرمہ) کے برابر بنانا، مقصد کامل مشابہت کو بیان کرنا ہے کہ میری امت کامل طور پر بنی اسرائیل کے مشابہ ہوگی۔

"حتی ان کان منهم من اتی امه علانیة لکان فی امتی من یصنع ذلک"

یہاں تک کہ اگر ان میں کوئی ماں کے پاس علانیہ طور پر آئے گا تو میری امت میں سے کئی لوگ ہوں گے جو (ان کو دیکھ کر) یہی کریں گے، یہ آپ نے اپنی امت کی بنی اسرائیل سے کامل مشابہت کی مثال دی، ماں کے پاس آنے کا مطلب بدکاری کا مرتکب ہونا، یعنی اگر یہود علانیہ طور پر ماں سے بدکاری کے مرتکب ہوئے تو ان کو دیکھ کر میری امت کے لوگ بھی ماں سے بدکاری کے مرتکب ہوں گے۔

تہتر فرقوں کو علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ یوں بیان فرماتے ہیں:

نبی کریم ﷺ کی امت اجابت یعنی کلمہ گو لوگ کفریہ عقیدہ تک پہنچے ہوں گے، وہ لوگ جنہوں نے اصول دین میں اختلاف کیا ہے اور کفر تک پہنچ گئے وہ ابتدائی طور پر آٹھ فرقے ہیں، پھر ہر ایک میں کئی کئی فرقے ہیں۔

"المعتزلة القائلون بان العباد خالقوا اعمالهم وبنفی الرؤیة وبو جوب الثواب والعقاب وهم عشرون فرقة"

معتزلہ اس کے قائل ہیں کہ بندے اپنے افعال کے خالق ہیں، اور وہ باری تعالی کی رؤیۃ کا انکار کرتے ہیں، وہ ثواب وعذاب کو نہیں مانتے، پھر ان کے بیس فرقے ہیں۔

خیال رہے کہ ثواب وعذاب پر ایمان ہوتو خوف خدا بھی ہوتا ہے، اسی لئے آجکل معتزلہ کے مذہب کو زندہ کرنے کی بھرپور کوششیں جاری ہیں، کہ عذاب قبر نہیں تا کہ ہر قسم کی بے حیائی کو بغیر کسی خطرہ کے فروغ دیا جا سکے، یہ کوئی نہ کہے کہ یہ کام تو عذاب کا ذریعہ ہے۔

"والشیعة المفرطون فی محبة علی کرم الله وجهه وهم اثنان وعشرون فرقة"

اور رافضی جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت میں بہت زیادہ حد سے تجاوز کیا وہ بائیس فرقے ہیں۔

"والخوارج المفرطة المکفرة له رضی اللہ عنہ ومن اذنب کبیرة وهم عشرون فرقة"

اور خارجی لوگ جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں نہایت گستاخی کی، یہاں تک کہ معاذ اللہ آپ کو کافر کہا، اور انہوں نے گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر کہا، یہ بیس فرقے ہیں۔

"والمرجئة القائلة بانه لایضر مع الایمان معصیة کما لاینفع مع الکفر طاعة وهی خمس فرق"

مرجئہ فرقہ جو اس کے قائل ہیں کہ ایمان کے ساتھ گناہ کوئی نقصان نہیں دیتے جس طرح کفر کے ساتھ طاعت کوئی نقصان نہیں دیتی، یہ پانچ فرقے ہیں۔

"والنجاریة الموافقة لاهل السنة فی خلق الافعال والمعتزلة فی نفی الصفات وحدوث الکلام وهم ثلاث فرق"

نجاریہ فرقہ یہ تو مانتا ہے کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، اس مسئلہ میں وہ اہل سنت کے ساتھ ہیں، لیکن وہ صفت باری تعالیٰ کو نہیں مانتے اور اللہ تعالیٰ کے کلام کو حادث مانتے ہیں، ان مسائل میں وہ معتزلہ کے ساتھ ہیں، یہ تین فرقے ہیں۔

"والجبریة القائلة بسلب الاختیار عن العباد فرقة واحدة"

اور جبریہ فرقہ اس کا قائل ہے کہ بندے کو کوئی اختیار نہیں، بلکہ وہ پتھر کی طرح مجبور محض ہے،" معاذ اللہ" اس نے وہی کام کرنے ہیں جو رب نے اس سے جبری طور پر کرانے ہیں، یہ ایک فرقہ ہے۔

"والمشبهة الذین یشبهون الحق بالخلق فی الجسمیة والحلول فرقة واحدة ایضا"

مشبہ فرقہ جو اللہ تعالیٰ کو مخلوق سے تشبیہ دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا جسم مانتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ وہ بندوں میں حلول کرتا ہے یہ ایک فرقہ ہے۔

"فتلک اثنان وسبعون فرقة کلهم فی النار" یہ بہتر فرقے ہیں جو تمام آگ والے ہیں۔

فرقہ ناجیہ : وہ ایک فرقہ جونجات حاصل کرنے والا ہے، جس کی وضاحت خود رسول اللہ ﷺ نے فرمادی ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں جو اس راہ پر قائم ہوں جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔ان کو ہی اہلسنت کہا جاتا ہے۔

"والفرقة الناجية هم اهل السنة البيضاء الحمدية و الطريقة النقية الاحمدية "

یعنی فرقہ ناجیہ وہ ہے جو نبی کریم ﷺ کی روشن سنتوں پر قائم ہوں، اور آپ کے صاف طریقہ پر قائم ہوں، پھر یہی اہل سنت زہد وتقوی کے لحاظ پر مختلف مراتب رکھتے ہیں، کوئی شخص بھی شریعت سے دور رہ کر متقی نہیں ہوسکتا، شریعت پر چلنے کا نام "شـــــرعة" ہے، باطنی علم ومعرفت کا حصول اور تقرب الی اللہ کا نام "منہاج" ہے اور زیادہ خلوص حاصل ہوجائے تو اس کا نام معراج ہے۔کیا خوب کسی نے کہا۔

الافالزموا سنة الانبياء　　الا فـاحـفظوا سيـرة الاصـفياء

ومن يبتدع بدعة لم يكرم　　بـوجـد انــه رتبة الاتـقيــاء

خبردار لازم پکڑو انبیاء کرام کی سنت کو خبردار نیک لوگوں کی سیرت کی حفاظت کرو۔جن لوگوں نے بری بدعات کو ایجاد کرلیا ان کی کوئی عزت نہیں کہ وہ متقی لوگوں کے مرتبہ کو پالیں۔

اور دوسری روایت میں ذکر فرمایا گیا "وواحدة فی الجنة وهی الجماعة " اور ایک جنتی فرقہ وہ جماعت ہے۔

(وهـى الـجـمـاعة)ای اهل العلم والفقه الذین اجتمعوا علی اتباع آثاره علیه الصلوة والسلام فی النقیر والقطمیر ولم یبتد عوا بالتحریف والتغیر "

جماعت سے مراد اہل علم اور اہل فقہ ہیں جو نبی کریم ﷺ کی سنتوں کے مطابق قائم ہیں ذرا بھر بھی سنتوں سے انحراف نہیں کرتے اور بدعات سے سنتوں میں کوئی تحریف اور تبدیلی نہیں کرتے۔

"قال شريح ان السنة قد سبقت قياسكم فاتبع ولا تبتدع فانک لن تضل ما اخذت بالاثر "

شریح رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ بیشک سنت قیاس سے پہلے ہے، سنت کے ہوتے ہوئے قیاس پر عمل نہ کرو اور سنت کے خلاف کوئی نئے کام ایجاد نہ کرو، جب تک نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی اتباع کرتے رہو گے گمراہ نہیں ہو گے۔

"وعن سفيان لوان فقيها على رأس لكان هو الجماعة "

حضرت سفیان فرماتے ہیں کہ اگر ایک فقیہ پہاڑ کی چوٹی پر ہو تو وہ بھی جماعت ہے۔

"جماعت کے ساتھ ہونے کا مطلب واضح ہوگیا کہ علماء کرام، فقہاء عظام کے ساتھ ہوجاؤ"

اور دوسری روایت میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی:

"وانہ سیخرج فی امتی اقوام تتجاری بھم تلک الاھواء کما یتجاری الکلب بصاحبہ لا یبقی منہ عرق ولا مفصل الادخلہ"

کا مطلب یہ ہے "کہ میری امت میں کئی قومیں ایسی ہوں گی جو سنت کے خلاف نئے نئے کام ایجاد کر لیں گے، وہ نئی چیزوں کی ایجاد کی محبت ان کی رگوں اور جوڑوں میں ایسے اثر انداز ہوگی جیسے کہ پاگل کتا کسی کو کاٹ دے تو اس کے زہریلے اثرات اس کاٹے ہوئے انسان کی رگوں اور جوڑوں میں پہنچ جاتے ہیں، کوئی رگ، کوئی جوڑ اس کے اثر سے محفوظ نہیں رہتے۔ (مرقاۃ جلد اول صفحہ نمبر ۲۴۷ تا ۲۴۹)

ہاں یہ خیال سے نہ نکلے کہ نئے کام وہی منع ہیں جو کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ اور اجماع امت کے مخالف ہوں، جب تک بدعات حسنہ اور سیئہ کا فرق نہیں کیا جائے گا اس وقت تک کوئی فرقہ دیندار ہونے کا دعویدار یہ ثابت نہیں کر سکے گا کہ ہمارے فرقہ کے تمام کام وہی ہیں جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ اطہر میں تھے، اس سے ہٹ کر ہمارا کوئی نیا کام نہیں، دینی مدرسہ ہم نے کوئی نہیں بنایا، پختہ مساجد ہماری نہیں، ہماری مساجد میں بجلی کے پنکھے نہیں، سنگ مرمر یا چپس کے فرش نہیں، ہماری مساجد میں قالین نہیں بچھائے گئے، لھذا ہمارے کام صحابہ کرام والے کام ہیں۔ جب سب کچھ تم کر رہے ہو تو بدعت بدعت کی رٹ لگا کر، آئے دن پوسٹر چھاپ کر، لوگوں کو گمراہ کرنے کی دن رات تمہیں فکر لگی ہوئی ہے، آئیے ذرا غور تو کرو، کتوں کی طرح بھونکنا، مسلمانوں کو گمراہ کہنا، مسلمانوں کو مشرک کہنا کون سا انصاف ہے، یہ کیسے دین کی خدمت ہے۔

بہتر ناری فرقوں کو علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے یوں بیان کیا:

اسی زیر بحث آیہ کریمہ کی تفسیر میں قرطبی رحمہ اللہ یوں رقمطراز ہیں، بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والے وہ فرقے جو حقیقت میں کفر کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں جن کو نبی کریم ﷺ نے ناری (جہنمی) کہا ہے، وہ چھ فرقے ہیں، ہر فرقے کی بارہ بارہ شاخیں ہیں۔

وہ چھ فرقے یہ ہیں: حروریہ، قدریہ، جہمیہ، مرجئہ، رافضیہ، جبریہ "انقسمت الحروریۃ اثنتی عشرۃ فرقۃ" حروریہ کے بارہ فرقے ہیں:-

(1) فاولھم الازرقیۃ قالوا لانعلم احدا مؤمنا و کفروا اھل القبلۃ الا من دان بقولھم"
پہلا فرقہ حروریہ میں سے ازرقیہ ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مؤمن نہیں سمجھتے، وہ اہل قبلہ کو بھی کافر کہتے

ہیں مگر یہ کہ جوان کی بات کو مانیں وہ مؤمن ہو سکتے ہیں۔

(2) والاباضية قالوا من اخذ بقولنا فهو مؤمن ، ومن اعرض عنه فهو منافق "

حروریہ میں سے ایک فرقہ " اباضیہ " ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ جو ہماری بات پر عمل کرے گا وہ مؤمن ہے، اور ہماری بات سے اعراض کرے گا وہ منافق ہے۔

(3) والثعلبية قالوا ان الله عزوجل لم يقض ولم يقدر "

حروریہ میں سے تیسرا فرقہ "ثعلبيه" ہے جو اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر کو تسلیم نہیں کرتے۔

(4) والخازمية قالوا لاندرى ماالايمان والخلق كلهم معذورون "

حروریہ میں چوتھا فرقہ " خازميه " ہے وہ کہتے ہیں، ہمیں معلوم نہیں کہ ایمان کیا ہے، تمام مخلوق معذور ہے (جو چاہیں لوگ وہی کریں ان سے کوئی باز پرس (پوچھ گوچھ) نہیں ہونی)

(5) والخلفيه زعموا ان من ترک الجهاد من ذكر او انثى كفر "

پانچواں فرقہ "خلفیہ" ہے، جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جس مذکر یا مؤنث نے جہاد کو چھوڑا وہ کافر ہو گیا،

(ان کا یہ قول سراسر مردود ہے، اس میں صحیح عقیدہ یہ ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے، اگر مسلمان دفاع نہ کر سکیں، کافروں کی یلغار ہو تو فرض عین ہو جاتا ہے، فرض عین کا تارک گنہگار ہے، اور فرض عین کی فرضیت کا منکر کافر ہے)

(6) والكوزية قالوا ليس لاحدان يمس احدالانه لايعرف الطاهر من النجس ولا ان يؤاكله حتى يتوب ويغتسل "

چھٹا فرقہ كوزيه ہے، اسے کرویہ بھی کہا گیا ہے اور کدریہ بھی کہا گیا ہے، یہ کہتے ہیں کہ کسی شخص کو ہاتھ نہ لگایا جائے یہ معلوم نہیں کہ یہ پاک ہے یا ناپاک ہے، کسی کے ساتھ مل کر کھانا نہ کھایا جائے یہاں تک کہ وہ پہلے توبہ کرلے اور غسل کرلے۔

(7) والكنزية قالوا لايسع احدا ان يعطى ماله احدا لانه ربما لم يكن مستحقا بل يكنزه في الارض حتى يظهر اهل الحق "

ساتواں فرقہ كنزيه ہے، وہ کہتے ہیں، کسی ایک کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ دوسرے کو مال دے کیونکہ پتہ نہیں ہوتا کہ یہ مستحق ہے یا نہیں، اسلئے وہ اپنا مال جو کسی کو دینا ہے اسے زمین میں دفن کردے، جب کوئی حقدار واضح طور پر ظاہر ہو جائے تو اسے مال دے۔

(8) والشمراخية قالوا لاباس بمس النساء الا جانب لانهن رياحين "

اٹھواں فرقہ شمراخيه ہے، وہ کہتے ہیں کہ اجنبی عورتوں کو چھونے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ عورتیں گل ریحانہ (خوشبودار پھول) ہیں۔

(یہی آجکل روشن خیال بھی کہتے ہیں اگر ان کو کہا جائے کہ یہ حرام ہے تو وہ کہتے ہیں یہ قدامت پسند ہے)

(9) والاخنسیة قالوا لا یلحق المیت بعد موته خیر ولاشر"

نواں فرقہ "اخنسیه" ہے، وہ کہتے ہیں مرجانے کے بعد کوئی خیر وشر میت کو لاحق نہیں ہوگا۔

(نہ عذاب قبر، اور نہ قبر میں راحت، نہ جنت، نہ دوزخ، آجکل کچھ مردود اسی فرقہ کے مطابق اشتہار چھاپ کر لوگوں کے دلوں سے خوف خدا کو دور کرنیکی ناپاک جسارت کرر ہے ہیں)

(10) والحکمیة قالوا من حاکم الی مخلوق فهو کافر"

دسواں فرقہ یہ ہے کہ جواپنا فیصلہ مخلوق کے پاس لے گیا وہ کافر ہے، (یعنی ان کے نزدیک مخلوق میں نہ کوئی حکم (فیصل) ہے اور نہ ہی کوئی حاکم ہے۔

(11) والمعتزلة قالوا اشتبه علینا امر علی ومعاویة فنحن نتبرأ من الفریقین"

گیارھواں فرقہ "معتزله" ہیں، وہ کہتے ہیں ہم پر (حضرت) علی (رضی اللہ عنہ) اور (حضرت) معاویہ (رضی اللہ عنہ) کا معاملہ مشتبہ ہے (کہ کون سچا ہے یا کون جھوٹا ہے، کون حق پر ہے یا کون باطل پر ہے) اسلئے ہم دونوں سے بیزاری اختیار کرتے ہیں۔

(خیال رہے کہ یہ فرقہ حروریہ کی ایک قسم ہے، نام اس کا بھی معتزلہ ہے، قدریہ میں سے ایک فرقہ معتزلہ زیادہ مشہور ہے، جس کا ذکر ان شاء اللہ آگے آرہا ہے)

(12) والمیمونیة قالوا لا امام الا برضا اهل محبتنا"

بارھواں فرقہ "میمونیه" ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ کوئی امام نہیں سوائے ہمارے اہل محبت کی رضامندی کے۔

قدریہ فرقہ کی بارہ فرقوں میں تقسیم:

(۱) الاحمریة وهی التی زعمت ان فی شرط العدل من الله ان یملک عباده امورهم ویحول بینهم وبین معاصیهم"

قدریہ فرقہ میں سے پہلا فرقہ ''احمریہ'' ہے، ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالی (معاذ اللہ) اس وقت عادل ہوگا جب وہ اپنے بندوں کو تمام امور کا مالک بنادے گا، اور بندوں اور ان کے گناہوں کے درمیان خود حائل ہوجائے (یعنی بندوں کو گناہ نہ کرنے دے)

(۲) والثنویة وهی التی زعمت ان الخبر من الله والشر من الشیطان"

دوسرا فرقہ ثنویہ ہے یہ وہ فرقہ ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ خبر تو اللہ تعالی کی طرف سے ہے اور شر شیطان کی

طرف سے ہے، (یعنی یہ فرقہ خیر کا خالق اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں، اور شر کا خالق شیطان کو)

(۳) والمعتزلة وهم الذين قالوا بخلق القرآن وجحدوا (صفات) الربوبية "

تیسرا فرقہ معتزلہ ہے، یہ وہ لوگ جنہوں نے قرآن پاک کے مخلوق ہونے کا قول کیا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کرتے ہیں، (ان کے بہت نظریات اہل سنت کے خلاف ہیں)

(۴) والكيسانية وهم الذين قالوا لاندرى هذه الافعال من الله او من العباد ولا نعلم ايثاب الناس بعد او يعاقبون "

چوتھا فرقہ ''کیسانیہ'' ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں ہمیں معلوم نہیں کہ یہ افعال اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں، یا کہ بندوں کی تخلیق ہے، پھر ہمیں یہ بھی پتہ نہیں کہ لوگوں کو ثواب دیا جائے گا یا عذاب دیا جائے گا۔

(۵) والشيطانية قالوا ان الله تعالى لم يخلق الشيطان "

پانچواں فرقہ ''شیطانیہ'' ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو پیدا نہیں کیا، یعنی تمام مخلوق کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، لیکن وہ شیطان کا خالق نہیں۔

(۶) والشريكية قالوا ان السيآت كلها مقدرة الا الكفر "

چھٹا فرقہ ''شریکیہ'' ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ تمام گناہ تو رب تعالیٰ کی تقدیر میں ہیں، لیکن کفر اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں نہیں۔

(۷) والوهمية قالوا ليس لافعال الخلق وكلامهم ذات ولا للحسنة والسيئة ذات "

ساتواں فرقہ ''وہمیہ'' ہے وہ کہتے ہیں مخلوق کے افعال اور ان کے کلام کیلئے کوئی ذات نہیں پائی گئی، اور نہ ہی اچھائیوں اور برائیوں کیلئے کوئی ذات پائی گئی، (اس فرقہ میں کتنی حماقت پائی گئی ہے کہ یہ افعال مانتے ہیں لیکن فاعل نہیں مانتے جبکہ کسی فعل کا فاعل کے بغیر پایا جانا ممکن نہیں)

(۸) والزبرية قالوا كل كتاب نزل من عندالله فالعمل به حق ناسخا كان او منسوخا "

آٹھواں فرقہ ''زبریہ'' ہے، اسے ''زبوندیہ'' بھی کہا گیا ہے، یہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جو کتاب بھی نازل فرمائی اس پر عمل کرنا حق ہے خواہ وہ ناسخ ہو یا منسوخ ہو، گویا کہ یہ لوگ منسوخ ہونے کے منکر ہیں، اسی لئے منسوخ پر عمل کرنا حق مانتے ہیں حالانکہ منسوخ کہتے ہی اسے ہیں جس پر عمل کرنا اللہ تعالیٰ نے ختم کر دیا ہے، اگر منسوخ ہونے کے باوجود اس پر عمل کرنا جائز ہوتو اسے منسوخ کہنے کا مطلب ہی کیا؟ آجکل نیچری اور قادیانی بھی یہی مذہب رکھتے ہیں، سب باطل مذاہب ایک مرتبہ پھر معرض وجود پر لائے جا رہے ہیں، لیکن وہ پہلے بھی مٹ گئے، پھر مٹ کر رہیں گے۔

(۹) والمسعدية زعموا ان من عصى ثم تاب لم تقبل توبته "

نواں فرقہ ''مسعدیہ'' ہے، جسے ''متبریہ'' بھی کہا جاتا ہے، ان کا گمان یہ ہے کہ بیشک جس نے نافرمانی کی پھر توبہ کر لی

لیکن اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، (ان کا یہ عقیدہ قرآن پاک کی صریح آیات سے مخالف ہے، جن میں توبہ کی قبولیت کا ذکر ہے)

(۱۰) والناکثیة زعموا ان من نکث بیعة رسول الله ﷺ فلا الم علیه "

دسواں فرقہ "ناکثیہ" ہے، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اگر کسی نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت توڑ لی تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ (معاذاللہ یہ صریح کفر ہے)

(۱۱) والقاسطیة تبعوا ابراهیم بن النظام فی قوله من زعم ان الله شیئ فهو کافر"

گیارھواں فرقہ "قاسطیہ" ہے یہ ابراہیم بن نظام کے متبع ہیں اس کے اس قول میں کہ جس نے "شــیٔ" کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر کیا وہ کافر ہے (یہ اس کا عقیدہ سراسر باطل ہے، کیونکہ "شیٔ" کا معنی موجود ہونا، اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے)

بارھواں فرقہ غالباً علامہ قرطبی رحمۃ اللہ سے یا کاتب سے چھوٹ گیا ہے، جس کا ذکر نہیں، عین ممکن ہے۔

جہمیہ فرقہ کی بارہ فرقوں میں تقسیم:

(۱) المعطلة زعموا ان کل ما یقع علیه وهم الانسان فهو مخلوق وان من ادعی ان الله یری فهو کافر"

جہمیہ فرقہ میں سے ایک فرقہ "معطلہ" ہے، جن کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر چیز جو واقع ہے وہ مخلوق ہے، لیکن اس کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ انسانوں کے اعمال کو اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے، یہ کفر ہے۔

(یہ خیال رہے کہ زیادہ مشہور تعطیلیہ یا معطلہ فرقہ وہ فرقہ ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف ایک عقل کو پیدا کیا، اس عقل نے دوسرے کو، دوسرے نے تیسرے کو، اس طرح دس عقل معرض وجود میں آئے جو "عقول عشرہ" سے مشہور ہیں، اب سب نظام ان عقول کے ذمہ ہے، اللہ تعالیٰ تمام امور سے معطل ہے۔ (معاذاللہ)

(۲) والمریسیة قالوا اکثر صفات الله تعالی مخلوقة"

دوسرا فرقہ "مریسیہ" ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو قدیم نہیں مانتے بلکہ اکثر صفات کو مخلوق اور حادث مانتے ہیں۔

(۳) والملتزقة جعلوا الباری سبحان فی کل مکان"

تیسرا فرقہ "ملتزقہ" جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر مکان میں مکین ہے، خیال رہے کہ ایک یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے جو اس کی شان کے لائق ہے موجود ہونا، یہ عقیدہ تو کامل ایمان ہے، دوسرا یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ ہر مکان میں مکین ہے، یہ کفر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی مکان سے متمکن ہونے سے پاک ہے، اس لئے کہ مکان کی جہات ستہ ((فوق، تحت، یمین ویسار، امام، خلف) اوپر، نیچے، دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے) سے مقید ہوتا ہے، رب

تعالیٰ جہات ستہ کی تقیید سے پاک ہے۔ فلاسفہ کے نزدیک مکان جسم حاوی کی سطح باطنی ہے جو جسم محوی کی سطح ظاہری سے مماس ہے، مکان کا یہ معنیٰ بھی لیں تو پھر بھی مقید ہونا لازم آئے گا جو رب تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں، کیونکہ یہ حدوث پر دلالت کرے گا، اللہ تعالیٰ حدوث سے پاک ہے۔

(۴) والواردية قالوا لا يدخل النار من عرف ربه ومن دخلها لم يخرج منها ابدا"

چوتھا فرقہ ''واردیہ'' ہے، وہ کہتے آگ میں وہ شخص داخل نہیں ہوگا جس نے اپنے رب کو پہچان لیا، اور جو آگ میں داخل ہوگیا وہ کبھی بھی نہیں نکالا جائے گا، یہ عقیدہ بھی باطل ہے، کیونکہ کافر تو جہنم سے کبھی نہیں نکالا جائے، لیکن مؤمن گنہگار کو اگر سزا دی گئی تو اسے سزا کے ختم ہونے پر جہنم سے نکال دیا جائے گا۔

(۵) والزنادقة قالوا ليس لا حد ان يثبت لنفسه ربا، لان الاثبات لايكون الا بعد ادراك الحواس وما لايدرك لا يثبت"

پانچواں فرقہ ''زنادقہ'' (زندیق کی جمع) ہے، کسی ایک کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ یہ کہے کہ ''رب تعالیٰ'' ہے اس لئے کہ کسی چیز کو ثابت کرنے کیلئے ضروری ہے کہ وہ حواس میں آئے اور اس کا ادراک کیا جا سکے، جب یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حواس میں نہیں آتا تو اس کا ثبوت بھی ممکن نہیں۔

(۶) والحرقية زعموا ان الكافر تحرقه النار مرة ثم يبقى محترقا ابدا لا يجد حر النار"

چھٹا فرقہ ''حرقیہ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ کافر کو ایک مرتبہ آگ جلائے گی، پھر وہ جل کر خاکستر ہو جائے گا، اور اسے دوبارہ آگ کی تکلیف کبھی بھی نہیں ہوگی، ان کا عقیدہ سراسر قرآن پاک کے ارشاد گرامی ﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُوْدًا﴾ کے مخالف ہے۔

(۷) والمخلوقية،زعموا ان القرآن مخلوق "

ساتواں فرقہ ''مخلوقیہ'' ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن پاک مخلوق ہے (یعنی حادث ہے، قدیم نہیں) خیال رہے کہ مختلف فرقوں کا کئی معانی میں اختلاف بھی ہے، اور کئی فرقے کسی ایک نظریہ میں متفق بھی ہوتے ہیں، جیسا کہ خلق قرآن کئی فرقوں کا عقیدہ ہے۔

(۸) والفانية زعموا ان الجنة والنار يفنيان ، ومنهم من قال لم يخلقا "

آٹھواں فرقہ ''فانیہ'' فرقہ ہے ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جنت اور جہنم دونوں فنا ہونے والی چیزیں ہیں، اور اسی فرقہ میں ایک اور گروہ ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ جنت اور دوزخ ابھی پیدا نہیں ہوئیں، خیال رہے کہ نیچری فرقہ جنت اور جہنم کو نہیں مانتا، بلکہ جنت سے مراد دنیا کے باغات ہیں، اور جہنم سے مراد دنیا کے مصائب و آلام ہیں، یہ فرقہ بھی قرآن

وحدیث کا واضح طور پر منکر ہے، کیونکہ جنت ودوزخ کا ذکر قرآن وحدیث میں صراحۃ کثرت سے موجود ہے۔

(۹) والعبدية جحدوا الرسل وقالوا انماهم حكماء"

نواں فرقہ ''عبدیہ'' ہے، انہوں نے رسولوں کا انکار کیا ہے کہ کوئی رسول نہیں، البتہ بعض لوگ علم والے دوسروں کے راہنمارہے، وہ حقیقت میں حکماء ہیں، (ان لوگوں کو رسول سمجھ لیا گیا) یہ فرقہ بھی قرآن پاک اور حدیث پاک کے حکم صریح کا مخالف ہے۔

(۱۰) والواقفية قالوا لا نقول ان القرآن مخلوق ولا غير مخلوق"

دسواں فرقہ ''واقفیہ'' (وقف سے لیا گیا ہے) ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نہ تو یہ کہتے ہیں کہ قرآن مخلوق ہے، اور نہ ہی یہ کہتے ہیں قرآن مخلوق نہیں۔

(۱۱) والقبرية ينكرون عذاب القبر والشفاعة"

گیارھواں فرقہ ''قبریہ'' ہے، جو قبر کے عذاب اور شفاعت کے منکر ہیں، یہ فرقہ بھی کفریہ فرقہ ہے، یہ فرقہ آجکل بہت پایا جاتا ہے، جن کو میرے پیارے حبیب پاک ﷺ نے جہنمی کہا، علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے وضاحت کی، راقم کو کوئی نہ برا، کہے، بلکہ اپنے آپ کو صحیح کیا جائے، توبہ کی جائے۔

(۱۲) واللفظية قالوا لفظنا بالقرآن مخلوق"

بارھواں فرقہ ''لفظیہ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ہم تو قرآن کے مخلوق ہونے کا تلفظ کرتے ہیں، یعنی ہم تو بول بول کر کہہ رہے ہیں کہ (معاذ اللہ) قرآن مخلوق ہے۔

مرجئہ فرقہ کی بارہ فرقوں میں تقسیم:

(۱) التاركية قالوا ليس لله عزوجل على خلقه فريضة سوى الايمان به فمن آمن به فليفعل ما شاء"

مرجئہ میں سے پہلا فرقہ ''تارکیہ'' ہے، وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق پر سوائے ایمان کے کوئی چیز فرض نہیں کی، جو شخص ایمان لے آئے، وہ جو چاہے کرے، اسے کوئی نہیں پوچھا جائے گا تو نے یہ گناہ کیوں کیا تھا۔

(۲) والسائبية قالوا ان الله تعالى سيب خلقه ليفعلوا ما شاؤا"

دوسرا فرقہ ''سائبیہ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر لازم ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو آزاد چھوڑ دے وہ جو چاہیں کرتے پھریں، ان سے کسی قسم کی کوئی باز پرس نہ ہو، ان کا قول (معاذ اللہ) یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ کسی چیز کو فرض کرے، یا کسی چیز کو حرام کرے۔

(۳) والراجیة قالوا لایسمی الطائع طائعا و لا العاصی عاصیا لانا لاندری ماله عندالله تعالی "

تیسرا فرقہ "راجیہ" ہے، ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالی کی خوشی سے طاعت کرنے والے کو مطیع اور طائع نہ کہا جائے، اور معصیت کرنے والے کو عاصی نہ کہا جائے، کیونکہ ہمیں معلوم نہیں کہ وہ اللہ کے ہاں کس درجہ میں ہوگا، ہوسکتا ہے کہ ہم مطیع اور طائع کہتے رہیں وہ حقیقت میں عاصی ہو، اور ہم عاصی کہتے رہیں وہ مطیع اور طائع ہو، ان لوگوں کا مذہب اس لئے باطل ہے۔ ظاہر اعمال پر احکام کا دارومدار ہے، حقیقت کو اللہ تعالی پر چھوڑ دیا جائے، مطلقا ظاہر سے روگردانی درست نہیں۔

(۴) والسالبیة قالوا الطاعة لیست من الایمان "

چوتھا فرقہ "سالبیہ" ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ طاعت ایمان کا حصہ نہیں، یعنی یہ کہا جائے نیکیاں صرف ایمان والوں کی معتبر ہیں، اور کافروں کی معتبر نہیں، یہ غلط ہے، بلکہ کافروں کی نیکیاں بھی مقبول ہیں، کافر لوگ ایمان والوں سے زیادہ نیک ہوتے ہیں۔ یہ فرقہ بھی کافر ہے، کافروں کی تعریف کر کے ان سے ہڈی (دنیاوی حقیر مال) وصول کر رہا ہے، وہ بھی ایک کو ہڈی ڈالتے ہیں جب تک وہ ان کی ہمنوائی کی طاقت رکھتا ہے اس وقت تک اسے ہڈی پر ہڈی ڈالتے چلے جاتے ہیں، جب ذرا بھر اس کی ہمنوائی میں کمی آجاتی ہے اس سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں، وہ حسرت سے کبھی ادھر دیکھتا ہے، کبھی ادھر دیکھتا ہے، اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا، کاش کہ مسلمانوں کو ہوش آجائے کہ وہ کافروں سے دور ہوجائیں، آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن جائیں۔

(۵) والبهیشة قالوا الایمان علم ومن لایعلم الحق من الباطل والحلال من الحرام فهو کافر "

پانچواں فرقہ "بہیشہ" ہے، وہ کہتے ہیں ایمان علم ہے، جو حق و باطل اور حلال و حرام کا علم نہ رکھے وہ کافر ہے، یہ عقیدہ باطل ہے، صحیح عقیدہ یہ ہے کہ ایمان لانے سے مؤمن ہوگیا، اب اسے چاہئے وہ حق و باطل میں اور حلال و حرام میں فرق سمجھے، یعنی علم حاصل کرے، یہ مطلب نہیں کہ جاہل لوگ مؤمن نہیں ہوسکتے۔

(۶) والعملیة قالوا الایمان عمل "

چھٹا فرقہ "عملیہ" ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ایمان عمل ہے، جس کے عمل درست ہوئے وہ مؤمن ہے اور جس کے عمل درست نہ ہوئے وہ کافر ہے، یہ عقیدہ بھی قرآن وحدیث کے مخالف ہے، صحیح عقیدہ یہ ہے کہ تصدیق قلبی کا نام ایمان ہے، اور نیک اعمال کچھ فرائض ہیں، کچھ واجبات وسنن ومستحبات۔

(۷) والمنقوصیة قالوا الایمان لایزید ولا ینقص "

ساتواں فرقہ ''منقوصیہ'' ہے وہ کہتے ہیں، ایمان زیادہ اور کم نہیں ہوتا۔

یہ مذہب باطل ہے، قرآن پاک کے مخالف ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے ﴿وَاِذَا تُلِيَتۡ عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُهٗ زَادَتۡهُمۡ اِيۡمَانًا﴾

(اور جب ان پر اس کی آیتیں پڑھی جائیں زیادہ کرتی ہیں ان کے ایمان کو)

(۸) والمستثنیة قالوا الاستثناء من الایمان "

آٹھواں فرقہ ''مستثنیہ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ استثناء ایمان کا حصہ ہے، یعنی ان کے نزدیک کوئی چیز مستثنی نہیں، جو چاہیں وہ کریں، ایسا نہیں کہ یہ چیز حلال ہے سوائے فلاں کے، وغیرہ، تمام مستثنیات خود ایمان میں داخل ہیں۔

(۹) والمشبهة قالوا بصر کبصرو ید کید "

نواں فرقہ ''مشبہۃ'' ہے، وہ اللہ تعالی کو عام جسموں کے مشابہ مانتے ہیں، وہ کہتے ہیں اللہ تعالی کا ہاتھ ہمارے ہاتھوں کی طرح ہے، اور اللہ تعالی کی آنکھیں ہماری آنکھوں کی طرح ہیں۔

(۱۰) والحشوية قالوا حكم الاحاديث كلها واحد ، فعندهم ان تارک النفل کتارک الفرض "

دسواں فرقہ ''حشویہ'' ہے، وہ کہتے ہیں کہ تمام احادیث کا حکم ایک ہے، ان کے نزدیک نہ ہی راویوں کی تعداد کے لحاظ پر خبر واحد، مشہور اور متواتر کی طرف کوئی تقسیم ہے اور نہ ہی راویوں کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کے لحاظ پر صحیح، حسن، ضعیف کی طرف کوئی تقسیم ہے، اور ان کے نزدیک نفلوں کو ترک کرنے والا اسی طرح گنہگار ہوتا ہے جیسا کہ فرضوں کو ترک کرنے والا گنہگار ہوتا ہے۔

(۱۱) والظاهرية الذين نفوا القياس "

گیارھواں فرقہ ''ظاہریہ'' ہے، یہ قیاس کے منکر ہیں، یہی فرقہ آجکل کی اصطلاح میں غیر مقلدین کا ہے، جو خود ساختہ اہل حدیث بنے بیٹھے ہیں۔

(۱۲) والبدعية اول من ابتدع هذه الاحداث فی هذه الامة "

بارھواں فرقہ بدعیۃ ہے، یہ وہ فرقہ ہے جنہوں نے بری بری بدعات اس امت میں ایجاد کی ہیں، پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ قرآن پاک، حدیث پاک، اجماع امت کے خلاف جو بدعت ہوگی وہ سیئہ کہلائے گی، بعض بدعات حرام ہوں گی، اور بعض مکروہ، لیکن بدعات حسنہ کوئی واجب، کوئی مستحب، کوئی مباح ہیں۔

فرقہ رافضیہ کی بارہ فرقوں میں تقسیم:

(۱) العلوية قالوا ان الرسالة كانت الى عليّ و ان جبريل اخطأ"

رافضیہ میں سے پہلا فرقہ ''علویہ'' ہے، جن کا عقیدہ یہ ہے کہ رسالت کے حقدار حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، لیکن جبریل سے غلطی ہوگئی کہ وہ وحی حضرت محمد (ﷺ) کے پاس لے آئے۔

(۲) والامرية قالوا ان علياشريک محمد فی امره "

دوسرا فرقہ ''امریہ'' ہے، یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی ؓ حضرت محمد ﷺ کے ساتھ ان کے امر میں شریک ہیں، یعنی ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت علی ؓ اور حضرت محمد ﷺ دونوں ہی نبی ہیں، اور نبوت میں دونوں شریک ہیں۔

(۳) والشيعة قالواان علياؓ وصی رسول اللهﷺ ووليه من بعده وان الامة كفرت بمبايعة غيره "

تیسرا فرقہ ''شیعہ'' ہے یہ کہتے ہیں حضرت علی ؓ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے وصیت فرمادی کہ میرے بعد یہ میرے ولی یعنی میرے جانشین ہوں گے، بیشک تمام امت دوسروں کی بیعت کر کے (معاذ اللہ) کافر ہوگئی، اس فرقہ نے تمام صحابہ کرام کو معاذ اللہ کافر کہا، جنہوں نے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم کی بیعت کی۔

(۴) والاسحاقية قالوا ان النبوة متصلة الى يوم القيامة وكل من يعلم علم اهل البيت فهو نبی "

چوتھا فرقہ ''اسحاقیہ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ نبوت قیامت تک جاری ہے، جس کو اہل بیت کے متعلق علم حاصل ہوگیا وہ نبی ہے، یہ فرقہ ختم نبوت کا منکر ہے، اور جھوٹے نبیوں کیلئے اس فرقہ نے نبوت کا دروازہ کھولا ہے، یعنی قادیانی اسی فرقہ کی پیداوار ہیں، جن کا پہلا شکار ہی رافضی اور دیوبندی بنے، اب بریلوی حضرات ان کی ناپاک نگاہ میں ہیں۔

(۵) والناؤوسية قالوا علی افضل الامة فمن فضل غيره عليه فقد كفر "

پانچواں فرقہ ''ناؤوسیہ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت علی ؓ تمام امت سے افضل ہیں، اگر کسی نے دوسرے کسی شخص کو فضیلت دی تو وہ کافر ہوگیا۔ (معاذ اللہ)

اس فرقہ کے مطابق بھی تمام امت (معاذ اللہ) کافر ہے، کیونکہ اجماع امت ہے اس مسئلہ پر کہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ تمام صحابہ کرام سے افضل ہیں، پھر حضرت عمر ؓ پھر حضرت عثمان ؓ پھر حضرت علی المرتضیٰ ؓ۔

(۶) والامامية قالوا لا يمكن ان تكون الدنيا بغير امام من ولدالحسنين ، وان الامام يعلمه جبريل علیہ السلام فاذا مات بدل غيره مكانه "

چھٹا فرقہ ''امامیہ'' ہے، وہ کہتے ہیں، دنیا کا بغیر امام کے قائم ہونا ممکن نہیں، وہ امام ضروری ہے کہ حضرت امام حسنین ؓ کی اولاد سے ہو، جبریل علیہ السلام امام مقرر کرتے ہیں، جب ایک امام فوت ہو جاتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ قائم کر دیتے ہیں۔

(۷) والزیدیة قالوا ولدالحسنین کلهم ائمة فی الصلوات ، فمتی وجد منهم احدلم تجز الصلوة خلف غیرهم برهم وفا جرهم "

ساتواں فرقہ ''زیدیہ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ نماز کی امامت کرانا صرف حضرت امام حسین ﷛ کی اولاد کا حق ہے، جب آپ کی اولاد میں سے کوئی شخص موجود ہو، اس کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا شخص نماز نہیں پڑھا سکتا، خواہ وہ سید نیک ہو یا فاسق وفاجر ہو۔

(۸) والعباسیة زعموا ان العباس کان اولی بالخلافة من غیره "

آٹھواں فرقہ ''عباسیہ'' ہے ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خلافت کے حقدار حضرت عباس ﷛ تھے، ان کے نزدیک بھی دوسری خلافتیں باطل ہیں، خلیفہ بنانے والے (معاذ اللہ) کافر ہیں، حضرت ابوبکر صدیق ﷛ کی خلافت اجماع صحابہ سے ثابت ہے، ان کے عقیدہ کے مطابق تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فیصلہ باطل ہے۔

(۹) والتناسخیة قالوا الارواح تتناسخ فمن کان محسنا خرجت روحه فدخلت فی خلق یسعد بعیشه "

نواں فرقہ ''تناسخیہ'' ہے ، یہ تناسخ ارواح کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ ایک نیک شخص کی روح جب نکل جاتی ہے تو دوسرے نیک بخت میں منتقل ہو جاتی ہے، دوسرا نیک بخت انسان ہونا بھی ضروری نہیں، بلکہ کوئی جانور بھی جسکی زندگی دوسروں کیلئے نفع مند ہو، اس میں بھی وہ روح منتقل ہو سکتی ہے۔

(۱۰) والرجعیه زعموا ان علیا واصحابه یرجعون الی الدنیا وینتقمون من اعدائهم "

دسواں فرقہ ''رجعیہ'' ہے، ان کا گمان یہ ہے کہ حضرت علی ﷛ اور ان کے اصحاب دنیا میں پھر لوٹ کر آئیں گے اور اپنے دشمنوں سے انتقام لیں گے۔

(۱۱) واللاعنة یلعنون عثمان وطلحة وزبیر ومعاویة وابا موسی وعائشة وغیرهم "

گیارھواں فرقہ ''لاعنہ'' ہے، جو حضرت عثمان اور طلحہ اور زبیر اور معاویہ اور ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عائشہ (وغیرہم) رضی اللہ عنہم پر (معاذ اللہ) لعنت بھیجتے ہیں۔

وہ لعنت یقیناً ان کی طرف لوٹتی ہے، اس لئے کہ جس پر لعنت بھیجی جائے وہ لعنت کا مستحق نہ ہو تو وہ لعنت بھیجنے والے کی طرف لوٹ کر آجاتی ہے۔

(۱۲) والمتربصة تشبهوا بزی النساک ونصبوا فی کل عصر رجلاینسبون الیه الامر یزعمون انه مهدی هذه الامة فاذامات نصبوا آخر "

بارھواں فرقہ ''متربصہ'' ہے، یہ لوگ بظاہر اپنے آپ کو درویشوں کی شکل کے مشابہ رکھتے ہیں، اور ہر زمانے میں ایک شخص کو والئی امور سمجھتے ہیں کہ یہ امت کا مہدی ہے، جو وہ مر جاتا ہے تو ایک اور شخص کو مہدی مان لیتے ہیں، یہ سلسلہ ان کا یوں ہی چلتا رہتا ہے۔

فرقہ جبریہ کی بارہ فرقوں میں تقسیم:

(۱) فمنهم المضطرية قالوا لافعل للآدمی بل الله يفعل الكل "

جبریہ فرقہ میں سے ایک فرقہ ''مضطریۃ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ بندے کا کوئی فعل نہیں سب فعل اللہ تعالیٰ کے ہیں، اس فرقہ کو مضطربہ بھی کہا گیا ہے۔ یہ فرقہ درحقیقت انسانوں کو گنہگار بنانے کی طرف راغب ہے کہ جب یہ کہا جائے گا کہ کوئی فعل بندے کا نہیں، تو لوگ عیاش ہو جائیں گے، اور یہ کہیں گے کہ یہ فعل تو ہمارا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا ہے، گویا کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندے میں حلول کئے ہوتا ہے، لھذا بندے کے افعال حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے افعال ہیں۔

(۲) والافعالية قالوا لنا افعال ولكن لا استطاعة لنا فيها ، وانما نحن كالبهائم نقاد بالحبل "

دوسرا فرقہ افعالیہ ہے، یہ کہتے ہیں کہ فعل تو ہمارا ہوتا ہے، لیکن ہمیں اس میں استطاعت واختیار حاصل نہیں ہوتا، وہ کام تو ہم سے اللہ تعالیٰ کراتا ہے، ہم تو چوپاؤں کی طرح ہوتے ہیں کہ جس طرح چوپاؤں کو رسی ڈال کر جدھر چاہیں گھماتے رہیں، اسی طرح وہ کام ہم سے جبراً کرائے جاتے ہیں۔

(۳) والمفروغية قالوا كل الاشياء قد خلقت والآن لايخلق شئی "

تیسرا فرقہ ''مفروغیۃ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام چیزوں جنہوں نے پیدا ہونا تھا وہ پیدا ہو چکی ہیں، اس کے بعد کسی اور چیز نے پیدا نہیں ہونا، یہ بدیہی چیزوں کا انکار ہے، ہم دیکھ رہے ہیں کہ کوئی پیدا ہو رہا ہے، اور کوئی فوت ہو رہا ہے۔

(۴) والنجارية زعمت ان الله تعالى يعذب الناس على فعله لاعلى فعلهم "

اور چوتھا فرقہ ''نجاریہ'' ہے، ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو اپنے فعل پر عذاب دیتا ہے، لوگوں کے افعال پر عذاب نہیں دیتا، یعنی یہ لوگ معاذ اللہ بندوں کے افعال ہی نہیں مانتے، بلکہ تمام افعال اللہ تعالیٰ کے مانتے ہیں، معاذ اللہ کتنا برا اور کتنا کفریہ عقیدہ ہے کہ بندے کا برا کام رب کا ہو جائے، (معاذ اللہ) ثم (معاذ اللہ) برا کام تو رب کرے اور سزا بندوں کو دے، کیسے احمق ہیں یہ لوگ؟

(۵) والمنانية قالوا عليک بما يخطر بقلبک ، فافعل ماتو سمت منه الخير"

پانچواں فرقہ ''منائیہ'' ہے، وہ کہتے ہیں، جو تمہارے دل میں آئے وہی کام کرنا تم پر لازم ہے، جو کام تمہیں اچھا سمجھ آئے وہی کرلو۔

(۶) والکسبیة قالوا لایکتسب العبد ثوابا ولا عقابا''

چھٹا فرقہ کسبیہ ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ بندے کے کسی فعل پر کوئی ثواب اور کوئی عذاب نہیں۔

یہ فرقہ قرآن پاک کے صریح ارشاد کے منافی ہے۔

﴿بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خَالِدُوْنَ '' وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اُولٰٓئِکَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِیْهَا خَالِدُوْنَ﴾ (البقرة، آیة نمبر ۸۱،۸۲)

ہاں کیوں نہیں جو گناہ کمائے اور اس کی خطاء اسے گھیر لے وہ دوزخ والوں میں ہے، انہیں ہمیشہ اس میں رہنا ہے÷ اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہ جنت والے ہیں، انہیں ہمیشہ اس میں رہنا ہے۔

(۷) والسابقية قالوا من شاء فليعمل ومن شاء فلايعمل ، فان السعيد لا تضره ذنوبه والشقى لاينفعه بره''

ساتواں فرقہ سابقیہ ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ جو چاہو عمل کرو، جو چاہو نہ کرو، کیونکہ نیک بخت کو گناہ کوئی نقصان نہیں پہنچاتے، اور بد بخت کو نیکیاں کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں پہنچاتیں۔

(۸) والحبية قالوا من شرب كاس محبة الله تعالى سقطت عنه عبادة الاركان''

آٹھواں فرقہ ''حبیہ'' ہے، وہ یہ کہتے ہیں جس نے اللہ تعالیٰ کی محبت کا پیالہ پی لیا اس سے عبادات ساقط ہو جاتی ہیں، یعنی صرف اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعوی کر لے کہ مجھے رب تعالیٰ کی محبت حاصل ہے، اس کے بعد کوئی نماز نہ پڑھے اور روزے نہ رکھے، زکوۃ ادا نہ کرے اور حج نہ کرے تو کوئی حرج نہیں۔

(۹) والخوفية قالوا من احب الله تعالى لم يسعه ان يخافه ، لان الحبيب لايخاف حبيبه''

نواں فرقہ ''خوفیہ'' ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اسے ڈرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ حبیب اپنے حبیب سے نہیں ڈرتا، اس فرقہ کا یہ عقیدہ باطل ہے، کیونکہ یہ تو رب تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ وہ محبت میں کتنا سچا ہے، ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ محبت کا دعوی کرتا رہے لیکن وہ اس میں کامل درجہ نہ رکھتا ہو، اس لئے اللہ تعالیٰ کو وہ دعوی قبول ہی نہ ہو۔

(۱۰) والفكرية قالوا من ازداد علما اسقط عنه بقدر ذلك من العبادة''

دسواں فرقہ "فکریہ" ہے، وہ یہ کہتے ہیں جس قدر کسی کا علم بڑھتا جاتا ہے اسی مقدار کے مطابق اس سے عبادات اٹھ جاتی ہیں، اس فرقہ کی کوشش ہے کہ علماء کو جہنمی بنایا جائے، کیونکہ جتنی مقدار میں علم زیادہ ہوگا اتنی مقدار میں اس سے عبادات اٹھ جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ یہ کہے میں تو بڑا عالم ہوں مجھے نمازوں، روزوں کی کیا ضرورت ہے۔

(۱۱) والخشبية قالوا الدنيا بين العباد سواء لاتفاضل بينهم فيما ورثهم ابو هم آدم "

گیارھواں فرقہ "خشبیہ" ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ دنیا سب بندوں میں برابر ہے، کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں، اسلئے کہ سب کے باپ حضرت آدم علیہ السلام ہیں، اوران کی وراثت سب کو حاصل ہے۔

(۱۲) والمنية قالوا مناالفعل ولنا الاستطاعة "

بارھواں فرقہ "منیہ" ہے، وہ کہتے ہیں، کام بھی ہمارے ہیں، استطاعت بھی ہماری ہے، یہ فرقہ بھی رب تعالی کا منکر ہے، کیونکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں کسی نے کوئی استطاعت عطاء نہیں کی، یہ ہمیں خود ہی حاصل ہے، ہمیں اعمال کی کوئی توفیق عطاء نہیں کرتا، بلکہ ہم اپنی طاقت سے عمل کرتے ہیں۔ (ماخوذ از قرطبی بوضاحت)

حاصل کلام :

ابھی تک جو بحث کی ہے، اس تمام بحث کا نتیجہ قرطبی کی مندرجہ ذیل بحث میں دیکھئے۔

❁ وقال ابن عباس لسماک الحنفي يا حنفي الجماعة الجماعة ، فانما هلكت الامم الخالية لتفرقها اما سمعت الله عزوجل يقول ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سماک حنفی کو کہا، اے حنفی جماعت کو لازم پکڑو، جماعت کو لازم پکڑو، بیشک پہلی امتیں تفرقہ کی وجہ سے ہلاک ہوگئیں، کیا تم نے اللہ تعالی کا ارشاد گرامی نہیں سنا۔ ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ "اور تھام لو اللہ کی رسی کو سب مل کر"

❁ وفي صحيح مسلم عن ابي هريرة قال قال رسول الله ﷺ ان الله يرضى لكم ثلاثا ويكره لكم ثلاثا يرضى لكم ان تعبدوه ولا تشركوا به شيئا وان تعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا وان تناصحوا من ولاه الله امركم "ويكره لكم ثلاثا قيل وقال وكثرة السؤال واضاعة المال "

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالی تمہارے لئے تین چیزوں کو پسند کرتا

ہے، اور تین چیزیں تمہارے لئے ناپسند کرتا ہے، تمہارے لئے یہ پسند کرتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور یہ کہ تھام لو اللہ کی رسی کو سب مل کر اور تفرقہ بازی نہ کرو، اور یہ کہ تم اس کی نصیحت قبول کرو جس کو اللہ تعالیٰ نے امور کا والی بنایا ہے، اور تین چیزیں تمہارے لئے ناپسند کرتا ہے وہ یہ ہیں قیل وقال (بے مقصد بحثوں میں الجھنا) اور زیادہ سوال کرنا، اور مال ضائع کرنا۔

❁ "فاوجب اللہ تعالی علینا التمسک بکتابه وسنة نبیه والرجوع الیهما عند الاختلاف وامرنا بالاجتماع علی الاعتصام بالکتاب والسنة اعتقادا وعملا، وذلک سبب اتفاق الکلمة وانتظام الشتات الذی یتم به مصالح الدنیا والدین والسلامة من الاختلاف، وامر بالاجتماع ونهی عن الافتراق الذی حصل لاهل الکتابین هذا معنی الآیة علی التمام"

اس آیۂ کریمہ کا مکمل معنی اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر لازم قرار دیا ہے کہ ہم قرآن پاک اور حدیث پاک سے مضبوطی سے تھام لیں، اگر کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو قرآن وحدیث کی طرف رجوع کریں، اور ہمیں رب تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ اعتقاد اور عمل میں قرآن پاک اور حدیث پاک کو سب متفق ہو کر تھام لیں، قرآن پاک اور حدیث پاک کی طرف رجوع کرنے سے کلمات میں اتفاق حاصل ہوگا، قرآن پاک وحدیث پر اجتماع کا حکم دیا گیا، اور یہود ونصاریٰ کی طرح تفرقہ سے منع کیا گیا۔ (قرطبی)

فائدہ جلیلہ :

وفیها دلیل علی صحة الاجماع جسما هو مذکور فی موضعه من اصول الفقه "واللہ اعلم"

یہی آیۂ کریمہ اس مسئلہ پر کافی دلیل ہے کہ "اجماع امت" شرعی دلائل میں سے ایک عظیم دلیل ہے۔ (قرطبی)

اجماع امت پر مختصر بحث ان شاء اللہ اسی آیۂ کریمہ کی وضاحت کے ضمن میں آخر میں ذکر کر دی جائے گی۔

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾

"اور یاد کرو اللہ کی نعمتوں کو، جو تم پر ہیں، جب تم (ایک دوسرے کے) دشمن تھے تو اس نے الفت ڈالی تمہارے دلوں میں، تو ہو گئے تم اس کی نعمت سے آپس میں بھائی بھائی۔"

جو آیہ زیر بحث ہے یہ اسی کا آخری حصہ ہے، شان نزول سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ یہ آیۂ کریمہ اور اس

سے پہلی آیات اوس اور خزرج کے بارے میں نازل ہوئیں، وہ اسلام لانے سے پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے، اسلام لانے کے بعد اللہ تعالی نے ان کے دلوں میں الفت ڈال دی، جس کی وجہ سے وہ آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے، یہ حقیقت میں ان پر اللہ تعالی کا بہت بڑا احسان تھا اسی احسان اور نعمت کو یاد رکھنے کا حکم دیا، کہ جب تم اللہ کی اس نعمت کو یاد رکھو گے تو یقیناً تمہاری اخوت اسلامیہ قائم ودائم رہے گی۔

زیادہ مفسرین کرام نے تو یہی مطلب بیان کیا ہے جسے ذکر کر دیا گیا، لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہودی کی سازش سے اسلام لانے کے بعد ان دونوں قبیلوں کا ایک دوسرے کے سامنے لڑائی کیلئے آجانے کا تذکرہ کیا ہو کہ تم جب ایک دوسرے کے دشمن ہوگئے تو رسول اللہ ﷺ تمہارے پاس تشریف لائے یہ درحقیقت اللہ تعالی کی تم پر نعمت تھی کہ اس نے تمہارے دلوں میں الفت ومحبت ڈال دی، جس سے تمہاری دشمنی جاتی رہی۔ (ماخوذ از کبیر)

فائدہ جلیلہ: واعلم ان كل من وجهه الى الدنيا كان معاديا لأكثر الخلق ومن كان وجهه الى خدمة الله تعالى لم يكن معاديا لاحد"

جو شخص دنیا کی طرف نظر رکھے، اس کے کام دنیاوی اغراض پر مبنی ہو وہ بہت لوگوں کا دشمن ہوتا ہے، اس کا کام انسانیت کے مطابق نہیں بلکہ خواہشات کے مطابق ہے، لیکن جس کی نظر اللہ تعالی کی طرف ہو وہ کسی کا بھی دشمن نہیں ہوتا۔

اصل وجہ یہ ہے کہ جس کی حقیقت میں نظر اللہ تعالی کی طرف ہو اور بالتبع اس کی نظر مخلوق کی طرف ہو تو وہ سب چیزوں کو قضاء وقدر کے قبضہ میں سمجھتا ہے، اس لئے وہ کسی کے دشمنی نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ بیان کیا گیا ہے

"ان العارف اذا امر امر برفق ويكون ناصحا لايعنف ويعير فهو مستبصر بسر الله في القدر"

بیشک عارف جب نرمی سے کسی کو کوئی حکم دیتا ہے تو وہ اسے نصیحت کر رہا ہوتا ہے، وہ نہ تو سختی سے حکم دیتا ہے اور نہ ہی اسے عار دلاتا ہے، وجہ اس کی یہی ہے کہ وہ تقدیر میں اللہ تعالی کے رازوں کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾ "تم ہوگئے اس کی نعمت سے آپس میں بھائی بھائی"

اس سے پتہ چلا کہ اسلام کے بعد جو ان کے درمیان اچھے معاملات جاری رہے وہ اللہ تعالی کی طرف سے ان کو حاصل ہوئے، اس لئے کہ اللہ تعالی نے ان کے دلوں میں اپنی نعمت سے ایک طاقت پیدا فرما دی جو الفت ومحبت کی طرف دعوت دیتی ہے تو اس پر وہ الفت ومحبت لزومی طور پر ان کو حاصل ہو جاتی ہے۔ معتزلہ کا مذہب اس میں یہ ہے

کہ بندوں کے دلوں میں محبت کا پایا جانا بندوں کی اپنی تخلیق ہے، اسلئے کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ نہیں، بلکہ بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں۔

"قال الکعبی ان ذلک بالهداية والبيان والتحذير والمعرفة والالطاف"

یہی وجہ ہے کہ کعبی معتزلی نے یہ کہا ہے کہ بندے خود ایک دوسرے سے محبت والفت کو پیدا کرتے ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دیتا ہے، ان کے سامنے بیان کرتا ہے، الفت ومحبت نہ کرنے پر ان کو ڈراتا ہے، اور الفت ومحبت کی ان کو پہچان کراتا ہے، ان پر مہربانیاں کرتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

اخوت وصداقت : اصل الاخ فی اللغة من التوخی وهو الطلب فالاخ مقصده مقصدا خيه "اخ" لغت میں "توخی" سے لیا ہوا ہے، جس کا معنی ہے "طلب" لهذا بھائی کا وہی مقصد ہوتا ہے جو اس کے بھائی کا ہوتا ہے۔

"والصديق ماخوذ من ان يصدق كل واحد من الصديقين صاحبه مافی قلبه ولا يخفی عليه شئی"

صدیق (صاد پر زبر، دال مخفف) کا معنی ہے گہرا دوست، اس وقت دوست کو "صدیق" کہا جائے گا، جب ایک دوسرے دوست کی کوئی بات مخفی نہ رہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا﴾

اور تم جہنم کی آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تمہیں اس سے نکالا۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے دنیاوی نعمتوں کا ذکر فرمایا، اس کے بعد اخروی نعمت کا ذکر فرمایا کہ تمہیں جہنم کی آگ کے گڑھے سے نکالنا یہ تم پر اللہ تعالیٰ کا اخروی عظیم انعام ہے، "شَفَا" (شین پر زبر، الف مقصورہ) اس کا معنی ہے کنارہ "شفا البیر" کنوئیں کا کنارہ، اس کی جمع ہے "اشفاء" "نقذ" "استنقذ" "انقذ" کا معنی ہے خلاصی دینا، نجات دینا "حُفْرَةٍ" کا معنی ہے گڑھا، معنی یہ ہے کہ تم اپنے کفر کی وجہ سے جہنم کے کنارے پر تھے، جہنم کو اس گڑھے سے تشبیہ دی جس میں آگ ہو، گویا کہ یوں بیان کیا گیا کہ تم کفر کی وجہ سے آگ کے اسطرح مستحق ہو گئے تھے کہ کوئی آگ کے گڑھے کے کنارے پر ہو، گرنے کے قریب ہو "فبين تعالى انه انقذهم من هذه الحفرة وقد قربوا من الوقوع فيها" اسی طرح رب تعالیٰ نے اوس وخزرج کا حال بیان فرمایا کہ وہ کفر کی وجہ سے آگ میں گرنے کے قریب تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو آگ میں گرنے سے بچالیا، گویا کہ آگ سے نکال لیا۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کیلئے:

﴿ فَاَنْقَذَكُمْ مِنْهَا ﴾ میں "ھا" ضمیر ﴿ شَفَا حُفْرَةٍ ﴾ کی طرف لوٹ رہی ہے، تو یہ کس طرح صحیح ہے کہ ضمیر مؤنث ہے اور "شفا" مذکر ہے۔

پہلا جواب: یہ ضمیر ﴿ حُفْرَةٍ ﴾ کی طرف لوٹ رہی ہے، کہ گڑھے سے نکالا، اسلئے کہ گڑھے کہ کنارے سے نکالنا گڑھے سے نکالنا ہی ہے۔

دوسرا جواب: ضمیر "نار" کی طرف لوٹ رہی ہے جو مؤنث سماعی ہے، یعنی تمہیں آگ سے نکالا۔ "شفا" اور "شفة" دونوں ایک معنی میں استعمال ہوتے رہتے ہیں، اس لئے یہ ضمیر گویا کہ "شفة" کی طرف لوٹ رہی ہے، جو مؤنث ہے۔

تیسرا جواب: خود لفظ "شفا" میں تذکیر و تانیث کا احتمال پایا گیا ہے، لھذا ضمیر مذکر کی لوٹائی جائے یا مؤنث کی لوٹائی جائے دونوں جائز ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

دنیا کی زندگی کتنی ہے:

آیۃ کریمہ سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر وہ کفر پر مرجاتے تو آگ میں گر جاتے، ان کی زندگی کی مثال بیان کی گئی کہ جس طرح کوئی آگ کے گڑھے کے کنارے پر بیٹھا ہوا ہو اور اس کا گڑھے میں گر جانا متوقع ہو (گر جانے کی امید کی جاری ہو) یہی حال ان لوگوں کا ہے۔

"وھذا فیہ تنبیہ علی تحقیر مدة الحیاة فانه لیس بین الحیاة وبین الموت المستلزم للوقوع فی الحفرة الا مابین طرف الشئی وبین ذلک الشئی"

اسی سے یہ مسئلہ بیان ہو رہا ہے کہ دنیا کی زندگی کی مدت بہت تھوڑی ہے گویا کہ زندگی اور موت کے درمیان اتنا وقفہ ہے جتنا گڑھے کے کنارے پر ہو تو گڑھے میں گر جانے میں وقفہ ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾

اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لئے اپنی آیات کو تا کہ تم ہدایت پا جاؤ۔

آیات سے مراد دلائل ہیں، یعنی جس طرح یہ دلیل تمہارے لئے بیان کی اسی طرح اور بھی دلائل تمہارے

لئے بیان کرتا ہے، اس ارادہ سے کہ تم ہدایت حاصل کرلو۔ (بیضاوی)

اجماع کی مختصر بحث از حسامی مع نامی:

قرطبی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ آیۂ کریمہ ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ دلالت کر رہی ہے اس پر کہ ''اجماع امت'' بھی دلائل شرع میں سے ایک دلیل ہے، جس کا ذکر اصول فقہ میں ہے، طلباء کرام کے فائدہ کیلئے اصول فقہ کی مشہور کتاب حسامی اور اس کی شرح نامی سے مختصر بحث اجماع امت کی پیش کی جا رہی ہے، زیادہ تفصیل دیکھنی ہو تو نور الانوار کو دیکھئے۔

اجماع کا لغوی معنی:

اجماع کے لغوی دو معانی ہیں، ایک ''العزم من الشئی'' کسی چیز کا پختہ ارادہ کرنا، جیسا کہ کہا جاتا ہے ''اجمع فلان علی کذا'' فلاں شخص نے اس کام کا پختہ ارادہ کرلیا ہے، اور دوسرا معنی اسکا ''اتفاق'' ہے، جیسا کہ کہا جائے ''اجمعوا علی هذا'' اس پر تمام کا اتفاق ہے۔

اصطلاحی معنی:

هو اتفاق جميع المجتهدين الصالحين من امة محمد ﷺ فی عصر علی واقعة ''

نبی کریم ﷺ کی امت کے نیک مجتہدین اصحاب علم کا ایک زمانہ میں ایک مسئلہ میں متفق ہو جانا، اجماع امت ہے تعریف میں ''اتفاق'' لفظ ذکر کیا گیا ہے جو اقوال اور افعال اور سکوت اور تقریر دونوں کو شامل ہے، یعنی سب کسی مسئلہ پر بول کر اتفاق کریں، یا اس پر عمل کر کے اتفاق کریں، یا بعض کہیں یہ مسئلہ اس طرح ہے، دوسرے اس پر خاموش رہیں، یا کوئی شخص عمل کر رہا ہو تو علماء مجتہدین دیکھ کر خاموش ہو جائیں، یہ سب صورتیں اجماع امت کی ہیں، جو شرعی دلیل ہے۔

''وقولنا جميع المجتهدين يخرج اتفاق بعضهم ويخرج اتفاق العوام ايضا فانهما ليسا باجماع ''

''اجماع'' کی تعریف میں ''تمام مجتہدین کا متفق ہونا'' ذکر کیا ہے، جس سے یہ واضح ہو گیا کہ اگر بعض علماء مجتہدین کسی مسئلہ میں متفق ہو گئے اور بعض نے مخالفت کی تو وہ ''اجماع امت'' نہیں، اور وہ شرعی دلیل بھی نہیں کہ اس پر اعتبار کر کے اس مسئلہ میں عمل کیا جائے، اسی طرح عوام تمام ہی کسی مسئلہ میں متفق ہو جائیں تو ان کا اتفاق شرعی دلیل نہیں، اسے اجماع امت نہیں کہا جائے گا۔

"وقولنا الصالحین یخرج اجماع الفاسقین والمبتدعین من المجتهدین فانه لیس بحجة"

اجماع امت کی تعریف میں "صالحین" کا ذکر کیا گیا ہے، جس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اگر علماء مجتہدین فاسق اور بدعات سیئہ پر عمل کرنے والے ہوں تو ان کا اجماع کوئی دلیل نہیں، واضح ہوا کہ حکمرانوں سے پیسے بٹورنے والے، اور پیسے لے کر ہاں میں ہاں ملانے والے اور غلط فتوے دینے والے علماء کا کسی مسئلہ میں اتفاق یا اختلاف کوئی حیثیت نہیں رکھتا، کیونکہ وہ تو "العوام کالانعام" سے بھی گھٹیا اور بدترین ہیں۔

"وقولنا من امة محمدﷺ یخرج اجماع مجتهدی الامم السابقة لانه من خصائص هذه الامة"

اور اجماع کی تعریف میں ذکر کیا ہے امت محمد مصطفیٰ ﷺ کے علماء مجتہدین وصالحین کا کسی مسئلہ پر اتفاق کرنا "اجماع امت ہے" اس سے یہ واضح ہو گیا کہ صرف نبی کریم ﷺ کا یہ خاصہ ہے کہ آپ کی امت کے "علماء مجتہدین وصالحین" کا اجماع دلیل ہے، ورنہ پہلی امتوں کا اجماع نہ اس وقت دلیل تھا اور نہ ہی اب دلیل ہے۔ تعریف میں "فی عصر علی واقعة" کہا ہے، جس سے یہ فائدہ حاصل ہو گیا کہ ایک زمانہ میں کسی مسئلہ میں علماء کا متفق ہونا "اجماع امت" ہے، خواہ تعداد علماء کی قلیل ہو یا کثیر ہو، اسلئے بعض لوگوں کا اس مسئلہ میں یہ کہنا غلط اور باطل ہے کہ کسی مسئلہ میں تمام مجتہدین کا ہر زمانہ میں قیامت تک متفق ہونا اجماع امت ہے۔ اس بحث سے واضح ہو گیا کہ "اجماع" میں کئی اقوال باطل ہیں، بعض لوگوں نے کہا "اجماع" صرف صحابہ کرام کا ہے، اور بعض لوگوں نے کہا "اجماع" صرف اہل مدینہ کا ہے، بعض نے کہا اجماع عترت نبی کریم ﷺ کا ہے، یہ تمام اقوال باطل ہیں۔

"والصحیح عندنا ان اجماع کل عصر من اهل العدالة والاجتهاد حجة ولا عبرة لقلة العلماء وکثرتهم ولا بالثبات علی ذلک حتی یموتوا"

ہمارے نزدیک صحیح مذہب یہ ہے کہ ہر زمانہ کے عادل (صالحین) مجتہدین علماء کرام کا اجماع حجت ہے، علماء کی تعداد قلیل ہونے یا کثیر ہونے کا کوئی اعتبار نہیں، اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ وہ اجماع کے بعد تا حیات اسی پر قائم رہیں (بلکہ بعد میں موقف بدل جائے اور اس مسئلہ سے کسی نے رجوع کر لیا، تو اس سے اجماع میں کوئی فرق نہیں آئے گا) اهل هوی کی اجماع کی مخالفت سے اجماع میں کوئی فرق لازم نہیں آتا۔

"اذا انعقد الاجماع علی فضیلة ابی بکر فخلاف الروافض فیه غیر معتبر"

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت پر اجماع منعقد ہے، تو رافضیوں کے اختلاف سے "اجماع امت" میں کوئی فرق لازم نہیں آئے گا، بلکہ رافضیوں کو رافضی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اہل حق کو چھوڑ دیا ہے۔

"ولا عبرة لمخالفة من لا رأی له کالعوام فی الباب الا فیما یستغنی عن الرأی"

جن لوگوں کو رائے اور اجتہاد حاصل نہیں، جیسے عوام ہیں، ان کی اجماع کے خلاف مخالفت کا کوئی لحاظ نہیں، صاحب کتاب نے "الا فیما یستغنی عن الرای" کو مستثنیٰ کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے، بعض احکام میں رائے کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا جیسا کہ "نقل قرآن اور تعداد رکعات" ان میں نہ عوام کی رائے کا کوئی اعتبار ہے، اور نہ مجتہدین کی رائے کا کوئی اعتبار ہے، کیونکہ ان چیزوں کا ثبوت خبر متواتر سے ہے، بعض احکام میں رائے کا اعتبار پایا جاتا ہے، ان میں علماء صالحین مجتہدین کا رائے میں اتفاق اجماع ہے، لیکن عوام کی رائے کا ان میں بھی کوئی اعتبار نہیں۔

اجماع کے مراتب:

سب سے قوی اجماع صحابہ کرام کا ہے۔ جس میں نص پائی جائے کہ وہ کہیں "اجمعنا علی کذا" ہمارا اس مسئلہ میں اجماع ہے، اس اجماع کے حجت و دلیل ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، اسلئے اجماع صحابہ کرام کے ضمن میں اجماع اہل مدینہ بھی آ گیا اور اجماع عترت رسول اللہ ﷺ بھی آ گیا" "اس اجماع کا منکر کافر ہے"

اس کے بعد اجماع سکوتی کا درجہ ہے:

اجماع سکوتی یہ ہے کہ بعض صحابہ کرام کے قول میں نص ہو کہ ہم اس مسئلہ میں متفق ہیں، اور بعض اس میں خاموش ہوں، بعض کے خاموش رہنے اور مخالفت نہ کرنے کی وجہ سے اجماع ہو گیا، لیکن پہلے اجماع سے کم درجہ ہو گیا، "لان السکوت فی الدلالة علی تقریر الحکم دون النص ولذا لایکفر جاحده" اسلئے کہ سکوت کسی حکم کو ثابت کرنے کی دلالت میں نص سے کم درجہ رکھتا ہے، اتنا تو ہر صاحب عقل سمجھ لیتا ہے، کہ یہ کہنا کہ ہم اس میں متفق ہیں، اور خاموش رہنا لیکن مخالفت نہ کرنا، ان میں بہت بڑا فرق ہے، اسی وجہ سے اجماع سکوتی کے منکر کو کافر نہیں کہا جائے گا۔

پھر ہر زمانہ کے علماء صالحین و مجتہدین کا اجماع:

لیکن شرط یہ ہے کہ ان کا اجماع صحابہ کرام کے اجماع کے مخالف نہ ہو "فهذا لاجماع بمنزلة المشهور یفید الطمانینة دون الیقین" یہ اجماع خبر مشہور کے درجہ میں ہے، یہ اطمینان حاصل ہونے کا فائدہ دیتا ہے، اس سے یقین حاصل نہیں ہوتا اس اجماع کا منکر کافر نہیں، لیکن شدید گنہگار ہے، جیسا کہ خبر مشہور کا منکر کافر نہیں لیکن گنہگار ہوتا ہے۔

پھر اجماع جس میں بعض صحابہ کرام کی مخالفت پائی گئی ہو:

یعنی اجماع علماء صالحین مجتہدین کا ہو، اس میں بعض صحابہ کرام کی موافقت پائی گئی ہو، اور بعض کی مخالفت، یہ اسی وقت ہوگا جب بعض صحابہ کرام کا اس میں اختلاف پایا گیا ہوگا، جیسا کہ ''ام ولد'' کی بیع (فروخت کرنے) میں صحابہ کرام کا اختلاف تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جائز نہیں مانتے تھے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جائز مانتے تھے، پھر اجماع حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق ہوگیا کہ ''ام ولد'' کی بیع جائز نہیں، یہ اجماع پہلے تین قسم کے اجماع سے کم درجہ ہے، اس کا مقام خبر واحد کا ہے، یہ قیاس پر مقدم ہوگا، عمل اس پر واجب ہوگا، لیکن اس کا منکر کافر نہیں ہوگا ''خبر واحد کا بھی یہی حکم ہے''

اس آخری درجہ اجماع پر بحث:

یہ اجماع جس میں بعض صحابہ کرام کی مخالفت پائی گئی ہو، اس میں علماء کرام کا اختلاف ہے، بعض اہل ظواہر، اور اصول فقہ والے کئی حضرات جیسے ابوبکر صیرفی شافعی، شیخ ابوالحسن اشعری، احمد بن حنبل، غزالی، امام الحرمین جونی، اور بعض احناف رحمهم الله کا قول یہ ہے، کہ۔

''هذا لايكون اجماعا حتى يبقى المسئلة اجتهادية كما كانت ويجوز لاحد ان ياخذ بالقول المخالف لهذا الجماع''

یہ اجماع ہی نہیں، بلکہ یہ مسئلہ اجتہادیہ ہے جیسے پہلے اجتہادیہ تھا، اجماع کے بعد بھی اجتہادیہ ہے، اس میں اگر کوئی مخالفت کرے تو جائز ہے، ان لوگوں کی اس پر دلیل یہ ہے کہ اس اجماع میں اتفاق نہیں پایا گیا، کیونکہ بعض صحابہ کی مخالفت پائی گئی ہے، پھر مخالفت جس کی کی گئی اس کی وفات سے بھی ''یہ اجماع دلیل نہیں بن سکے گا'' ''لان موت المخالف لايبطل قوله'' اس لئے کہ جس کی مخالفت کی گئی اس کی وفات سے اس کا قول باطل نہیں ہوگا۔

احناف کا اس میں مذہب:

یعنی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے کثیر اصحاب اور امام شافعی رحمہ اللہ کے بعض اصحاب کا صحیح قول اس میں یہ ہے ''اجماع علماء كل عصر حجة فيما سبق فيه الخلاف وفيما لم يسبق'' ہر زمانے کے علماء صالحین ومجتہدین کا اجماع حجت ہے خواہ پہلے حضرات میں سے بعض کی مخالفت پائی گئی ہو یا نہ پائی گئی ہو، دونوں اجماع حجت ہیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ جس اجماع میں پہلے حضرات کی مخالفت نہیں پائی گئی وہ خبر مشہور کے درجہ میں ہے، اور جس میں اختلاف

پایا گیا وہ خبر واحد صحیح کے درجہ میں ہے۔

اجماع کے انتقال کی اقسام:

صحابہ کرام کے اجماع کا ہماری طرف منتقل ہونا دو قسم ہے۔**ایک** یہ کہ صحابہ کرام کا اجماع ہم تک ہر زمانے کے اتنے لوگوں سے پہنچے جن کا جھوٹ پر متفق ہونا محال ہو یعنی اجماع ہم تک ہر زمانے میں اجماع سے پہنچے تو یہ خبر متواتر کے درجہ میں ہوگا۔**دوسرا** یہ ہے کہ اجماع صحابہ ہم تک احاد سے پہنچے عمل کرنا اس پر واجب ہوگا لیکن علم یقین حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ اصل کے لحاظ پر تو اس میں یقین پایا گیا ہے، لیکن نقل کے لحاظ پر اس میں ظن آ گیا، تاہم یہ اجماع بھی قیاس سے مقدم ہوگا۔ (حسامی مع نامی)

فرقہ واریت ناسور ہے:

یہ جملہ عام لوگوں کے ذہنوں میں ان لوگوں نے بٹھایا ہوا جو درحقیقت فرقہ واریت کی آگ کو ہوا دے کر بھڑکانے والے، یہ کہنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے پیسے خرچ کر کے ملک میں افراتفری پیدا کرنے کیلئے فرقہ واریت کو پیدا کیا، یہی لوگ ہیں جنہوں نے فرقہ واریت کے پودوں کی آب زر سے آبیاری کر کے اسے تناور درخت بنا دیا، جس کی جڑیں ملک کے کونہ کونہ میں پھیل گئیں۔

آیئے! خدارا تجزیہ کی جئے وہ کون ہیں جنہوں نے فرقہ واریت کی آگ کو بھڑکا کر یہ راگ الاپنا شروع کر دیا فرقہ واریت ناسور ہے، یہ مولوی دہشت گرد ہیں، یہ تو اسی طرح کا جملہ ہے جیسا کہ چور چوری کرنے کے بعد دوسرے لوگوں سے مل کر شور کرنے لگے وہ چور گیا، وہ بھاگ گیا، وہ تنگ گلیوں میں گھس گیا، اس نے تاریک رات کا فائدہ اٹھالیا، اپنے آپ کو اسنے بچالیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ہاں ہاں اب ہر ذی شعور انسان سمجھ چکا ہے کہ یہ کام ان لوگوں کا ہے جو ایک مرتبہ اقتدار سے چمٹ جاتے ہیں تو ڈنڈے کے زور سے اپنے ساتھ لٹھ برداروں کو ملا کر اس اپنے اقتدار کو طول دینے کیلئے طرح طرح کے حربے استعمال کرتے ہیں، ان حربوں میں سے ایک یہ ہے کہ لوگوں کو لڑاؤ حکومت چلاؤ۔

پھر ان کے مشیر جو پہلے ان کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ تمہاری کامیابی کا راز صرف اس میں ہے کہ لوگوں کا لڑاؤ اور حکومت چلاؤ، نااہل حکام، اور بے تدبیر وزیر، اور فسادی مشیر مل کر پیسہ چھانٹا شروع کر دیتے ہیں کبھی ایک کو خرید اور

بھی دوسرے کو، ایک دوسرے کو لڑانے کے ذرائع پیدا کیے جاتے ہیں کون نہیں جانتا کہ تخریب کار تنظیموں کو ارباب حکومت نے ہی کھڑا کیا ہے، بغیر پیچھے آہنی ہاتھ کے کوئی تخریب کار تنظیم دو دن بھی قائم نہیں رہ سکی، یہ صرف پیچھے خفیہ ہاتھ کے بل بوتے اور ان کو ملنے والے پیسے سے قائم و دائم رہتی ہیں، جب ان سے پیسہ دینے والے اس لئے ناراض ہو جاتے ہیں کہ تمہیں لڑانے کیلئے، تمہیں پروان چڑھانے کیلئے جو غیر مسلم ہمیں پیسہ دیتے تھے اب وہی تم سے ناراض ہو گئے ہیں کیونکہ تم نے ان کا کام چھوڑ دیا، ان کی بات مانتے چلے جاتے ان کا کام کرتے رہتے تو تمہیں پیسے ملتے رہتے، تمہاری تنظیمیں برقرار رہتیں۔ تم نے تلے لگنا چھوڑ دیا ہے تو یاروں نے تم سے منہ موڑ لیا ہے، اس لئے اب تم دہشت گرد ہو، ہاں اگر تم نے پھر سے مجاہد کا لقب حاصل کرنا ہے تو نصرانیوں کے غلام بن جاؤ، ان کا کام کرو تو تمہیں پیسے بھی ملیں گے اور تمہیں مجاہد بھی کہا جائے گا۔

یہ ہے وہ سبب جس نے فرقہ واریت کو جنم لیا، اسکے جڑوں کو مضبوط کیا، ملک کو تباہ کیا ملک کے دو ٹکڑے کئے، ابھی تک سوچ وہی ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، پیچھے آنے والا پہلے کے نقش قدم پر چلتا ہے بلکہ دو قدم آگے بڑھ جاتا ہے، سب خرابی کی جڑ غیر مسلموں کی غلامی ہے، بظاہر ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم آزاد ہیں، لیکن درحقیقت پہلے سے زیادہ غلامیت ہمیں حاصل ہوئی ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہودیوں اور نصرانیوں کے یار ہی ارباب حکومت کے مشیر بے تدبیر ہوتے ہیں، جب ان کو مشورہ دے کر کہ ''لوگوں کو لڑاؤ اور حکومت چلاؤ'' میں کافی حد تک کامیاب ہو جاتے ہیں، ان سے کافی کام ملک کی تباہی کا مسلمانوں کو قتل کرانے کا لے لیتے ہیں تو جب ارباب حکومت ان کی ہاں میں ہاں ملانا ذرا کم کر دیتے ہیں تو اب وہ دوسری طرف آجاتے ہیں اپنے غیر مسلم آقاؤں سے لیا ہوا پیسہ دوسری جانب چھانٹنا شروع کر دیتے ہیں، اب ان کا نعرہ یہ ہوتا ہے ''شور مچاؤ حاکم ہٹاؤ''

یہ ہیں اسباب جن کی وجہ سے کالج، یونیورسٹیاں، دکانیں، اور بازار اور گھر لڑائی کی لپیٹ میں ہیں، یہ وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے داڑھیوں والے، جبہ و دستار والے جہلاء کو بھی خرید لیا جاتا ہے، ان سے بھی ایک دوسرے سے لڑانے کا کام لے لیا جاتا ہے لیکن اللہ تعالی کے فضل و کرم سے حقیقی علماء کبھی نہیں بکے اور انشاء اللہ کبھی نہیں بکیں گے، خصوصی طور پر علماء اہل سنت بریلوی مسلک کے علماء جو بحیثیت جماعت کے قائد اعظم کے ساتھ پاکستان بنانے میں پیش پیش تھے وہ انشاء اللہ کبھی ملک کے وقار کے خلاف کام نہیں کریں گے کیونکہ اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی چیز کو بگاڑنا اہل علم کا شیوہ ہی نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ہر مسلک کے حقیقی علماء اللہ کے فضل و کرم سے تخریب کار لوگوں کا کبھی آلہ کار نہ بنے اور نہ ہی انشاء اللہ کبھی بنیں گے۔

اس لئے میرے پیارے عوام الناس! یہ جملہ ضرور یاد کریں کہ" فرقہ واریت ناسور ہے" لیکن اس کے اسباب کو بھی نہ بھولیں، انشاء اللہ آپ کو پتہ چل جائے کہ نام ونہاد ملک کے محافظ ہی سب تباہی کا سبب ہیں۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (آیۃ نمبر ۱۰۴)

(۱) اور تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے کہ بھلائی کی طرف بلائیں، اور اچھی بات کا حکم دیں اور بری سے منع کریں اور یہی لوگ مراد کو پہنچے۔

(۲) اور چاہئے کہ تم میں سے ایک گروہ ہو جو دعوت دیں بھلائی کی طرف، اور حکم دیں اچھی چیزوں کا، اور منع کریں بری چیزوں سے، اور یہی، لوگ کامل کامیاب ہیں۔

ماقبل سے تعلق:

گزشتہ آیات میں اہل کتاب (یہود ونصاری) کے دو عیبوں کا ذکر فرمایا، ایک کفر کا ذکر کیا:

"يَآاَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِآيَاتِ اللّٰهِ" اے اہل کتاب تم اللہ کی آیات سے کیوں کفر کرتے ہو۔

اور دوسرا ان کا عیب ذکر کیا کہ وہ غیروں کو کفر میں واقع کرنے کی ناپاک جسارت کرتے تھے۔

"يَآاَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ آمَنَ بِهٖ"

اے اہل کتاب تم کیوں روکتے ہو اللہ کی راہ سے ایمان والوں کو۔

اہل کتاب کے عیوب ذکر کرنے کے بعد ایمان والوں کا تذکرہ فرمایا، اور ان کو ایمان وتقوی کا حکم دیا۔

"يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ"

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے، اور ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔

پھر حکم فرمایا ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ اور تھام لو اللہ کی رسی کو سب مل کر، اب اس آیۃ کریمہ میں ایمان والوں کو حکم دیا کہ تم اوروں کو بھی ایمان واطاعت کی طرف لانے کی کوشش کرو، یہی وجہ ہے ارشاد فرمایا ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾ اور چاہیے کہ تم میں سے ایک گروہ ہو جو دعوت دیں بھلائی کی طرف۔ (کبیر)

لفظ "من" کے متعلق بحث:

منکم ، میں لفظ " من " تبعیض کیلئے ہے، یا تبیین کیلئے ہے، اس میں اہل علم کا اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے کہ یہ تبیین کیلئے ہے، تبعیض کیلئے نہیں، ان حضرات نے اپنے موقف پر دو دلیلیں پیش کی ہیں۔

" الاول ان اللہ تعالیٰ اوجب الامر بالمعروف و النھی عن المنکر علی کل الامۃ فی قولہ " کنتم خیرا مۃ اخرجت للناس تا مرون با لمعروف و تنھون عن المنکر "

پہلی دلیل ان میں سے یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے " امر بالمعروف " اور " نھی عن المنکر " کا حکم تمام امت کو دیا ہے، بعض کو حکم نہیں، ابھی آگے قریب ہی آیۃ کریمہ آ رہی ہے، " كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ " (تم بہتر ہو ان سب امتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں بھلائی کا حکم دیتے ہوئے اور برائی سے منع کرتے ہوئے)

اس آیۃ کریمہ میں تمام امت کے " امر بالمعروف " اور " نھی عن المنکر " کا ذکر ہے، صرف بعض کا ذکر نہیں۔ ان حضرات کی دوسری دلیل یہ ہے

"لا مکلف الا و یجب علیہ الامر بالمعروف و النھی عن المنکر " کہ کوئی مکلّف (عاقل و بالغ) نہیں یہ کہ اس پر واجب ہے کہ وہ اچھے کاموں کا حکم دے، اور برے کاموں سے منع کرے، خواہ ہاتھ سے روکے، یا زبان سے روکے، یا دل سے روکے، ہر ایک پر واجب ہے کہ وہ اپنے آپ سے ضرر کو دور کرے۔

" اذا ثبت ھذا فتقول معنی ھذا الآیۃ کو نو ا امۃ دعاۃ الی الخیر آمرین بالمعروف ناھین عن المنکر " جب یہ ثابت ہے تو ہم کہتے ہیں معنی اس آیۃ کا یہ ہے "ہو جاؤ تم امت بھلائی کی دعوت دو، اچھے کاموں کا حکم دو، اور برے کاموں سے منع کرو۔

اس تمام تقریر کے بعد واضح ہوا کہ " من " تبیین ہے، تبعیض کیلئے نہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ﴾ یہاں بھی "من" تبین کیلئے ہے، اس طرح کہا جاتا ہے "لفلان من اولادہ جند " فلاں کی اولاد لشکر ہے، اور کہا جاتا ہے "وللامیر من غلمانہ عسکر " امیر کے غلام لشکر ہیں، ان مثالوں میں "من " بیانیہ ہے، تبعیض کیلئے نہیں، بعض اولاد یا بعض لشکر مراد نہیں۔

مقام توجہ : اگر چہ حکم تو تمام امت کو ہے، لیکن اگر بعض نے " امر بالمعروف اور نھی عن المنکر " پر عمل کر دیا تو باقیوں سے حکم ساقط ہو جائے گا، یعنی یہ فرض کفایہ ہے، فرض عین نہیں۔

دوسرا قول : بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ "مــــن" تبعیض کیلئے، جس کا معنی ہوتا ہے "بعض"

"اب ان حضرات کے دو قول ہیں، ایک یہ کہ "مــــن" تبعیض کیلئے بنانے کا فائدہ یہ ہے کہ قوم کے بعض لوگ اچھے کاموں کا حکم دینے اور برے کاموں سے روکنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے، جیسا کہ عورتیں، مریض، اور عاجز، دوسری دلیل ان حضرات کی یہ ہے کہ یہ تکلیف مختص ہے علماء کرام سے۔ اس پر دو دلیلیں موجود ہیں ایک یہ کہ یہ آیۃ کریمہ مشتمل ہے تین چیزوں پر۔

(۱) "الدعوۃ الی الخیر" "بھلائی کے کاموں کی طرف بلانا" (۲) "والامر بالمعروف" اچھے کاموں کا حکم دینا۔

(۳) "والنھی عن المنکر" برے کاموں سے روکنا، یہ کام علماء ہی کر سکتے ہیں، جہلاء نہیں کر سکتے، کیونکہ جاہل بسا اوقات باطل کی طرف بلائیں گے، برے کاموں کا حکم دیں گے، اچھے کاموں سے روکیں گے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جاہل بسا اوقات اپنے مذہب کا پرچار کرے گا، دوسرے کے مذہب کو نہیں جانتا ہوگا تو اسے اچھے کاموں سے روک دے گا، جاہل نرمی کے وقت سختی کرے گا سختی کے وقت نرمی کرے گا، اس لئے آیۃ کریمہ میں جب علماء کا ذکر ہے تو وہ امت کا بعض ہیں، لہذا "مــــن" تبعیض کیلئے آئے گا، دوسرے مقام پر رب تعالی کا ارشاد گرامی اس کی تائید کر رہا ہے۔

"فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ٥ (سورۃ التوبۃ آیۃ نمبر ۱۲۲)

تو کیوں نہ ہو کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ حاصل کریں، اور واپس آکر اپنی قوم کو ڈر سنائیں، اس امید پر کہ وہ بچیں۔

دوسری یہ کہ آیۃ کریمہ میں مراد علماء ہیں، اس لئے کہ جب اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کا حکم فرض کفایہ ہے تو واضح بات ہے کہ یہ کام علماء کرام ہی مستحسن طریقہ پر ادا کر سکتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

راقم کے نزدیک محاکمہ :

جن حضرات نے "من" بیانیہ کہا اور جن حضرات نے "من" تبعیض کیلئے کہا ہے حقیقت میں ان میں کوئی اختلاف نہیں، جنہوں نے ابتداء کو دیکھا ہے (کہ اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا، یہ حکم امت کے ہر فرد کو ہے، مراد امت اجابت ہے، یعنی جنہوں نے ایمان قبول کیا ہے، ان سب کو یہ حکم دیا گیا، اگر کسی ایک نے

بھی اس پر عمل نہ کیا تو سب ہی گنہگار ہوں گے) انہوں نے کہا کہ " من " بیانیہ ہے، مراد تمام امت ہے، جنہوں نے انتہاء کو دیکھا (کہ مطلوب تو فرض کفایہ ہے، بعض کے ادا کرنے سے حکم پر عمل ہو جائے گا، کوئی بھی گنہگار نہیں ہوگا) انہوں نے کہا ہے کہ " من " تبعیض کیلئے، امید ہے کہ طلباء کرام کے روشن اذہان اس محاکمہ کو قبول کریں گے کہ ابتداء کو دیکھنے سے " من " بیانیہ ہے، اور انتہاء کو دیکھنے سے " من " تبعیض کیلئے ہے۔

ضحاک کا قول:

اس آیۃ کریمہ میں خطاب صحابہ کرام کو ہے، کیونکہ وہ براہ راست نبی کریم ﷺ سے علم حاصل کرتے تھے، اس لئے ان کو ہی حکم دیا کہ تم دوسروں کو بھی علم سکھاؤ، اس قول کے مطابق آیۃ کریمہ کا معنی یہ ہوگا " کونو امة مجتمعین علی حفظ سنن الرسول ﷺ و تعلم الدین " کہ تم تمام ایک گروہ بن کر متفق ہو جاؤ اس پر کہ نبی کریم ﷺ کی سنتوں کی حفاظت کرنی ہے، اور دین کی تعلیم حاصل کرنی ہے۔

راقم کے نزدیک ضحاک اور جمہور کے اقوال میں کوئی اختلاف نہیں، اس لئے کہ ابتدائی طور پر حکم صحابہ کرام کو تھا، اس طرح ضحاک کا قول ثابت ہوگیا، بعض میں عموم الفاظ کا اعتبار کرتے ہوئے تمام مؤمنین کیلئے حکم نافذ کر دیا، اس طرح جمہور کا قول ثابت ہوگیا۔

آیۃ کریمہ میں تین چیزوں کا حکم دیا گیا:

(۱) بھلائی کی دعوت (۲) اچھے کاموں کا حکم دینا (۳) اور برے کاموں سے روکنا۔

دینی طلباء کرام اس مسئلہ سے بخوبی واقف ہیں کہ عطف مغایرت کو چاہتا ہے، اسلئے تینوں چیزیں علیحدہ علیحدہ مراد ہوں گی۔ اسلئے "دعوت الی الخیر" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی کی ذات وصفات کو ثابت کرنے کیلئے دوسروں کو بھی دعوت دے، اور اللہ تعالی کو ممکنات کی مشابہت سے پاک رکھے، رب تعالی کا ارشاد گرامی اس پر دلالت کر رہا ہے ﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ﴾ (سورة النحل آية نمبر ۱۲۵) اپنے رب کی راہ کی طرف بلاؤ حکمت سے۔

اور ارشاد باری تعالی بھی اسی مفہوم کو ثابت کر رہا ہے ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْۤ اَدْعُوْۤا اِلَی اللّٰهِ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ﴾ (سورۃ یوسف آیۃ نمبر ۱۰۸) تم فرماؤ یہ میری راہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور میری تابعداری کرنے والے دل کی آنکھیں رکھتے ہیں۔

بھلائی کی طرف دعوت دینے کے بعد ایسے فعل کی رغبت دلائی گئی جو مناسب اور بہتر ہو، اسی کو " ویامرون بالمعروف " سے بیان فرمایا کہ وہ اچھے کاموں کا حکم دیں، اس کے بعد رغبت دلائی کہ جو کام مناسب نہیں ان کو چھوڑ دیا جائے اسی کو " وینھون عن المنکر " سے بیان فرمایا کہ وہ برے کاموں سے منع کریں۔ (تمام بحث ماخوذ از کبیر)

﴿وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ "اور وہی کامل کامیاب ہیں"۔

راقم نے یہ ترجمہ بیضاوی سے لیا ہے " واولئک هم المفلحون "المخصوصون بکمال الفلاح " اور وہی کامل کامیاب ہیں، اور اس کامل میں ان کو خصوصی کمال حاصل ہے۔ (بیضاوی)

فاسق اچھے کاموں کا حکم اور برے کاموں سے روک سکتا ہے یا نہیں؟

بعض حضرات نے اس آیۂ کریمہ سے یہ دلیل پکڑی ہے کہ رب تعالیٰ نے اچھے کاموں کا حکم دینے والوں اور برے کاموں سے روکنے والوں کے متعلق فرمایا ﴿وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ فاسقوں کو چونکہ کامیابی حاصل نہیں ہوتی، لھذا ان کیلئے جائز نہیں کہ وہ دوسروں کو اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں، اس قول کا رد کیا گیا ہے کہ یہ درست نہیں، اس لئے کہ رب تعالیٰ نے اکثریت کا ذکر فرمایا ہے کہ اکثر لوگ جب دوسرے کو نصیحت کریں گے تو یقیناً خود بھی اس پر عمل کریں گے۔

والعلماء قالوا "الفاسق له ان یامر بالمعروف لانه وجب علیه ترک ذلک المنکر ووجب علیه النهی عن ذلک المنکر فبأن ترک احدالواجبین لا یلزمه ترک الواجب الآخر"

علماء کرام نے یہ کہا ہے کہ فاسق دوسرے کو اچھے کام کا حکم دے، کیونکہ کسی کو اچھی نصیحت نہ کرنا بھی برا فعل ہے، اور برے فعل سے بچنا بھی ضروری ہے۔ دو چیزیں واجب ہیں، ایک یہ کہ فاسق گناہوں سے باز آجائے، اور دوسری چیز واجب یہ ہے کہ فاسق دوسروں کو اچھے کاموں کا حکم دے، اگر فاسق سے ایک واجب چھوٹ رہا ہے تو دوسرا وہ نہ چھوڑے۔

"**وعن السلف مروا بالخیر وان لم تفعلوا**" سلف صالحین سے مروی ہے کہ اچھے کاموں کا حکم دو اگرچہ خود اس پر عمل نہ کرو۔

"وعن الحسن انه سمع مطرف ابن عبدالله یقول لااقول مالاافعل فقال واینایفعل ما یقول؟ ودالشیطان لو ظفر بهذه الکلمة منکم فلا یامر احدبمعروف ولا ینهی عن المنکر"

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے مطرف ابن عبداللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا " کہ میں وہ بات نہیں کہتا جو خود نہیں کرتا " آپ

نے فرمایا ہم میں سے کون ہے جو کہے خود بھی اس پر عمل کرے، یعنی بعض اوقات انسان سے کوتاہی ہو جاتی ہے کہ دوسروں کو نصیحت کرتا ہے اور خود اس پر عمل نہیں کر سکتا، اگر شیطان نے تم سے یہ کلمہ سن لیا تو وہ بہت خوش ہوگا، کیونکہ اس طرح تو اچھے کاموں کا حکم دینے والا اور برے کاموں سے منع کرنے والا کوئی ملے گا نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

☆ **روی انه علیه ﷺ سئل من خیر الناس قال آمرهم بالمعروف و انهاهم عن المنکر و اتقاهم لله و اوصلهم للرحم "**

نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا، یا رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سے بہتر کون ہے، تو آپ نے فرمایا، جو اچھے کاموں کا حکم دینے والا ہو، اور برے کاموں سے روکنے والا ہو، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہو اور صلہ رحمی کرنے والا ہو۔ (ماخوذ از بیضاوی)

"والامر بالمعروف یکون واجبا مندوبا علی حسب ما یؤمر به والنهی عن المنکر واجب کله لان جمیع ما انکره الشرع حرام "

اچھے کاموں کا حکم دینا کبھی واجب ہوتا ہے اور کبھی مستحب ہوتا، جیسا امر کا تقاضا ہوگا ایسا ہی حکم ہوگا، لیکن برے کاموں سے روکنا ہمیشہ واجب ہوگا، کیونکہ جمیع کام شریعت کے مخالف حرام ہوں گے، حرام سے روکنا واجب ہوگا۔

لیکن علامہ بیضاوی کے اس آخری قول کو شیخ زادہ نے رد کیا ہے:۔

قوله (والنهی عن المنکر واجب کله) قال النحریر التفتازانی فیه نظر اذالمکروه منکر یندب ترکه ولا یجب والالکان حراما "

"علامہ بیضاوی کا یہ کہنا کہ تمام برے کاموں سے روکنا واجب ہے" یہ درست نہیں، اس لئے کہ بعض برے کام مکروہ ہوتے ہیں، ان سے روکنا مستحب ہے، اگر تمام برے کاموں سے روکنا واجب ہو تو تمام کام حرام ہوں گے، حالانکہ کوئی برے کام مکروہ ہوں گے۔ (شیخ زادہ)

راقم کے نزدیک علامہ بیضاوی کا قول مقید ہے کہ وہ برے کام جو حرام کے درجہ میں ہیں، ان تمام سے روکنا واجب ہے۔

طریقہ تبلیغ: یبدأ فی الامر بالمعروف والنهی عن المنکر بالارفق مترقیا الی الاغلظ فالاغلظ "

اچھے کاموں کے حکم دینے کی ابتداء اور برے کاموں سے روکنے کی ابتداء نرم کلام سے کرے، اگر نرم کلام کو ہی وہ تسلیم کرلے تو بہتر بات، ورنہ آہستہ آہستہ کلام میں سختی کرتا جائے۔

"ثم اذالم یتم الامر بالتغلیظ والتشدید وجب علیه القهر بالید "

اگر سخت کلام اور زوردار کلام کا ان پر کوئی اثر نہ ہو تو اب ضروری ہو جائے گا کہ ان کو ہاتھ سے سمجھایا جائے، یعنی اگر طاقت حاصل ہو تو ان کی سرزنش کی جائے، ان کو تھپڑ رسید کئے جائیں۔ "فان عجز فباللسان وان عجز فبالقلب" اگر ہاتھ سے روکنے کی ان کو طاقت حاصل نہ ہو تو زبان سے روکے، اگر زبان سے بھی روک نہ سکے تو دل سے ان کو برا سمجھے۔

خیال رہے یہ سب سے کم درجہ ہے ایمان کا، اگر برے شخص کو برا نہ سمجھا جائے تو اس انسان کا ایمان کامل نہیں، پہلے نرمی سے بات کرے، نرمی سے بات نہ بنے تو پھر سختی سے کلام کرے، اس قول کو رب تعالیٰ کے ارشاد سے تائید حاصل ہے۔

"وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْءَ اِلٰى اَمْرِ اللّٰهِ"

اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑیں تو ان میں صلح کراؤ، پھر اگر ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس زیادتی والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔

اس آیہ کریمہ میں" قدم الاصلاح علی القتال "اصلاح کو قتال سے پہلے ذکر کیا، جس سے پتہ چلا کہ نرم کلام سے سمجھانا پہلے ہے اور سخت کلام کا درجہ اس کے بعد ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

امر بالمعروف، نہی عن المنکر پر احادیث مبارکہ:

✿ عن ابی سعید الخدری عن رسول الله ﷺ قال من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ و ذلک اضعف الایمان "

("رواہ مسلم" مشکوۃ باب الامر بالمعروف)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو شخص تم میں سے برے کام کو دیکھے تو اس کو ہاتھ سے بدل دے، اگر اس کی طاقت نہ رکھے تو زبان سے، اور اگر اس کی طاقت نہ رکھے تو دل سے، یہ ضعیف ایمان ہے۔

وضاحت حدیث:

"والخطاب للصحابة اصالة ولغیرھم تبعا"

اس حدیث پاک میں اصل میں خطاب تو صحابہ کرام کو ہے، اور بالتبع تمام امت کو یہ حکم شامل ہے، "منکم" "میں" من "، تبعیض کیلئے جس پتہ چلا کہ " امر بالمعروف "اور" نہی عن المنکر "فرض کفایہ ہے۔

تنبیہ: وایماء الی انہ لایباشر الامن یعرف مراتب الاحسان وتفاوت المنکرات

ویمیز بین المتفق علیه والمختلف فیه منها ، وھذاالمعنی مقتبس من قوله تعالی
"ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر"
حدیث پاک میں اس مسئلہ کی طرف واضح اشارہ ہے کہ وہ شخص دوسروں کو دعوت دے جو صاحب علم ہو، احسان کے مراتب وہ جانتا ہو، اور منکرات کا فرق اسے پتہ ہو، اور یہ اسے علم ہو کہ اس مسئلہ میں اہل علم کا اتفاق ہے، اور اس مسئلہ میں اہل علم کا اختلاف، یہ تمام معنی درحقیقت اللہ کے ارشاد گرامی ﴿وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ سے لیا ہے۔

ہاتھ سے بری چیز کو روکنے کا ایک مطلب:

"یمنعه بالفعل بان یکسر الآلات ویریق الخمر ویرد المغصوب الی مالکه"
جب کسی میں برائی دیکھے تو اس کے برے فعل کو ہاتھ سے روکے یعنی اس کے لہو ولعب کے آلات کو توڑ دے، اور اس کی شراب کو بہادے، اور اگر اس نے کسی کی کوئی چیز غصب کی ہو تو اس سے لے کر مالک کو واپس کردے۔

قول سے برائی کا بدلنا:

(فان لم یستطع فبلسانه)ای فلیغیرہ بالقول وتلاوۃ ماانزل اللہ من الوعید علیه وذکر الوعظ والتخویف والنصیحة"
اگر ہاتھ سے برائی کو تبدیل کرنے (روکنے) کی طاقت نہ رکھے تو زبان سے اس برائی کو تبدیل کردے یعنی قرآن پاک کی وہ آیات پڑھ کر سنائے جن میں برائی پر وعید آئی ہوئی ہے، اور وعظ ونصیحت فرمائے، اور خوف دلائے۔

دل سے برائی کو تبدیل کرنے کا مطلب:

(فان لم یستطع فبقلبه)بان لایرضی به وینکر فی باطنه علی متعاطیه فیکون تغییرا معنویا اذلیس فی وسعه الاھذا القدر من التغییر"
اگر زبان سے برائی کو تبدیل کرنے کی طاقت نہ رکھے تو دل سے برائی کو تبدیل کرے، دل سے برائی کو تبدیل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ "اس کی برائی کو پسند نہ کرے، اور دل سے اس کے گناہوں کے ارتکاب کو برا سمجھے، یہ تغییر معنوی ہے، ورنہ دل سے کسی کی برائی کو تبدیل کرنے کی اسے وسعت حاصل نہیں۔

دل سے برا سمجھنا اضعف ایمان ہے:

یعنی اگر برے شخص کو دل سے برا سمجھتا ہے، لیکن زبان سے نہیں روکتا تو یہ ایمان کے شعبوں میں سے کم درجہ کا ایمان ہے، اسلئے کہ قوی ایمان اس ارشاد نبوی سے واضح ہے "افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر" افضل جہاد یہ ہے کہ کلمہ حق بیان کرے ظالم بادشاہ کے سامنے، اور اللہ تعالیٰ نے نیک بندوں کی شان ان الفاظ مبارکہ سے بیان کی ہے ﴿وَلَايَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ﴾ وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

بعض علماء نے تین مدارج اسطرح بیان کئے:

"وقد قال بعض علمائنا الامر الاول للامراء، والثانی للعماء، والثالث لعامة المؤمنين"

بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ ہاتھ سے برائی کو تبدیل کرنے کا حکم ارباب حکومت کو ہے، اور دوسرا حکم یعنی زبان سے روکنے کا حکم علماء کو ہے، اور دل سے برا سمجھنے والا حکم عام مومنیں کو ہے۔ راقم کے نزدیک اس قول اور پہلی وضاحت میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ مطلب یہ بھی ہے اور پہلا بھی ہے۔

اضعف ایمان کا مطلب:

معصیت کا انکار دل سے کرنا، یہ ایمان کے مراتب میں سے کم درجہ ہے۔

"لانه اذارأی منكر امعلو مامن الدين بالضرورة فلم ينكره ولم يكرهه ورضي به واستحسنه كان كافرا"

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی انسان دوسرے میں برائی دیکھے، اس برائی کا برا ہونا دین میں واضح طور پر بغیر کسی شک وشبہ سے ثابت ہو، اس برائی کا انکار نہ کرے، اور اس برائی کو برا نہ سمجھے، بلکہ اس برائی پر راضی ہو اور اسے مستحسن (اچھا) سمجھے تو وہ کافر ہو جائے گا۔

سؤال: حدیث پاک سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کبھی کم ہوتا ہے اور کبھی زیادہ ہوتا ہے، یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ہے، اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب کس طرح صحیح ہوگا کہ وہ کہتے ہیں، ایمان کم اور زیادہ نہیں ہوتا، ایمان کا صرف ایک ہی درجہ ہے۔

جواب: "معناه اضعف ثمرات الايمان "والانكار بالقلب منها"

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ایمان کے ثمرات ضعیف ہوں گے، صرف دل سے برائی کو برا سمجھنا اسی قبیلہ سے ہے۔

اعتراض: ابھی تم نے پہلے بیان کیا ہے کہ برائی کو دل سے بھی برا نہ سمجھنا کفر ہے، وہ کس طرح صحیح ہے۔

جواب: ثمرات ایمان کبھی قوی ہوتے ہیں، اور کبھی ضعیف ہوتے ہیں، قوی سے دوری کفر ہے، ہم نے جو مسئلہ بیان کیا ہے وہ مکمل یہ ہے کہ برائی کا انکار نہ کرے، برائی کو برا نہ سمجھے، برائی کو اچھا سمجھے، اور برائی پر راضی ہو تو کفر ہے، اور اگر ضعیف ثمرات سے دوری ہو تو فسق ہے جیسا کہ برے شخص کو دل سے برا نہ سمجھے، لیکن برائی کو اچھا نہ سمجھے، اور برائی پر راضی نہ ہو۔ (ماخوذ از مرقاۃ جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۳۲۸)

- **عن النعمان بن بشیر قال قال رسول اللہ ﷺ مثل المداهن فی حدود الله و الواقع فیها مثل قوم استهموا سفینة فصار بعضهم فی اسفلها و صار بعضهم فی اعلاها فكان الذی فی اسفلها یمر بالماء علی الذین فی اعلاها فتاذوا به فاخذ فأسا فجعل ینقر اسفل السفینة فاتوه فقالوا مالک قال تأذیتم بی و لابدلی من الماء فان اخذوا علی یدیه انجوه ونجوا انفسهم و ان تركوه اهلكوه و اهلكوا انفسهم"**

(رواہ البخاری، مشکوۃ باب الامر بالمعروف)

نعمان بن بشیر کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی کی حدود میں کوتاہی سے کام لینے والے اور ان حدود کی وجوہ کے مرتکب لوگوں کی مثال اسطرح ہے، جس طرح ایک قوم کشتی میں بیٹھنے کیلئے قرعہ ڈالیں قرعہ نکلنے پر بعض نیچے ہوں اور بعض اوپر ہوں، سب سے نیچے حصہ میں جو پانی گذرنے کے ساتھ حصہ ہے اس میں ایک شخص کو اوپر والوں نے کوئی اذیت پہنچائی ہو، اس نے کلہاڑا لے کر کشتی کو نیچے سے سوراخ کرنا چاہا، وہ اوپر والے اس کے پاس آگئے، اور اس سے پوچھا تمہیں کیا ہوا؟ اس نے کہا تم نے مجھے ایذاء پہنچائی، اب مجھے پانی کی ضرورت ہے (میں کشتی کو سوراخ کر کے پانی حاصل کرنا چاہتا ہوں) اگر ان لوگوں نے اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا تو اس کو بھی بچا لیا اور اپنے آپ کو بھی بچا لیا، اور اگر اسے اسی طرح چھوڑ دیا تو اسے بھی ہلاکت میں ڈال دیا، اور اپنے آپ کو بھی ہلاکت میں ڈال لیا۔

وضاحت حدیث:

"مثل المداهن فی حدود الله و الواقع فیها"

اللہ کی حدود میں کوتاہی کرنے والوں اور ان میں واقع ہونے والوں کی مثال "المداهن ای المتساهل" "مداہن" کا معنی سستی کرنا، کوتاہی کرنا "فی حدود اللہ" (اللہ کی حدود میں) اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی کی حدود کو قائم کرنے میں سستی سے کام لے یعنی حدود قائم نہ کرے، یا مراد یہ ہے کہ دوسروں کو گناہوں سے نہ روکے جو حدود قائم

کرنے کا ذریعہ ہیں۔

"**حدود الله**" کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا، اسلئے کہ یہ بہت بڑے گناہوں کے ارتکاب پر لازم آتی ہے، دوسری وجہ ان کے ذکر کی تخصیص کی یہ ہے "ان ضررها قد يتعدى الى غير فاعلها" کہ ان گناہوں کے باعث حدود نافذ نہ کرنے کا ضرر (نقصان) دوسروں کو بھی ہوتا ہے جو ان کے مرتکب نہیں ہوتے۔

"**ويمكن ان يراد بالحدود مطلق المعاصي فذكر الحدود لتغليب الاقوى**"

ممکن ہے مراد حدود سے مطلقاً گناہ ہوں، البتہ ان کو "حدود" سے اس لئے تعبیر کر دیا کہ باعث حدود گناہ چونکہ بہت بڑے گناہ ہیں، قاعدہ تغلیب کا لحاظ کرتے ہوئے حدود کو غالب سمجھتے ہوئے ذکر کر دیا اور باقیوں کو اس کے تابع کر دیا۔

"**اولان حد كل معصية معروف مقرر**" یا وجہ یہ ہے کہ ہر معصیت کو حد کہنا بھی مشہور و معروف ہے کہا جاتا ہے حد سے تجاوز نہ کرو، یعنی گناہوں کا ارتکاب نہ کرو۔

والواقع فيها: (اور ان میں واقع ہونے والے) یعنی اللہ تعالیٰ کی حدود میں کوتاہی کرنے والے اور گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کی مثال۔

عربی زبان کا کمال:

وفي التعبير بالواقع فيها اشارة الى بسبب المعصية كانه طارح من علو منزلته في هوى بئر عميق ومكان سحيق"

باعث حدود گناہ کرنے والوں کے متعلق نبی کریم ﷺ نے "والواقع فيها" کے الفاظ استعمال فرمائے جس سے یہ اشارہ فرمایا کہ گناہوں کی وجہ سے انسان بلند مرتبہ سے خواہشات کے گہرے کنوئیں اور تنگ مکان میں گر جاتا ہے، یہ اشارہ لفظ "واقع" سے ملا ہے، جس کا یہی معنی ہوتا ہے "طارح" گرنے والا۔

مداہنت اور مدارات میں فرق:

مداہنت ناجائز ہے، شریعت نے اس سے منع کیا ہے، اور مدارات جائز ہے، شریعت نے اس کا حکم دیا ہے۔

"**ان المداهنة في الشريعة ان يرى منكرا ويقدر على دفعه ولم يدفعه حفظا لجانب مرتكبه او جانب غيره لخوف او طمع او الاستحياء منه او قلة مبالاة في الدين**"

شرعی اصطلاح میں مداہنت اسے کہا جاتا ہے کہ ایک شخص کسی کو برائی کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھے، اور اسے طاقت بھی حاصل ہو برائی سے روکنے کی، لیکن نہ روکے، اس کے نہ روکنے کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ برے شخص کی حفاظت کرتا ہے، کبھی کسی دوسرے شخص کا اسے خوف ہوتا ہے کہ تم کون ہوتے ہو فلاں کو برائی سے روکنے والے، اور کبھی برائی کے مرتکب سے، اسے لالچ ہوتی ہے کہ وہ میری مالی معاونت کرتا ہے، مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں اسے برائی سے منع کروں، اور کبھی یہ شرم محسوس کرتا ہے کہ میں اسے کیسے منع کروں مجھے تو اس سے شرم آتی ہے، یا یہ شخص دین کی کچھ پرواہ ہی نہیں کرتا اس لئے اسے برائی سے منع نہیں کرتا۔

"والمداراة موافقته بترک حظ نفسه وحق يتعلق بماله وعرضه فيسكت عنه دفعا للشر ووقوع الضرر"

مدارات یہ ہے کہ اپنے مال اور اپنی عزت سے تعلق رکھنے والے حقوق کو معاف کر دینا تا کہ شر دور ہو جائے، اور کسی کو نقصان نہ ہو، میرا نقصان ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، یہ اچھا فعل ہے اسے شریعت میں پسند کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں جائز امداد پائی گئی ہے، کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے" فدارهم مادمت في دارهم "ان سے مدارات کر جب تک تو ان کے گھر میں موجود ہے، مطلب یہ ہے کہ رب تعالی کی رضاء کی خاطر بندوں سے تکلیف برداشت کرنا پسندیدہ عمل ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں کہا جائے:

"ان المداهنة انما تكون في الباطل مع الاعداء والمداراة في امر حق مع الاحباء"

باطل طریقے سے دشمنوں کی امداد کرنا مداہنت ہے، اور جائز طریقے سے احباب سے امداد کرنا مدارات ہے۔

مثال اور ممثل لہ کا بیان:

نبی کریم ﷺ نے "اللہ کی حدود میں کوتاہی کرنے والے کو کشتی سے اوپر حصہ میں بیٹھنے والوں سے تشبیہ دی" "اور حدود میں واقع ہونے والوں کو کشتی کے نیچے حصہ والوں سے تشبیہ دی" گناہوں کے مرتکبین جو گناہوں میں کامل طور پر واقع ہو گئے، اور اس سے نکل نہیں سکے ان کو تشبیہ دی کشتی میں سوراخ کرنے والے سے" اور جو برائی سے روکنے والے ہیں ان کو تشبیہ دی ان لوگوں سے جو کشتی میں سوراخ کرنے والے کو روکیں۔

حاصل کلام: والمعنى انه كذلك ان منع الناس الفاسق عن الفسق نجا، ونجوا من عذاب الله تعالى، وان تركوه على فعل المعصية ولم يقيموا عليه الحد حل بهم العذاب وهلكوا بشؤمه"

معنی اس کا یہ ہے کہ اگر لوگ فاسق کو برائی سے منع کریں تو وہ فاسق بھی اور یہ لوگ بھی رب تعالیٰ کے عذاب سے نجات پا جائیں گے، اور اگر اسے برائی سے نہیں منع کرتے اس پر حدود نافذ نہیں کرتے تو تمام پر رب تعالیٰ کا عذاب آجائے گا ،اور فاسق کی نحوست کی وجہ سے سب ہلاک ہو جائیں گے۔ (مرقاۃ جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۳۳۰،۳۳۱)

- **وعن اسامة بن زيد قال قال رسول الله ﷺ يجاء بالرجل يوم القيامة فيلقى في النار فتندلق اقتابه في النار فيطحن فيها كطحن الحمار برحاه فيجتمع اهل النار عليه فيقولون اى فلان ماشانك اليس كنت تأمرنا بالمعروف وتنهانا عن المنكر قال كنت آمركم بالمعروف ولا آتيه وانهاكم عن المنكر وآتيه "**

(رواه البخاری ومسلم ، مشكوة باب الامر بالمعروف)

حضرت اسامہ بن زید ﷺ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن ایک شخص کولایا جائے گا تو اسے آگ میں ڈالا جائے گا ،تو جلدی ہی آگ میں اس کی انتڑیاں باہر نکل آئیں گی ،تو وہ ان میں گھومے گا جیسا کہ گدھا آٹے والی چکی کے اردگرد گھومتا ہے، آگ والے (جہنمی) لوگ اس کے اردگرد جمع ہو جائیں گے، وہ کہیں گے اے فلاں شخص تیرا کیا حال ہے کیا تو ہمیں اچھے کاموں کا حکم دیتا تھا اور برے کاموں سے روکتا تھا، تو وہ کہے گا، ہاں میں تمہیں اچھے کاموں کا حکم دیتا تھا اور خود ان پر عمل نہیں کرتا تھا، اور تمہیں برے کاموں سے روکتا تھا اور خود برے کام کرتا تھا۔

"قال المظهر اى يدور ويتردد في اقتابه يعني يدور حول اقتابه ويضربها برجله "

اپنی انتڑیوں میں پھرنے کا یہ حکم ہے کہ وہ ان کے اردگرد پھرے گا اور ان کو اپنے پاؤں سے مارے گا۔
(مرقاۃ جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۳۳۱)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"فتندلق اى تخرج سريعا اقتابه اى امعاؤه فيطحن بصيغة الفاعل على الصحيح اى يدور فيها اى في اقتابه كطحن الحمار برحاه اى كدورانه حول رحاه"

(مرقاۃ جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۳۳۱)

- **عن حذيفة ان النبى ﷺ قال والذى نفسى بيده لتامرن بالمعروف ولتنهون عن المنكر او ليوشكن الله ان يبعث عليكم عذابا من عنده ثم لتدعنه ولا يستجاب لكم**

(رواہ الترمذی، مشکوۃ باب الامر بالمعروف)

حضرت حذیفہ ﷺ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے "تم ضرور بر ضرور اچھے کاموں کا حکم دوگے یا برے کاموں سے روکو گے" یا قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف

سے عذاب بھیج دے، پھر تم اس سے دعاء کرو تو تمہاری دعاء کو قبول نہ کیا جائے۔

"والمعنی واللہ ان احد الامرین واقع اما الامر والنهی منکم واما انزال العذاب من ربکم ثم عدم استجابة الدعاء له فی دفعه عنکم "

مطلب یہ کہ "قسم ہے اللہ تعالیٰ کی دو چیزوں سے ایک کا وقوع ضروری ہے یا اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا پایا جائے گا، اگر یہ چیز نہ پائی گئی تو تم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے گا، اس عذاب کے دور ہونے کی تمہاری دعائیں قبول نہیں کی جائیں گے۔ (مرقاۃ جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۳۳۲)

✿ **عن ابی هریرة لتأمرن بالمعروف ولتنهون عن المنکر اولیسلطن اللہ علیکم شرارکم فیدعو خیارکم فلا یستجاب لهم "**

(رواه الطبرانی فی الاوسط ، وهکذا رواه البزار ، مرقاة جلد نمبر ۹ صفحه نمبر ۳۳۲)

حضرت ابوھریرہ ؓ سے روایت آتی ہے کہ "ضرور بضرور تم اچھے کاموں کا حکم دو اور برے کاموں سے روکو" یا تم پر اللہ تعالیٰ شریر لوگوں کو مسلط کردے گا، تو (ان سے نجات کیلئے) نیک لوگ دعائیں کریں گے، ان کی دعائیں قبول نہیں کی جائیں گی۔

اس حدیث پاک کو دیکھئے اور آجکل کے حالات کو دیکھئے تو اس کا وقوع سو فیصد ہو چکا ہے، کیونکہ علماء امر بالمعروف، نہی عن المنکر سے پیچھے ہٹ گئے تو رب تعالیٰ نے ان پر اشرار کو مسلط کردیا ہے اب ہر ہاتھ میں تسبیح دیکھتا ہوں، دعائیں کی جارہی ہیں، اشرار سے جان چھوٹنا ممکن نظر نہیں آتا۔

✿ **وعن العرس بن عمیرة عن النبی ﷺ قال اذا عملت الخطیئة فی الارض من شهدها فکرهها کان کمن غاب عنها فرضیها کان کمن شهدها"**

(رواہ ابو داؤد ، مشکوۃ باب الامر بالمعروف)

عرس بن عمیرہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب گناہوں کا ارتکاب زمین میں کیا جائے گا جس نے ان برائیوں کو دیکھ کر انہیں ناپسند سمجھا (خواہ دل سے ہی) تو وہ شخص ایسا ہوگا جیسا کہ برائیوں کے ارتکاب کے وقت کوئی موجود ہی نہیں تھا، (یعنی اس کی کوئی گرفت نہیں ہوگی) اگر ایک شخص برائیوں کے ارتکاب پر تو موجود نہیں تھا لیکن وہ ان برائیوں پر راضی رہا، انہیں پسند کیا تو وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ وہ برائیوں کے وقت موجود تھا، حدیث پاک سے واضح ہے کہ برائی کو برا سمجھنا باعث نجات ہے، برائی کو اچھا سمجھنا باعث عذاب ہے۔

✿ **وعن ابی بکر الصدیق قال یاایها الناس انتم تقرؤن هذه الآیة (یاایها الذین امنوا علیکم انفسکم لایضرکم من ضل اذا اهتدیتم)فانی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ان الناس اذا**

رؤا منکرا فلم یغیروہ یوشک ان یعمھم اللہ بعقابہ "رواہ ابن ماجہ" وفی روایۃ ابی داود اذا راوا الظالم فلم یاخذوا علی یدیہ اوشک ان یعمھم اللہ بعقاب، وفی اخری لہ ما من قوم یعمل فیھم بالمعاصی لم یقدرون علی ان یغیروا الا یوشک ان یعمھم اللہ بعقاب وفی اخری لہ ما من قوم یعمل فیھم بالمعاصی ھم اکثر ممن یعملہ"

حضرت ابو بکر صدیق ﷛ نے فرمایا، اے لوگو تم یہ آیۃ کریمہ پڑھتے ہو۔

"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ"

(اے ایمان والو تم اپنی فکر رکھو، تمہارا کچھ نہ بگاڑے گا جو گمراہ ہوا جبکہ تم راہ پر ہو) میں نے تو نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا "بیشک لوگ جب برائی کو دیکھیں تو اسے نہ بدلیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر عام عذاب مسلط کر دے (یہ روایت ہے ابن ماجہ کی) اور ایک روایت ابوداؤد کی یوں ہے "لوگ جب ظالم کو دیکھیں تو اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر عام عذاب مسلط کر دے، اور ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے "کوئی قوم ایسی نہیں کہ ان میں برائیوں کا ارتکاب کیا جارہا ہو وہ اس برائی کو تبدیل کرنے پر قادر بھی ہوں، پھر نہ تبدیل کریں مگر یہ کہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر عام عذاب بھیج دے" ابوداؤد کی ایک اور روایت میں ہے کہ کوئی ایسی قوم نہیں جن میں برائیوں کا ارتکاب کیا جارہا ہو، وہ لوگ زیادہ ہوں، برائی کے مرتکب کم ہوں (جب وہ ان کو نہ روکیں، حالانکہ روکنے پر قادر ہوں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو عام عذاب دے گا) یعنی برائیوں کے مرتکبین، اور ان کو نہ روکنے والے سب ہی عذاب میں مبتلاء ہو جائیں گے۔

وضاحت حدیث:

حضرت ابو بکر صدیق ﷛ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ تم آیۃ کریمہ کے ظاہر معنی کو دیکھ کر غلطی کا شکار ہو رہے ہو، جس کا تم مطلب یہ لے رہے ہو کہ انسان خود اچھے عمل کرے، برائیوں سے رکے، دوسروں کو اچھے کام کا حکم دے یا نہ دے، اور دوسروں کو برائی سے روکے یا نہ روکے، اس کیلئے کوئی حرج نہیں، بلکہ وہ خود تو ہدایت پر ہے، آیۃ کریمہ کا جو تم مطلب سمجھ رہے ہو، وہ نہیں، اگر یہی مطلب ہوتا تو رسول اللہ ﷺ یہ ارشاد کیوں فرماتے "بیشک لوگ جب برائی کو دیکھیں اسے نہ تبدیل کریں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو عام عذاب دے دے"

آیۃ کریمہ کا مطلب:

اس سے پہلی آیۃ کریمہ کے آخری الفاظ پر ایک نظر ڈالئے وہ الفاظ مبارکہ یہ ہیں ﴿اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآؤُھُمْ

﴿لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴾ (کیا اگر چہ ان کے باپ دادا نہ کچھ جانیں اور نہ راہ پر ہوں) ان دونوں آیتوں کا آپس میں باہمی ربط ابن ابی حاتم کی روایت سے واضح ہے، وہ یہ ہے۔

"انما انزلت هذه الآية لان الرجل كان يسلم ويكفر ابوه ويسلم الرجل ويكفر اخوه فلما دخل قلوبهم حلاوة الايمان دعوا آباء هم واخوانهم فقالوا حسبنا ما وجدنا عليه آباؤنا فانزل الله "يا ايها الذين آمنوا عليكم انفسكم "الاية"

بیشک کبھی کوئی انسان اسلام قبول کر لیتا اور اس کا باپ کافر ہوتا، اور کبھی کوئی شخص اسلام قبول کر لیتا اس کا بھائی کافر ہوتا، اسلام لانے والوں میں جب ایمان کی حلاوت داخل ہو جاتی، وہ اپنے آباء اور اپنے بھائیوں کو اسلام کی دعوت دیتے، تو ان کے کافر باپ اور بھائی یہ جواب دیتے "ہمیں وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے آباء کو پایا" (تو وہ پریشان ہوتے) تو اللہ تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کو نازل فرمایا۔

"يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ"

(اے ایمان والو تم اپنی فکر رکھو، تمہارا کچھ نہ بگاڑے گا جو گمراہ ہوا جبکہ تم راہ پر ہو)

تفسیر بیضاوی میں ہے "والآية نزلت لما كان المؤمنون يتحسرون على الكفرة ويتمنون ايمانهم "کہ جب مؤمن کافروں پر حسرت رکھتے اور تمنا کرتے کہ کاش کہ یہ ایمان لے آئیں، تو اس وقت آیہ کریمہ نازل ہوئی۔ (بیضاوی)

عذر کی وجہ سے امر بالمعروف، نہی عن المنکر کے ترک کی اجازت:

وفی هذه الآية رخصة فی ترك الحسبة اذا علم عدم قبولها او فيها مفسدة او اضرار له منها اتفقت عليه كلمة السلف على ذلك والاحاديث تدل عليه"

اس آیہ کریمہ میں عذر کی وجہ سے امر بالمعروف، نہی عن المنکر کے چھوڑنے کی اجازت ہے، جب اسے یہ معلوم ہو کہ میری بات یہ لوگ نہیں سنتے، یا اسے یہ خیال ہو کہ اگر میں نے ان کو اچھے کاموں کا حکم دیا، یا برائیوں سے منع کیا تو یہ فساد برپا کریں گے، یا اسے خطرہ ہو کہ یہ لوگ مجھے نقصان پہنچائیں گے تو اسے اجازت ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دے، اس مسئلہ پر سلف وصالحین کا اتفاق ہے، اور اس پر احادیث بھی دلالت کر رہی ہیں۔ (تفسیر المعین الفصوی) (ماخوذ از مرقاۃ جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۳۳۳)

✿ وعن ابی ثعلبة فی قوله تعالى عليكم انفسكم لا يضركم من ضل اذا اهتديتم فقال اما والله لقد سالت عنها رسول الله ﷺ فقال بل ائتمروا بالمعروف وتناهوا عن المنكر

حتی اذا رأیت شحا مطاعا وھوی متبعا ودنیا مؤثرة واعجاب کل ذی رأی برأیه ورأیت امر الابد لک منه نعلیک نفسک ودع امر العوام فان ورائکم ایام الصبر فمن صبر فیهن قبض علی الجمر للعامل فیهن اجر خمسین منکم

(رواہ الترمذی وابن ماجة ، مشکوة باب الامر بالمعروف)

حضرت ابو ثعلبہ ﷛ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ﴾ کے متعلق قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا ہے، تو آپ نے فرمایا بلکہ تم اچھے کاموں کا حکم دو اور برے کاموں سے روکو، یہاں تک کہ جب تم دیکھو بخل مطاع کو (یعنی تم دیکھو ایسے شخص کو جو بظاہر تمہارا مطیع ہو اور حقیقت میں غیر کے تابع ہو) اور خواہشات کا تابع ہو، اور دنیا کو وہ (امور دین اور درجات آخرت پر) ترجیح دیتا ہو، اور ہر رائے دینے والے کی رائے کو پسند کرتا ہو (یعنی قرآن پاک وحدیث، اجماع اور قیاس کی طرف اس کی نظر نہیں ہوتی) اور تم اس سے کوئی امر ضروری طور پر دیکھو (یعنی تم اس سے کوئی برائی دیکھو، لیکن تمہارا عذر، اور تمہاری مجبوری ہو کہ تم اس سے چھٹکارا بھی نہیں پا سکتے، لیکن تمہیں یہ بھی خطرہ ہو کہ اگر میں یہاں لوگوں کے ساتھ کھڑا رہا اور اسے برائی سے بھی نہ روک سکا تو میں خود بھی اس برائی کا مرتکب ہو سکتا ہوں) تو ایسی صورت میں تمہا ... اگر تم اس برائی کو دیکھتے ہو اور تمہیں طاقت حاصل نہیں کہ تم اس کا دفاع کر سکو (فیجب علیک حفظها عن المعاصی) تم پر واجب ہے کہ اپنے نفس کو ... بچا سکو۔ "ودع امر العوام" اور عوام کا معاملہ چھوڑ دو" (یعنی عام لوگ جو خواص کے طریقہ سے دور ہیں ... طریقہ کو چھوڑ دو)

"وحاصله انه اذرایت بعض الناس یعملون المعاصی ولا بدلک من السکوت لعجزک فاحفظ نفسک عن المعاصی واترک الامر بالمعروف والنهی عن المنکر واشتغل بنفسک ودع امر الناس الی الله فانه تعالی لایکلف نفسا الاوسعها"

حاصل کلام یہ ہے کہ جب تم دیکھو کہ بعض لوگ برائیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں، لیکن تم اپنی مجبوری اور معذوری کی وجہ سے خاموش ہو، تو تم پر ضروری ہے کہ اپنے نفس کو برائیوں سے بچالو، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دو، اور خود اچھے کاموں میں مشغول رہو، اور برے کاموں سے اجتناب کرتے رہو، اور لوگوں کا معاملہ اللہ کی طرف چھوڑ دو، اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔)

"فان وراء کم ایام الصبر" بیشک تمہارے لئے اس کے سواء صبر ہے" (یہاں دو مطلب ہیں" فان ورائکم ای قدامکم من الازمان الآتیة اوخلفکم من الامور الهادیة' 'وراء" کا معنی ہے "سواء" جو آگے اور

پیچھے دونوں کو شامل ہے، یعنی تم آنے والے زمانہ میں صبر کرو، یا معنی یہ ہے کہ تم اپنے پیچھے ایسے امور سے صبر کرو جو تمہیں جہنم میں گرانے والے ہوں اور عذاب میں واقع کرنے والے ہوں، ''صبر کرنے سے مراد کیا ہے؟

''وهو الحبس علی خلاف النفس من اختيار العزلة وترک الخلطة والجلوة ''

یعنی اپنے نفس کو اپنی خواہشات کے خلاف روک لے، برائیوں کے مرتکب لوگوں سے اپنے آپ کو جدا کرلے، ان سے میل ملاپ نہ رکھے، اور ان کی محفلوں میں نہ جائے)''فمن صبر فيهن ''ای فی تلک الايام ''قبض علی الجمر '' جس شخص نے ان دونوں میں صبر کیا تو وہ ایسے ہی ہوگا جیسا کہ اسے آگ کی چنگاری پر روک لیا گیا ہو، (کیونکہ سب لوگوں سے علیحدگی اگر چہ اس کیلئے ذہنی طور پر بہت بڑی مشقت ہوگی، لیکن رب تعالی کی رضاء کی خاطر کی ہوئی مشقت پر عظیم اجر وثواب ہوگا، اسی وجہ سے حضور ﷺ نے فرمایا'' للعامل فيهن اجر خمسين رجلا يعملون مثل عمله '' ان مشکل ایام میں صبر سے کام لینے والے کو اتنا اجر وثواب حاصل ہوگا، جتنا پچاس آدمیوں کو یہی عمل کرنے کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔ یعنی مشقت کے دنوں کے بغیر پچاس لوگ اگر صبر سے کام لیں تو جتنا ثواب ان کو ملے گا، اتنا ثواب اس اکیلے کو حاصل ہوگا''قالوا يا رسول الله اجر خمسين منهم قال اجر خمسين منكم '' صحابہ کرام نے تعجب کے طور پر پوچھا، یا رسول اللہ کیا واقعی اسے پچاس آدمیوں کا ثواب حاصل ہوگا، آپ نے فرمایا ہاں تمہارے پچاس آدمیوں کا اسے ثواب حاصل ہوگا۔ ''اجر خمسين منكم ''آپ نے ارشاد فرما کر، مشقت کے دنوں میں صبر کرنے والے کا عظیم درجہ بیان کیا کہ اسے عام پچاس آدمیوں کا ثواب نہیں ملے گا بلکہ تمہارے جیسے جلیل القدر پچاس آدمی مشقت کے دنوں کے بغیر جو ثواب حاصل کریں، وہ اکیلا اتنا ثواب حاصل کرلے گا۔ (وضاحت ماخوذ از مرقاۃ جلد ۹ صفحہ نمبر ۳۳۶)

❁ وعن ابی سعيد قال قال رسول الله ﷺ ان الله يسأل العبد يو م القيامة فيقول مالک اذا رأيت المنكر فلم تنكره قال رسول الله ﷺ فيلقی حجته فيقول يا رب خفت الناس ورجوتک'' (رواه البيهقی ، مشكوة باب الامر بالمعروف)

حضرت ابو سعید ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالی قیامت کے دن بندے سے پوچھے گا، اور کہے گا تجھے کیا ہوا کہ تو نے برائی کو دیکھ کر اس کا انکار (زبان سے یا ہاتھ سے) نہیں کیا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا (فيلقی) بتشديد القاف المفتوحة (حجته) بالنصب '' اس کے دل میں یہ حجت ڈال دی جائے گی (کہ وہ یہ کہے) وہ عرض کرے گا اے میرے رب میں لوگوں سے ڈرتا تھا، اور تیری (رحمت کی) امید کرتا تھا، سبحان اللہ اللہ تعالی اپنے بندوں پر کتنا کریم ہے کہ خود ہی دل میں یہ بات ڈالے گا کہ یوں کہہ تا کہ میں تیری بخشش کردوں''

❁ عن عبد اللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ لما وقعت بنواسرائیل فی المعاصی نھتھم علماؤھم فلم ینتھوا فجالسوھم فی مجالسھم و آکلوھم وشاربوھم فضرب اللہ قلوب بعضھم ببعض فلعنھم علی لسان داود وعیسی ابن مریم ذلک بما عصوا وکانوا یعتدون قال فجلس رسول اللہ ﷺ وکان متکئا فقال لا والذی نفسی بیدہ حتی تاطروھم اطرا'' (رواہ الترمذی وابو داود)مشکوۃ باب الامر بالمعروف)

حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب بنی اسرائیل گناہوں میں واقع ہو گئے تو انہیں ان کے علماء نے منع کیا، انہوں نے ان کو اپنی مجالس میں بٹھایا اور ان کو کھلایا اور ان کو پلایا، تو اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کے دلوں کو بعض سے ملا دیا، تو ان پر اللہ تعالیٰ نے حضرت داود ؑ اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کے ذریعے لعنت فرمائی، یہ (لعنت ان پر کی گئی) بوجہ اس کے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کیا، راوی کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ سہارا لگا کر بیٹھے، تو آپ نے فرمایا نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے یہاں تک کہ تم بھی ان کی طرح (حق کی جانب سے) پھر جاؤ گے۔

وضاحت حدیث:

معاصی میں مبتلاء ہونے سے مراد، ان کا زنا اور ہفتے کے شکار، اور بڑے بڑے گناہوں میں مبتلاء ہونا ہے، ابتدائی طور پر ان کے علماء نے ان کو گناہوں سے منع کیا، لیکن وہ گناہوں سے نہ رکے، تو ان برائیوں کے مرتکب لوگوں نے علماء کو بھی اپنی مجالس میں بٹھالیا، اور ان کو کھانے اور پینے میں شریک کرلیا (ان کی خوب دعوت کی) تو اللہ تعالیٰ نے ان برے افعال والوں اور علماء کے دلوں کو آپس میں ملا جلا دیا۔ ''فضرب اللہ قلوب بعضھم ببعض '' تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بعض کے دلوں کو بعض کی وجہ سے ملا دیا، عرب حضرات کہتے ہیں'' ضرب اللبن بعضہ ببعض ای خلطہ ذکرہ الراغب '' علامہ راغب اصفہانی نے بیان کیا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے'' بعض دودھ بعض سے ملالیا''

''وقال ابن الملک رحمہ اللہ الباء للسببیۃ ای سود اللہ قلب من لم یعص بشؤم من عصی فصارت قلوب جمیعھم قاسیۃ بعیدۃ عن قبول الحق والخیر او الرحمۃ بسبب المعاصی ومخالطۃ بعضھم بعضا''

ابن الملک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ '' ببعض '' میں باء سببیت کیلئے ہے، مطلب یہ ہے کہ جب گناہوں کے مرتکب لوگوں کی مجلس میں دوسرے بیٹھیں گے تو ان بروں کی نحوست کی وجہ سے ان کے ساتھ بیٹھنے والوں کے دل ان بروں کے دلوں سے مل جائیں گے، یعنی ان کے دل سیاہ اور بہت زیادہ سخت

ہو جائیں گے یہاں تک کہ وہ حق اور خیر اور رحمت کو قبول نہیں کریں گے، کیونکہ گناہ گاروں کے ساتھ ملنے والوں کے دل بھی سخت ہو جائیں گے۔

اللہ تعالی ان پر حضرت داود علیہ السلام اور حضرت عیسی ابن مریم کے ذریعے ان پر لعنت بھیجے گا، اس کا ذکر قرآن پاک میں ان الفاظ سے کیا گیا ﴿ لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَی بْنِ مَرْیَمَ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ﴾ "قال" یعنی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا، نبی کریم ﷺ سہارا لگا کر بیٹھ گئے، یعنی آپ نے یہ کلام بڑے اطمینان سے فرمایا" لا" نہیں، اس کا مطلب یہ ہے "لا تعذرون او لا تنجون من العذاب انتم ایها الملة خلف اهل تلک الامة" یعنی "لا" قسم پر داخل ہو کر زائد نہیں، بلکہ نفی کا معنی دے رہا ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ اگر تم نے بھی بنی اسرائیل کا طریقہ اختیار کیا کہ برے لوگوں کی محفل میں بیٹھ کر دعوت کھالی تو قیامت کے دن تمہارا کوئی عذر قبول نہیں کیا جائے گا، یہاں تک کہ تمہیں عذاب سے نجات نہیں دی جائے گی، تم اے امت اسی امت کے پیچھے آنے والے ہو۔ "والذی نفسی بیده حتی تأطروهم اطرا" قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے یہاں تک کہ تم بھی ان کی طرح حق سے پھر جاؤ گے، یعنی اگر تم حق سے پھر کر باطل سے مل گئے تو تم عذاب سے بچ نہیں سکو گے، ہاں اگر تم باطل سے پھر کر حق کی طرف مائل ہو گئے تو اللہ تعالی تمہیں عذاب سے بچالے گا۔ (ماخوذ از مرقاۃ جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۳۴۱)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○ (آیۃ نمبر ۱۰۵)

(1) اور ان جیسے نہ ہونا جو آپس میں پھٹ گئے اور ان میں پھوٹ پڑ گئی بعد اس کے کہ روشن نشانیاں انہیں آ چکی تھیں اور ان کیلئے بڑا عذاب ہے۔ (کنز الایمان)

(2) اور نہ ہو تم ان کی طرح جو آپس میں بٹ گئے، اور انہوں نے اختلاف کیا اس کے بعد کہ آ گئیں ان کے پاس واضح نشانیاں، اور ان کیلئے بڑا عذاب ہے۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

رب تعالیٰ نے اس سے پہلے ذکر فرمایا کہ توراۃ وانجیل وہ آسمانی کتابیں جو دین اسلام کے سچے ہونے اور صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہیں، اور ان میں نبی کریم ﷺ کی صداقت وحقانیت کا تذکرہ موجود ہے۔ اس کے بعد ذکر فرمایا کہ اہل کتاب (یہود ونصاری) نے نبی کریم ﷺ سے حسد کیا، اور مسلمانوں کو دین سے پھیرنے کیلئے شکوک وشبہات ڈالنے شروع کئے کہ یہ مسلمان دین سے برگشتہ ہو جائیں (پھر جائیں) اس کے بعد مؤمنوں کو حکم دیا کہ ایمان پر قائم رہو، اور اللہ تعالیٰ کی راہ کی طرف لوگوں کو دعوت دو۔

اب اس آیۃ کریمہ کے ذریعے اس مضمون کو ختم کیا جا رہا ہے کہ اے مومنو تم اہل کتاب (یہود ونصاری) کی طرح نہ بن جانا کہ آیات کریمہ میں شبہات ڈالتے رہو، اور ان کی فاسد تاویلات کرتے رہو، جس سے ان آیات کے حقیقی مطالب ہی اٹھ جائیں، ہاں اگر تم نے ایسا کیا تو تم بھی ان کی طرح بہت بڑے عذاب میں مبتلاء ہو جاؤ گے۔

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ﴾

''اور نہ ہو تم انکی طرح جو آپس میں بٹ گئے، اور انہوں نے اختلاف کیا اس کے بعد کہ آ گئیں ان کے پاس واضح نشانیاں۔''

یہاں معنی میں دو احتمال ہیں، **ایک** ان میں سے یہ ہے کہ یہ کہا گیا ہے، اے مؤمنو ان آیات کو سننے کے بعد ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو بٹ گئے، اور انہوں نے واضح نشانیوں کے بعد دین میں اختلاف کیا اس لحاظ پر یہ آیۃ

کریمہ تمام پہلی آیات کا تتمہ ہے یعنی پہلی آیات کو معنوی طور پر تکمیل کرنے والی ہے۔ اور **دوسرا** احتمال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ارشاد فرمایا، تو اس کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک اچھے کاموں کا حکم دینے والا ظالموں اور غلبہ رکھنے والوں پر حکم دینے کی کی طاقت نہ رکھے، اور یہ طاقت اس وقت تک نہیں حاصل ہوسکتی جب تک اہل حق و دین کی آپس میں الفت ومحبت نہیں ہوگی، اس آیۃ کریمہ میں مومنو کو تفرقہ اور اختلاف سے ڈرایا گیا ہے کہ اگر تم نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا تو تمہیں امر بالمعروف نہی عن المنکر کی طاقت حاصل نہیں ہوگی، اس معنی کے لحاظ پر یہ آیۃ کریمہ صرف سابقہ آیۃ کریمہ کا تتمہ ہے۔ (کبیر)

یہود ونصاریٰ کے تفرقہ واختلاف کی چند وجوہ:

(۱) **تفرقوا واختلفوا بسبب اتباع الهوى وطاعة النفس والحسد**" ان لوگوں نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا خواہشات کی تابعداری کی وجہ سے، اور نفس کی طاعت کی وجہ سے اور حسد کی وجہ سے۔

(۲) **تفرقوا حتى صار كل فريق منهم يصدق من الانبياء بعضادون بعض فصاروا بذلك الى العداوة والفرقة**"

دوسری وجہ ان کے اختلاف کی یہ تھی کہ ان میں سے کسی فریق نے کسی ایک نبی کی تصدیق کی، اور دوسرے کا انکار کیا، دوسرے فریق نے اس نبی کی تصدیق کی جس کی ایک فریق تکذیب کرچکا اور دوسرے نبی کی ان لوگوں نے تصدیق کی، جس کی وجہ سے ان لوگوں کی ایک دوسرے سے عداوت ہوگئی، اور ان کے آپس میں اختلاف ہوگئے، آپس میں بٹ اور پھٹ گئے۔

(۳) **صاروا مثل مبتدعة هذه الامة مثل المشبهة والقدرية والحشوية**"
تیسری وجہ ان کے اختلاف کی یہ تھی کہ ان میں بھی کئی نئے نئے فرقوں نے جنم لیا تھا، جیسے اس امت میں مشبہہ، قدریہ، حشویہ فرقے پیدا ہوئے، ایسے ہی ان میں بھی کئی اس قسم کے نئے نئے فرقے ایجاد ہوگئے تھے۔

تفرقہ واختلاف میں فرق:

بعض حضرات نے تو یہ بیان کیا کہ دونوں کا معنی ایک ہے، اسلئے "**تفرقوا**" کے بعد "**واختلفوا**" بطور تاکید ذکر کیا گیا ہے، اور بعض حضرات نے ان دونوں لفظوں کے معانی میں چند فرق بیان کئے ہیں۔

(۱) **قيل تفرقوا بالعداوة واختلفوا فى الدين**"

ایک وجہ فرق یہ ہے کہ تفرقہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے عداوت کی وجہ سے علیحدہ ہو گئے، آپس میں بٹ گئے، ایک دوسرے سے پھٹ گئے۔

(۲) **وقیل تفرقوا بسبب استخراج التاویلات الفاسدة من تلک النصوص ثم اختلفوا بان حاول کل واحد نصرة قوله ومذهبه "**

اور بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے تفرقہ پیدا کیا یعنی ظاہری آیات کے مطالب چھوڑ کر غلط اور باطل تاویلیں نکال لیں، پھر ایک دوسرے سے اختلاف کیا کہ ہر فریق نے اپنے اپنے اقوال اور اپنے مذہب کو صحیح کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، حالانکہ ہر ایک باطل راہ پر تھا۔

(۳) **والثالث تفرقوا بابدانهم بان صار کل واحد من اولئک الاحبار رئیسا فی بلد، ثم اختلفوا بان حاول کل واحد منهم نصرة قوله ومذهبه "**

اور تیسری وجہ فرق یہ ہے، وہ متفرق ہو گئے یعنی ان کے اصحاب علم میں سے کوئی کسی شہر کا رئیس بن گیا اور کوئی کسی شہر کا رئیس بن گیا، پھر انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا، ہر ایک دعویٰ کرنے لگا کہ میں حق پر ہوں، دوسرا باطل پر ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے تفرقہ اور اختلاف کی یہ تیسری وجہ بیان کرنے کے بعد ذکر فرمایا۔

"واقول انک اذا انصفت علمت ان اکثر علماء هذاالزمان صاروا موصوفین بهذه الصفة فنسأل الله العفو والرحمة "

میں کہتا ہوں کہ بیشک جب تو انصاف کرے تو تجھے خود پتہ چل جائے گا کہ اس زمانے کے اکثر علماء میں یہ وصف پایا جاتا ہے، ہم اللہ تعالیٰ سے عفو اور رحمت کا سوال کرتے ہیں۔ (کبیر)

راقم کہتا ہے ہر زمانہ میں علماء کے لباس میں جہلاء نے علماء کو بدنام کیا، اس قسم کے علماء حقیقت میں علماء نہیں ہوتے، بلکہ دین فروش ہوتے ہیں۔

ان کا اختلاف کیسا تھا؟

یہود و نصاریٰ کا اختلاف اصول دین میں تھا، صرف فروعی اختلاف کی مذمت نہیں بیان کی گئی، اور نبی کریم ﷺ کی امت کو بھی یہی حکم دیا گیا۔

"والاظهر ان النهی فیه مخصوص بالتفرق فی الاصول دون الفروع لقوله ﷺ "اختلاف امتی رحمة "ولقوله ﷺ من اجتهد فأصاب فله اجران ومن اخطأ فله اجر واحد "

زیادہ ظاہر بات یہی ہے کہ اصول دین میں اختلاف سے منع کیا گیا ہے، فروع دین میں اختلاف سے منع نہیں کیا گیا، اسلئے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میری امت کا اختلاف رحمت ہے، اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا" جس نے اجتہاد کیا اگر اس نے درست راہ پالی تو اسے دو اجر حاصل ہوں گے، اور اگر اس سے خطاء ہوگئی تو اسے ایک اجر حاصل ہوگا، یعنی اجتہاد کا ثواب خطاء پر بھی حاصل ہوگا، ان دونوں احادیث سے واضح ہوا کہ فروع میں اختلاف جائز ہے، اس سے منع نہیں کیا گیا۔ (ماخوذ از بیضاوی)

﴿مِنْ بَعْدِمَا جَاءَ هُمُ الْبَيِّنَاتِ﴾ "اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح نشانیاں آگئیں۔"

یعنی وہ واضح نشانیاں آگئیں جو حق راہ کی دعوت دیتی تھیں، اتفاق کرنے کی راہ بتاتی تھیں اور ایک کلمہ پر متحد ہونے کا سبق دیتیں، لیکن انہوں نے اس کے بعد ان میں اختلاف کیا۔ (روح البیان)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"جَاءَ هُمُ الْبَيِّنَات" میں فعل مذکر رکھا گیا، کیونکہ فاعل مؤنث غیر حقیقی ہے، اور فعل وفاعل میں "هم" ضمیر کا فاصلہ بھی موجود ہے، اسلئے فعل کا مذکر ذکر کرنا صحیح ہے، علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کو مختصر طور پر بیان فرمایا (جو اعتراض سے خالی نہیں)

"انما قال (مِنْ بَعْدِمَا جَاءَ هُمُ الْبَيِّنَات) ولم يقل جاء تهم لجواز حذف علامة التانيث من الفعل اذ كان فعل المؤنث متقدما"۔

جن فروع پر اجماع امت ہو ان میں اختلاف حرام ہے:

یہود ونصاری یا اس امت کے وہ لوگ جنہوں نے واضح قطع دلائل کے بعد اختلاف کیا اور فرقوں میں بٹ گئے، ان کیلئے بڑا عذاب ہے، وہ واضح نشانیاں کیا ہیں؟

"الدلائل الواضحة القاطعة من الآيات المحكمة والاخبار المتواترة المحكمة من الانبياء ونحوذلک كاجماع هذه الامة سواء كان ذلک الاختلاف فی اصول الدين كاختلاف اهل الاهواء مع اهل السنة او فی الفروع المجمع عليها كمسئلة غسل الرجلين ومسح الخفين فی الوضوء وخلافة الخلفاء الاربعة"

واضح نشانیاں یہ ہیں ''قرآن پاک کی آیات قطعیہ، احادیث متواترہ، تمام انبیاء کرام کی اخبار متواترہ محکمہ، اور نبی کریم ﷺ کی امت کے علماء صالحین ومجتہدین کا اجماع، لھذا اصول دین میں اختلاف سے بھی منع کیا گیا ہے جیسا کہ اپنی خواہشات کے مطابق چلنے والوں نے اہل سنت کے خلاف عقائد باطلہ پر قائم ہو کر ان سے اختلاف کیا اور راہ حق سے بھٹک گئے، اسی طرح وہ فروع جن پر اجماع امت ہے ان سے اختلاف کرنے والے بھی صراط مستقیم سے ہٹ گئے وہ علیحدہ فریق بن کر اہل سنت سے دور ہو گئے۔

وہ فروع جن پر اجماع علماء صالحین ومجتہدین ہیں، وہ یہ ہیں ''وضوء میں پاؤں کے دھونے میں اجماع ہے، پاؤں نہ دھونا اختلاف اور تفرقہ بازی ہے، جس سے شریعت نے منع کیا ہے، اور وضوء میں موزوں پر مسح کرنے کا جواز اجماع سے ثابت ہے، موزوں پر مسح کرنے کو جائز نہ سمجھنا اختلاف اور تفرقہ بازی ہے جس سے شریعت نے منع کیا (خیال رہے موزوں پر مسح کرنا ضروری نہیں بلکہ مسح کو جائز سمجھنا ضروری ہے۔) اور چار خلفاء راشدین کی خلافت جس ترتیب سے واقع ہوئی اس کو حق سمجھنے پر اجماع ہے، خلفاء راشدین کی خلافت راشدہ کو حق نہ سمجھنا اختلاف اور تفرقہ بازی ہے، جس سے منع کیا گیا، اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ ظنی دلائل سے اجتہاد کے ذریعے جو مسائل حاصل کئے جاتے ہیں، ان میں اختلاف کا پایا جانا عین ممکن ہے، بعض مجتہدین کا اجتہاد میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ (مظہری)

''فذلک الاختلاف بعد بذل الجهد بلا مکابرة وتعصب معفو بل هو رحمة وسعة للناس''

یہ اختلاف چونکہ مسائل کے حصول کیلئے اپنی پوری کوشش صرف کرنے کے بعد پایا جاتا ہے، اس میں نہ کوئی ایک دوسرے سے ضد پائی جاتی ہے، اور نہ کوئی تعصب، یہ اختلاف معاف ہے، بلکہ رحمت ہے، اس کی لوگوں کو اجازت ہے۔ (مظہری)

❁ **عن عمر بن الخطاب قال قال رسول الله ﷺ سالت ربی عن اختلاف اصحابی من بعدی فاوحی الله یامحمدان اصحابک عندی کالنجوم بعضها اقوی من بعض'' وفی روایة بعضها اضوء من بعض ولکل نور فمن اخذ بشئی مماهم علیه من اختلافهم فهو عندی علی هدی''**

حضرت عمر بن خطاب ؓ نے بیان فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میں نے اپنے رب سے اپنے صحابہ کے اختلاف کے متعلق پوچھا تو رب تعالی نے میری طرف وحی کی، اے محمد بیشک تیرے صحابہ میرے نزدیک ستاروں کی طرح ہیں، جس طرح بعض ستارے بعض سے زیادۃ قوی ہیں (اسی طرح بعض صحابہ بعض پر فوقیت رکھتے ہیں) (مظہری)

اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ بعض ستارے بعض سے زیادہ روشن ہیں، (اسی طرح آپ کے صحابہ کو) بعض کو بعض پر نور حاصل ہے، صحابہ کا جس مسئلہ میں اختلاف ہوا اس میں کسی شخص نے جس صحابی سے قول پر عمل کر لیا وہ میرے نزدیک ہدایت پر ہوگا۔

("رواہ عبد بن حمید فی مسندہ والدارمی وابن ماجہ والعبدری فی الجمع بین الصحیحین وابن عساکر والحاکم عن عمر بن الخطاب "ورواہ الدار قطنی فی فضائل الصحابة وابن عبد البر عن جابر والبیھقی فی المدخل عن ابن عباس ") (مظھری)

❁ وروی البیھقی ایضافی المدخل بسند ضعیف عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ مھما اوتیتم من کتاب الله فالعمل به ولا عذر لاحد فی ترکه فان لم یکن فی کتاب الله فسنة نبی ماضیة فان لم یکن سنة نبی فماقال اصحابی ان اصحابی بمنزلة النجوم فی السماء فایھااخذتھم به اھتدیتم واختلاف اصحابی لکم رحمة "

بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ذکر کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا جب تمہیں اللہ کی کتاب دی گئی تو اس پر عمل کرو، کتاب اللہ (قرآن پاک) کو چھوڑنے کا کسی کا عذر قبول نہیں کیا جائے گا، اگر کتاب اللہ میں (کوئی مسئلہ بظاہر موجود) نہ ہو تو اللہ کے نبی کی سنت جاری ہے، (یعنی سنت رسول اللہ پر عمل کرو) اگر سنت میں نہ ہو تو صحابی کے قول پر عمل کرو، میرے صحابہ آسمان میں ستاروں کی طرح ہیں جس پر تم عمل کرو گے ہدایت پا جاؤ گے، میرے صحابہ کا اختلاف تمہارے لئے رحمت ہے۔ (مظہری)

❁ واخرج البیھقی فی المدخل وابن سعد فی الطبقات عن القاسم بن محمد قال اختلاف اصحاب محمد رحمة لعباد الله "

بیہقی اور طبقات سعد نے قاسم بن محمد سے روایت بیان کی کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کا اختلاف اللہ تعالیٰ کے بندوں کیلئے رحمت ہے، اور بیہقی نے اس قسم کی روایت حضرت عمر بن عبدالعزیز [illegible] اللہ سے بھی بیان کی۔ (مظہری)

﴿وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ "اور ان کیلئے بڑا عذاب ہے۔"

یعنی قطعی دلائل جن لوگوں کو حاصل ہو گئے، اس کے بعد جب وہ پھر [illegible] بہت بڑے عذاب کے مستحق ہو گئے۔ (مظہری)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَO (آیۃ نمبر ۱۰۶)

(1) جس دن کچھ منہ اونجالے ہوں گے اور کچھ منہ کالے، تو وہ جن کے منہ کالے ہوئے کیا تم ایمان لاکر کافر ہوئے تو اب چکھو اپنے کفر کا بدلہ۔ (کنزالایمان)

(2) اس دن سفید ہوں گے کچھ چہرے، اور سیاہ ہوں گے کچھ چہرے، لیکن وہ جو سیاہ ہوئے چہرے ان کے (ان کو کہا جائے گا) کیا تم نے کفر کیا بعد ایمان لانے کے، تو چکھو عذاب بوجہ اسکے جو تم کفر کرتے رہے۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالیٰ نے یہود کو بعض اشیاء کا حکم دیا اور بعض سے منع کیا، پھر مسلمانوں کو بعض چیزوں کا حکم دیا اور بعض سے منع کیا، اب اس آیۃ کریمہ میں پہلے امور کی تاکید کیلئے احوال آخرت کا تذکرہ کیا۔ (کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

" یَوْم " میں نصب کی دو وجہ ہیں، ایک یہ کہ " لهم " ظرف کی وجہ سے نصب ہو جسکا عامل فعل مقدر ہے، معنوی طور پر تقدیر عبارت کی یہ ہوگی "سیکون لهم عذاب عظیم فی هذا الیوم " ان کو بڑا عذاب ہوگا اس دن میں جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے۔ **دوسری** وجہ نصب کی "اذکر" مقدر ہے، یعنی یاد کرو اس دن کو جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے۔

اس آیۃ کریمہ میں کن لوگوں کا تذکرہ ہے:

(۱) آیۃ کریمہ "اہل اہواء" (خواہشات کے مرتکبین) کے متعلق نازل ہوئی، اس پر حدیث اسماء دلالت کر رہی ہے۔

❁ عن اسماء بنت ابی بکر قالت قال رسول اللهﷺ انی علی الحوض حتی انظر من یرد علیّ منکم وسیؤخذ ناس دونی فاقول یارب منی ومن امتی فیقال هل شعرت ما عملوا بعدک والله مابرحوا یرجعون علی اعقابهم" (رواہ البخاری)

اسماء بنت ابی بکر (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک میں حوض (کوثر) پر ہوں گا یہاں تک کہ میں دیکھوں گا تم میں سے (میری امت میں سے) جو مجھ پر وارد ہوں گے، کچھ لوگوں کو میرے قریب آنے سے منع کر دیا جائے گا، تو میں کہوں گا اے میرے رب یہ تو میرے ہیں اور میری امت کے لوگ ہیں، تو کہا جائے گا" کیا آپ کو معلوم ہے انہوں نے آپ کے بعد کیا عمل کئے ہیں؟ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی وہ ہمیشہ اپنی ایڑیوں کے بل پیچھے لوٹتے چلے جائیں گے۔ (مظہری)

❁ **عن ابی هريرة ان رسول الله ﷺ قال بادروا بالاعمال فتنا كقطع الليل المظلم يصبح الرجل مؤمنا ويمسى كافرا ومؤمنا ويصبح كافرا يبيع دينه بعرض من الدنيا قليل"**

(رواہ مسلم واحمد والترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" اعمال کی طرف جلدی کرو فتنوں سے پہلے جس طرح تاریک رات میں ڈاکہ ڈالا جائے، صبح ایک شخص مومن ہوگا شام کو کافر ہو جائے گا اور شام کو کوئی شخص مؤمن ہوگا صبح کافر ہو جائے گا، اپنے دین کو دنیا کے تھوڑے مال کے بدلے بیچ دے گا۔

(مظہری)

خیال رہے کہ دنیا حقیر چیز ہے اس کا سارا مال دین اور آخرت اور اخروی نعمتوں کے مقابلہ میں قلیل ہی ہے۔

(۲) اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ "خوارج" کے بارے میں نازل ہوئی۔ "**عن ابی امامة عن النبی ﷺ قال هم الخوارج**" "**رواه احمد وغيره**" ابوامامہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا" وہ خارجی لوگ ہیں"

(۳) اس میں تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ مرتدین کے بارے میں نازل ہوئی، ظاہری معنیٰ سے یہ قول زیادہ واضح ہے۔

(۴) اس میں چوتھا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ اہل کتاب کے متعلق نازل ہوئی جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ پر ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا، اور وہ اہل کتاب بھی اس آیۃ کریمہ میں آتے ہیں جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ پر ایمان لایا اور آپ کی بعثت کے بعد آپ سے کفر کیا۔

(۵) تمام اقوال کا جامع قول: جس میں سارے اقوال سمٹ کر آجاتے ہیں۔

"وقيل فی جميع الكفار كفروا بعد ما اشهدهم الله علی انفسهم او بعد ما تمكنوا من الايمان بالنظر الی الدلائل"

اس آیۂ کریمہ میں تمام کفار کا ذکر ہے جنہوں نے یوم میثاق کو رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" (کیا میں تمہارا رب نہیں) کے جواب میں کہا "قَالُوْا بَلٰی" انہوں نے کہا ہاں (تو ہمارا رب ہے) یا تمام کفار کو دلائل کی طرف نظر کرنے سے ایمان لانا چاہئے تھا، اسے ایمان سے تعبیر کردیا، اور ان کا ایمان نہ لانا گویا کہ ایمان کے بعد کفر کرنے کے مترادف ہے، اس قول میں اہل اہواء جو درجۂ کفر تک پہنچے ہوں، اور مرتدین اور خوارج سب ہی آجاتے ہیں۔

خوارج کے متعلق ارشاد مصطفوی ﷺ:

❁ **اخرج مسلم عن زید بن وهب انه كان فی الجیش الذین كانوا مع علی (ﷺ) لماساروا الی الخوارج فقال علی ایهاالناس انی سمعت رسول الله ﷺ یقول یخرج قوم من امتی یقرؤن القرآن لیس قراء تكم الی قرأتهم بشئ ولا صلوتكم الی صلوتهم بشئ ولا صیامكم الی صیامهم بشئ یقرؤن القرآن یحسبون انه لهم وهو علیهم لاتجاوز صلوتهم تراقیهم یمرقون من الاسلام كما یمرق السهم من الرمیة"**

زید بن وہب فرماتے ہیں کہ وہ حضرت علی ﷺ کے ساتھ تھے، جب وہ خارجیوں کی طرف چلے تو حضرت علی ﷺ نے فرمایا اے لوگو بیشک میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرمارہے تھے "میری امت میں سے ایک قوم نکلے گی جو قرآن پڑھتے ہوں گے، تمہارا قرآن پڑھنا ان کے پڑھنے کے مقابل کچھ نہیں ہوگا، تمہاری نمازیں ان کی نمازوں کے مقابل کچھ نہیں ہوں گی، اور تمہارے روزے ان کے روزوں کے مقابل کچھ نہیں ہوں گے، وہ قرآن پڑھیں گے گمان یہ کریں گے کہ قرآن ان کو نفع پہنچارہا ہے لیکن حقیقت میں قرآن انہیں نقصان پہنچارہا ہوگا (کیونکہ ان کا ایمان ہی نہیں ہوگا) ان کی نمازیں ان کی سینے کی ہڈیوں سے نیچے نہیں جائیں گی، (یعنی ان کے اعمال کو قبولیت حاصل نہیں ہوگی) وہ اسلام سے ایسے نکل جائیں جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ (خازن)

چہرے سفید ہونے اور سیاہ ہونے سے کیا مراد ہے؟

اس کے دو معنی لئے گئے ہیں، ایک مجازی اور دوسرا حقیقی۔

مجازی معنی: ان البیاض مجاز عن الفرح والسرور والسواد عن الغم " چہرے کے سفید ہونے کا مجازی معنی یہ لیا گیا کہ ان کو فرحت وسرور (بہت زیادہ خوشی کا مقام) حاصل ہوگا، اور چہرے کے سیاہ ہونے کا مجازی معنی یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ غم میں مبتلاء ہوں گے، یہی معنی دوسری آیات میں بھی پایا گیا ہے۔

﴿وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَى اللّٰهِ وُجُوهُهُم مُّسْوَدَّةٌ﴾ (پارہ نمبر ۲۴ سورۃ الزمر، آیۃ نمبر ۵۹)

''اور قیامت کے دن تم دیکھو گے انہیں جنہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا کہ ان کے منہ کالے ہیں۔''

﴿لِلَّذِينَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ (پارہ نمبر ۱۱ سورۃ یونس آیۃ نمبر ۲۶)

''بھلائی والوں کیلئے بھلائی ہے اور اس سے بھی زائد، اور ان کے منہ پر نہ چڑھے گی سیاہی اور نہ خواری وہی جنت والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔'' (اس کے بعد آیۃ نمبر ۲۷ میں بیان کیا گیا)

﴿وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ﴾

''اور جنہوں نے برائیاں کمائیں تو برائی کا بدلہ اسی جیسا اور ان پر ذلت چڑھے گی۔''

یہاں بھی یقیناً'' قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ'' مراد ہے، جو پچھلی آیۃ سے سمجھ آ رہا ہے،'' قَتَرٌ'' کا معنی ہے'' سیاہی'' یعنی جنتی لوگ سیاہی سے محفوظ رہیں گے اور جہنمی چہرے سیاہی میں مبتلاء ہوں گے۔

﴿وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ○ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ○ وَوُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ○ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ﴾ (پارہ نمبر ۲۹ سورۃ القیامۃ، آیۃ نمبر ۲۲ تا ۲۵)

کچھ منہ اس دن تروتازہ ہوں گے اپنے رب کو دیکھتے اور کچھ منہ اس دن بگڑے ہوئے ہوں گے سمجھتے ہوں گے کہ ان کے ساتھ وہ کی جائے گی جو کمر کو توڑ دے۔

﴿يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ﴾ (سورۃ الرحمن، آیۃ نمبر ۴۱)

(مجرم اپنے چہرے سے پہچانے جائیں گے)

﴿وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ○ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ○ وَوُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ○ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ○ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ﴾ (پارہ نمبر ۳۰ سورۃ عبس آیۃ نمبر ۳۸ تا ۴۲)

کتنے منہ اس دن روشن ہوں گے، ہنستے خوشیاں مناتے، اور کتنے مونہوں پر اس دن گرد پڑی ہوگی ان پر سیاہی چڑھ رہی ہے، یہ وہی کافر بدکار'' ان تمام مذکورہ آیات میں'' بیاض اور ناضرۃ'' کا مجازی معنی ہے'' فرحت وسرور حاصل ہونا'' اور سواد، اور غبرۃ اور قترۃ'' کا مجازی معنی ہے غم اور پریشانی'' حضرت امام حسن ﷺ نے جب حضرت امیر معاویہ ﷺ سے صلح کر لی، کچھ امور طے کر کے امارت (حاکمیت) ان کے حوالہ کر دی، تو کسی سفید بالوں والے بوڑھے نے آپ کو کہا'' یا مسود وجوہ المؤمنین '' اے مومنوں کے چہروں کو سیاہ کرنے والے، آپ نے اسے جواب دیا۔

یابیاض القرون سودت وجھی عند بیض الوجوہ سود القرون

فلعمری لاخفینک جهدی عن عیانی و عن عیان العیون
بسواد فیه بیاض لوجهی وسواد لوجهک الملعون

(۱) اے سفید گیسوؤں والے میں نے اپنا چہرا سیاہ کیا جب کہ سیاہ بالوں والے جوانوں کے چہرے سفید ہو گئے۔

(۲) مجھے اپنی عمر کی قسم میں اپنی عمر کو ضرور برضرور تم سے مخفی رکھوں گا، اپنے آپ کو ظاہر ہونے اور لوگوں کی نظروں میں ظاہر ہونے سے۔

(۳) یہ ایسی سیاہی ہے جس میں حقیقت میں میرے چہرے کی سفیدی ہے، اور تمہارے چہرے کی سیاہی ملعون ہے۔

ان اشعار میں بھی چہرے کی سفیدی سے مراد ''فرحت وسرور'' اور چہرے کی سیاہی سے مراد غم اور پریشانی ہے، جب کوئی شخص اپنا مطلوب ومقصود پالیتا ہے تو عرب حضرات اس کیلئے یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ "ابیض وجهه "ومعناه الاستبشار والتهلل" اس کا چہرا سفید ہو گیا یعنی اسے خوشی حاصل ہوگئی اور اس کا چہرا چمک اٹھا۔ اسی طرح دعائیہ کلمات میں یوں استعمال کیا جاتا ہے" الحمد لله الذی بیض وجهك "سب تعریفیں اللہ تعالی کیلئے ہیں جس نے تمہارے چہرے کو سفید کیا یعنی تمہیں راحت وسرور عطاء کیا، اور جس شخص کو غم اور پریشانی لاحق ہو، اس کیلئے یہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں،" اربدو جهه واغبر لونه وتبدلت صورته " اس کا چہرا خاکستری ہو گیا، اس کا رنگ غبار آلودہ ہو گیا اور اس کی صورت بدل گئی، ان تمام الفاظ کا مجازی معنی یہی ہے کہ وہ غمناک ہو گیا۔

دوسرا معنی حقیقی ھے : کہ مؤمنین کے چہرے حقیقی طور پر سفید ہوں گے اور ان میں نورانیت ہوگی وہ چمک دمک رہے ہوں گے اور کافروں کے چہرے سیاہ ہوں، غبار آلود ہوں گے، خاکستری ہوں گے۔ (ماخوذ از کبیر)

راقم کے نزدیک عموم المجاز معنی لینا بہتر ہے:

مؤمنین کے چہرے نورانی ہوں گے اور کافروں کے تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہوں گے، اس معنی میں مجاز خود بخود داخل ہو جائے گا، حقیقت ومجاز کا اجتماع بھی لازم نہیں آئے گا، مطلب یہ ہوگا، مؤمنین کے چہرے نورانی ہوں گے وہ سفید ہوں گے، ان میں آب وتاب ہوگی، وہ اپنی اس کیفیت اور اپنے اعمال کی مقبولیت اور رب تعالی کے تقرب اور انبیاء کرام کے مؤمنین پر راضی ہونے کی وجہ سے خوش ہوں گے، ان کو فرح وسرور حاصل ہوگا۔

اور کافروں کے چہروں پر تاریکی چھائی ہوگی، ان کے چہرے سیاہ ہوں گے، غبار ان کے چہرے سے اڑ رہا ہوگا، ان کے چہرے آگ سے جل جانے کی طرح خاکستری نظر آئیں گے، وہ اپنی یہ حالت دیکھ کر بہت زیادہ غم اور

پریشانی میں مبتلاء ہوں گے، رب تعالیٰ اور انبیاء کرام ان سے ناراض ہوں گے۔

چہرے سیاہ وسفید کب ہوں گے اور کہاں ہوں گے؟

یہ چند مقامات ہیں جہاں مؤمنین کے چہرے سفید اور کفار کے سیاہ ہوں گے، یہ منظر قیامت کے دن ہوگا۔

(۱) **یوم القیامة حین یبعثون من قبورهم تکون وجوه المؤمنین مبیضة ووجوه الکافرین مسودة "**
یعنی قیامت کے دن جب لوگوں کو قبروں سے اٹھایا جائے گا تو مؤمنوں کے چہرے سفید، چمکدار ہوں گے، اور کافروں کے سیاہ، کالے ہوں گے۔

(۲) دوسرا مقام اس حال کا نامہ اعمال پڑھنے کے وقت ہوگا۔
اذاقرأالمؤمن کتابه فرأی فی کتابه حسناته استبشر وابیض وجهه واذاقرأالکافر والمنافق کتابه فرأی فیه سیآته اسود وجهه "
جب مؤمن اپنا نامہ اعمال پڑھے گا تو وہ خوش ہوگا اور اس کا چہرا سفید ہوگا، جس میں آب وتاب ہوگی، جب کافر اور منافق اپنا اپنا نامہ اعمال پڑھیں گے تو ان کے چہرے سیاہ ہوں گے اور وہ پریشان ہوں گے۔

(۳) یہ حال اس وقت ہوگا جب رب تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا۔

﴿وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ﴾ جدا ہو جاؤ آج اے مجرمو، یعنی جب کفار ومنافقین کو مومنین سے جدا کر دیا جائے گا تو اس وقت مؤمن خوش ہوں گے اور ان کے چہرے سفید ہوں گے، اور کافر اور منافق لوگ اس وقت غم میں ہوں گے، اور ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔

(۴) ویقال ان ذلك عند المیزان اذارجحت حسناته ابیض وجهه واذارجحت سیآته اسود وجهه "
یہ حالت میزان کے وقت ہوگی، جن کی نیکیاں بڑھ جائیں گی وہ خوش ہوں گے، اور ان کے چہرے سفید ہوں گے، اور جن کی برائیاں بڑھ جائیں وہ غمزدہ ہوں اور ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔

(۵) **ویقول اذا کان یوم القیامة یؤمر کل فریق بان یجتمع الی معبوده فاذاانتهوا الیه حزنوا واسودت وجوههم، فیبقی المؤمنون واهل الکتاب والمنافقون، فیقول الله تعالی للمؤمنین من ربکم؟فیقولون ربناالله عزوجل فیقول لهم اتعرفونه اذارأیتموه فیقولون سبحانه،اذااعترف عرفناه فیرونه کما شاء الله،فیخر المؤمنون سجدالله تعالی فتصیر وجوههم مثل الثلج بیاضاویبقی المنافقون واهل الکتاب لایقدرون علی السجود فیحزنواوتسودوجوههم"**

اور یہ حالت اس وقت ہوگی جب قیامت کے دن ہر فریق کو حکم دیا جائے گا کہ وہ اپنے اپنے معبودوں کے ساتھ جمع ہو جائیں گے، جب خالص کافر اپنے معبودوں سے ملیں گے تو وہ غمزدہ ہو جائیں گے اور ان کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے، لیکن مؤمنین اور منافقین اور اہل کتاب ابھی تک کافروں سے جدا ہوں گے، مؤمنین سے اللہ تعالیٰ سؤال کرے گا تمہارا رب کون ہے؟

وہ کہیں گے ہمارا رب اللہ عزوجل ہے، پھر رب تعالیٰ ان کو کہے گا کیا تم اپنے رب کو دیکھ کر پہچان لو گے، وہ کہیں گے کہ ہمارا رب تو پاک ذات ہے، (یعنی ہم اسے کیسے دیکھ سکیں گے) مؤمن جب اپنے عجز کا اعتراف کرلے گا تو رب تعالیٰ اپنی پہچان کرادے گا، یعنی وہ اپنے دیدار سے مشرف فرمائے گا، تو مؤمنین رب تعالیٰ کو دیکھیں گے جس طرح رب تعالیٰ چاہے گا، (اس کی کیفیت کو بیان نہیں کیا جاسکتا) مومنین رب تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گر جائیں گے تو ان کے چہرے برف کی طرح سفید ہوں گے، لیکن منافقین اور اہل کتاب اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار اور رب تعالیٰ کے حضور سجدہ کرنے سے محروم رہیں گے اس لئے ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ (ماخوذ از قرطبی)

دینی طلباء کرام کیلئے ایک علمی نکتہ:

اس آیۃ کریمہ سے یہ ثابت ہوا کہ مکلف یا مؤمن ہوگا یا کافر، ان کے درمیان کوئی واسطہ نہیں، جیسا کہ معتزلہ مؤمن اور کافر کے درمیان واسطہ مانتے ہیں، جسے نہ مؤمن مانتے ہیں، نہ کافر، اہل سنت کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت والے لوگوں کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں، ایک قسم یہ ہے کہ ان کے چہرے سفید ہوں گے وہ مومن ہوں گے، اور دوسری قسم یہ ہے کہ ان کے چہرے سیاہ ہوں گے وہ کافر ہوں گے ''ولم یذکر الثالث فلو کان ھھنا قسم ثالث لذکرہ اللہ تعالیٰ'' یہاں تیسری قسم کا کوئی ذکر نہیں، اگر تیسری قسم ہوتی تو اسے ذکر کیا جاتا، معتزلہ کی جانب سے جواب یہ دیا گیا کہ تیسری قسم کے نہ ذکر کرنے سے تیسری قسم معدوم نہیں ہوگئی، ایک وجہ تو یہ ہے کہ ''وجوہ'' نکرہ ہے، مقام مثبت میں واقع ہے، جو عموم کا فائدہ نہیں دیتا، پھر آیۃ کریمہ میں مؤمنین کا ذکر ہے اور ان کافروں کا ذکر ہے جو ایمان کے بعد کفر اختیار کرتے ہیں، اصلی کافروں کو یہ آیۃ کریمہ شامل نہیں، جب اصلی کافر دو قسموں سے باہر ہیں تو وہ لوگ بھی ان دو قسموں سے باہر ہیں جو نہ مؤمن ہیں اور نہ کافر۔

اہل سنت کی طرف سے ان کے استدلال کا رد یہ کیا گیا ہے کہ نکرہ مقام اثبات میں عموم پر دلالت کرتا ہے، جب قرینہ پایا جائے، قرائن اس میں واضح ہیں کیونکہ پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور نبی کریم ﷺ کی نبوت پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا، جس کا تقاضا یہی ہے کہ ایمان لانے والوں کے چہرے سفید ہوں اور کفر کرنے والوں کے

چہرے سیاہ ہو جائیں۔

"ثم دل مابعد هذه الآية على ان صاحب البياض من اهل الجنة وصاحب السواد من اهل النار فحينئذ يلزم نفى المنزلة بين المنزلتين"

پھر اسی کا تذکرہ کر دیا گیا کہ بعض چہرے سفید ہوں گے اور بعض چہرے سیاہ ہوں گے، اس کے بعد ذکر کیا جن کے چہرے سیاہ ہوں گے وہ جہنمی ہوں گے اور جن کے چہرے سفید ہوں گے وہ جنتی ہوں گے اب واضح ہو گیا کہ لوگوں کی کل دو قسمیں ہیں، مؤمن اور کافر، درمیان میں اور کوئی قسم نہیں۔ جہاں تک اس دلیل کا تعلق ہے کہ اصلی کافروں کو یہ آیہ کریمہ شامل نہیں، یہ درست نہیں، کیونکہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ اصلی کافر بھی یوم میثاق کو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کر چکے ہیں، اسے ہی ایمان سے تعبیر کر دیا گیا، کہ وہ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے۔

پھر اس آیہ کریمہ کے آخر میں ﴿فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ﴾ ذکر کیا گیا، جو سبب ہے عذاب کا وہ کفر ہے۔

"واذاوقع التعليل بمطلق الكفر دخل كل الكفار فيه سواء كفر بعد الايمان او كان كافر اصليا"

جب علت مطلق کفر ہے تو یہ ان کافروں کو بھی شامل ہے جو ظاہری ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے، یعنی مرتد ہو گئے، اور اصلی کافروں کو بھی شامل ہے کہ وہ یوم میثاق کو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کو مان کر پھر گئے۔ (ماخوذ از کبیر)

سؤال: جب دو قسموں کا ذکر کیا گیا تو ارشاد فرمایا ﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ﴾ اس میں چہروں کے سفید ہونے کا پہلے ذکر کیا اور سیاہ ہونے کا ذکر بعد میں کیا لیکن جب تفصیل ذکر کی تو ارشاد فرمایا ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ﴾ اس میں سیاہ چہرے والوں کا ذکر پہلے کیا اور سفید چہرے والوں کا بعد میں ﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ﴾ میں ذکر ہو رہا ہے، اس کی وجہ کیا ہے۔

جواب: اس میں چند وجوہ ہیں:

(۱) واؤ مطلق جمع کیلئے ہے ترتیب کیلئے نہیں، اس لئے ﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ﴾ میں مطلقا یہ ذکر کیا گیا کہ بعض چہرے سفید ہوں گے، بعض سیاہ ہوں گے، ترتیب مقصود نہیں۔

(۲) مقصود مخلوق کو رحمت پہنچانا ہے نہ کہ عذاب، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے پہلے سفید چہرے والوں کا ذکر کیا کیونکہ وہ اہل ثواب ہیں، اور وہی سفید چہرے والے ہوں گے۔

"تقديم الاشرف على الاخس فى الذكر احسن ثم ختم بذكرهم ايضاتنبيهاعلى ان

ارادة الرحمة اکثر من ارادة الغضب، کما قال سبقت رحمتی غضبی "

اعلیٰ واشرف کو گھٹیا سے پہلے ذکر کرنا احسن ہے، پھر آخر میں بھی ان کا ہی تذکرہ کیا، جس سے یہ اشارہ بھی کردیا کہ رب تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر زیادہ ہے، یہی وجہ ہے کہ حدیث قدسی میں رب تعالیٰ نے فرمایا کہ ''میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی''

(۳) فصحاء اور شعراء اپنے کلام کی ابتداء ایسے الفاظ سے شروع کرتے ہیں کہ جن سے طبیعت خوش ہو اور سینہ میں شرح پائی جائے، اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی سرور اور شرح صدر کا سبب ہے، اسی وجہ سے اہل ثواب کا ذکر پہلے کیا کہ وہ سفید چہرے والے ہوں گے اور اختتام بھی اسی سے کیا۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی مدارس کے طلباء توجہ فرمائیں:

سوال یہ پیدا ہوتا کہ ﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ﴾ میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ '' اما '' کا کوئی جواب ذکر نہیں کیا گیا، اس کا مطلب واضح نہیں کہ وہ جن کے چہرے سیاہ ہوں گے، ''کیا تم نے کفر کیا ایمان لانے کے بعد'' تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں عبارت مقدر ہے، وہ یہ ہے " **فیقال لھم** "تو ان کو کہا جائے گا، اب مطلب یہ ہوگیا ''اور لیکن وہ جن کے چہرے سیاہ ہوں گے تو ان کو کہا جائے گا کیا تم نے ایمان کے بعد کفر کیا (اب مطلب واضح ہوگیا) اس طرح اور آیات میں بھی اس قسم کے الفاظ محذوف ہیں۔

﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ﴾

اور فرشتے داخل ہوں گے ان پر ہر دروازے سے "وَيَقُوْلُوْنَ لَهُمْ "اور ان کو کہیں گے ''تم پر سلام ہو''

﴿وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا﴾

اور جب اٹھا رہے تھے ابراہیم اس گھر ''بیت اللہ'' کی بنیادیں، اور اسمٰعیل (فقالا) تو ان دونوں نے عرض کیا اے ہمارے رب قبول کر ہم سے۔

﴿وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَآ﴾

اور اگر آپ دیکھتے جب مجرم جھکائیں ہوں گے اپنے سروں کو اپنے رب کے ہاں (فیقولون) تو کہہ رہے ہوں گے ''اے ہمارے رب'' (ماخوذ از کبیر)

"فَذُوْقُوا الْعَذَابَ" الف لام عہد خارجی ہے، یعنی وہ عذاب جو عظیم ہے "ذوقوا" امر ہے جو اہانت کیلئے استعمال ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا ''چکھو بڑا عذاب'' یعنی اتنا عظیم ہوگا عذاب، جس کی وجہ سے ان کا ہر عضو گرفت میں

ہوگا، یہ ان کی ذلت کیلئے ہوگا۔

﴿بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ﴾ ''بوجہ اس کے جو تم کفر کرتے رہے۔''

اس میں ''با'' سببیت کیلئے ہے (اسی کے مطابق راقم نے ترجمہ کیا ہے) (ماخوذ از روح المعانی)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ ○ (آیۃ نمبر ۱۰۷)

(1) اور وہ جن کے منہ اونجالے ہوئے وہ اللہ کی رحمت میں ہیں وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ (کنز الایمان)

(2) اور وہ جن کے چہرے سفید (چمکدار) ہوئے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (نجوم الفرقان)

(ففی رحمة الله)يعنى الجنة والثواب المخلد،عبر عن ذلک بالرحمة تبينها على ان المؤمن وان استغرق عمره فى طاقة الله لايدخل الجنة الا برحمته وفضله "

رحمت سے مراد جنت اور دائمی ثواب ہے، اسے رحمت سے تعبیر کیا گیا، جس سے اس پر متنبہ (خبردار) کیا گیا کہ اگرچہ انسان بہت بڑی عمر اللہ کی طاعت کرتا رہے لیکن جنت میں سوائے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل سے داخل نہیں ہوگا، اصل وجہ خاتمہ بالخیر پر جنت میں جانے کی دارومدار ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہوتا ہے۔ (ماخوذ از بیضاوی)

جنت کو رحمت کہنے کی وجہ:

''**سميت الجنة رحمة لانها دار رحمة**'' جنت کا نام رحمت رکھا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ رحمت کا مقام ہوگا، جو وہاں پہنچ گیا وہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کے عذاب سے ہمیشہ کیلئے محفوظ ہوگیا۔ (خازن)

سفید چہرے والے کون ہوں گے؟

وہ مؤمنین ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی طاعت کرنے والے ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو پورا کرنے

والے ہوں گے۔ (خازن،قرطبی)

جنت میں دخول رب تعالیٰ کی رحمت سے ہوگا، کوئی ذاتی طور پر مستحق نہیں، اس پر حدیث پاک دیکھئے۔

❁ عن عائشة عن النبی ﷺ قال سددو وقاربوا وابشروا فانه لایدخل الجنة احدا عمله قالوا ولا انت یارسول الله قال ولا انا ان یتغمدنی الله بمغفرة ورحمة " (رواه الشیخان فی الصحیحین واحمد)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا درست ہو جاؤ، اور قریب ہو جاؤ اور خوش ہو جاؤ، بیشک جنت میں کسی کو اس کا عمل داخل نہیں کرے گا، صحابہ کرام نے عرض کی آپ کو (بھی) نہیں یارسول اللہ؟ آپ نے فرمایا، اور نہ ہی مجھے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت و رحمت نے مجھے ڈھانپ لیا ہے، مطلب واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرو، اسی سے خاتمہ بالخیر کی دعاء کرو، جب صحابہ کرام نے پوچھا کہ آپ کو بھی آپ کے اعمال جنت میں نہیں داخل کریں گے تو آپ نے فرمایا ہاں مجھے بھی اعمال جنت میں داخل نہیں کریں گے، البتہ مجھے رب تعالیٰ کی مہربانی سے رحمت و مغفرت نے ڈھانپ لیا ہے، یعنی میں نے بھی رب تعالیٰ کی رحمت سے ہی جنت میں جانا ہے، لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس کی رحمت مجھ پر چھا چکی ہے، تمہیں معلوم نہیں، اسلئے اس کی رحمت کے حصول کی کوشش کرتے رہو۔

❁ وعن جابر عن النبی ﷺ لایدخل احدامنکم عمله الجنة ولا یجیره من النار ولا انا الا رحمة من الله " (رواه مسلم)

حضرت جابر ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کسی ایک کو تم میں سے اس کا عمل اسے جنت میں داخل نہیں کرے گا اور نہ ہی اسے آگ سے نجات دے گا اور نہ ہی مجھے سوائے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے۔

سؤال: قرآن پاک کی آیۂ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ جنتی لوگوں کو کہا جائے گا ﴿اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ داخل ہو جاؤ جنت میں بوجہ اس کے کہ تم (اچھے) عمل کرتے رہے" تو یہ کہنا کس طرح درست ہے کہ "نیک اعمال سے انسان جنت میں داخل نہیں ہوگا بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل سے داخل ہوگا؟

جواب: قرآن پاک کی آیۂ کریمہ اور حدیث پاک میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ سمجھنے کی ضرورت ہے "ان للجنة منازل ینال بالاعمال وذلک محمل الآیة" آیۂ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ جنت میں منازل و مراتب ہوں گے، ان کو اچھے اعمال کے ذریعے حاصل کیا جا سکے گا۔

"واما اصل دخولها والخلود فیها بفضل الله ورحمته وذلک معنی الاحادیث "

جنت میں اصل دخول اور اس میں ہمیشہ رہنا اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہوگا، یہ مطلب ہے حدیث پاک کا۔

"ویدل علیہ قول ابن مسعود تجوزون الصراط بعفو اللہ وتدخلون الجنة برحمة اللہ وتقسمون المنازل باعمالکم" (رواہ ھناد فی الزھد وابو نعیم عن عون بن عبداللہ مثلہ)

اسی پر حضرت عبداللہ بن مسعود ﷛ کا قول دلالت کررہا ہے کہ پل صراط سے تم اللہ تعالیٰ کے معاف کرنے سے گذروگے، اور جنت میں تم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے داخل ہوگے اور منازل تمہارے حصہ میں تمہارے اعمال کی وجہ سے آئیں گی۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

تِلْکَ آیَاتُ اللّٰہِ نَتْلُوْھَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ وَمَا اللّٰہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعَالَمِیْنَ ○ (آیۃ نمبر ۱۰۸)

(1) یہ اللہ کی آیتیں ہیں ہم ٹھیک تم پر پڑھتے ہیں اور اللہ جہان والوں پر ظلم نہیں چاہتا۔ (کنزالایمان)

(2) یہ آیتیں ہیں اللہ کی، ہم پڑھتے ہیں وہ تم پر حق سے اور نہیں اللہ ارادہ فرماتا ظلم کا جہان والوں پر۔ (نجوم الفرقان)

معنیٰ سمجھنے کیلئے نحوی ترکیب کی طرف توجہ ضروری ہے:

"تلک" مبتداء ہے اور "آیات اللہ" اس کی خبر ہے اور "نتلوھا" جملہ حالیہ، جیسا کہ "ھذا بعلی شیخا" میں "شیخا" حال ہے اسم اشارہ میں "اشیر" فعل والا معنیٰ ہوتا ہے، اسی وجہ سے "فاعلیت اور مفعولیت" والا معنیٰ اس سے سمجھ میں آرہا ہوتا ہے، جسکی وجہ سے حال بنانا درست ہوتا ہے، اور ایک دوسری ترکیب میں "آیات اللہ" بدل ہے "تلک" سے اور تمام جملہ خبر مبتداء ہے، اور "بالحق" نتلوھا کے فاعل سے حال ہے، یا مفعول سے حال ہے، اگر فاعل سے حال ہو تو ان تمام الفاظ کا معنیٰ یہ ہوگا "یہ اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں، ہم آپ پر تلاوت کرتے ہیں ہمارا پڑھنا حق ہے۔

اور اگر مفعول سے حال ہو تو اب مکمل معنیٰ یہ ہوگا "یہ اللہ کی آیات ہیں، ہم آپ پر تلاوت کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ آیات حق ہیں۔ اس صورت میں یہ حال تاکید کیلئے ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہوتی ہی حق ہیں، پھر حق کا ذکر کرنا تاکید ہوگیا۔ (شیخ زادہ)

"تلک" اشارہ پہلی آیات کی طرف ہے جن میں کافروں کے عذاب اور نیک لوگوں کی نعمتوں کا ذکر ہے اس پر بظاہر سوال یہ وارد ہوتا ہے کہ یہ آیات تو قریب ہیں، ان کی طرف "تلک" اشارہ بعید سے کیسے کیا گیا؟ تو اس کا

جواب یہ دیا گیا کہ اگرچہ یہ آیات تو قریب ہیں، لیکن "ان ھذہ الآیات المذکورۃ قد انقضت بعد الذکر فصار کانھا بعدت " بیشک یہ آیات مذکورہ جب ان کو بیان کر دیا گیا تو ان کا بیان ختم ہونے کے بعد وہ بعید ہونے کے درجہ میں چلی گئیں، وانما جاز اقامۃ "تلک" مقام "ھذہ "اس لئے اشارہ قریب کی جگہ اشارہ بعید کالانا صحیح ہے۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ وہ کتاب نازل کرے گا جو ضروریات دین پر مشتمل ہوگی۔

"فلماانزل ھذہ الآیات قال تلک الآیات الموعودۃ ھی التی نتلوھاعلیک بالحق"

تو جب ان آیات کو نازل کیا گیا تو یہ فرمایا گیا کہ وہ آیات جن کا وعدہ کیا گیا وہ ہم آپ پر حق سے تلاوت کرر ہے ہیں، اس صورت میں اشارہ بعید اپنے حقیقی معنی پر مشتمل ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

"(نتلوھا)جملۃ حالیۃ من الآیات (علیک)ای نقرأھا علیک یامحمد بواسطۃ جبریل"

''ہم پر وہ (آیتیں) پڑھتے ہیں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اے محمد ﷺ ہم آپ پر جبرائیل کے واسطہ سے پڑھتے ہیں۔ (روح البیان)

﴿وَمَا اللّٰہُ یُرِیۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعٰلَمِیۡنَ﴾ ''اور نہیں اللہ ارادہ فرماتا ظلم کا جہان والوں پر''

یعنی اللہ تعالیٰ جہان والوں میں سے کسی ایک پر ظلم کرنے کا ارادہ نہیں فرماتا۔

اللہ تعالیٰ کے ظلم نہ فرمانے کا مطلب:

والمعنی ان اللہ لایریدان ینقص ثواب من عمل خیربفضلہ ولا ان یزید فی عذاب العاصی علی قدر جریمتہ "

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے جس نے نیکی کا عمل کیا، اللہ تعالیٰ اس کے ثواب کو کم کرنے کا ارادہ فرماتا، کہ اس پر ظلم ہو اور نہ ہی عاصی (گنہگار) کے گناہوں سے زیادہ اسے عذاب دیتا ہے، کہ اس پر ظلم ہو۔

"والکفر باللہ تعالی اعظم الخطایالاذنب فوقہ فیعذب بالنار المخلدۃ عذابالایکون عذاب فوقہ جزاء وفاقا"

اللہ تعالیٰ سے کفر تمام گناہوں سے عظیم گناہ ہے، اس سے بڑھ کر کوئی اور عظیم گناہ نہیں، اس لئے اس کا عذاب بھی جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہنے کا عذاب ہوگا، یہ عذاب بھی وہ عذاب ہے جس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں، لھذا جرم کے موافق کامل جزاء دی جائے گی۔ (ماخوذ از مظہری)

"وظلـمـانکرۃ فی سیاق النفی فیعم جمیع انواع الظلم والعالمین جمع محلی باللام

فیفید العموم ایضا،فالمعنی مایرید شیأمن الظلم لاحد من خلقه ‘‘

آیۃ کریمہ میں ظلما نکرہ ہے جونفی کے تحت واقع ہے اس لئے وہ عموم کا فائدہ دے رہا ہے، جس کا مطلب ہے تمام قسم کے مظالم،اور عالمین پر الف لام استغراق کیلئے جوعموم پر دلالت کررہی ہے،اب مطلب یہ ہوگیا،اور تمام جہانوں میں اپنی مخلوق کے کسی ایک فرد پر کسی قسم کا کوئی ایک بھی ظلم نہیں کرتا۔

’’کیف والظلم وضع الشئی فی غیر موضعه والتصرف فی ملک الغیر وهو تعالی انما یتصرف فی ملک نفسه ‘‘

رب تعالی کیسے ظلم کرسکتا ہے؟ظلم تو یہ ہے کہ ایک چیز کو جہاں رکھنا ہے وہاں نہ رکھا جائے بلکہ اس جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دیا جائے ، وہ غیر کے ملک میں تصرف نہیں کرتا ،اور وہ کسی چیز کو غیر محل میں بھی نہیں رکھتا ، بلکہ وہ تو ہر چیز کو اس کے محل میں رکھتا ہے،ایک چیز کو غیر محل میں رکھنے کی دو وجہ ہوتی ہیں کبھی مستحق کو اس کا حق نہ دینا ،اور کبھی وہ کام کرنا جس سے منع کیا گیا ہے۔

’’وکل ذلک لایتصور فی حقه تعالی فیستحیل تصور الظلم من الله تعالی فانه لاحق علیه لاحد فیظلم بنقصه ’’ولا یمنع عن شئی فیظلم بفعله بل هو المالک علی الاطلاق یفعل مایشاء بقدرته وبحکم مایرید بحکمته فکل ماجاء منه فهو محض حکمة وعدل ‘‘

اللہ تعالی کے حق میں ان میں سے کوئی صورت بھی نہیں پائی جاسکتی ،لھذا اللہ تعالی سے ظلم کرنے کا تصور بھی محال ہے، کیونکہ اللہ تعالی پر کسی کا کوئی حق نہیں ،اس پر کوئی چیز واجب نہیں کہ وہ اس میں کمی کر کے کسی پر ظلم کرے،اور رب تعالی کو کسی چیز سے منع نہیں کیا گیا کہ وہ اس پر عمل کر کے ظلم کرے ، بلکہ وہ مطلقا مالک ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے جو چاہے وہ کرتا ہے،اور اپنی حکمت کے مطابق جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے،رب تعالی کا ہر کام حکمت اور عدل پر مبنی ہے۔ (شیخ زادہ)

سؤال : رب تعالی کے ارشاد گرامی ﴿وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعَالَمِيْنَ﴾ کا تم کیا مطلب لیتے ہو یا تم کہو گے ’’هو لایرید ان یظلمهم ‘‘وہ بندوں پر ظلم کرنے کا ارادہ نہیں فرماتا ،اور یا تمہارا موقف یہ ہوگا ’’انه لایرید منهم ان یظلم بعضهم بعضا‘‘ وہ یہ نہیں چاہتا کہ بعض بندے دوسرے بعض بندوں پر ظلم کریں ، یہ دونوں مطلب درست نظر نہیں آتے ، پہلا معنی لینا اس لئے درست نہیں کہ تمہارا مذہب یہ ہے

’’انه تعالی لوعذب البرئی عن الذنب باشدالعذاب لم یکن ظالما ، بل کان عادلا لان الظلم تصرف فی ملک الغیر وهو تعالی انما یتصرف فی ملک نفسه فاستحال کونه ظالما ‘‘

کہ اللہ تعالی اگر گناہ سے بری شخص کو شدید عذاب دے تو یہ ظلم نہیں ہوگا بلکہ عدل ہوگا ، کیونکہ ظلم تو اس

وقت ہوتا ہے جب غیر کی ملکیت میں تصرف کیا جائے، اللہ تعالیٰ تو اپنی ملکیت میں تصرف فرماتا ہے لھذا اسے ظلم نہیں کہا جاسکتا۔

اگر تم دوسرا مطلب لو تو وہ بھی درست نظر نہیں آتا، اسلئے کہ تمہارا مذہب یہ ہے "کل افعال العباد ارادۃ اللہ وتکوینہ علی قولکم" کہ بندوں کے تمام افعال اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے اور اس کے موجود کرنے سے پائی جاتے ہیں، تو یہ کہنا کس طرح درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں ارادہ فرماتا جہان والوں پر ظلم کا، جب کہ اس کے بندے ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

جواب: آیۃ کریمہ کا صحیح مطلب تو وہی ہے جو تفسیر مظہری سے بیان کیا جاچکا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کسی کے نیک عمل کا ثواب کم کرنے کا ارادہ نہیں فرماتا، اور کسی گنہگار کو اس کے گناہوں سے زیادہ عذاب دینے کا ارادہ نہیں فرماتا۔ اس سے ظلم نہ کرنے کا مفہوم واضح طور پر سمجھ آگیا، تاہم یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ اگر گناہوں سے بری شخص کو شدید عذاب دے تو یہ ظلم نہیں کہ وہ اپنے ملک میں تصرف کررہا ہے، یہ بھی درست ہے کہ حقیقت میں یہ ظلم ہی نہیں تو اعتراض بھی درست نہیں۔

جہاں تک بندوں کا بعض کا بعض پر ظلم کرنے کا رب ارادہ نہیں فرماتا، اس صورت میں ارادہ کا مجازی معنی پسند کرنا لےلیا جائے تو مسئلہ واضح ہوجاتا ہے کہ رب تعالیٰ بندوں کا ایک دوسرے پر ظلم کرنا پسند نہیں فرماتا، لیکن بندوں کو افعال کا اختیار دیا ہوا ہے وہ اپنے اختیار سے ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں۔ (راقم)

سؤال: اللہ تعالیٰ نے اپنی مدح بیان کی کہ وہ "جہان والوں پر ظلم کا ارادہ نہیں فرماتا" یہ مدح کس طرح درست ہے، مدح تو اس وقت ہوتی ہے جب ایک چیز کا پایا جانا ممکن ہو تو وہ کام نہ کیا جائے "الظلم منہ محال علی مذھبکم فامتنع التمدح بہ" جب اللہ تعالیٰ کا ظلم کرنا تمہارے مذہب میں محال ہے تو اس کی نفی کیسے ہے؟

پہلا جواب: یہ کوئی قانون نہیں کہ ایک چیز ممکن ہو پھر وہ اللہ تعالیٰ سے نہ پائی جائے تو وہ قابل مدح ہے یہ قانون بندوں کے لحاظ پر ہے، اللہ تعالیٰ کی شان کے جو لائق ہی نہ ہو اور محال ہو اس کا نہ پایا جانا بھی قابل مدح ہے، رب تعالیٰ نے اپنی مدح بیان فرمائی ﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾ اسے نہیں پکڑتی اونگھ اور نیند، یعنی وہ اونگھ اور نیند سے پاک ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی مدح فرمائی ﴿وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ﴾ وہ کھلاتا ہے، اسے نہیں کھلایا جاتا "ولا یلزم من ذلک صحۃ النوم والاکل علیہ فکذاھھنا" اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسے نیند کا آنا صحیح ہے لیکن اسے نیند آتی نہیں، اور یہ کہنا بھی درست نہیں کہ وہ کھا سکتا لیکن کھاتا نہیں، اس آیۃ کریمہ میں بھی یہی مطلب ہے کہ ظلم اس

سے محال ہوتا، ظلم کا اس سے محال ہونا ہی قابل مدح ہے۔

دوسرا جواب: الثانی انه تعالی ان عذب من لم یکن مستحقاللعذاب فهو و ان لم یکن ظلمافی نفسه لکنه فی صورة الظلم وقد یطلق اسم احدالمتشابهین علی الآخر کقوله "وجزاء سیئة مثلها"

اگر اللہ تعالی اس شخص کو عذاب دے جو مستحق عذاب نہیں تو یہ حقیقت میں ظلم تو نہیں، لیکن بظاہر ظلم نظر آتا ہے، تو اس لحاظ پر مدح کرنا صحیح ہے، دو متشابہ چیزوں کا ایک دوسرے پر اطلاق درست ہے، جس طرح رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿وَجَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ برائی کا بدلہ اسی کی مثل برا ہے، حالانکہ برائی کا بدلہ حقیقت میں برا نہیں بلکہ عدل وانصاف ہے، لیکن بظاہر برا نظر آتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

فائدہ: "والعدل من جزاء المحسن والمسئی" اچھے کام کرنے والے کو اس کے مطابق جزاء دینا اور برے کام کرنے والے کو اس کے مطابق جزاء دینا عدل وانصاف ہے۔ (مدارک)

تنبیہ: اس سے پہلے کافروں کے چہرے سیاہ ہو جانے اور عذاب میں مبتلاء ہونے کا ذکر کیا تو بظاہر وہم ہوتا تھا کہ شاید یہ عذاب دینا ظلم ہوگا تو ظلم کی نفی کر کے اسے رد کر دیا اور یہ بتایا۔

"انماوقعوا فیماوقعوافیه بسبب افعالهم المنکرة وانه لایظلم احدامن خلقه"

کہ ان لوگوں نے برے افعال یعنی کفر کی وجہ سے اپنے آپ کو عذاب میں واقع کر دیا، ورنہ اللہ تعالی اپنی مخلوق میں سے کسی ایک پر بھی ظلم نہیں کرتا۔ (خازن)

گذشتہ سے پیوستہ:

- واخرج ابو نعیم عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ الغبار فی سبیل اللہ اسفار الوجوه یوم القیامة"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالی کی راہ میں غبار قیامت کے دن چہرے کو روشن کر دے گا۔ (درمنثور)

یہ بھی واضح ہے کہ اللہ کی راہ سے مراد جہاد ہے، اور حج کرنا بھی "فی سبیل الله" میں آتا ہے، اور دینی طلباء کرام کا تعلیم حاصل کرنے کیلئے گھر سے باہر جانا بھی "فی سبیل الله" میں داخل ہے۔ (راقم)

- واخرج الطبرانی عن ابی الدرداء عن النبی ﷺ قال لیس من عبد یقول لااله الاالله مائة مرة الابعثه الله یوم القیامة ووجهه کالقمر لیلة البدر"

حضرت ابوالدرداء ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایسا بندہ نہیں، جس نے لا الہ الا اللہ سومرتبہ پڑھا مگر وہ جنت میں جائے گا۔ (درمنثور)

زیر بحث آیۃ کے متعلق:

❁ روی ابو ذر ان النبی ﷺ قال فیمایروی عن ربه عزوجل "انه قال یاعبادی انی حرمت الظلم علی نفسی وجعلته بینکم محرمافلا تظالموا" (بخاری ومسلم وترمذی وابن ماجة)

حضرت ابوذر ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ اللہ تعالی کا ارشاد (حدیث قدسی) بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی فرماتا ہے اے میرے بندو میں نے اپنے نفس پر ظلم حرام کردیا ہے اور تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام کردیا ہے، تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ (منقول از البحرالمحیط)

❁ وفی الحدیث الصحیح ایضاان رسول اللہ ﷺ قال ان اللہ لایظلم المؤمن حسنة یعطی بها فی الدنیاویجزی بهافی الآخرة ،واماالکافر فیطعم بحسناته فی الدنیاما عمل لله بهافاذاافضی الی الآخرة لم یکن له حسنة یجزی بها" (مسلم،مسند احمد)

حدیث صحیح میں ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بیشک اللہ تعالی مؤمن پر ظلم نہیں فرماتا اسے دنیا میں نیکی کرنے کی توفیق عطاء فرماتا ہے اور اس کی جزاء آخرت میں عطاء فرمائے گا، لیکن کافر اپنی اچھائیوں کے بدلے دنیا میں کھالیتا ہے، اس کا عمل اللہ کی رضاء کیلئے نہیں ہوتا، جب وہ قیامت میں پہنچے گا تو اس کے پاس کوئی نیکی نہیں ہوگی کہ اسے جزاء دی جائے۔ (منقول از البحرالمحیط)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَلِلّٰهِ مَافِی السَّمَاوَاتِ وَمَافِی الْاَرْضِ وَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُo (آیۃ نمبر ۱۰۹)

(1) اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کی طرف سب کاموں کی رجوع ہے۔ (کنزالایمان)

(2) اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹایا جاتا ہے تمام کاموں کو۔ (نجوم الفرقان)

"ولله" جار مجرور کو پہلے ذکر کیا جو حصر پر دلالت کررہا ہے، یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالی "وحده لا شریک له" ہے اس کا کوئی شریک نہیں، تمام مخلوق اسی کی ملکیت میں ہے، موت دینا اور حیات عطا کرنا اسی کے قبضہ قدرت میں ہے،

ثواب دینا اور عذاب دینا اسی کے قبضہ قدرت میں ہے، لفظ "ما" ذکر کیا یا تو غیر ذوالعقول کی تعداد میں کثرت کی وجہ سے ان کو غالب کیا، یا اس سے یہ بتایا گیا ہے کہ رب تعالیٰ کی عظمت کے مقابل مخلوق کو پستی حاصل ہے، (اگر چہ مخلوق میں اولوالعزم حضرات انبیاء کرام ہیں اور سید الکائنات حضرت محمد ﷺ ہیں)

"والی اللہ"ای الی حکمۃ وقضائہ لاالی غیرہ شرکۃ واستقلالا" (ترجع الامور) ای امورھم فیجازی کلامنھم بماوعدلہ واو عدہ من غیر دخل فی ذلک لاحدقط"

اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی قضاء (اس کے فیصلہ) کی طرف تمام امور لوٹائے جاتے ہیں، وہ ہر ایک کو اپنے وعدہ کے مطابق جزاء عطاء کرے گا، اور اپنی وعید (ڈرانے) کے مطابق عذاب دے گا، کسی اور کو اس میں کوئی دخل حاصل نہیں ہوگا، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے حکم وقضاء میں کوئی شریک ہے، اور نہ ہی رب کے بغیر کسی اور کو یہ حاصل ہے کہ امور اس کی طرف لوٹائے جائیں۔ (روح البیان)

سوال: "رجوع" کا تو یہ مطلب ہوتا ہے کہ کوئی چیز چلی جائے پھر لوٹ کر آجائے، رب تعالیٰ کی طرف کاموں کا لوٹنا کس طرح صحیح ہے، کہ کام پہلے چلے جائیں پھر لوٹ آئیں۔

جواب: قلنا کانت کالذاھبۃ بھلا کھا ثم اعادتھالان فی الدنیایملک بعض الخلق بالتدبیر وفی القیامۃ یکون کل ذلک اللہ تعالیٰ"

جب تمام چیزوں میں ایک مرتبہ فنا ہے، پھر ان کو لوٹانا "رجوع" ہی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ دنیا میں مخلوق کو بعض چیزوں کی تدبیر کی وجہ سے ملکیت حاصل ہوتی ہے، لیکن قیامت میں صرف اللہ تعالیٰ کو ملکیت حاصل ہوگی، "اللہ تعالیٰ کی طرف تمام کاموں کے لوٹائے جانے کا یہی مطلب ہے" (ماخوذ از روح البیان)

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کافروں اور مومنوں کے احوال بیان فرمائے کہ مؤمنوں پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے گا اور کافروں کو عذاب دے گا" "نبہ علی ان التصرف ھو فیمایملکہ، فلا اعتراض علیہ تعالیٰ" اب اس آیۃ کریمہ میں اس پر تنبیہ کی گئی کہ اللہ تعالیٰ اپنے ملکیت میں تصرف فرماتا ہے، اس پر کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں، اس آیہ کریمہ سے پہلی آیۃ کریمہ کی توثیق بھی ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ملک میں وسعت پائی گئی، تمام امور اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں "فھو غنی عن الظلم" جو اپنی وسیع ملکیت میں تصرف کرتا ہے وہ ظلم سے مستغنی ہے، جو

غیر کے ملک میں تصرف کرے ظالم تو وہ ہوتا ہے، اپنی ملکیت میں تصرف کرنا ظلم نہیں۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

دینی طلباء کرام کیلئے بہت مفید:

آیات کریمہ میں یعنی "تبیض" اور "تسود" میں، اور اسودت اور ابیضت میں، اور "اَکَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ" میں اور "بالحق" اور "وظلما" میں طباق پایا گیا ہے، یہ بھی خیال رہے کہ "طباق" "مطابقۃ" "تضاد" ایک معنی میں علم بدیع میں استعمال کئے گئے ہیں "وھی الجمع بین المتضادین" دو متضاد چیزوں کو ایک جگہ جمع کرنا مطابقۃ اور طباق وتضاد ہے۔

اور "اکفرتم" اور "تکفرون" میں تجنیس تماثل پائی گئی ہے، جب دو لفظ ایک نوع میں متفق ہوں، دونوں اسم ہوں، یا دونوں فعل ہوں یا دونوں حرف ہوں تو اسے تجنیس مماثل کہتے ہیں، یہاں بھی ایک مادہ سے دو فعل لئے ہوئے ہیں "اکفرتم" اور "تکفرون" ان دونوں میں تجنیس تماثل ہے، اور ﴿فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِیْهَا خَالِدُوْنَ﴾ میں اسم ظاہر کی تاکید مضمر سے کی گئی ہے، یعنی رحمۃ کی طرف ھا ضمیر لوٹ رہی ہے۔ پھر لفظ "الله" کا تکرار متغائر المعانی (جن کے مختلف معانی ہیں ان) میں استعمال جو زیادتی حسن پر دلالت کرتا ہے۔

"والمعروف فی لسان العرب اذا اختلف الجمل اعادت المظھر لاالمضمر"

عرب کی زبان میں یہ مشہور ہے کہ جب جملے مختلف (معانی پر دلالت کر رہے) ہوں تو اسم ظاہر کو لوٹایا جاتا، ضمیر کو نہیں لایا جاتا اس میں تفخیم شان پائی گئی ہے، اور خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی کی تعظیم پائی گئی ہے۔ (ماخوذ از البحر المحیط مختصر المعانی)

زیر بحث آیۃ کریمہ کے متعلق کچھ مزید بحثیں:

احتج اصحابنا لقوله تعالیٰ "ولله مافی السموات ومافی الارض" علی کونه خالقا لاعمال العباد"

اہل سنت نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلِلّٰهِ مَافِی السَّمَاوَاتِ وَمَافِی الْاَرْضِ﴾ سے یہ دلیل حاصل کی کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے تمام افعال کا خالق ہے، خواہ وہ اعمال اچھے ہوں یا برے، بندوں کے افعال بھی جب زمین وآسمان سے باہر نہیں تو وہ واضح ہو گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ "**فدلت هذه الآیة علی انه خالق لافعال العباد**" تو یہ آیۃ دلالت کر رہی ہے کہ وہ بندوں کے تمام افعال کا خالق ہے۔

معتزلہ کا چونکہ مذہب یہ ہے کہ بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں، تو اسلئے

"اجاب الجبائی عنه بان قوله (لله) اضافة ملک لااضافة فعل الاتری انه یقال "هذاالبناء لفلان فیریدون انه مملوکه لاانه مفعوله "

جبائی معتزلی نے اہل سنت و جماعت کی دلیل کا جواب یہ دیا کہ ارشاد باری تعالیٰ میں " لله " میں نسبت ملک کی طرف ہے، فعل کی طرف نسبت نہیں، عام طور پر بیان کیا جاتا ہے، یہ مکان فلاں کا ہے تو اس سے مراد یہ لی جاتی ہے ، کہ یہ مکان فلاں کی ملکیت میں ہے، اور یہ معنی نہیں کہ فلاں نے یہ مکان خود تعمیر کیا ہے، تعمیر تو معماروں نے کیا ہے، جبائی نے اور یہ دلیل قائم کی ہے کہ آیۃ کریمہ میں مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت اور اپنی مدح بیان کی اگر یہ کہا جائے کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو بندوں کے افعال تو برے بھی ہوتے ہیں، برے افعال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کس طرح قابل مدح ہے۔

اور دلیل جبائی نے یہ پیش کی ہے کہ ﴿ مَافِي السَّمَاوَاتِ وَمَافِي الْأَرْضِ ﴾ سے یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ یہاں ان چیزوں کا ذکر ہے جو آسمانوں اور زمین کا مظروف بن سکیں (یعنی زمین و آسمان میں سما سکیں)

"وذلک من صفات الاجسام لامن صفات الافعال التی هی اعراض "

یہ صفات اجسام سے ہے نہ کہ صفات افعال سے، کیونکہ یہ اعراض ہیں، اعراض بغیر معروض کے، صفت بغیر موصوف کے نہیں پائی جاتی۔

ہمارے اصحاب نے جواب یہ دیا ہے:

"ان هذه الاضافة اضافة الفعل بدليل ان القادر على القبيح والحسن "

کہ یہ کہنا غلط ہے کہ یہ اضافت فعل نہیں، بلکہ یہاں اضافۃ فعل پائی گئی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اچھی اور بری تمام چیزوں کی تخلیق کی قدرت ہے، اور یہ بھی واضح ہے کہ بندوں کے برے افعال رب تعالیٰ کی طرف بحیثیت تخلیق کے منسوب ہیں، برے افعال کی تخلیق بری نہیں بلکہ برے افعال کا کسب برا ہے۔ بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کی قدرت سے تخلیق ہیں اور بندوں کے اسباب جو انکو معرض وجود میں لاتے ہیں وہ امور داعیہ کہلاتے ہیں۔

"ولبت ان مجموع القدرة والداعية بخلق الله تعالى لبت ان فعل العبد مستند الى الله خلقاوتكوبنابواسطة فعل السبب"

ثابت ہو گیا کہ بیشک انسان کی مجموعی قدرت اور امور داعیہ کا اللہ تعالیٰ خالق ہے، لھذا بندے کے افعال اسباب کے ذریعے پائے جاتے ہیں، لیکن حقیقت میں ان کا خالق اور انکو معرض وجود میں لانے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

فلاسفہ کا مذہب:

اللہ تعالیٰ کا ارشادگرامی ﴿وَلِلّٰهِ مَافِي السَّمَاوَاتِ وَمَافِي الْاَرْضِ﴾ فلاسفہ نے یہ گمان کیا ہے کہ "مافی السماوات" کو پہلے ذکر کیا گیا، اور " مافی الارض "کو بعد میں، اسی سے پتہ چل گیا کہ " ان احوال السماویة اسباب للاحوال الارضیة فقدم السبب علی المسبب " سماوی احوال سبب ہیں ارضی احوال کا، اور سبب مسبب سے پہلے ہوتا ہے اسی وجہ سے ما فی السماوات کو پہلے ذکر کیا گیا۔

"وھذایدل علی ان جمیع الاحوال الارضیة مستندة الی الاحوال السماویة ولا شک ان الاحوال السماویة مستندة الی خلق اللہ وتکوینہ فیکون الجبر لازما"

یہ قول اس پر دلالت کر رہا ہے کہ تمام احوال ارضیہ منسوب ہیں احوال سماویہ کی طرف، اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ احوال سماویہ اللہ کی خلق اور تکوین کی طرف منسوب ہیں، فلاسفہ کے اس قول سے جبریہ فرقہ کا مدعیٰ ثابت ہوگا کہ انسان احوال سماویہ میں اختیار نہیں رکھتا اور حقیقیطور پر مراد احوال سماویہ ہی ہیں، اس طرح انسان کا مجبور محض ہونا لازم آئے گا۔
(ماخوذ از کبیر)

وہی اول وہی آخر:

﴿وَلِلّٰهِ مَافِي السَّمَاوَاتِ وَمَافِي الْاَرْضِ﴾ میں رب تعالیٰ نے اپنا اسم گرامی " اللہ " ذکر فرمایا، پھر ﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ میں اسم گرامی " اللہ "ذکر فرمایا۔

"والغرض منہ تاکید التعظیم والمقصود ان منہ مبدأالمخلوقات والیہ معادھم "

اس سے غرض تاکید تعظیم ہے، اور مقصود اس سے یہ بیان کرنا ہے کہ بیشک اسی سے مخلوقات کی ابتداء ہے، اور اسی کی طرف انتہاء ہے۔

فقولہ (وللہ مافی السماوات ومافی الارض)اشارة الی انہ سبحانہ ھوالاول وقولہ (والی اللہ ترجع الامور)اشارة الی انہ "ھو الآخر"

اور اللہ تعالیٰ کے ارشادگرامی ﴿وَلِلّٰهِ مَافِي السَّمَاوَاتِ وَمَافِي الْاَرْضِ﴾ سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اول ہے، اور ﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ سے اس طرف اشارہ ہے کہ وہی آخر ہے۔

وذلک یدل علی احاطة حکمہ وتصرفہ وتدبیرہ باولھم وآخرھم وان الاسباب والمسببات منتسبة الیہ وان الحاجات منقطعة عندہ "

اوراس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ اللہ کا حکم اوراس کا تصرف اوراس کا تصرف اوراس کی تدبیر تمام اول وآخر کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، کیونکہ ظاہری اسباب اور مسببات تمام اسی کی طرف منسوب ہیں، اور تمام حاجات اسی پر جا کر ختم ہوتی ہیں۔

فائدہ: ظاہری اسباب اور ہیں، حقیقی سبب اللہ تعالیٰ ہے، نماز کا سبب ظاہری وقت ہے، اور روزے کا سبب ظاہری رمضان کا موجود ہونا ہے، اور حقیقی سبب تمام چیزوں کا اللہ تعالیٰ ہے اسی طرح تمام حاجتیں اللہ تعالیٰ پر جا کر ختم ہوتی ہیں، حقیقی طور پر حاجت رواء وہی ہے، البتہ اس نے خود ہی وسائل بنا رکھے ہیں، بیماری سے نجات دینے کا ذریعہ طبیب کو بنادیا، اور کبھی کسی نیک کی دعاء سے حاجت پوری ہوگئی، کبھی کسی نیک شخص سے دم کرالیا تو شفاء حاصل ہوگئی، کبھی کسی نیک شخص کے وسیلہ سے دعاء کرلی تو وہ دعاء مقبول ہوگئی، یہ سب مجازی طور پر حاجت روا ہیں۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

کلمة الی فی قوله "والی الله ترجع الامور" لاتدل علی کونه تعالی فی مکان وجهة بل المراد ان رجوع الخلق الی موضع لاینفذفیه حکم احد الاحکمه ولایجری فیه قضاء احدالاقضاؤه"

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ﴾ میں کلمہ "الی" اس پر دلالت نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ کسی مکان یا کسی جہت میں ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ مخلوق نے وہاں لوٹنا ہے جہاں کسی ایک کا حکم نہیں چلے گا صرف اللہ تعالیٰ کا ہی حکم ہوگا، کسی ایک کا وہاں فیصلہ نہیں ہوگا صرف اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوگا۔ (کبیر)

طلباء کرام کے فائدہ کیلئے ایک اور مسئلہ:

ترجع شامی وحمزة وعلی کان عبارة عن وجودالشئی فی زمان ماض علی سبیل الابهام ولا دلیل فیه علی عدم سابق ولا علی انقطاع طارئی"

شامی اور حمزہ اور علی رحمهم الله نے ایک اعتراض کا جواب دیا ہے، وہ اعتراض یہ تھا کہ ایک چیز پہلے موجود ہو، پھر اس کی طرف لوٹے تو اسے رجوع کہا جائے گا، جب کوئی چیز پہلے موجود ہی نہ ہو تو لوٹانے کا کیا مطلب؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اگر کوئی چیز زمانہ ماضی میں مبہم طور پر بھی پائی جائے تو اس کیلئے مراجعت کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے، اس پر کوئی دلیل نہیں کہ تمام امور پہلے معدوم تھے، یا ان پر انقطاع جاری ہوگیا۔

(ماخوذ از مدارک التنزیل للنسفی المعروف بالنسفی)

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُوْنَ O (آیۃ نمبر ۱۱۰)

(1) تم بہتر ہو ان سب امتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو، اور اگر کتابی ایمان لاتے تو ان کا بھلا تھا ان میں کچھ مسلمان ہیں اور زیادہ کافر۔ (کنز الایمان)

(2) تم بہتر ہو تمام امتوں سے جو ظاہر کی گئیں لوگوں کیلئے، تم حکم دیتے ہو اچھے کاموں کا، اور تم منع کرتے ہو برے کاموں سے، اور تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر، اور اگر ایمان لاتے اہل کتاب تو بہتر ہوتا ان کیلئے، ان میں سے کوئی مؤمن ہیں، اور اکثر ان میں سے حد سے تجاوز کرنے والے کافر۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلے آیات میں مؤمنوں کو بعض چیزوں کا حکم دیا، اور بعض سے منع کیا، اور اہل کتاب کی طرح سرکش اور نافرمان ہونے سے منع فرمایا، اس کے بعد مطیع لوگوں کے ثواب کا ذکر کیا اور کافروں کے عذاب کا ذکر کیا۔ تمام آیات میں غرض یہ ہے کہ مؤمنین و مکلفین کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے احکام کے تسلیم کرنے کا حکم دیا گیا، اور سرکشی اور معصیت سے منع کیا گیا، اس کے بعد اس آیۃ کریمہ میں ایک اور طریقہ سے مؤمنین کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر ابھارا گیا ہے۔

۞ ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ﴾ والمعنى انكم كنتم فى اللوح المحفوظ خير الامم وافضلهم، فاللائق بهذا ان لاتبطلوا على انفسكم هذه الفضيلة وان لاتزيلوا عن انفسكم هذه الخصلة المحمودة وان تكونوا منقادين مطيعين فى كل مايتوجه عليكم من التكاليف"

تم تمام امتوں سے بہتر ہو، یعنی لوح محفوظ میں لکھ دیا گیا ہے کہ تم تمام امتوں سے بہتر اور افضل ہو، لائق یہی ہے کہ تم اپنے اعمال کو ترک کر کے اپنے نفسوں کی اس فضیلت کو باطل نہ کر دو، اور نہ ہی اپنے نفسوں سے یہ اچھا طریقہ زائل کرو، جو بھی تمہیں تکالیف دی جاتی ہیں یعنی جن کاموں سے تمہیں روکا گیا ان سے رک جاؤ، اور جن کاموں کا

تمہیں حکم دیا گیا ان پر عمل کرو، اللہ تعالی کے مطیع اور فرمانبردار بن جاؤ، اور ماقبل سے تعلق کی دوسری وجہ یہ ہے کہ رب تعالی نے اشقیاء (بدبختوں) کا کامل حال بیان فرمایا۔ ﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ﴾ "لیکن وہ جن کے چہرے سیاہ ہیں۔ پھر نیک بختوں کا کامل حال بیان فرمایا۔ ﴿وَاَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ﴾ " لیکن وہ جن کے چہرے سفید ہیں۔ اس کے بعد بدبختوں کی وعید کا سبب بیان فرمایا۔ ﴿وَمَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ "اور اللہ نہیں ارادہ فرماتا ظلم کرنے کا جہاں والوں پر"

" یعنی انهم انما استحقوا ذلک بافعالهم القبیحة "

یعنی وہ اپنے برے افعال کی وجہ سے اس عذاب کے مستحق ہوئے ہیں، اللہ تعالی کا ان پر کوئی ظلم نہیں۔

ثم نبه فی هذه الآیة علی ماهو السبب لوعد السعداء بقوله (کنتم خیر امة اخرجت للناس) ای تلک السعادات والکمالات والکرامات انما فازوا بها فی الآخرة لانهم کانوا فی الدنیا "خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ"

اس کے بعد اس آیۃ کریمہ میں اس پر تنبیہ کی گئی کہ اے نیک بختو تمہارے ساتھ وعدہ کا تعلق اس سے ہے کہ تم تمام امتوں سے بہتر ہو جو لوگوں کیلئے ظاہر کی گئیں، یہ نیک بختی اور کمال اور کرامت تمہیں آخرت میں حاصل ہونی ہے، جس کی وجہ سے تمہیں اعلی درجہ کی کامیابی حاصل ہوگی، کیونکہ دنیا میں تم تمام امتوں سے بہتر ہو۔ (مفاتیح الغیب المعروف بالکبیر)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

لفظ "کان" کبھی تامہ ہوتا ہے، کبھی ناقصہ، اور کبھی زائدہ، اور کبھی "صار" کے معنی میں ہوتا ہے، یہاں تمام احتمال پائے گئے ہیں۔

پہلا احتمال: جب ﴿کُنْتُمْ﴾ میں "کان" تامہ ہو تو اس صورت میں "کان" بمعنی وقوع اور حدوث کے ہوگا، اور وہ خبر کا محتاج نہیں ہوگا "والمعنی حدثتم خیر امة ووجدتم خیر امة وخلقتم خیر امة" تمہیں سب امتوں سے بہتر امت بنایا گیا، تمہیں سب امتوں سے بہتر امت پایا گیا، اور تمہیں سب امتوں سے بہتر امت پیدا کیا گیا، اس ترکیب میں "خیر امة" میں حال واقع ہوگا، اس پر ہی جمہور مفسرین کرام ہیں۔

دوسرا احتمال: دوسرا احتمال یہ ہے کہ "کان" ناقصہ ہو، لیکن اس پر یہ اعتراض ہوگا کہ اس سے تو پتہ چلے گا کہ یہ معنی ہوگا "انهم کانوا موصوفین بهذه الصفة وانهم مابقوا الآن علیها" کہ وہ پہلے اس صفت سے

متصف تھے اب اس صفت پر باقی نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ کان ناقصہ ہمیشہ انقطاع پر دلالت نہیں کرتا، بلکہ کبھی دوام پر دلالت کرتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے ﴿اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا﴾ یہاں کان ناقصہ ہے لیکن اللہ تعالی کا ہمیشہ کیلئے غفار ہونا ثابت ہے یہ مطلب نہیں کہ وہ پہلے غفار تھا اور اب معاذ اللہ نہیں ہے اور اسی طرح ﴿وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ میں کان دوام پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ ہمیشہ کیلئے "غَفُوْرٌ" اور "رَحِيْمٌ" ہے۔

کان ناقصہ کی صورت میں معانی میں چند احتمال:

(۱) احدھا کنتم فی علم اللہ خیر امة " ان میں سے ایک معنی یہ ہے کہ تم اللہ تعالی کے علم میں تمام امتوں سے بہتر امت ہو۔

(۲) وثانیھا کنتم فی الامم الذین کانوا قبلکم مذکورین بانکم خیر امة " دوسرا معنی یہ ہے کہ تم سے پہلے جو امتیں گذر گئیں جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے بیشک تم ان تمام سے بہتر امت ہو۔

(۳) وثالثھا کنتم فی اللوح المحفوظ موصوفین بانکم خیر امة " تیسرا معنی یہ ہے کہ لوح محفوظ میں لکھ دیا گیا ہے کہ تم "خیر امة" کی صفت سے متصف ہو۔

(۴) ورابعھا کنتم منذ آمنتم خیر امة اخرجت للناس" چوتھا معنی یہ ہے کہ تم نے جب سے ایمان لایا ہے اس وقت سے تم تمام امتوں سے بہتر ہو، جو امتیں لوگوں پر ظاہر کی گئیں۔

(۵) پانچواں معنی ابو مسلم نے بیان کیا کہ "كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ" پیچھے لایا گیا ﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ﴾ کے تو جب ان کو جنت میں ہمیشہ رہنے کا حکم دیا جائے گا تو اس وقت ان کو کہا جائے گا۔

"کنتم فی دنیاکم خیر امة فاستحققتم ما انتم فیه من الرحمة وبیاض الوجه بسببه"

تم دنیا میں تمام امتوں سے بہتر امت تھے، اسی وجہ سے تم رحمت اور چہرے کی سفیدی کے مستحق ہو۔

(۶) کنتم مذ آمنتم خیر امة تنبیھا علی انھم کانوا موصوفین بھذہ الصفة مذ کانوا"

چھٹا معنی یہ ہے کہ تم نے جب ایمان لایا اس وقت سے تم تمام امتوں سے افضل ہو، اسی سے اس کی طرف تنبیہ کر دی گئی کہ پہلی امتوں کے وہی لوگ بہتر تھے جو ایمان والے تھے، لیکن تم ایمان لانے کے بعد ان سے افضل ہو گئے (کافر کبھی بہتر نہیں ہو سکتا، کافروں کو بہتر کہنے والے اسلام کے باغی ہیں)

(۷) قوله تعالی "کنتم" مخصوص بقوم معینین من اصحاب الرسول ﷺ وھم السابقون

الاولون ومن صنع مثل ماصنعوا"

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی " کنتم "معین لوگوں سے خاص ہے، وہ ہیں نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کیونکہ وہی سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں، پھر البتہ آیۃ کریمہ بعد میں آنے والے ان لوگوں کو شامل ہے جن کے اعمال صحابہ کرام کے اعمال کی طرح ہیں۔ (ماخوذ از کبیر بحذف وتقدیم وتاخیر)

راقم کو یہی آخری معنی پسند ہے، کیونکہ افضلیت کے حقدار صحابہ کرام یا ان کے متبعین۔

تیسرا احتمال: تیسرا احتمال یہ کہ "کان" زائدہ ہو، زائدہ ہونے کی صورت میں "کان" کو ذکر کیا جائے، یا پوشیدہ رکھا جائے معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا، البتہ اس قول کو ابن الانباری رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے، کیونکہ "کان "زائدہ ہوتا ہے درمیان میں یا آخر میں، شروع میں زائدہ نہیں ہوتا "عبداللہ کان قائم " میں، اور " عبداللہ قائم کان " میں "کان "کو عرب حضرات زائد مانتے ہیں، لیکن " کان عبداللہ قائما "میں "کان" کو زیادہ نہیں مانتے۔

چوتھا احتمال: چوتھا احتمال یہ ہے کہ "کان "بمعنی" صار" کے ہو، یعنی "کنتم خیر امۃ "کا معنی" صرتم خیر امۃ " تم تمام امتوں سے بہتر امت ہوگئے، اب مکمل معنی یہ ہوگیا:

" صرتم خیرامۃ بسبب کونکم آمرین بالمعروف وناھین عن المنکر ومؤمنین باللہ "

تم تمام امتوں سے بہتر ہوگئے اس سبب سے کہ تم اچھے کاموں کا حکم دینے والے ہو، اور برے کاموں سے روکنے والے ہو اور اللہ پر ایمان لانے والے ہو۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ ''جو ظاہر کی گئیں لوگوں کیلئے۔''

اعلیٰ حضرت وعلامہ رازی وعلامہ بیضاوی رحمھم اللہ:

اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ نے ﴿اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ کا ترجمہ کیا ''جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں'' یہی ترجمہ بیضاوی اور رازی رحمھما اللہ نے تحریر فرمایا، الفاظ علامہ رازی رحمہ اللہ کے دیکھیں۔

"ان المعنی کنتم خیر الامم المخرجۃ للناس فی جمیع الاعصار فقولہ "اخرجت للناس" ای اظھرت للناس حتی تمیزت وعرجت وفصل بینھا وبین غیرھا"

﴿اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ کا معنی ہے ''ظاہر کی گئیں لوگوں کیلئے'' یعنی تمام امتیں جو لوگوں کیلئے ظاہر کی گئیں کہ ان کی پہچان ہوسکے اور دوسروں سے ممتاز ہوسکیں، ان تمام امتوں سے تم بہتر اور افضل ہو،

خیال رہے کہا "اُخرِجَت" کالغوی معنی ہے "نکالی گئی" بامحاورہ مرادی معنی ہے "ظاہر کی گئی"۔

آیۂ کریمہ اجماع امت کی حجت پر دلالت کر رہی ہے:

"احتج اصحابنا بھذہ الآیة علی ان اجماع الامة حجة" ہمارے اصحاب نے اس آیۂ کریمہ سے یہ دلیل پکڑی ہے کہ اجماع امت بھی شرعی احکام ثابت کرنے والے دلائل میں سے ایک دلیل ہے، حجت ثابت کرنے کیلئے دو وجہ بیان کی گئیں۔

تقریر اول: اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰی اُمَّةٌ یَّھْدُوْنَ بِالْحَقِّ﴾ موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ہے جو حق کی ہدایت دیتے ہیں، پھر اس آیۂ کریمہ میں "کنتم خیر امة" (تم تمام امتوں سے بہتر ہو) اس سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کی امت کے وہ لوگ جو اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں اور اللہ پر ایمان رکھتے ہیں وہ موسیٰ علیہ السلام کی امت کے ان لوگوں سے افضل ہیں جو حق کی ہدایت دیتے ہیں۔

"واذا کان ھؤلاء افضل منھم وجب ان تکون ھذہ الامة لاتحکم الابالحق"
جب کہ یہ لوگ افضل ہیں ان پہلے لوگوں سے تو ضروری ہے کہ یہ امت سوائے حق کے کوئی حکم نہ دے، اگر نبی کریم ﷺ کے امت کے وہ لوگ جو صحابہ کرام اور اہل بیت کی اتباع کرتے ہیں، وہ ناحق بات کریں تو موسیٰ علیہ السلام کی امت کے حق بات کرنے والوں سے افضل نہیں ہو سکتے۔

"لان المبطل یمتنع ان یکون خیرا من المحق" کیونکہ باطل راہ پر چلنے والے کا حق راہ پر چلنے والے سے افضل ہونا منع ہے۔

"فثبت ان ھذہ الامة لاتحکم الابالحق واذاکان کذلک کان اجماعھم حجة"
تو ثابت ہوا کہ بیشک یہ امت صرف حق کا فیصلہ کرے گی، جب اس طرح ہے تو ان کا اجماع حجت ہے۔

تقریر دوم: "المعروف" اور "اَلْمُنْکَرُ" پر الف لام استغراقی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ معنی یہ ہے۔

"وھذا یقتضی کونھم آمرین بکل معروف وناھین عن کل منکرومتی کانوا کذلک کان اجماعھم حقا وصدقا لامحالة فکان حجة"
کہ وہ صحابہ کرام اور آپ کے متبعین ہر ایک بھلائی کا حکم دینے والے ہیں اور ہر ایک برائی سے منع کرنے والے ہیں، جب ان کا وصف یہ ہے تو واضح ہوا کہ ان کا اجماع یقینی طور پر حق اور سچ ہے، لھذا ان کا اجماع حجت ہے۔ (کبیر)

فائدہ: زجاج نے کہا ہے کہ ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ﴾ بظاہر خطاب ہے نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کو، لیکن یہ حکم تمام امت کو شامل ہے، جیسا کہ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ اور ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ﴾ کا حکم بظاہر اس وقت حاضرین کو تھا، لیکن بعد میں وہ حکم تمام امت کو شامل ہو گیا۔ (کبیر)

البتہ امت کے وہی لوگ اس میں آئیں گے جن کے اعمال قرآن وسنت کے مطابق ہوں گے۔

﴿تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ﴾

''تم حکم دیتے ہو اچھے کاموں کا اور تم روکتے ہو برے کاموں سے اور تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر۔''

''واعلم ان هذا كلام مستأنف والمقصود منه بيان علة تلك الخيرية'' یہ نئی بات شروع ہو رہی ہے، اور مقصد امت کے خیر ہونے کی علت بیان کرنا ہے، جس طرح کہا جاتا ہے ''زيد كريم يطعم الناس ويكسوهم ويقوم بما يصلحهم'' زید کریم ہے کہ وہ لوگوں کو طعام کھلاتا ہے اور ان کو کپڑے پہناتا ہے، اور ان کی حاجات کو پورا کرتا ہے یعنی زید کے کریم ہونے کی علت لوگوں کو طعام کھلانا اور ان کو کپڑے پہنانا اور ان کی حاجات کو پورا کرنا ہے۔

اصول فقہ کا قانون:

اصول فقہ میں قانون بیان کیا گیا ہے کہ کوئی حکم بیان کیا جائے اس کے بعد اس کے اوصاف بیان کئے جائیں تو وہ اوصاف اس حکم کی علت بنتے ہیں، اس آیۃ کریمہ میں پہلے امت کے خیر ہونے کا ذکر کیا، پھر ان کے یہ تمام اوصاف امت کی افضلیت کے اسباب ہیں، ان کے بغیر امت افضل نہیں ہو سکتی۔ (کبیر)

سؤال: اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا اور اللہ پر ایمان رکھنا اس امت کی افضلیت کے اسباب کیسے ہیں؟ یہ اوصاف تو پہلی امتوں کو بھی حاصل تھے۔

جواب: نبی کریم ﷺ کی امت کو یہ اوصاف اعلیٰ درجے کے حاصل ہیں، اعلیٰ درجہ کا ''امر بالمعروف ونهي عن المنكر'' جہاد کرنا ہے، کامل درجہ کا جہاد اسی امت کو حاصل ہے۔

''ان الامر بالمعروف قد يكون بالقلب وباللسان وباليد واقواها مايكون بالقتال لانه القاء النفس في خطر القتل''

بیشک اچھے کاموں کا حکم دینا کبھی دل سے ہوتا ہے اور کبھی زبان سے اور کبھی ہاتھ سے، ان تمام میں سے زیادہ قوی جہاد سے دین کی تبلیغ کی جائے، یہ افضل اس لئے ہے کہ اس میں اپنے نفس کو قتل کے خطرہ میں ڈالنا پایا جاتا ہے

"واعرف المعروفات الدين والايمان بالتوحيد والنبوة، وانكر المنكرات الكفرفكان الجهادفي الدين محملا لاعظم المضارلغرض ايصال الغير الى اعظم المنافع وتخليصه من اعظم المضارفوجب ان يكون الجهاداعظم العبادات ولما كان امر الجهادفي شرعنااقوى منه في سائر الشرائع لاجرم صارذلک موجبالفضل هذه الامة على سائر الامم"

سب کاموں سے اچھا کام دین حق اور اللہ تعالیٰ کی توحید پر اور نبی کریم ﷺ کی نبوت پر ایمان لانا ہے اور سب کاموں سے برا کام اللہ تعالیٰ سے کفر کرنا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے میں اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر اوروں کو عظیم منافع پہنچانا کہ جہاد عبادات میں سے عظیم عبادت ہو، جب جہاد ہماری شریعت میں بنسبت دوسری شریعتوں سے زیادہ قوی درجہ رکھتا ہے تو یقیناً وہ امت جسے اعلیٰ درجہ کی عبادت قوی ترین جہاد "فی سبیل اللہ" حاصل ہے وہ تمام امتوں سے افضل ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

حضرت ابن عباس ﷺ کا ارشاد:

وهذامعنى ماروى عن ابن عباس انه قال في تفسيرهذه الآية قوله (كنتم خيرامة اخرجت للناس) تامرونهم ان يشهدواان لااله الاالله ويقروابماانزل الله وتقاتلونهم عليه "ولااله الاالله" اعظم المعروف والتكذيب هو انكرالمنكر"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیۃ کی تفسیر یوں بیان فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ آیۃ کریمہ میں ﴿تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم حکم دیتے ہو کہ گواہی دو اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں، اور اللہ تعالیٰ نے جو نازل کیا اس کے اقرار کرنے اور اللہ کی راہ میں قتال (جہاد) کرنے کا حکم دیتے ہو، "لاالہ الااللہ" سب کاموں سے اچھا ہے تو اس کی شہادت پر قائم رہنے کا حکم دینا اچھے کام کا حکم دینا ہے، اور "لاالہ الا اللہ" کی تکذیب برا کام ہے، اور " لاالہ الااللہ" کی تکذیب سے روکنا برے کام سے روکنا ہے۔

جہاد کا فائدہ:

قفال کہتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے فائدہ کا کوئی انصاف کرنے والا انکار نہیں کرسکتا، کیونکہ اکثر لوگ اپنے اپنے دین پر آباء واجداد کی محبت اور عادت کی وجہ سے قائم رہتے ہیں، ان پر جو دلائل بھی قائم کرو وہ ان کی

طرف توجہ نہیں کرتے، اور نہ ہی سوچنے کی کوشش کرتے ہیں، جب وہ دین میں داخل ہونے کو ناپسند کرتے کریں، جو دین قبول کرلیں ان کو اس دین حق سے برگشتہ (پھیرنے) کرنے کی کوشش کریں، اور دیندار لوگوں کیلئے راہ حیات تنگ کردیں، تو ایسے لوگوں سے جہاد کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ ہوسکتا ہے وہ راہ راست پر آجائیں، اگر ان کی قسمت میں راہ راست پر آنا نہ ہو تو کم از کم دیندار لوگ ان سے نجات حاصل کرلیں گے، بعض اوقات مسلمانوں کی جرأت، بے باکی کو دیکھ کر ان کے دلوں سے باطل دین کی محبت کم ہو جاتی ہے اور دین حق سے محبت ان کو حاصل ہو جاتی ہے، جو عذاب دائمی کے مستحق تھے ان کو ثواب دائمی حاصل ہو جاتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر بوضاحت)

سؤال: اس مقام پر "امر بالمعروف ونهي عن المنكر" کو پہلے ذکر کیا گیا اور اللہ تعالی پر ایمان رکھنے کو بعد میں ذکر کیا گیا "وان الايمان بالله لابد ان يكون مقدما على كل الطاعات" حالانکہ تمام عبادات سے پہلے ایمان کا ہونا ضروری ہے" تو کیا وجہ ہے کہ ایمان کو مؤخر ذکر کیا گیا؟

جواب: اللہ تعالی پر ایمان لانا حق پر قائم رہنے والی پہلی تمام امتوں کو حاصل رہا، جب اللہ تعالی نے اس امت کو تمام ان امتوں پر فضیلت دی گئی جو حق پر قائم تھیں اور پہلے گذر گئیں، یہ فضیلت صرف ایمان کی وجہ سے نہیں، ایمان تو تمام کو ہی حاصل رہا، بلکہ یہ فضیلت اس لئے حاصل ہوئی کہ نبی کریم ﷺ کی فضیلت کو اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا اعلی درجہ کا حاصل رہا، اس کا ذریعہ جہاد جیسا "امر بالمعروف ونهي عن المنكر" کا سبب اسی امت کو حاصل رہا، (نفس ایمان میں کوئی زیادتی نہیں، جسکی تفصیل (ان شاء اللہ) سورۃ انفال میں آئے گی)

"فان المؤثر في حصول هذه الخيرية هو الامر بالمعروف والنهي عن المنكر واما الايمان بالله فهو شرط لتاثير هذا المؤثر في هذا الحكم ...... والمؤثر الصق بالاثر من شرط التاثير فلهذا السبب قدم الله تعالى ذكر الامر بالمعروف والنهي عن المنكر على ذكر الايمان"

اصل میں اس امت کے خیر ہونے پر مؤثر "امر بالمعروف والنهي عن المنكر" ہیں "ایمان بالله" اس مؤثر کی شرط تاثیر ہے، کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی عبادت مؤثر نہیں، مؤثر کا اثر سے شرط تاثیر سے ملنا ضروری ہوتا ہے، اسی وجہ سے "امر بالمعروف ونهي عن المنكر" کو پہلے ذکر فرمایا، اور ایمان باللہ کو بعد میں ذکر کیا۔ (ماخوذ از کبیر)

سؤال: آیۃ کریمہ میں اللہ تعالی پر ایمان رکھنے کا ذکر فرمایا اور نبوت پر ایمان رکھنے کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ نبوت پر ایمان رکھنے بغیر ایمان حاصل نہیں ہوتا۔

جواب: "الایمان باللہ یستلزم الایمان بالنبوۃ" اللہ پر ایمان حاصل ہی اس وقت ہوتا ہے جب نبوت پر ایمان ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اس وقت تک حاصل نہیں جب تک نبی کے سچے ہونے پر ایمان نہ ہو، اور اس کے سچے ہونے پر ایمان اسی وقت حاصل ہوگا جب اللہ تعالیٰ اس کے دعویٰ کے سچے ہونے پر اسے معجزات عطاء فرمائے گا "لان المعجز قائم مقام التصدیق بالقول" اس لئے کہ معجزہ عطاء کرنا اسی طرح تصدیق ہے جسطرح زبان سے کسی کی تصدیق کردی کہ یہ سچا ہے۔

"فلما شاھدنا ظھور المعجز علی وفق دعوی محمد ﷺ کان من ضرورۃ الایمان باللہ الایمان بنبوۃ محمد ﷺ فکان الاقتصار علی ذکر الایمان باللہ تنبیھا علی ھذہ الدقیقۃ"

جب ہم نے نبی کریم ﷺ کے دعویٰ نبوت پر آپ کے معجزات کا مشاہدہ کیا تو ضروری ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اسی وقت حاصل ہوگا جب نبی کریم ﷺ کی نبوت پر ایمان ہوگا، کیونکہ معجزات کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے آپ کی تصدیق فرمائی، اگر آپ پر ایمان نہیں ہوگا تو رب تعالیٰ کی تصدیق کا انکار ہوگا جب رب تعالیٰ نے آپ کی جو تصدیق فرمائی اس پر ایمان نہیں ہوگا تو یقیناً اللہ تعالیٰ پر بھی ایمان نہیں ہوگا، واضح ہوا کہ "ایمان باللہ مستلزم ہے ایمان بالنبوۃ کو" (اللہ پر ایمان رکھنے سے نبوت پر ایمان خود بخود لازم آجاتا ہے) اسی نکتہ کی وجہ سے صرف اللہ پر ایمان رکھنے کا ذکر فرمادیا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ﴾

"اور اگر ایمان لاتے اہل کتاب تو ان کیلئے بہتر ہوتا۔"

"یعنی کما انکم اکتسبتم ھذہ الخیرامۃ بسبب ھذہ الخصال فاھل الکتاب لو آمنو الحصلت لھم ایضا صفۃ الخیریۃ" واللہ اعلم

یعنی اے مومنو جس طرح تم نے اچھی صفات کے ذریعے بہتری اور افضلیت حاصل کی، اگر اہل کتاب بھی ایمان لے آتے اور وہی صفات حاصل کر لیتے جو تمہیں حاصل ہیں تو وہ بھی تمام امتوں سے افضل ہوجاتے۔ (کبیر)

اہل کتاب کا کونسا ایمان معتبر ہے؟

ولو آمن اھل الکتاب بھذا الدین الذی لأجلہ حصلت صفۃ الخیریۃ لاتباع محمد ﷺ لحصلت ھذہ الخیریۃ ایضا لھم فالمقصود من ھذا الکلام ترغیب اھل الکتاب فی ھذا الدین"

مراد یہ ہے کہ اگر اہل کتاب نبی کریم ﷺ کے دین پر ایمان لے آتے جس پر ایمان لانے اور آپ کی تابعداری

کرنے کی وجہ سے صحابہ کرام اور آپ کی امت کے دوسرے حضرات یعنی علماء وصلحاء کو تمام امتوں سے افضلیت حاصل ہوئی تو ان کو بھی نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے اور آپ تابعداری کرنے سے بہتری حاصل ہو جاتی، اس آیۃ کریمہ سے مقصد ہی اہل کتاب اس دین میں داخل ہونے کی ترغیب دینا ہے۔

اہل کتاب غلطی فہمی سے محروم ہو گئے:

ان اهل الكتاب انما آثروا دينهم على دين الاسلام حباللرياسة واستتباع العوام ولو آمنوا لحصلت لهم هذه الرياسة فى الدنيامع الثواب العظيم فى الآخرة فكان ذلك خير الهم مماقنعوا به"

اہل کتاب نے اپنے دین کو اسلام پر ترجیح دی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ریاست و سرداری کو پسند کرتے تھے کہ اگر ہم اپنے دین پر قائم رہے تم ہمیں سرداری حاصل رہے گی اور عوام بھی ہمارے تابع ہوں گے، یہ درحقیقت ان کی غلط فہمی تھی، اگر وہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آتے تو ان کو دنیا میں سرداری حاصل ہو جاتی اور آخرت میں ثواب عظیم حاصل ہوتا، یہ فضیلت ان کو قناعت سے حاصل ہو جاتی۔ (کبیر)

جب قسمت ساتھ چھوڑ دے تو عقل بھی ساتھ چھوڑ جاتی ہے، محرومیت ان کی قسمت میں تھی تو اور کیا چیز ان کی مدد کر سکتی تھی۔

﴿مِنۡهُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَاَکۡثَرُهُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ﴾

''ان میں سے کوئی مؤمن ہیں اور اکثر ان میں سے حد سے تجاوز کرنے والے کافر۔''

"المؤمنون" پر الف لام عہد خارجی ہے، اس سے مراد یہود سے ایمان لانے والے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے چند ساتھی جو ایمان لائے، اسی طرح نصرانیوں میں سے حضرت نجاشی جنہوں نے ایمان قبول کیا اور ان کے چند ساتھی جنہوں نے ایمان قبول کیا، یعنی ایمان والے بہت تھوڑی تعداد میں تھے، اور ان میں کافر زیادہ تعداد میں تھے۔

کافر کو فاسق کہنے میں عجیب حکمت:

اگرچہ "فسق" کا معنی حد سے تجاوز کرنا، جو بہت زیادہ حد سے تجاوز کر جائے وہ کافر ہوتا ہے، یہاں آیۃ کریمہ میں "الفاسقون" سے مراد کافر ہیں، اسی لئے اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ﴿وَاَکۡثَرُهُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ﴾ اور زیادہ کافر، کتنا مختصر اور خوب ترین ترجمہ ہے لیکن راقم نے علامہ رازی رحمہ اللہ کی تفسیر

دل پذیر و بینظیر یعنی تفسیر کبیر کو دیکھا تو تفصیلی ترجمہ لکھ دیا ''اور اکثر ان میں سے حد سے تجاوز کرنے والے کافر'' آیئے آپ بھی تفسیر کبیر کی خوبصورت تحقیقی تفسیر کو دیکھئے، بلا اختیار میری طرح شاید آپ کی زبان سے بھی نکلے'' واہ قرآن تیری عظمت پر قربان۔

''الوصف انمایذ کر للمبالغة فای مبالغة تحصل فی وصف الکافربانه فاسق''

یہ ایک سوال کیا گیا کہ '' فسق '' کا معنی ہے حد سے تجاوز کرنا، اس وصف میں مبالغہ پایا گیا، اس سے مراد تو کافر ہے، لیکن کافر کو فاسق کہنے کی وجہ کیا ہے؟

تو اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

''الکافر قدیکون عدلافی دینه وقدیکون فاسقافی دینه فیکون مردوداعندالطوائف کلهم لان المسلمین لایقبلونه لکفره والکفار لایقبلونه لکونه فاسقافیمابینهم، فکانه قیل اهل الکتاب فریقان منهم من آمن، والذین ماآمنوافهم فاسقون فی ادیانهم فلیسوا ممن یجب الاقتداء بهم البتة عن احدمن العقلاء''

کافر کبھی اپنے دین میں عادل ہوتا ہے، یعنی دوسرے کافر اسے عادل کہتے ہیں، وہ کافروں کے نزدیک مقبول ہوتا ہے، اور کبھی کافر اپنے دین میں فاسق ہوتا ہے، حد سے تجاوز کرنے والا ظالم ہوتا ہے، یہ فاسق تمام کے نزدیک مردود ہوتا ہے، مومن تو اسے اس لئے قبول نہیں کرتے کہ وہ کافر ہے، لیکن دوسرے کافر بھی اسے قبول نہیں کرتے کہ وہ فاسق ہے گویا کہ یوں بیان کیا گیا کہ اہل کتاب کے دو فریق ہیں، بعض وہ ہیں جنہوں نے ایمان قبول نہیں کیا وہ حقیقت میں اپنے اپنے دین میں فاسق ہی ہیں، خواہ کافر ان کو فاسق سمجھیں یا نہ سمجھیں، لھذا کسی عقلمند شخص کے لائق نہیں کہ وہ کسی کافر کی اقتداء کرے۔ (کبیر)

بات صرف سمجھنے کی ہے کہ کافر لوگ کسی کافر کو عادل کہتے ہیں اور کسی کو فاسق، لیکن اسلام ہر کافر کو فاسق کہتا ہے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کافر ہو اور فاسق نہ ہو۔

''امة '' کا کیا مطلب؟

''الامة الطائفة المجتمعة علی الشئی الواحد'' امت کا لغوی معنی ایک گروہ جو ایک چیز پر متفق ہو جائیں

نبی کریم ﷺ کی امت کی دو قسمیں ہیں، امت دعوت اور امت اجابت، امت دعوت میں تمام مومنین اور کافرین آتے ہیں، کیونکہ امت دعوت کا مطلب ہی یہ ہے کہ آپ نے جن لوگوں کو دعوت اسلام دی، آپ نے چونکہ دعوت اسلام تو لوگوں کو

دی اس لئے تمام ہی امت دعوت میں شامل ہیں لیکن امت اجابت وہ ہے "ھم الجماعة الموصوفون بالایمان به والاقرار بنبوته" جن لوگوں نے ایمان لایا اور آپ کی نبوت کا اقرار کیا۔ اگر مطلقا آپ کی امت کا لفظ آئے تو اس وقت آپ کی امت اجابت مراد ہوتی ہے جنہوں نے آپ پر ایمان لایا ہے، جیسا کہ آپ کا اپنا ارشاد گرامی ہے "امتی لاتجتمع علی ضلالة" میری امت گمراہی پر مجتمع (جمع) نہیں ہوگی، اور قیامت کے دن آپ فرمائیں گے "امتی امتی" یہ تو میری امت کے لوگ ہیں، ان ارشادات سے مراد آپ کی امت کے ایماندار لوگ ہیں، کافر مراد نہیں، اگر آپ کی امت دعوت کا ذکر کرنا مقصود ہو تو وہاں صرف امت کا ذکر نہیں ہوگا، بلکہ "امت دعوت" مکمل الفاظ آئیں گے۔ (از کبیر)

افضلیت امت مصطفیٰ کریم ﷺ پر احادیث مبارکہ:

❁ عن ابن مسعود ان رسول الله ﷺ قال خیر الناس قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم" (بخاری)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں میں سے بہتر میرا زمانہ ہے، پھر ان لوگوں کا جن کا ان کے بعد متصل آنے والے ہیں، پھر ان لوگوں کا جو ان کے بعد متصل آنے والے ہیں۔ قوله "خیر الناس قرنی یعنی اصحابی" نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی "لوگوں سے بہتر میرا زمانہ ہے" اس سے مراد "میرے صحابہ کا زمانہ" ہے۔

"والقرن اهل کل زمان ماخوذ من الاقتران فکانه الزمان الذی یقترن فیه اهل ذلک الزمان فی اعمارهم واحوالهم"

"قرن" کا لفظ معنوی لحاظ پر "اقتران" سے ماخوذ ہے، یعنی ایک زمانہ میں عمر گذارنے والے لوگ، اور ایک قسم کے احوال رکھنے والے، مراد اس سے ہم زمان لوگ۔ (ماخوذ از خازن)

اسی حدیث کو نقل کرنے کے بعد علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"وهذا یدل علی ان اول هذه الامة ممن بعدهم والی هذ ذهب معظم العلماء وان من صحب النبی ﷺ ورآه ولو مرة فی عمره افضل ممن یاتی بعده وان فضیلة الصحبة لایعدلها عمل"

یہ حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے کہ اس امت کے اول لوگ بعد میں آنے والوں سے افضل ہیں، عظیم علماء کرام کا یہی فیصلہ ہے کہ جن خوش بخت لوگوں کو نبی کریم کی زیارت ایک مرتبہ اپنی عمر میں حاصل ہوئی، خواہ بہت ہی قلیل، اسی طرح نابینا صحابہ کو ایک مرتبہ آپ کی صحبت میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا ہو تو وہ بعد میں آنے والوں سے

افضل ہیں، کیونکہ کوئی عمل صحابیت کی فضیلت کو نہیں پا سکتا۔ (قرطبی)

تنبیہ: کئی احادیث میں بعد میں آنے والے لوگوں کی فضیلت نظر آتی ہے، لیکن ان سے مراد، بعد میں آنے والے لوگوں کی حضور ﷺ سے شدید محبت کا ذکر ہے، یا ان کا آپ کو بغیر دیکھے ایمان لانے کا ذکر خیر ہے، یا صحابہ کرام سے تشبیہ ہے ورنہ حقیقت میں صحابہ کرام کا مرتبہ دوسرے لوگوں سے افضل ہے، آیئے وہ احادیث دیکھئے جن میں بظاہر بعد میں آنے والوں کی فضیلت کا ذکر ہے۔

❁ **روی ابو امامة ان النبی ﷺ قال طوبی لمن رآنی و آمن بی وطوبی سبع مرات لمن لم یرنی و آمن بی"**

ابو امامہ نے فرمایا بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا مبارک ہے اس شخص کیلئے جس نے مجھے دیکھا اور میرے ساتھ ایمان لایا اور سات مرتبہ مبارک ہو اس شخص کیلئے جس نے مجھے نہیں دیکھا اور مجھ پر ایمان لایا۔ (منقول از قرطبی)

اس حدیث سے بھی بعد میں آنے والوں کی افضلیت نہیں ثابت ہو رہی البتہ بغیر دیکھے ایمان لانے پر تعجب کا اظہار کیا گیا اور ان کی تعریف کی گئی۔

❁ **وفی مسند ابی داود الطیالسی عن محمد بن ابی حمید عن زید بن اسلم عن ابیه عن عمر قال کنت جالسا عند رسول الله ﷺ فقال اتدرون ای الخلق افضل ایمانا؟ قلنا الملائکة" قال وحق لهم بل غیرهم "قلنا الانبیاء، قال" وحق لهم بل غیرهم ثم قال رسول الله ﷺ افضل الخلق ایمانا قوم فی اصلاب الرجال یؤمنون بی ولم یرونی یجدون ورقا فیعملون بما فیها فهم افضل الخلق ایمانا"**

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوتھا، تو آپ نے فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ کون سی مخلوق افضل ہے از روئے ایمان کے؟ ہم نے عرض کیا "وہ فرشتے ہیں" آپ نے فرمایا وہ تو ٹھیک ہیں، لیکن میرا سوال اور لوگوں کے بارے میں ہے، ہم نے پھر عرض کیا وہ انبیاء کرام ہیں، آپ نے فرمایا یہ بات بھی حق ہے، لیکن میری مراد کچھ اور لوگ ہیں، پھر آپ نے خود ہی ارشاد فرمایا ایمان کے لحاظ پر افضل مخلوق ابھی تک اپنے آباء (باپوں) کی پشتوں میں ہے جو میرے ساتھ ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں ہوگا، وہ (کتاب وسنہ کے) اوراق پائیں، ان میں جو ہوگا اس کے مطابق عمل کریں گے وہ ایمان کے لحاظ پر مخلوق سے افضل ہوں گے۔ (منقول از قرطبی)

اس حدیث پاک سے بھی بعد میں آنے والوں کے بغیر دیکھے ایمان لانے کی تعریف کی گئی، مطلقا صحابہ کرام

سے افضلیت ثابت نہیں۔

❁ وروی صالح بن جبیر عن ابی جمعة قال قلنا یارسول الله هل احد خیر مناقال نعم قوم یجیئون من بعدکم فیجدون کتابابین لوحین فیؤمنون بمافیه ویؤمنون بی ولم یرونی "

ابو جمعہ نے فرمایا کہ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ہم سے بھی کوئی بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا، ہاں وہ قوم جو تمہارے بعد میں آئے گی، وہ دو تختیوں (گتوں) کے درمیان کتاب پائیں گے، اس میں جو کچھ ہوگا اس پر وہ ایمان لائیں گے، اور مجھ پر ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں ہوگا۔ (منقول از قرطبی)

ان تمام احادیث سے شدت محبت سمجھ آ رہی ہے کہ وہ کتنے محبت والے لوگ ہوں گے جو مجھے دیکھے بغیر مجھ پر ایمان لائیں گے، شدت محبت پر حدیث مسلم بہت واضح ہے۔ (منقول از قرطبی)

❁ عن ابی هریرة ان رسول اللها قال من اشدامتی الی حباناس یکونون بعدی یوداحدهم لورآنی باهله وماله"

(مسلم جلد ثانی صفحه نمبر ۳۸۷، کتاب الجنة و صفة نعیمهاو اهلها)

حضرت ابو ھریرہ ﷺ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، لوگوں میں سے شدید محبوب مجھے وہ لوگ ہیں جو میرے بعد میں آئیں گے (وہ میرے ساتھ اتنی محبت کریں گے) کہ ان کی تمنا یہ ہوگی کہ کاش وہ مجھے دیکھ لیں اگر اہل وعیال اور مال ہی قربان کیوں نہ کرنا پڑتا، اس حدیث سے واضح ہوا کہ بعد میں آنے والے، نبی کریم ﷺ سے شدید محبت کریں گے اور رسول اللہ ﷺ کو بھی ان سے شدید محبت تھی لیکن صحابہ کرام پر افضلیت اور برتری اس حدیث سے ثابت نہیں ہوتی۔ **دوسری** وجہ ان احادیث سے صحابہ کرام سے تشبیہ کو ثابت کرنا ہے، جیسا کہ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے وضاحت کی۔

"وقدقیل فی توجیه احادیث هذاالباب ان قرنه انمافضل لانهم کانواغرباء فی ایمانهم لکثرة الکفاروصبرهم علی اذاهم وتمسکهم بدینهم و ان اواخرهذه الامة اذااقامواالذین وتمسکوابه وصبرواعلی طاعة ربهم فی حین ظهور الشروالفسق والهرج والمعاصی والکبائرکانواعندذلک ایضاغرباء وزکت اعمالهم فی ذلک الوقت کمازکت اعمال اوائلهم "

ان احادیث میں جن میں بظاہر بعد میں آنے والے لوگوں کی افضلیت سمجھ آتی ہے ان کی وجہ یہ بیان کی گئی

کہ یہ بات تو یقینی ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کا زمانہ افضل تھا، ان لوگوں کو فضیلت دی گئی وہ اپنے ایمان میں غریب الوطن مسافرین کی طرح تھے، کفار کی تعداد زیادہ تھی، اور صحابہ کرام صبر سے کام لے رہے تھے، اور اپنے دین پر پختگی سے قائم تھے، ان سے تشبیہ دیتے ہوئے گویا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشادات سے یوں فرمادیا کہ بیشک اس امت کے بعد میں آنے والے جب دین پر قائم رہیں گے، دین سے مضبوطی سے سہارا لگائے ہوں گے، اور وہ اپنے رب کی فرمانبرداری میں اس وقت صبر کریں گے جبکہ شر ظاہر ہوگا فسق و فجور، قتل و غارت، اور بڑے بڑے جرائم اور ہر طرف نافرمانیوں کا دور ہوگا، اس وقت بعد میں آنے والے لوگ بھی پہلے دور یعنی صحابہ کرام کی طرح غریب الوطن مسافرین کی طرح بے سروسامان ہوں گے، اور اُس وقت ان کے اعمال اسی طرح پاکیزہ ہوں گے جیسے پہلے لوگوں کے اعمال پاکیزہ تھے۔ (منقول از قرطبی)

یہی مطلب جو بیان کیا گیا اس پر نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے۔

❁ قال ﷺ بدأ الاسلام غریبا و سیعود کما بدأ فطوبی للغرباء" نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسلام بے سروسامانی کی حالت میں شروع ہوا، پھر اسی حالت کی طرف لوٹ آئے گا، تو مبارک ہے ان لوگوں کیلئے جو بے سروسامانی میں (دین کی آبیاری کرنے والے) ہوں گے۔ (منقول از قرطبی)

❁ روی عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ مثل امتی مثل المطر لایدری اولہ خیر ام آخرہ"
(ذکرہ ابو داؤد الطیاسی و ابو عیسی الترمذی)

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کی مثال بارش کی طرح ہے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا پہلا قطرہ بہتر ہے یا آخری بہتر ہے۔ (منقول از قرطبی)

(اس حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو یہ پتہ نہیں ہوگا کہ پہلے لوگوں میں ایمان لانے والے ایمان پر قائم رہے گا یا بعد میں ایمان لانے والا ایمان پر قائم رہے گا، کیونکہ صحابہ کرام کے دور میں کئی لوگ (العیاذ باللہ) مرتد ہو گئے لیکن بعد کے دور میں بفضلہٖ تعالیٰ کتنے ہی لوگ وہ ہیں جو ابتداء سے انتہاء تک ایمان پر قائم رہیں گے) (راقم)

❁ روی ان عمر بن عبدالعزیز لما ولی الخلافۃ کتب الی سالم بن عبداللہ ان اکتب الی بسیرۃ عمر بن الخطاب لأعمل بھا، فکتب الیہ سالم "ان عملت بسیرۃ عمر فانت افضل من عمر لان زمانک لیس کزمان عمر ولا رجالک کرجال عمر قال و کتب الی فقھاء زمانہ فکلھم کتب الیہ بمثل قول سالم" (منقول از قرطبی)

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جب خلیفہ بنے تو انہوں نے سالم بن عبداللہ بن عمر بن خطاب کی طرف خط لکھا

کہ تم میری طرف حضرت عمرؓ کی سیرت لکھ کر بھیجو تا کہ میں اس پر عمل کروں، تو ان کی طرف حضرت سالم نے لکھا کہ اگر تم نے حضرت عمرؓ کی سیرت پر مکمل طور پر عمل کر لیا تو تم حضرت عمرؓ سے افضل ہو جاؤ گے کیونکہ تمہارا زمانہ حضرت عمر کے زمانہ کی طرح نہیں، اور نہ ہی تمہیں ان کے اصحاب کی طرح ساتھی مل سکتے ہیں، پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانہ کے کثیر فقہاء کی طرف یہی خط لکھا، لیکن سب نے جواب وہی دیا جو حضرت سالم نے جواب دیا تھا۔

مطلب واضح ہے:

کہ حضرت سالمؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جب تمہیں حضرت عمرؓ کا زمانہ حاصل نہیں، اور ان کے اصحاب کی طرح تمہیں اصحاب میسر نہیں تو تم ان کی سیرت پر کامل عمل تو نہیں کر سکتے، اگر بالفرض ان کی طرح تم کامل عمل کر سکتے تو ان سے افضل ہوتے، لیکن تمہارا ان سے افضل ہونا ممکن نہیں۔ (راقم)

❁ **عن عمر بن الخطاب "بسند حسن" قال رسول الله ﷺ الجنة حرمت على الانبياء حتى ادخلها وحرمت على الامم حتى يدخلها امتي"** (رواه الطبراني في الاوسط)

حضرت عمر بن خطابؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت انبیاء کرام پر حرام ہوگی یہاں تک کہ میں اس میں داخل ہو جاؤں، اور امتوں پر جنت حرام ہوگی، یہاں تک کہ میری امت داخل ہو جائے۔
(منقول از مظہری)

مطلب واضح ہے کہ جنت میں مجھ سے پہلے انبیاء کرام داخل نہیں ہو سکیں گے، اور میری امت سے پہلے کوئی امت داخل نہیں ہو سکے گی۔

❁ **وروى (ايضا) عن ابن عباس مرفوعا الجنة محرمة على جميع الامم حتى ادخلها انا وامتي الاول فالاول"**

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث مروی کہ (نبی کریم ﷺ نے فرمایا) جنت تمام امتوں پر حرام ہوگی یہاں تک کہ میں اور میری امت اس میں داخل ہو جائیں، درجہ بدرجہ اس میں داخل ہوں گے۔ (منقول از مظہری)

(یعنی پہلے زیادہ مرتبہ والے پھر ان سے کم مرتبہ والے، پھر ان سے کم)

❁ **عن جابر قال قال رسول الله ﷺ اني لارجوان يكون من تبعني ربع اهل الجنة ثم قال ارجوان يكون ثلث اهل الجنة ثم قال ارجوان يكون الشطر"** (رواه احمد والبزار والطبرانی باسناد صحیح)

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "امید کرتا ہوں میرے متبعین (میری امت کے

میری تابعداری کرنے والے) تمام جنتیوں کا چوتھائی حصہ ہوں گے، پھر آپ نے فرمایا میں امید کرتا ہوں کہ وہ تمام جنتیوں کا تہائی درجہ ہوں گے، پھر آپ نے فرمایا کہ میں امید کرتا ہوں کہ وہ تمام جنتیوں کے نصف برابر ہوں گے۔ (منقول از مظہری)

❁ عن بهزبن حكيم عن ابيه عن جده قال قال رسول الله ﷺ انكم لتمون سبعين امة انتم خيرها واكرمها على الله عزوجل" (رواه الترمذی وحسنه وابن ماجه والدارمی)

بہز بن حکیم اپنے باپ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک تم ستر امتوں کی تکمیل کرنے والے ہو، تم ان تمام سے بہتر اور مکرم ہو اللہ تعالیٰ کے ہاں۔ (منقول از مظہری)

مطلب واضح ہے کہ تم بہت سی امتوں پر زیادہ تعداد میں ہوگے، دوسرے احادیث سے واضح ہے کہ آپ کی امت دو تہائی ہوگی، اور ساری امتیں مجموعی طور پر ایک تہائی ہوں گی، حدیث شریف میں ستر کا ذکر کثرت کیلئے استعمال ہے، معین تعداد کیلئے نہیں، محاورہ عرب یہی تھا کہ کثرت کو ستر سے تعبیر کردیا جاتا تھا۔

❁ وقال رسول الله ﷺ اهل الجنة عشرون ومائة صف ثمانون منها من هذه الامة والباقون من سائر الامم" (رواه الترمذی وحسنه والحاكم وصححه وروى الطبرانی مثله من حديث ابی موسى وابن عباس ومعاية بن جندة وابن مسعود)

حضرت ابو موسیٰ اور ابن عباس اور معاویہ بن جندہ اور ابن مسعود ؓ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جنت والے تمام لوگوں کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی جن میں اسی صفیں اس (میری) امت کی ہوں گی، اور باقی (چالیس) صفیں تمام امتوں کی مجموعی ہوں گی۔

❁ وقال ﷺ ان الله تجاوزعن امتی الخطاء والنسيان وما استكرهوا عليه"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے میری امت کی خطاء اور بھول اور جبری طور پر کام کرانے سے درگذر فرمایا۔ (رواه ابن ماجة والبيهقی)

❁ عن بريدة عن رسول الله ﷺ قال مامن احد من اصحابی يموت بارض الابعث قائدا ونورالهم يوم القيامة" (رواه الترمذی)

حضرت بریدہ ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرا اصحابہ میں سے کوئی ایک (بھی) نہیں جو کسی زمین میں فوت ہوجائے مگر یہ کہ اسے قائد اور نور بنا کر قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔ (منقول از مظہری)

❁ عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ كل امتی يدخلون الجنة الامن ابی قالوا ومن يابی؟ قال من اطاعنی دخل الجنة ومن عصانی فقد ابی" (رواه البخاری)

حضرت ابوھریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری تمام امت جنت میں داخل ہوگی سوائے اس کے جس نے انکار کیا، صحابہ نے پوچھا، انکار کرنے والے کون ہوں گے؟ آپ نے فرمایا جنہوں نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوں گے اور جنہوں نے میری نافرمانی کی وہ انکار کرنے والے ہیں (یعنی وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے۔ (منقول از خازن)

خیال رہے کہ جب حدیث شریف میں "وَمَنْ عَصَانِیْ" کا معنی یہ لیا جائے کہ میری امت کے مؤمنین جب گنہگار، نافرمان ہو جائیں تو وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے۔

❁ **عن ابی امامة قال سمعت رسول الله ﷺ یقول وعدنی ربی ان یدخل من امتی الجنة سبعون الفالاحساب علیهم ولاعذاب ومع کل الف سبعون الفا"** (بخاری)

حضرت ابوامامہ ﷺ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا میرے رب نے میرے ساتھ وعدہ فرمایا کہ میری امت میں سے ستر ہزار کو بغیر حساب عذاب کے جنت میں داخل کرے گا، اور ہر ایک ہزار کے ساتھ ستر ہزار اور داخل کرے گا۔ (منقول از خازن)

❁ **عن ابی بکر الصدیق ﷺ قال قال رسول الله ﷺ اعطیت سبعین الفایدخلون الجنة بغیر حساب وجوههم کالقمر لیلة البدرقلوبهم علی قلب رجل واحدفاستزدت ربی فزادنی مع کل واحدسبعین الفا"** (رواہ احمد)

حضرت ابوبکر صدیق ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ستر ہزار جنت میں بغیر حساب کے داخل کرنے کا انعام دیا گیا، جن کے چہرے چودہویں کی رات کی طرح چمکدار ہوں گے، اوران کے دل ایک آدمی کا دل ہوں گے، (یعنی وہ متفق ومتحد ہوں گے) میں نے اپنے رب سے (اپنی امت کے لوگوں کی بخشش کی) زیادتی طلب کی تو رب تعالیٰ مجھے ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار ستر ہزار جنت میں داخل کرنے کا وعدہ فرمالیا۔

❁ **عن ابن عباس عن النبی ﷺ انه قال عرضت علی الأمم فرایت النبی ومعه الرهیط والنبی ومعه الرجل والرجلان والنبی ولیس معه احداذرفع لی سوادعظیم فظننت انهم امتی، فقیل لی هذاموسی وقومه، ولکن انظرالی الافق فنظرت فاذاسوادعظیم فقیل لی انظرالی الافق الآخرفاذاسوادعظیم فقیل لی هذه امتک ومعهم سبعون الفایدخلون الجنة بغیرحساب ولاعذاب، ثم نهض فدخل منزله فخاض الناس فی اولئک الذین یدخلون الجنة بغیر حساب ولاعذاب فقال بعضهم فلعلهم الذین صحبوارسول الله ﷺ وقال بعضهم فلعلهم الذین ولدوافی الاسلام ولم یشرکوابالله**

شیاً ذکروا اشیاء فخرج علیهم رسول اللہ ﷺ فقال ماالذی تخوضون فیه؟فاخبروہ فقال هم الذین لایرقون ولایسترقون ولایکتوون ولایتطیرون وعلی ربهم یتوکلون ،فقام عکاشة بن محصن فقال ادع اللہ ان یجعلنی منهم،قال انت منهم، ثم قام رجل آخرفقال ادع اللہ ان یجعلنی منهم،قال سبقک بها عکاشة" (رواہ مسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ پر امتیں پیش کی گئیں، میں نے کسی نبی کو دیکھا، ان کے ساتھ (ان کی امت) ایک چھوٹا سا قبیلہ تھا، اور کسی نبی کو دیکھا، ان کے ساتھ ایک یا دو آدمی تھے، اور کسی نبی کو دیکھا ان کے ساتھ کوئی ایک شخص نہیں تھا، اسی دوران ایک بہت بڑی جماعت میرے سامنے آئی، میں نے خیال کیا، یہ میری امت ہوگی، مجھے بتایا گیا یہ موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کی قوم (آرہی) ہے، لیکن تم (آسمان کے) ایک کنارے کی طرف دیکھو، تو میں نے ایک بہت بڑی جماعت کو دیکھا، پھر مجھے کہا گیا دوسرے کنارے کی طرف دیکھو ادھر بھی ایک بہت بڑی جماعت تھی، پھر مجھے بتایا گیا یہ تمہاری امت ہے، اور ان کے ساتھ ستر ہزار وہ لوگ تھے جو بغیر حساب اور عذاب کے جنت میں داخل ہو جائیں گے، پھر آپ اٹھے اور اپنے گھر تشریف لے گئے، تو لوگوں نے غور وفکر شروع کیا کہ وہ کون لوگ ہوں گے جو بغیر حساب اور بغیر عذاب کے جنت میں داخل ہوں گے؟ بعض حضرات کہنے لگے وہ نبی کریم ﷺ کی مصاحبت میں رہنے والے ہوں گے (یعنی صحابہ کرام ہوں گے) بعض لوگ کہنے لگے کہ یہ وہ حضرات ہوں گے جن کی پیدائش اسلام پر ہوئی، اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ٹھہرایا، اسی طرح لوگوں نے چند چیزوں کا ذکر کیا (یعنی اپنی اپنی رائے پیش کی کہ وہ فلاں لوگ ہوں گے، وہ فلاں لوگ ہوں گے) تو نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے، آپ نے فرمایا " تم کس چیز میں غور وفکر کر رہے ہو؟ صحابہ کرام نے آپ کو خبر دی (کہ ہم ان لوگوں کے متعلق غور وفکر کر رہے ہیں کہ وہ کون لوگ ہوں گے جو بغیر حساب وعذاب کے جنت میں داخل ہوں گے) تو آپ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جو جنتر منتر نہ کریں گے اور نہ کروائیں گے، اور داغ نہیں دیں گے اور فال نہیں نکالیں گے، اپنے رب پر توکل کریں گے، عکاشہ بن محصن کھڑے ہوئے، آپ نے عرض کیا آپ اللہ تعالیٰ سے دعاء کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان سے کردے، تو آپ نے فرمایا تم ان میں سے ہی ہوگے، پھر ایک اور شخص (انصار میں سے) کھڑے ہوئے، عرض کیا، آپ اللہ تعال سے دعاء کریں کہ مجھے ان میں سے کردے، آپ نے فرمایا " عکاشہ تم سے سبقت لے گئے" (منقول از ابن کثیر وصابونی)

خیال رہے جنتر، منتر اور فال کی بحث پہلے پارہ میں تفصیلی طور پر بیان کی جا چکی ہے۔

❁ واخرج احمد بسند عن علی (ﷺ) قال قال رسول الله ﷺ اعطیت مالم یعط احد من الانبیاء نصرت بالرعب واعطیت مفاتیح الارض وسمیت احمد وجعل التراب لی طهورا وجعلت امتی خیر الامم"

مسند احمد میں مسند حسن سے حضرت علی ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے وہ دیا گیا جو انبیاء کرام میں سے کسی ایک کو بھی نہیں دیا گیا، میری رعب سے امداد کی گئی، مجھے زمین کی چابیاں دے دی گئیں، اور میرا نام احمد رکھا گیا، اور مٹی میرے لئے پاک کرنے والی بنائی گئی (کیونکہ تیمم سے پاکیزگی حاصل ہونا اس امت کی خصوصیت ہے) اور میری امت کو سب امتوں سے افضل بنایا گیا۔ (منقول از درمنثور)

❁ واخرج عبد بن حمید وابن ابی حاتم عن عطیة فی الآیة قال خیر الناس للناس شهدتهم للنبیین الذین کذبهم قومهم بالبلاغ"

عطیہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ سب لوگوں سے بہتر تم لوگ ہو کیونکہ تم انبیاء کرام کے حق میں گواہی دو گے جب ان کی قومیں ان کی تبلیغ کی تکذیب کریں گے۔ (منقول از درمنثور)

فائدہ: (وتؤمنون بالله) ای ایمانا متعلقا بکل مایجب ان یؤمن به من رسول و کتاب وحساب وجزاء"

آیہ کریمہ میں جو ارشاد ہے "وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ" (اور تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر) اس سے مراد ہر اس چیز پر ایمان رکھنا ضروری ہے جس پر ایمان رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، یعنی تمہارا ایمان رسولوں پر اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر اور حساب اور جزاء (یعنی یوم آخرت) پر ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

(للناس) انما عبر باللام دون من اشارة الی ان هذه الامة نفع ورحمة لنفسها وللخلق عموما فی الدنیا بالدعاء لجمیع الامم وفی الآخرة بالشهادة للانبیاء"

(للناس) میں لام ذکر کیا ہے "من" نہیں ذکر کیا، یعنی "مِنَ النَّاسِ" نہیں کہا، اس سے اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ امت اپنے لئے بھی نفع اور رحمت ہے، اور تمام مخلوق کیلئے بھی، کیونکہ تمام امتوں کیلئے دعاء کریں گے دنیا میں، اور آخرت میں انبیاء کرام کے حق میں گواہی دیں گے۔ (صاوی)

خطاب کا فائدہ: (کنتم) خطاب کا صیغہ ہے، غیب کے صیغہ سے خبر نہیں دی گئی جس کا فائدہ یہ ہے۔

واختیرت صیغة الخطاب تشریفا لهم واشارة الی رفع الحجب عنهم حیث خاطبهم ولم یخبر عنهم والهم مقربون من حضرة الله"

کہ اس امت کی شرافت وفضیلت ظاہر کرنا مقصود ہے، کہ ان کو خطاب کر کے گویا کہ ان سے حجاب اٹھایا گیا، غیب کے صیغہ سے صرف خبر نہیں دی گئی تا کہ ان کا اللہ تعالیٰ کا مقرب ہونا سمجھ آئے۔ (صاوی)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

لَنْ یَّضُرُّوْكُمْ اِلَّاۤ اَذًى وَاِنْ یُّقَاتِلُوْكُمْ یُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا یُنْصَرُوْنَ ○ (آیۃ نمبر ۱۱۱)

(1) وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑیں گے مگر یہی ستانا اور اگر تم سے لڑیں تو تمہارے سامنے سے پیٹھ پھیر جائیں گے، پھر ان کی مدد نہ ہوگی۔ (کنزالایمان)

(2) ہرگز وہ ضرر نہیں پہنچا سکیں گے تمہیں مگر ستانا، اور اگر وہ لڑائی کریں تمہارے ساتھ وہ پھیر جائیں گے تم سے پیٹھ، پھر ان کی مدد نہیں کی جائے گا۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول:

یہودی رئیسوں نے جب ایمان لانے والے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھیوں کو ان کے اسلام لانے پر ستانا شروع کیا تو اس وقت اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا گیا۔

(لَنْ یَّضُرُّوْكُمْ اِلَّاۤ اَذًى) یعنی لن یضروکم ایھاالمؤمنون ھؤلاء الیھود الاذی یعنی باللسان من طعنھم فی دینکم اوتھدیداو القاء شبھة وتشکیک فی القلوب وکل ذلک یوجب الاذی والغم"

یعنی اے مومنو یہ یہود تمہیں ہرگز کوئی ضرر (تکلیف) نہیں پہنچا سکیں گے سوائے ستانے کے، یعنی زبان سے وہ تمہارے دین میں طعن کریں گے، تمہیں دھمکیاں دیں گے، اور دین کے متعلق تمہارے دلوں میں شکوک وشبہات ڈالیں گے، یہ تمام چیزیں تمہیں ستانے اور غم میں ڈالنے کا ذریعہ ہوں گی۔ (ماخوذ از خازن)

﴿وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ﴾

اگر وہ تمہارے ساتھ لڑائی کریں تو وہ تم سے پیٹھ پھیر جائیں گے، پھر ان کی امداد نہیں کی جائے گی۔

"هكذا وقع فانهم يوم خيبر اذلهم الله وارغم انوفهم وكذلك من قبلهم من يهود المدينة بني قينقاع وبني النضير وبني قريظة كلهم اذلهم الله"

اللہ تعالی کا ارشاد گرامی واضح طور پر سچا ہو چکا ہے، خیبر میں اللہ تعالی نے یہود کو شکست دے کر ذلیل کیا اور ان کا ناک خاک آلود کیا، اور اسی طرح خیبر سے پہلے مدینہ طیبہ کے یہود بنی قینقاع اور بنی نضیر اور بنی قریظہ کو اللہ تعالی نے ذلیل کیا، مسلمانوں کے مقابل ان کو شکست ہوئی، اور اللہ تعالی نے ان کی کوئی امداد نہیں فرمائی۔ (صابونی، ابن کثیر)

یہود کے ستانے کے مختلف انداز:

کبھی نبی کریم ﷺ پر طعن کر کے مسلمانوں کو ستایا گیا، اور کبھی حضرت عیسی علیہ السلام پر طعن کر کے مسلمانوں کو ستایا گیا، کسی نبی کی شان میں کوئی نازیبا الفاظ استعمال کئے جائیں تو مسلمان کو اذیت پہنچتی ہے، اور مسلمان کا خون کھول اٹھتا ہے، کبھی یہود کلمات کفر اپنی زبانوں پر جاری کر کے مسلمانوں کو ستاتے، اور حضرت عزیز علیہ السلام کو اللہ تعالی کا بیٹا کہہ کر کبھی ستاتے۔ اگر چہ آیۃ کریمہ یہود کے بارے میں نازل ہوئی لیکن "الكفر ملة واحدة" (کافر سب ایک گروہ ہیں) کے مصداق کے مطابق نصرانیوں نے حضرت عیسی علیہ السلام کو رب تعالی کا بیٹا کہہ کر، اور بعض نصرانیوں نے مستقل خدا کہہ کر اور بعض نصرانیوں تین خداؤں میں سے ایک خدا عیسی ہیں کہہ کر ستایا، یہود کی طرح نصرانیوں نے بھی مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات ڈال کر مسلمانوں کو ستایا۔

آیۃ کریمہ غیبی خبروں پر مشتمل:

واعلم ان هذه الآية اشتملت على الاخبار عن غيوب كثيرة، منها ان المؤمنين آمنون ضررهم ومنها انه لا يحصل لهم قوة وشوكة بعد الانهزام، وكل هذه الاخبار وقعت كما اخبر الله عنها فان اليهود لم يقاتلوا الا انهزموا وما اقدموا على محاربة وطلب رياسة الا خذلوا وكل ذلك اخبار عن الغيب فيكون معجزا"

یقینی بات ہے کہ یہ آیۃ کریمہ بہت سی غیبی خبروں پر مشتمل ہے، یعنی یہ بیان کیا گیا کہ مؤمنین یہودیوں کے ضرر سے امن میں رہیں گے، اور یہ بتایا گیا کہ اگر مؤمنین سے انہوں نے لڑائی کی تو ان کو شکست

ہوگی، اور یہ بتایا گیا کہ شکست کے بعد ان کو قوت وشوکت حاصل نہیں ہوگی، یہ تمام غیبی خبریں ہیں جو نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہیں۔ (کبیر)

فائدہ: قرآن پاک کی اس ایک آیۃ کریمہ میں کئی غیبی خبریں نبی کریم ﷺ کو دی گئیں، سارے قرآن پاک میں کتنی ہی غیبی خبریں دی گئیں، اہل علم سے مخفی نہیں، غیبی خبریں نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے، معجزہ کا انکار روز روشن کے انکار کے مترادف ہے۔ (راقم)

مقام توجہ: آج تک یہود اپنے قدموں پر نہیں کھڑے ہوسکے اور قیامت تک ان شاء اللہ وہ ذلیل ہوتے رہیں گے، باوجود اس کے کہ خونخوار درندہ امریکہ ان کی پشت پناہی کررہا ہے، انہیں اسلحہ دے رہا ہے، لیکن کبھی چند فلسطینی بنی اسرائیل (یہودیوں) کی نیند حرام کردیتے ہیں، چند بے سروسامان مسلمانوں کے ہاتھوں اسے ذلت اٹھانی پڑتی ہے، اور آجکل لبنانی حزب اللہ کے ہاتھوں ذلیل ہورہا ہے، اگرچہ اسلامی حکومتوں میں گھسے ہوئے قادیانی بھی امریکیوں کی طرح یہودیوں (بنی اسرائیل) کی پشت پناہی کررہے ہیں لیکن پھر بھی وہ ذلیل وخوار ہورہے ہیں، سبحان اللہ مولائے کائنات تیرے وعدے کتنے سچے، پکے حق پر مبنی ہیں جن کو دیکھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ مسلح یہودی امریکہ کی امداد کے باوجود مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی جماعتوں سے ذلیل ہورہے ہیں۔ (راقم)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

﴿ثُمَّ لَا یُنْصَرُوْنَ﴾ میں لفظ "ثم" ذکر کیا گیا جو تراخی رتبی پر دلالت کررہا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ "ان الاخبار بتسلیط الخذلان علیھم اعظم من الاخبار بتولیتھم الادبار" پہلے ان کا لڑائی میں پیٹھ پھیر جانے کا ذکر کیا گیا، پھر ان کی امداد نہ کرنے کا ذکر فرمایا، اس میں ان کی ذلت کا ذکر کیا گیا، ان کی رسوائی وذلت کی خبر ان کے پیٹھ پھیرنے کی خبر سے عظیم ہے۔ (کبیر)

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَاثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ O (آیۃ نمبر ۱۱۲)

(1) ان پر جمادی گئی خواری جہاں ہوں امان نہ پائیں مگر اللہ کی ڈور اور آدمیوں کی ڈور سے اور غضب الٰہی کے سزاوار ہوئے اور ان پر جمادی گئی محتاجی یہ اس لئے کہ وہ اللہ کی آیتوں سے کفر کرتے اور پیغمبروں کو ناحق شہید کرتے یہ اس لئے کہ نافرمانبردار اور سرکش تھے۔ (کنز الایمان)

(2) مسلط کردی گئی ان پر ذلت جہاں پائے جائیں، مگر اللہ کی رسی اور لوگوں کی رسی سے، اور وہ ٹھہرے اللہ کے غضب میں، اور مسلط کردی گئی ان پر مسکینی، یہ بسبب اس کے کہ بیشک وہ کفر کرتے اللہ کی آیتوں سے اور وہ شہید کرتے انبیاء کرام کو ناحق، یہ بسبب اس کے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔ (نجوم الفرقان)

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَاثُقِفُوْٓا﴾

"مسلط کردی گئی ان پر ذلت جہاں بھی وہ پائے گئے۔"

"والمعنی جعلت الذلة ملصقة بهم کالشئی یضرب علی الشئی فیلصق به"

"ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ" کا معنی یہ ہے کہ ذلت ان کے ساتھ ملادی گئی (یعنی چپکا دی گئی) جب ایک چیز کے اوپر دوسری چیز ہو اور وہ نیچے والی چیز سے مل جل جائے چپک جائے تو اس وقت یہ لفظ بولے جاتے ہیں "ضرب الشئی علی الشئی" کبھی ایک چیز دوسری کے اوپر آجائے، ملے اور چپکے نہیں تو اس کیلئے بھی یہی الفاظ استعمال کردیئے جاتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے "ضرب علیهم الخباء" ان پر خیمہ لگادیا گیا۔ "الذلة هی الذل" "ذلت" اور "ذل" کا ایک ہی معنی ہے، ان پر ذلت چھا جانے سے کیا مراد ہے؟

"ان المراد ان یحاربوا ویقتلوا وتغنم اموالهم وتسبی ذراریهم وتملک اراضیهم"

اس سے مراد یہ ہے کہ ان سے لڑائی کی جائے اور ان کو قتل کردیا جائے اور ان کی اولاد کو قید کرلیا جائے اور ان کا مال، مال غنیمت بنالیا جائے، اور ان کی زمین کی ملکیت حاصل ہو جائے۔ (کبیر)

﴿ اَیْنَ مَاثُقِفُوْا ﴾ ''جہاں بھی وہ پائے جائیں۔''

یہ رب تعالیٰ کے اس ارشادگرامی کے مطابق ہے'' اُقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ''ان کوقتل کرو جہاں بھی تم ان کو پاؤ۔ (کبیر)
(اَیْنَمَاثُقِفُوْا)وجدوا'' جہاں بھی وہ پائے جائیں ''ثقف يثقف ثقفا'' پالینا''ثُقِفُوْا''مجہول ہے پالئے جائیں۔
''فی ای مكان وای زمان وجدوافی دارالاسلام الزموا الذل'' یعنی داراسلام میں جہاں بھی اور جس وقت بھی پائے جائیں ذلت ان کے ساتھ لازم کردی گئی۔ (بیضاوی،شیخ زادہ)

ان کی ذلت کی اوروجوہ:

ایک وجہ پہلے قریب ہی ذکر ہو چکی ہے،دوسری وجہ یہ ہے ''وقیل المراد ضرب الجزية عليهم لانه يوجب الصغار ولذلة'' کہ ان پر جزیہ مقرر کرکے ان کوذلیل کردیا جائے گا۔

''وقيل المرادبه انک لاتری فیهم ملكاقاهر اولارئيسامعتبراوانماتراهم مستحقرين في جميع البلاد ذليلين مهانين''
اوران کی ذلت کی تیسری وجہ یہ بیان کی گئی کہ بیشک تم ان میں کوئی قاہر بادشاہ اورکوئی معتبر رئیس نہیں دیکھو گے،بیشک تم ان کوتمام شہروں میں ذلیل ہوتا ہوااوررسوا ہوتا ہوا دیکھو گے۔

''وقیل المرادبه كونهم اذلاء فيمابين المسلمين المؤمنين بسبب كفرهم وتمسكهم بالدين المنسوخ بل بالطريقة المخترعة الباطلة فی نفسها''
اوربعض حضرات نے ان کی ذلت کی چوتھی وجہ یہ بیان کی کہ وہ مسلمانوں،مومنوں میں کفر کی وجہ سے،اور منسوخ دین پرعمل کرنے اوراس پر سہارالگانے کی وجہ سے ان پر ذلت مسلط کردی گئی،بلکہ ان کا اپنا من گھڑت دین ان کے ایمان وعمل کا ذریعہ تھا،جوسراسر باطل ہے،یہی وجہ ان کی ذلت کی تھی۔

سب سے بہتر قول:

والظاهر ابقاء الذل علی عمومه اذلاوجه لتخصيصه بلامخصص''
ظاہر بات یہی ہے کہ ان کی ذلت کو عام رکھا جائے،کسی مخصص کے بغیر ان کے ساتھ کسی خاص ذلت کو مختص نہ کیا جائے،یعنی مراد یہ لی جائے کہ ان پر ہرقسم کی ذلت مسلط کردی گئی۔ (شیخ زادہ)

﴿اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ﴾ " مگر اللہ کی رسی اور لوگوں کی رسی سے۔"

یعنی ان پر ذلت مسلط کر دی گئی وہ جہاں بھی ہوں گے، سوائے اس کے کہ انہوں نے اللہ کی رسی اور لوگوں کی رسی کا سہارا لے لیا تو وہ ذلت سے اپنے آپ کو بچا سکیں گے۔

اللہ کی رسی سے مراد کیا ہے؟

(اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ)یعنی الا بعهدمن الله وهو ان يسلموا فتزول عنهم الذلة "

اللہ تعالیٰ کی رسی سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے یوم میثاق کو کئے ہوئے وعدہ کے مطابق اسلام لے آئیں تو مکمل طور پر ان سے ذلت دور کر دی جاتی ہے، یعنی اسلام قبول کر کے انہوں نے اپنے آپ سے ذلت کو دور کر لیا۔ (خازن)

لوگوں کی رسی سے مراد کیا ہے؟

(وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ)یعنی المؤمنين ببذل الجزية "لوگوں کی رسی سے مراد یہ ہے کہ مؤمنوں سے جزیہ دینے کا معاہدہ کر کے دنیا میں اپنے آپ کو قتل ہونے اور اولاد کے قید کئے جانے اور مال کو مال غنیمت بنائے جانے کی ذلت سے بچا لیتے ہیں۔ (خازن)

اللہ کی رسی اور لوگوں کی رسی کا ایک اور مطلب:

ان پر ذلت اس طرح مسلط کر دی گئی جیسا کہ خیمہ کسی پر لگا دیا جائے، یہ ذلت ان پر تمام احوال میں مسلط رہے گی سوائے اس کے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری اور مسلمانوں کی ذمہ داری کا سہارا لے لیا، حبل سے مراد عہد ہے، کیونکہ یہ سبب ہے نجات کا، اور مراد پر کامیاب ہونے کا، عہد کا لفظ استعمال کریں یا ذمہ داری کا بظاہر تو دونوں جگہ پر ایک ہی لفظ " حبل " استعمال ہے، لیکن حقیقت میں فرق ہے، فرق کی وجہ ہے "وعطف قوله (وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ)على قوله(بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ)يقتضى المغايرة "وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ" کا عطف ہے "حَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ" پر ان دونوں میں مغائرت ہے کیونکہ معطوف علیہ اور معطوف میں مغایرت پائی جاتی ہے۔

وہ وجہ فرق یہ ہے:

"قال الامام فى وجهه الامان الحاصل للذمى قسمان،احدهما الذى نص الله عليه

وھو الامان الحاصل له باعطاء الجزیة عن یدوقبول ایاھا،والثانی الامان الذی فوض الی رای الامام واجتھاده فیعطیھم الامان مجاناتارة وببدل زائداوناقص اخری علی حسب اجتھاده فالاول ھو المسمی بحبل اللہ والثانی ھو المسمی بحبل المؤمنین فالامانان واقعان بمباشرة المسلمین الاانھمامتغایران بالاعتبار"

امام (رازی) نے بیان کیا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ امان جو ان کو حاصل ہوتی ہے،اس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس پر اللہ تعالی نے نص بیان فرمائی۔

﴿قَاتِلُوْا الَّذِیْنَ لَایُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلَابِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَایُحَرِّمُوْنَ مَاحَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَلَایَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوْا الْکِتَابَ حَتّٰی یُعْطُوْا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍوَّھُمْ صَاغِرُوْنَ﴾ (سورة التوبة،آیة نمبر ۲۹)

لڑو ان سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور قیامت پر اور حرام نہیں مانتے اس چیز کو جس کو حرام کیا اللہ اور اس کے رسول نے اور سچے دین کے تابع نہیں ہوتے یعنی وہ جو کتاب دے گئے جب تک اپنے ہاتھ سے جزیہ نہ دیں ذلیل ہو کر یعنی پہلی قسم امان کی وہ ہے جو نص (قرآن پاک) سے ثابت ہے،ان کا جزیہ دینا،یہ ہے "حَبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ" دوسری قسم جو حاکم ان سے صلح کرے،کبھی بغیر مال لینے کے ان سے کچھ شرائط پر صلح کر لی جاتی ہے،کبھی مقرر جزیہ سے کم مال مقرر کر کے اور کبھی زائد مال مقرر کر کے ان سے صلح کی جاتی ہے اور انہیں امان دی جاتی ہے،اسے "حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ" کہا گیا،بظاہر دونوں امانیں حاکم کی طرف سے ہی دی جاتی ہیں،لیکن ان میں فرق واضح طور پر پایا گیا ہے۔ (ماخوذ از روح البیان)

﴿وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ﴾ "اور وہ ٹھہرے اللہ کے غضب میں۔"

معناہ انھم مکثوا،ولبثوا وداموا فی غضب اللہ" اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ٹھہرے اور رکے اور ہمیشہ اللہ کے غضب میں رہے۔

"واصل ذلک ماخوذ من البوء وھو المکان،ومنه تبوأفلان منزل کذا،وبوأته ایاہ"

اصل میں "بَاءُوْا" ماخوذ ہے "بوء" سے،جس کا معنی مکان،جس طرح کہا جاتا ہے "تبوأفلان منزل کذا" فلاں شخص اسطرح کے گھر میں رہا،اور یہ کہا جاتا ہے "بوأته ایاہ" میں نے اسے فلاں جگہ ٹھہرایا۔ (کبیر)

راقم نے تفسیر کبیر کے مطابق ترجمہ کیا ہے اور اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ بیضاوی اور روح المعانی کے مطابق ہے۔

"وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ"ای رجعوابه وھو کنایة عن استحقاقھم له واستیجابھم ایاہ"

وہ اللہ تعالیٰ کے غضب سے لوٹے ، اشارۃ معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہوئے اور انہوں نے اپنے افعال سے اللہ کے غضب کو قبول کیا۔ (روح المعانی)

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ﴾ ''اور مسلط کردی گئی ان پر مسکینی۔''

یعنی وہ غالب اوقات مسکین رہیں گے، ایسا یہودی کم ہی ملے گا جو اپنا غنی ہونا ظاہر کرے گا، وہ اپنی مسکینی کا ہی اظہار کرتے رہیں گے۔ (روح المعانی)

ان کے مسکین رہنے کی اور وجہ یہ ہے کہ ان پر جزیہ مقرر ہوگا، وہ جزیہ ادا کرنے کی وجہ سے مسکین ہوں گے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے یہی تفصیل بیان کی، اور وجہ یہ ہے کہ یہود کا مال مسلمانوں کے ہاتھ آیا، وہ خود مسکین ہوگئے، خیبر کی یہودیوں کا مال مسلمانوں کے ہاتھ آیا، بنوقینقاع اور بنونضیر کا مال مسلمانوں کے ہاتھ آیا، جس کی وجہ سے وہ مسکین ہوگئے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾

''یہ بسبب اس کے کہ بیشک وہ کفر کرتے اللہ کی آیتوں سے اور وہ شہید کرتے انبیاء کو ناحق۔''

پہلے تین مکروہات یہود کے ذکر فرمائے، ان کے ساتھ ذلت کو لازم کردیا گیا، اور اللہ تعالیٰ کا غضب ان کے ساتھ لازم کردیا گیا، اور مسکینی ان کیلئے لازم کردی گئی، پھر ان تینوں چیزوں کے لازم ہونے کی وجہ بیان کی گئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرتے، اور انبیاء کو ناحق کرتے۔ (کبیر)

سوال: یہ ارشاد تو میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کے زمانہ کے یہودیوں سے ہے، حالانکہ انہوں نے تو انبیاء کرام کو شہید نہیں کیا تھا، تو اس کا کیا مطلب ہے؟

جواب: ان ھؤلاء المتاخرین وان کان لم یصدر عنهم قتل الانبیاء علیهم السلام لکنهم کانوا راضین بذلک''

نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود سے اگرچہ انبیاء کرام کا قتل صادر نہیں ہوا، لیکن وہ اپنے اسلاف کے اس فعل پر راضی تھے، اس وجہ سے خطاب ان کو کیا گیا۔

﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾

''یہ بسبب اس کے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔''

(ذلک)اشارة الی کفرهم وقتلهم الانبیاء علیهم السلام علی مایقتضیه القرب فلاتکرار"
ایک احتمال یہ ہے کہ " ذلك" کا اشارہ ان کے کفر اور انبیاء کرام کو ناحق شہید کرنے کی طرف ہو، جو
کا"قرب" تقاضا کرتا ہے، اس صورت میں کوئی تکرار نہیں۔ (روح المعانی)

اب مطلب یہ ہوگا کہ ان پر ذلت کا مسلط ہونا، اور ان پر مسکینی کا مسلط ہونا، اور غضب کا ان کے ساتھ لازم ہونا اس کی وجہ اور سبب ان کا کفر اور قتل الانبیاء تھا، اور کفر اور انبیاء کرام کو ناحق شہید کرنے کی وجہ اور اس کا سبب ان کی نافرمانی اور حد سے تجاوز تھا۔ **دوسرا** احتمال یہ ہے کہ کفر، قتل الانبیاء اور نافرمانی اور حد سے تجاوز کرنا تمام ہی سبب ہوں، ان پر ذلت وغیرہ کے مسلط کئے جانے کے، تو اس صورت میں مندرجہ ذیل سوال و جواب ہوں گے۔

سؤال: (ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا) تو تکرار پر دلالت کر رہا ہے، اور تکرار کی کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی، کیونکہ تکرار آتا ہے تاکید کیلئے، اور تاکید کیلئے ضروری ہے کہ وہ مؤکد سے قوی ہو، چونکہ عصیاں میں کفر سے کمی ہے، لھذا اس کی تاکید تو ہو نہیں سکتی، تو اس تکرار کا فائدہ کیا؟

جواب: ذلت اور غضب اور مسکینی کا سبب "کفر اور قتل انبیاء" ہے، اور کفر اور قتل انبیاء کا سبب نافرمانی تھی، لیکن جب وہ مکمل طور پر نافرمانیاں ہی فرمانیاں کرتے رہے ان کے گناہ بڑھتے رہے، تو ان کا نور ایمان ضعیف ہوتا چلا گیا۔

"ولم یزل کذلک الی ان بطل نور الایمان وحصلت ظلمة الکفر"

تو اسی وجہ سے ان کا نور ایمان باطل ہو گیا اور ان کو کفر کی ظلمت وتاریکی حاصل ہو گئی، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ﴾ ہرگز ایسا نہیں (قرآن پہلے لوگوں کی کہانیاں نہیں) بلکہ زنگ ان کے دلوں پر ہے بوجہ اس کے کہ جو وہ کسب کرتے تھے۔ اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کی نافرمانی بھی کفر سے کم نہیں تھی، بلکہ وہ کفر کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی، تاہم آخر میں اس جواب کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے جس انداز پر بیان کیا ہے، روح المعانی نے وہی نقل کیا جو بیان کیا جا چکا ہے۔ کبیر میں یوں ذکر کیا گیا۔

"فقوله (ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا) اشارة الی علة العلة" اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی "ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا" علت کی علت کی طرف اشارہ ہے، یعنی نافرمانی کو کفر اور قتل انبیاء کا سبب بتایا گیا۔

کبھی مستحبات کی ترک کا انجام کفر ہو جاتا ہے:

ولهذا المعنی قال ارباب المعاملات من ابتلی بترک الآداب وقع فی ترک

السنن،ومن ابتلی بترک السنن وقع فی ترک الفریضة،ومن ابتلی بترک الفریضة وقع فی استحقار الشریعة ومن ابتلی بذلک وقع فی الکفر"

اوپر جو بیان ہوا "علت کی علت کی طرف اشارہ ہے" اس کے بعد علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا یہی وجہ ہے کہ ارباب معاملات نے کہا ہے "جو شخص مستحبات کو چھوڑنے میں مبتلاء ہوتا ہے، وہ سنت کو چھوڑنے کا عادی ہوجاتا ہے، اور جو سنت کے چھوڑنے میں مبتلاء ہوجاتا ہے وہ فرض کے چھوڑنے میں واقع ہوجاتا ہے، اور جو فرض کو چھوڑنے میں مبتلاء ہوجاتا ہے وہ شریعت کو حقیر سمجھنا شروع کرلیتا ہے، جو شریعت کو حقیر سمجھے وہ کافر ہوجاتا ہے، اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو فرض نماز کے بعد اور نماز جنازہ کے بعد دعاء کرنے سے روکتے ہیں، سوم، چہلم اور تعزیت کی دعاؤں سے منع کرتے ہیں، یہ مستحبات ہیں، ان کے تارک اور ان سے منع کرنے والے اپنے انجام کی فکر کریں۔

جواب دوم: اس میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ ﴿ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ﴾ پہلے گزرے ہوئے یہود کے ذلت، مسکینی اور غضب میں مبتلاء ہونے کی علت ہو، اور "ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا" بعد والے یہود (جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں تھے) کے ذلت وغیرہ میں مبتلاء ہونے کی علت اور وجہ ہو، اس میں کوئی تکرار لازم نہیں آتا۔

"فکانه تعالی بین علة عقوبة من تقدم ثم بین ان من تأخر لماتبع من تقدم کان لأجل معصية وعداوته مستوجبالمثل عقوبتهم حتی یظهر للخلق ان ماانزله الله بالفریقین من البلاء والمحنة لیس الامن باب العدل والحکمة"

گویا کہ اللہ تعالی نے پہلے لوگوں کی سزا کا ذکر کیا، اور اس سزا کے مستحق ہونے کی وجہ بھی بیان کی، اس کے بعد، پیچھے آنے والوں کی سزا کا ذکر کیا کہ ان کی سزا بھی پہلے لوگوں کی تابعداری کی وجہ سے وہی ہے جو پہلوں کی ہے البتہ اس کی وجہ ان کی معصیت اور عداوت ہے، اللہ تعالی نے دونوں فریقوں کی سزاؤں کا ذکر کیا اور ان کے اسباب بھی بیان کیے، جس سے یہ ظاہر کیا کہ یہ اللہ تعالی کے عدل اور اس کی حکمت کا تقاضا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

❁ واخرج ابن جریروابن حاتم عن الحسن "ضربت علیهم الذلة" قال اذلهم الله فلامنعة لهم وجعلهم الله تحت اقدام المسلمین "

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے "ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ" کی تفسیر بیان کی کہ اللہ تعالی نے ان کو ذلیل کردیا، ان کو کوئی طاقت اور دبدبہ حاصل نہیں ہوگا، اور اللہ تعالی نے ان کو مسلمانوں کے قدموں کے نیچے کردیا۔

(از در منثور)

❁ واخرج ابن جریروابن المنذروابن ابی حاتم عن قتادة فی قوله (ذٰلِکَ

بِمَاعَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ)قال فاجتنبوا المعصیة والعدوان فان بهماهلک من هلک قبلکم من الناس"

حضرت قتادہ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ذٰلِکَ بِمَاعَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ﴾ کی تلاوت کے بعد مسلمانوں کو تنبیہ کی کہ معصیت اور حد سے تجاوز سے بچ جاؤ، ان دو چیزوں کی وجہ سے تم سے پہلے لوگ ہلاک ہو گئے۔ (درمنثور)

آیات سے مراد کونسی آیات ہیں؟ جن سے وہ کفر کرتے ہیں:۔

"آیات الله الناطقة بنبوة محمدﷺ وتحریفهم لهاوبسائر الآیات القرآنیة"

آیات سے مراد ان کی آسمانی کتاب توراۃ کی وہ آیات ہیں جو نبی کریمﷺ کی نبوت پر دلالت کرتی تھیں، ان سے یہود نے انکار کیا، اور ان کی تحریف کی، اور اسی طرح قرآن پاک کی تمام آیات کا انہوں نے انکار کیا۔ (تفسیر ابی السعود)

(ذٰلِکَ)اشارة الی ماذکرمن الکفروالقتل(بِمَاعَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ)ای کائن بسبب عصیانهم واعتدائهم حدودالله تعالی علی الاستمرارفان الاصرارعلی الصغائریفضی الی مباشرة الکبائروالاستمرارعلیهایؤدی الی الکفر"

یہ ان کا کفر اور قتل انبیاء بسبب نافرمانی کے تھا، کیونکہ وہ ہمیشہ ہی نافرمانی کرتے رہے، اور اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرتے رہے، کیونکہ صغائر پر ہمیشہ قائم رہنا کبیرہ گناہوں کی طرف پہنچادیتا ہے، اور کبیرہ پر ہمیشہ قائم رہنا کفر تک پہنچادیتا ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

"فعلی المؤمن ان لایفتح باب المعصیة علی نفسه خوفامما یؤدی الیه بل ویترک ایضابعض ماابیح له"

مؤمن کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ پر معصیت کا دروازہ نہ کھولے، اس خوف سے کہ کہیں معصیت میں مبتلاء نہ ہو جائے، بلکہ جن مباح چیزوں کی وضاحت کر دی گئی لیکن کچھ شبہ ان کے ناجائز ہونے کا ہو تو ایسی مباح چیزوں کو بھی چھوڑ دینا تقویٰ ہے۔

"وقالﷺ الحلال بین والحرام بین وبینهماامورمشتبهات فمن اتقی الشبهات استبراء لعرضه ومن وقع فی الشبهات وقع فی الحرام کالراعی حول الحمی یوشک ان یقع فیه"

نبی کریمﷺ نے فرمایا حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں، جو شخص شبہات سے بچ گیا اس نے عزت اور دین کو بچالیا، اور جو شخص شبہات میں واقع ہو گیا (گویا کہ) وہ حرام میں واقع ہو گیا

،جیسا کہ چرواہا حد بندی کے اردگرد جانوروں کو چرائے تو قریب ہے کہ اس میں واقع ہو جائے۔ (منقول از روح البیان)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

لَيۡسُوۡا سَوَاءً مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتَابِ اُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَّتۡلُوۡنَ آيَاتُ اللّٰهِ آنَاءَ الَّيۡلِ وَهُمۡ يَسۡجُدُوۡنَ○ (آیۃ نمبر ۱۱۳)

(1) سب ایک سے نہیں کتابیوں میں کچھ وہ ہیں کہ حق پر قائم ہیں اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں رات کی گھڑیوں میں اور سجدہ کرتے ہیں۔ (کنزالایمان)

(2) وہ سب برابر نہیں، اہل کتاب سے ایک گروہ وہ ہے جو قائم رہنے والے ہیں، تلاوت کرتے ہیں اللہ کی آیتیں رات کی گھڑیوں میں ایسے حال میں کہ وہ سجدہ کرتے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول:

قال ابن عباس لما اسلم عبداللہ بن سلام واصحابة قالت احبار الیھود ما آمن بمحمدﷺ الاشررنا ولولا ذلک ماترکوا دین آبائھم فانزل اللہ ھذہ الآیة"

(اخرجه الطبرانی والبیھقی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب عبداللہ بن سلام (جو یہودیوں کے بہت بڑے عالم تھے) اوران کے ساتھی ایمان لے آئے تو یہودی علماء کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) کے ساتھ ایمان لانے والے نہیں مگر وہ جو ہم سے شر لوگ ہیں، اگر وہ شریر نہ ہوتے تو وہ اپنے آباء کے دین کو نہ چھوڑتے، ان کے یہ کہنے پر یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔ (تفسیر خازن) درمنثور)

﴿لَيۡسُوۡا سَوَاءً﴾ "وہ سب برابر نہیں۔"

ان الفاظ مبارکہ کا مطلب دو طرح بیان کیا گیا ہے، ایک یہ کہ ان الفاظ پر وقف تام ہے۔

"والمعنی ان اھل الکتاب الذین سبق ذکرھم منھم المؤمنون وَاَكۡثَرُهُمُ الۡفَاسِقُوۡنَ لَيۡسُوۡا سَوَاءً"

اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ "بیشک اہل کتاب جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ" ان میں بعض ایمان لانے والے ہیں، اوران میں سے اکثر کافر ہیں، وہ اہل کتاب سب برابر نہیں، اسی صورت میں بعض حضرات نے ایک اور معنی یہ بیان کیا ہے

"وقیل معناہ لایستوی الیھود وامۃ محمدا القائمۃ بامر اللہ الثابتۃ علی الحق"
کہ یہود اور نبی کریم ﷺ کی امت "جو کہ اللہ تعالیٰ کے امر پر قائم ہے، اور حق پر ثابت ہے" برابر نہیں۔

دوسرا احتمال یہ ہے "لَیْسُوْا سَوَاءً" پر وقف نہ ہو، بلکہ معنوی لحاظ پر اس کا بعد سے تعلق ہو، کیونکہ بعد میں آنے والے جار مجرور (مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ) کا تعلق "لیسوا" سے ہو، اس صورت میں اختصار ہوگا، اور عبارت پوشیدہ ہوگی معنوی عبارت یوں ہوگی "لَیْسُوْا سَوَاءً مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اُمَّۃٌ قَائِمَۃٌ ومنھم امۃ ملعومۃ غیر قائمۃ" کہ سب اہل کتاب برابر نہیں، کیونکہ ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جو حق پر قائم ہے، اور دوسرا گروہ وہ ہے جو حق پر قائم نہیں، چونکہ عرب حضرات دو مخالف چیزوں کا ذکر کرنا ہو تو ایک کو ذکر کر دیتے ہیں کہ دوسری قرائن سے خود بخود سمجھ آ جائے گی، اسی ضابطہ کو یہاں استعمال کیا گیا۔ (خازن)

﴿مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اُمَّۃٌ قَائِمَۃٌ﴾ "اہل کتاب سے ایک گروہ وہ ہے جو قائم رہنے والے ہیں۔"

قائم رہنے سے مراد:

(۱) اس کا ایک مطلب یہ ہے "جماعۃ قائمۃ ای مستقیمۃ عادلۃ" اہل کتاب میں سے ایک جماعت عدل وانصاف پر قائم ہے، یہ لفظ لیا ہوا "قامت العود" لکڑی درست ہوگئی، سیدھی ہوگئی۔ (روح البیان)

(۲) قال ابن عباس قائمۃ ای مھدیۃ قائمۃ علی امر اللہ تعالی لم یضیعوہ ولم یترکوہ"
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا معنی یہ بھی بیان کیا ہے کہ "قائم رہنے سے" مراد یہ ہے کہ اہل کتاب سے ایک گروہ ہدایت پر قائم ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے امر پر قائم ہیں، اس کو انہوں نے چھوڑا نہیں۔

(۳) وقیل قائمۃ علی کتاب اللہ عزوجل وحدودہ" اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے، کہ اہل کتاب سے ایک گروہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کی حدود پر قائم ہے۔

(۴) وقیل قائمۃ فی الصلوۃ" اور معنی یہ ہے کہ اہل کتاب سے ایک گروہ وہ ہے جو نماز میں قیام کرنے والا ہے۔ (خازن)

(۵) قائمۃ بامر اللہ مطیعۃ لشرعہ متبعۃ نبی اللہ" اللہ تعالیٰ کے امر پر قائم رہنے والے ہیں، اور اس کی شریعت کے فرمانبردار ہیں، اور اللہ کے نبی کے تابعدار ہیں۔ (صابونی، ابن کثیر)

یہ پانچواں معنی دوسرے معنی کے کچھ قریب ہے، الفاظ کچھ مختلف تھے تو طلباء کے فائدہ کیلئے علیحدہ ذکر کر دیا ہے۔

(۶) قائمة على كتاب الله وحده "اللہ تعالیٰ وحدہ ذات کی کتاب پر قائم رہنے والے ہیں۔ (معالم التنزیل للبغوی)

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ (کچھ وہ ہیں کہ حق پر قائم) تمام معانی کو شامل ہے **راقم** نے مطلق چھوڑ دیا ہے، یہ ترجمہ کیا ہے (اہل کتاب سے ایک گروہ وہ ہے جو قائم رہنے والے ہیں) تاکہ طلباء کرام جس معنی پر محمول کرنا چاہیں اسی پر محمول کر لیں۔ (محمول کرنا یعنی چسپاں کرنا)

﴿يَتْلُونَ آيَاتِ اللّٰهِ آنَاءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ﴾

''تلاوت کرتے ہیں اللہ کی آیتیں رات کی گھڑیوں میں ایسے حال میں کہ وہ سجدہ کرتے ہیں۔''

اس میں چند مطالب بیان کئے گئے ہیں:

(۱) يعنى يصلون عبر بالسجود عن الصلوة لان التلاوة لاتكون فى السجود"
آیۂ کریمہ میں "یسجدون" سے مراد یہ ہے کہ "وہ نماز پڑھتے" سجدہ سے مراد نماز ہے، کیونکہ سجدہ میں قرآن پاک کی تلاوت نہیں ہوتی، اس قول کے مطابق ان کا مطلق نماز ادا کرنا مراد لیا گیا ہے، کسی نماز کی تخصیص نہیں، یعنی وہ رات کو نوافل ادا کرتے ہیں۔

(۲) وقيل هى صلوة التهجد بالليل" بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ اس نماز سے مراد خاص نماز یعنی تہجد ادا کرنا مراد ہے۔

(۳) وقيل هى صلوة العشاء لان اليهود لايصلونها" بعض حضرات نے کہا اس نماز سے مراد عشاء کی نماز ہے کیونکہ یہود عشاء کی نماز ادا نہیں کرتے تھے۔

(۴) وقيل يحتمل انه اراد بالسجود الخضوع والخشوع لان العرب تسمى الخشوع سجودا"
بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ "وَهُمْ يَسْجُدُونَ" سے مراد خشوع کرنا ہے، کیونکہ عرب حضرات خشوع کا نام سجدہ رکھتے ہیں۔ (ماخوذ از خازن)

(۵) او نزلت فى قوم يصلون صلوة الاوابين وهى اثنتاعشرة ركعة بعد صلوة المغرب"
بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ یہ آیۂ کریمہ ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو مغرب کے بعد بارہ رکعت نماز اوابین پڑھتے تھے۔ (روح البیان)

اوابین اور تہجد کا ذکر قریب ہی (ان شاء اللہ) بیان کیا جا رہا ہے، خشوع کا ذکر پہلے پارہ میں "اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ" کی وضاحت کے ضمن میں آچکا ہے۔

آیۃ کریمہ میں کن لوگوں کا ذکر ہے؟

ایک تو شان نزول میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی مراد ہیں جنہوں نے یہودیت کو چھوڑ کر ایمان قبول کر لیا تھا، اس میں چند اور لوگ بھی اس آیۃ کریمہ کے نزول کا مصداق ہیں، یعنی یہ آیۃ کریمہ مندرجہ ذیل کو شامل ہے، عرب میں سے اہل نجران کے چالیس آدمیوں کو، اور حبشہ کے بتیس آدمیوں کو اور روم کے آٹھ آدمیوں کو شامل ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر قائم تھے پھر نبی کریم ﷺ کی تصدیق کی اور ان پر ایمان لے آئے۔ اسی طرح یہ آیۃ کریمہ انصار کے چند آدمیوں کو بھی شامل ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو اسلام لانے سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرتے تھے، اور جنابت کا غسل کرتے تھے، اور جو بھی ان کو دین حنیف (حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین) کے مسائل کا علم تھا اس پر عمل کرتے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو لے آیا تو انہوں نے آپ پر ایمان لایا اور آپ کی تصدیق کی، اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی اہل کتاب میں شامل کیا کہ وہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے سے پہلے اپنے علم کے مطابق دین ابراہیم علیہ السلام پر قائم تھے۔ (خازن)

صلوٰۃ اوابین: "وست بعدالمغرب لیکتب من الاوابین" (درمختار)

اور چھ رکعت مغرب کے بعد ادا کرے تا کہ اوابین کے درجہ میں اسے لکھ دیا جائے۔

"الاوابین جمع اواب ای رجاع الی اللہ تعالی بالتوبۃ والاستغفار" "اوابین" جمع ہے "اواب" کی اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا توبہ اور استغفار کے ذریعے (شامی) یہی وجہ ہے مغرب کے بعد نوافل کا نام اوابین رکھنے کا، کہ جو لوگ مغرب کے بعد نوافل ادا کرتے ہیں ان کو وہ درجہ حاصل ہو جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے توبہ کرنے والوں کو حاصل ہو جاتا ہے۔

تنبیہ: اگر چہ درمختار میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ چھ رکعت ایک سلام سے یا دو سلاموں سے یا تین سلاموں سے ادا کرے، لیکن اپنا مختار صاحب درمختار نے ان الفاظ سے پیش کیا "والاول ادوم واشق" پہلا قول کہ ایک سلام سے چھ رکعت ادا کرے اس میں نماز لمبی ہوتی ہے اور مشقت اس میں زیادہ ہوتی ہے، مشقت آمیز میں افضلیت پائی جاتی ہے، لیکن علامہ شامی نے ان الفاظ سے اس قول کو رد کیا ہے "وکان جمعھابتسلیمۃ واحدۃ خلاف الافضل" کہ چھ رکعت ایک سلام سے ادا کرنا افضلیت کہ مخالف ہے، اسلئے کہ یہ ثابت ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دو دو رکعت نوافل ادا کرنا افضل ہے، لھذا چھ کو ایک سلام سے ادا کرنے کی افضلیت کا قول باطل ہو گیا۔

"فكان المستحب فيه ثلاث تسليمات ليكون على نسق واحد"
مستحب اس میں تین سلام ہیں تا کہ ایک ہی طریقہ پر تمام رکعتیں ادا ہو جائیں، یعنی دو دو رکعت ادا ہو جائیں گی جو صاحبین کے قول کے مطابق افضل ہیں۔ (ماخوذ از شامی باب النوافل جلد اول صفحہ نمبر ۴۹۸)

❁ وعن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺمن صلى بعدالمغرب ست ركعات لم يتكلم فيمابينهن بسوء عدلن له بعبادة ثنتي عشرة سنة،رواه الترمذی وقال هذاحديث غريب لانعرفه الامن حديث عمر بن ابی خثعم وسمعت محمدبن اسمعيل يقول هو منكر الحديث وضعفه جدا"
حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے مغرب کے بعد چھ رکعت ادا کیں، اور ان میں کوئی بری بات نہ کی تو وہ بارہ سال کی عبادت کے برابر ہوں گی۔

تنبیہ: اگر چہ ترمذی نے یوں بیان کیا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور عمر بن ابی خثعم کے واسطہ سے آتی ہے، اور ترمذی کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن اسمٰعیل بخاری سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ عمر بن ابی خثعم معروف راویوں کے خلاف روایت کرتا ہے اور بہت زیادہ ضعیف ہے۔ علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ میرک کا قول نقل کرنے کے بعد ان کے تضاد پر گرفت کرتے ہیں۔

"قال ميرک نقلاعن المنذری ورواه ابن ماجة وابن خزيمه فی صحيحه"
میرک رحمہ اللہ منذری سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں، یہ روایت ابن ماجہ نے بھی ذکر کی ہے اور ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں بھی نقل کی ہے۔

"قال ميرک ناقلاعن التصحيح والعجب من محی السنة كيف سكت عليه وهو ضعيف باجماع اهل الحديث قلت ينافيه ماتقدم انه رواه ابن خزيمه فی صحيحه مع انهم اجمعواعلى جوازالعمل بالحديث الضعيف فی فضائل الاعمال"

میرک نے تصحیح سے نقل کرتے ہوئے کہا کہ تعجب ہے محی السنۃ پر کہ انہوں نے اس حدیث پر کیسے خاموشی اختیار کی حالانکہ اس حدیث کے ضعیف ہونے پر اجماع ہے۔ علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول میرک کے پہلے قول کے مخالف ہے، کیونکہ وہ پہلے بیان کر چکے ہیں، کہ ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں اسے نقل کیا ہے، جس کی وجہ سے حدیث کا ضعیف ہونا اتفاقی نہ رہا، اور اس پر بھی اجماع ہے کہ ضعیف حدیث پر فضائل اعمال میں عمل جائز ہے۔

"قال ميرک وعن محمد بن عماربن ياسر قال رأيت عماربن ياسر يصلی بعدالمغرب ست ركعات وقال رأيت حبيبی رسول الله ﷺيصلی بعد المغرب ست

رکعات وقال من صلی بعد المغرب ست رکعات غفرت له ذنوبه وان کانت مثل زبد البحر"

میرک کہتے ہیں محمد بن عمار بن یاسر نے کہا میں نے (اپنے باپ) عمار بن بن یاسر کو مغرب کے بعد چھ رکعت ادا کرتے ہوئے دیکھا، اور انہوں نے کہا کہ میں اپنے حبیب رسول اللہ ﷺ کو مغرب کے بعد چھ رکعات ادا کرتے ہوئے دیکھا، اور آپ نے فرمایا جس شخص نے مغرب کے بعد چھ رکعت ادا کیں اس کے گناہ معاف کردیئے جائیں گے خواہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں، (یہ بھی خیال رہے کہ عبادات کہ ذریعے معاف ہونے والے صغائر گناہ ہوتے ہیں، کبائر توبہ سے معاف ہوتے ہیں۔

❁ وعن عائشة قالت قال رسول الله ﷺ من صلی بعدالمغرب عشرین رکعة بنی الله له بیتافی الجنة " (رواه الترمذی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے مغرب کے بعد بیس رکعت ادا کیں اللہ تعالی اس کیلئے جنت میں گھر بنائے گا۔

"وقال ابن حجر وفیهاحدیث آخر، وهوانه علیه السلام کان یصلیهاعشرین ویقول هذه صلوة الاولین فمن صلاهاغفرله"وکان السلف الصالح یصلونهاقال جمع ورویت اربعاورویت رکعتین فاقلهار کعتان واکثرهاعشرون"

ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا اس میں ایک اور حدیث ہے، وہ یہ کہ بیشک رسول اللہ ﷺ (مغرب کے بعد) بیس رکعت ادا کرتے تھے اور فرماتے تھے یہ پہلے لوگوں کی نماز ہے، جس نے یہ نماز ادا کی اس کی مغفرت کردی جائے گی۔ یہ نماز سلف صالحین ادا کرتے رہے، البتہ بعض روایات میں دو رکعت کا ذکر ہے، اور بعض میں چار رکعت کا ذکر ہے، اور بعض میں چھ کا ذکر ہے، اور بعض روایات میں بیس کا ذکر بھی پایا گیا ہے روح البیان کے بارہ رکعت کا قول بھی کیا ہے، ان تمام اقوال میں وجہ تطبیق یہ ہے کہ کم از کم اوابین کی نماز کی دو رکعت ہیں، اور زیادہ سے زیادہ بیس رکعت ہیں۔

(مشکوۃ باب النوافل مع مرقاۃ جلد نمبر ۳، صفحہ نمبر ۱۱۴، ۱۱۵)

رات کی نماز اور تہجد : رات کی نماز عام ہے اور تہجد کی نماز خاص ہے۔

"وما کان بعد صلوة العشاء فهو من اللیل" جو نوافل عشاء کی نماز کے بعد ادا کئے جائیں گے وہ "صلوۃ اللیل" (رات کی نماز) کہلاتی ہے۔

"وهذایفیدان هذه السنة تحصل بالتنفل بعدصلوة العشاء قبل النوم"

اسی سے یہ فائدہ حاصل ہوگیا کہ یہ سنت (غیر مؤکدہ) عشاء کی نماز کے بعد، سونے سے پہلے نوافل ادا کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

"وان التھجد ازالة النوم بتکلف مثل تأثم ای تحفظ عن الاثم نعم صلوۃ اللیل وقیام اللیل اعم من التھجد"

"تہجد" کا معنی ہے تکلف سے نیند کا زائل کرنا، جیسا کہ "تأثم" کا معنی ہے "گناہوں سے دور رہنا" یعنی عشاء کی نماز کے بعد سو جائے پھر نوافل ادا کرنے کیلئے بیدار ہو (جاگے) تو وہ نوافل جو ادا کرے گا ان کو نماز تہجد کہا جائے گا، لیکن عشاء کی نماز کے بعد سوئے یا نہ سوئے جو نوافل عشاء کی نماز کے بعد ادا کرے گا وہ "صلوۃ اللیل" وہ رات کی نماز کہلائے گی، یہی مطلب ہے کہ "صلوۃ اللیل" (رات کی نماز) عام ہے تہجد کی نماز سے کیونکہ تہجد کی نماز عشاء کے بعد سو کر جاگنے کے بعد ادا ہوتی ہے۔

تہجد نوافل ہیں: ان التھجد لا یحصل الا بالتطوع فلو نام بعد صلوۃ العشاء ثم قام فصلی فوائت لا یسمی تھجدا"

بیشک تہجد سوائے نوافل کے حاصل نہیں ہوتے، اگر ایک شخص سو گیا عشاء کی نماز کے، پھر جاگ کر اس نے قضاء نمازیں ادا کیں تو ان کو تہجد نہیں کہا جائے گا۔ (خیال رہے کہ اگرچہ وہ تہجد نہیں لیکن تہجد سے افضل فوت شدہ نمازوں کی قضاء ہے کیونکہ فرض سے بری الذمہ ہونا بنسبت نوافل کے افضل ہے۔ (راقم)

تمام رات جاگنے والے کے نوافل تہجد کا درجہ رکھتے ہیں:

اگرچہ معجم طبرانی میں ایک روایت حجاج بن عمر کی یہ ہے کہ "تہجد" سونے کے بعد ہی ہیں، بغیر سونے کے تہجد نہیں، لیکن صحیح قول یہی ہے جس پر تقریباً جمہور کا اتفاق ہے کہ تمام رات جاگنے والے شخص نے جو نوافل عشاء کی نماز کے بعد رات میں ادا کئے وہ اس کے تہجد ہوں گے۔

عشاء کی نماز سے پہلے تہجد نہیں:

وقتہ بعد صلوۃ العشاء حتی لو نام ثم تطوع قبلھا لا یحصل السنۃ " اگر ایک شخص عشاء کی فرض ادا کرنے سے پہلے سو گیا اور جاگنے پر نماز سے پہلے ہی نوافل ادا کئے تو ان سے تہجد ادا کرنے کی سنت حاصل نہیں ہوگی، اسلئے کہ تہجد کا وقت عشاء کی فرض نماز کے بعد سو کر اٹھنے پر ہوتا ہے۔

تہجد کا وقت مقرر نہیں:

جو اوپر بحث ذکر کی گئی ہے اس سے واضح ہو گیا کہ عشاء کی نماز پڑھ کر سو گیا، پھر جاگ کر تہجد کی نیت سے نفل ادا کئے تو ان کو تہجد ہی کہا جائے گا، یہ ضروری نہیں کہ پچھلے پہر ہی جو نوافل ادا کئے جائیں وہی تہجد ہوں۔

البتہ افضل طریقہ یہ ہے:

ان الافضل من الثلث الاوسط السدس الرابع والخامس" بہتر یہ ہے کہ رات کے درمیانی تہائی حصہ کے آخر میں تہجد ادا کرے، کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے۔

❁ قال رسول الله ﷺ احب الصلوة الی الله تعالی صلوة داود (علیہ السلام) کان ینام نصف اللیل ویقوم ثلثه وینام سدسه"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کو نمازوں میں سے پسندیدہ نماز حضرت داود علیہ السلام کی نماز تھی، وہ رات کا آدھا حصہ سوتے تھے، اور رات کے تہائی حصہ میں قیام کرتے تھے اور چھٹا حصہ پھر سو جاتے تھے، یعنی اگر رات نو گھنٹے کی ہوتی تو آپ پہلے ساڑھے چار گھنٹے کے آخر تک عشاء کی نماز کے بعد سو جاتے، پھر رات کے تین گھنٹے قیام کرتے، یعنی کھڑے ہو کر نوافل ادا کرتے، پھر ڈیڑھ گھنٹہ سو جاتے۔

رات کی نماز افضل ہے:

صلوة اللیل افضل من النهار" رات کی نماز دن کی نماز سے افضل ہے، مسلم شریف میں مرفوع حدیث ہے "افضل الصلوة بعد الفريضة صلوة اللیل "فرض نماز کے بعد افضل نماز رات کی نماز ہے۔

تہجد کی کتنی رکعت ہیں:

تہجد کی رکعات کے متعلق مختلف روایات آتی ہیں، ان تمام سے نتیجہ یہ نکلا۔

"اقول فینبغی القول بان اقل التهجد رکعتان واوسطه اربع واکثره ثمان" "واللہ اعلم"

میں کہتا ہوں (شامی کہتے ہیں) مناسب یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ تہجد کی کم از کم دو رکعت ہیں، درمیانی چار رکعت ہیں اور اکثر آٹھ رکعتیں ہیں۔ حاوی قدس میں ہے "یصلی ما سهل علیه ولو رکعتین والسنة فیها ثمان رکعات" کہ جتنی رکعت آسانی سے پڑھ سکے وہی پڑھ لے، خواہ دو رکعت ہی ادا کر لے البتہ مسنون رکعت ہیں۔

حدیث ابی داؤد سے پتہ چلتا ہے "ان اقل تهجده اربع سوی ثلاث الوتر" کہ بیشک رسول اللہ ﷺ کی تہجد کے نماز کم از کم چار رکعت ہوتی سوائے تین وتر کے، لیکن دوسری روایت میں دو رکعت کا بھی ذکر ملتا ہے۔

"قال ﷺ من استيقظ من الليل وايقظ اهله فصليا ركعتين كتبا من الذاكرين الله كثيرا والذاكرات (رواه النسائی وابن ماجه وابن حبان فی صحيحه والحاكم)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص رات کو بیدار ہوا اور اپنے اہل کو بھی بیدار کیا تو انہوں نے دو، دو رکعت ادا کیں تو اس شخص اور اس کی اہل کو اللہ کا کثیر ذکر کرنے والے مردوں اور عورتوں میں لکھ دیا جائے گا، اس روایت میں کم از کم دو رکعت ادا کرنے کا ذکر ہے۔

تہجد کی عادت بنا کر چھوڑ دینا مکروہ ہے:

"قال ﷺ لابن عمر يا عبدالله لا تكن مثل فلان كان يقوم الليل ثم تركه" (بخاری ومسلم)

نبی کریم ﷺ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو فرمایا اے عبداللہ فلاں شخص کی طرح نہ ہو جانا کہ وہ رات کو قیام کرتا تھا (یعنی تہجد ادا کرتا تھا) پھر اس نے ادا کرنا چھوڑ دیا۔

"ولذا قال ﷺ احب الاعمال الی الله ادومها وان قل "رواه الشيخان وغيرهما"

بخاری اور مسلم میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو وہ عمل پسند ہے کہ وہ ہمیشہ جاری رکھے اگرچہ وہ عمل کم ہی کیوں نہ ہو۔ "فينبغی للمكلف الاخذ من العمل بما يطيقه" عاقل و بالغ کو چاہئے کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق عمل کرے۔

تنبیہ: اگرچہ رات کی نماز عام ہے جسطرح پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، لیکن احادیث میں قیام اللیل کا جو ذکر ملتا ہے اس سے مراد تہجد کی نماز ہی ہے "ان صلوة الليل المحثوث عليها هی التهجد" بیشک رات کی نماز ادا کرنے پر جو برانگیختہ کیا گیا اس سے مراد تہجد ہیں۔ (تہجد کی تمام بحث ماخوذ از شامی جلد اول صفحہ نمبر ۵۰۶، ۵۰۷)

رات کی نماز کے متعلق احادیث:

عن عائشة رضی الله عنها قالت كان النبی ﷺ يصلی فيما بين ان يفرغ من صلوة العشاء الی الفجر احدی عشرة ركعة يسلم من كل ركعتين ويوتر بواحدة فيسجد السجدة من ذلك قدر ما يقرأ احدكم خمسين آية قبل ان يرفع رأسه فاذا سكت المؤذن من صلوة الفجر وتبين له الفجر قام ركعتين خفيفتين ثم اضطجع علی شقه الايمن حتی يأتيه المؤذن للاقامة فيخرج" (بخاری ومسلم)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ عشاء کی نماز کے فارغ ہونے کے بعد اور صبح کی نماز سے پہلے گیارہ رکعت ادا فرماتے تھے، ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیرتے، البتہ وتر کی نماز میں دو رکعت کے ساتھ ایک رکعت اور ملا کر طاق بناتے، ان میں سجدہ کرتے اتنی قدر جتنی قدر تم سجدہ کرتے ہوئے سر اٹھانے سے پہلے پچاس آیتیں پڑھو، جب مؤذن فجر کی نماز کی اذان سے فارغ ہوتا، اور فجر ظاہر ہو جاتی (یعنی روشنی ہو جاتی) آپ کھڑے ہوتے تو دو خفیف رکعت ادا فرماتے پھر آپ دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے یہاں تک کہ مؤذن آپ کو نماز کیلئے اٹھاتا تو آپ مسجد میں تشریف لے جاتے۔

وضاحت حدیث:

نبی کریم ﷺ رات کے وقت گیارہ رکعت ادا فرماتے تھے، آٹھ رکعت نوافل ہوتے، اور تین رکعت وتر، اور یہ واضح ہوا کہ آپ تہجد دو دو رکعت کر کے ادا کرتے تھے۔

"فیسجد السجدة من ذلک قدر مایقرأ احدکم خمسین آیة" والظاهر ان الفاء لتفصیل المجمل یعنی فیسجد کل واحدة من سجدات تلک الرکعات طویلة"

ظاہر یہی ہے کہ "فیسجد" پر فاء اجمال کی تفصیل کیلئے، یعنی تمام رکعتوں میں آپ ہر سجدہ اتنا لمبا فرماتے جتنا تم پچاس آیات پڑھنے میں وقت صرف کرتے ہو۔

اور ایک معنی یہ بھی ممکن ہے:

"ومن فی من ذلک للتبعیض والفاء للتفریع ومعناه قد کان بعض سجداته طویلا بقدر مایقرأ احد خمسین آیة"

کہ "من ذلک" میں "من" تبعیض کیلئے ہو (جس کا معنی "بعض" ہو) اور فا تفریع کیلئے ہو کہ آپ کے بعض سجدے اتنے لمبے ہوتے جتنی مقدار تم پچاس آیتیں پڑھتے ہو، خیال رہے بعض حضرات نے اس سے مراد سجدۂ شکر لیا ہے کہ آپ نماز کے بعد سجدۂ شکر ادا کرتے لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جہاں بھی سجدہ کا ذکر ہے، جس سے مراد بظاہر فقط سجدۂ شکر کا ذکر سمجھ آتا ہے، اس سے مراد دو رکعت نوافل ہیں۔ (**فاذا سکت المؤذن ای فرغ**) جب مؤذن اذان سے فارغ ہوتا (**من صلوة الفجر ای اذانها**) فجر کی اذان سے (**تبین له الفجر**) جب فجر سفید ہو جاتی تو آپ کھڑے ہوتے تو دو رکعت خفیف ادا فرماتے، یعنی ان میں چھوٹی چھوٹی سورتیں (**قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ** اور سورۃ اخلاص وغیرہ) آپ پڑھتے۔

"قلت الظاهران المرادبالتبین لاسفارفیفیدان الاسفارمستحب حتی فی حق السنة"

(میں کہتا ہوں) ملاعلی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ظاہر یہی ہے کہ " تبیـن " سے مراد فجر کا سفید ہو جانا ہے تو اسی سے یہ فائدہ حاصل ہو گیا کہ صبح کی نماز روشنی میں ادا کرنا مستحب ہے، یہاں تک کہ فجر کی سنتیں بھی روشنی میں ادا کرے، پھر آپ اپنی دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے، تا کہ رات کے قیام کی تھکن کی وجہ سے جسم میں سستی نہ رہے بلکہ چستی آجائے۔ (مشکوۃ باب قیام اللیل مع مرقاۃ جلد نمبر ۳ صفحہ نمبر ۱۲۱)

❁ وعن عائشة قالت کان النبی ﷺ اذاصلی رکعتی الفجرفان کنت مستیقظة حدثنی والااضطجع " (رواہ مسلم،مشکوۃ باب قیام اللیل)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ (رات کے قیام کے بعد) جب فجر کی دو رکعت ادا فرماتے اگر میں بیدار ہوتی تو میرے ساتھ کلام فرماتے اور اگر میں سوئے ہوتی تو آپ لیٹ جاتے۔

❁ وعن عائشة قالت ﷺ یصلی من اللیل ثلاث عشرة رکعة منهاالوترور کعتاالفجر " (رواہ مسلم،مشکوۃ باب قیام اللیل)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ رات تیرہ رکعت ادا فرماتے تھے، جن میں (تین رکعت) وتر بھی ہوتے اور دو رکعت فجر کی بھی ہوتیں۔ (یعنی آٹھ رکعت تہجد کی ہوتیں)

❁ وعن مسروق قال سألت عائشة عن صلوة رسول الله ﷺ باللیل قالت سبع وتسع واحدی عشرة رکعة سوی رکعتی الفجر" (رواہ البخاری (باب قیام اللیل)

حضرت مسروق کہتے ہیں میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نبی کریم ﷺ کی رات کی نماز کے متعلق پوچھا، تو آپ نے بتایا کہ آپ کبھی فجر کی دو رکعت کے علاوہ سات رکعت ادا کرتے (چار نفل، تین وتر) اور کبھی نو رکعت ادا فرماتے (چھ رکعت نفل اور تین وتر) اور کبھی گیارہ رکعت ادا فرماتے (آٹھ رکعت نفل اور تین رکعت وتر۔

❁ وعن عائشة قالت کان النبی ﷺ اذاقام من اللیل لیصلی افتتح صلوته برکعتین خفیفتین " (رواہ مسلم،مشکوۃ باب قیام اللیل)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ جب رات کو قیام کا ارادہ فرماتے تو دو رکعت خفیف سے ابتداء فرماتے۔

"وامارواية خمس عشرة فمحمولة علی انه ﷺ کان یفتتح صلوة اللیل برکعتین خفیفتین "

ایک روایت میں پندرہ رکعت کا بھی ذکر ہے، اس کا شاید یہی مطلب ہوگا کہ تہجد کی نماز کو شروع کرنے سے پہلے دو رکعت نفل چھوٹی چھوٹی سورتوں سے افتتاحی طور پر ادا فرماتے (واللہ اعلم بالصواب)

(مرقاۃ جلد نمبر ۳ صفحہ نمبر ۱۲۲)

❁ عن ابی هریرة قال قال رسول اللهﷺ ینزل ربنا تبارک وتعالی کل لیلة الی السماء الدنیا حتی یبقی ثلث اللیل الآخر یقول من یدعونی فاستجیب له من یسألنی فاعطیه من یستغفرنی فاغفر له (بخاری ومسلم) وفی روایة لمسلم ثم یبسط یدیه ویقول من یقرض غیر عدوم ولا ظلوم حتی ینفجر الفجر" (مشکوة باب التحریض علی قیام اللیل)

حضرت ابوھریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ہمارا رب تعالی ہر رات کو جب رات کا آخری تہائی حصہ رہ جاتا تو آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے (یعنی اس کی رحمت یا اس کے فرشتوں کا نزول ہوتا ہے) وہ کہتا ہے کہ کون ہے جو مجھ سے دعاء کرے کہ میں اس کی دعاء کو قبول کروں کون ہے جو مجھ سے سؤال کرے کہ میں اسے عطاء کروں، کون ہے جو مجھ سے بخشش طلب کرے کہ میں اس کی بخشش کروں۔ **مسلم** کی ایک روایت ہے "پھر وہ اپنے ہاتھ (جو اس کی شان کے لائق ہیں) کشادہ کر دیتا ہے اور فرماتا ہے کون ہے جو مجھے قرض دے حالانکہ وہ محتاج نہیں، اور وہ ظالم نہیں، یہ سلسلہ فجر تک جاری رہتا ہے۔

وضاحت حدیث:

"ینزل ربنا" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی کا امر نازل ہوتا ہے، یا مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی کے فرشتے نازل ہوتے ہیں، یا مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی کی طرف سے نداء دینے والا فرشتہ نازل ہوتا ہے یا مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی کی رحمت کا نزول ہوتا ہے

"قیل مقصود الحدیث الترغیب والتحثیث وتخصیص هذا الوقت بمزید الشرف والفضل وان ما یاتی به المکلف انفع وارجی وبالقبول احری"

حدیث پاک میں رات کے پچھلے تہائی حصہ میں دعاء کرنے، رب تعالی سے طلب کرنے، اور استغفار کرنے پر برانگیختہ کیا گیا، اور اس وقت کی شرافت اور فضیلت کو بیان کیا گیا ہے، اور مکلف جو اس وقت میں دعاء وغیرہ کرے گا اس کی قبولیت کی زیادہ امید کی جاتی ہے، اور انسان کے لائق اور مناسب یہی ہے کہ اس وقت کی برکات سے فائدہ حاصل کرے۔ "ثم یبسط یدیه "ای لطفه ورحمته" ہاتھوں کو کشادہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے لطف اور اپنی رحمت کو پھیلاتا ہے۔ "ویحتمل ان یکون بالتجلی الصوری لتنزه ذاته عن الجارحة والنزول الحسی" اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ وہ اپنی تجلی صوری فرماتا ہے، کیونکہ رب تعالی اعضاء سے پاک ہے، اور ظاہری طور پر اترنے سے بھی پاک ہے۔ "ویقول من یقرض غیر عدوم" اور وہ کہتا ہے کون ہے جو مجھے قرض دیتا ہے، حالانکہ وہ محتاج نہیں۔ "ویقول" وہ کہتا ہے۔ یعنی خود وہ کہتا ہے، یا اپنے کسی خاص فرشتے کے ذریعے وہ کہلاتا

ہے"من یقرض"اویعطی العبادة البدنیة اوالمالیة علی سبیل القرض واخذالعوض"کون ہے جو قرض دے'اس کا مطلب یہ ہے کون ہے جو عبادت بدنیہ یا مالیہ ادا کرے،اسی کو قرض سے تعبیر کیا ہے کہ وہ عبادت کرے اور ثواب حاصل کرے۔"غیر عدوم"ای رباغنیا غیر فقیر عاجز عن العطاء"یعنی اللہ تعالیٰ غنی ہے،فقیر نہیں،اور عطاء سے عاجز نہیں،بندے کا عبادت بدنیہ اور مالیہ کرنا بندے کے اپنے فائدہ کیلئے رب تعالیٰ کو اس ضرورت نہیں۔'ولاظلوم"بعدم الوفاء اوبنقص من الثواب والجزاء"اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا کہ اسے ثواب عطاء نہ کرے یا اس کے ثواب میں کمی کرے۔بلکہ وہ مکمل جزاء عطاء فرماتی ہے۔

❁ عن ابی امامة قال قال رسول اللہ ﷺ علیکم بقیام اللیل فانه دأب الصالحین قبلکم وهو قربة لکم الی ربکم ومکفرة للسیات ومنهاة عن الاثم"

(رواہ الترمذی،مشکوۃ باب التحریض علی قیام اللیل)

حضرت ابوامامہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اپنے پر رات کے قیام اور نوافل کو لازم پکڑو بیشک یہ تم سے پہلے نیک لوگوں کی عادت ہے،اور وہ تمہارے لئے تمہارے رب کی قربت اور گناہوں کے مٹانے،اور گناہوں سے رکنے کا ذریعہ ہے۔

❁ وعن ابی سعیدالخدری قال قال رسول اللہ ﷺ ثلاثة یضحک اللہ الیهم الرجل اذاقام باللیل یصلی والقوم اذاصفوافی الصلوة والقوم اذاصفوافی قتال العدد"

(رواہ فی شرح السنة"مشکوۃ باب التحریض علی قیام اللیل)

حضرت ابوسعید خدری ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین شخصوں پر اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے،ایک وہ شخص جو رات کو قیام کرتا ہے اور نماز(نوافل)ادا کرتا ہے،اور دوسرا وہ شخص جو اس وقت نماز ادا کرتا ہے جب قوم نماز کی صفیں بناتی ہے،اور تیسرا وہ شخص جو اس وقت نماز ادا کرتا ہے جب قوم جہاد کی صفیں بناتی ہے۔

عشاء کی نماز یہود ادا نہیں کرتے تھے،اس کا کیا مطلب ہے؟

❁ وعن معاذبن جبل قال قال رسول اللہ ﷺ اعتموابهذه الصلوة فانکم قد فضلتم بهاعلی سائر الامم ولم تصلهاامة قبلکم" (رواہ ابوداؤد،مشکوۃ باب تعجیل الصلوات)

حضرت معاذ بن جبل ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم یہ نماز تاریکی آجانے پر ادا کرو(یعنی شفق کے غائب ہونے پر ادا کرو)بیشک تمہیں تمام امتوں پر فضیلت دی گئی اس نماز کے ذریعے،کیونکہ تم سے پہلے کسی امت نے یہ نماز ادا نہیں کی۔

اعتراض: جبریل امین نے نبی کریم ﷺ کو جب نمازوں کے ابتدائی اوقات اور انتہائی اوقات بتائے تو بعد

میں عرض یہ کیا"ھذہ وقت الانبیاء من قبلک" آپ سے پہلے انبیاء کرام کی نمازوں کے اوقات بھی یہی تھے اس سے پتہ چلتا ہے کہ سب نمازیں تمام امتوں پر فرض تھیں، ان دونوں حدیثوں میں تطبیق کیسے ہے؟

جواب اول: **راقم** کے نزدیک آسان جواب یہ ہے کہ پانچ نمازیں جو ہم پر فرض ہیں اسی طرح پانچ نمازیں ہر امت پر فرض نہیں تھیں، بلکہ بعض نمازیں بعض امتوں پر، اور بعض دوسری نمازیں دوسری امتوں پر، اسی طرح تمام نمازوں کے اوقات کو پہلے انبیاء کرام کی طرف منسوب کرنا صحیح ہے۔ (راقم)

جواب دوم: دوسری حدیث شریف میں ذکر ہے کہ "یہ وقت آپ سے پہلے انبیاء کرام کا ہے" اس میں یہ ذکر نہیں کہ یہ وقت پہلی امتوں کیلئے ہے، لھذا مطلب یہ ہے۔

"ان صلوۃ العشاء کانت تصلیھا الرسل نافلۃ لھم ای زائدۃ ولم تکتب علی امھم کالتھجد فانہ وجب علی رسول اللہ ﷺ ولم یجب علینا"

بیشک انبیاء کرام عشاء کی نماز بطور نفل ادا کرتے رہے لیکن ان کی امتوں پر عشاء کی نماز فرض نہیں تھی، یہ اسی طرح ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ پر تہجد واجب تھے اور ہم پر واجب نہیں۔

جواب سوم: **ویحتمل انہ ارادانہ لم تصلھا علی النحو الذی تصلونھا من التاخیر وانتظار الاجتماع فی وقت حصول الظلام وغلبۃ المنام علی الانام"**

اور احتمال یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام امتوں نے عشاء کی نماز اس طرح نہیں ادا کی جیسے تم ادا کرتے ہو کہ نماز تاخیر سے ادا کرتے ہو اور شفق کے غائب ہونے، اندھیرا چھا جانے کی انتظار کرتے ہو، اور جب نیند لوگوں پر غالب آجاتی ہے اس وقت تم نماز ادا کرتے ہو۔ (ماخوذ از مرقاۃ جلد دوم صفحہ نمبر ۱۳۸)

اس تیسرے جواب پر ایک اور حدیث پاک دلالت کررہی ہے:

❁ **عن عبداللہ بن عمر قال مکثناذات لیلۃ ننتظر رسول اللہ ﷺ صلوۃ العشاء الآخرۃ فخرج الیناحین ذھب ثلث اوبعدہ فلاندری اشئی شغلہ فی اھلہ اوغیرذلک فقال حین خرج انکم لتنظرون صلوۃ ماینتظرھااھل دین غیرکم ولولاان یثقل علی امتی لصلیت بھم ھذہ الساعۃ ثم امر المؤذن فاقام الصلوۃ وصلی"** (رواہ مسلم، مشکوۃ باب تعجیل الصلوۃ)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، ہم رات عشاء کی نماز کیلئے نبی کریم ﷺ کی انتظار میں رکے رہے، تو آپ ہماری طرف تشریف لے آئے جبکہ رات کا تہائی حصہ یا اس سے زائد گذر چکا تھا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ آپ اپنی اہل میں مشغول رہے یا کہ کوئی اور وجہ تھی (جب آپ تشریف لائے) تو آپ نے فرمایا بیشک تم نماز کی انتظار

کرتے رہے، اتنی انتظار تمہارے بغیر کسی اور دین والوں نے نہیں کی، پھر آپ نے فرمایا اگر میں امت پر بوجھ نہ سمجھتا تو ان کو اسی وقت میں نماز پڑھاتا، پھر آپ نے مؤذن کو حکم دیا تو انہوں نے اقامت کہی، پھر آپ نے نماز پڑھائی۔

حدیث پاک سے فائدہ حاصل ہوا:

آپ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ "انتظارهذه الصلوة من بين سائر الصلوات من خصوصياتكم التي خصكم الله بهافكلمازدتم يكون الاجراكمل مع ان الوقت زمان يقتضي الاستراحة فالمثوبة على قدرالمشقة ولان الذاكرفي الغافلين كالصابر في الفارين"

اس (عشاء کی) نماز کی انتظار تمہاری خصوصیات میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ خصوصیت عطاء کی ہے کہ تم یہ نماز دیر سے ادا کرتے ہو، جب نیک عمل میں مشقت زیادہ ہوتی ہے، اس میں اجر بھی زیادہ ہوتا ہے کیونکہ یہ وقت آرام کا ہوتا ہے، آرام کو چھوڑ کر جب مشقت برداشت کرے گا تو اسے ثواب بھی زیادہ ہوگا وہ ایسے ہوگا جیسے غافل لوگوں میں کوئی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ہو، اور جہاد سے بھاگنے والوں میں کوئی ثابت قدم رہنے والا ہو۔ (مرقاۃ جلد دوم صفحہ نمبر ۱۴۰)

تنبیہ: ثم ان التاخير المذكور في هذا الحديث لم يخرج به عن وقت الاختيار وهو نصف الليل اوثلثه"

عشاء کی نماز کو تاخیر سے ادا کرنے کا جو ذکر حدیث پاک میں ہے، اس کا یہ مطلب ہے کہ مختار وقت سے زیادہ دیر نہ ہو، وہ رات کا تہائی حصہ یا نصف رات تک ہے۔ (مرقاۃ جلد نمبر ۲ صفحہ نمبر ۱۴۰)

راقم کے نزدیک وہی مسئلہ مختار ہے جو فقہاء کرام نے بیان کیا ہے کہ تاخیر اتنی مقدار میں ہو کہ جماعت میں نمازیوں کے کم ہونے کا ذریعہ نہ بنے، اگر دیر سے ادا کرنے میں نمازی زیادہ ہوں تو دیر سے ادا کرنا بہتر ہوگا، اور اگر جلدی نماز ادا کرنے میں نمازی زیادہ ہوں تو جلدی نماز ادا کرنا بہتر ہوگا۔ مطلقاً تاخیر کو اگرچہ نبی کریم ﷺ نے پسند فرمایا لیکن وہ دور صحابہ کرام کا تھا، جو آپ کی انتظار میں رہتے تھے، اب ہمارے زمانہ میں تو نماز ادا کر لینا بھی غنیمت ہے، اگر لوگ تاخیر سے جماعت سے بھاگ جائیں تو جلدی نماز ادا کی جائے۔ آجکل تو اتنی زیادہ جہالت چھا گئی کہ مقرر امام کو (امام الحی) اگر ایک یا دو منٹ دیر ہو جائے تو کسی کو پکڑ کر آگے مصلی پر کھڑا کر دیا جاتا ہے، جہلاء کو یہ پتہ نہیں کہ امام الحی کی اجازت کے بغیر نماز پڑھا دینا مکروہ تحریمہ ہے۔ امام الحی کو آج کے دور میں صرف پانچ منٹ کا اختیار اپنے پاس رکھنا چاہئے، امام ہمیشہ دیر کرنے کا عادی نہ بن جائے۔ کبھی کسی عذر کی وجہ سے امام کو دیر ہو جائے تو نمازی پانچ منٹ تک انتظار کریں، پھر امام نے اگر اجازت دے رکھی ہے تو کسی کو امام بنا کر نماز باجماعت پڑھ لی جائے۔

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ O (آیۃ نمبر ۱۱۴)

(1) اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لاتے ہیں، اور بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نیک کاموں پر دوڑتے ہیں اور یہ لوگ لائق ہیں۔ (کنزالایمان)

(2) ایمان رکھتے اللہ پر، اور آخرت کے دن پر، اور حکم دیتے ہیں بھلائی کا، اور منع کرتے ہیں برائی سے، اور جلدی کرتے ہیں نیکی کے کاموں میں، اور یہی لوگ صلاحیت رکھنے والوں میں سے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

اہل کتاب سب برابر نہیں، اس کی وجہ بیان فرمائی کہ بعض اہل کتاب وہ ہیں ''جو حق پر قائم ہیں'' (اوران کی صفت یہ ہے کہ) وہ رات کی گھڑیوں میں اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں، (اوران کی صفت یہ ہے) کہ وہ نماز ادا کرتے ہیں، (اوران کی صفت بیان کی کہ) وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں اوران کی صفت یہ بیان کی گئی کہ نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں، ان کی چھ صفات بیان کرنے کے بعد فرمایا ''وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ'' صالحین کے چند معانی بیان کئے گئے۔

صالحین بمعنی صلاحیت احوال:

''اولئک الموصوفون بتلک الاوصاف من الذین صلحت احوالھم عنداللہ''

وہ لوگ جو ان صفات سے متصف ہیں، یہ ان لوگوں سے ہوں گے جن کے احوال اللہ تعالیٰ کے ہاں درست ہوئے، یعنی با صلاحیت ہوئے۔ (البحرالمحیط) **راقم** نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

صالحین بمعنی مسلمین:

زمخشری نے بیان کیا ہے ''ویجوز ان یرید بالصالحین المسلمین'' جائز ہے کہ مراد ''صالحین'' سے مسلمان لوگ ہوں، جو اللہ تعالیٰ کے قرب کے لائق ہوں، زمخشری نے بیان کیا ہے کہ وصف صلاح زیادہ طور پر وصف اسلام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اسی وجہ سے انبیاء کرام نے ''صالحین'' میں ہونے کی دعائیں کیں، حضرت سلیمان

ﷺ کی دعاء کو رب تعالیٰ نے بیان کیا ﴿وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِکَ فِیْ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیْنَ ﴾ (اور داخل کر مجھے اپنی رحمت سے اپنے قرب کے سزاوار بندوں میں) حضرت ابراہیم ﷺ کے متعلق رب تعالیٰ نے بیان فرمایا ﴿وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴾ (اور البتہ تحقیق ہم نے اسے چن لیا دنیا میں اور بیشک وہ آخرت میں قرب کے لائق بندوں سے ہوں گے) اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب (علیہم السلام) کے متعلق فرمایا "وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِیْنَ " اور ہر ایک کو ہم نے قرب کے لائق بنایا، حضرت اسمٰعیل اور حضرت ذوالکفل اور حضرت ادریس (علیہم السلام) کے متعلق ارشاد فرمایا "وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِیْ رَحْمَتِنَا اِنَّهُمْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ " اور داخل کیا ہم نے ان کو اپنی رحمت میں، بیشک وہ قرب کے لائق لوگوں میں سے ہیں۔ (ماخوذ از کشاف والبحر المحیط)

صالحین بمعنی اصحاب محمد:

قال ابن عباس (اُولٰٓئِکَ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ) ای من اصحاب محمد ﷺ"
وہ لوگ صالحین سے ہوں گے یعنی نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام سے ہوں گے۔ (البحر المحیط)

صالحین بمعنی نیک لوگ:

یہود نے جب یہ کہا "ما آمن بہ الا شرارنا " (نہیں ایمان لایا اس کے ساتھ سوائے ہمارے برے لوگوں کے) تو رب تعالیٰ نے ایمان لانے والوں کا وصف بیان کیا "وَاُولٰٓئِکَ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ "ای من عداد الذین صلحت عند اللہ حالھم "یعنی یہ نیک لوگوں کے ساتھی ہوں گے جن کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا۔ (روح المعانی)

صالحین بمعنی صلاحیت اجسام:

(مِنَ الصّٰلِحِیْنَ) ممن صلحت اجسادھم بصلاح قلوبھم وزکاء نفوسھم" صالحین سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کی درستگی اور نفسوں کی پاکیزگی کی وجہ سے ان کے جسم درست ہوں، اب مطلب یہ ہوا کہ ان صفات کے متصف لوگ ان میں سے ہوں گے جن کے اجسام درست ہوں گے۔ (مظہری)

صالحین بمعنی رب کی رضاء وثناء کے مستحق:

(مِنَ الصّٰلِحِیْنَ) ای من جملۃ من صلحت احوالھم عند اللہ تعالیٰ واستحقوا رضاہ وثناہ"

اب مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو ان صفات سے متصف ہوں گے، وہ ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کے احوال اللہ تعالیٰ کے ہاں درست ہوں گے اور وہ رب تعالیٰ کی رضاء اور اس کی ثناء کے مستحق ہوں گے۔ (روح البیان)

"من" بمعنی "مع":

(وَاُولٰئِکَ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ) ای مع الصالحین وھم اصحاب محمد ﷺ فی الجنة"

اور وہ جو ان صفات سے متصف ہوں گے، یہ صالحین (نیک لوگوں) کے ساتھ جنت میں ہوں گے، وہ نیک لوگ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام ہیں، یعنی ان لوگوں کو جنت میں صحابہ کرام کا قرب حاصل ہوگا۔ (قرطبی)

سب تراجم کو حاوی ترجمہ:

اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ مختصر، خوبصورت اور تمام تراجم کا جامع ترجمہ" آپ نے ترجمہ کیا" اور یہ لوگ لائق ہیں" آپ نے اپنے ترجمہ میں "مــن" بیانیہ بنایا ہے، یہ ترجمہ نہیں کیا کہ "یہ لوگ لائق لوگوں سے ہوں گے" بلکہ ترجمہ کیا" یہ لائق لوگ ہیں" **راقم** نے اگرچہ ترجمہ عام مفسرین کے مطابق" من "تبعیفیہ والا کیا، تاہم البحر المحیط سے لیا ہے جو تقریباً دوسرے تراجم کو اپنے دامن میں لپیٹے ہوئے ہے۔

تنبیہ: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بحث ابھی قریب ہی گذر چکی ہے، دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

اعتراض: آیۃ کریمہ میں اہل کتاب سے ایمان لانے والوں کے اچھے اوصاف ذکر کئے جا رہے ہیں، ان میں ایک وصف یہ بیان کیا گیا ﴿وَیُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرَاتِ﴾ وہ جلدی کرتے ہیں نیکی کے کاموں میں، نیکی کے کاموں میں جلدی کرنا کس طرح قابل تعریف ہے؟ جبکہ حدیث شریف میں جلدی کرنے کی مذمت ان الفاظ سے کی گئی ہے "العجلة من الشیطان الا فی امور" جلد بازی شیطان کی جانب سے ہے سوائے چند امور کے اور ارشاد فرمایا "العجلة من الشیطان و التانی من الرحمن" عجلت شیطان کی جانب سے ہے اور دیر کرنا رحمٰن کی جانب سے ہے۔

جواب: مسارعت اور عجلت میں فرق ہے "معنی المسارعة انه اذا تعارض حق الله و حظ لنفسه بادر لحق اللــه و ترک حظه" جب اللہ تعالیٰ کے حق اور اپنے نفس کے حصہ میں تعارض آجائے تو جلدی سے اللہ تعالیٰ کے حق کو ادا کیا جائے، اور اپنے نفس کے حصہ کو چھوڑ دیا جائے اسے مسارعت کہا جاتا ہے "والسـرعة مخصـوصة بـأن یقدم ماینبغی تقدیمه" سرعت ان کاموں سے خاص ہے جن کو مقدم ذکر کرنا پسند کیا گیا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ:

"ان المسارعة مخصوصة بفرط الرغبة فيما يتعلق بالدين لان من رغب في الأمر آثر الفور على التراخي"

بیشک مسارعت فرط رغبت (زیادتی رغبت) سے مخصوص ہے ان کاموں میں جو دین سے تعلق رکھتے ہیں، جب نیکی کے کاموں میں رغبت پائی جائے تو دیر پر جلدی کام کرنے کو ترجیح دے،

اسی لئے رب تعالی نے فرمایا ﴿وَسَارِعُوا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ﴾ اپنے رب سے مغفرت طلب کرنے کی طرف جلدی کرو، خیال رہے کہ "سرعة" کا مقابل "اناءة" ہے، اسی سے حدیث شریف میں "والتانی من الوحمن" آیا ہوا ہے، لیکن اس کا معنی مجازی مراد ہے مطلقا "تاخیر کرنا" واما العجلة فهي المبادرة للشئی مطلقا" عجلت یہ ہے کہ کسی چیز کی طرف مطلقا جلد بازی کرنا، عجلت کا مقابل تاخیر ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ "والعجلة مخصوصة بان يقدم مالا ينبغي تقديمه" عجلت مخصوص ہے ان کاموں سے جن کا جلدی کرنا مناسب نہ ہو، جیسا کہ نماز وقت سے پہلے ادا کرنا، نماز میں رکوع اور سجود کے مکمل ہونے کا یقین نہ ہو، رکوع سے صحیح سیدھا کھڑا ہونا اور رکوع میں صحیح جھک جانا اور کم از کم ایک مرتبہ تسبیح مکمل کر لینا، اسی طرح سجدہ میں، یہ رکوع اور سجود مکمل ہے، تین مرتبہ تسبیحات کو مکمل کرنا سنت ہے، اس سے زائد مستحب ہے کاش کہ نادان لوگ مسائل بھی پڑھیں رکوع وسجود میں سو جانے والے بعض اوقات ائمہ پر اعتراض کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ "العجلة ليست مذمومة على الاطلاق" عجلت مطلقا منع نہیں، کیونکہ حضرت موسی علیہ السلام نے رب تعالی کے حضور عرض کیا ﴿وَعَجِلْتُ اِلَیْکَ رَبِّ لِتَرْضٰی﴾ میں نے تیری طرف (آنے میں) جلدی کی اے میرے رب تا کہ تو راضی ہو جا۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جہاں عجلت کی مذمت بیان کی وہاں بعض امور کو مستثنی بھی کیا "العجلة من الشيطان الافي امور" عجلت شیطان کی طرف سے ہے سوائے چند امور کے، آیئے دیکھئے "تو بہ جلدی کرنا، مہمان کے سامنے طعام جلدی رکھنا، اور میت کی تجہیز و تکفین جلدی کرنا، اور باکرہ عورت کی شادی جلدی کرنا، اور نماز اول وقت مستحب میں پڑھنا" ان تمام کاموں کو جلدی کرنا بہتر ہے، خواہ یوں کہا جائے کہ یہ وہ امور ہیں جن کو نبی کریم ﷺ نے عجلة مذمومہ (بری جلد بازی) سے مستثنی (علیحدہ) فرمایا، یا یوں کہا جائے کہ ان میں جلدی کرنا مستحب ہے اسے مسارعت کہا جائے گا، جس کی رب تعالی نے تعریف فرمائی ہے ﴿وَیُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرَاتِ﴾ وہ نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں۔ (ماخوذ از صاوی وکبیر وروح المعانی)

اصل بات یہ ہے کہ عربی الفاظ کی کہیں کہیں اردو الفاظ سے صحیح ترجمانی نہیں ہوسکتی، جس کی وجہ سے اس قسم کے اعتراض وجواب کی ضرورت درپیش آتی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اعلی حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ نے اس اعتراض سے بچنے کیلئے ترجمہ یہ کیا ہے''اور نیک کاموں پر دوڑتے ہیں'' **واقـــم** نے اصل میں اعتراض وجواب کی وضاحت کیلئے ''وَيُسَارِعُونَ ''کالفظی ترجمہ کیا ہے۔

۞ **اغتنم خمساقبل خمس شبابک قبل هرمک وصحتک قبل سقمک وفراغک قبل شغلک وحیاتک قبل موتک وغناک قبل فقرک"**

حدیث شریف میں ہے''پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو، جوانی کو بڑھاپے سے پہلے، اور صحت کو بیماری سے پہلے، اور فراغت کو مشغولیت سے پہلے، اور زندگی کو موت سے پہلے، اور غنی ہونے کو محتاجی سے پہلے۔ یہ حدیث حسن ہے، ابن مبارک نے کتاب الزہد میں بیان کی ہے، علامہ بغوی نے عمرو بن میمون اودی سے بالاسناد مرسل روایت ذکر کی ہے۔ (البحر المحیط مع حاشیہ)

۞ **عـن ابـی امـامة قـال قـال رسـول الـلـه ﷺ بـادروا بـالاعـمـال هرماناغضا وموتاخالسا ومرضاحابسا وتسویفامویسا"** (رواه البيهقي)

ابوامامہ کہتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا''نیک اعمال کی طرف جلدی کرلو اس بڑھاپے سے پہلے جس کی وجہ سے سر کانپ رہا ہو، اور اچانک موت کے آجانے سے پہلے، اور اعمال سے روک دینے والی مرض سے پہلے، اور اس محتاجی سے پہلے جس میں کہنا پڑھے اچھا ہو جائے گا، اچھا ہو جائے گا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

واولئک اشارة الی امة باعتبار اتصافهم بمافصل من النعوت الجليلة ومافيه من معنى البعد للايذان درجتهم وسموطبقتهم فى الفضل وايثاره على الضمير للاشعار بعلة الحكم والمدح اى اولئك المنعوتون بتلك الصفات الفاضلة بسبب اتصافهم بها"

یہاں دو چیزیں سمجھنے کے قابل ہیں، ایک یہ کہ ''اولئك ''کا اشارہ''امة ''کی طرف ہے جو قریب ہے تو اشارہ بعید کیوں لایا گیا؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ''اہل کتاب سے ایک گروہ''جس کا ذکر ہو رہا اس امت (گروہ) کے اوصاف جلیلہ ذکر کیے گئے ہیں، ان اوصاف جلیلہ میں درجات کی بلندی اور طبقات کی فضیلت میں رفعت کی وجہ سے''بعد مرتبۃ ''(مرتبہ میں بلندی) حاصل ہے، اس''بعد مرتبۃ''کو مکان کی دوری کے درجہ میں رکھ کر اشارہ بعید کا لایا گیا ہے۔

دوسری بات قابل توجہ یہ ہے کہ "اولئك" اشارہ لایا گیا ہے، ضمیر نہیں لائی گئی "وھم من الصالحین" نہیں کہا گیا، اس کی وجہ کیا ہے، تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اشارہ کو ضمیر پر ترجیح دینے کی یہ وجہ ہے کہ حکم اور مدح کی علت (سبب) بیان کیا گیا ہے کہ وہ صالحین سے کیوں ہیں یا صالحین کیوں ہیں؟ اسلئے کہ وہ اعلیٰ قسم کی فضیلت رکھنے والی صفات یعنی صفات جلیلہ ورفیعہ سے متصف ہیں یہ سبب ہے ان کا صالحین سے ہونے گا۔ (تفسیر ابی السعود)

"وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ" التی یعملونھا مبادرین غیر متثاقلین لمعرفتھم بقدر ثوابھم"

وہ نیکی کے کاموں پر عمل کرنے میں جلدی کرتے ہیں، نیکی کے کاموں کو بوجھ نہیں سمجھتے، اس لئے کہ انہیں نیکی کے اعمال کے ثواب کی قدر کا علم حاصل ہوتا ہے۔ "وقیل یبادرون بالعمل قبل الفوت" اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ عمل کے فوت ہونے سے پہلے ہی اسے جلدی سے ادا کر لیتے ہیں۔ (قرطبی)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَمَايَفْعَلُوْامِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ ○ (آیۃ نمبر ۱۱۵)

(1) اور وہ جو بھلائی کریں ان کا حق نہ مارا جائے گا، اور اللہ کو معلوم ہیں ڈر والے۔ (کنزالایمان)

(2) اور جو وہ بھلائی کریں تو اسے ہرگز ضائع نہیں کیا جائے گا، اور اللہ جانتا ہے پرہیزگاروں کو۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

جب جاہل یہودیوں نے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کے متعلق کہا "انھم خسروا بسبب ھذاالایمان" بیشک یہ لوگ اس ایمان کی وجہ سے خسارہ میں آگئے، تو رب تعالیٰ نے ان کی صفات جلیلہ کا ذکر فرما کر ان کے متعلق یہ ارشاد فرمادیا "واولئک من الصالحین" وہ باصلاحیت لوگوں سے ہیں، تو اسی سے گویا کہ یہ اعلان فرمادیا "بل فازوا بالدرجات العظمیٰ" وہ خسارہ میں نہیں، بلکہ وہ بہت بڑے درجات حاصل کر کے کامیاب ہو گئے مقصد ان ایمان لانے والوں کی تعظیم تھی تاکہ ان کے دل سے ان جاہلوں کے کلام کا اثر زائل ہو جائے، پھر اس آیۃ کریمہ میں اہل کتاب جو ایمان لانے والے تھے ان کے دل کو مزید تسلی دی، کہ یہ لوگ جو بھی نیکی کا

کام کریں گے خواہ قلیل ہو یا کثیر اس کا ثواب ضائع نہیں کیا جائے گا۔ ﴿فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ﴾ جس نے ذرا برابر نیکی کا عمل کیا وہ اسے پالے گا (یعنی اس کا ثواب پالے گا) "فان سائر الخلق یدخلون فیه نظرا الی العلة" بیشک تمام مخلوق اس حکم میں داخل ہے، کیونکہ سبب عام ہے کہ جو شخص بھی جو بھلائی کا کام کرے گا اس کا ثواب اسے عطاء کر دیا جائے، اس کے ثواب میں نہ کمی کی جائے گی، اور نہ ہی اس کا ثواب ضائع کیا جائے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَمَا یَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ﴾ "اور جو وہ بھلائی کریں۔"

اس سے مراد ہر قسم کی نیکی کے کام ہیں، خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، خواہ وہ متعدی ہوں یعنی ان کا نفع غیروں تک بھی پہنچے یا وہ غیر متعدی یعنی ان کا نفع اس کی ذات تک محدود ہو، دوسروں کو اس کا نفع نہ پہنچے، خواہ وہ نیکی کے کام ظاہر ہوں یا باطن ہوں۔

﴿فَلَنْ یُّكْفَرُوْهُ﴾ "تو اسے ہرگز ضائع نہیں کیا جائے گا۔"

اس مقام پر "یکفرو" کا لفظ "کفران" سے لیا ہوا ہے، جس کا معنی ہے "کفران نعمت" یعنی ناشکری کرنا لیکن یہ معنی یہاں ممکن نہیں کہ معنی یوں کیا جائے ہرگز ان کی اس بھلائی کی ناشکری نہیں کی جائے گی اور ان کی اس بھلائی کی نعمت کا کفران نہیں کیا جائے گا۔ یہ معنی کیوں درست نہیں، یہ اس لئے درست نہیں کہ "یکفرو" مجہول کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے، اور اس کا ایک مفعول جمع کی ضمیر، اور دوسرا مفعول واحد کی ضمیر ہے۔

"لایجوز ان یضاف الکفران الی الله تعالی لانه لیس لاحد علیه تعالی نعمة حتی یکفرها"

اللہ تعالیٰ کی طرف کفران کی نسبت جائز نہیں، اسلئے کسی ایک کا اللہ تعالیٰ پر کوئی انعام نہیں، کہ اللہ اس انعام کا شکر ادا نہ کرے تو "کفران نعمت" ہو جائے۔ جب یہ معنی مراد لینا درست نہیں تو مجازی معنی ہوگا "فلن یضیع ولاینقض ثوابه البتة سمی ذلک کفرانا کما سمی توفیة الثواب شکرا" وہ یہ ہے "کہ ہرگز ان کا ثواب نہیں کیا جائے گا، اور ہرگز ان کے ثواب میں کمی نہیں کی جائے گی، ثواب کے ضائع کر دینے اور ثواب کے کم کر دینے کو مجازی طور پر "کفران" کہا جاتا ہے جیسا کہ مکمل ثواب کے عطاء کرنے کو "شکر" کہا جاتا ہے، اسی معنی کا اعتبار ان آیات میں کیا گیا ہے۔ ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِیْمٌ﴾ (بیشک اللہ شاکر اور علم والا ہے) اسی طرح ﴿فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْیُهُمْ مَّشْكُوْرًا﴾ ان کی کوشش کا شکریہ قبول کیا جائے، یعنی ان کو ثواب دیا جائے گا۔ (بیضاوی و شیخ زادہ)

دینی مدارس کے طلباء کرام توجہ فرمائیں:

یہاں ایک اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ "کفران" اور "شکر" کا ایک ایک مفعول آتا ہے "فَلَنْ یُّکْفَرُوْهُ" کے دو مفعول ایک نائب فاعل اور دوسرا مفعول ضمیر منصوب متصل، کیسے آ گئے ہیں۔

جواب: کہ یہاں قاعدہ تضمین جاری کیا گیا ہے، وہ یہ کہ "کفر" متضمن ہے اس فعل کو جو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے، وہ ہے "حرم" اور "منع" گویا کہ یوں کہا گیا ہے "فلن یحرموه" ان کو اس بھلائی سے ہرگز محروم نہیں کیا جائے گا، یا اصل میں یوں تھا "ولن یمنعوا جزاء ه" ہرگز ان سے ان کی جزاء کو نہیں روکا جائے گا۔ (شیخ زادہ)

تنبیہ: ایک قرأت میں تاء سے پڑھا گیا ہے ﴿وَمَاتَفْعَلُوْامِنْ خَیْرٍ فَلَنْ تُکْفَرُوْهُ﴾ اس صورت میں یہ جملہ استینافیہ (نیا جملہ) ہوگا، اور خطاب عام مؤمنین کو ہوگا، مطلب یہ ہوگا "اے مؤمنو جو نیکی کا کام تم کرو تو وہ بھلائی کا کام ہرگز تم سے ضائع نہیں کیا جائے گا۔ تاء والی قراءت کو تائید ان آیات سے بھی ملتی ہے ﴿وَمَاتَفْعَلُوْامِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾ اور جو تم کرو بھلائی کا کام اللہ اسے جانتا ہے ﴿وَمَاتَفْعَلُوْامِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ﴾ اور جو تم کرو بھلائی پورا پورا دیا جائے گا تمہیں (اس کا ثواب) ﴿وَمَاتَفْعَلُوْامِنْ خَیْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَاللّٰهِ﴾ اور جو تم بھلائی کرو تم اسے پالو گے اللہ کے ہاں۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ بِالْمُتَّقِیْنَ﴾ "اور اللہ جانتا ہے پرہیزگاروں کو۔"

جب اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ ان کے بھلائی کے اعمال کا ثواب ہرگز ضائع نہیں کیا جائے گا، تو اس کے بعد یہ الفاظ مبارکہ ذکر فرمائے ﴿وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ بِالْمُتَّقِیْنَ﴾ جو دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ الفاظ مبارکہ دلیل کے قائم مقام کیسے ہیں؟ وہ اس طرح کہ ثواب اور جزاء کا نہ پہنچانا یا ہوگا سہو ونسیان (بھولنے) کی وجہ سے "وذلک محال فی حقه لانه علیم بکل المعلومات" "اور یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں" (کہنا کہ وہ (معاذ اللہ) بھول گیا ہے) محال ہے، اس لئے کہ وہ ہر وقت تمام معلومات کو جاننے والا ہے، ابتدائی طلباء کرام بھی بخوبی جانتے ہیں کہ "علیم" صفت مشبہ والا معنی دے رہا ہے جس میں دوام وثبات ہوتا ہے اسلئے الفاظ کے مطابق لغوی معنی یہ ہے "اور اللہ ہر وقت پرہیزگاروں کو جاننے والا ہے"

عوام کی آسانی کیلئے راقم نے ترجمہ کر دیا "اور اللہ جانتا ہے پرہیزگاروں کو۔ "واما ان یکون للعجز والبخل والحاجة" اور یہ ثواب وجزاء نہ پہنچانے کی وجہ عاجز ہونا اور کنجوس ہونا، اور محتاج ہونا ہے "وذلک

محال لانه اله جمیع المحدثات" اللہ تعالی کو عاجز اور بخیل اور محتاج کہنا محال ہے، کیونکہ وہ معبود حقیقی ہے یہ صفات حدوث پر دلالت کرتی ہیں، وہ تو قدیم ہے۔

"فاسم (الله) تعالی یدل علی عدم العجز و البخل و الحاجة" وقوله (علیهم) یدل علی عدم الجهل"

رب تعالی کا اسم گرامی "الله" اس پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ عجز، بخل احتیاجی سے پاک ہے، اور لفظ "علیم" اس پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ جہالت سے پاک ہے، یہاں سے ہی دلیل مکمل ہوگئی کہ وہی جزا دینے والا ہے کسی کو جزاء سے محروم نہیں کرے گا کیونکہ وہ سہو ونسیان، جہالت، عجز، بخل اور احتیاجی سے پاک ہے، متقین کا ذکر کیا، حالانکہ اللہ تعالی تمام مخلوق کو جاننے والا ہے، اس کی وجہ یہ ہے "هذاالقول بشارة للمتقین بجزیل الثواب و دلالة علی انه لایفوز عنده الا اهل التقوی" کہ اس میں متقین کی بشارت کا ذکر ہے کہ انہیں بہت بڑا ثواب حاصل ہوگا، اور ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ یہ مرتبہ بغیر تقوی کے حاصل نہیں ہوگا۔

تقوی خیر اور اچھے اعمال کا مبدأ ہے:

اللہ تعالی کے ہاں کامیاب ہونے والے اہل تقوی ہیں ﴿وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ﴾ سے یہ واضح اشارہ ملتا ہے "ان الخیر یقربهم الیه" کہ بھلائی کے کام ان لوگوں کو اللہ تعالی کے قریب کر دیتے ہیں، اس پر حدیث قدسی دلالت کر رہی ہے "من تقرب الی شبرا تقربت الیه باعا" رب تعالی فرماتا ہے "جو میرے قریب ایک بالشت ہوتا ہے، میں اس کے قریب اتنا ہوتا ہوں جتنا دو بازوؤں کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے۔ اور ارشاد فرماتا "انا جلیس من ذکرنی وانیس من شکرنی و مطیع من اطاعنی" جو میرا ذکر کرتا ہے میری رحمت اس کے ساتھ ہوتی ہے، اور جو میرا شکر یہ ادا کرتا ہے میں اس سے محبت کرتا ہوں، اور جو میری اطاعت کرتا ہے میں اسے اطاعت کا ثواب عطاء کرتا ہوں۔

"ومطیع من اطاعنی" ای کما اطعتمونی بتصفیة الاستمداد و التوحید نحوی اطعتکم بافاضة الفیض عل حسبه و الاقبال الیکم"

جس طرح تم خالص مجھ سے امداد طلب کر کے اور خالص میری طرف توجہ کر کے میری اطاعت کرتے ہو، اسی طرح میں تمہیں اس کے مطابق ثواب پہنچاتا ہوں اور تمہاری طرف توجہ کرتا ہوں، یہ گویا کہ میری طرف سے تمہاری اطاعت ہے۔ سبحان اللہ کیسی ہے شان رحیمی و کریمی۔

(وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ) بالذین اتقوا مایحجبهم عنه فتجلی لهم بقدر زوال الحجاب"

اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ تقوی والے لوگوں کو جاننے والا ہے، یعنی جب لوگ ان چیزوں سے بچ جائیں گے جوان کے اور رب تعالیٰ کے درمیان حجاب کا ذریعہ بنتی ہیں، تو حجاب زائل ہوتا چلا جائے گا، جتنا حجاب زائل ہوگا اسی قدر ان پر اللہ تعالیٰ کی صفاتی تجلیات واضح ہوں گی۔ (روح البیان)

خوبصورت سبق آموز حکایت:

ابوبکر کتانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے خواب میں ایک نوجوان کو دیکھا اتنا خوبصورت جوان میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، میں نے اس سے پوچھا تو کون ہے؟ "فقال التقوی" اس نے جواب دیا میں تقوی ہوں، قلت فاین تسکن؟ قال فی کل قلب حزین" میں نے کہا تو کہاں رہتا ہے؟ اس نے کہا کہ میں ہر غمناک دل میں رہتا ہوں، پھر میں نے ایک سیاہ وحشناک عورت کو دیکھا، میں نے اس سے پوچھا تو کون ہے؟ فقال الضحک" اس نے کہا "میں ہنسی ہوں "فقلت این تسکنین فقالت فی کل قلب فرح مرح" میں نے پوچھا تو کہاں رہتی ہے؟ تو اس نے کہا میں خوش اور اترانے والے دل میں رہتی ہوں، ابوبکر کتانی فرماتے ہیں میں جب بیدار ہوا تو میں نے دل میں پختہ عقیدہ جمالیا کہ آئندہ میں نہیں ہنسوں گا ہاں اگر کہیں ہنسی غالب ہوگئی جو مجھے بے اختیار آگئی تو وہ مستثنیٰ رہے گی۔

"فعلی السالک ان یتمسک بحبل التقوی ویانس بہ فی الدنیالعل اللہ یجعلہ انیسالہ فی قبرہ وحشرہ فالتقوی من دیدن الصلحاء وھم الذین یسارعون الی الخیرات مادامو افی الحیاۃ"

سالک پر لازم ہے کہ تقوی کی رسی کو لازم پکڑے، اور تقوی سے ہی دنیا میں انس پکڑے، تاکہ اللہ تعالیٰ تقوی کو اس کی قبر میں اور حشر میں اس کا انیس بنادے، تقوی صلحاء کا طریقہ ہے، یہی وہ لوگ ہیں جو بھلائی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں جب تک زندہ رہتے ہیں۔ (روح البیان)

"قال الشیخ ابوالحسن رحمہ اللہ افضل مایسأل العبدمن اللہ خیرات الدین ففی خیرات الدین خیرات الآخرۃ ففی خیرات الآخرۃ خیرات الدنیاوفی خیرات ظھور خصائص الاولیاء وھی اربعۃ اوصاف العبودیۃ ونعوت الربوبیۃ والاشراف علی ماکان ومایکون والدخول علی اللہ فی کل یوم سبعین مرۃ والخروج"

شیخ ابوالحسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں، افضل یہ ہے کہ بندہ رب تعالیٰ سے دین بھلائی طلب کرتا رہے، کیونکہ دین کی بھلائی میں آخرت کی بھلائی ہے، اور آخرت کی بھلائی میں دنیا کی بھلائی ہے، اور دنیا کی بھلائی میں اس پر اولیاء کرام کی خصوصیات ظاہر ہوجاتی ہیں، اولیاء کرام کی اعلیٰ قسم کی خصوصیات چار ہیں۔

(۱) **اوصاف عبودیت:** کہ انسان میں رب تعالی کی عبادت کرنے کا خصوصی مقام حاصل ہو جائے۔

(۲) **نعوت ربوبیت:** کہ اس خاص بندے کو رب تعالی کی صفات کا مظہر ہونے کی حیثیت حاصل ہو جائے۔

(۳) **والاشراف علی ماکان وما یکون:** باقی مخلوق جو پیدا ہو چکی ہے یا ہونی ہے اس پر اس انسان کو اشرفیت حاصل ہو جائے، خیال رہے کہ عام عرف میں ولی کا اطلاق غیر نبی پر ہوتا ہے، اسلئے ولی کی اشرفیت انبیاء کرام اور جلیل القدر ملائکہ کے سواء باقی مخلوق پر ہوگی۔

(۴) **والدخول علی اللہ فی کل یوم سبعین مرۃ والخروج** "اور ان کو اللہ تعالی کے حضور ہر دن ستر مرتبہ آنے جانے کا موقع مل جاتا ہے یعنی اللہ تعالی کی صفاتی تجلیات اس پر منکشف ہوتی ہیں۔ (روح البیان)

"فلیسارع العبد الی الخیرات والحسنات وجمیع الحالات ولا یتیسر ذلک الا لارباب الارادات واصحاب المجاهدات"

لھذا بندے کو چاہئے کہ وہ ہر قسم کے نیکی و بھلائی کے کاموں میں جلدی کرے، یہ کام خاص ارادۃ اور مجاہدہ کرنے والے حضرات ہی کر سکتے ہیں۔

نیاید نکو کاری از بدگان	محال ست دوزندگی ازسگان
بداصلوں سے نیکی نہیں آسکتی	زندگی کی دوڑ کتوں سے حاصل ہونا محال ہے
تواں پاک کردن ززنگ آئینہ	ولیکن نیاید زسنگ آئینہ
آئینہ کو زنگ سے پاک کیا جاسکتا	لیکن پتھر کو آئینہ نہیں بنایا جاسکتا
بکوشش نروید گل از شاخ بید	نہ زنگے بگر مابہ گردد سفید

کوشش کے باوجود بید درخت کی شاخ پر پھول نہیں اگتا زنگ کو ریگ مال سے بھی سفید نہیں کیا جاسکتا۔ (روح البیان)

تمام اشعار کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اپنے آپ میں تقوی کے ذریعے اہلیت پیدا کرتا کہ تجھے رب تعالی کا قرب حاصل ہو سکے، اگر تیرا دل گناہوں سے زنگ آلود ہوا تو رب تعالی کا قرب حاصل نہیں کر سکے گا۔

❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْئًا وَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ٥

(آیة نمبر ۱۱۶)

(1) وہ جو کافر ہوئے ان کے مال اور اولاد ان کو اللہ سے کچھ نہ بچائیں گے، اور وہ جہنمی ہیں ان کو ہمیشہ اس میں رہنا۔ (کنز الایمان)

(2) بیشک وہ جنہوں نے کفر کیا ہرگز نہیں بے پرواہ کریں گے ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ سے کچھ (بھی) اور وہ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (نجوم الفرقان)

مختصر مطلب تقریباً ترجمہ سے ہی واضح ہو رہا ہے، کہ بیشک کافروں کو ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بالکل نہیں بچا سکیں گے، اور وہ لوگ جہنمی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، لیکن مؤمنوں کو ان کے مال اور ان کی اولاد نفع پہنچائیں گے۔

"وان کان التصدیق بالاموال یطفئی غضب الرب فی حق المؤمنین ویغفرون بموت اولادهم او استغفارهم"

کیونکہ مؤمن حضرات جب اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مال صدقہ کریں تو اس سے اللہ تعالیٰ کا غضب ختم ہو جاتا ہے اور اس کی رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے، اور ان کے بچوں کے فوت ہونے کی وجہ سے یا ان کی اولاد کی اپنے والدین کیلئے مغفرت طلب کرنے سے ان کی بخشش کر دی جاتی ہے۔ (تفسیر تبصیر الرحمٰن)

شان نزول:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آیۃ کریمہ بنی قریظہ اور بنی نضیر کے بارے میں نازل ہوئی، کیونکہ یہود کے رئیس لوگ نبی کریم ﷺ کی دشمنی میں مال حاصل کرنے کی طرف مائل ہوتے تھے۔

"وانما کان مقصودهم بمعاداته تحصیل الریاسة والاموال فقال الله عزوجل لن تغنی عنهم اموالهم ولا اولادهم"

ان کا مقصد نبی کریم ﷺ کی دشمنی سے یہ ہوتا تھا کہ ریاست اور مال حاصل کر لیں اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد گرامی ﴿لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ﴾ ان کے مال اور ان کی اولاد ان کو بے پرواہ نہیں کر سکے گی۔

(۲) دوسرا قول شان نزول میں یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ قریش مشرکین کے متعلق نازل ہوئی، کیونکہ
"فان اباجهل كان كثير الافتخار بالاموال وانفق ابوسفيان مالا كثيرا في يومي بدر واحد على المشركين"
بیشک ابوجہل اپنے مال پر بہت زیادہ فخر کرتا تھا اور ابوسفیان نے بدر اور احد میں کثیر مال مشرکوں پر خرچ کیا، تو آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ تمہاری اولاد تمہیں اللہ تعالیٰ سے نہیں بچا سکیں گے۔

(۳) تیسرا قول شان نزول میں یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ عام مشرکین کے متعلق نازل ہوئی، کہ کفار اگر مال بطور فدیہ دے کر اپنے آپ کو عذاب سے بچانا چاہیں گے تو نہیں بچا سکیں گے۔ (خازن)

راقم کے نزدیک تمام اقوال ہی معتبر ہیں، اس لئے کہ آیۃ کریمہ میں بنی قریظہ اور بنی نضیر کا ذکر بھی موجود ہے اور قریش مشرکین کو بھی آیۃ کریمہ شامل ہے اور اپنے عموم الفاظ کے لحاظ پر آیۃ کریمہ تمام کفار و مشرکین کو شامل ہے۔

صرف مال اور اولاد کا ذکر کیوں؟

"وانما خص الاموال والاولاد بالذكر لان الانسان يدفع عن نفسه تارة بالفداء بالمال وتارة بالاستعانة بالاولاد فاعلم الله تعالى ان الكافر لا ينفعه شئى من ذلك فى الآخرة ولا مخلص له من عذاب الله"
اللہ تعالیٰ نے مال اور اولاد کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا ہے کیونکہ انسان کبھی مال کا فدیہ دے کہ اپنے آپ سے عذاب کو دور کرتا ہے، اور کبھی اولاد سے امداد کر کے مدافعت کرتا ہے، رب تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ کافر کو عذاب سے نہ اس کا مال بچا سکتا ہے اور نہ اولاد۔

﴿وَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ھُمۡ فِیۡھَا خٰلِدُوۡنَ﴾

"اور وہ لوگ آگ والے ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

راقم نے لفظی ترجمہ کیا ہے، مرادی ترجمہ وہی خوبصورت ہے جو اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے کیا ہے، "اور وہ جہنمی ہیں۔ "وَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّار" ای مصاحبوها على الدوام وملازموها " وہ اصحاب نار ہوں گے، یعنی آگ کے مصاحب ہوں گے ہمیشہ کیلئے اور آگ کو لازم پکڑنے والے ہوں گے۔ (روح البیان)

" ھُمۡ فِیۡھَا خٰلِدُوۡن" کہہ کر ان کے آگ سے نکلنے کے طمع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا کہ وہ آگ میں ہمیشہ رہیں گے، وہ

اپنے دل ودماغ سے یہ باطل تصور نکال دیں کہ وہ مال بطور فدیہ دے کر اور اپنی اولاد سے امداد طلب کر کے اپنے آپ کو جہنم سے بچا لیں گے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِیْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ (آیۃ نمبر ۱۱۷)

(1) کہاوت اس کی جو اس دنیا کی زندگی میں خرچ کرتے ہیں اس ہوا کی سی ہے جس میں پالا ہو وہ ایک ایسی قوم کی کھیتی پر پڑی جو اپنا ہی برا کرتے تھے تو اسے بالکل مار گئی اور اللہ نے ان پر ظلم نہ کیا وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ (کنز الایمان)

(2) مثال اس کی جو وہ خرچ کرتے ہیں اس دنیا کی زندگی میں، ایسی ہے جیسے ہوا ہو اس میں سخت ٹھنڈک ہو پہنچے وہ ایک قوم کی کھیتی کو جنہوں نے ظلم کیا اپنی جانوں پر تو فنا کر دے اس (کھیت) کو، اور نہیں ظلم کیا اللہ نے ان پر، لیکن وہ اپنی جانوں پر خود ہی ظلم کرتے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول: شان نزول میں چند احتمال ہیں۔

(۱) قیل ارادنفقة ابی سفیان واصحابه ببدر واحدفی معاداة رسول الله"
اس میں ایک قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی، جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی دشمنی میں مال خرچ کیا۔

(۲) وقیل ارادنفقة الیهود علی علمائهم ورؤسائهم " دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ یہود کے بارے میں نازل ہوئی جو وہ مال اپنے علماء اور رئیسوں پر خرچ کرتے تھے۔

(۳) وقیل ارادنفقات جمیع الکفار وصدقاتهم فی الدنیا" تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ تمام کفار کے متعلق نازل ہوئی جو دنیا میں مال خرچ کرتے رہے، اور اپنے خیال میں صدقات کرتے رہے۔

(۴) وقیل ارادنفقة المرائی الذی لایریدبماینفق وجه الله" چوتھا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو دکھلاوے کے طور پر دنیا میں مال خرچ کرتے رہے، ان کا ارادہ اللہ تعالیٰ کی رضاء طلب کرنا نہیں تھا۔ (خازن)

مختصر مطلب:

تمام اقوال شان نزول کے جمع ہیں، آیئے ذرا دیکھئے اسی سے مختصر مطلب بھی واضح کیا جاتا ہے، ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے رسول اللہ ﷺ کی دشمنی میں مال خرچ کرنے کی مثال، اور یہود ونصاری کے اپنے علماء اور رئیسوں پر مال خرچ کرنے کی مثال، اور عام کفار کے مال خرچ کرنے کی مثال اور لوگوں کا دکھلاوے کے طور پر مال خرچ کرنے کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی قوم گناہوں اور مظالم سے اپنی جانوں پر ظلم کرلیں تو ان کی سزا کیلئے ان کی کھیتی پر سخت سرد ہوا یا سخت گرم لو چلے تو ان کی کھیتی برباد ہو جائے تو ان پر اللہ تعالی کا کوئی ظلم نہیں بلکہ ان کے معاصی ومظالم کی وجہ سے انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا جس کی وجہ سے ان کی کھیتی برباد ہوگئی، ایسے ہی کفار و یہود ونصاری اور ریاء کاروں کا مال خرچ کرنا ضائع چلا جائے، ان کو نفع نہ پہنچائے تو ان پر اللہ تعالی کا ظلم نہیں، بلکہ ان لوگوں کا خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ہے "صر" کے دو معانی ذکر کیئے گئے ہیں، ایک یہ "ان الصر البرد الشدید" بیشک "صر" کا معنی ہے سخت ٹھنڈک، یعنی ہوا کی مثال جو شدید ٹھنڈی ہو۔ یہ قول اکثر مفسرین اور اہل لغت کا ہے، اسی کے مطابق ایک روایت حضرت ابن عباس کی ہے اور حضرت ابن انباری کا ایک قول یہی ہے، لیکن ان دونوں حضرات نے دوسرا معنی اس کا یہ بیان کیا ہے "ان الصر هو السموم الحارة التی تقتل" بیشک "صر" وہ گرم لو ہے جو کھیتی کو برباد کر دیتی ہے۔ (خازن)

﴿اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ﴾

"وہ پہنچی ایک قوم کی کھیتی کو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔"

(ظلموا انفسهم) الکفر والمعاصی فباؤا بغضب من الله وانما وصفوا بذلک لان الاهلاک عن سخط اشد وافظع"

جس قوم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا کفر اور گناہوں کے سبب وہ اللہ کے غضب سے لوٹے، ان کا یہ وصف بیان کیا کہ ان کی کھیتی کا برباد ہونا اللہ تعالی کو ناراض کرنے کی وجہ سے تھا۔

﴿فَاَهْلَكَتْهُ﴾ "وہ اسے برباد کردے۔"

طلباء کیلئے: "اهلکت" مؤنث کا صیغہ ہے، تاء تانیث اس پر دلالت کر رہی ہے کہ اس کا فاعل "هی" ضمیر ہے جو ریح کی طرف لوٹ رہی ہے، اور تاء کے بعد ضمیر واحد مذکر کی منصوب متصل ہے جو "حرث" کی طرف لوٹ رہی ہے، کہ وہ سخت ٹھنڈی ہوا، یا گرم لو اس کھیتی کو پہنچے تو اس کو برباد کردے مراد تشبیہ سے یہ ہے کہ جو انہوں نے مال

خرچ کیا وہ سب ضائع ہوگیا، مکمل طور پر برباد ہوگیا سوائے اس کے کہ ان کو نفع کے لوٹنے کی کوئی امید ہو، جس طرح کافروں کی کھیتی کو سخت سردھوایا گرم لو پہنچے تو اس کھیتی کو برباد کردے "عقوبة لهم ولم تدع منه اثرا" ان کی سزا کیلئے اوراس کا نام نشان چھوڑے، اس سے نفع کی امید مکمل ختم ہوگئی، کیونکہ "فاستأصلته" ہوا نے اسے جڑوں سے اکھیڑ کررکھ دیا ہے۔ (ماخوذ از روح البیان)

﴿وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ﴾ "اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا۔"

اس کی وجہ ہے کہ انہوں نے جو مال غیر شرعی طور پر خرچ کیا وہ ان کی سزا کیلئے ضائع ہوگیا۔

﴿وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ "لیکن وہ اپنے نفسوں پر خود ہی ظلم کرتے ہیں۔"

یعنی وہ اپنے کفر اور ریاء کاری کی وجہ سے اپنا مال بے جا خرچ کر کے اپنے مال کو ضائع کر کے اپنی جانوں پر ظلم کررہے ہیں۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

وتقديم المفعول لرعاية الفواصل لاللتخصيص "انفسهم" مفعول ہے جو فعل سے مقدم ذکر کیا گیا ہے، لیکن اس میں تخصیص کا معنی نہیں پایا گیا، بلکہ آیات کے آخری الفاظ کو ملانے کیلئے ذکر کیا گیا ہے، یعنی آخر میں "اَلْمُفْلِحُوْنَ، يَسْجُدُوْنَ، خَالِدُوْنَ، يَظْلِمُوْنَ" سب الفاظ ایک جیسے آگئے، جو عبارت کی خوبصورتی میں اضافہ کررہے ہیں۔ (ماخوذ از روح البیان)

کافروں کا ان کو نفع کیوں نہیں پہنچائے گا؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ کافروں کے مال خرچ کرنے میں دو احتمال ہیں۔ **ایک** یہ کہ وہ دنیاوی منافع کیلئے خرچ کریں، اور **دوسرا** یہ کہ دینی، اخروی منافع کیلئے مال خرچ کریں۔

"فان كان لمنافع الدنيالم يبق منه الرا البتة فى الآخرة فى حق المسلم فضلاعن الكافر"

اگر دنیا کے منافع کیلئے مال خرچ کیا جائے تو اس کا اثر آخرت میں مسلمان کے حق میں بھی باقی نہیں رہے گا تو کافر کو یقیناً اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اگر کافر آخرت کے منافع والے کاموں میں مال خرچ کریں، سرائے بنادیں پل تعمیر کردیں، غریبوں، ضعیفوں پر احسان کریں، یتیموں کی پرورش و تربیت کیلئے مال خرچ کریں، بیوہ عورتوں کو مال

دیں، یہ سب کام اگرچہ آخرت میں عظیم نفع کا سبب ہیں، لیکن ان میں ایمان شرط ہے، اگر ایمان نہ ہوا تو سب اعمال مکمل طور پر ضائع ہو جائیں گے، جیسا کہ کھیتی کاشت کرنے والا نفع کثیر کی توقع رکھتا ہے تو اسے سخت ٹھنڈی ہوا یا گرم لو پہنچے تو اسے تباہ و برباد کردے، سوائے غم اور افسوس کے کوئی چیز باقی نہ رہے۔

ایک اور رب تعالی کے ارشاد گرامی سے مسئلہ واضح ہو جاتا ہے:

﴿وَقَدِمْنَا اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾ (سورة الفرقان آية نمبر ۲۳)

''اور جو کچھ انہوں نے کام کئے تھے ہم نے قصد فرما کر انہیں باریک باریک غبار کے بکھرے ہوئے ذرے کردیا۔''

عمل میں اخلاص ضروری ہے:

فلیبادر العاقل الی الانفاق من ماله والاخلاص فی عمله '' عقل مند شخص کو چاہئے کہ وہ اپنا مال خرچ کرنے میں جلدی کرے اور اپنے عمل میں اخلاص رکھے، وہی عمل قبول ہوگا جس میں اللہ تعالی کی رضاء پائی گئی، جس عمل میں دکھلاوا پایا گیا وہ ضائع چلا جائے گا، کیونکہ وہ عمل صالح بنا ہی نہیں، بلکہ ریاء کاری عذاب کا ذریعہ بنے گی، کیونکہ یہ برے عمل میں داخل ہوگی۔

ریاء کاری سے بے برکتی:

منصور بن عمار رحمہ اللہ فرماتے ہیں ایک مومن جو اللہ کی رضاء کی خاطر میرا بھائی بنا ہوا تھا، میرے ساتھ اعتقاد رکھتا تھا، اور وہ خواہ مشکل ہو یا آسانی ہر حال میں میری زیارت کیا کرتا تھا، اور وہ بہت زیادہ عبادت گذار تھا، تہجد ادا کرتا تھا اور روتا رہتا تھا، میں نے چند دن اسے گم پایا (وہ میری زیارت کو نہ آیا) تو میں نے اس کے متعلق پوچھا، تو پتہ چلا کہ وہ بیمار ہے، اور بیماری کیوجہ سے کافی کمزور ہو چکا ہے، میں اس کی زیارت اور بیمار پرسی کیلئے اس کے گھر گیا، اس کے دروازہ کو کھٹکھٹایا تو اس کی بچی باہر نکلی، تو اجازت طلب کر کے میں اس کے گھر میں داخل ہوا تو میں نے اسے گھر کے صحن کے درمیان بستر پر لیٹا ہوا پایا، اس کا چہرا سیاہ ہو چکا تھا، اور آنکھیں اس کی نیلی ہو چکی تھیں، ہونٹ اس کے سخت ہو گئے تھے، تو میں نے اسے کہا اے میرے بھائی ''لاالہ الااللہ'' کا ورد زیادہ کرو، اس نے آنکھیں کھول کر مجھے غصہ سے سرخ آنکھوں سے دیکھا، پھر اس نے مجھے اسی طرح دیکھا، اور پھر اس نے مجھے اسی حال میں دیکھا، میں نے اسے کہا تم کلمہ کا ذکر کیا کرو، ورنہ میں تمہیں غسل دے کر، کفن پہنا کر دفن کردوں گا، تمہاری نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا۔ تو اس نے کہا اے میرے بھائی منصور میرے اور کلمہ کے درمیان کوئی چیز حائل ہو چکی ہے، یعنی میری زبان پر کلمہ جاری نہیں

ہورہا، میں نے "لا حول ولا قوة الاباللہ العلی العظیم "پڑھتے ہوئے کہا"فاین تلک الصلوۃ والصیام والتھجد والقیام " کہاں ہیں وہ تمہاری نمازیں اورروزے، کہاں ہیں وہ تمہارے تہجد اور دوسرے نوافل؟

"فقال یااخی کل ذلک کان لغیروجہ اللہ الماکنت افعل ذلک لیقال واذکربہ "

عبادات اللہ کی رضاء کے لئے نہیں تھیں، بلکہ ان میں میرا مقصد یہ تھا کہ میرے اعمال کا اور میرا چرچا ہو، اور لوگ یہ کہیں بڑا نمازی اور تہجد گذار ہے، جب میں گھر میں اکیلا ہوتا تو میں گناہوں میں مبتلاء ہو جاتا تھا۔

درآوازہ خواہی دراقلیم فاش　　　　بروں حلہ کن دروں حشو باش

اگر تو چاہتا ہے کہ ملک میں تیری تعریف کی جائے　　　　تو تو منافقت والا لباس اتاردے

"فلاغرور للعاقل بکثرة الاعمال والاولادوالاموال اذالم تکن نیة صحیحة"

جب تک انساب صحیح نہ ہو، اس میں خلوص نہ ہو تو وہ اپنے اعمال کی کثرت اور اولاد کے زیادہ ہونے اور بہت مال کے ہونے پر ناز نہ کرے اور اس غرور میں نہ رہے کہ یہ چیزیں میرے لئے نفع مند ہیں۔نفع مند اسی وقت ہیں جب ایمان اور خلوص پایا گیا۔خیال رہے جو لوگ آخرت کو ترجیح دیتے ہیں، بلکہ باقی تمام چیزوں کو چھوڑ کر صرف اللہ تعالی کی رضاء ومحبت کو حاصل کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں"فوجدوا الفقر اعزمن الغنی والذل الذمن العزة وبذلوا اموالھم وارواحھم فی سبیل اللہ" وہ فقر کو غنی ہونے سے عزیز سمجھتے ہیں، اور دنیاداروں کے عزت دینے سے زیادہ وہ دنیاداروں کی طرف دی جانی والی ذلت کو پسند کرتے ہیں۔اور وہ اپنے مال اور اپنی جانیں اللہ تعالی کی راہ میں قربان کردیتے ہیں۔لیکن ایسے لوگ بہت کم ہی ملتے ہیں۔

❁ نبی کریم ﷺ نے ﴿اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ o حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ﴾ کی تلاوت کی، پھر ارشاد فرمایا۔

"یقول ابن آدم مالی وھل لک من مالک الاما اکلت فافنیت اولبست فابلیت اوتصدقت فامضیت"

انسان کہتا ہے (یہ) میرا مال (ہے) اے انسان تیرا مال تو صرف وہ ہے جو تو نے کھا کر ختم کرلیا، اور تو نے پہن کر پرانا کرلیا ہے، یا تم نے صدقہ کرکے آخرت کیلئے جاری کردیا ہے۔

❁ قال ﷺ (یاعائشة ان اردت اللحوق بی فلیلفک من الدنیا کزادالراکب وایاک ومجالسة الاغنیاء ولاتستخلقی ثوباحتی ترقعیہ"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے عائشہ اگر تو میرے ساتھ ملنے کا ارادہ رکھتی ہے، تو تمہیں اتنا مال کافی ہونا چاہئے جتنا مسافر کو زادراہ کافی ہوتا ہے، اور اغنیاء کی مجلسوں سے اپنے آپ کو دور رکھو، کسی کپڑے کو پرانا نہ سمجھو بلکہ اسے ٹکڑے لگا کر پہن لیا کرو۔

❁ وقال ﷺ اللهم من احبنی فارزقه العفاف والکفاف ومن ابغضنی فاکثرماله وولده"
نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا" اے اللہ جو میرے ساتھ محبت رکھے اس کو پاکدامنی اور قناعت کا رزق عطاء فرما، اور جس نے میرے ساتھ بغض رکھا تو تو اس کے مال اور اولاد کو زیادہ کر (یعنی مال اور اولاد کی زیادتی کی اس کے دل میں حرص رکھ دے۔

نتیجہ واضح ہے:

فقدوقفت ایھاالعبدعلی حقیقة الحال وان المال لایغنی عن المرء شیئافعلیک بالقناعة وتقلیل الدنیاولاتغتربااصحاب الاموال والجاه"

اے انسان جب تو حقیقت مال سے واقف ہو چکا ہے تو یقین کرلے کہ مال انسان کو کسی چیز سے بے پرواہ نہیں کرسکتا، تو تو قناعت کو لازم پکڑ، اور دنیا کی قلت (قلیل ہونے) کو لازم پکڑ، لوگوں کے دنیاوی مرتبہ اور دنیا کے مال پر دل نہ للچا، بس تو رب کا ہو کر اپنے آپ کو یوں سمجھ،

از پی ذکروشوق حق مارا   دردو عالم دل وزبانی بس

اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی ملاقات کے شوق کیلئے ہمیں دونوں جہانوں میں دل اور زبان کافی ہے۔

وز طعام ولباس اہل جہاں   کہنہ دلقی ونیم نانی بس

جہاں والوں کے طعام اور لباس کی بنسبت ہمیں پرانی گدڑی اور آدھی روٹی کافی ہے اے انسان تو رب تعالیٰ کی رضاء کی خاطر کام کر دنیا کو دکھلاوے کیلئے کام نہ کر

زعمرو ای پسر چشم اجرت مدار   چودر خانہ زید باشی بکار

اے لڑکے عمرو سے امید اجرت کی نہ رکھ جبکہ تو کام زید کے گھر میں کرتا ہے اے انسان عبادت میں زیادہ سے زیادہ کوشش کر بغیر عبادت کے تو رب تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں کرسکتا

چہ قدر آورد بندہ خوردیش   کہ زیر قبادارد اندام پیش

وہ انسان کیا خوراک حاصل کرے گا   جو اپنے جبہ کے نیچے ہاتھ باندھے رکھے۔ (ماخوذ از روح البیان)

اعمال کے ضائع ہونے میں معتزلہ اور اہل سنت کا مذہب:

معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ عمل کرنے کے بعد ضائع ہو جاتے ہیں، اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ مجازی طور پر

عمل ضائع ہوجانا ذکر کیا جاتا ہے، حقیقت میں کوئی عمل ضائع نہیں ہوتا۔ معتزلہ نے اس آیۃ کریمہ سے یہ دلیل پکڑی ہے کہ جس طرح سرد ہوا یا گرم لو کھیتی کو برباد کردیتی ہے اسی طرح کفر وغیرہ سے عمل ضائع ہوجاتے ہیں، لھذا یوں کہا جائے گا "انہ لولا الکفر لکان ذلک الانفاق موجبالمنافع الآخرۃ وحینئذ یصح القول بالاحباط" کہ اگر وہ کافر نہ ہوتے تو ان کا مال خرچ کرنا ان کیلئے آخرت میں نفع مند ہوتا، لیکن ان کے کفر نے ان کے مال خرچ کرنے کو ضائع کردیا، معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ انہوں نے کفر کی حالت میں جو مال خرچ کیا ہے وہ حقیقت میں باطل ہوگیا کہ انہوں نے مال خرچ ہی نہیں کیا۔

اہل سنت اس مسئلہ میں یہ کہتے ہیں:

"ان العمل لایستلزم الثواب الابحکم الوعد، والوعدمن اللہ مشروط بحصول الایمان، فاذاحصل الکفرفات المشروط لفوات شرطہ لان ازالہ بعد ثبوتہ"

انسان کو عمل کا ثواب اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کا وعدہ پایا جائے، اللہ تعالیٰ کا وعدہ ایمان کے ساتھ مشروط ہے، جب ایمان ہی نہیں پائے جائے گا تو ثواب بھی حاصل نہیں ہوگا، جب ثواب حاصل نہ ہوا تو مجازی طور پر کہا جائے کہ اس کا عمل ضائع ہوگیا، اہل سنت کے مذہب میں کافر کا مال خرچ تو ختم نہیں ہوتا البتہ ثواب سے اسے محرومیت رہتی ہے۔ (کبیر)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّنْ دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ○ (آیۃ نمبر ۱۱۸)

(1) اے ایمان والو غیروں کو اپنا راز دار نہ بناؤ وہ تمہاری برائی میں کمی نہیں کرتے ان کی آرزو ہے جتنی ایذاء تمہیں پہنچے بیران کی باتوں سے جھلک اٹھا اور وہ جو سینے میں چھپائے ہیں اور بڑا ہے، ہم نے نشانیاں تمہیں کھول کر سنا دیں اگر تمہیں عقل ہو۔ (کنز الایمان)

(2) اے ایمان والو نہ بناؤ راز دان اپنوں کے سواء اوروں کو، وہ نہیں کمی کرتے تمہیں فساد پہنچانے میں اور وہ پسند کرتے ہیں تمہارا مشقت میں پڑنا، تحقیق ظاہر ہوگیا بغض ان کے مونہوں سے، اور وہ جو چھپائے ہیں اپنے سینوں میں اور بڑا ہے، اور تحقیق ہم نے کھول کر بیان کردی ہیں نشانیاں تمہارے لئے اگر تم عقل رکھتے ہو۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول: (۱) شان نزول کے متعلق ایک روایت یہ ہے۔

❁ اخرج ابن اسحق وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابن عباس قال کان رجال من المسلمین یواصلون رجالا من یهود لما کان بینهم من الجوار والحلف فی الجاهلیة فانزل الله فیهم ینهاهم عن مباطنتهم تخوف الفتنة علیهم منهم يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّنْ دُونِكُمْ" (الآیة)

ابن اسحاق اور ابن جریر اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی کہ مسلمانوں میں سے کچھ حضرات یہودیوں کے پڑوسی تھے، زمانہ جاہلیت میں ان کی آپس میں دوستی تھی کہ ایک دوسرے کے حلیف تھے، اب اسلام لانے کے بعد بھی یہ ان سے میل جول رکھتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر مومنو کو یہود سے ملنے سے منع کردیا کہ تم ان کو اپنا راز دار نہ بناؤ ورنہ وہ تمہیں فتنہ میں ڈال دیں گے۔ (منقول از در منثور)

(۲) واخرج عبد بن حمید وابن جریر وابن ابی حاتم عن مجاهد فی الآیة قال نزلت فی المنافقین من اهل المدینة نهی المؤمنین ان یتولوهم"

شان نزول کے متعلق دوسری روایت عبد بن حمید اور ابن جریر اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت

مجاھد سے بیان کی ہے کہ اس آیۃ کریمہ سے مدینہ طیبہ کے منافقوں سے محبت رکھنے سے مؤمنوں کو منع کیا۔
(منقول از در منثور)

اصل میں کئی مسلمان تو منافقوں کو سمجھ چکے تھے، لیکن بعض مسلمان ان کو مخلص مؤمن سمجھتے تھے، ان کو منع کیا کہ تم ان کو اپنا رازدار نہ بناؤ، وہ تمہاری باتیں یہودیوں تک پہنچاتے ہیں۔

(۳) واخرج ابن حاتم والطبرانی بسند جید عن حمید بن مهران المالکی الخیاط قال سالت اباغالب عن قوله (یاایها الذین آمنوا لاتتخذوا بطانة من دونکم) الآیة. قال حدثنی ابو امامة عن رسول الله ﷺ انه قال هم الخوارج"

ابن ابی حاتم اور طبرانی نے سند صحیح سے حمید بن مہران مالکی خیاط سے روایت ذکر کی، وہ کہتے ہیں مجھے ابوامامہ نے رسول اللہ ﷺ سے حدیث بیان کی ہے کہ اس آیۃ کریمہ کو نازل کیا گیا ہے کہ خارجیوں سے محبت کرنے اور ان کو اپنا رازدار بنانے سے منع کیا ہے۔ (منقول از در منثور)

(۴) واخرج عبد بن حمید وابویعلی وابن جریر وابن ابی حاتم والبیهقی فی الشعب عن انس عن النبی ﷺ قال لاتنقشوا فی خواتیمکم عربیا ولاتستضیئوا بنار المشرکین فذکر ذلک للحسن فقال نعم لاتنقشوا فی خواتیمکم محمدا ولاتستشیروا المشرکین فی شئی من امورکم قال الحسن وتصدیق ذلک فی کتاب الله یاایها الذین آمنوا لاتتخذوا بطانة من دونکم"

حضرت انس ﷺ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی انگوٹھیوں میں عربی کا نقش نہ کراؤ، اور مشرکوں کی آگ سے روشنی حاصل نہ کرو (صحابہ کرام کے دور کے بعد تابعین کے دور میں) یہ حدیث حضرت حسن بصری رحمہ اللہ پر پیش کی گئی، آپ نے فرمایا ہاں حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی انگوٹھیوں پر نبی کریم ﷺ کا اسم گرامی "محمد" نقش نہ کراؤ (عربی ذات سے مراد آپ ہی ہیں، اور دوسری روایات میں واضح طور پر آپ کے نام کو انگوٹھیوں میں نقش کرانے سے منع کیا گیا ہے) اور آپ کے فرمان کہ مشرکوں کی آگ سے روشنی حاصل کرنے سے منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم مشرکوں سے اپنے معاملات میں کسی چیز کے متعلق مشورہ نہ کیا کرو، اس کی تائید کتاب اللہ میں موجود ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ﴾ (اے ایمان والو تم نہ بناؤ رازدار اپنوں کے سوا غیروں کو) اس روایت کے مطابق مشرکین کو رازدار بنانے سے منع کیا گیا ہے۔ (منقول از در منثور)

تمام روایات ہی شان نزول ہیں:

راقم نے نزدیک روایات میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ سب ہی اجتماعی طور پر مراد ہیں، یعنی اے ایمان والو یہود کو، منافقین کو، خارجیوں کو، مشرکین کو، غرضیکہ ہر قسم کے کافر کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔ (بِطَانَةً) **ولیجة وھو الذی یعرفہ الرجل اسرارہ لثقة بہ**" جو شخص دوسرے کو اپنے راز بتادے اور اس پر بھروسہ کرے، اور اس پر کامل اعتبار کرے، اسے "بِطَانَةً" اور (وَلِیْجَةً) کہا جاتا ہے، اصل میں رازدار کو تشبیہ دی گئی ہے کپڑے یعنی استر سے، استر کو بطانہ کہا جاتا ہے اور کپڑے کے ظاہر حصہ کو "ظھارۃ" کہا جاتا ہے۔ اسی کپڑے کے اندر پہننے والے کپڑے کرتی، بنیان وغیرہ کو "شعار" کہا جاتا ہے، اور کپڑے کے اوپر پہننے والے چادر، کوٹ وغیرہ کو "دثار" کہا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے انصار کو "شعار" سے تشبیہ دی اور عام لوگوں کو "دثار" سے آپ نے ارشاد فرمایا "**الانصار شعار والناس دثار**" انصار شعار ہیں، یعنی جگری یار ہیں، اور عام لوگ "دثار" ہیں یعنی اوپری یار ہیں۔ (ماخوذ از بیضاوی وشیخ زادہ)

خیال رہے کہ "اَلنَّاسِ" پر الف لام عہد ذہنی ہے، مہاجرین صحابہ کرام "دثار" نہیں، بلکہ وہ "شعار" ہی ہیں انصار کی کسی خاص موقع پر تعریف کرتے ہوئے صرف ان کا ذکر کردیا گیا ہے۔ ﴿مِنْ دُوْنِکُمْ﴾ **دون امابمعنی غیر اوبمعنی الادون والدنی** "دُوْن" کے دو معنی ہیں۔ ایک بمعنی "غیر" کے، اسی کے مطابق **راقم** نے ترجمہ کیا ہے "اے ایمان والو تم نہ بناؤ رازدار اپنوں کے سوا غیروں کو" "کم" ضمیر جو مضاف الیہ ہے "دُوْن" کا یہ مؤمنین کی طرف لوٹ رہی ہے، اب واضح طور پر ترجمہ یہ ہوگا "اے ایمان والو ایمان والوں کے سوا کافروں کو رازدار نہ بناؤ" "دون" کا دوسرا معنی ہے "گھٹیا" اب اس صورت میں معنی ہوگا اے ایمان والو اپنے اعلیٰ واشرف لوگوں کے سوا گھٹیا لوگوں کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔ (ماخوذ از روح المعانی)

اس ترجمہ میں بہت ہی حسن وجمال پایا گیا ہے کہ بہت مختصر الفاظ سے مومنوں کی شان بیان ہوگئی کہ وہ اعلیٰ اور اشرف ہیں، وہی تمہارے اپنے ہیں، اور کافروں کی مذمت بھی پائی گئی کہ وہ گھٹیا ہیں اور وہ تم سے دور ہیں، وہ تمہارے نہیں۔

دینی طلباء کرام کیلئے چند مسائل:

(۱) ﴿مِنْ دُوْنِکُمْ﴾ **ای من دون المسلمین ومن غیر اھل ملتکم**" ﴿مِنْ دُوْنِکُمْ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ "مسلمانوں کے سوا" یا مطلب یہ ہے کہ اپنے مذہب والوں کے سوا دوسرے مذاہب والے، یہ معنی مراد لینا بہت اچھا ہے، کیونکہ اس سے یہ بھی سمجھا دیا گیا ہے کہ اے ایمان والو مؤمنین ہی تمہارے اپنے ہیں، وہی تمہارے بھائی ہیں

،یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جائے"قد احسنتم الینا وانعمتم علینا وھو یرید احسنتم الی اخواننا"تم نے ہم پر احسان کیا اور تم نے ہم پر انعام کیا، تو اس کا مطلب یہ لیا گیا ہے کہ تم نے ہمارے بھائیوں پر احسان کیا، یعنی ہمارے بھائیوں پر احسان کرنا ہم پر احسان کرنا ہے، اسی طرح آیۃ کریمہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مؤمن بھائیوں کو راز دار بنانا غیروں کو راز دار بنانا ہے، وہ راز دوسرے کافروں تک بھی پہنچ جائے گا۔ (کبیر بوضاحت)

(۲) "لَاتَتَّخِذُوْا بِطَانَةً" میں "بِطَانَةً" نکرہ ہے جو تحت النفی واقع ہے، جو عموم کا فائدہ دے رہا ہے یعنی کسی ایک کافر کو بھی اپنا راز دار نہ بناؤ۔ (کبیر)

(۳) ﴿مِنْ دُوْنِكُمْ﴾ میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ یہ متعلق ہو "لَاتَتَّخِذُوْا" سے، اب معنوی طور پر عبارت یہ ہو "لَاتَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِكُمْ بِطَانَةً" اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ وصف ہو "بِطَانَة" کا اب معنوی لحاظ پر تقدیر عبارت کی یہ ہو "لَاتَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ" یہی صورت زیادہ بہتر ہے، کیونکہ جس چیز کا ذکر کرنا اہم ہو، اسے پہلے ذکر کیا جاتا ہے، اس صورت میں نفی راز دار بنانے کی اہم ہے اگرچہ مراد اس سے غیر مذاہب والے ہی ہیں، دوسری صورت میں نفی غیروں کی ہوئی، راز دار بنانے کا ذکر ضمنی طور پر ہو گیا، حالانکہ مقصود راز دار بنانے کی نفی ہے۔ (کبیر)

❁ عن ابی ھریرة عن النبی ﷺ قال المرء علی دین خلیله فلینظر احدکم من یخالل" (سنن ابی داؤد)
حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے تم میں سے ہر ایک کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کس سے دوستی قائم کر رہا ہے۔ (منقول از قرطبی)

یعنی انسان کو چاہئے کہ مسلمان، نیک، دیندار سے دوستی قائم کرے تا کہ اس کے اچھے اعمال اس پر بھی اثر انداز ہوں، کافر، بے دین شخص سے دوستی قائم نہ کرے تا کہ اسکے برے اعمال اس پر اثر انداز نہ ہوں۔

﴿لَایَأْلُوْنَكُمْ خَبَالًا﴾ (وہ کمی نہیں کرتے تمہیں فساد پہنچانے میں)

(لَایَأْلُوْنَكُمْ خَبَالًا)ای لایقصرون لکم فی الفساد"وہ کمی نہیں کرتے تمہیں فساد پہنچانے میں۔

دینی طلباء کی توجہ کیلئے:

الا،یالو،الوا" کا معنی ہے کوتاہی کرنا، کمی کرنا، یہ زیادہ طور پر ایک مفعول سے متعدی ہوتا ہے، اور کبھی دو مفعولوں سے بھی متعدی ہوتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے "لا آلوک نصحا" جب دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے تو

زیادہ طور پر منع یا" نقص " کے معنی کو متضمن ہوتا ہے "لایالوک نصحا" کا معنی ہے وہ تمہیں نصیحت کرنے سے رکتا نہیں، یا معنی یہ ہوگا وہ تمہیں نصیحت کرنے میں کمی نہیں کرتا، تاہم تقصیر والا معنی بھی کبھی دو مفعولوں میں استعمال ہوتا ہے جیسا علامہ بیضاوی نے ﴿لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا﴾ کا ترجمہ کیا ہے "لایقصرون لکم فسادا" ۔وہ کوئی کمی نہیں چھوڑتے تم میں فساد ڈالنے کی۔ (ماخوذ از بیضاوی وشیخ زادہ)

"والخبال الفساد واصله مایلحق الحیوان من جنون فیورثه فساداواضرارا"

خبال کا معنی ہے فساد، اصل میں ذی روح چیز کو جو جنون لاحق ہوتا ہے اسے خبال کہا جاتا ہے، چونکہ اس سے فساد اور ضرر پیدا ہوتا ہے اسلئے پھر فساد اور ضرر پر بھی خبال بولا جانے لگا" **مخبول** " اور " **خابل** " ناقص العقل کو کہتے ہیں۔

حضرت عمر ﷛ کے درخشندہ فیصلے:

وروی ان اباموسی الاشعری استکتب ذمیافکتب الیه عمر یعنفه وتلاعلیه هذه الآیة وقدم ابوموسی الاشعری علی عمررضی الله عنهمابحساب فرفعه الی عمرفاعجبه، وجاء عمر کتابلفقال لابی موسی این کاتبک یقراهذاالکتاب علی الناس؟فقال انه لایدخل المسجدفقال لم؟اجنب هو؟قال انه نصرانی؟ فانتهره وقال لاتدنهم وقداقصاهم الله ولاتکرمهم وقداهانهم الله ولاتامنهم وقدخونهم الله"

روایت بیان کی گئی ہے کہ بیشک ابوموسی اشعری نے ایک ذمی کو حساب لکھنے پر مقرر کیا تو حضرت عمر ﷛ نے ان کی طرف خط لکھا ان کو سختی سے منع کیا اور یہی آیت بطور دلیل تلاوت فرمائی۔حضرت ابوموسی ﷛ (اس غیر مسلم ذمی کی قابلیت بیان کرنے کے لئے) حضرت عمر ﷛ کے پاس حساب لیکر آئے اور حضرت عمر ﷛ کے پاس وہ حساب پیش کیا۔آپ نے اس حساب پر تعجب کیا حضرت عمر نے ابوموسی سے پوچھا کہ وہ تمہارا کاتب کہاں ہے؟وہ آکر لوگوں پر یہ لکھا ہو حساب خود پڑھ کر سنائے۔ابوموسی اشعری نے کہا وہ مسجد میں داخل نہیں ہوسکتا۔آپ نے پوچھا کیوں داخل نہیں ہوسکتا کیا وہ جنبی ہے؟ حضرت ابوموسی نے کہا وہ نصرانی ہے آپ نے ان کو جھڑکا اور فرمایا" ان کو قریب نہ کرو" اسلئے کہ اللہ تعالی نے ان کو تم سے دور کر دیا ہے اور ان کو عزت نہ دو، تحقیق اللہ تعالی نے ان کو ذلیل کر دیا ہے اور ان کو امین نہ سمجھو رب تعالی نے ان کو خائن کہہ دیا ہے۔

۞ وعن عمر ﷛ قال لاتستعملوااهل الکتاب فانهم یستحلون الرشاء واستعینوا علی امورکم وعلی رعیتکم بالذین یخشون الله تعالی وقیل لعمررضی الله ان

ههنا رجلامن نصاری الحیرة لااحد اکتب منه ولااخط بقلم افلایکتب عنک فقال لاآخذبطانة من دون المؤمنین فلایجوزاستکتاب اهل الذمة، ولاغیر ذلک من تصرفاتهم فی البیع والشراء والاستنابة الیهم"

حضرت عمرؓ نے فرمایا اہل کتاب کوکسی کام پر نہ لگاؤ، کیونکہ وہ رشوت کو حلال سمجھتے ہیں، تم اپنے معاملات میں اوراپنی رعایا پران لوگوں سے امداد طلب کروجواللہ تعالیٰ کا خوف رکھتے ہوں، حضرت عمرؓ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ یہاں حیرہ کے نصاریٰ میں سے ایک شخص بہت اچھا کاتب ہے، کوئی ایک اس سے اچھا کاتب نہیں، اور کسی کا قلم اس سے اچھا نہیں لکھ سکتا، کیا ہم اسے کاتب نہ بنالیں، آپ نے فرمایا میں مؤمنوں کے سوا کسی ایک کو راز دار نہیں بناتا، ذمیوں کو کاتب بنانا جائز نہیں، اوراس کے بغیر خرید وفروخت کے تصرفات ان کیلئے جائز نہیں، اوران کو نائب بنانا جائز نہیں۔
(ماخوذ از قرطبی)

﴿وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ﴾ "اوروہ پسند کرتے ہیں تمہارا مشقت میں پڑنا۔"

"ود، یود، ودا" محبت کرنا، جیسا کہ کہاجاتا ہے "وددته کذا" ای اجبته کذا" میں فلاں سے اس طرح کی محبت کرتا ہوں۔ "العنت" شدة الضرر والمشقة "العنة" کا معنی ہے "شدید نقصان پہنچانا اور مشقت میں مبتلاء کرنا" "ما" مصدریہ ہے راقم نے ترجمہ مصدری ہی کیا ہے، "تمہارا مشقت میں پڑنا" معنوی طور پر تقدیر عبارت کی یہ ہوگی "احبوا ان یضروکم فی دینکم ودنیاکم اشد الضرر" وہ پسند کرتے ہیں تمہارے دین اور تمہاری دنیا میں تمہیں شدید نقصان پہنچنے کو "لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا" اور "وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ" میں چند وجہ سے فرق پایا گیا ہے۔

(۱) الاول لایقصرون فی افسادد ینکم فان عجزواعنه ودوالقاء کم فی اشد انواع الضرر"

پہلی وجہ فرق یہ ہے کہ وہ تمہارے دین میں فساد پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کرتے، اگر وہ فساد پھیلانے سے عاجز آجائیں تو تمہارا شدید میں مشقت پڑنا انہیں پسند آتا ہے۔

(۲) الثانی لایقصرون فی افساد امورکم فان لم یفعلوا ذلک لمانع من خارج فحب ذلک غیر زائل عن قلوبهم"

دوسری وجہ فرق یہ ہے کہ وہ تمہارے ہر قسم کے معاملات میں فساد پھیلانے میں کوئی کمی نہیں کرتے، اگر کسی خارجی مانع کی وجہ سے ایسا نہ کرسکیں تو ان کے دلوں میں تمہیں فساد میں مبتلاء کرنے کی محبت برقرار رہتی ہے وہ زائل نہیں ہوتی۔

(۳) والثالث لایقصرون فی فساد امورکم فی الدنیا فاذا عجزواعنه لم یزل عن قلوبهم

حب اعنالکم"

تیسرا وجہ فرق یہ ہے کہ وہ تمہارے دنیاوی امور میں فساد پھیلانے میں کوئی کمی نہیں کرتے، جب وہ اس سے عاجز آجائیں تو ان کے دلوں میں تمہارا مشقت میں پڑنا پسند آتا ہے، یہ تمنا ان سے زائل نہیں ہوتی۔ (کبیر بتقدیم وتاخیر)

"البغضاء" کا معنی بہت شدید بغض ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے "البغض مع البغضاء" بہت شدید بغض، اسی طرح کہا جاتا "الضرمع الضراء" بہت زیادہ ضرر۔ (کبیر)

"افواہ" جمع ہے "فم" کی" فم "اصل میں "فوہ" ہے، اس پر دلیل ہی "افواہ" ہے، کیونکہ جمع تکسیر اور تصغیر اسموں کو اپنے اصل کی طرف لوٹاتی ہے، یہ جمع ایسے ہی ہے جیسے سوط کی جمع اسواط آتی ہے، اور طوق کی جمع اطواق آتی، ہے جب کوئی شخص عمدہ بات کرے تو کہا جاتا ہے" رجل مفوہ " اور کہا جاتا ہے "افوہ "جبکہ وہ وسیع منہ والا ہو۔ (کبیر)

بغض ضد ہے محبت کی، مطلب یہ ہے کہ تمہاری عداوت اور تکذیب ان کے مونہوں سے ظاہر ہوتی ہے۔

"افواہ" کہا" السنة" نہیں کہا کیا وجہ ہے؟

بظاہر عجیب وہم ہوتا ہے کہ یہ کہا گیا ہے ﴿قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ﴾ (تحقیق بغض ظاہر ہو گیا ان کے مونہوں سے) یہ کیوں نہیں کیا ﴿قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَلْسِنَتِهِمْ﴾ کہ ان کی زبانوں سے بغض ظاہر ہو گیا۔

"وخص تعالی الافواہ بالذکر دون الالسنة اشارة الی تشدقهم وثرثرتهم فی اقوالهم هذه"

اس کی وجہ یہ ہے منہ کا ذکر کیا، زبان کا نہیں کیا جس سے یہ اشارہ کیا ہے، کہ کافروں کا تمہارے ساتھ بغض صرف زبانوں سے ظاہر نہیں ہو رہا، بلکہ ان کی باچھوں سے بھی بغض بکھر رہا ہے۔ (قرطبی)

❁ نهی النبی ﷺ ان یشتحی الرجل فاه فی غض اخیه" معناہ ان یفتح" نبی کریم ﷺ نے اپنے مومن بھائی کی عزت کے خلاف منہ کھولنے سے منع فرمایا۔

❁ وقال ﷺ ان دماء کم واموالکم واعراضکم علیکم حرام " نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک تمہارے خون اور تمہارے مال اور تمہاری عزتیں تم میں سے ایک دوسرے پر حرام ہیں۔ (قرطبی)

اور رب تعالی کا ارشاد گرامی اور زیادہ واضح ہے ﴿وَلَا یَغْتَبْ بَعْضُکُمْ بَعْضًا﴾ اور نہ غیبت کرے تمہارا بعض بعض کی۔

فعل قلبی کے بعد فعل بدنی کا ذکر:

پہلے ذکر فرمایا ﴿وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ﴾ (وہ پسند کرتے تمہارا مشقت میں پڑتا) اس میں ان کے فعل قلبی (دل کے کام) کا ذکر کیا گیا کہ وہ مؤمنین سے دل میں شدید بغض رکھتے ہیں، اس کے بعد ذکر فرمایا ﴿قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ﴾ (تحقیق ظاہر ہو گیا بغض ان کے مونہوں سے) اس میں ان کے فعل بدنی کو بیان کیا گیا کہ مؤمنوں کے بغض کو وہ مونہوں سے بھی ظاہر کرتے رہتے ہیں "فجمعوا بین کراهة القلوب و بذاذة الالسن" یعنی ان میں مؤمنوں کو دلوں سے ناپسند کرنا، اور مؤمنوں کے خلاف فحش کلامی دونوں چیزیں جمع تھیں۔ (البحر المحیط)

ان کی فحش کلامی ان کی باچھوں سے بھی بکھر رہی ہوتی تھی، قرطبی کی ایک عبارت پہلے نقل کی جا چکی ہے، طلباء کرام روح المعانی کی ایک خوبصورت عبارت بھی یاد کرلیں۔

(قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ) ای ظهرت امارات العداوة لکم من فلتات السنتهم وفحوی کلماتهم لانهم لشدة بغضهم لکم لایملکون انفسهم و لایقدرون ان یحفظوا السنتهم"

(تحقیق ظاہر ہو چکا بغض ان کے مونہوں سے) یعنی تمہاری عداوت کی علامات و نشانیاں ان کی زبانوں کی جان بوجھ کر لغزشوں سے اور ان کے انداز کلام سے ظاہر ہوتی رہتی ہے کیونکہ وہ مؤمنین سے شدید بغض رکھتے ہیں وہ اپنے نفسوں پر مالک نہیں، اور نہ ہی اپنی زبانوں کی حفاظت کر سکتے ہیں۔

یعنی مطلب وہی جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ فحش کلامی میں اتنے آگے نکل چکے ہیں کہ ان کی زبانوں سے تابڑ توڑ حملے ان کے بس میں نہیں ہوتے، ان کا بیہودہ کلام ان کی باچھوں سے بھی بکھر پڑتا ہے۔

ان کے مونہوں سے بغض کے ظاہر ہونے کے دو مطلب:

(۱) ایک یہ کہ وہ مومنوں کے خلاف باتیں توڑ موڑ کر پیش کرتے جس سے وہ مؤمنوں کے خلاف اپنی باتوں کو پیش کر کے خوش ہوتے، رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ﴾ آپ ضرور بر ضرور ان کو پہچانو گے ان کی باتوں کی ادائیگی میں۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے کافروں سے مسلمانوں کے خلاف باتیں کرتے ہیں، نبی کریم ﷺ اور قرآن پاک کی تکذیب کرتے ہیں اور مؤمنوں کو جاہل اور احمق کہتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَمَاتُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَکْبَرُ﴾ ”اور وہ جو چھپائے ہیں اپنے سینوں میں اور بڑا ہے۔“

یعنی وہ جو منافقوں کی زبان پر بغض کی علامات ظاہر ہوتی ہیں وہ کم ہیں اور ان کے سینوں میں چھپی نفرت بہت بڑی ہے اور ان کی زبانوں سے جو کینہ کی علامات ظاہر ہوتی ہیں وہ کم ہیں اور جو ان کے سینوں میں کینہ چھپا ہوا ہے وہ بہت بڑا ہے۔ (کبیر)

﴿قَدْ بَیَّنَّالَکُمُ الْاٰیٰتِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾

”تحقیق ہم نے کھول کر بیان کردی ہیں تمہارے لئے نشانیاں اگر تم عقل رکھتے ہو۔“

یعنی ہم نے واضح آیات ذکر فرمادی ہیں، جن میں واضح طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے دشمنوں سے محبت کرنے سے منع کیا گیا ہے، یا دوسرا مطلب یہ ہے کہ نے واضح آیات ذکر کردی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ سے محبت کرنے والے اور ان کے دشمنوں میں تمیز کررہی ہیں۔ (روح المعانی)

﴿اِنْ کُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ ”اگر تم عقل رکھتے ہو۔“

یعنی اگر تم صاحب عقل وفہم ہو اور سمجھ رکھتے ہو تو دشمن اور دوست میں فرق محسوس کرو، کافروں کو دشمن سمجھو، اور مؤمنین کو دوست سمجھو، کافروں سے دور ہو جاؤ اور مؤمنوں کے قریب ہو جاؤ، آجکل الٹی گنگا بہہ رہی ہے، مسلمانوں، دینداروں، علماء کا قتل عام کیا جارہا ہے، یہود وہنود ونصاریٰ کی غلامی کا پٹہ گلے میں ڈالا ہوا ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

هٰۤاَنْتُمْ اُولَاۤءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا یُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَیْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ قُلْ مُوْتُوْا بِغَیْظِكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○ (آیة نمبر ۱۱۹)

(1) سنتے ہو یہ جو تم ہو تم تو انہیں چاہتے ہو اور وہ تمہیں نہیں چاہتے اور حال یہ کہ تم سب کتابوں پر ایمان لاتے ہو اور وہ جب تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور اکیلے ہوں تو تم پر انگلیاں چبائیں غصہ سے تم فرمادو کہ مرجاؤ اپنی گھٹن میں اللہ خوب جانتا ہے دلوں کی بات۔ (کنزالایمان)

(2) خبردار تم یہ ہو، تم پسند کرتے ہو ان کو اور وہ نہیں پسند کرتے تمہیں، حالانکہ تم ایمان رکھتے ہو تمام کتابوں پر، اور وہ جب تمہیں ملتے ہیں، کہتے ہیں ہم ایمان لائے، اور جب علیحدہ ہوتے ہیں تو کاٹتے ہیں تم پر (انگلیوں کے) پورے آپ فرمادو مرجاؤ تم حسرت سے، بیشک اللہ جاننے والا ہے سینوں کی باتوں کو۔ (نجوم الفرقان)

طلباء کرام پہلے ترکیب دیکھیں پھر مطلب واضح ہوگا:

ترکیب میں چند احتمال ہیں "ھا" تنبیہ کیلئے ہے "انتم" مبتداء ہے اور "اولاء" پہلی خبر ہے، اور تحبونھم دوسری خبر ہے دوسری ترکیب یہ ہے کہ "انتم" مبتداء ہے، اور "اولاء" پھر مبتداء ہے، اور "تُحِبُّوْنَهُمْ" خبر ہے، مبتداء خبر مل کر مکمل جملہ خبر ہے پہلے مبتداء کی ان دونوں صورتوں میں "اولاء" اسم اشارہ ہے جو قریب کیلئے استعمال ہے، اب معنی یہ ہوگیا ''خبردار تم یہ ہو تم انہیں پسند کرتے ہو اور وہ تمہیں پسند نہیں کرتے'' ایک اور احتمال یہ ہے کہ "اولاء" موصول ہو، اور بعد میں آنے والا جملہ صلہ ہو، اس صورت میں معنی یہ ہوگا ''خبردار تم وہ لوگ ہو کہ تم انہیں پسند کرتے ہو اور وہ تمہیں پسند نہیں کرتے۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

"ھا" تنبیہ ذکر کرنے کا فائدہ:

جب کوئی شخص غافل ہو، یا اس کی توجہ کامل نہ ہو متکلم کی طرف تو اسے خواب غفلت سے جگانے کیلئے حرف تنبیہ ذکر کیا جاتا ہے، مؤمنین چونکہ توجہ کی کمی، یعنی غفلت کی وجہ سے منافقوں کو مخلص مؤمن سمجھ کر، ان سے محبت کرتے

اوران کوراز بتادیتے، تورب تعالیٰ نے " ھا" تنبیہ سے ان کو بتایا کہ "ان المخاطبین مخطئو ن فی اتخاذھم بطانۃ" بیشک مؤمنین جن کو خطاب کیا جارہا ہے وہ کافروں کو دوست اور رازدار بنا کر غلطی کررہے ہیں، اس غلطی سے ان کو باز رہنا ضروری ہے۔ (ازروح المعانی وشیخ زادہ)

﴿ھَاَنْتُمْ اُولَاءِ﴾ میں اشارہ کا فائدہ:

والاشارۃ للتحقیر فاستعملت ھنا للتوبیخ کانہ ازدری بھم لظھور خطئھم فی ذلک الاتخاذ"

"اولاء" اشارہ تحقیر کیلئے ہے، لیکن یہاں توبیخ کیلئے استعمال ہے، یعنی مؤمنین کو کفار سے محبت کرنے سے ڈرایا گیا ہے، اور انکی کفار کے ساتھ دوستی پر ان کی ظاہر خطاء پر عیب لگایا گیا ہے، یہ مکمل مسئلہ صرف "اولاء" سے سمجھ آگیا، بعد میں آنے والے الفاظ تفسیر بن گئے۔ (روح المعانی)

تنبیہ: صحابہ کرام کی محبت منافقوں سے ان کے کفر کے ظاہر ہونے کے بعد نہیں تھی، بلکہ جب تک ان کا کفر ظاہر نہیں ہوا تھا، ان کو مخلص سمجھ کر محبت کی گئی، یا منافقین اور یہود وغیرہ سے محبت یہ تھی۔

"والمراد بمحبۃ المؤمنین لھم المحبۃ العادیۃ الناشئۃ من نحو الانسان والصداقۃ"

مؤمنوں کی ان لوگوں سے دلی محبت، ایمانی محبت نہیں تھی، بلکہ عام عادت کے مطابق جو کسی احسان کرنے والے سے، یا ظاہری طور پر دوستی قائم کرنے والے سے محبت ہوتی ہے، وہی محبت ان سے تھی۔

اس ظاہری اور عام عادت کے مطابق محبت کو بھی رب تعالیٰ نے عجیب وغریب سمجھتے ہوئے مؤمنین کو منع فرمایا کہ تم منافقوں کی چھان بین کیوں نہیں کررہے، یہود سے زمانہ جاہلیت کے معاہدوں کا پاس کیوں کررہے ہو وہ معاہدے تو خود بخود ختم ہوگئے، اور وہ تو ﴿اَلَّذِیْنَ یَتَرَبَّصُوْنَ بِکُمْ رَیْبَ الْمَنُوْنَ﴾ تمہارے حوادثات اور مصائب وآلام کے منتظر رہتے ہیں، وہ تمہیں کافر بنانے کے درپے ہوتے ہیں (پیچھے لگے رہتے ہیں) اگرچہ اس میں کامیاب تو نہیں ہوتے، لیکن تمہیں نقصان پہنچانے کا کوئی وقت ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، لھذا تم ان سے ہر وقت محتاط رہو، کہیں ان کے جال میں نہ پھنس جانا۔ (ازروح المعانی)

﴿ھَاَنْتُمْ اُولَاءِ تُحِبُّوْنَھُمْ وَلَا یُحِبُّوْنَکُمْ﴾

"خبردار تم یہ ہو کہ تم ان کو پسند کرتے اور وہ تمہیں پسند نہیں کرتے۔"

اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں:

(۱) احدھاقال المفضل(تحبونھم)تریدون الاسلام وھو خیر الاشیاء(وَلَا یُحِبُّوْنَکُمْ)لانھم یریدون بقائکم علی الکفر ولاشک انہ یوجب الھلاک"

ان میں ایک وجہ یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے جو مفضل رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ تم ان کو پسند کرتے ہو، یعنی تم چاہتے ہو کہ وہ اسلام لے آئیں، تم ان کیلئے سب چیزوں سے اعلیٰ چیز پسند کر رہے ہو، لیکن وہ تمہیں پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی طرح کافر بنو، حالانکہ یقینی بات ہے کہ کفر ہلاک کر دینے والی چیز ہے۔

(۲) الثانی(تُحِبُّوْنَھُمْ)بسبب ماںینکم وبینھم من الرضاعة والمصاھرة(وَلَا یُحِبُّوْنَکُمْ)بسبب کونکم مسلمین"

دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم ان سے محبت کرتے ہو کہ تمہارے ان سے رشتے قائم ہیں، کوئی ان میں تمہارے دودھ شریکے ہیں، اور بعض خاندانوں کی بعض سے شادیاں ہیں، لیکن وہ رشتہ داری کا پاس نہیں کرتے بلکہ تمہیں مسلمان سمجھ کر تمہارے ساتھ محبت نہیں کرتے۔

(۳) الثالث(تُحِبُّوْنَھُمْ)بسبب انھم اظھروالکم الایمان(وَلَا یُحِبُّوْنَکُمْ)بسبب ان الکفر مستقر فی باطنھم"

تیسرا مطلب یہ ہے کہ تم ان سے محبت کرتے ہو، اس وجہ سے کہ وہ تمہارے سامنے اپنے ایمان کا اظہار کرتے ہیں، لیکن وہ تمہارے ساتھ محبت نہیں کرتے، کیونکہ ان کے دلوں میں کفر مضبوطی سے قرار پکڑے ہوئے ہے۔

(۴) الرابع قال ابوبکر الاصم(تُحِبُّوْنَھُمْ)بمعنی انکم لاتریدون القاء ھم فی الآیات والمحن(وَلَا یُحِبُّوْنَکُمْ)بمعنی انھم یریدون القائکم فی الآفات والمحن ویتربصون بکم الدوائر"

چوتھا مطلب جو ابوبکر اصم نے بیان کیا ہے کہ تم ان سے محبت کرتے ہو، یعنی تم نہیں چاہتے کہ وہ مصائب وآلام میں مبتلاء ہو، لیکن وہ تمہارے ساتھ محبت نہیں کرتے کیونکہ وہ تو چاہتے ہیں کہ تم مصائب وآلام میں گرفتار ہو جاؤ، بلکہ وہ تو انتظار کر رہے ہوتے ہیں کہ تمہیں حوادثات پہنچیں۔

(۵) الخامس(تُحِبُّوْنَھُمْ)بسبب انھم یظھرون لکم محبة الرسول ومحب المحبوب محبوب(وَلَا یُحِبُّوْنَکُمْ)لانھم یعلمون انکم تحبون الرسول وھم یبغضون الرسول ومحب المبغوض مبغوض"

پانچواں مطلب یہ ہے کہ تم ان سے محبت کرتے ہو اس وجہ سے کہ وہ تمہارے سامنے رسول اللہ ﷺ کی محبت کا اظہار

کرتے ہیں، تم یہ کہتے ہو کہ ہمارے محبوب مصطفیٰ ﷺ سے محبت کرنے والے ہمارے بھی محبوب ہیں، لیکن وہ تم سے محبت نہیں کرتے، اس کی وجہ ہی یہ ہے کہ تم نبی کریم ﷺ سے محبت کرتے ہو، وہ حقیقت میں آپ سے بغض رکھتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ جس سے ہم بغض رکھتے ہیں اس سے محبت کرنے والوں سے بھی ہم بغض رکھتے ہیں۔

(۶) السادس (تُحِبُّوْنَهُمْ) ای تخالطونهم، وتفشون الیهم اسرارکم فی امور دینکم (وَلَایُحِبُّوْنَكُمْ) ای لایفعلون مثل ذلک بکم"

چھٹا مطلب یہ ہے کہ تم ان سے محبت کرتے ہو، یعنی ان سے میل جول رکھتے ہو، اور دینی امور کے راز ان پر ظاہر کر دیتے ہو، لیکن وہ تمہارے ساتھ اس طرح در پیش نہیں آتے۔

تمام وجوہ سے نتیجہ یہی نکلا کہ مؤمن کفار سے محبت کرتے ہیں، لیکن وہ ان سے بغض رکھتے ہیں، اسلئے مومنوں کو بھی چاہئے کہ کفار سے دور ہو جائیں، ان کو اپنا دشمن سمجھیں، ان سے میل جول محبت کرنا، اپنے راز ان پر ظاہر کرنا شدید نقصان دہ ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتَابِ كُلِّهٖ﴾ "حالانکہ تم ایمان رکھتے ہو تمام کتابوں پر۔"

(وتؤمنون بالکتاب کله) ای بجنس الکتب جمیعا وهو حال "(تفسیر ابی السعود)

"الکتاب" سے جنس کتاب ہے، لیکن کثرت کو مستلزم ہے، اور جملہ حال ہے۔

اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے دونوں چیزوں کو ترجمہ میں مدنظر رکھا، یعنی حال ہونے اور کثرت کو، اسلئے ترجمہ کیا "اور حال یہ کہ تم سب کتابوں پر ایمان لانے والے ہو" **راقم** نے بھی اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "الکتاب" کو لفظ واحد سے ذکر کیا گیا ہے، اس میں چند وجہ ہیں ایک یہ کہ یہاں مراد جنس کتاب ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے "کثر الدراهم فی ابدی الناس" جنس درہم کی کثرت پائی گئی ہے لوگوں کے ہاتھوں، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ "الکتاب" کو مصدر تسلیم کیا جائے مصدر چونکہ تثنیہ اور جمع بغیر تاویل کے نہیں ہوتا، اسلئے جمع نہیں لایا گیا، تاہم جمع "الکتاب" لانے میں جواز اور وسعت تھی تقدیر الکلام "انکم تؤمنون بکتبهم کلها" اب تقدیر کلام کے مطابق معنی یہ ہو گیا کہ "بیشک تم تو ان کی تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو" لیکن وہ تمہارے ساتھ بغض رکھتے ہیں، وہ تمہاری کتاب پر ایمان نہیں رکھتے، باوجود اس کے تم ان سے محبت رکھتے ہو "وفیه توبیخ شدید بانهم فی باطلهم اصلب منکم فی حقکم" اس میں مؤمنوں کو ڈانٹ دی گئی کہ وہ باطل راہ پر ہونے کے باوجود اپنے نظریات پر بڑی سختی سے جمے ہوئے ہیں کہ وہ تمہارے ساتھ محبت نہیں رکھتے، تمہاری کتاب پر

ایمان نہیں رکھتے، اور ادھر تم ہو کہ حق پر ہونے کے باوجود اتنے نرم ہو کہ تم ان سے محبت رکھتے ہو۔ (کبیر)

خیال رہے کہ مؤمنوں کو ان سے محبت رکھنے پر ڈانتا گیا ہے، ان کی اصلی کتابوں پر ایمان لانے پر ڈانٹ نہیں دی گئی، کیونکہ تمام آسمانی کتب پر ایمان رکھنے کے بغیر ایمان ہی مکمل نہیں، اسی لئے رب تعالی نے فرمایا ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ (یعنی ایمان ان لوگوں کا ہی مکمل ہے) جو ایمان رکھتے ہیں اس چیز پر جو آپ پر نازل کی گئی اور اس چیز پر جو آپ سے پہلے نازل کی گئی۔

راقم کا موقف:

راقم کے نزدیک "الکتاب" پر الف لام جنسی ہے، کثرت کا معنی لینے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ زیادہ مناسب معنی یہ ہے "حالانکہ تم مکمل کتاب پر ایمان رکھتے ہو" یعنی تمہارا ایمان کامل قرآن پاک پر ہے، جب مکمل قرآن پاک پر ایمان ہو تو یقیناً پہلی تمام آسمانی حقیقی کتب پر ایمان ہوگا یعنی تمہارا مکمل قرآن پر ایمان ہے جو دوسری کتابوں پر ایمان لانا فرض قرار دیتا ہے، لیکن ان کا ایمان قرآن پاک پر نہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ تمہارے ساتھ محبت نہیں رکھتے۔

﴿وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا﴾ "اور جب وہ تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے۔"

رب تعالی نے منافقین کا وصف بیان کیا کہ وہ جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے ایمان لایا جیسا کہ تم نے ایمان لایا، اور ہم نے تصدیق کی جیسا کہ تم نے تصدیق کی۔

﴿وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ﴾

"اور جب وہ علیحدہ ہوتے ہیں تم پر (انگلیوں کے) پورے کاٹتے ہیں۔"

یعنی جب مومنوں سے علیحدہ ہوتے ہیں تو عداوت ظاہر کرتے ہیں، اور مؤمنوں پر شدید غصے میں ہوتے ہیں، اسلئے کہ مؤمنوں کو ایک دوسرے سے محبت کرتا ہوا دیکھتے ہیں، اور ان کا ایک کلمہ (لااله الا الله) پر اتفاق دیکھتے ہیں، بلکہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے کلام سے بھی اتفاق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور ان کی آپس میں ایک دوسرے سے صلح ہی صلح نظر آتی ہے، تو مؤمنین پر شدید غصے میں آکر اپنی انگلیوں کے پورے چبانے شروع کر دیتے ہیں۔

"عض الانامل عبارة عن شدة الغیظ" پوروں کو کاٹنے سے مراد ہی شدید غصے میں آنا ہے، اگرچہ حقیقی طور پر انگلیوں کو کاٹنا مراد نہیں، بلکہ یہ مجازی طور پر استعمال ہے جیسا کہ کئی مثالیں مجازی معنی میں استعمال ہوتی ہیں۔ (خازن)

البتہ انسان کبھی شدید غصہ میں ہوتا ہے یا کسی کام پر نادم ہوتا ہے تو وہ انگلیوں کے پورے اپنے دانتوں کے نیچے دباتا ہے، یا اپنے انگوٹھے کو دانتوں کے نیچے دباتا ہے، اسی حالت کا یہاں ذکر کیا گیا۔ (مدارک التنزیل للنسفی)

اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ نے ﴿عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ﴾ کا ترجمہ کیا ہے (تم پر انگلیاں چبائیں) آپ کا ترجمہ مرادی مقصد کے مطابق ہے، کہ وہ انگلیوں کو دانتوں کے نیچے دباتے تھے، یعنی چباتے تھے، پھر آپ نے "اَنَامِلَ" کا ترجمہ انگلیاں کیا ہے، کہ وہ اتنے شدید غصہ میں ہوتے ہیں کہ پہلے تو وہ اپنے انگلیوں کے پورے دانتوں کے نیچے دباتے ہیں، لیکن آہستہ آہستہ وہ پوری انگلیاں ہی اپنے مونہوں میں ٹھونس لیتے ہیں۔ **راقم** نے "عَضُّوا" کا اور "اَنَامِلَ" کا لغوی ترجمہ کیا ہے تاکہ طلباء کرام کو لغوی معنی بھی سمجھ آجائے، اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے مرادی معنی بھی سمجھ آجائے، لغوی معنی یوں بیان کیا گیا ہے "**العض هو بالاسنان**" (البحر المحیط)

"عض" کا معنی ہے دانتوں سے کاٹنا "**انامل جمع انملة طرف الاصابع**" انامل جمع ہے "انملة" کی اس کے معنی ہے انگلیوں کی طرفین، یعنی انگلیوں کے پورے۔ (خازن)

﴿قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ﴾ "آپ فرمادو تم مرجاؤ حسرت سے۔"

(مِنَ الْغَيْظِ) من اجله تاسفا وتحسرا حيث لم يجدوا الى التشفى سبيلا (قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ) دعاء عليهم بدوام الغيظ وزيادته بتضاعف قوة الاسلام واهله حتى يهلكوا به"

(وہ تم پر (انگلیوں کے) پورے کاٹتے ہیں) بوجہ افسوس اور حسرت کے وہ اس سے شفا (نکلنے) کی کوئی راہ نہیں پاتے، اس لئے اے محبوب آپ ان کے خلاف دعاء کردیں کہ تم ہمیشہ اسی حسرت میں رہو، اور تمہاری حسرت بڑھتی چلی جائے، کیونکہ اسلام اور مسلمانوں کی شوکت میں تو اضافہ ہوتا ہی رہے گا، لھذا تم حسرت میں ہی ہلاک ہوجاؤ۔ (بیضاوی)

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ "بیشک اللہ جاننے والا ہے سینوں کی باتوں کو۔"

"ذات" کا لفظ مؤنث ہے، جیسے "ذو" مذکر ہے، جمع مکسر حکم مؤنث میں ہے، اس لئے مطلب یہ ہوگا "**والمراد (بِذَاتِ الصُّدُوْرِ) الخواطر القائمة بالقلب والدواعى والصوارف الموجودة فيه**" کہ "اللہ جاننے والا ہے جو دلوں میں واقع ہونے والے خطرات ہیں، اور دلوں میں ہر قسم کے اسباب اور دلوں کو پھیرنے والے ذرائع کو رب تعالیٰ جانتا ہے۔ یہ چیزیں دلوں کی طرف منسوب ہیں، اس لئے ان کو "ذَاتِ الصُّدُوْرِ" کہا گیا ہے۔

"والمعنی انه تعالی عام بکل مایحصل فی قلوبکم من الخواطر والبواعث والصوارف"
معنی اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالی تمہارے دلوں میں واقع ہونے والے خطرات اور اسباب اور دلوں کے پھیرنے والے ذرائع کو جانتا ہے۔ (کبیر)

دینی مدارس کے طلباء کرام توجہ فرمائیں:

صاحب کشاف نے ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ کے ترکیبی لحاظ پر دو مطالب بیان کئے ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ یہ الفاظ مبارکہ " قُلْ " کا مقولہ ہیں، یعنی درمیان میں حرف عطف ذکر نہیں کیا گیا، جیسا کہا جائے "حامد حافظ عالم کریم" حامد حافظ ہے اور عالم ہے، اور کریم ہے، ہر عطف اگر چہ بظاہر ذکر نہیں لیکن معتبر ہے اب مطلب یہ ہوگیا، آپ فرمادیں "مرجاؤ تم اپنی حسرت اور غیظ وغضب میں" اور آپ فرمادیں بیشک اللہ تعالی سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے، وہ جانتا ہے جب تم ہم سے علیحدہ ہو کر حسرت وپریشانی کی وجہ سے یعنی مؤمنوں کے بڑھتے ہوئے اتفاق واتحاد کو دیکھ کر حسد سے جلتے ہوئے اپنی انگلیوں کے پوروں کو منہ میں ڈال کر کاٹ رہے ہوتے ہو۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ "قل" کا مقولہ نہ ہو۔
"فمعناه قل لهم ذلک یامحمد ولاتتعجب من اطلاعی ایاک علی مایسرون فانی اعلم ماهو اخفی من ذلک وهو مااضروه فی صدورهم ولم یظهروه بالسنتهم"
اس صورت میں معنی یہ ہے اے رسول (ﷺ)! آپ فرمادیں تم مرجاؤ حسرت سے، اب اس سے آگے "آپ فرمادیں" نہیں بلکہ نیا جملہ شروع ہو رہا ہے کہ آپ ان کو جب یہ فرمائیں "تو میں جو تمہیں ان کے رازوں پر مطلع کر رہا ہوتو میں اس سے بھی زیادہ پوشیدہ چیزوں کو جانتا ہوں اور وہ جو انہوں نے اپنے سینوں میں چھپا رکھا ہے میں اسے بھی جانتا ہوں حالانکہ انہوں نے اسے زبان سے ظاہر نہیں کیا ہوتا۔
(ماخوذ از کبیر)

سبحان اللہ! علامہ رازی رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا "ولا تعجب من اطلاعی ایاک علی مایسرون" "اے میرے حبیب آپ اس پر تعجب نہ کریں جو میں تمہیں ان کے پوشیدہ رازوں پر مطلع کر رہا ہوں" نبی کریم ﷺ کو رب تعالی نے منافقوں کے دلوں پر مطلع کر دیا، اب بھی آپ کے علم کے کوئی پیمانے سے ناپنے کی کوشش کرے تو اس کی اپنی بدنصیبی، دوسرا کوئی کیا کر سکتا ہے۔

﴿قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ﴾ میں ایک اور احتمال:

یہ خطاب نبی کریم ﷺ کے دل کو خوش کرنے کیلئے اور قوی امید رکھنے کیلئے ہو کہ آپ اللہ تعالی کے وعدہ پر خوش ہو جائیں کہ رب تعالی نے اسلام کو عزت عطاء فرمائی ہے اور کفار و منافقین کو ذلت عطاء کرنی ہے وہ اسی وجہ سے جل جل کر مر جائیں گے، اب صورت میں مطلب یہ ہوگا "حدث نفسک بذلک" اے محبوب آپ اپنے نفس سے یہ بات کریں کہ ان کو گویا دل سے یہ کہتے رہیں۔ (کبیر)

اصل میں دو احتمال ہیں کہ ﴿قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ﴾ یا تو دعاء ہو ان کے خلاف، یا خبر ہو "ان المعنی اخبرهم انهم لایدرکون مایؤملون" اس صورت میں معنی ہو گیا کہ اے محبوب آپ ان کو خبر دے دو کہ بیشک وہ نہیں پائیں گے جس کی وہ امید رکھتے ہیں۔ (قرطبی)

تقریبا یہی مطلب ہے جو احتمال کبیر سے پیش کیا گیا ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ O (آیۃ نمبر ۱۲۰)

(1) تمہیں کوئی بھلائی پہنچے تو انہیں برا لگے اور تم کو برائی پہنچے تو اس پر خوش ہوں، اور اگر تم صبر اور پرہیز گاری کئے رہو تو ان کا داؤں تمہارا کچھ نہ بگاڑے گا بیشک ان کے سب کام خدا کے گھیرے میں ہیں۔ (کنز الایمان)

(2) اگر تمہیں پہنچے بھلائی تو ان کو غم میں ڈال دے اور اگر پہنچے تمہیں کوئی مصیبت تو وہ خوش ہوتے ہیں اس پر اور اگر تم صبر کرو اور پرہیز گار ہو جاؤ تو نہیں نقصان پہنچائے گا تمہیں ان کا مکر کچھ (بھی) بیشک اللہ جو تم عمل کرتے ہو ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ (نجوم الفرقان)

مختصر مطلب:

تقریباً ترجمہ سے ہی واضح ہے، خطاب ہے مؤمنوں کو ہے کہ اگر تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی قسم کی بھلائی، کسی قسم کے منافع پہنچیں، تو وہ ان کو غم میں مبتلاء کر دیتی ہے، اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو وہ منافقین اس پر خوش ہوتے ہیں، اے مومنو تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو، اگر تم نے صبر اور تقویٰ اختیار کیا تو ان کا مکر و فریب، ان کی چالبازیاں تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گی، بیشک اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو جو وہ کرتے ہیں احاطہ کئے ہوئے ہے۔

﴿اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ﴾ "اگر پہنچے تمہیں بھلائی تو غم میں ڈالے ان کو"

"مس یمس مسا" کا اصل میں لغوی معنیٰ "ہاتھ سے چھونا" ہے، پھر ایک چیز دوسری کو پہنچے تو اسے بھی "مس" کہتے ہیں "قال صاحب الکشاف المس ھھنا بمعنی الاصابة" صاحب کشاف نے بیان کیا ہے کہ اس مقام میں "مس" کا معنیٰ پہنچنا اور پہنچانا ہے۔ "حسنة" سے مراد دنیاوی منافع ہیں جو مختلف احوال کے مطابق حاصل ہوتے ہیں، جیسے صحت بدن، بارشوں کی وجہ سے سال کا خوشحال ہونا، مال غنیمت کا حاصل ہونا، دشمن پر غلبہ حاصل ہونا، اور احباب کے درمیان محبت و الفت حاصل ہونا، وغیرہا۔ "سیئة" ضد ہے "حسنة" کی یعنی فقر حاصل ہونا، دشمن سے شکست حاصل ہونا، پریشانی کا لاحق ہونا، اقارب کے درمیان اختلاف پیدا ہونا، قتل و غارت

وغیرہ حاصل ہونا، ساء الشیٔ یسوء کا معنی قبیح ہونا، یہ "حسنة" کی ضد ہے۔

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی کا مفہوم یہ ہے:

"انهم يحزنون ويغتمون بحصول نوع من انواع الحسنة للمسلمين ويفرحون بحصول نوع من انواع السيئة لهم"

کہ مسلمانوں کو جب کوئی بھلائی پہنچے تو وہ حزن اور غم میں مبتلاء ہوجاتے ہیں اور مسلمانوں کو اگر کوئی مصیبت پہنچے تو وہ اس پر خوش ہوتے ہیں۔ (کبیر)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"وجملة الشرط متصلة بالشرط قبل ومابينهمااعتراض والمعنى انهم متناهون فى عداوتكم فلم توالونهم فاجتنبوهم"

یہ جملہ شرطیہ یعنی "اِنْ تَمْسَسْكُمْ الخ "متصل ہے پہلے جملہ شرطیہ سے یعنی "وَاِذَا لَقُوْكُمْ الخ" سے اور درمیان میں جملہ معترضہ ہے، مطلب یہ ہوگیا" کہ بیشک وہ تمہاری دشمنی میں انتہاء درجہ تک پہنچے ہوئے ہیں، تم ان سے محبت کیوں کرتے ہو ان سے اجتناب کرو۔

﴿وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا﴾

"اور اگر تم صبر کرو، اور پرہیز گار ہوجاؤ تو نہیں نقصان پہنچائے گا تمہیں ان کا مکر کچھ (بھی)"

راقم نے یہ ترجمہ خازن کی اس عبارت سے لیا ہے:

"وان تصبروايعنى على اذاهم وقيل ان تصبرواعلى طاعة الله ومانالكم فيهامن شدة(وتتقوا)اى تخافواربكم وقيل وتتقوامانهاكم عنه وتتوكلواعليه(لايضركم)اى لاينقصكم(كيدهم)اى عداوتهم ومكرهم(شيئا) اى لانكم فى عناية الله وحفظه"

اور اگر تم صبر کرو ان کی طرف سے تکالیف پہنچانے پر، اور اگر تم صبر کرو اللہ تعالیٰ کی طاعت پر اور اس طاعت میں تکالیف کے پہنچنے پر، اور پرہیز گار ہوجاؤ یعنی اپنے رب سے ڈور، اور جن چیزوں سے رب تعالیٰ نے تمہیں روکا ہے ان سے بچ جاؤ، اور رب تعالیٰ پر توکل رکھو، تو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا ان کی عداوت اور ان کا مکر کچھ بھی، اس لئے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عنایت اور حفاظت میں ہو۔

فائدہ: ﴿لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا﴾ (تمہیں نہیں نقصان پہنچائے گا ان کا مکر کچھ بھی) اسلئے کہ تم اللہ تعالیٰ کی

حفاظت میں ہو، اس سے رب تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ تعلیم دی، اوران کی یہ راہنمائی کی "یستعان علی کید العدو بالصبر و التقوی" کہ دشمن کے مکروفریب پر صبر اور تقویٰ سے امداد طلب کی۔

"قال الحکماء اذاردت ان نکبت من یحسدک فازدد فضلا فی نفسک لایضرکم"
حکماء نے بیان کیا ہے کہ اگر تو ارادہ رکھتا ہے کہ اپنے ساتھ حسد کرنے والے کو اپنے راستہ سے ہٹا دے تو تو اپنے نفس میں فضیلت پیدا کر تو وہ تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ (مدارک التنزیل للنسفی)

﴿إِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيطٌ﴾ "بیشک اللہ جو وہ عمل کرتے ہیں ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔"

"والمعنی محیط جزاؤہ" مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جزاء ان کے اعمال کا احاطہ کئے ہوئے ہے صرف یہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کو جزاء عطاء فرمائے گا، بلکہ احاطہ کا ذکر فرمایا ہے، اس کا کیا فائدہ ہے؟ "وعبر بالاحاطة عن الاطلاع التام و القدرة و السلطان" احاطہ سے تعبیر کرنے سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کے اعمال پر کامل علم حاصل ہے، اوراسے ان پر سلطنت حاصل ہے، اور وہ ان کو جزاء دینے پر کامل قادر ہے۔ (البحرالمحیط)

اعتراض: محیط تو اسے کہتے ہیں جو تمام جوانب (طرفوں) سے احاطہ کرے، یہ صفت اجسام کی ہے، اللہ تعالیٰ جسمیت سے پاک ہے، تو کس طرح "محیط" کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر صحیح ہے؟

جواب: محیط کا مجازی معنی مراد لیا گیا ہے "انه تعالی لما کان عالما بکل الاشیاء قادرا علی کل الممکنات جاز فی مجاز اللغة انه محیط بها" اسلئے کہ اللہ تعالیٰ جب تمام چیزوں کو جاننے والا ہے، اور تمام ممکنات پر قادر ہے تو مجازی طور پر یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ تمام چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"محیط" باب افعال سے اسم فاعل ہے، اسم فاعل حدوث پر دلالت کرتا ہے، ثبوت پر نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کیلئے جن صفات کا بھی تذکرہ ہو ان میں دوام وثبات ہوتا ہے، اسی لئے ﴿إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾ میں "کان" "دوام واستمرار پر دلالت کر رہا ہے، راقم نے اسی لئے اپنے ترجمہ میں دوام کو پیش نظر رکھا، اور ترجمہ یوں کیا "بیشک اللہ جو وہ عمل کرتے ہیں ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے" رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿إِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيطٌ﴾ ذکر ہوا ﴿إِنَّ اللّٰهَ مُحِيطٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ﴾ ذکر نہیں کیا گیا اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہم چیز کو پہلے ذکر کیا جاتا

ہے، پھر دوسری چیز کو۔

"ولیس المقصود ههنا بیان کونه تعالی عالما بل بیان ان جمیع اعمالهم معلومة لله تعالی ومجازیهم علیها فلاجرم قدم ذکر العمل" (واللہ اعلم)

مقصد یہاں یہ بیان کرنا نہیں کہ اللہ تعالی عالم ہے، بلکہ مقصد بیان کرنے کا ان کے اعمال ہیں، کہ اللہ تعالی کو ان کے اعمال کا علم ہے وہ انہیں جزاء عطاء کرے گا، اس لئے "عمل" کو پہلے ذکر کیا، اور احاطہ جو علم پر دلالت کر رہا ہے اسے بعد میں ذکر کیا۔ (کبیر)

فائدہ: "حسنة" کے ساتھ "مس" کو ذکر کیا، اور "سیئة" کے ساتھ "اصابة" کو ذکر کیا اس میں کوئی وجہ فرق بھی ہے یا نہیں؟ بعض حضرات نے تو بیان کیا ہے کہ کوئی فرق تو نہیں، عبارت میں حسن و جمال پیدا کرنے کیلئے بطور تفنن (فنی کمال) ذکر کر دیا ہے، لیکن بعض محققین نے بیان کیا ہے کہ زیادہ بہتر اور زیادہ مناسب یہ ہے کہ وجہ فرق جو واضح طور پر سمجھ آ رہی ہے اسے بیان کیا جائے، اس انداز ترتیب سے یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے وہ منافق خوش بھی بہت زیادہ ہوتے تھے، اور غمناک بھی بہت زیادہ۔

"لان المس اقل من الاصابة کما هو الظاهر فاذا ساء هم اقل خیر نالهم فغیره اولی منه، واذا فرحوا باعظم المصائب مما یرثی له الشامت ویرق الحاسد فغیره اولی فهم لا ترجی موالاتهم اصلا فکیف تتخذونهم بطانة"

وجہ اس کی یہ ہے کہ "مس" اصابۃ سے کم ہے یہ تو بالکل ظاہر ہے جب مسلمانوں کو تھوڑی بھلائی سے وہ بہت زیادہ غمناک ہوتے ہیں، تو یقیناً زیادہ بھلائی کے پہنچنے سے تو ان کے غم اور پریشانی میں اور ہی زیادہ اضافہ ہوتا تھا، اور جب مسلمانوں کو زیادہ مشکل درپیش آتی تو وہ اس پر خوش ہوتے تھے تو یقیناً تھوڑی مصیبت پہنچنے پر بھی وہ اسی طرح خوش ہوتے تھے۔ تو اس سے مسلمانوں کو سمجھا دیا گیا کہ وہ تو دوستی کے قابل نہیں، ان کو اپنا رازدار بنانا کس طرح درست ہوسکتا ہے ایک اور وجہ فرق یہ بیان کی گئی۔

"ان ذلک اشارة الی ان ما یصیبهم من الخیر بالنسبة الی لطف الله تعالی معهم خیر قلیل، وما یصیبهم من السیئة بالنسبة لما یقابل به من الاجر الجزیل عظم بعید کما لا یخفی"

کہ اس ترتیب میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کو بظاہر بھلائی یعنی فوائد دنیاوی کم ہی حاصل ہوتے ہیں لیکن اس پر اللہ تعالی کی طرف سے بہت زیادہ ثواب حاصل ہوگا، اور جو ان کو مشکلات پہنچتی ہیں بیشک وہ بظاہر زیادہ اور عظیم نظر آتی ہوں گی،

لیکن ان پر صبر کرنے سے بہت بڑا ثواب رب تعالیٰ نے عطاء فرمانا ہے، یہ وجہ فرق واضح ہے، مخفی نہیں۔ (روح المعانی)
سبحان اللہ قرآن پاک کیسی عظیم کتاب ہے جس کا ایک ایک جملہ، ایک لفظ کتنے بیش بہا (بہت قیمتی) موتی بکھیر رہا ہے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"لایضرکم" کے تحت بیان کیا گیا ہے کہ اسے "ضاد" کے کسرہ اور راء کی جزم سے بھی پڑھا گیا ہے، اس صورت میں یہ "ضارہ یضیرہ" سے لیا جائے گا، البتہ معنی "ضر یضر" والا ہی ہوگا۔ (روح المعانی)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَاِذْغَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِیْنَ مَقَاعِدَلِلْقِتَالِ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌO(آیۃ نمبر ۱۲۱)

(1) اور یاد کرواے محبوب جب تم صبح کو اپنے دولت خانہ سے برآمد ہوئے مسلمانوں کو لڑائی کے مورچوں پر قائم کرتے اور اللہ سنتا جانتا ہے۔ (کنز الایمان)

(2) اور یاد کرو جب آپ صبح نکلے اپنی اہل سے، آپ قائم کر رہے تھے مؤمنوں کو مقام قتال میں اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول:

اگرچہ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ آیۃ کریمہ بدر کے واقعہ پر نازل ہوئی، اور ایک قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ غزوہ خندق کے متعلق نازل ہوئی، لیکن جمہور مفسرین کرام کا قول یہ ہے کہ غزوہ احد کے متعلق نازل ہوئی اسی پر زیادہ وثوق اختیار کیا گیا۔ (قرطبی)

جب بدر کو قریش کے سرکردہ لوگوں کو قتل کر کے ان کا ایک اکنوئیں میں پھینک دیا گیا تھا، باقی کفار جب شکست حاصل ہونے کے بعد مکہ میں پہنچے تو بدر میں جو لوگ قتل کر دئے گئے ان کے بیٹے ابوسفیان کے پاس جمع ہو کر کہنے لگے کہ ہمیں بدر کا انتقام لینا چاہئے، ابوسفیان کے پاس آنے والے عکرمہ بن ابی جہل اور عبداللہ بن ابی ربیعہ اور صفوان بن امیہ تھے ان دنوں میں ہی قریش کو کافی تجارتی نفع ہو چکا تھا (جس کا ذکر قریب ہی بدر کے واقعہ میں ان

شاءاللہ آ جائے گا) یہ لوگ کہنے لگے۔

"یا معشر قریش ان محمد اقدوترکم وقتل اخیارکم فاعینونا بھذاالمال علی حربه لثارنابمن اصاب منافعلوا"

اے قریش کے قبیلے! بیشک محمد نے تمہیں برباد کر کے رکھ دیا، اور تمہارے بھائیوں کو قتل کر دیا، یہ تجارتی نفع والا تمام مال ہمیں دے دیں تا کہ ہم محمد اور اس کے ساتھیوں سے جنگ کر کے بدلہ لیں، قریش نے وہ تمام مال ابو سفیان اور اس کے ساتھیوں کو دے دیا جو مسلمانوں سے جنگ کرنا چاہتے تھے، ابوسفیان کی زیر قیادت قریش کا لشکر تین ہزار افراد پر مشتمل تیار کر لیا گیا لشکر کے ساتھ ابوسفیان کی زوجہ ھند بنت عتبہ بھی تھی، اور بھی قریش کی عورتیں ساتھ تھیں، جو لشکر کا گا نا گا کر جوش دلا رہی تھیں، ان کے ساتھ دوسو گھوڑے تھے اور بھی ہر قسم کا جنگی سامان وافر مقدار میں ان کے پاس موجود تھا یہ لوگ مدینہ طیبہ کے مقابل بطن سبخہ میں ایک پہاڑ کے پاس اتر گئے۔

❁ قال رسول اللهﷺانی رأیت بقرا تنحرورأیت فی ذباب سیفی ثلماورأیت انی ادخلت یدی فی درع حصینة فأولتهاالمدینة"

نبی کریم ﷺ نے خواب دیکھا، آپ فرماتے ہیں میں نے گائے کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھا، اور میں نے اپنی تلوار کو دیکھا کہ اس میں دندانے پڑ گئے، اور میں نے دیکھا کہ میں نے اپنا ہاتھ اپنی مضبوط زرہ میں داخل کر لیا، اس کی تعبیر میں نے مدینہ طیبہ لی ہے۔

"وعبرا ذبح البقرة بذبح اناس من اصحابه والثلم الذی بذباب سیفه بقتل رجل من اهل بیته"

نبی کریم ﷺ نے گائے کے ذبح کئے جانے سے اشارہ کیا کہ کچھ صحابہ کرام شہید کر دئے جائیں گے، اور تلوار کے کند ہونے اور اس میں داندانے پڑ جانے سے اشارہ کیا کہ آپ کے اہل بیت میں سے کسی شخص کو شہید کر دیا جائے گا، ایسا ہی ہوا کہ حضرت حمزہ ؓ کو شہید کر دیا گیا۔

نبی کریم ﷺ کا مشورہ:

آپ نے صحابہ کرام کو مشورہ کیلئے طلب کر لیا، اس مشورہ میں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول کو بھی طلب کر لیا گیا تھا، نبی کریم ﷺ نے اپنی رائے یہ بیان فرمائی۔

"فان رأیتم ان تقیموابالمدینة وتدعوهم حیث نزلوافان اقاموااقاموابشرمقام وان هم دخلواعلینا قاتلناهم فیها"

اگر تم مدینہ میں ہی رہو تو بہتر ہے، ان کو چھوڑ دو، وہ جہاں بھی اترے ہیں ٹھیک ہے، وہ جہاں ٹھہریں گے

وہی مقام ان کیلئے شر ہوگا اگر انہوں نے ہم پر (مدینہ طیبہ میں) حملہ کیا تو ہم ان سے قتال کریں گے، نبی کریم ﷺ کی رائے کو عبداللہ بن ابی بن سلول نے بھی پسند کیا، وہ بھی چاہتا تھا کہ ہمیں مدینہ طیبہ سے باہر نکل کر جنگ نہیں کرنی چاہئے، نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ سے باہر نکل کر جنگ کرنے کو ناپسند فرمارہے تھے، آپ کا موقف یہ تھا کہ ہمیں مدینہ طیبہ میں رہ کر دفاعی جنگ کرنی چاہئے۔

"فقال رجال من المسلمین ممن اکرمه الله تعالی بالشهادة یوم احد وغیرهم ممن کان فاته یوم بدر اخرج بنا یارسول الله الی اعدائنا لایرون انا جبنا عنهم و ضعفنا"

لیکن وہ صحابہ کرام جن کو شہادت سے احد کے دن رب تعالی نے مکرم کرنا تھا اور کچھ دوسرے صحابہ کرام جو بدر میں شریک نہیں ہوسکے تھے ان تمام کا مطالبہ یہ تھا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ ہمیں دشمن کے مقابل لے چلیں، کبھی بھی ہمارا دشمن ہمیں بزدل اور کمزور نہیں پائے گا۔ ادھر عبداللہ بن ابی بن سلول بار بار زور دے رہا تھا کہ ہمیں مدینہ طیبہ میں رہ کر دفاع کرنا چاہئے، باہر نہیں نکلنا چاہئے، یہ اپنے دلائل قائم کررہا تھا، اور کہہ رہا تھا۔

یا رسول الله اقم بالمدینة لاتخرج الیهم فوالله ماخرجنا منها الی عدو لنا قط الا اصاب منا ولادخل علینا الا اصبنا منه "

یارسول اللہ ﷺ! آپ مدینہ طیبہ میں ہی رہیں۔ باہر جنگ کیلئے نہ جائیں، کیونکہ ہم نے جب بھی باہر نکل کر جنگ کی دشمن نے ہم پر غلبہ پایا، اور جب ہم نے شہر میں رہ کر دفاع کیا تو ہم نے غلبہ پایا۔

لیکن یہ دلیل اس کی بہت کمزور تھی کیونکہ بدر میں نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ سے باہر نکل کر جنگ کی تھی اور وہ غلبہ حاصل کیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ ہاں البتہ یہاں اس کی رائے کو اس لئے قوت حاصل تھی کہ اس کی رائے نبی کریم ﷺ کی رائے سے ملتی تھی۔ لیکن شہادت کے مشتاق حضرات بار بار دشمن کے مقابل جنگ کرنے کو ترجیح دیتے ہوئے باہر نکلنے کا مطالبہ کررہے تھے۔

❁ "دخل رسول الله ﷺ فلبس لامة حربه وذلک یوم الجمعة حین فرغ من الصلوة ثم خرج علیهم"

نبی کریم ﷺ گھر تشریف لے گئے اور جنگی اسلحہ زیب تن کیا (یعنی تلوار کو گلے میں لٹکایا، زرہ پہنی، نیزہ ہاتھ میں لیا) یہ جمعہ کا دن تھا، آپ نماز جمعہ سے جب فارغ ہوئے تو گھر جا کر اسلحہ زیب تن کرکے ان کے پاس تشریف لے آئے۔

"وقد ندم الناس وقالوا استکرهنا رسول الله ﷺ ولم یکن لنا ذلک فان شئت فاقعد ﷺ"

نبی کریم ﷺ کو اسلحہ زیب تن کئے ہوئے تشریف لانے پر لوگ پشیمان ہوگئے کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کو اس حال

میں نکلنے پر مجبور کیا ہے۔حالانکہ ہمیں یہ حق حاصل نہ تھا۔اب تمام حضرات مؤدبانہ طور پر عرض کر رہے تھے یارسول اللہ اگر آپ یہاں ہی تشریف رکھنا چاہتے ہیں تو آپ یہی بیٹھ جائیں، باہر نہ نکلیں۔

"فقال ﷺ ماینبغی لنبی اذالبس لامته ان یضعها حتی یقاتل فخرج ﷺ بالف من اصحابه"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ نبی کی شان کے لائق یہ نہیں کہ اسلحہ زیب تن کر کے پھر اتار دے یہاں تک کہ وہ جہاد کرے، تو نبی کریم ﷺ اپنے ساتھ ایک ہزار آدمیوں کو ساتھ لے کر احد کی طرف تشریف لے گئے۔احد کا واقعہ شوال ۳ھ میں درپیش آیا۔

عبد اللہ بن ابی بن سلول اپنے تین سو ساتھیوں سمیت لوٹ آیا۔اب نبی کریم ﷺ کے ساتھ سات سو افراد رہ گئے۔نبی کریم ﷺ نے احد پہاڑ کے درہ پر حضرت عبد اللہ بن جبیر کو کھڑا کیا اور ان کے ساتھ پچاس آدمی کھڑے کئے۔آپ نے ان لوگوں کو حکم دیا کہ تم نے یہاں ہی ٹھہرنا ہے، تا کہ وہ ہمارے پیچھے سے حملہ نہ کر دیں، اور ساتھ ہی یہ فرمایا "ان کان علینا اولنا فاثبت مکانک" کہ جنگ خواہ ہمارے مخالف ہو یا موافق ہو تم نے یہی ٹھہرنا ہے، تا کہ تمہاری جانب سے آکر وہ حملہ نہ کر دیں۔احد کے دن نبی کریم ﷺ دو زرہ استعمال فرما رہے تھے۔جھنڈا آپ نے مصعب بن عمیر کو دیا۔احد میں صحابہ کرام کو فتح حاصل ہو گئی، مال غنیمت جمع کرنا شروع کیا، تو جو صحابہ کرام حضرت عبد اللہ بن جبیر کی زیر قیادت درہ پر مقرر کئے گئے تھے، انہوں نے جب دیکھا کہ باقی حضرات مال غنیمت جمع کر رہے ہیں ہم رہ رہے ہیں

"وجعلوا ینسلون رجلا فرجلا حتی اخلوا مراکزهم ولم یبق مع عبد الله سوی النی عشر رجلا مع ایصاء رسول الله ﷺ بشبوتهم مکانهم"

لیکن ان حضرات نے درہ کو چھوڑنا شروع کر دیا، ایک ایک اس سے ہٹا رہا، یہاں تک کہ انہوں نے اپنے اس مرکز کو خالی کر دیا جس میں انہیں کھڑا کیا گیا تھا۔حضرت عبد اللہ بن جبیر ﷺ کے ساتھ صرف بارہ آدمی رہ گئے تھے کہ ہم یہاں ہی کھڑے رہیں گے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں یہاں کھڑے رہنے کا حکم فرمایا۔

کفار نے جب درہ خالی پایا تو اس جانب سے حملہ کر دیا، جنگ کا نقشہ بدل گیا، ستر صحابہ کرام شہید ہو گئے، بہت زیادہ تعداد میں شدید زخمی ہو گئے، خود نبی ﷺ بھی زخمی ہو گئے، آپ کے دانت مبارک کا کچھ حصہ شہید ہو گیا، سر اور چہرے پر زخم آئے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

خیال رہے کہ درہ کے چھوڑنے میں صحابہ کرام کی اجتہادی خطاء تھی، جن حضرات نے درہ کو چھوڑا ان کا اجتہاد یہ تھا کہ اب مکمل فتح ہو چکی ہے، اب یہاں ٹھہرنے کا کوئی مقصد نہیں، اور جو حضرات وہاں قائم رہے ان کا موقف یہ تھا

کہ جب تک نبی کریم ﷺ یہاں سے ہٹنے کا حکم نہیں دیں گے اس وقت تک ہمارا یہاں کھڑے رہنا ضروری ہے، احد کا واقعہ تیسرے پارہ میں بیان کر دیا گیا، یہاں تو آیۃ کریمہ کا شان نزول بیان کرنے کیلئے مفسرین کرام نے جن چیزوں کو دوبارہ ذکر کیا وہ ذکر کر دی گئیں۔

آیۃ کریمہ کے الفاظ مبارکہ کے متعلق:

واذغدوت"ای واذکر اذخرجت غدوۃ "اور یاد کرو جب تم صبح نکلے "**من اهلک** "**من عند اهلک وکان الخروج من حجرة عائشة رضی الله عنها**" اپنی اہل کے گھر سے، آپ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ سے نکل کر غزوہ میں تشریف لے گئے تھے یہ ہفتہ کے دن کے صبح تھی، اور جب آپ ہتھیار زیب تن کر کے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر سے باہر تشریف لائے تھے وہ ہفتہ کے دن کی صبح تھی۔ خیال رہے کہ اگر "غدوت" بمعنی "صرت" کے ہو جائے تو دونوں وقتوں کو شامل ہو جائے گا، اب معنی صرف یہ ہو گا جب آپ ہو گئے نکلنے والے اپنی اہل کے گھر سے، یعنی ہتھیار زیب تن کر کے آپ نکلے، پھر صبح جنگ کیلئے نکلے۔

فائدہ: رب تعالی نے مؤمنین سے وعدہ فرمایا کہ "کافروں کا مکر تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا" لیکن اس کے ساتھ شرط یہ رکھی کی "اگر تم نے صبر کیا اور پرہیز گاری اختیار کی" غزوہ احد میں مسلمانوں کو شکست نہیں ہوئی کیونکہ وہ میدان میں جمے رہے، میدان چھوڑ کر بھاگے نہیں، ابتدائی طور پر اچانک حملہ میں کچھ پسپا ہونے کا نام وہ فرار نہیں تھا جس کی مذمت احادیث میں آئی ہوئی ہے، شہادت حاصل ہونا عظیم کامیابی تھی، لیکن منافقین کی نظر میں مسلمانوں کا ظاہری نقصان (معاذ اللہ) شکست تھا، اس آیۃ کریمہ میں ضمناً یہ مسئلہ بھی بتا دیا کہ "اے محبوب آپ صبح جنگ کیلئے گھر سے جب نکلے" یعنی آپ کی رائے کے خلاف کچھ حضرات نے مدینہ طیبہ میں رہنے کیلئے صبر نہیں کیا، اور باہر [illegible] سے پرہیز نہیں کیا تو ظاہری طور پر کچھ تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔

﴿ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ "ای توطنهم"

(۱) آپ مؤمنوں کو مقام قتال ٹھہرنے کی جگہ عطاء کر رہے تھے۔

(۲) "وقیل تنزلهم" اور معنی یہ بیان کیا گیا کہ آپ مؤمنوں کو مقام قتال میں اتار رہے تھے۔

(۳) "قیل تسوی لهم" اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ مؤمنوں کی صفوں کو میدان قتال میں برابر کر رہے تھے۔

(۴) "قیل تھیئی لھم" اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ مؤمنوں کو مقام قتال میں جہاد کیلئے تیار کررہے تھے۔
(روح المعانی)

﴿مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾ "مقامات لڑائی میں۔"

(مقاعد) ای مواطن مواقف و مقامات له "مقاعد" کا معنی ٹھہرنے کی جگہ، رکنے کی جگہ، اور قائم ہونیکی جگہ، "قتال" کا معنی جنگ لڑائی، اب ﴿تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾ کا معنی یہ ہوگیا "آپ قائم کررہے تھے مؤمنوں کو مقامات جنگ میں" اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ کا مرادی ترجمہ بہت ہی خوبصورت ہے "مسلمانوں کو لڑائی کے مورچوں پر قائم کرتے۔

﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ﴾ "اور اللہ سننے والا ہے۔"

یعنی تمام سنی جانے والی چیزوں کو سننے والا ہے، اور اس غزوہ میں کی جانے والی باتوں کو بھی سننے والے ہیں۔

﴿عَلِيْمٌ﴾ "جاننے والا ہے۔"

یعنی تمام باتیں جو علم میں آنے والی ہیں ان تمام کو جاننے والا ہے، اس غزوہ میں لوگوں کے دلوں میں پائی جانے والی تمام باتوں اور رازوں کو جاننے والا ہے۔

فائدہ جلیلہ: قوله (وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ) يروى انه ﷺ غدا من منزل عائشة رضی الله عنها فمشی علی رجليه الی احد وهذا قول مجاهد و الواقدی فدل هذا النص علی ان عائشة رضی الله عنها كانت اهلا للنبی ﷺ وقال تعالی (اَلطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبَاتِ) فدل هذا النص علی انها كانت مطهرة مبرأة عن كل قبيح الاتری ان ولد نوح لما كان كافرا قال (انه ليس من اهلك) و كذلك امرأة لوط" (کبیر)

آیۃ کریمہ میں "اہل" سے مراد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں کہ نبی کریم ﷺ صبح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ سے پیدل ہی احد کی طرف تشریف لے گئے (یہی قول مجاہد اور واقدی کا ہے اس آیۃ کریمہ سے واضح طور پر ثابت ہوا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کی اہل ہیں۔

اور دوسری آیۃ کریمہ سے یہ واضح ہو رہا ہے ﴿اَلطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبَاتِ﴾ (پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کیلئے اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کیلئے ہیں) کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پاکیزہ اور ہر عیب اور

برائی سے پاک تھیں، خاص کر کے اس پر اور دلیل دلالت کر رہی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا کافر تھا، تو رب تعالی نے فرمایا ﴿اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِکَ﴾ بیشک وہ تمہاری اہل سے نہیں اور حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق فرمایا ﴿لَنُنَجِّیَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ﴾ فرشتوں نے ابراہیم علیہ السلام کو بتایا ہم جانتے ہیں اس بستی میں کون ہیں "ہم اس (لوط) کو اور اس کی اہل کو ضرور بر ضرور نجات دیں گے سوائے ان کی عورت کے" یہاں بھی لوط علیہ السلام کی کافرہ عورت کو آپ کی اہل سے نکال دیا کہ وہ آپ کی اہل سے نہیں۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰهُ وَلِیُّهُمَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○

(آیۃ نمبر ۱۲۲)

(1) جب تم میں کے دو گروہوں کا ارادہ ہوا کہ نامردی کر جائیں اور اللہ ان کا سنبھالنے والا ہے، اور مسلمانوں کو اللہ پر ہی بھروسہ چاہیئے۔ (کنز الایمان)

(2) جب ارادہ کیا دو گروہوں نے تم میں سے بزدلی کا، حالانکہ اللہ ان کا مددگار ہے، اور اللہ پر ہی چاہیئے کہ مؤمنین توکل رکھیں۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول:

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا "ای تجبنا وتضعفا وتتخلفا" والطائفتان بنو سلمة من الخزرج وبنو حارثة من الاوس وكانا جناحي العسكر وذلك ان رسول الله ﷺ خرج الى احد في الف رجل وقيل في تسعمائة رجلا، فلما بلغوا الشوط انخذ عبد الله بن ابى بثلث الناس ورجع في ثلاث مائة وقال علام تقتل انفسنا واو لادنا؟ فتبعهم ابو جابر السلمي فقال انشدكم بالله في نبيكم وفي انفسكم، فقال عبد الله بن ابى "لو نعلم قتالا لاتبعناكم" وهمت بنو سلمة وبنو حارثة بالانصراف مع عبد الله بن ابى، فعصمهم الله فلم ينصرفوا فاذكرهم الله عظيم نعمته"

"فشل" کا معنی بزدلی، ضعف، اور پیچھے رہ جانا" اب مطلب یہ ہوا کہ جب ارادہ کیا دو گروہوں نے تم میں سے بزدلی کا، اور انہوں نے کمزوری دکھائی، پیچھے لوٹ جانے کا ارادہ کیا" دو گروہوں سے مراد خزرج سے بنو سلمہ،

اور اوس سے بنو حارثہ، یہ دونوں گروہ نبی کریم ﷺ کے لشکر کے بازو تھے، نبی کریم ﷺ ایک ہزار اور ساڑھے نو سو کے درمیان لشکر کو لے کر احد کی طرف تشریف لے گئے، احد کے قریب مقام شوط میں جب پہنچے تو عبداللہ بن ابی نے لشکر کا تہائی حصہ یعنی تین سو جو اس کے ساتھ لوگ تھے کو ساتھ لیا اور واپس لوٹ پڑا، اور کہہ رہا تھا کہ ہم کس وجہ سے اپنی جانوں اور اپنی اولاد کو قتل کرائیں، ابو جابر سلمی ان کے پیچھے آئے، ان کو رب تعالیٰ کا واسطہ دے کر کہا کہ تم نبی کریم ﷺ سے پیچھے ہٹ کر آپ کو اور اپنی جانوں کو تکلیف میں نہ ڈالو، لیکن عبداللہ بن ابی یہ کہہ رہا تھا کہ اگر ہمیں جنگ کرنے کا طریقہ آتا تو ہم ضرور جنگ کرتے، ہمیں تو لڑنا آتا ہی نہیں، جب وہ اور اس کے ساتھی واپس لوٹ آئے، تو بنو سلمہ اور بنو حارثہ نے بھی عبداللہ بن ابی کے ساتھ لوٹ جانے کا ارادہ کیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو محفوظ رکھا، وہ واپس نہ لوٹے، اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر ان کو اپنی عظیم نعمت کی یاد دلائی کہ رب تعالیٰ کا تم پر خصوصی فضل و کرم ہوا کہ اس نے تمہیں واپس لوٹنے سے بچا لیا، اور تمہارا ایمان سلامت رہا۔ (معالم التنزیل للبغوی)

﴿وَاللّٰهُ وَلِیُّهُمَا﴾ "حالانکہ اللہ ان کا مددگار ہے۔"

"واللہ ولیھما "ناصرھما وحافظھما" اور اللہ ان دونوں کا محافظ ہے اور مددگار ہے۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ اور البحر المحیط:

واللہ ولیھما معنی الولایۃ التثبیت والنصر "ولایۃ کا معنی ہے ثابت رکھ دیا اور مدد کرنا۔ (البحر المحیط)

اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے "التثبیت" والا ترجمہ کیا ہے "اور اللہ ان کا سنبھالنے والا ہے" اور راقم نے "النصر" والا ترجمہ کیا ہے "حالانکہ اللہ ان کا مددگار ہے" اور راقم نے حال والا معنی روح المعانی سے لیا "وجوز ان تکون حالا من فاعل" اس جملہ کو فاعل سے حال بنانا جائز رکھا گیا ہے۔

❁ عن جابر قال نزلت فینا اذ ھمت طائفتان منکم ان تفشلا واللہ ولیھما قال نحن الطائفتان بنو حارثۃ وبنو سلمۃ وما یسرنی انھا لم تنزل لقول اللہ واللہ ولیھما" (بخاری ومسلم)

حضرت جابر ؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیۃ کریمہ ﴿اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰهُ وَلِیُّهُمَا﴾ ہمارے متعلق نازل ہوئی مجھے یہ بات خوش نہیں لگی کہ یہ آیۃ کریمہ ہمارے متعلق نازل نہ ہوتی، کیونکہ آیۃ کریمہ میں "وَاللّٰهُ وَلِیُّهُمَا" آیا ہوا ہے۔ اس حدیث پاک میں بشارت دی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی حفاظت

میں لیا، ان کی مدد کی اور ان کو ثابت قدم رکھا یہ ان کے اعلیٰ مقام کا ذکر کیا کہ ان کو رب تعالیٰ نے شرافت عظیمہ عطاء کی، آیۃ کریمہ میں واضح طور پر ذکر کیا گیا "وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا" یعنی دو گروہوں نے اگرچہ بزدلی کا ارادہ کیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی حفاظت میں لے کر واپس لوٹنے سے روک لیا۔ (خازن)

اعتراض: "الھم" کا معنی ہے "عزم" آیۃ کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ دو گروہوں نے بزدلی کا اور واپس لوٹنے کا عزم کر لیا تھا "**وذلک معصیة فکیف مدحهما الله تعالى بقوله والله وليهما**" جہاد سے منہ پھیرنے کا عزم معصیت۔ ہے تو رب تعالیٰ نے ان کی کیسے تعریف فرمائی اور ارشاد فرمایا "وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا"

جواب: "الھم" کے دو معنی ہیں، ایک "عزم" اور دوسرا "حدیث النفس" کسی چیز کا دل میں واقع ہونا پختہ ارادہ نہ کرنا، اس لئے یہاں "الھم" کا معنی "حدیث النفس" لینا ہی بہتر ہے۔ "**والله تعالى لايؤاخذ بحديث النفس**" اللہ تعالیٰ دل میں واقع ہونے والے ارادہ یعنی قصد پر گرفت نہیں فرماتا، اس کی گرفت عزم پر ہوتی ہے، جس میں پختہ ارادہ پایا جائے اور کام کے اسباب میں بڑی کوشش پائی جائے۔

❁ **قال ابن عباس انهم اضروا ان يرجعوا فلما عزم الله لهم على الرشد وليتوامع رسول الله ﷺ مدحهم الله تعالى بقوله والله وليهما"**

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بیشک ان لوگوں نے دل میں پوشیدہ رکھا کہ ہمیں بھی واپس لوٹ جانا چاہئے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو بھلائی عطاء فرمادی اور ان کو نبی کریم ﷺ کے ساتھ ثابت قدم رکھا، تو رب تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی اپنے اس قول سے "وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا" اللہ ان کا مددگار ہے، وہی ان کو ثابت قدم رکھنے والا ہے۔ (خازن)

مراتب القصد خمس هاجس ذكروا　　فخاطر فحديث النفس فاستمعا

يليه هم فعزم كلها رفعت　　سوى الاخير ففيه الاخذ قد وقعا

ارادہ کے مراتب پانچ ہیں، ایک ہاجس ذکر کیا گیا ہے اور دوسرا خاطر، اور تیسرا حدیث النفس دل میں واقع ہونے والی اشیاء، اور چوتھا اس کے ساتھ متصل "ھم" ہے، اور اس کے بعد پانچوں عزم ہے، کسی میں بھی گرفت نہیں، سوائے عزم کے، عزم میں گرفت ہے۔ (صاوی)

﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ "اور اللہ پر ہی چاہئے کہ توکل رکھیں ایمان والے۔"

"توکل" کا وزن ہے "تفعل" جب کوئی شخص کسی دوسرے پر اعتماد کرے اور اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد

کردے، اس وقت کہا جاتا ہے "وکل امرہ الی غیرہ "اس نے اپنا معاملہ غیر کے سپرد کردیا "والتوکل ھو العجز والاعتماد علی الغیر " توکل کا معنی یہ ہے کہ خود عاجز ہو اور غیر پر اعتماد کرے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"وَعَلَی اللہ" جارومجرور، ظرف ہیں، ظرف کی تقدیم حصر پر دلالت کررہی ہے، مطلب یہ ہوا "فامر اللہ عبادہ المؤمنین ان لایتوکلوا وان لایفوضوا امرھم الا الیہ "اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو حکم دیا کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ پر توکل کریں، اور اپنے تمام معاملات اسی کے سپرد کریں اور اسی کے حسن تدبیر پر اعتماد کریں۔ (خازن)

صرف اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کا مسئلہ ﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ﴾ کی بحث میں نجوم الفرقان کی جلد اول میں دیکھیں۔

وَلَقَدۡ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدۡرٍ وَّاَنۡتُمۡ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ○ (آیت نمبر ۱۲۳)

(1) اور بیشک اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی جب تم بالکل بے سروسامان تھے تو اللہ سے ڈرو کہیں تم شکر گذار ہو۔ (کنز الایمان)

(2) اور تحقیق امداد کی تمہاری اللہ نے بدر میں، حالانکہ تم بالکل بے سروسامان تھے، تو اللہ سے ڈرو تاکہ تم شکر گذار ہو جاؤ۔ (نجوم الفرقان)

سب سے پہلے راقم کی "تسکین الجنان" کا ایک ورق دیکھئے:

﴿وَّاَنۡتُمۡ اَذِلَّةٌ﴾

تم کمزور تھے۔	(محمود الحسن صاحب)
حالانکہ تم اس وقت بہت کمزور تھے۔	(مودودی صاحب)
حالانکہ تم پست تھے۔	(عبد الماجد دریا آبادی صاحب)
اور تھے تم ذلیل۔	(شاہ رفیع الدین صاحب)
تم بالکل بے سروسامان تھے۔	(اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

وانتم اذلۃ لقلۃ العدد والسلاح (جلالین) تم تعداد اور ہتھیاروں کے لحاظ سے کم تھے، یعنی بے سروسامان تھے۔

وانما فسر بقلة العدد والسلاح لئلا ینافی مدلول هذه الآیة (ولله العزة ولرسوله وللمؤمنین) ویقتضیه العز والقوة والغلبة"

﴿وَّاَنۡتُمۡ اَذِلَّةٌ﴾ کی تفسیر بے سروسامان ہونے سے یعنی قلت عدد اور ہتھیاروں کی قلت سے کی گئی، تا کہ بظاہر ''ذلت'' کا مفہوم رب تعالیٰ کے اس ارشادِ گرامی کے منافی (مخالف) نہ ہو ﴿وَلِلّٰهِ الۡعِزَّةُ وَلِرَسُوۡلِهٖ وَلِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ (اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کیلئے عزت ہے) اس لئے کہ ذلت کی نقیض (الٹ) ''عزت، قوت، غلبہ'' ہے پھر صحابہ کرام کیلئے ﴿وَّاَنۡتُمۡ اَذِلَّةٌ﴾ کا استعمال کیسے صحیح ہے؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہاں تو معنی ''تعداد کی کمی اور ہتھیاروں کی کمی مراد ہے۔

روی ان المسلمین ثلثمائة وثلاثة عشر جلاستة وسبعون من المهاجرین وبقیتهم من الانصار وما کان فیهم الافرس واحد والکفار قریب الف مقاتل ومنهم مائة فرس مع الاسلحة الکثیرة"

بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی کل تعداد تین سو تیرہ تھی، چھہتر مہاجرین اور باقی انصار تھے، ان کے پاس صرف ایک گھوڑا تھا، جبکہ کافر ایک ہزار کے قریب تھے، اور ان کے پاس ایک سو گھوڑے اور کثیر ہتھیار موجود تھے۔

(حاشیہ جلالین)

(خیال رہے کہ دو گھوڑوں والی روایت زیادہ مشہور ہے، اگرچہ صاوی نے تین گھوڑوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

(واللہ اعلم بالصواب)

(وَّاَنۡتُمۡ اَذِلَّةٌ) بقلة العدد'' (مدارک) تم تعداد میں کم تھے یعنی بے سروسامان تھے۔

اب اس وضاحت کے بعد اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ کی طرف نظر کی جائے کہ آپ کا ترجمہ کس طرح شانِ صحابہ کے مطابق ہے، لیکن اس کے برخلاف دوسرے تراجم کو دیکھیں، ''تم ذلیل تھے'' ''تم بہت پست تھے'' کتنے شانِ صحابہ کرام کے خلاف تراجم ہیں' 'اور تم بہت کمزور تھے' یہ ترجمہ بھی مقصد کو واضح کرنے میں ناکام ہے، کیونکہ ''تم بہت کمزور تھے'' اس کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''جسمانی طور پر کمزور تھے'' اور (العیاذ باللہ) یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ تم ایمان کے طور پر کمزور تھے، یہ تراجم مقصد بیان سے کوسوں دور ہیں۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ حقیقت کو سمجھانے میں اور مقصد بیان کی وضاحت کرنے میں اور صحابہ کرام کی شان کو ثابت کرنے میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ (تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان صفحہ نمبر ۸۸، ۸۹)

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ اَلَنْ یَّکْفِیَکُمْ اَنْ یُّمِدَّکُمْ رَبُّکُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُنْزَلِیْنَ O (آیۃ نمبر ۱۲۴)

(1) جب اے محبوب تم مسلمانوں سے فرماتے تھے کیا تمہیں یہ کافی نہیں کہ تمہارا رب تمہاری مدد کرے تین ہزار فرشتے اتار کر۔ (کنز الایمان)

(2) جب آپ فرمارہے تھے مؤمنوں کو، کیا کافی نہیں تمہیں کہ امداد فرمائے تمہاری تمہارا رب تین ہزار فرشتوں سے اس حال میں کہ وہ اتارے ہوئے ہوں۔ (نجوم الفرقان)

رب تعالیٰ نے مسلمانوں کی بدر میں پہلے ایک ہزار فرشتوں سے امداد فرمائی۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ فَاسْتَجَابَ لَکُمْ اَنِّیْ مُمِدُّکُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُرْدِفِیْنَ﴾ (سورۃ الانفال آیۃ نمبر ۹)

جب تم اپنے رب سے فریاد کرتے تھے تو اس نے تمہاری سن لی کہ میں تمہیں مدد دینے والا ہوں ہزار فرشتوں کی قطار سے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے تین ہزار فرشتوں سے مؤمنوں کی امداد کی جو اسی زیر بحث آیۃ کریمہ میں ہے، پھر رب قدوس نے مؤمنوں کی پانچ ہزار فرشتوں سے امداد فرمائی جو اس کے بعد آیۃ کریمہ میں ذکر آرہا ہے۔

﴿اِذْ تَقُوْلُ﴾ ''ظرف ہے'' نصر کم'' کی، تحقیق اللہ تعالیٰ نے تمہاری امداد کی جب تم مؤمنوں کو کہہ رہے تھے۔

﴿لِلْمُؤْمِنِیْنَ﴾ حین اظھروا العجز عن المقاتلة''

مؤمنوں کو آپ اس وقت تسلی دے رہے اور یہ ارشاد فرما رہے تھے جب انہوں نے کافروں سے جنگ کرنے میں اپنے عجز کا اظہار کیا۔

﴿اَلَنْ یَّکْفِیَکُمْ اَنْ یُّمِدَّکُمْ رَبُّکُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ﴾

''کیا تمہیں کافی نہیں کہ تمہاری امداد کرے تمہارا رب تین ہزار فرشتوں سے۔''

''الکفایة سد الخلة و القیام بالامر'' کفایت کا مطلب ہے کہ حاجت کو پورا کرنا اور تمام معاملات کی حفاظت کرنا ''الامداد اعانة الجیش بالجیش'' جنگ میں امداد کا مطلب ہی یہ ہے کہ ایک لشکر کی دوسرے لشکر کے ذریعے امداد کی جائے، صحابہ کرام کافروں کی بڑی تعداد سے ''جو اسلحہ سے مسلح تھے'' جنگ کرنے کیلئے نہیں گئے تھے، بلکہ ایک قافلہ کی سرکوبی کیلئے گئے تھے (جس کا تفصیلی ذکر انشاء اللہ آگے آرہا ہے) اس لئے صحابہ کرام اپنی تعداد میں کمی اور بے سروسامانی اور کافروں کی تعداد میں زیادتی اور ظاہری قوت اور اسباب جنگ کے پائے جانے کی وجہ سے یہ

خیال کر رہے تھے کہ ہماری امداد کہاں سے آئے گی تو اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی، صحابہ کرام کو تسلی دی کہ اللہ تعالیٰ تمہاری تین ہزار فرشتوں سے امداد فرمائے گا۔

﴿مُنْزَلِيْنَ﴾ "اس حال میں کہ وہ اتارے ہوئے ہوں۔"

﴿مُـنْـزَلِـيْـنَ﴾ ای حال کونهم نازلين من السماء باذنه تعالی (مُنْزَلِيْنَ) حال واقع ہو رہا ہے یعنی اس حال میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے آسمانوں سے اترنے والے ہیں، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارے ہوئے ہوں گے۔ (ماخوذ از روح البیان)

مطلقاً امداد کا معنی یہ ہے "والامداد فی الاصل اعطاء الشئی حالا بعد حال" امداد اصل میں یہ ہے کہ کسی کو کوئی چیز وقتاً فوقتاً عطاء کرنا۔ شر میں بھی امداد کرنے کا ذکر قرآن پاک میں ہے ﴿وَيَـمُـدُّهُـمْ فِیْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ اسی طرح اور ارشاد ہے ﴿وَنَـمُدُّلَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا﴾ اور خیر میں امداد جس طرح یہاں ذکر ہے، اور ارشاد گرامی ہے ﴿وَاَمْدَدْنَا كُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ﴾۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

بَلٰۤى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ○ (آیۃ نمبر ۱۲۵)

(1) ہاں کیوں نہیں اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کرو اور کافر اسی دم تم پر آ پڑیں تو تمہارا رب تمہاری مدد کو پانچ ہزار فرشتے نشان والے بھیجے گا۔ (کنزالایمان)

(2) ہاں کیوں نہیں، اگر تم صبر کرو، اور پرہیزگار ہو جاؤ، اور وہ تمہارے پاس جلدی اسی وقت (حملہ کرنے) آ جائیں تو امداد کرے گا تمہاری رب پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

"بَلٰى" ایجاب لمابعدان وتحقيق ای بلی يكفيكم ذلک ثم وعدهم الزيادة بشرط الصبر والتقوى حثالهم وتقوية لقلوبهم فقال (ان تصبروا) على لقاء العدو ومناهضتهم (وتتقوا) معصية الله ومخالفة نبيه ﷺ"

کیوں نہیں یہ امداد تمہیں کافی ہے، پھر رب تعالی نے ان سے زیادہ امداد کرنے کا وعدہ فرمایا، یعنی تین ہزار فرشتوں کا اتارا جانا ہی تمہارے لئے امداد کافی ہے، البتہ وہ اور زیادہ پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری امداد کرے گا شرط یہ ہے کہ تم صبر کرو، یعنی دشمن سے جب تمہاری ملاقات ہو تو صبر سے کام لو اور تقوی اختیار کرو، یعنی اللہ تعالی کی معصیت اور نبی کریم ﷺ کی مخالفت سے بچ کر رہو۔

﴿وَيَأْتُوكُم مِّن فَوْرِهِمْ هَٰذَا﴾ ''وہ آجائیں تمہارے پاس جلدی سے۔''

یعنی مشرکین اگر تمہارے پاس اسی گھڑی آجائیں حملہ کرنے کی غرض سے، تو ان کے آنے پر بغیر کسی تاخیر کے تمہاری امداد فرمائے گا۔

﴿يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ﴾

''وہ تمہاری امداد کرے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہوں گے۔''

''التسویم الذی ہو الذی ہو اظہار سیما الشئی'' تسویم کا معنی ہے کس چیز کی علامات کو ظاہر کرنا۔

''روی ان الملائکۃ کانوا بعمائمہم بیض الا جبریل علیہ السلام فانہ کان بعمامۃ صفراء علی مثال الزبیر بن العوام ونزلوا علی الخیل البلق موافقۃ لفرس المقداد واکرامالہ''

روایت میں آتا ہے کہ فرشتے جب اترے تو ان کی سفید پگڑیاں تھیں، سوائے جبریل کے کہ ان کی پگڑی زرد رنگ کی تھی، جیسے حضرت زبیر بن عوام کی پگڑی تھی، وہ چتکبرے گھوڑے پر اترے جیسا کہ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کا گھوڑا تھا، اس میں حضرت مقداد کی خصوصی عزت افزائی تھی۔

فرشتوں نے لڑائی کی تھی یا نہیں؟

اس مسئلہ میں دو قسم کی روایات پائی جاتی ہیں۔

''وانما کانت الفائدۃ فی کثرۃ الملائکۃ لتسکین قلوب المؤمنین ولان اللہ تعالی جعل اولئک الملائکۃ مجاہدین الی یوم القیامۃ فکل عسکر صبر واحتسب تاتیہم الملائکۃ ویقاتلون معہم''

بدر میں کثیر فرشتوں کو مؤمنوں کے دلوں کو تسلی دینے کیلئے بھیجا گیا، اس لئے کہ اللہ تعالی نے ان فرشتوں کو قیامت تک جہاد کرنے والا بنایا، ہر وہ لشکر جس نے صبر کیا اور تقوی اختیار کیا وہ ان کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتے ہیں۔

"وقال ابن عباس ومجاهدلم تقاتل الملائكة الايوم بدروفيماسوى ذلك يشهدون ولايقاتلون انمايكون عدداومددا"

حضرت ابن عباس ومجاہد (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں، بدر کے سوا کسی اور جنگ میں فرشتوں نے لڑائی میں حصہ نہیں لیا، صرف بدر میں فرشتوں نے لڑائی کی، اور باقی جنگوں میں فرشتے حاضر ہوتے رہے، مؤمنوں کی تعداد بڑھاتے رہے، اور مؤمنوں کے دلوں کو تسلی دے کر ان کی امداد کرتے رہے، اس روایت سے واضح ہو رہا ہے کہ بدر میں فرشتے صحابہ کرام کے ساتھ ملکر جہاد کرتے رہے۔

"وقال بعضهم انما كانت الفائدة فى كثرة الملائكة انهم كانوايدعون ويسبحون ويكثرون الذين يقاتلون يومئذ"

بعض روایات کے مطابق فرشتوں کا زیادہ تعداد میں آنے کا فائدہ یہ تھا کہ وہ اس دن بدر میں جنگ کرنے والوں کیلئے دعاء کر رہے تھے، اور ان کی کامیابی کیلئے اللہ تعالی کی تسبیحات پڑھ رہے۔

اس روایت سے دو فائدے حاصل ہوئے (ایک یہ کہ مشکل وقت میں اللہ تعالی کی تسبیحات پڑھ کر دعاء کی جائے) اور دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا "فعلى هذا لم تقاتل الملائكة يوم بدروانماحضروا للدعاء بالتثبيت" کہ اس روایت کے مطابق یہ واضح ہو رہا ہے کہ فرشتوں نے بدر کے دن لڑائی میں حصہ نہیں لیا، وہ صرف صحابہ کرام کی تسلی کیلئے آئے تھے اور ان کی ثابت قدمی کیلئے دعاء کر رہے تھے۔ (ماخوذ از قرطبی)

راقم کا موقف:

اس مسئلہ میں یہ ہے کہ فرشتے اپنی ملکی طاقت سے لڑائی نہیں کر رہے، اور نہ ہی سب فرشتے لڑائی کر رہے تھے، بلکہ بعض فرشتے بشری طاقت کے مطابق (جو اس وقت ان کو عطاء کی گئی) لڑائی کر رہے تھے **انشاء اللہ** بدر کے تفصیلی واقعات کے ضمن میں قریب ہی آ رہا ہے۔

فائدہ جلیلہ:

"نزول الملائكة بسبب من اسباب النصر لايحتاج اليه الرب تعالى وانمايحتاج اليه المخلوق"

فرشتوں کا اترنا امداد کے اسباب میں سے ایک سبب تھا، اللہ تعالی اس کا محتاج نہیں تھا، بلکہ مخلوق اس کی محتاج تھی "فليعلق القلب بالله وليثق به" کہ مخلوق کا دل رب تعالی کی ذات سے معلق (لگا) رہے، اور رب

تعالی کی امداد پر ان کو غالب وثوق (اعتبار) رہے۔

رب تعالی امداد فرماتا ہے کبھی اسباب کے ذریعے اور کبھی بغیر اسباب کے یعنی وہ صرف "کن" سے کبھی امداد فرماتا ہے ﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗۤ اِذَآ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ (بیشک اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ ارادہ فرماتا کسی چیز کا تو کہتا ہے "کن" (ہوجا) تو وہ ہوجاتی ہے۔ بدر میں سبب کے ذریعے امداد کی تاکہ مخلوق کو بھی پتہ چل جائے کہ رب تعالی نے اسباب کے ذریعے بھی امداد کرنے کا وعدہ فرمالیا ہے ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا﴾ (تم ہرگز اللہ تعالی کے فیصلوں میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

اعتراض: اقویاء یعنی بڑی شان والے بلند ہمت لوگ تو صرف رب تعالی پر توکل رکھتے ہیں، وہ اسباب کا سہارا نہیں لیتے "ان الاسباب انما بنیت فی حق الضعفاء لاللاقویاء" اسباب تو کمزور لوگوں کیلئے ہوتے ہیں جو توکل نہیں رکھتے، بڑے لوگوں کیلئے اسباب نہیں ہوتے، تو صحابہ کرام کو امداد کے سبب سے مطلع کرنے کا کیا جائزہ تھا۔

جواب: یہ ضابطہ ہی درست نہیں کہ اسباب توکل کے خلاف ہیں، اولیاء کرام، بلکہ انبیاء کرام نے بھی مرض میں علاج کرانے کو توکل کے مخالف نہیں قرار دیا، اور لوگوں نے اپنی بیماری وغیرہ میں نبی کریم ﷺ سے دعاء کرائی، ان کا دعاء کرانا توکل کے مخالف نہیں تھا، ورنہ یہ حقیقت ہے "ان النبی ﷺ واصحابه کانوا الاقویاء وغیرهم هم الضعفاء" کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام قوی حضرات تھے اور باقی حضرات ضعفاء (ضعیف لوگ) تھے۔

(ماخوذ از قرطبی بوضاحت)

﴿یَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا﴾ میں "مِنْ فَوْرِهِمْ" کا ایک معنی "من وجههم" وہ منہ اٹھائے تمہارے پاس اسی گھڑی میں آدھمکیں، دوسرا معنی ہے "من غضبهم" وہ غصہ سے اسی گھڑی تمہارے پاس آجائیں یعنی تم پر چڑھائی کردیں۔ اصل میں "فور" کا معنی "فارت القدر" (ہنڈیا نے جوش مارا) سے لیا ہے، غیظ وغضب کی حالت پر لفظ "فور" کا اطلاق ہوتا ہے "والاصل الفور الی الشئی والاخذفیه بجد" "فور" کا اصل میں معنی یہ ہے کہ ایک چیز کی طرف ارادہ کرنا اور اسے بڑی کوشش سے حاصل کرنا۔

﴿واقعہ بدر﴾

تاریخ بدر: غزوہ بدر کیلئے نبی کریم ﷺ ہجرت کے انیسویں مہینہ میں بارہ رمضان المبارک کو روانہ ہوئے، بعض نے آٹھ رمضان کہا اور قتال سترہ رمضان المبارک ۲ھ کو واقع ہوا، جمعہ کا دن تھا، بعض نے ہفتہ کا دن کہا ہے۔ (مدارج النبوۃ جلد دوم)

بدر کا نام بدر کیوں؟

بدر ایک بستی کا نام ہے جو بدر بن مخلد بن نضر بن کنانہ سے اس لئے منسوب ہے کہ اس نے اس جگہ پڑاؤ کیا تھا، اور بدر بن حارث کی طرف اس لئے منسوب ہے کہ اس نے یہاں ایک کنواں کھودا تھا جو بدر (چودہویں کے چاند) کی طرح گول تھا۔ (مدارج النبوۃ بتصرف)

غرضیکہ جہاں بدر کی جنگ ہوئی وہاں قریب ایک بستی کا نام بھی بدر تھا، اس بستی کو آباد کرنے والے کا نام بھی بدر تھا اور ایک کنواں تھا اس کا نام بھی بدر تھا، درحقیقت بستی اور کنواں بدر نامی شخص کی طرف منسوب تھے۔

غزوہ بدر حق و باطل میں تمیز کرنے کا ذریعہ واقع ہوا:

نبی کریم ﷺ کے تمام غزوات میں سے یہ غزوہ بہت زیادہ عظیم غزوہ تھا، اس دن دین کو عزت و شوکت حاصل ہوئی، اسی وجہ سے اس دن کو ﴿یَوْمَ الْفُرْقَانِ﴾ (حق و باطل میں فرق کرنے والا دن) کہا گیا ہے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ﴾ فرقان کا دن وہ دن ہے جس دن دو جماعتیں ملیں۔ اس دن کفر کی بنیادوں کو تباہ و برباد کر کے کافروں کو ذلیل و خوار بنا دیا، حالانکہ مسلمانوں کی تعداد کم اور دشمنان دین کی تعداد زیادہ تھی، اور کفار جنگ کے پورے ساز و سامان سے لیس ہو کر اتراتے اور تکبر کرتے آئے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ ﷺ کو عزت دی اور اپنے دین کو قوی اور مضبوط بنایا، رب تعالیٰ کی امداد کا ذکر قریب ہی تین آیات میں گذر چکا ہے۔

مسلمانوں کی تعداد: تین سو تیرہ تھی جن میں ستتر (۷۷) مہاجرین، اور دو سو چھتیس (۲۳۶) انصار تھے، لیکن نبی کریم ﷺ ساتھ کے صرف تین سو پانچ صحابہ کرام تھے، باقی آٹھ میں سے ایک حضرت عثمان ﷛ ہیں جو آپ کے حکم سے اپنی زوجہ سیدہ رقیہ بنت رسول اللہ ﷺ کی علالت اور تیمارداری کیلئے رکے تھے لیکن آپ کا شمار بدری صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔ اور سات صحابہ کرام کو مشرکین کے قافلہ کی تلاش میں بھیجا ہوا تھا، جن میں پانچ انصار تھے، اور دو مہاجرین سے حضرت طلحہ اور سعید بن زید ہیں، یہ سات بھی بدری صحابہ کہلاتے ہیں، یعنی ان کا درجہ بدر والے صحابہ کے برابر ہے، اور بدر کے مال غنیمت میں یہ برابر کے شریک تھے۔ (مدارج النبوۃ جلد دوم)

مسلمانوں کے پاس جنگی سامان چھ زرہیں اور آٹھ تلواریں، اور ستر اونٹ، اور تین گھوڑے (جس روایت میں زیادہ گھوڑوں کا ذکر ہے وہ تین ہیں، ورنہ دو اور ایک کا بھی ذکر ہے۔

مشرکوں کی تعداد وجنگی سامان :

مشرکین ایک ہزار کے قریب تھے، ان کے ساتھ ایک سو گھوڑے اور سات سو یا کچھ زیادہ اونٹ تھے، کفار بڑی شوکت اور کروفر میں تھے، مکمل جنگی ساز وسامان ان کے پاس تھا، وہ بڑے غرور اور تکبر میں تھے، ان کا ہر شخص زرہ پوش خواہ سوار تھا یا پیادہ ان کے ساتھ آلات طرب (عیش وعشرت) بھی تھے، اور ان کے ساتھ گانا گانے والی ڈومیناں بھی تھیں، وہ گانا گا کر مسلمانوں کے خلاف زبان طعن دراز کرتیں، اور مشرکوں کو جوش دلاتیں، قریش کے سرداروں میں سے ہر روز کوئی نہ کوسب لشکر والوں کو کھانا دیتا تھا، وہ بظاہر اس شان وشوکت سے آئے تھے لیکن رب تعالی نے ان کو ذلیل کیا۔ (مدارج النبوۃ جلد دوم)

جنگ بدر کا سبب :

بدر کا واقعہ مسلمانوں کے بغیر قصد وارادہ اور منصوبہ بندی کے واقع ہوا تھا، نبی کریم ﷺ اور تمام مسلمان اس جنگ کیلئے پہلے سے تیار نہ تھے، وہ تو قریش کے اس بڑے قافلہ کی سرکوبی کیلئے مدینہ طیبہ سے نکلے تھے جو شام سے آرہا تھا، اس میں قریش کا کثیر مال تجارت تھا، اس کا امیر قافلہ ابوسفیان تھا، اس میں عمرو بن العاص بھی شامل تھا (ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا) یہ قافلہ تیس سواروں پر مشتمل تھا، یہ لوگ جب بدر کے قریب پہنچ گئے تو نبی کریم ﷺ کو اطلاع ملی آپ نے صحابہ کرام سے فرمایا وہ قافلہ آرہا ہے جس کے ساتھ اموال کثیرہ بھی ہے اور دشمنوں کی تعداد بھی بہت کم ہے، لھذا اس کی سرکوبی کیلئے چلو ممکن ہے کہ حق تعالی اس طرح تمہیں سامان عطاء فرمائے، ایک روایت میں دعاء کا تذکرہ ہے، آیئے وہ حدیث پاک دیکھئے۔ (ماخوذ از مدارج النبوۃ جلد دوم)

❁ عن عبدالله ابن عمرو ان النبی ﷺ خرج یوم بدر فی ثلثمائة وخمسة عشر قال اللهم انهم حفاة فاحملهم اللهم انهم عراة فاکسهم اللهم انهم جیاع فاشبعهم ففتح الله له فانقلبوا ومامنهم رجل الاوقد رجع بجمل اوجملین واکتسبوا وشبعوا"
(رواه ابوداؤد، مشکوة باب المعجزات)

عبداللہ بن عمرو (بن العاص) فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ بدر کے دن تین سو پندرہ اصحاب کے ساتھ نکلے، (تین سو پندرہ کا مطلب کسر کا لحاظ نہ کرتے ہوئے تین سو تیرہ کو تین سو پندرہ اصحاب سے تعبیر کردیا گیا) آپ نے عرض کیا اے اللہ! بیشک یہ پاؤں سے ننگے ہیں، ان کو سواریاں عطاء کر، اے اللہ یہ ننگے ہیں ان کو کپڑے عطاء کر، اے اللہ یہ بھوکے ہیں ان کو سیر کر، اللہ تعالی نے آپ کو فتح عطاء کی تو وہ جب واپس لوٹ کر آئے، کوئی شخص بھی ان میں سے نہیں تھا مگر یہ کہ وہ ایک یا دو اونٹ لے کر واپس آیا ہر شخص کو کپڑے حاصل تھے اور سب سیر تھے۔

وضاحت حدیث:

"اللهم انهم،ای غالبهم(حفاة)بضم الحاء جمع خاف وهومن لافعل له(فاحملهم)بهمز وصل وکسرمیم ای اعنهم علی الحمل والمعنی اعط کلامنهم المرکوب"
آپ کی دعاء کا یہ مطلب ہے کہ اے اللہ ان میں سے اکثر لوگ پاؤں سے ننگے ہیں،انہیں جوتے میسر نہیں،ان کی امداد فرما،ان میں سے ہر ایک کو سواری عطاء فرما۔

"اللهم انهم عراة فاکسهم" اے اللہ یہ ننگے ہیں،یعنی ان کو مکمل زینت والا لباس میسر نہیں،زیادہ سے زیادہ کمر سے باندھنے والی چادریں ان کو میسر ہیں،ان کو زیب وزینت والا مکمل لباس تو عطاء فرما" اللهم انهم جیاع فاشبعهم" اے اللہ! یہ بھوکے ہیں ان کو سیر کر،یعنی ان کے ظاہر وباطن کو سیر کر،تا کہ ان کو طاعت پر قوت عطاء فرما۔"ففتح الله له" اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو فتح عطاء فرمائی،یعنی آپ کی مشرکین مکہ پر اور صنادید قریش (قریش کے سرکردہ سرداروں) پر امداد فرمائی،یہاں تک کہ مشرکین کے ستر آدمی قتل کر دیئے گئے،اور ستر آدمی قید کر لئے گئے،"فانقلبوا"فرجع اصحابه "صحابہ کرام لوٹے۔ "ومامنهم رجل الا وقدرجع بجمل اوجملین واکتسواوشبعوا" یعنی صحابہ کرام کو اللہ تعالیٰ نے کفار کا مال بطور غنیمت عطاء فرمایا جس سے ہر شخص کو ایک یا دو اونٹ حاصل ہو گئے،ان کو مکمل زیب وزینت والا لباس عطاء کر دیا گیا،اور مال کے ملنے کی وجہ سے ان کو کھانا بھی میسر ہو گیا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی کتنا ہی سچا ہے﴿عَسٰۤی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند سمجھو اور اللہ نے اس میں خیر کثیر رکھ دی ہو۔

"وفی الحدیث ان الصبرعلی ماتکره فیه خیر کثیرثم هذه نتیجته فی الدنیاوالآخرة خیروابقی"
حدیث سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جس چیز کو تم ناپسند سمجھتے ہو،اسی پر صبر کرنے سے کثیر بھلائیاں حاصل ہوتی ہیں پھر یہ نتیجہ دنیا اور آخرت میں بھلائی کا ذریعہ ہے اور قائم رہنے والا ہے۔ (ماخوذ از مرقاۃ جلد ۱۱ صفحہ نمبر ۲۱۴)

عاتکہ بنت عبدالمطلب کا خواب دیکھنا:

نبی کریم ﷺ کی پھوپھی عاتکہ بنت عبدالمطلب نے خواب دیکھا کہ کچھ لوگ اونٹوں پر سوار ہو کر آئے، اور مقام ابطح میں آئے اور بلند جگہ کھڑے ہو کر انہوں نے یہ کہا اے قریش کے لوگو جلدی کرو اور اپنے قتل کی جگہ آؤ،جب ابوجہل لعین کو اس خواب کا پتہ چلا تو وہ (حضرت) عباس سے کہنے لگا،اے ابوالفضل یہ عورت تم

میں کب سے نبی بن گئی، پھر وہ بطور (طنز) کہنے لگا کیا تمہارے مردوں کا نبوت کا دعوی کرنا کافی نہیں تھا، بڑا تعجب ہے اب تمہاری عورتیں بھی نبوت کا دعوی کرنے لگ گئی ہیں، پھر وہ کہنے لگا کہ میں تین دن انتظار کرتا ہوں اگر اس خواب کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوا تو میں تمام قبائل عرب میں خط بھیج دوں گا کہ تم لوگ یعنی بنی ہاشم سب سے زیادہ جھوٹے ہو۔ (سیرت ابن ابی ہشام وطبقات ابن سعد بالاختصار ترجمہ عاتکہ بنت عبدالمطلب)

اصل میں ابوجہل کا تکبر اسے بدر میں جانے پر ابھار رہا تھا، تاکہ اپنے قتل کی جگہ تک جلدی پہنچ جائے۔

صمضم غفاری کا خواب:

صمضم غفاری نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں ایک اونٹ پر سوار ہوں اور ایک ایسی گھاٹی سے گذر رہا ہوں جو خون سے لبریز ہے، جب میں بیدار ہوا تو میں نے سمجھ لیا کہ قریش کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہوں گے، اس خواب کو سن کر بنی ہاشم بڑے خوش ہوئے کیونکہ یہ خواب عاتکہ بن عبدالمطلب کے خواب کی تائید کر رہا تھا۔ (مدارج النبوۃ جلد۲)

اہل مکہ کا فیصلہ:

اہل مکہ نے جنگ کی تیاری شروع کر لی اور فیصلہ یہ کیا کہ ہر وہ شخص جن کو مکہ میں کوئی کام ہے ان میں سے ایک جنگ کیلئے باہر نکل آئے یا اپنی طرف سے کسی اور کو بھیج دے، قریش کے تمام سردار جنگ کیلئے آمادہ ہو گئے، لیکن ابولہب نے ٹال مٹول سے کام لیا اور پیچھے رہنے کا فیصلہ کیا، اس نے اپنی جگہ پر ابوجہل کے بھائی عاص بن ہشام بن مغیرہ کو بھیجا، اور اس کے ذمہ سودی کی رقم ابولہب کے چار ہزار درہم تھے جو اس نے معاف کر دئے تھے۔ امیہ بن خلف بھی چھپ رہا تھا، مکہ سے باہر جانے کا ارادہ کر رہا تھا، کیونکہ اسے حضرت سعد بن معاذ ؓ کے ذریعے یہ خبر مل چکی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے کہ میرے اصحاب امیہ بن خلف کو قتل کر دیں گے، نبی کریم ﷺ کی خبر نے سچا ہونا ہی تھا، یہی وجہ ہے کہ ابوجہل نے بہت زیادہ اصرار کیا، اور ولید کو کہا اے ابوصفوان تو مکہ کے بہت سے لوگوں کا سردار ہے، جب لوگوں کو پتہ چل گیا کہ تو نہیں جا رہا، پیٹھ پھیر رہا ہے اور پیچھے رہ رہا ہے تو دوسرے لوگ بھی پیچھے رہ جائیں گے تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے، ابوجہل کے بار بار اصرار پر امیہ بن خلف جانے پر تیار ہو گیا۔

وضاحت حدیث: وہ حدیث جس میں امیہ بن خلف کے قتل ہو جانے کی پیشگوئی کی گئی ہے، وہ یہ ہے۔

عن سعدبن معاذانه قال کان صدیقالامیة بن خلف و کان امیة اذامربالمدینة نزل علی سعدوکان سعداذامربمکة نزل علی امیة فلمام قدم رسول اللہ ﷺ المدینة انطلق سعدمعتمرافنزل علی امیة بمکة فقال لامیة انظرلی ساعة خلوة لعلی ان اطوف بالبیت فخرج بہ قریبامن نصف النھارفلقیھماابوجھل فقال یاابا صفوان من ھذامعک؟فقال ھذاسعدفقال لہ ابوجھل الاأراک تطوف بمکة آمناوقداویتم الصباة وزعمتم انکم تنصرونھم وتعینونھم اماواللہ لولاانک مع ابی صفوان مارجعت الی اھلک سالمافقال لہ سعدورفع صوتہ علیہ اماواللہ لئن منعتنی ھذالامنعنک ماھواشد علیک منہ طریقک علی المدینة فقال لہ امیة لاترفع صوتک یاسعدعلی ابی الحکم سیداھل الوادی،فقال سعددعناعنک یاامیة فواللہ لقدسمعت رسول اللہ ﷺ یقول انھم قاتلوک قال بمکة قال لاادری،ففزع لذلک امیة فزعاشدیدافلمارجع امیة الی اھلہ قال یاام صفوان الم تری ماقال لی سعد؟قال زعم ان محمدااخبرھم انھم قاتلی فقلت لہ بمکة قال لاادری فقال امیة واللہ لااخرج من مکة فاتاہ ابوجھل فقال یااباصفوان انک حتی یراک الناس قد تخلفت وانت سید اھل الوادی تخلفوامعک فلم یزل بہ ابوجھل حتی قال اما اذاغلبتنی فواللہ لاشترین اجودبعیربمکة ثم قال امیہ یاام صفوان جھزینی فقالت لہ یااباصفوان وقدنسیتَ ماقال لک اخوک یثربی؟قال لامااریدان اجوزمعھم الاقریبافلماخرج امیة لاینزل منزلاالاعقل بعیرہ فلم یزل بذلک حتی قتلہ اللہ عزوجل ببدر"

(بخاری باب ذکر النبی ﷺ من یقتل ببدر)

عبداللہ بن مسعود بن معاذ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ امیہ بن خلف کے دوست تھے، امیہ جب مدینہ سے گذرتا تو سعد کے پاس ٹھہرتا، سعد کا جب مکہ سے گذر ہوتا تو یہ امیہ کے پاس ٹھہرتے، جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ میں تشریف لے آئے تو سعد عمرہ کرنے کی غرض سے چلے، مکہ میں امیہ کے پاس جا کر ٹھہرے، پھر امیہ کو کہنے لگے کہ دیکھ رکھنا کوئی (لوگوں سے) علیحدہ گھڑی مل جائے، ہوسکتا ہے میں بیت اللہ شریف کا طواف کرلوں، وہ دن کے آدھے حصہ میں (یعنی دوپہر کے وقت) سعد کو لے گیا، تو ان دونوں کو ابوجہل (راستہ میں آتے ہوئے) مل گیا، تو اس نے کہا، اے ابوصفوان! یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ امیہ نے کہا "یہ سعد ہے" ابوجہل نے امیہ کو کہا کیا تم مکہ میں امن میں (بغیر کسی خوف کے) طواف کر رہے تھے؟ اور تحقیق تم نے ایک بے دین (اپنے آباء اجداد کے دین سے پھر جانے والے) کو امن دیا ہوا ہے اور تم یہ گمان کرتے ہو کہ بیشک تم ان کی امداد کرو گے اور معاونت کرو گے، (پھر سعد کو کہنے لگا) قسم

ہے اللہ کی اگر تو ابوصفوان (امیہ کی کنیت ہے) کے ساتھ نہ ہوتا تو تو اپنی اہل کی طرف صحیح وسلامت لوٹ کر نہ جاتا، تو سعد نے اسے زوردار گرجدار آواز سے کہا، خبردار قسم ہے اللہ تعالی کی اگر تو نے مجھے یہاں سے منع کیا تو میں تمہارے (شام کی طرف جانے والے) مدینہ سے گذرنے والے راستے بند کردوں گا۔

امیہ نے سعد کو کہا، اے صفوان! تم اپنی آواز اس وادی کی کے سردار ابوالحکم پر بلند نہ کرو، (کفار ابوجہل کو ابوالحکم کہتے تھے، مسلمان ابوجہل کہتے تھے، حق یہ تھا کہ امیہ اپنے مہمان کا ساتھ دیتا لیکن اس نے جب ابوجہل کا ساتھ دینا شروع کردیا تو سعد غصہ میں آگئے) تو سعد نے کہا اے امیہ تم اپنے آپ سے ہمیں ہٹادو (یعنی تم ہمارے راستہ سے ہٹ جاؤ، تم ہمیں کیا بچاؤ گے) میں نے تو رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ فرمارہے تھے، بیشک میرے صحابہ امیہ بن خلف کو قتل کردیں گے، اس نے پوچھا کیا مکہ میں (مجھے قتل کریں گے) حضرت سعد نے کہا یہ تو مجھے معلوم نہیں، امیہ یہ خبر سن کر بہت پریشان ہوگیا، شدید گھبراہٹ میں مبتلاء ہوگیا (نبی کریم ﷺ کی غیبی خبروں پر کفار بھی یقین رکھتے تھے) امیہ جب اپنی اہل کے پاس آیا، تو اس نے کہا اے ام صفوان (یہ کنیت ہے اس کی زوجہ کی) کیا تمہیں علم حاصل ہوا مجھے سعد نے کیا کہا؟ اس نے پوچھا کہ سعد نے تمہیں کیا کہا؟ اس نے بتایا کہ وہ گمان کرتا ہے کہ بیشک محمد نے ہمیں خبر دی ہے کہ ان کے اصحاب تمہیں قتل کردیں گے، تو میں نے اس سے پوچھا کیا وہ مجھے مکہ میں قتل کردیں گے؟ اس نے کہا یہ تو مجھے علم نہیں، امیہ نے کہا قسم ہے اللہ کی میں مکہ سے باہر نہیں جاؤں گا، جب بدر (کی طرف نکلنے) کا دن آگیا تو ابوجہل اسے کہہ رہا تھا کہ تم ہمارے ساتھ چلو، کیونکہ میں نے اور لوگوں کو بھی کہہ دیا ہے کہ چلو مسلمانوں کو ہمارے قافلہ کے روکنے کا مزہ چکھاتے ہیں، لیکن امیہ مکہ سے باہر جانے سے ڈر رہا تھا (انکار کررہا تھا) ابوجہل نے کہا اے ابوصفوان تم اس وادی میں (اپنے قبیلے کے) کے سردار ہو، جب لوگ تمہیں دیکھیں گے کہ تم پیچھے رہ گئے ہو تو وہ بھی پیچھے رہ جائیں گے۔ ابوجہل بار بار کہتا رہا، یہاں تک کہ امیہ نے کہا کہ اگر تم مجبور ہی کرتے ہو تو قسم ہے اللہ کی میں مکہ میں سب سے عمدہ اونٹ خریدوں گا، پھر امیہ نے (گھر آکر اپنی زوجہ کو) کہا اے ام صفوان میرا سامان تیار کردو، اس نے کہا اے ابوصفوان کیا تم اپنے یثربی بھائی کی باتوں کو بھول گئے ہو؟ اس نے کہا نہیں (بھولا نہیں) میں کوئی دور جانے کا ارادہ نہیں رکھتا، بلکہ قریب سے ہی واپس آجاؤں گا، یہ جہاں بھی اترتا، اونٹ کو رسی سے باندھ دیتا، اس کا ارادہ یہ ہوتا کہ لوٹ آئے، لیکن یہ اسی طرح بدر میں پہنچ گیا، اللہ تعالی نے اسے وہاں بدر میں پہنچادیا۔

حدیث پاک میں استعمال ہوا ہے "صباۃ" (بضم الصاد) یہ جمع ہے صابی کی "هو المائل عن دينه الى دين غيره" یہ اسے کہتے ہیں جو ایک دین سے دوسرے دین کی طرف پھر جائے، امیہ کی زوجہ نے حضرت سعد کو امیہ کا

یثربی بھائی کہا "والمراد الاخوة بینھمابحسب المعاھدة والموالاة" اخوۃ سے مراد ان کا وعدہ اور دوستی کا بھائی چارہ ہے۔ (عمدۃ القاری جزء ۷ اصفحہ نمبر ۷۶)

ابو جہل کا کعبہ کے اوپر کھڑے ہو کر لوگوں کو بھڑکانا:

ایک روایت میں ہے کہ ابو جہل لعین نے خانہ کعبہ کے اوپر کھڑے ہو کر آواز لگائی کہ اے مکہ والو جلدی کرو، جلدی نکلو، اور اپنے اموال اور اپنے قافلہ کے پاس پہنچو اگر تم سے پہلے محمد (ﷺ) کے اصحاب پہنچ گئے تو پھر تمہاری خیر نہیں، اس پر ایک ہزار جنگی لوگ نکل آئے اور بصد کروفر غرور وتکبر اور پورے سازوسامان، آلات غنا اور ملاہی (لہو ولعب کے سامان) کے ساتھ چل پڑے۔

نبی کریم ﷺ کا صحابہ کرام سے مشورہ اور صحابہ کرام کی طرف آپ کو اطمینان بخش جواب:

❁ عن انس ان رسول اللهﷺ شاور حین بلغه اقبال ابی سفیان قال فتکلم ابوبکر فاعرض عنه ثم تکلم عمر فاعرض عنه فقال سعد بن عبادة ایانا ترید یارسول الله والذی نفسی بیده لو امرتنا ان تخیضها البحر لاخضناها ولو امرتنا ان نضرب اکبادها الی برک الغماد لفعلنا قال فندب رسول الله ﷺ الناس فانطلقوا حتی نزلوا بدرا وورت علیھم روایا قریش وفیھم غلام اسود لبنی الحجاج فاخذوه فکان اصحاب رسول الله ﷺ یسالونه عن ابی سفیان واصحابه فیقول مالی علم بابی سفیان ولکن ھذا ابو جھل وعتبة وشیبة وامیة بن خلف فی الناس فاذا قال ھذا ضربوه ورسول الله ﷺ قائم یصلی فلما رای ذلک انصرف وقال والذی نفسی بیده لتضربوه اذا صدقکم وتترکوا اذا کذبکم قال فقال رسول الله ﷺ ھذا مصرع فلان ویضع علی الارض ھھنا وھھنا قال فماماط احدھم عن موضع ید رسول اللهﷺ" (مسلم جلد ثانی باب غزوة بدر صفحه نمبر ۱۰۱)

حضرت انس ؓ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے (صحابہ کرام سے) مشورہ کیا جب آپ کو ابو سفیان (کے قافلہ) کی آنے کی خبر ملی، تو حضرت ابوبکر ؓ نے آپ سے اس کے متعلق (اچھا) کلام فرمایا، لیکن آپ نے ان سے اعراض فرمایا، (کہ میرا مشورہ تم سے نہیں) پھر حضرت عمر ؓ نے اس کے متعلق بہتر کلام فرمایا، لیکن آپ نے ان سے اعراض فرمایا کہ (میرا مقصد تم سے مشورہ لینا نہیں، کیونکہ آپ انصار کے رائے لینا چاہتے تھے کہ یہ مدینہ طیبہ سے باہر جنگ کیلئے جائیں گے یا نہیں) پھر حضرت سعد بن عبادہ ؓ (جو انصار کے سردار تھے) کھڑے ہوئے، عرض کیا

یارسول اللہ اگر آپ ہم سے بات کرنے کا ارادہ فرمارہے ہیں تو قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر آپ ہمیں حکم دیں کہ ہم اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیں، تو ہم دریا میں ڈال دیں گے، راوی کہتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو بلایا، تو لوگ چلے یہاں تک کہ بدر میں پہنچ گئے، وہاں قریش کے کچھ لوگ پانی لینے کیلئے آگئے، ان میں بنی حجاج کا ایک حبشی غلام بھی تھا، اسے صحابہ کرام نے پکڑ کر پوچھا کہ ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے متعلق بتاؤ وہ کہاں ہیں؟ اس نے کہا کہ ابوسفیان کے قافلہ کا تو مجھے کوئی علم حاصل نہیں، البتہ ابوجہل، عتبہ، شیبہ اور امیہ بن خلف یہاں (قریب) ہی آچکے ہیں، تو صحابہ کرام نے اسے مارا (اس خیال سے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے) اس نے کہا اچھا میں تمہیں (صحیح) خبر دیتا ہوں، یہاں قریب ہی ابوسفیان اور اس کے ساتھی موجود ہیں، صحابہ کرام نے اسے چھوڑ دیا، پھر اس سے پوچھا، اس نے کہا ابوسفیان کے متعلق تو مجھے کوئی علم نہیں، البتہ لوگوں میں (یعنی بہت بڑے لشکر میں) ابوجہل، عتبہ، شیبہ اور امیہ بن خلف آرہے ہیں، صحابہ کرام نے پھر اسے مارا، رسول اللہ ﷺ نماز ادا فرمارہے تھے، آپ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم اسے مارتے ہو جب یہ سچ کہتا ہے، اور تم اسے چھوڑ دیتے ہوئے جب یہ جھوٹ بولتا ہے پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ فلاں کے مرنے کی جگہ ہے یہ فلاں کی یہ فلاں کی آپ نے اپنا ہاتھ مبارک رکھ کر بتایا، یہاں اور یہاں روای کہتے ہیں کوئی ایک بھی آپ کے ہاتھ کی جگہ سے نہیں ہٹا (بلکہ وہیں مرا۔

وضاحت حدیث: "برك الغماد" برک باء پرفتحہ، راء کو ساکن، مفتوح اور مکسور تینوں طرح پڑھا گیا ہے۔

"واما الغماد فبغين معجمة مكسورة ومضمومة لغتان مشهورتان، وهو موضع من وراء مكة بخمس ليال بناحية الساحل وقيل بلديمان وقال ابراهيم الحربى برك الغماد وسعفات هجر كناية يقال فيما تباعد"

"برك الغماد" یا تو مکہ مکرمہ سے پانچ راتوں (پانچ دن پانچ راتوں) کے فاصلہ پر جنگل کے کنارے پر جگہ کا نام ہے، پانچ دنوں کا فاصلہ تقریباً تہتر میل ہے، اور بعض حضرات نے کہا یمن میں ایک شہر کا نام ہے، ابراہیم حربی کا قول یہ ہے کہ عرب حضرات "برك الغماد" اور "سعفات هجر" دو لفظ بولتے ہیں، جن کا کنایۃً معنیٰ "دوری" لیتے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ اگر آپ ہمیں حکم دیں کہ بہت دور دراز سفر کر کے جہاد کیلئے جانا ہے تو ہم وہاں جائیں گے خواہ وہ یمن کا شہر ہو یا دور دراز جنگل ہو۔ "**وفيه جواز ضرب الكافر الذى لاعهد له وان كان اسيرا**" حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جس کافر سے کوئی معاہدہ نہیں، وہ ذمی نہیں، اسے امن نہیں دیا گیا اسے مارنا جائز ہے

خواہ وہ قیدی ہی کیوں نہ ہو۔

"وفیہ معجزتان من اعلام النبوۃ احداھما اخبارہ ﷺ بمصرع جبابرتھم فلم یتعد احد مصرعہ الثانیۃ اخبارہ ﷺ بان الغلام الذی کانوا یضربونہ "یصدق اذا ترکوہ ویکذب اذا ضربوہ وکان کذلک فی نفس الامر" (نووی)

اس حدیث پاک سے نبی کریم ﷺ کے دو معجزے ثابت ہو رہے ہیں، ایک تو یہ کہ نبی کریم ﷺ نے قریش کے جن سرکردہ لوگوں کے نام بتائے اور جگہ کا انتخاب کیا کہ فلاں شخص یہاں مرے گا، اور فلاں شخص یہاں مرے گا، سب وہیں مرے، کوئی بھی وہاں سے ہٹ کر نہیں مرا، اور نہ ہی بچ کر نکلا، امیہ بن خلف جس کے متعلق نبی کریم ﷺ نے بہت پہلے خبر دے رکھی تھی کہ اسے میرے اصحاب قتل کر دیں گے، وہ بدر میں نہیں آنا چاہتا تھا لیکن اسے مجبور کر کے بدر میں لے جایا گیا وہ بھی وہاں قتل کر دیا گیا۔

ابوسفیان کا مشورہ لیکن ابوجہل کا اصرار:

ارباب سیر نے بیان کیا ہے کہ جب ابوسفیان اپنے قافلہ کو بچا کر ایک طرف سے نکل گیا تو اس نے مکہ میں پیغام بھیجا کہ قافلہ خطرہ سے نکل آیا ہے، لھذا تم لوگ لوٹ آؤ، محمد (ﷺ) کا پیچھا نہ کرو، قریش کے دوسرے عقلمند لوگ اور مدبر حضرات بھی انہیں منع کر رہے تھے، عتبہ اور شیبہ بھی منع کرنے والوں سے ہی تھے، عداس نصرانی جو عتبہ اور شیبہ کے غلام تھے، اور در پردہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لا چکے تھے، یہ بھی اپنے مالکوں کو منع کر رہے تھے کہ محمد (ﷺ) اللہ کے نبی ہیں، ان سے جنگ کر کے بدبختی میں مبتلاء نہ ہو، لیکن ابوجہل جس نے بدر میں قتل ہونا تھا یہ اصرار کر رہا تھا کہ ہم جنگ کرنے سے باز نہیں رہ سکتے، خدا کی قسم ہم بدر میں پہنچے سے پہلے واپس نہیں لوٹ سکتے، وہاں ہم تین دن ٹھہریں گے، اپنے اونٹ ذبح کریں گے، شراب پئیں گے، اور گانا سنیں گے، وہاں میلے کی طرح جشن منائیں گے، تا کہ ہماری شوکت و شجاعت کا چرچا ہر طرف عرب قبائل میں پھیل جائے تا کہ وہ ہم سے ڈرتے رہیں۔ ابوجہل کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس نے بدر سے لوٹ کر آنا ہی نہیں البتہ وہاں کفر و شرک اور فسق و فجور کا بازار گرم کریں گا، ذلت کی خاک میں سو کر جہنم میں جانے کا اسے پتہ نہیں تھا، بات اس کی یوں سچی ہوئی کہ کفار کی ذلت کی موت کا تمام قبائل میں چرچا ہو گیا۔ (ماخوذ از مدارج النبوۃ جلد دوم)

مسلمانوں اور کافروں کے لشکر بدر کے دو کناروں پر ٹھہر گئے:

نبی کریم ﷺ نے جب بدر کی جانب کوچ فرمایا تو مدینہ طیبہ کی جانب بدر کے ایک کنارے پر آپ اتر گئے۔

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَاَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى﴾ "عدوہ" کا معنی ہے "وادی کا کنارہ" اور "دنیا" دنو سے ہے جس کا معنی ہے "قریب" اور "قصوی" کا معنی ہے "بعید" یعنی مسلمانوں کو خطاب کر کے بتایا گیا کہ تم مدینہ کے قریب جانب تھے، اور وہ یعنی کفار مدینہ کی دور جانب تھے، یعنی وہ بدر کے اس کنارے پر تھے جو مکہ کی طرف تھا۔

شیطان وسوسہ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت:

جس جانب مسلمان اترے تھے وہ علاقہ ریگستان تھا، جس میں ان کے پاؤں اور گھوڑوں کے سم ریت میں دھنس جاتے تھے، مسلمانوں پر پیاس کا بھی غلبہ ہو جاتا تھا، اور جس طرف کفار تھے وہ پختہ زمین تھی، یعنی وہ مٹی والی طرف تھی، پانی بھی اس طرف تھا، شیطان نے مسلمانوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ تم کہتے ہو ہم حق پر، اللہ کا نبی ہمارے ساتھ ہے اور ہم اللہ کے محبوب ہیں، حالانکہ پختہ زمین قریش کی جانب ہے، پانی ان کے پاس موجود ہے، تم پیاسے ہو رہے ہو، اور تم ریگستان میں ہو، تمہارے پاؤں زمیں دھنس رہیں، تم کس طرح جنگ کرو گے؟ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے بارش نازل فرمائی، مسلمانوں نے سیر ہو کر پیا، اونٹوں کو پانی پلایا، اور پانی اپنے پاس جمع کر لیا، اور ان کی ریتلی زمین بارش سے سخت ہوگئی، کافروں کی چٹیل زمین میں کیچڑ ہو گیا، اس طرح رب تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں سے شیطان کا وسوسہ زائل کر دیا، اور مسلمانوں کے دلوں کو اطمینان وسکون عطاء فرمایا، رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لِيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ﴾ اور اللہ نے تم پر آسمان سے پانی نازل کیا تا کہ تم اس سے پاکیزگی حاصل کرو، اور وہ تمہارے دلوں سے شیطان کا وسوسہ دور فرمائے۔

نبی کریم ﷺ کی دعاء:

❁ عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ یوم بدر اللھم انشدک عھدک ووعدک اللھم ان شئت لم تعبد فاخذ ابوبکر بیدہ فقال حسبک فخرج وھو یقول سیھزم الجمع ویولون الدبر"

(بخاری باب غزوۃ البدر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ بدر کے دن رب کے حضور عرض کر رہے تھے اے اللہ میں تجھ سے وعدہ پورا کرنے کی درخواست کرتا ہوں، اے اللہ تو چاہتا ہے کہ تیری عبادت نہ کی جائے؟ تو حضرت ابوبکر ﷺ نے آپ کے ہاتھ مبارک پکڑ لیا، اور عرض کیا کہ تمہیں کافی ہے، تو آپ (اپنے عریشہ یعنی قبہ سے) نکلے، تو آپ فرما رہے تھے عنقریب جماعتیں شکست کھا جائیں گی اور پیٹھ پھیر جائیں گی۔

وضاحت حدیث:

"انشدک"بضم الشین ای اطلب منک الوفاء بماعهدت ووعدت من الغلبة علی الکفار والنصر للرسول واظهار الدین"

اے اللہ! جو تو نے مؤمنوں کو کفار پر غالب کرنے کا، اور اپنے رسول ﷺ کی امداد کرنے کا اور دین کو غلبہ عطاء کرنے کا وعدہ فرمایا ہے، میں اس وعدہ کی وفاء تجھ سے طلب کرتا ہوں، یہاں حدیث شریف میں ''عہد اور وعد'' ایک ہی معنی میں استعمال ہے "ان شئت لم تعبد" کا مطلب تقریبا وہی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں واضح طور پر موجود ہے

"اللهم ان تهلک هذه العصابة من اهل الاسلام لاتعبد فی الارض"

اے اللہ اگر تو نے مسلمانوں کی اس جماعت کو ہلاک کر دیا تو زمین میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔

"حسبک"ای یکفیک من القول فاترکه""حسبك" کا مطلب یہ ہے کہ اے نبی کریم ﷺ ''آپ کا اتنا عرض کرنا کافی ہے، اب آپ چھوڑ دیں'' علامہ خطابی کہتے ہیں کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ اللہ تعالی نے جو وعدہ نبی کریم ﷺ سے آپ کی امداد کرنے کا فرمایا اس کے پورا کرنے کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بنسبت رسول اللہ ﷺ کے زیادہ وثوق تھا'' "انه لایجوز ذلک قطعا" بیشک یہ کہنا ہرگز جائز نہیں، بلکہ نبی کریم ﷺ اپنے صحابہ پر شفقت کرتے ہوئے اور ان کو تقویت پہنچانے کیلئے یہ دعاء کر رہے تھے، خاص کر کے اسلام میں یہ پہلا غزوہ تھا "فابتهل فی الدعاء لیسکنهم اذ کانوا یعلمون ان وسیلته مقبولة ودعاءه مستجاب" اسلئے نبی کریم ﷺ بڑی انکساری سے رب تعالی کی طرف رجوع کرتے ہوئے دعاء فرما رہے تھے تاکہ صحابہ کرام کے دلوں کو سکون حاصل ہو جائے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ نبی کریم ﷺ کا وسیلہ مقبول ہے، اور آپ کی دعاء کو قبول کیا جاتا ہے۔ کیا اس طرح کی دعاء کہیں اور بھی فرمائی؟ ہاں ابونعیم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ذکر کی کہ آپ نے غزوہ احد میں یہ دعاء فرمائی

"اللهم انک ان تشاء لاتعبد فی الارض" واللہ اعلم (عینی جزء ۱۷ صفحہ نمبر ۸۱)

نبی کریم ﷺ کیلئے عریشہ بنایا گیا:

عریشہ اس جھونپڑی کو کہتے ہیں جو اکثر طور پر باغ میں ٹہنیوں اور پتوں سے بناتے ہیں، نہایہ میں ہے "العریش کل یستظل به" عریش اسے کہتے ہیں جس کے سایہ میں آرام کیا جائے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی اجازت سے بدر میں آپ کیلئے عریشہ تیار کیا، نبی کریم ﷺ نے ان کے حق میں دعاء خیر فرمائی، آج عریشہ کی جگہ مسجد بنی ہوئی ہے،

جیسا کہ کئی اور مقام پر یادگاروں کو قائم کرنے کیلئے مسجدیں بنی ہوئی ہیں۔ (ماخوذ از مدارج النبوۃ جلد دوم بالاختصار)

قریش کے ایک لشکری نے قریش کو جنگ سے منع کیا:

قریش نے اپنے ایک لشکری کو بھیجا کہ وہ مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ لگا کر بتائے، اس نے ادھر ادھر دیکھ کر بتایا کہ مسلمانوں کی تعداد تین سو کے قریب نظر آتی ہے اس نے کہا اے گروہ قریش میں نے ان بلاؤں کو دیکھا ہے جو اموات کو اٹھائے ہوئے ہیں، اور یثرب کے ان اونٹوں کو دیکھا ہے جو زہر قاتل کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں، مطلب یہ کہ ان کے ساتھ جنگ کرنا تمہاری ہلاکت کا سبب ہے، جب تم سب ہلاک ہو جاؤ گے، تو تمہارے پیچھے زندہ رہنے والوں کا کیا فائدہ ہوگا؟ تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ تم لوٹ چلو اور جنگ نہ کرو، حکیم بن خرام جو اس وقت کافروں میں تھا (بعد میں ایمان قبول کیا) اس نے بھی عتبہ کو یہی مشورہ دیا کہ واپس لوٹ چلو تو بہتر ہے، ورنہ تمہارا نام مٹ جائے گا، عتبہ نے کہا میرا ارادہ تو یہی ہے، البتہ تم ابو حنظلہ یعنی ابو جہل کے پاس جاؤ، اس کو واپس جانے کیلئے تیار کرو، حکیم بن خرام ابو جہل کے پاس آیا اسے واپس لوٹ جانے کا مشورہ دیا ابو جہل کو جب پتہ چلا کہ اسے میرے پاس عتبہ نے بھیجا ہے، تو اس نے عتبہ کے پاس آ کر کہا "انتفخ سحرک" یعنی تمہارے پھیپھڑے میں ہوا بھر گئی، یعنی تم بزدل ہو گئے ہو، عتبہ نے کہا عنقریب پتہ چل جائے گا کس کا پھیپھڑا پھولا ہوا ہے، بزدل کون ہے۔ (ماخوذ از مدارج النبوۃ جلد دوم)

نبی کریم ﷺ کی جنگی مہارت:

جب لشکر اسلام میدان کارزار میں اتر آیا تو نبی کریم ﷺ نے صفوں کو برابر فرمایا، پھر ارشاد فرمایا جب تک میں حکم نہ دوں دشمنوں پر حملہ نہ کرنا، اور اگر وہ تمہارے قریب آ جائیں تو تیر اندازی شروع کر دینا، لیکن اتنے اندازے سے تیر پھینکنا کہ تیر ختم نہ ہو جائیں۔ (مدارج النبوۃ جلد دوم)

اس سے نبی کریم ﷺ کی جنگی مہارت واضح ہوتی ہے، کہ دشمن پر حملہ کرنے میں جلد بازی نہ کرنا بلکہ رکے رہنا، وہ تمہیں ڈرا ہوا، سہا ہوا سمجھیں گے، وہ تمہارے قریب ہونے کی کوشش کریں گے، جب وہ قریب آ جائیں، تو اچانک تیر اندازی شروع کر دو، انہیں سنبھلنے کا موقع نہ ملے، تیروں سے چھلنی ہو جائیں، پھر مسلمانوں کے پاس اسلحہ کم ہونے کی وجہ سے انہیں مشورہ دیا کہ آہستہ آہستہ اسلحہ استعمال کرنا، جلدی سے تمام اسلحہ جنگ میں نہ پھونک دینا، تا کہ دشمن کو پتہ چلے کہ تمہارے پاس بہت اسلحہ ہے۔

نبی کریم ﷺ کے انصاف کی درخشاں مثال:

ارباب سیر نے ایک عجیب وغریب واقعہ بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کی صفیں درست فرما رہے تھے، تو آپ کے ہاتھ مبارک میں ایک چھڑی تھی، سواد ابن غریہ جو خوش طبع اور خوش فہم صحابی ہوئے ہیں، وہ صفوں سے آگے نکل آئے، نبی کریم ﷺ نے وہ چھڑی ان کے سینے پر لگاتے ہوئے فرمایا "استویا سواد" اے سواد صف کو سیدھا کرو، سواد نے عرض کیا یارسول اللہ آپ کی چھڑی سے مجھے تکلیف ہوئی ہے، اللہ تعالی نے آپ کو حق سے بھیجا ہے، عدالت وانصاف آپ کے ہاتھ میں ہے، اس لئے آپ میرا قصاص دیجئے۔

نبی کریم ﷺ نے اسی وقت اپنے لباس مبارک کو اپنے سینہ اقدس سے دور کرتے ہوئے فرمایا اے سواد ابھی تم قصاص لے لو، سواد نے جلدی سے آگے بڑھ کر نبی کریم ﷺ کے سینہ مبارک کو چوم لیا، آپ نے فرمایا اے سواد تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ تو انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ ہو سکتا ہے یہ میرا آخری وقت ہو، میں اس جنگ میں شہید ہو جاؤں، اس لئے میں نے چاہا کہ آخر میں میرا جسم آپ کے جسم سے مس ہو جائے، تو نبی کریم ﷺ ان کیلئے دعاء خیر فرمائی۔ (مدارج النبوۃ جلد۲)

اس سے دو فائدے حاصل ہوئے ایک تو یہ کہ نبی کریم ﷺ نے دوران جنگ اگر کسی کیلئے دعاء فرمائی "رحمہ اللہ" تو اسے شہادت حاصل ہوئی، غزوہ خیبر میں نبی کریم ﷺ نے حضرت عامر رضی اللہ عنہ کیلئے دعاء فرمائی "یرحمہ اللہ" تو ایک صحابی نے کہا "وجبت یا رسول اللہ" یارسول اللہ ﷺ اس کیلئے شہادت واجب ہوئی۔ (باب غزوۃ الخیبر مسلم جلد ۲ صفحہ نمبر ۱۲۰)

معنی وجبت ای ثبتت له الشهادة وستقع قريبا وكان هذا معلوما عندهم ان من دعا له النبي ﷺ هذا الدعاء في هذا الموطن استشهد" (نووی)

"وجبت" کا معنی یہ ہے کہ "اس کیلئے شہادت ثابت ہو چکی ہے" یعنی عنقریب شہادت واقع ہو جائے گی، صحابہ کرام کو یہ معلوم تھا کہ نبی کریم ﷺ نے جنگ میں جس کیلئے بھی رحمت کی دعاء کی، وہ اس جنگ میں شہید ہو گیا۔

دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ صحابی نے نبی کریم ﷺ سے قصاص کا مطالبہ کیا تو آپ نے اپنے آپ کو قصاص کیلئے پیش کر دیا، یہ نبی کریم ﷺ کے عدل وانصاف کی درخشاں مثال ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ صحابی نے قصاص نہ لیا اور لینے کا ارادہ تھا، بلکہ آپ کے جسم کو چومنا مقصود تھا، لیکن قصاص کے مطالبہ پر آپ کا اپنے آپ کو پیش کرنا عظیم عدل ہے۔

ولید، عتبہ، شیبہ کا پہلے نکلنا اور اپنے مقابل طلب کرنا:

جیسا کہ اس وقت جنگ کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ پہلے نامی گرامی بہادر لوگ صفوں سے باہر نکلتے، اور اپنے

مقابل لوگوں کے نکلنے کا مطالبہ کرتے، ایسے ہی بدر میں بھی صورت درپیش آئی، آیئے حدیث پاک دیکھئے۔

❁ عن علی قال لما کان یوم بدر تقدم عتبة بن ربیعة وتبعه ابنه واخوه فنادی من یبارز فانتدب له شباب من الانصار فقال من انتم فاخبروه فقال لاحاجة لنافیکم انما اردنابنی عمنافقال رسول اللہ ﷺ قم یاحمزة قم یاعلی قم یاعبیدة بن الحارث فاقبل حمزة الی عتبة واقبلت الی شیبه واختلف بین عبیدة والولید ضربتان فاثخن کل واحدمنهماصاحبه ثم ملناعلی الولیدفقتلناه واحتملناعبیدة" رواه احمدوابوداؤد" (مشکوة باب القتال فی الجهادصفحه نمبر ۳۴۳)

حضرت علی ﷺ فرماتے ہیں بدر کے دن عتبہ بن ربیعہ صف سے باہر نکلا، اس کے پیچھے اس کا بیٹا (ولید) اور اس کا بھائی شیبہ صفوں سے باہر نکلے، پکارا کون ہے جو ہمارے مقابلہ کیلئے آئے، ان کے اس چیلنج کو چند انصار کے نوجوان نے قبول کیا، (عتبہ نے) کہا تم کون ہو؟ انہوں نے اپنے متعلق خبر دی (کہ ہم انصار سے ہیں) اس نے کہا ہمیں تم سے کوئی مطلب نہیں، ہم تو اپنے خاندان قریش کو اپنے مقابلہ کیلئے بلا رہے ہیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے حمزہ تم اٹھو، اے علی تم اٹھو، اے عبیدہ بن الحارث تم اٹھو، حمزہ عتبہ کے مقابل آگئے، (انہوں نے عتبہ کو قتل کردیا) اور میں شیبہ کے مقابل آگیا (اس طرح حضرت علی ﷺ نے شیبہ کو قتل کردیا) عبیدہ اور ولید کا ایک دوسرے سے مقابلہ ہوا، ہر ایک نے دوسرے کو زخمی کر کے تھکا دیا کمزور کردیا، ہم ولید پر جھپٹ پڑے، ہم نے اسے قتل کردیا، اور ہم عبیدہ کو اٹھا کر (خیمہ میں) لے آئے، عبیدہ شہید ہوگئے۔

تنبیہ: حضرت عبیدہ کی عمر اس وقت اسی سال تھی، عبیدہ کو زخمی حالت میں خیمہ میں لایا گیا تھا، ان کی پنڈلیوں کا مغز بہہ رہا تھا، چونکہ میدان جنگ میں جلدی یہ جان نہ دے سکے، تو ان کو خیال آیا کہ شاید مجھے شہادت حاصل نہیں ہوگی، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ کیا میں شہید نہیں؟ تو آپ نے فرمایا ہاں تم شہید ہو۔
(مدارج النبوۃ جلد دوم)

ابوجہل کا قتل:

❁ عن عبدالرحمن بن عوف انه قال بیناانا واقف فی الصف یوم بدرنظرت عن یمینی وشمالی فاذاانابین غلامین من الانصارحدیثة اسنانهماتمنیت لوکنت بین اضلع منهمافغمزنی احدهمافقال یاعم هل تعرف اباجهل قال قلت نعم وماحاجتک الیه یاابن اخی قال اخبرت انه یسب رسول اللہ ﷺ والذی نفسی بیده لئن رأیته لایفارق

سوادی سواده حتی یموت الاعجل مناقال فتعجبت لذلک فغمزنی لذلک فغمزنی الآخرفقال مثلهاقال فلم انشب ان نظرت الی ابی جهل یزول فی الناس فقلت الاتریان ھذاصاحبکماالذی تسالون عنه قال فابتدراه فضرباه بسیفهماحتی قتلاه ثم انصرفاالی رسول الله ﷺ فاخبراه فقال ایکماقتله فقال کل واحدمنهماانا قتلته فقال هل مسحتماقالالافنظرفی السیفین فقال ایکماقتله فقال کلاکماقتله وقضی بسلبه لمعاذبن عمروبن جموح والرجلان معاذبن عمرالجموح ومعاذبن عفراء" (مسلم جلدثانی صفحه نمبر ۹۲ باب استحقاق القاتل سلب القتل)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف فرماتے ہیں، بیشک میں بدر کی جنگ کے دوران قتال کی صف میں کھڑا تھا، میں نے دائیں اور بائیں دیکھا کہ میں تو دونو جوانوں تھوڑی عمروں کے انصار کے درمیان ہوں، میں نے تمنا کی کاش کہ میں بہادر اور جنگی تجربہ کار شخصوں کے درمیان ہوتا، تو اتنے میں ان دونوں میں سے ایک نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اے میرے چچا کیا تم ابوجہل کو جانتے ہو، میں نے کہا ہاں میں جانتا ہوں، تمہیں اس سے کیا کام ہے؟ اس نے کہا مجھے یہ پتہ چلا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کا گالیاں دیتا ہے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر میں اسے دیکھ لوں تو میرا جسم اس کے جسم سے جدا نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ مر جائے جس کی موت ہم میں سے جلدی آنی ہے، عبدالرحمٰن بن عوف کہتے ہیں میں نے اس کی بات پر بہت تعجب کیا جو اس نے میرے ساتھ کی، اتنے میں دوسرے نے میرے ساتھ کلام کیا اسی طرح جس طرح پہلے نے کیا تھا، یہ کہتے ہیں میں ابوجہل کو دیکھنے لگا کہ وہ کہاں ہے، کیونکہ وہ گھوم پھر رہا تھا، تو میں نے اسے دیکھتے ہی ان نو جوانوں کو بتایا وہ ہے تمہارا صاحب (ابوجہل) جس کے متعلق تم پوچھ رہے تھے، یہ کہتے ہیں ان دونوں نے جلدی اپنی تلواروں سے اس پر حملہ کر دیا یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا، پھر یہ دونوں وہاں سے لوٹ کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو ابوجہل کے قتل کی خبر دی، آپ نے فرمایا تم میں سے کس نے قتل کیا ہے، تو ان میں سے ہر ایک نے کہا میں نے قتل کیا ہے، پھر آپ نے فرمایا کیا تم دونوں نے اپنی اپنی تلواروں کو صاف کر لیا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں، آپ نے دونوں کی تلواروں کو دیکھ کر فرمایا تم دونوں نے ہی اسے قتل کیا ہے، پھر آپ نے ابوجہل کا سامان معاذ بن عمرو بن جموح کو دے دیا، وہ انصاری دونو جوانوں میں سے ایک معاذ بن عمرو بن جموح تھے، اور دوسرے معاذ بن عفراء تھے۔

وضاحت حدیث: ''تمنیت لو کنت بین اضلع منهما'' اضلع کا اصلی معنی بڑی پسلیوں والا، لیکن مراد اس سے بہادر آدمی ہے، بخاری کی بعض روایات میں "اصلح" آیا ہے، زیادہ صلاحیت رکھنے والا، تجربہ

کار، اگرچہ "اضلع"کو زیادہ صحیح قرار دیا گیا ہے، لیکن راقم نے ترجمہ علامہ نووی رحمہ اللہ کے اس قول کے مطابق کیا ہے "ولعله قالهما جميعا ومعنى اضلع اقوى" ہوسکتا ہے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ﷺ نے دونوں لفظ کہے ہوں، ایک راوی نے ایک لفظ استعمال کیا ہو، دوسرے نے دوسرا لفظ استعمال کیا ہو، راقم کا ترجمہ دونوں لفظوں کا اعتبار کرتے ہوئے ہے، آیئے دیکھئے"میں نے تمنا کی کاش میں بہادر اور جنگی تجربہ کار شخصوں کے درمیان ہوتا""لا يفارق سوادی سواده ای شخصی شخصه" میری ذات اس کی ذات سے، میرا جسم اس کے جسم جسم سے جدا نہیں ہوگا، یہاں تک کہ جس کی موت جلدی آنی ہے وہ مر جائے گا، میری موت پہلے آئے یا اس کی موت پہلے آئے۔
(ماخوذ از نووی)

اعتراض: بعض روایات میں آتا ہے کہ ابن مسعود ﷺ نے ابوجہل کو قتل کیا، دونوں روایات میں کس طرح تطبیق دی جائے گی۔

جواب: ابوجہل پر تلوار معاذ بن عفراء نے چلائی، اور معاذ بن عمرو بن جموح نے بھی چلائی، لیکن ابوجہل زمین پر معاذ بن عمرو بن جموح کی تلوار سے گرا (اور ٹھنڈا ہوا اسی وجہ سے ابوجہل کا سامان ان کو دیا گیا، اگرچہ حضور ﷺ نے دونوں کے متعلق فرمایا کہ تم دونوں نے ہی قتل کیا ہے"وجاء ابن مسعود بعد ذلک وفيه رمق فجز رقبته" اس کے بعد ابن مسعود آئے جبکہ ابوجہل کے کچھ آخری سانس موجود تھے تو انہوں نے اس کی گردن کاٹ دی۔ (ماخوذ از نووی)

اعتراض: اس روایت میں ذکر ہے کہ ابوجہل معاذ بن عمرو جموح اور معاذ بن عفراء نے قتل کیا ہے، لیکن دوسری روایت میں یہ ہے کہ عفراء کے دونوں بیٹوں نے قتل کیا ہے، تو کس طرح دونوں روایات میں تطبیق دی جاسکتی ہے، آیئے پہلے وہ روایت دیکھئے پھر جواب دیا جائے گا۔

❁ **عن انس بن مالک قال قال رسول الله ﷺ من ينظر لنا ماصنع ابو جهل فانطلق ابن مسعود فوجده قد ضربه ابنا عفراء حتى برد قال فاخذ بلحيته فقال انت ابو جهل فقال وهل فوق رجل قتلتموه او قال قتله قومه قال وقال ابو مجلز قال ابو جهل فلو غير اكار قتلنی"**

حضرت انس بن مالک ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کون ہے جو دیکھ کر یہ بتائے ابوجہل سے کیا ہوا؟ ابن مسعود گئے، انہوں نے اسے اس حالت میں پایا کہ عفراء کے دو بیٹوں نے اسے تلواریں مار کر ٹھنڈا کر دیا ہے (لیکن ابھی وہ مکمل نہیں مرا تھا) ابن مسعود نے اس کی داڑھی کو پکڑ کر کہا کیا تو ابوجہل ہے؟ اس نے کہا کیا تم نے ایک

بڑے شخص کو قتل نہیں کیا؟ یا اس نے کہا کیا اسے اس کی قوم نے قتل کیا ہے ابو مجلز کی روایت میں ہے کہ ابو جہل نے کہا کاش مجھے دہقانی قتل نہ کرتے، یعنی انصار کے نوجوان جو کھیتی باڑی کرتے ہیں کاش کہ وہ مجھے قتل نہ کرتے بلکہ قریش کے لوگ مجھے قتل کرتے، کیسا متکبر تھا مرتے دم بھی اس کا تکبر اس کے رگ وریشہ سے نہ نکلا۔

عبداللہ سندھی کا جواب لیکن ضعیف:

قولہ قد ضرب ابنا عفراء یمکن ان یکون به تغلیب بناء علی ماسبق ان احدهما کان ابن عفراء والآخر غیرہ فھذا التغلیب فی الاضافة کمایغلب اطلاق نفس الاسم کمافی عمرین ونحوہ" (حاشیه مسلم سندی)

عفراء کے دو بیٹوں کو جو ذکر ہے اس میں قاعدہ تغلیب جاری کیا گیا ہے جیسے ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو عمرین کہا گیا ہے، اسی طرح اس روایت میں معاذ بن عفراء اور معاذ بن عمرو بن جموح کو "ابنا عفرا" کہہ دیا گیا ہے، حالانکہ ایک ابن عفراء ہے دوسرا ابن عفراء نہیں۔

صحیح جواب:

(والرجلان) ای الغلامان (معاذبن عمروبن الجموح ومعاذبن عفراء) ھی امه وھما اخوان امھما واحد وابوھمامختلف"

(مشکوۃ باب قسمة الغنائم والغلول فیھا، مرقاۃ جلد ۸ صفحه نمبر ۵۸)

معاذ بن عمرو بن جموح اور معاذ بن عفراء دونوں بھائی تھے، دونوں کی ماں عفراء تھی، البتہ باپ دونوں کے علیحدہ علیحدہ تھے، ایک روایت میں معاذ بن عمرو بن جموح ذکر کیا گیا جس میں نسبت باپ کی طرف کی گئی، اور دوسری روایت میں "ابنا عفراء" کہا گیا ہے، یعنی عفراء کے دونوں بیٹے، اس روایت میں ماں کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

فرشتوں کو دیکھنا اور ان کی آواز سننا:

❁ وعن ابن عباس ان النبی ﷺ قال یوم بدر ھذا جبریل آخذ براس فرسه علیه اداۃ "

(رواہ البخاری، مشکوۃ باب المعجزات)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، بیشک نبی کریم ﷺ نے بدر کے دن فرمایا یہ جبریل ہیں اپنے گھوڑے کے سر کو پکڑے ہوئے ہیں، جبریل پر آلات حرب ہیں، یعنی وہ اسلحہ سے مسلح ہیں۔

"ولعله ﷺ اظھرہ لانس حتی ابصرہ کمایشیر الیه قوله ھذا لانه فی الاصل موضوع للمحسوس

وبھذایتبین وجہ ایرادالحدیث فی باب المعجزات" (مرقاۃ جلد 11 صفحہ نمبر ۱۶۶)

شاید نبی کریم ﷺ نے (اپنے ہم رکاب) حضرت انس ؓ پر ظاہر فرمایا ہو، اور انہیں جبریل دکھائے ہوں، اسی وجہ سے "ھــذا" سے اشارہ کیا گیا، جو اصل میں محسوس چیز کی طرف اشارہ کیلئے وضع کیا گیا ہے، حضرت انس ؓ کو دکھانا آپ کا معجزہ تھا اسی وجہ سے مشکوۃ میں یہ حدیث کتاب المعجزات میں ذکر ہے۔

وعن ابن عباس قال بینمارجل من المسلمین یومئذیشتدفی الرجل من المشرکین امامہ اذسمع ضربۃ بالسوط فوقہ وصوت الفارس یقول اقدم حیزوم اذنظر الی المشرک امامہ خرمستلقیا فنظر الیہ فاذاھو قدخطم انفہ وشق وجہہ کضربۃ السوط فاخضرذلک اجمع فجاء الانصاری فحدث رسول اللہ ﷺ فقال صدقت ذلک من مددالسماء الثالثۃ فقتلوایومئذسبعین " (رواہ مسلم مشکوۃ کتاب المعجزات)

حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں، مسلمانوں میں سے ایک شخص اس دن ایک مشرک کے پیچھے تیز تیز دوڑ رہا تھا جو اس کے آگے آگے تھا، مسلمان نے اچانک مشرک پر کوڑا کی ضرب (مار) کی آواز سنی، اور ایک سوار کی آواز سنی جو یہ کہہ رہا تھا "اقدم حیزوم" حیزوم آگے بڑھو، مسلمان نے مشرک کو دیکھا جو اس کے آگے تھا، وہ سیدھا گر چکا تھا، اور مسلمان نے اسے دیکھا کہ اس کی ناک کٹ چکی تھی، اور اس کے چہرے پر کوڑا چلنے کا نشان موجود تھا، وہ مشرک تمام سیاہ ہو چکا تھا، وہ انصاری نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور آپ کے سامنے واقعہ بیان کیا، تو آپ نے فرمایا ہاں تم نے سچ کہا، یہ تیسرے آسمان سے امداد آئی تھی، اس دن ستر آدمی کافروں کے قتل کر دئے گئے اور ستر قید کر لئے گئے۔

وضاحت حدیث:

چند مشکل الفاظ یا ان میں ضمیروں کے مرجع کی طرف طلباء کرام توجہ دیں تا کہ معنی درست کیا جا سکے "یشتد ای یسرع ویعدو" یشتد کا معنی یہاں یہ ہے "تیز چلنا، اور دوڑنا" "فی اثر رجل" بعض حضرات نے بیان کیا کہ "رجل" کی راء کے نیچے کسرہ ہے اور جیم ساکن ہے یعنی مشرک پیدل دوڑ رہا تھا، اور مسلمان بھی اس کے قدموں کے نشانوں پر تیز دوڑ رہا تھا بعض حضرات نے "راء" کے فتحہ سے پڑھا ہے کہ وہ اس مشرک کے پیچھے دوڑ رہا تھا، (اذسمع) ای المسلم (ضربۃ) ای صوت ضربۃ بالسوط (فوقہ) ای فوق المشرک" مسلمان نے اچانک مشرک پر کوڑا کی مار کی آواز سنی۔ مسلمان نے سوار کی آواز سنی کہ وہ کہہ رہا ہے "اقدم حیزوم" "وحیزوم اسم فرس الملک" حیزوم فرشتے کے گھوڑے کا نام ہے اور "اقدم

" کو دو طرح پڑھا گیا ہے، ایک ہمزہ اور دال کے ضمہ (پیش) سے، معنی اس کا ہے "تقدم" آگے بڑھ" **راقم** نے یہی ترجمہ کیا ہے۔

دوسرا ہمزہ کے فتحہ (زبر) اور دال کے کسرہ (زیر) سے اس، اس کے پھر دو مطلب بیان کئے گئے ہیں ایک مطلب یہ ہے کہ اس کا معنی "اعزم" سیدھے ہو کر، مضبوط ہو کر رہو، اور دوسرا مطلب علامہ نووی نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ گھوڑے کیلئے کلمہ زجر ہے۔ "**فاخضر ذلک اجمع**" "**احضر**" کی راء مشدد ہے، احضرار کا معنی سبز ہو جانا یا سیاہ ہو جانا، کیونکہ "**فان الخضرة قد تستعمل بمعنی السواد کعکسه للمبالغة**" بیشک خضرۃ کبھی سواد کے معنی میں آتا ہے، اور سواد کبھی خضرۃ کے معنی میں استعمال ہوتا رہتا ہے (سواد کا معنی سیاہ، خضرۃ کا معنی سبز) اگرچہ علامہ قاری رحمہ اللہ نے یہ بیان کیا ہے "**ای صار موضع الضرب کله اخضر او اسود**" جہاں اسے کوڑا لگا (اور اس کا ناک کٹا اور چہرہ زخمی ہوا) وہ تمام جگہ سبز یا زخمی ہوگئی۔ راقم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے یہ خیال کرتے ہوئے کہ فرشتہ کے کوڑے کی ضرب کی وجہ سے وہ مشرک مکمل سیاہ ہوگیا۔ (واللہ اعلم)

انصاری نے جب نبی کریم ﷺ کو واقعہ بتایا تو آپ نے فرمایا "**صدقت ذلک من مدد السماء الثالثة**" تم نے سچ کہا یہ تیسرے آسمان سے امداد آئی" اس میں صحابی کی کرامت سمجھ آرہی ہے کہ انہوں نے فرشتے کی آواز سنی، اس کی ضرب کو دیکھا، اور نبی کریم ﷺ کا معجزہ واضح ہو رہا ہے "**لان المدد کان من السماوات کلها وهذامن الثالثة خاصة**" کیونکہ امداد تو تمام آسمانوں سے آرہی تھی لیکن یہ امداد جو اس صحابی کو حاصل ہوئی وہ خاص کر کے تیسرے آسمان سے آئی تھی، یہی وجہ ہے جبکہ صاحب مشکوۃ نے اس حدیث کو کتاب المعجزات میں ذکر کیا ہے۔ (مرقاۃ جلد ۱۱ صفحہ نمبر ۱۶۶، ۱۶۷)

استاذی المکرم کا استدلال:

اس حدیث کی وضاحت میں استاذی المکرم حضرت علامہ محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی نے فرمایا تھا کہ فرشتوں کا ناک اور چہرے پر ضرب لگانا اس پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ مسلمانوں کے دلوں کو تسلی دینے کیلئے آئے تھے، لڑنے کیلئے نہیں آئے تھے، کہیں کہیں ضرب سے کام لیا، وہ بھی معمولی، اگر لڑنے کیلئے آتے تو گلا کاٹتے، ناک کاٹنے، چہرہ زخمی کرنا کیا مقصد ہے؟

غزوہ احد میں بھی فرشتوں کو دیکھا گیا:

"**وعن سعد بن ابی وقاص قال رایت عن یمین رسول الله وعن شماله یوم احد رجلین**

علیهما ثیاب بیض یقاتلان کاشد القتال ما رأیتهما قبل ولا بعد یعنی جبریل ومیکائیل"
(بخاری، مسلم، مشکوۃ کتاب المعجزات)

حضرت سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کی دائیں جانب اور دوسری جانب غزوہ احد کے دن دو آدمیوں کو دیکھا ان پر سفید کپڑے تھے، بہت شدید قتال کر رہے تھے، میں نے یہ منظر نہ اس سے پہلے دیکھا، نہ بعد۔ "والاظهر ان معناه قتالا مثل اشد قتال رجال الانس" اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ انسانوں کی طرح انسانی طاقت کے مطابق شدید لڑائی کر رہے تھے ورنہ ایک پر کی نوک سے مشرکین کو زیروزبر (اوپر نیچے) کردیتے۔ (مرقاۃ جلد ۱۱ صفحہ نمبر ۱۶۷)

پانچ ہزار فرشتے آئے یا نہیں:

زیادہ مفسرین کرام نے تو یہی لکھا ہے کہ پہلے ایک ہزار فرشتوں سے پھر تین ہزار فرشتوں سے اور پھر پانچ ہزار فرشتوں سے امداد کی گئی، یعنی پانچ ہزار فرشتے کل تعداد میں تھے۔ لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ کا موقف یہ ہے۔

"فجعل مجیئ خمسة آلاف من الملائكة مشروطا بثلاثة اشياء الصبر والتقوی و مجیئ الكفار علی الفور فلما توجد هذه الشرائط لا جرم لم يوجد المشروط"

پانچ ہزار فرشتوں کا آنا تین شرطوں سے مشروط تھا، (۱) صبر (۲) تقوی (۳) کافروں کا فوراً حملہ کرنا۔ جب یہ تینوں شرطیں مجموعی طور پر نہیں پائی گئیں، کیونکہ کافروں کا فوراً اور اچانک حملہ کرنا ثابت نہیں، جب شرط نہیں پائی گئی تو مشروط یعنی پانچ ہزار فرشتوں کا آنا بھی ثابت نہیں۔ (کبیر) (واللہ اعلم بالصواب)

نبی کریم ﷺ کا کفار کیلئے دعاء ہلاکت کرنا:

عن عبدالله بن مسعود ﷺ قال استقبل النبی ﷺ الكعبة فدعا علی نفر من قريش علی شيبة بن ربيعة وعتبة بن ربيعة والوليد بن عتبة وابی جهل بن هشام فاشهد بالله لقد رأيتهم صرعی قد غيرتهم الشمس وكان يوما حارا" (بخاری، باب دعاء النبی ﷺ علی کفار قریش الخ)

حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ نے فرمایا نبی کریم ﷺ نے کعبہ شریف کی طرف متوجہ ہو کر (بدر کے دن) قریش کے چند لوگوں یعنی شیبہ بن ربیعہ اور عتبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ اور ابوجہل بن ہشام کیلئے دعاء ہلاکت کی (کہ اے اللہ ان کو ہلاک کردے) میں گواہی دیتا ہوں کہ تحقیق میں نے ان سب کو ہلاک ہوئے دیکھا، ان کے جسموں کو دھوپ نے بدل دیا تھا، وہ دن بڑا گرم تھا۔

قدرت کا عجیب فیصلہ:

حضرت بلال ﷺ امیہ بن خلف کے غلام تھے، حضرت بلال ﷺ کے ایمان لانے پر اس نے آپ پر بڑے مظالم ڈھائے، حضرت بلال ﷺ کی مظلومیت کو دیکھ کر حضرت ابو بکر ﷺ نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا، لیکن حضرت بلال نے بدر کے دن کچھ اور ساتھیوں کی مدد سے امیہ بن خلف کو قتل کر دیا۔

❁ عن عبدالرحمن بن عوف قال کاتبت امیة بن خلف فلما کان یوم بدر فذکر قتله ابنه فقال بلال لانجوت ان نجاامیة" (بخاری باب قتل ابی جھل)

عبدالرحمن بن عوف کہتے ہیں میں نے امیہ بن خلف سے معاہدہ کیا ہوا تھا، جب بدر کا دن ہوا تو اس کے اور اس کے بیٹے کے قتل کا ذکر کیا گیا (کہ ان کو قتل کر دیا جائے) تو حضرت بلال نے کہا میری نجات نہیں اگر امیہ نے نجات پالی۔

وضاحت حدیث:

کاتبت معناه عاهدت امیة بن خلف(بفتحتین)ولفظ الذی فی کتاب الوکالة کاتبت امیة بن خلف کتابابان یحفظنی فی صاغیتی بمکة واحفظه فی صاغیته" وصاغیة الرجل خاصته والذین یمیلون ویاتونه"

"کاتبت" کا معنی ہے کہ میں نے امیہ بن خلف سے (خاء اور لام پر زبر) معاہدہ کیا' بخاری کتاب الوکالۃ میں یہ حدیث زیادہ الفاظ سے زیادہ واضح ہے، اس میں آگے والے الفاظ "کاتبت" سے لے کر "فی صاغیته" تک ہیں "صاغیة الرجل" انسان کے خاص آدمی جو اس کی طرف میلان کریں اور اس کے پاس آئیں، لیکن اس مقام پر حملہ کرنے والے خاص لوگ ہیں، وہ معاہدہ ایک دستاویز کی صورت میں لکھا گیا، کہ اگر مکہ میں مجھ پر کوئی حملہ کرے تو تم مجھے بچانا، اور تم پر کسی نے حملہ کیا تو میں تمہاری حفاظت کروں گا۔ آگے بخاری کتاب الوکالۃ کی حدیث میں مزید وضاحت موجود ہے۔

"قال فلما کان فی یوم بدر خرجت الی جبل لاخرزه حین نام الناس فابصره بلال فخرج حتی وقف علی مجلس من الانصار فقال "امیة بن خلف" لانجوت ان نجاامیة فخرج معه فریق من الانصار فی آثار فلماخشیت ان یلحقوناخلفت لهم ابنه لاشغالهم فقتلوه ثم ابواحتی یتبعوناوکان رجلاثقیلافلماادرکوناقلت له ابرک فبرک فالقیت علیه نفسی لامنعه فتخللوه بالسیوف من تحتی حتی قتلوه"

عبد الرحمن بن عوف کہتے ہیں جب بدر کا دن واقع ہوا تو میں ایک پہاڑ کی طرف نکلا کہ جب لوگ سوئے ہوئے ہوں (یعنی دوپہر قیلولہ کے وقت) تو میں اسے بچالوں، یعنی پہاڑ میں کہیں چھپادوں، لیکن بلال نے اسے دیکھ لیا، یہ انصار کی ایک مجلس میں جا کھڑے ہوئے، اور کہا ''وہ امیہ بن خلف ہے'' ''میری نجات نہیں اگر امیہ نے نجات پالی'' انصار کے چند آدمی (حضرت بلال کے ساتھ) ہمارے پیچھے چل پڑے، جب مجھے خوف لاحق ہوا کہ یہ تو ہمیں مل جائیں گے، تو میں نے امیہ کے بیٹے کو پیچھے چھوڑ دیا کہ وہ لوگ اس کے ساتھ مشغول ہو جائیں گے (یعنی اس سے پوچھیں گے تمہارا باپ کہاں ہے، اسے قتل کرنے کا وہ ارادہ نہیں رکھیں گے) لیکن انصار صحابہ نے امیہ کے بیٹے کو قتل کر دیا، پھر انہوں نے پیچھے ہٹنے سے انکار کر دیا، یہاں تک کہ وہ ہم تک پہنچ گئے، امیہ بن خلف جسیم شخص تھا، جب انہوں نے ہمیں پالیا (یعنی بہت ہی ہمارے قریب ہو گئے) تو میں نے اسے کہا ایسے بیٹھ جا جیسے اونٹ بیٹھتے ہیں، وہ اسی طرح بیٹھ گیا، میں نے اپنے آپ کو اس کے اوپر ڈال دیا تا کہ میں اسے بچا سکوں، لیکن صحابہ کرام نے میرے نیچے سے تلواریں گھسا کر اسے قتل کر دیا۔

"قال الکرمانی فقتله بلال لانه کان قدعذب بلالا کثیرافی المستضعفین بمکة"

علامہ کرمانی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ حضرت بلال ﷺ نے امیہ بن خلف کو قتل کر دیا، کیونکہ اس نے مکہ میں حضرت بلال ﷺ کو کمزور سمجھ کر بہت زیادہ تکالیف پہنچائی تھیں، کیا خوب کسی نے کہا۔

هنيئا زادک الرحمن فضلا   فقد ادرکت ثارک یابلال

مبارک ہو تم پر کتنا زیادہ اللہ کا فضل ہے تم نے پالیا ہے اپنے مظالم کا بدلہ اے بلال

اعتراض: پہلے جو حدیث بیان کی گئی اس میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد گذر گیا کہ میرے صحابہ امیہ بن خلف کو قتل کریں گے بخاری کی کتاب الوکالۃ میں مذکور حدیث میں بھی جمع کا صیغہ ہے "حتی قتلوہ" تو علامہ کرمانی رحمہ اللہ کا قول کیسے صحیح ہے کہ حضرت بلال ﷺ نے امیہ بن خلف کو قتل کیا۔

جواب: **ان الحدیث لایدل علی ان بلالااختص بقتل امیة ویمکن ان یکون بلال مع الذین تخللوہ بالسیوف تحت عبدالرحمن ابن عوف فصارمن جملة القاتلین"**

یہ بات قابل تسلیم ہے کہ حدیث پاک سے یہ واضح نہیں کہ صرف اکیلے حضرت بلال ﷺ بھی شریک تھے لھذا ان کی طرف نسبت کرنا درست ہے۔ (ماخوذ از عمدۃ القاری جلد ۱۷)

یہ بات ذہن میں رہے کہ حضرت بلال ﷺ کو مکہ مکرمہ میں ہی حضرت ابو بکر ﷺ نے خرید کر آزاد کر دیا تھا، اسلئے آپ کے ارشاد "لا نجوت ان نجا امية" کا یہ مطلب نہیں کہ امیہ اگر نجات پا گیا تو مجھ پر پہلے کی طرح

مظالم ڈھائے گا تو مجھے اس سے نجات حاصل نہیں ہوگی۔ بلکہ آپ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ مجھ پر ظلم کرنے والا آج بچ نہ جائے، وہ بچ گیا تو مجھے افسوس رہے گا کہ وہ ظالم کیوں قتل نہیں ہوا، اس طرح میں افسوس سے نجات حاصل نہیں کر سکوں گا۔ بدر میں قریش کے سردار قتل ہونے والوں پر حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی دعاء ہلاکت کا بھی اثر تھا:

❁ عن عبدالله قال بينمارسول الله ﷺ ساجدو حوله ناس من قريش اذجائه عقبة ابن معيط بسلاجزور فقذفه على ظهررسول الله ﷺ فلم يرفع رأسه فجاء ت فاطمة فاخذته عن ظهره ودعت على من صنع ذلک فقال اللهم عليک الملأ من قريش اباجهل بن هشام وعتبة بن ربيعة وشيبة بن ربيعة بن ابى معيط وامية بن خلف شعبة الشاک قال فلقدرايتهم قتلوايوم بدرفالقوافى بئرغيران امية او ابياتقطعت اوصاله فلم يلق فى البئر"

(مسلم جلد ۲ صفحه نمبر ۱۱۶ باب مالک النبى ﷺ اذى من المشركين و المنافقين)

حضرت عبداللہ (بن مسعود) ﷺ فرماتے ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نماز ادا کر رہے تھے، آپ سجدہ میں گئے، آپ کے اردگرد قریش کے کچھ لوگ تھے، عقبہ بن ابی معیط ایک اونٹنی کی جیلی لے کر آ گیا، اور نبی کریم ﷺ کی پیٹھ پر رکھ دی، آپ نے سر نہیں اٹھایا یہاں تک کہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا آئیں تو آپ نے حضو ﷺ کی پیٹھ سے اس جیلی کو ہٹایا، اور آپ ان لوگوں کے خلاف دعاء کر رہی تھیں جنہوں نے یہ کام کیا تھا، اے اللہ قریش میں سے ابو جہل بن ہشام اور عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ اور عقبہ بن ابی معیط اور امیہ بن خلف یا ابی بن خلف کو تو اپنی گرفت میں لے لے "یہ شعبہ راوی کو شک گذار کہ امیہ بن خلف ہے یا ابی بن خلف ہے" راوی بیان کرتے ہیں کہ تحقیق میں نے دیکھا کہ ان میں سے اکثر لوگ بدر کے دن قتل کر کے ایک کنویں میں ڈال دیئے گئے، البتہ امیہ یا ابی کے جوڑ کٹ گئے تھے اسے کنویں میں نہیں ڈالا گیا۔

وضاحت حدیث:

السلابفتح السين المهملة وتخفيف اللام مقصور وهو اللفافة التى يكون فيهاالولدفى بطن الناقة وسائر الحيوان وهى من الآدمية مشيمة "

سلالام مقصورہ سے ہے، اسی وجہ سے المنجد میں رسم الخط بھی "سلی" استعمال کیا گیا ہے، یہ اس لفافہ کو کہتے ہیں جس میں اونٹنی وغیرہ کے پیٹ میں بچہ ہوتا ہے، ہماری زبان میں اسے "جیلی" کہتے ہیں بلکہ پنجابی میں "جیر" کہتے ہیں، اور انسانوں میں اس لفافہ کو "مشیمہ" کہتے ہیں۔

اعتراض: جیلی میں تو خون اور رطوبت ہوتی ہے جو نجس ہیں، تو نبی کریم ﷺ نے پیٹھ پر نجس جیلی کے ہوتے

ہوئے نماز کیسے جاری رکھی؟

جواب: انہ ﷺ لم یعلم ماوضع علی ظھرہ فاستمر فی سجودہ اتصحابا للطھارۃ"

بیشک نبی کریم ﷺ کو معلوم نہ ہوسکا کہ آپ کی پیٹھ پر جیلی رکھ دی گئی، آپ تو طہارت سے نماز ادا کر رہے تھے۔

راقم نے علامہ نووی رحمہ اللہ کے قول "لم یعلم" پر اپنے قلمی حاشیہ میں یہ لکھا۔

" قولہ لم یعلم لان النبی ا اذا کان یصلی فیتوجہ توجھا کاملا الی اللہ ، ولھذا لم یعلم لغیر اللہ فی الصلوۃ "

آپ کامل توجہ سے فناء فی اللہ کے درجہ میں نماز ادا کرتے تھے، آپ کو اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی طرف توجہ نہ ہو سکی، لھذا یہ معلوم نہ ہوسکا کہ میری پیٹھ پر کوئی چیز رکھ دی گئی، البتہ یہ خیال رہے کہ علامہ نووی کا مختار یہ ہے کہ آپ نے محسوس ہونے پر بعد میں نماز کو لوٹا لیا تھا، اگر چہ اس وقت نماز کو نہیں لوٹایا کیونکہ وقت میں وسعت تھی۔ (نووی)

مقام توجہ: مسلم شریف کی اس حدیث سے پہلے مذکور حدیث میں ہے "قال ابو اسحاق الولید بن عقبۃ غلط فی ھذاالحدیث " ابواسحاق نے کہا ہے کہ اس حدیث میں ولید بن عقبہ (بالقاف) درست نہیں، اس کے بعد حدیث میں صحیح نام مذکور ہے "ولید بن عتبہ" (بالتاء)

"قال العلماء والولیدبن عقبۃ بالقاف ھو ابن ابی معیط لم یکن ذلک الوقت موجودااو کان طفلاصغیرا جدا"

ولید بن عقبہ (بالقاف) جو ابن ابی معیا تھا اس وقت موجود نہیں تھا، یا بہت چھوٹا بچہ تھا۔

اعتراض: حدیث شریف میں ہے "قال فلقدرأیتم قتلوا یوم بدر فالقوافی بئر" راوی کہتے ہیں میں نے ان تمام کو دیکھا کہ وہ قتل کردئے گئے اور ایک کنویں میں پھینک دئے گئے، حالانکہ عمارۃ بن ولید بدر میں قتل نہیں کیا گیا بلکہ یہ حبشہ کے کسی جزیرہ میں مرا ہے۔

جواب: ان المرادانہ رای اکثرھم بدلیل ان عقبۃ بن ابی معیط منھم ولم یقتل ببدر"

راوی نے جو جمع کا صیغہ ذکر کیا ہے اس سے مراد اکثر لوگ ہیں، کیونکہ عقبہ بن ابی معیط بدر میں قتل نہیں کیا گیا۔ (نووی)

راقم کے نزدیک صحیح جواب:

راقم کے نزدیک صحیح جواب یہ ہے کہ اس روایت میں عمارہ بن ولید کا ذکر ہی نہیں بلکہ بخاری کی ایک روایت

میں عمارہ بن ولید کا ذکر ہے، اور ولید بن عقبہ بن ابی معیط کا ذکر ہی سہوا ہے، اس لئے اس روایت کے مطابق راوی نے سب کو (جو اس روایت میں ہیں) بدر میں دیکھا کہ انہیں قتل کر کے ایک کنویں میں پھینک دیا گیا۔

تنبیہ: ولید بن عقبہ بن ابی معیط بدر میں نہیں تھا، البتہ اس کا باپ عقبہ بن ابی معیط بدر میں تھا، یہ بھی قتل نہیں ہوا تھا، البتہ قیدی بنایا گیا تھا "وانماقتله النبی ﷺ صبرا بعد انصرافه من بدر یعرق الظبیة" بدر سے لوٹتے ہوئے مقام "عرق الظبیه" میں اسے نبی کریم ﷺ نے قتل کر دیا، یعنی آپ نے اسے قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا (نووی) عقبہ بن ابی معیط کا تذکرہ اس روایت میں ہے۔

❁ عن عبدالله قال استقبل رسول الله ﷺ البیت فدعا علی ستة نفر من قریش فیهم ابوجهل وامیة بن خلف وعتبة بن ربیعة وشیبة بن ربیعة وعقبة ابن ابی معیط فاقسم بالله لقد رأیتم صرعی علی بدر قد غیرتهم الشمس وکان یوما حارا"

(مسلم جلد ۲ صفحہ نمبر ۱۱۷ باب مالقی النبی ﷺ من اذی المشرکین والمنافقین)

حضرت عبداللہ ﷺ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے بیت اللہ شریف کا استقبال کیا (یعنی توجہ بیت اللہ شریف کی طرف کی) پھر قریش کے چھ آدمیوں کی خلاف دعاء ہلاکت کی، وہ چھ یہ ہیں، ابوجہل اور امیہ بن خلف اور عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ اور عقبہ بن ابی معیط'' میں اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھاتا ہوں کہ تحقیق میں نے ان (میں سے اکثر) کو بدر میں ہلاک ہوئے دیکھا، دھوپ نے ان کے جسموں کو بدل دیا تھا (یعنی ان کے جسم بدبودار ہو گئے تھے) وہ دن بہت گرم تھا۔

بیر اور قلیب میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟

ابھی جس حدیث پر بحث ہو رہی ہے اور اس کے ضمن میں کچھ روایات آ رہی ہیں، اس میں ذکر ہے "بیر" کا کہ انہیں "بیر" میں ڈال دیا گیا، اور دوسری روایت میں قلیب کا ذکر ہے۔

"فوالذی بعث محمدا بالحق لقد رایت الذی سمی صرعی یوم بدر ثم سحبوا الی القلب قلیب بدر"

راوی کہتے ہیں قسم ہے اس ذات کی جس نے محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا تحقیق میں نے ان کو بدر میں ہلاک ہوتے دیکھا جن کا نام نبی کریم ﷺ نے اپنی دعاء (جو ان کے خلاف کی گئی) میں کیا، پھر ان کو کھینچ کر قلیب میں ڈال دیا گیا، قلیب سے مراد بدر کا قلیب ہے۔

خیال رہے اسی روایت میں "وذکر السابع ولم احفظه" کہ ساتویں شخص کا بھی آپ نے دعاء ہلاکت

میں کیا لیکن مجھے یاد نہیں، اس پر علامہ نووی نے لکھا "وقد وقع فی روایة البخاری تسمیة السابع انه عمارة بن الولید" بخاری میں ساتویں کا ذکر ہے، اس کا نام عمارہ بن ولید ہے۔

جواب: بیر اور قلیب میں ایسا فرق نہیں جس سے تضاد لازم آئے، بلکہ فرق صرف عام و خاص کا ہے خاص عام کے ضمن میں پایا جاتا ہے، بیر عام ہے ہر کنویں کو کہتے ہیں خواہ کنواں صرف کھودا گیا ہو اور اس میں دیواروں کی چنائی نہ کی گئی ہو، یا دیواروں کی چنائی کر کے اسے تیار کر دیا گیا ہو، لیکن قلیب خاص ہے کہ یہ صرف اس کنویں کو کہتے ہیں جو کھودا گیا ہو لیکن اس میں دیواروں کی چنائی نہ کی ہو، بدر میں جس کنویں میں کفار کو ڈالا گیا تھا اس میں دیواروں کی چنائی نہیں تھی، اسی لئے بعض روایات میں اس پر بیر کا اطلاق ہے اور بعض میں اس پر قلیب کا اطلاق کیا گیا۔ (ماخوذ از نووی بالوضاحت)

چوبیس صنادید قریش کو کنویں میں ڈالا گیا:

عن ابی طلحة ان نبی الله ﷺ امر یوم بدر باربعة وعشرین رجلا من صنادید قریش فقذفوا فی طوی من اطواء بدر خبیث مخبث وکان اذا ظهر علی قوم اقام بالعرصة ثلاث لیال فلما کان ببدر الیوم الثالث امر براحلته فشد علیها رحلها ثم مشی واتبعه اصحابه وقالوا ما نری ینطلق الا لبعض حاجته حتی قام علی شفة الرکی فجعل ینادیهم باسمائهم واسماء آبائهم یافلان ویافلان بن فلان ایسرکم انکم اطعتم الله ورسوله فانا قد وجدنا ما وعدنا ربنا حقا فهل وجدتم ما وعد ربکم حقا قال فقال عمر یارسول الله ﷺ ما تکلم من اجساد لا ارواح لها فقال رسول الله ﷺ والذی نفس محمد بیده ما انتم باسمع لما اقول منهم" (بخاری کتاب المغازی باب قتل ابی جهل)

حضرت ابوطلحہ بیان کرتے ہیں کہ بدر کے دن نبی کریم ﷺ نے چوبیس صنادید (سرداران) قریش کے متعلق حکم دیا کہ ان کو بدر کے ایک ناپاک اور ناپاک کرنے والے کنوئیں میں ڈال دیا جائے، آپ جب جنگ سے فارغ ہوتے تو کامیابی کی صورت میں وہاں تین دن تک ٹھہرتے، جب تیسرا دن ہوا تو آپ نے سواری تیار کرنے کا حکم دیا، آپ کیلئے سواری تیار کر دی گئی، آپ سواری پر سوار ہو کر چلے، صحابہ آپ کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے، صحابہ کرام کہہ رہے تھے آپ کسی حاجت کو پورا کرنے کیلئے چلے ہیں، یہاں تک کہ آپ کنویں کے کنارے پر کھڑے ہوئے، آپ ان کے اور ان کے آباء (باپوں) کے نام لے پکار رہے تھے۔ اے فلاں ابن فلاں، اے فلاں ابن فلاں کیا تمہیں اب یہ پسند آ رہا ہے کہ کاش تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے، ہمارے ساتھ جو ہمارے رب نے وعدہ فرمایا ہم

نے اسے حق پالیا، کیا تمھارے ساتھ جو تمھارے رب نے وعدہ کیا تم نے اسے حق پالیا ہے؟ حضرت عمر ﷺ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ کیا آپ ان جسموں سے کلام فرمارہے ہیں جن میں روح نہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے تم ان سے زیادہ میری بات کونہیں سن رہے۔

وضاحت حدیث:

صنادید جمع ہے صندید (بروزن عفریت کے) "وھو السید الشجاع العظیم " اس کا معنی سردار، بہادر اور بڑا یعنی کفار قریش کے سردار اور بہادر اور بڑے لوگ جنگ میں مارے گئے تھے، خیال رہے کہ کفار بدر میں ستر کی تعداد میں قتل کردئے گئے تھے لیکن کنویں میں چوبیس ان کے سرکردہ لوگ ڈال دئے گئے تھے۔ "خبیث و مخبث" اس کنویں کو خبیث ومخبث کہا گیا، اسلئے کہ وہ نجاست وغیرہ کے پھینکے جانے کی وجہ سے ناپاک تھا، اور اس کی نجاست اوروں کو ناپاک کرنے والی تھی۔

اعتراض: حدیث شریف کے پہلے حصہ میں کنویں کو "طوی" (طاء کی زبر اور واؤ کے نیچے زیر، اور یاء مشدد) کہا گیا "وھی البئر المطویة بالحجارة " اس کنویں کو کہتے ہیں جس میں دیوار کی چنائی کی گئی ہو، اور حدیث کے آخر میں آرہا ہے "رکی" (راء پر زبر اور یاء مشدد) "وھو البئر قبل ان تطوی) یہ اس کنویں کو کہتے ہیں، جس میں دیوار کی چنائی نہ کی گئی ہو، اسی طرح بعض روایات میں "قلیب " کا ذکر ہے "قلیب" بھی اسی کنویں کو کہتے ہیں جس میں پتھروں وغیرہ سے دیوار کی چنائی نہ کی گئی ہو، ایک ہی کنویں پر''طوی'' اور''رکی'' کا اطلاق کیسے صحیح ہے؟

جواب: لامنافاة لانها كانت مطوية ثم استهدمت فصارت كالركی"

ان میں کوئی منافات (مخالفت) نہیں، کیونکہ پہلے اس کی دیوار چنی گئی تھی، اب گر چکی تھی، مطلب یہ ہوا کہ ان کو اس کنویں میں ڈال دیا گیا جس کی دیوار چنی گئی تھی، لیکن اب اس کی دیوار گر چکی تھی، سابقہ لحاظ پر وہ "مطوی" تھا، موجود لحاظ پر "رکی" اور قلیب تھا۔ (عمدۃ القاری جلد ۷ صفحہ نمبر ۹۲)

"قال عمر یارسول اللہ ماتکلم "کلمة اما استفهامية ""ما" سوالیہ ہے، اور" تکلم" میں ایک تاء حذف ہے، یہ مضارع ہے، اصل میں "تتکلم" ہے۔

کنویں میں کفار کو کیوں ڈالا گیا؟

وانما وضعوا فی القلیب تحقیرا لھم ولئلا یتاذی الناس برائحتھم ولیس ھو دفنا لان الحربی

لایجب دفنہ" (نووی جلد ۲ صفحہ ۱۱۶ باب مالقی النبی ﷺ من اذی المشرکین والمنافقین)

کفار کو کنویں میں ڈالنے کی دو وجہ ہیں، ایک یہ کہ ان کی حقارت بیان کرنی مقصود تھی کہ یہ حقیر لوگ ہیں زندگی میں بھی مسلمانوں کے نزدیک گھٹیا تھے، موت کے بعد بھی گھٹیا ہیں، ایسے ہی جیسے کسی گھٹیا جانور کے مرنے کے بعد اسے گھسیٹ دیا جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ زیادہ لاشیں بکھرنے کی وجہ سے بو پھیل رہی تھی، اس لئے ان کو کنویں میں پھینک دیا گیا تاکہ مسلمان کچھ نہ کچھ بدبو سے محفوظ رہ سکیں، ان کو دفن اس لئے نہیں کیا گیا تھا کہ حربی کافر کو دفن کرنا مسلمانوں پر لازم نہیں۔ (حوالہ مذکور)

اس حدیث سے شیخ کا سماع موتی پر استدلال:

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ اس حدیث کی وضاحت میں قلمطراز ہیں" جاننا چاہئے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور متفق علیہ (یعنی بخاری و مسلم میں مذکور) ہے، اس میں مردوں کے سننے اور ان کو علم و شعور حاصل ہونے کا واضح ثبوت موجود ہے، کیونکہ جو کچھ حضور ﷺ نے خطاب فرمایا ان کا علم ان کو حاصل ہوا، اسی طرح صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ" دفنانے والے جب مردہ کو دفن کر کے لوٹتے ہیں تو مردہ "لوگوں کی جوتیوں کی آہٹ سنتا ہے" اسی طرح حضور ﷺ کا فرمان اہل بقیع کی زیارت کے سلسلہ میں مروی ہے کہ ان کو سلام کرو اور اس میں ان کو خطاب کرو اور کہو کہ اے قبروں والو تم پر سلام ہو اے مسلمانو تمہیں وہ سب کچھ مل گیا جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، اور ان شاء اللہ ہم بھی تمہارے ساتھ شامل ہونے والے ہیں۔ (مدارج النبوۃ جلد دوم)

شہداء مسلمان: اس جنگ میں مسلمانوں میں سے چودہ شہید ہوئے، چھ مہاجرین، اور آٹھ انصار۔

مہاجرین شہداء کرام کے اسماء گرامی:

حضرت عبیدہ بن حارث بن مطلب بن عبد مناف، حضرت عمیر بن ابی وقاص، حضرت ذوالشمالین عمیر بن عبد عمرو بن نضلہ، حضرت عاقل بن ابی بکیر، حضرت مہجع مولی عمر بن الخطاب، حضرت صفوان بن بیضاء رضی اللہ عنہم۔

انصار شہداء کرام کے اسماء گرامی:

حضرت سعد بن خثیمہ، حضرت مبشر بن عبدالمنذر، حضرت حارثہ بن سراقہ، حضرت عوف و معوذ پسران عفراء، حضرت عمیر بن حمام، حضرت رافع بن معلّی، حضرت یزید بن حارث بن سحم۔

مقتولین کفار:

ستھر کی تعداد میں کافر قتل کئے گئے ان میں مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں۔ (شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، عاص بن سعید بن عاص، ابوجہل بن ہشام، ابوالبختری، حنظلہ بن ابی سفیان بن حرب، حارث بن عامر بن نوفل بن عبد مناف، طعیمہ بن عدی، زمعہ بن اسود بن مطلب، نوفل بن خویلد، عاص بن ہشام بن مغیرہ (جو حضرت فاروق اعظم کا ماموں تھا) (بعض نے اس کا ذکر قیدیوں میں کیا ہے) امیہ بن خلف، علی بن امیہ بن خلف، منبہ بن حجاج، معبد بن وہب۔)

کفار قیدی:

ستھر کی تعداد میں کافر قید کر لئے گئے تھے، ان میں سے مشہور لوگ یہ ہیں۔ (نوفل بن حارث بن عبد المطلب، عباس بن عبد المطلب، عقیل بن ابی طالب، ابو العاص بن ربیع، عدی بن خیار، ابوعزیز بن عمیر، ولید بن ولید بن مغیرہ، عبداللہ بن ابی بن خلف، ابوعزہ عمرو بن عبداللہ جمحی شاعر، وہب بن عمیر بن وہب جمحی، ابووداعہ بن ضبیرہ سہمی، سہیل بن عمرو عامری۔) (غزوات النبی مصنفہ علامہ نور بخش توکلی رحمہ اللہ)

بدر کے قیدیوں کے مشورہ پر حضرت عمر ﷛ نے قتل کرنے کی اپنی رائے دی، اور حضرت ابوبکر ﷛ نے مشورہ دیا کہ ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، نبی کریم ﷺ نے بھی اسی رائے کو پسند کرتے ہوئے فدیہ لے کر قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ (مکمل تفصیل ان شاء اللہ دسویں پارہ میں آئے گی)

شبلی نعمانی صاحب اور علامہ نور بخش توکلی رحمہ اللہ:

غزوات النبی میں علامہ توکلی لکھتے ہیں غزوہ بدر کے مختصر بیان کے بعد یہاں ایک خاص بحث پیش آ گئی ہے جسے دیدہ دانستہ پس انداز کرنا مناسب نہیں، اور وہ یہ ہے کہ آیا مدینہ سے مسلمان قافلہ ابوسفیان سے تعرض کرنے کیلئے نکلے تھے یا فوج قریش سے مقابلہ کیلئے؟ اس بحث میں مولوی شبلی نعمانی نے سیرۃ النبی میں سب سے نرالا پہلو اختیار کیا، اور یہ دعوی کیا ہے کہ اس بارے میں اب تک مؤرخین وارباب سیر بلکہ تمام علماء اسلام نے غلطی کھائی ہے، لھذا ذیل میں احقاق حق کیلئے مولوی صاحب کی عبارت بلفظہ نقل کر کے اس کا جواب باصواب دیا جاتا ہے۔ "واللہ هو الهادی الی الصواب"

قال الشبلی النعمانی: غزوہ بدر پر دوبارہ نظر:

سادہ واقعات کرنے کے بعد اب وقت آیا ہے کہ محققانہ طور پر اس بات پر بحث کی جائے کہ غزوہ بدر کا مقصد

جیسا کہ عام مؤرخین نے بیان کیا ہے، کاروان تجارت کو لوٹنا تھا یا قریش کے حملہ کا دفاع تھا۔ میں اس بات سے واقف ہوں کہ تاریخ اور محکمہ عدالت میں فرق ہے، مجھکو یہ بھی معلوم ہے کہ تاریخ کا انداز بیان مقدمہ دیوانی یا فوجداری کے فیصلے لکھنے سے بالکل مختلف ہے،

میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ میرا منصب واقعہ دیوانی نگاری ہے فیصلہ نویسی نہیں، لیکن موقع ایسا آپڑا ہے کہ ایک واقعہ تاریخی نے مقدمہ عدالت کی حیثیت حاصل کرلی ہے، اس لئے مجھکو اپنے منصب سے ہٹ کر فصل مقدمہ کا قلم ہاتھ میں لینا پڑتا ہے، اس بات کا مجھ کو مطلق خوف نہیں کہ اس فیصلہ میں عام مؤرخین اور ارباب سیر میرے حریف مقابل ہیں، نہایت جلد نظر آئے گا کہ حق اکیلا تمام دنیا پر فتح پاسکتا ہے، سلسلۂ کلام کے اچھی طرح پیش نظر رکھنے کیلئے سب سے پہلے ہم کو بتا دینا چاہئے کہ (ہماری تحقیقات کی رو سے) واقعہ کی اصلی صورت کیا تھی؟ واقعہ یہ ہے کہ حضرمی کے قتل نے تمام مکہ کو جوش انتقام سے لبریز کردیا تھا اور اس سلسلے میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی پیش آگئیں، دونوں فریق ایک دوسرے سے پرحذر رہتے تھے اور جیسا کہ ایسی حالتوں میں عام قاعدہ ہے، غلط خبریں خود بخود مشہور ہوکر پھیل جاتی ہیں، اسی اثناء میں ابوسفیان قافلہ تجارت کے ساتھ شام کو گیا اور ابھی شام میں تھا کہ یہ خبر وہاں مشہور ہوگئی کہ مسلمان قافلہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، ابوسفیان نے وہیں سے مکہ کو آدمی دوڑایا کہ قریش کو خبر ہوجائے، قریش نے لڑائی کی تیاریاں شروع کردیں۔ مدینہ منورہ میں یہ مشہور ہوگیا کہ قریش ایک لشکر عظیم لیکر مدینہ آرہے ہیں آنحضرت ﷺ نے مدافعت کا قصد کیا اور بدر کا معرکہ پیش آیا۔ (سیرت النبی جلد اول ص ۲۵۰)

اقول: مؤرخین وارباب سیر بلکہ محدثین ومفسرین میں سے بھی کسی نے یہ بیان نہیں کیا کہ غزوۂ بدر کا مقصد کاروان کو لوٹنا تھا، وہ سب بالاتفاق یہی کہتے ہیں کہ مسلمان مدینہ منورہ سے محض قافلہ قریش سے تعرض کے لیے نکلے تھے، اس اثناء میں اتفاقیہ غزوۂ بدر پیش آگیا، قافلوں سے تعرض کی وجہ یہ ہوئی کہ کفار قریش ہجرت کے بعد بھی مسلمانوں کے مذہبی فرائض کی بجا آوری میں مزاحم ہوتے تھے، بلکہ دیگر قبائل کو بھی ان کی مخالفت پر برانگیختہ کرتے تھے، اس لیے حضور اقدس ﷺ نے مختلف اوقات میں مختلف اغراض کے لیے اپنے اصحاب کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں اطراف مدینہ میں بھیجنی شروع کیں، بلکہ بعض دفعہ خود بھی شرکت فرمائی، کہیں دشمن کی نقل وحرکت کی خبر لانے کے لیے کہیں بعض قبیلوں سے معاہدہ قائم کرنے کے لیے اور کہیں محض مدافعت کے لیے ایسا کیا گیا، ہاں ایک غرض یہ بھی تھی کہ قریش کی شامی تجارت کا راستہ بند کر دیا جائے اور یہ وہی بات ہے جس کی دھمکی حضرت سعد بن معاذ ﷺ نے ہجرت کے بعد ابوجہل کو خاص خانہ کعبہ میں یوں

دی تھی کہ اگر تم نے ہم کو طواف کعبہ سے روکا، تو ہم تمہارا مدینہ کا راستہ بند کر دیں گے۔

(صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب ذکر النبی ﷺ من یقتل ببدر)

چونکہ قریش بالعموم مسلمانوں کو حج وعمرہ سے روکتے تھے، اس لئے مجبوراً مسلمانوں کو ان کے تجارتی قافلوں سے تعرض کرنا پڑا تا کہ مذہبی مداخلت سے باز آجائیں مصنف کا یہ قول (اس سلسلے میں لڑائیاں بھی پیش آگئیں) ثبوت طلب ہے، کیونکہ حضرمی کے قتل کے بعد جنگ بدر سے پہلے مسلمانوں اور کفار قریش میں کوئی لڑائی نہیں ہوئی اور اس کا یہ قول (اسی اثناء میں ابوسفیان قافلہ تجارت کے ساتھ شام گیا) بھی درست نہیں، کیونکہ ابوسفیان واقعہ حضرمی سے پہلے شام چلا گیا تھا، چنانچہ طبقات ابن سعد میں غزوۂ ذوالعشیرہ میں تصریح ہے کہ جو قافلہ بچ کر نکل گیا، جب وہ شام سے واپس آیا تو مسلمان اسی سے تعرض کے لیے نکلے اور غزوۂ بدر پیش آیا، اسی طرح مصنف کا یہ کہنا کہ کہ مدینہ منورہ میں مشہور ہوا کہ قریش کی ایک جمعیت عظیم لے کر مدینہ آرہے ہیں، دعوی بلا دلیل ہے، ایسی دعاوی پر بنائے کلام کرنا محقق کی شان سے بعید ہے۔

قال الشبلی النعمانی:

اس بحث کے فیصلہ کے لیے سب سے پہلے ان واقعات کو یکجا لکھ دینا چاہیے جن پر دونوں فریق کا اتفاق ہے تا کہ وہ انفصال بحث میں اصول موضوعہ کے طور پر کام آئیں وہ یہ ہیں۔

(۱) قرآن مجید میں اگر کسی واقعہ کا صاف ذکر ہے، تو اس کے مقابلہ میں کسی روایت اور تاریخ کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔

(۲) کتب حدیث میں صحت کے لحاظ سے باہم جو فرق مراتب ہے اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔

اس قدر عموماً مسلم ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ قریش بڑی تیاری کے ساتھ مکہ سے نکلے ہیں، تو آپ نے صحابہ سے مخاطب ہو کر ان کا استمزاج کیا، مہاجرین نے نہایت جوش کے ساتھ آمادگی ظاہر کی، لیکن آنحضرت ﷺ انصار کی مرضی دریافت کرنا چاہتے تھے، یہ دیکھ کر حضرت سعد یا کوئی اور معزز انصاری اٹھے اور کہا ''یارسول اللہ ﷺ کیا آپ کا روئے سخن ہماری طرف ہے؟ ہم وہ لوگ نہیں ہیں جنہوں نے موسیٰ سے کہا تھا (تم اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو، ہم یہیں بیٹھے رہیں گے) خدا کی قسم اگر آپ حکم دیں، تو ہم آگ اور سمندر میں کود پڑیں'' یہ بھی مسلم ہے کہ صحابہ میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو شرکت سے ہچکچاتے تھے، چنانچہ خود قرآن مجید میں تصریح ہے۔ ﴿وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَکٰرِهُوْنَ﴾ اور مسلمانوں کا ایک گروہ قطعاً ناخوش تھا عموماً تمام ارباب سیر اور محدثین نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انصار کی رضامندی جو خاص طور پر دریافت کی، اس کی وجہ یہ تھی کہ انصار نے مکہ میں جب آپ

کے ہاتھ بیعت کی تھی، تو صرف یہ اقرار کیا تھا۔ ’’جب کوئی دشمن خود مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوگا، تو انصار مقابلہ کریں گے ‘‘ یہ اقرار نہ تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر بھی لڑیں گے، ان واقعات کے بعد اب مرکز بحث یہ ہے ’’یہ واقعات کہاں پیش آئے؟‘‘ ارباب سیر لکھتے ہیں کہ مدینہ سے جب آپ نکلے تو صرف قافلہ تجارت پر حملہ کرنا مقصود تھا، دو چار منزل چل کر معلوم ہوا کہ قریش فوجیں لیے چلے آتے ہیں، اس وقت آپ نے مہاجرین اور انصار کو جمع کیا کہ ان کا عندیہ دریافت فرمائیں، آگے کے واقعات یہیں پیش آئے، لیکن کتب سیر، تاریخ اور تمام دیگر شہادتوں سے بالاتر ایک اور چیز ہمارے پاس موجود ہے (قرآن پاک) جس کے آگے ہم سب کو گردن جھکا دینی چاہیے۔ ترکیب نحوی کی رو سے وَاِنَّ میں جو واو ہے حالیہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کا ایک گروہ جو لڑائی سے جی چراتا ہے، یہ موقع عین وہ تھا جب آپ مدینہ سے نکل رہے تھے نہ کہ مدینہ سے نکل کر جب آگے بڑھے، کیونکہ واوَ حالیہ کے لحاظ سے خروج من البیت اور اس کے گروہ کے جی چرانے کا وقت اور زمانہ ایک ہی ہونا چاہیے۔

﴿كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ ۝ يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَمَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ۝ وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ﴾ (سورۃ الانفال رکوع نمبر ۱)

’’جس طرح تجھ کو تیرے خدا نے تیرے گھر سے حق پر نکالا درآن حالیکہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس کو پسند نہیں کرتا تھا، یہ لوگ حق کے ظاہر ہوئے پیچھے تجھ سے حق بات میں جھگڑا کرتے تھے گویا کہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں اور موت کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جب کہ خدا تم سے یہ وعدہ کرتا تھا کہ دو جماعتوں میں سے کوئی جماعت تم کو ہاتھ آئے گی اور تم یہ چاہتے تھے کہ بے کھٹکے والی جماعت تم کو ہاتھ آجائے اور اللہ تعالیٰ یہ چاہتا تھا کہ حق کو اپنی باتوں سے قائم کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔‘‘

(۲) آیت مذکور میں بہ تصریح مذکور ہے کہ یہ جس وقت کا واقعہ ہے، اس وقت دو گروہ سامنے تھے، ایک کاروان تجارت اور ایک قریش کی فوج جو مکہ سے آرہی تھی، ارباب سیر کہتے جہیں کہ آیت قرآنی میں یہ اس وقت کا واقعہ مذکور ہے جب آنحضرت ﷺ بدر کے قریب پہنچ چکے تھے، لیکن بدر کے قریب پہنچ کر تو کاروان تجارت صحیح وسلامت بچ کر نکل گیا تھا، اس وقت یہ کیونکر صحیح ہوسکتا ہے کہ ’’دونوں میں سے ایک کا وعدہ ہے‘‘ اس لیے یہ بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی نص کے مطابق یہ واقعہ اس وقت کا ہونا چاہیے جب دونوں گروہ کے ہاتھ آنے کا احتمال ہوسکتا ہو اور یہ صرف دو وقت ہوسکتا ہے، جب آنحضرت ﷺ مدینہ میں تھے اور دونوں طرف کی خبریں آگئی تھیں کہ ادھر ابوسفیان کا روان

تجارت لے کر چلا ہے اور ادھر قریش جنگ کے سروسامان کے ساتھ مکہ سے نکل چکے ہیں۔

(۳) سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ قرآن مجید کی آیت مذکورہ بالا میں کفار کے دوفریق کا خدا تعالیٰ نے بیان کیا ہے، ایک قافلہ تجارت اور دوسرا صاحب شوکت یعنی کفار قریش جو مکہ سے لڑنے کے لیے آرہے تھے، آیت میں تصریح ہے کہ مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی تھی جو چاہتی تھی کہ کاروان تجارت پر حملہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر ناراضی ظاہر کی اور فرمایا۔

﴿تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (سورۃ الانفال رکوع ۱)

''تم چاہتے ہو کہ بے خرخشہ والا گروہ تم کو ہاتھ آجائے اور خدا یہ چاہتا ہے کہ اپنی باتوں سے حق کو قائم کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔''

ایک طرف وہ لوگ ہیں جو قافلہ تجارت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، دوسری طرف خدا ہے جو چاہتا ہے کہ حق کو قائم کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے، اب سوال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان دو میں سے کس کے ساتھ ہیں؟ عام روایتوں کے مطابق اس سوال کا کیا جواب ہوگا، میں اس تصور سے کانپ اٹھتا ہوں۔

(۴) اب واقعہ کی نوعیت پر غور کرو، واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ سے اس سروسامان کے ساتھ نکل رہے ہیں کہ تین سو سے زیادہ جانباز مہاجر اور انصار ساتھ ہیں، ان میں فاتح خیبر اور حضرت سید الشہداء امیر حمزہ ﷛ بھی ہیں جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک لشکر ہے باوجود اس کے (جیسا کہ قرآن مجید میں بہ تصریح مذکور ہے) ڈر کے مارے بہت سے صحابہ کا دل بیٹھا ہے اور ان کو نظر آتا ہے کہ کوئی ان کو موت کے منہ میں لیے جاتا ہے۔ قرآن مجید میں مذکور ہے۔

﴿وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَمَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ﴾

''مسلمانوں کی ایک جماعت کارہ تھی، وہ تجھ سے حق ظاہر ہوئے، پیچھے بھی جھگڑا کرتے تھے، گویا کہ موت کی طرف ہنکائے جارہے ہیں۔''

اگر صرف قافلہ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو یہ خوف واضطراب یہ پہلو تہی کس بناء پر تھی، اس سے پہلے بارہا (بقول ارباب سیر قافلہ قریش پر حملہ کرنے کے لیے تھوڑے تھوڑے آدمی بھیج دیئے گئے تھے اور کبھی ان کو ضرر نہیں پہنچا تھا، اس دفعہ اسی قافلہ کا اتنا ڈر ہے کہ تین سو چیدہ اور منتخب فوج ہے اور پھر لوگ ڈر کے مارے سہمے جاتے ہیں، یہ قطعی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں یہ خبر آگئی تھی کہ قریش مکہ سے جمعیت عظیم لے کر مدینہ پر آرہے ہیں۔ (سیرت النبی جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۰، ۲۵۲)

اقول: مولوی شبلی صاحب کا دعوی ہے کہ مسلمان مدینہ سے کاروان تجارت سے تعرض کے لیے نہ نکلے تھے، بلکہ بڑے سروسامان سے فوج قریش کے مقابلہ کے لیے نکلے تھے اس دعوی کے ثبوت میں مولوی صاحب نے قرآن کریم کی تین آیتوں سے چار دلیلیں پیش کی ہیں، جن پر ہم ہم بالترتیب نمبردار بحث کرتے ہیں۔

(۱) ''وَاِنَّ'' میں واؤ بے شک حالیہ ہے اور یہ جملہ کاف ''اخرجک'' سے حال میں واقع ہوا ہے، مگر اس سے یہ ضروری نہیں کہ خروج من البیت اور اس گروہ کے جی چرانے کا زمانہ ایک ہی ہو، ہم ذرا اس کی تشریح کردیتے ہیں، ہدایۃ النحو میں ہے۔''الحال لفظ یدل علی بیان ھیئۃ الفاعل او المفعول به او کلیھما'' یعنی حال وہ لفظ ہے جو فاعل یا مفعول یا ہر دو کی ہیئت کے بیان پر دلالت کرے، ہدایۃ النحو کی شرح درایۃ میں اس کے متعلق یوں لکھا ہے۔

''ثم المراد بالھیئۃ ھھنا الحالۃ و ھی اعم من ان تکون حقیقۃ او مقدرۃ نحو قوله تعالی فادخلوھا خالدین ای مقدرین الخلو و یسمی الاول حالاً محققۃ و الثانی حالا مقدرۃ''

ترجمہ: پھر ہیئت سے مراد یہاں حالت عام ہے، اس سے کہ حقیقیہ ہو یا مقدرہ جیسا کہ اللہ تعالی کا قول ہے ''فادخلوھا خالدین'' یعنی تمہارے واسطے خلود مقدر ہے پہلی قسم کو حال محققہ اور دوسری قسم کو حال مقدرہ کہتے ہیں۔ انتہی

اب دیکھنا یہ ہے کہ آیت زیر بحث میں حال کس قسم کا ہے محققہ یا مقدرہ، علمائے کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ یہاں حال مقدرہ ہے چنانچہ علامہ آلوسی روح المعانی میں فرماتے ہیں۔

(وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَکٰرِھُوْنَ) والجملۃ فی موضع الحال و ھی حال مقدرۃ لان الکراھۃ وقعت بعد الخروج کما ستراہ انشاء اللہ تعالی او یعتبر ذلک ممتدا''

یعنی یہ جملہ حال کی جگہ ہے اور یہ حال مقدرہ ہے کیونکہ کراہت خروج کے بعد واقع ہوتی ہے جیسا کہ انشاء اللہ تعالی تو عنقریب اسے دیکھے گا یا اسے ممتد اعتبار کیا جائے۔ انتھی

مطلب یہ ہے کہ اس کو حال مقدرہ سمجھنا چاہیے یا اس کے لیے زمان وسیع خیال کرنا چاہیے کہ جس کے بعض اجزاء میں کراہت اور بعض میں خروج واقع ہے۔ تفسیر جلالین کے حاشیہ جمل میں ہے۔

''فقوله و ان فریقا الخ حال مقدرۃ لما علمت ان الکراھۃ لم یقارن الخروج''

یعنی یہ حال مقدرہ ہے کیونکہ کراہت خروج کے ساتھ واقع نہیں ہوئی، جیسا کہ تجھے معلوم ہے۔ انتھی

ہمارے اس قول کی تائید مؤرخین وارباب سیر اور تمام محدثین ومفسرین کررہے ہیں، احادیث صحیحہ ہماری تائید کررہی ہیں جیسا کہ بیان ہوگا، قرآن کریم کی دوسری آیت جو عنقریب پیش ہوگی ہماری تائید کررہی ہے، اب

ناظرین خود انصاف کریں کہ ان حالات میں شبلی بیچارے کی رائے محض کیا وقعت رکھ سکتی ہے۔

(۲) مصنف نے تین آیتیں نقل کی ہیں جنہیں وہ ایک آیت خیال کر رہا ہے، مگر حقیقت میں یہاں تیسری آیت معرض بحث میں ہے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دونوں میں سے ایک کا وعدہ اللہ تعالی نے اس وقت کیا، جبکہ دونوں گروہ کے ہاتھ آنے کا احتمال وامکان تھا، مگر یہ کہنا کہ یہ صرف وہ وقت ہوسکتا ہے الخ درست نہیں بظاہر مصنف نے "وَاِذْ یَعِدُکُم " کی واؤ سے مغالطہ کھایا ہے اور یہ سمجھا ہے کہ وقت خروج اور وقت وعدہ ایک ہی ہیں حالانکہ یہ غلط ہے، کیونکہ اذ ظرف ہے فعل مضمر "اذکروا" کانہ کہ "اخرجك" کا، ایک لحہ کے لیے آیات "لاحقہ اِذْتَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ (الایۃ) "اِذْیُغَشِّیْکُمُ النُّعَاسَ (الایہ) پر بھی نظر ڈالو، ان آیتوں میں اذ بدل ہے وَاِذْ یَعِدُکُم سے، مصنف کے قول کے مطابق وعدہ، استغاثہ مسلمین، نیند کا طاری ہونا اور مینہ کا برسنا، یہ سب مدینہ ہی میں ہونا چاہیے وھذا کماتری.

مؤرخین ومحدثین کے نزدیک حضرت جبرائیل دو جماعتوں میں سے ایک کا وعدہ وادیٔ ذفران میں لائے، اس کے بعد حضور ﷺ نے صحابہ سے استمزاج فرمایا، اس وقت بے شک دونوں گروہ کے ہاتھ آنے کا امکان تھا، غور کرو وعدہ کرنے والا قادر مطلق ہو اور مولوی شبلی امکان واحتمال میں کلام کریں، وادیٔ ذفران کیا اس سے آگے بڑھ کر جب ہر دو فریق میدان بدر میں اترے، مسلمان مدینہ کے طرف کے ناکے پر اور مشرکین مکہ کی طرف کے ناکہ پر اس وقت بھی وہ قادر مطلق اگر چاہتا تو قافلہ کو مسلمانوں کے ہاتھ میں گرفتار کروا دیتا، یہ تو کوئی بڑی بات نہ تھی، کیونکہ وہ قافلہ لشکر اسلام سے فقط تین میل ساحل سمندر کی طرف تھا، مگر وہ مکہ بھی پہنچ جاتا ہے، تو اس کا مسلمانوں کے ہاتھ آنا قدرت الٰہی سے خارج نہ تھا، اب آیت زیر بحث کے معنی بھی سن لو، یہاں واؤ استیناف کے لیے جیسا کہ اہل علم کو معلوم ہے، اذ فعل ماضی پر داخل ہوا کرتا ہے، مگر یہاں ماضیہ کی حکایت کے لیے صیغہ مضارع استعمال ہوا ہے، پس اس کے معنے یوں ہوئے "اے مومنو! یاد کرو وہ وقت کہ اللہ تعالی نے تم سے دو گروہ میں سے ایک کا وعدہ کیا کہ یہ تمہارے واسطے ہے اور تم نے دوست رکھا کہ بن شدت والا تمہارے واسطے ہو اور اللہ نے چاہا کہ اپنے کلاموں سے سچ کو سچا کرے اور کافروں کا پیچھا کاٹ دے" بیان بالا سے مصنف کی قرآن فہمی اور نحو دانی کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔

(۳) مصنف کے اعتراض کا ماحصل یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں کفار کے دو فریق (قافلہ تجارت اور فوج قریش) کا ذکر ہے اور یہ بھی تصریح ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت قافلہ پر حملہ کرنا پسند کرتی تھی مگر خدا چاہتا ہے کہ فوج کفار کے شکست ہو، لہذا آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ سے قافلہ تجارت پر حملہ کرنے کے لیے نکلے، تو (نعوذ باللہ) آپ نے اللہ تعالی کی مرضی کے خلاف کیا، مگر ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ وعدہ زیر بحث مدینہ منورہ میں نہ ہوا تھا، وعدہ مذکورہ اور

قافلہ تجارت پر حملہ کرنا کی خواہش کا وقت اور مدینہ منورہ سے خروج کا وقت ایک نہیں جیسا کہ قرآن کریم سے ظاہر ہے ''وَاِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ (الایہ) کلام مستانف ہے، اس کو اخرجک سے کوئی ربط نہیں پس ارباب سیر و محدثین درست فرماتے ہیں کہ وادی ذفران میں وعدہ'' احدی الطائفتین'' ہوا، اس کے بعد حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب سے استمزاج فرمایا، بے شبہ آنحضرت ﷺ وہی چاہتے تھے جو اللہ تعالیٰ چاہتا تھا، چنانچہ جب مہاجرین میں سے حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے جنگ پر پوری آمادگی ظاہر فرمائی، تو حضور اقدس ﷺ بہت خوش ہوئے۔

(صحیح بخاری میں ہے، اشرق وجہہ، وسرہ، (کتاب المغازی باب قول اللہ تعالی اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ الآیہ)

آپ اسی طرح انصار میں سے حضرت سعد بن معاذ ؓ کی تقریر پرتاثیر پر حضور انور بابی ھو وامی نہایت خوش ہوئے۔ (سیرت ابن ہشام فبشر رسول اللہا بقول سعد ونشطہ ذالک ثم قال سیروا وابشر وا فان اللہ تعالی قد وعد فی احدی الطائفتین واللہ لکافی الآن انظر الی مضارع القوم. ۱۲)

آپ کا ان تقریروں سے خوش ہونا اور فوج کفار کی شکست کی بشارت دینا صاف بتارہا ہے کہ آپ بھی فوج قریش کا مقابلہ چاہتے تھے اور مسلمانوں کی فوج کا اکثر حصہ بھی یہی چاہتا تھا ہاں ایک قلیل جماعت تھی جو بوجہ بے سروسامانی بتقاضائے طبع بشری فوج کفار کے مقابلہ سے ہچکچاتی تھی۔

(۴) یہ پہلے ثابت کیا جاچکا ہے کہ ﴿وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَکٰرِھُوْنَ﴾ حال مقدرہ ہے، یہ کراہت ومجادلہ مدینہ منورہ میں پیش نہیں آیا، پس مصنف کی تمام خامہ فرسائی بے سود ہے، مسلمان جس سروسامان سے مدینہ منورہ سے نکلے، اس کا ذکر عنقریب آتا ہے، یہ کہنا (کہ مدینہ ہی میں یہ خبر آگئی تھی کہ قریش مکہ سے جمعیت عظیم لے کر مدینہ منورہ پر آرہے ہیں) بالکل غلط ہے، اس کا کوئی ثبوت نہیں، حسب وعدہ ہم یہاں قرآن کریم کی ایک دوسری آیت غزوۂ بدر کے متعلق نقل کرتے ہیں جو ہمارے مدعا کی مؤید ہے اور وہ یہ ہے۔

﴿اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْیَا وَھُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰی وَالرَّکْبُ اَسْفَلَ مِنْکُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِی الْمِیْعٰدِ وَلٰکِنْ لِّیَقْضِیَ اللّٰہُ اَمْرًا کَانَ مَفْعُوْلًا﴾ (سورۃ الانفال، ع۵)

''جس وقت تم تھے ورے کے ناکے اور وہ پرے کے ناکے اور قافلہ نیچے اتر گیا تم سے اور اگر آپس میں تم وعدے کرتے تو نہ پہنچتے وعدے پر، لیکن اللہ تعالیٰ کو کرڈالنا ایک کام جو ہو چکا تھا'' (ترجمہ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ تعالیٰ)

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمان مدینہ منورہ سے فوج کفار کے مقابلہ کے لیے نہ نکلے تھے اور نہ انہیں فوج کفار کے مکہ سے آنے کا اس وقت علم تھا۔ مولوی شبلی صاحب نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے ''جب تم قریب کے میدان میں اور قریش کی فوج دور کے میدان میں اور قافلہ تم سے نیچے تھا اگر تم ایک دوسرے سے وقت مقرر کر کے آتے، تو وقت میں

اختلاف ہوجاتا لیکن (خدا نے یہ اس لیے کر دیا) تا کہ جو ہونے والا تھا، خدا اس کو کر دے" (سیرت النبی، جلد اول صفحہ نمبر ۲۴۸)

کسی بھی لغت یا تفسیر کو اٹھا کر دیکھئے تواعد کے معنی ہیں ایک دوسرے سے وعدہ کرنا اسی طرح میعاد کے معنی وقت کے نہیں، قرآن پاک کے معنی میں رائے زنی سے اللہ تعالیٰ بچائے، بغرض توضیح اس آیت کی تفسیر کے متعلق چند اقوال نقل کیے جاتے ہیں، علامہ قسطلانی (مواہب لدنیہ مطبوعہ مصر، جزء اول صفحہ نمبر ۷۸) غزوۂ بدر کی نسبت لکھتے ہیں۔

"وكانت من غير قصد من المسلمين اليها ولا ميعاد كما قال الله تعالى ولو تواعدتم لاختلفتم في الميعاد ولكن ليقضي الله امرا كان مفعولا وانما قصد ﷺ والمسلمون التعرض لعير قريش"

ترجمہ: غزوۂ مسلمانوں کے قصد اور وعدے کے بغیر واقع ہوا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، ولو تواعدتم الآیہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں نے فقط قافلہ قریش سے تعرض کا قصد کیا تھا۔ انتہی۔ تفسیر بیضاوی میں ہے۔

ولو تواعدتم لاختلفتم في الميعاد اي لو تواعدتم وهم القتال ثم علمتم حالكم وحالهم لاختلفتم انتم في الميعاد هيبة منهم ويأسا من الظفر عليهم ليتحققوا ان ما اتفق لهم من الفتح ليس الا صنعا من الله خارقة للعادة فليزدادوا ايمانا وشكرا ولكن جمع بينكم على هذه الحالة من غير ميعاد ليقضي الله امر كان مفعولا حقيقا بان يفعل وهو نصر اوليائه وقهر اعدائه "

ترجمہ: (اور اگر تم آپس میں وعدہ کرتے، تو تم وعدے میں اختلاف کرتے) یعنی اگر تم اور وہ آپس میں لڑائی کا وعدہ کرتے پھر تم اپنا اور ان کا حال جان لیتے، تو بے شک تم ان سے ڈر کر اور ان پر فتح پانے سے مایوس ہو کر وعدے میں اختلاف کرتے (بن وعدہ لڑائی اس لیے ہوئی) کہ مسلمان جان لیں کہ جو انہیں فتح نصیب ہوئی وہ محض بطور خارق عادت اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ہوئی تا کہ وہ ایمان و شکر میں زیادہ ہو جائیں۔ انتہی

حاشیہ شیخ زادہ علی البیضاوی میں ہے۔

(قوله لاختلفتم) اى لخالف بعضكم بعضا وعزمتم على التخلف عن محاربة النفير لكثرتهم وقلتكم ولكن جمعكم الله تعالى من غير ميعاد لكم ليقضي الله امرا كان مفعولا في علمه وحكمه او كان حقيقا بان يفعل فانه تعالى دبر تدبيرا عجيبا لوقوع الحرب بين الجمعين من حيث الله اخبر المؤمنين باقبال العير حتى خرجوا واقلن الكفار بسماع خبر خروجهم لكي ينفروا وسبب الاسباب

حتی اجتمعوا للحرب وایدالله تعالی للمؤمنین بنصره بان ربط الله علی قلوبهم وقواها وازال عنها الاضطراب والارتیاب والقی فی قلوب الذین کفروا الرعب وامدهم بانزال الملائکة والمطروغیرذلک من وجوه لطفه وفعل ذلک خارقاللعادة لیظهر الحق ویقطع دابرالکفرین"

ترجمہ: (قوله اختلفتم) یعنی تم ایک دوسرے کی مخالفت کرتے اور ان کی کثرت اور اپنی قلت کے سبب فوج قریش کی لڑائی سے پیچھے رہ جانے کا ارادہ کرتے، مگر اللہ نے تم کو وعدے بغیر جمع کر دیا تا کہ وہ بات کر دے جو اس کے علم وحکم میں ہو چکی ہے، یا ہونے والی ہے، پس اللہ تعالی نے دونوں فریقوں میں لڑائی ہونے کے لیے عجیب تدبیر کی، بدینطور کہ مومنوں کو قافلہ کے آنے کی خبر دی، یہاں تک کہ وہ (مدینہ منورہ سے) نکلے اور کفار کو مسلمانوں کے نکلنے کی خبر سننے سے بے چین کر دیا تا کہ وہ لڑائی کے لیے نکلیں اور اسباب پیدا کر دیئے، یہاں تک کہ لڑائی کے لیے جمع ہو گئے اور اللہ تعالی نے اپنی مدد سے مومنوں کی تائید کی، بدیں طور کہ ان کے دل مضبوط کر دیئے اور ان کو تقویت دی اور ان سے اضطراب وشبہ دور کر دیا اور کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور فرشتے اور بارش اتار کر اور کئی قسم کی مہربانیوں سے ان کی مدد کی اور یہ بطور خارق عادت کیا تا کہ حق کو ظاہر کر دے اور کافروں کا پیچھا کاٹ دے۔ انتہی

غرض تمام علماء نے اس آیت کے یہی معنی بیان کیے ہیں، حتی کہ صحابہ کرام بھی یہی معنے سمجھے ہیں، چنانچہ حدیث کعب سے عیاں ہوگا۔

قال الشبلی النعمانی:

(۵) قرآن مجید میں ایک اور آیت اسی بدر کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے اور اس وقت جب آپ مدینہ میں ہی تشریف رکھتے تھے چنانچہ صحیح بخاری میں تفسیر سورۃ انفال میں تصریحاً مذکور ہے۔ آیت یہ ہے۔

﴿لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ دَرَجَةً﴾

"بجز معذوروں کے وہ لوگ جو بیٹھ رہے اور وہ لوگ جو خدا کی راہ اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں برابر نہیں ہو سکتے خدا نے مجاہدین کو جو مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں، درجہ میں فضیلت دی ہے۔" (سورۃ انفال)

صحیح بخاری میں اس آیت کے متعلق حضرت ابن عباس ؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یعنی وہ لوگ جو بدر میں شریک نہیں ہوئے اور وہ جو شریک ہوئے دونوں برابر نہیں ہو سکتے صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ جب یہ آیت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی تو پہلے غیر اولی الضرر کا جملہ نہ تھا، یہ آیت سن کر حضرت عبداللہ ابن مکتوم آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے

اندھے پن کا عذر کیا، اس پر وہیں یہ جملہ نازل ہوا: "غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ" (یعنی معذوروں کے سوا) یہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں معلوم ہوگیا تھا کہ قافلہ پر حملہ کرنا نہیں، بلکہ لڑنا اور جان دینا ہے۔ (سیرت النبی، جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۴)

اقول: آیۂ لایستوی القاعدون سورۃ نساء میں ہے اور صحیح بخاری تفسیر سورۂ نساء میں مذکور ہے، یہ کہنا کہ یہ آیت صحیح بخاری تفسیر سورۂ انفال میں تصریحاً مذکور ہے بالکل غلط ہے اور امام بخاری علیہ الرحمہ پر بہتان ہے، اس قرآن دانی پر مولوی شبلی صاحب کو محقق بننے کا دعویٰ ہے، العجب العجب، مولوی صاحب کا خیال ہے کہ "آیۂ لایستوی القاعدون" مدینہ منورہ میں بدر کو جانے سے پہلے نازل ہوئی، لہٰذا اصحابہ کرام مدینہ منورہ ہی سے قتال قریش کے لیے نکلے تھے، مگر ایسا خیال مولوی صاحب کی نادانی پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ یہ معلوم ہے کہ آیات و سور قرآن کی ترتیب نزولی اس ترتیب سے مختلف ہے جو اب قرآن میں موجود ہے چنانچہ حضرت ابن عباس ﷺ کی روایت کے مطابق مدینہ منورہ میں جو سورتیں نازل ہوتیں، وہ اس ترتیب سے نازل ہوئیں، سب سے پہلے بقرہ، پھر انفال، پھر آل عمران، پھر احزاب، پھر ممتحنہ پھر نساء، پھر اذا زلزلت، پھر الحدید الخ۔ (تفسیر الاتقان للسیوطی مطبوعہ مصر جزء اول صفحہ نمبر ۱۱، ۱۲)

صحیح بخاری تفسیر سورۂ انفال میں ہے:

عن سعیدبن جبیر قال قلت لابن عباس سورۃ الانفال قال نزلت فی بدر"

یعنی حضرت سعید بن جبیر کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابن عباس سے سورۂ انفال کی بابت دریافت کیا، آپ نے فرمایا کہ سورۂ انفال غزوۂ بدر میں نازل ہوئی ہے، پس ثابت ہوا کہ سورۂ نساء جس میں آیت زیر بحث ہے جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے، لہٰذا مولوی صاحب کی تمام خامہ فرسائی بے سود ہے۔

قال الشبلی النعمانی:

(۶) کفار قریش جو مکہ سے لڑنے کے لیے بدر میں آئے، ان کی نسبت یہ قرآن مجید میں ہے۔

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ﴾

(ان لوگوں کی طرح نہ بنو) جو اپنے گھروں سے مغرورانہ نمائش اور خدا تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہوئے نکلے۔

اگر قریش صرف قافلہ تجارت کے بچانے کے لئے نکلے تو خدا تعالیٰ یہ کیوں کہتا کہ وہ اظہار شان اور دکھاوے کے لیے خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے؟ اسمیں اظہار شان اور دکھاوے کی کیا بات تھی؟ اور خدا تعالیٰ کی راہ سے لوگوں کو روکنا کیا تھا؟ البتہ درحقیقت وہ مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے لیے نکلے تھے جس سے مقصود اپنے زور اور قوت کا اعلان و نمائش اور اسلام کی ترقی کا انسداد تھا، اس لیے خدا تعالیٰ نے اس غرور و نمائش اور صدعن سبیل اللہ کہا۔ (سیرت النبی جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۴، ۲۵۵)

اقول: سیرت ابن ہشام غزوۂ بدر میں ہے۔

قال ابن اسحق ولما رأی ابوسفیان انه قد احرز عیره ارسله الی قریش انکم انما خرجتم لتمنعوا عیرکم ورجالکم واموالکم فقد نجاها الله فارجعوا فقال ابوجهل بن هشام والله لانرجع حتی نرد بدرا وکان بدر اموسما من مواسم العرب یجتمع لهم به سوق کل عام فنقیم علیه ثلاثا فننحر الجزور ونطعم الطعام ونسقی الخمر وتعزف علینا القیان وتسمع بنا العرب وبمسیرنا وجمعنا فلایزالون یهابوننا ابدابعدها فامضوا"

ابن اسحاق نے کہا کہ جب ابوسفیان نے دیکھا کہ اس نے اپنے قافلہ کو بچالیا ہے تو اس لیے قریش کو کہا بھیجا کہ تم صرف اپنے قافلہ اور اپنے آدمیوں اور مالوں کو بچانے کے لیے نکلے ہو، سو اللہ تعالی نے ان کو بچالیا، اس لیے تم واپس چلے جاؤ، ابوجہل بن ہشام نے جواب دیا اللہ کی قسم ہم واپس نہ ہوں گے، یہاں تک کہ ہم بدر میں اتریں گے (بدر عرب کی منڈیوں میں سے ایک منڈی تھی جہاں وہ جمع ہوا کرتے تھے اور وہاں ایک بازار تھا) اور وہاں تین راتیں ٹھہریں گے اور اونٹ ذبح کریں اور کھانا کھلائیں گے اور شراب پلائیں گے اور غلام باجے بجا کر ہمیں گاسنائیں گے اور عرب ہمارا حال اور ہمارا آنا اور ہماری جمعیت سنیں گے پس وہ آج سے ہم سے ڈرتے رہیں گے لہذا آگے چلو۔

آیت زیر بحث میں ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کی اسی حالت کی طرف اشارہ ہے، اس کا اترانا اور دکھاوا ہونا تو ظاہر ہے، اس میں اسلام کی ترقی کا انسداد بھی ہے، کیونکہ جب تمام عرب ہیبت زدہ ہوجائیں گے، تو کسی کو ان کی مرضی کے خلاف اسلام لانے کی جرأت نہ ہوگی، حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ اور دیگر مفسرین کرام اس آیت کی یہی تفسیر بیان فرماتے ہیں ہم یہاں صرف چند عبارتیں نقل کررہے ہیں جن سب کا ماحصل یہی ہے۔

روی عن ابن عباس رضی اللہ عنہما لما رأی ابوسفیان انه احرز ارسل الی قریش ان ارجعوا فقد سلمت العیر فقال ابوجهل والله لانرجع حتی نرد بدرا ونشرب الخمور وتعزف علینا القینات ونطعم بها من حضرنا من العرب فوافوها ولکن سقوا کاس المنایا بدل الخمور وناحت علیهم النوائح بدل القینات وکانت اموالهم غنائم بدلا عن بذلها" (تفسیر روح المعانی جزء ثالث صفحه نمبر ۲۴۵)

اخرج ابن المنذر وابن ابی حاتم وابو الشیخ عن قتادہ رضی اللہ عنہ فی الآیة قال کان مشرکوا قریش الذین قاتلوا النبی ﷺ یوم بدر خرجوا ولهم بغی وفخر وقد قیل لهم یومئذ ارجعوا فقد انطلقت عیرکم وقد ظفرتم فقالوا الا والله حتی یتحدث اهل الحجاز بمسیرنا وعددنا" (درمنثور للسیوطی)

(کالذین خرجوا من دیارھم)ھم اھل مکة حین خرجوا الحمایة العیر فاتاھم رسول ابی سفیان وھم بالجحفة ان ارجعوا فقد سلمت عیر کم فابی ابو جھل وقال حتی نقدم بدرا نشرب بھا الخمور وتعرف علینا القیان ونطعم بھا من حضر نا من العرب فذالک بطرھم ورئاؤھم الناس باطعامھم فوافوھا نسقوا کئوس المنایا مکان الخمر وناحت علیھم النوائح مکان القیان" (تفسیر کشاف للزمحشری)

وایں حال ابوجہل وتابعان اوست (حاشیہ ترجمہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ) پس ظاہر ہوگیا کہ اس آیت کے معنی جو مولوی شبلی صاحب سمجھے ہیں، وہ ان کی محض اپنی رائے ہے جو سراسر غلط ہے۔

قال الشبلی النعمانی: قرآن مجید کے بعد احادیث نبوی کا درجہ ہے، احادیث کی متعدد کتابوں میں غزوۂ بدر کا مفصل ومجمل ذکر ہے لیکن کعب بن مالک والی حدیث کے سوا اور کسی حدیث میں یہ واقعہ میری نظر سے نہیں گزرا کہ آنحضرت ﷺ بدر میں قریش کے قافلۂ تجارت کو لوٹنے کے لیے نکلے تھے، کعب بن مالک کی حدیث متعدد وجوہ سے قابل بحث ہے۔

(۱) حضرت کعب بن مالک غزوۂ بدر میں شریک نہیں تھے اس لیے ان کی روایت اس موقع پر مشاہدہ وواقفیت کی روایت نہیں۔

(۲) اس واقعہ کی روایت سے ان کا مقصد یہ ہے کہ غزوۂ بدر کی اہمیت کم ہو جائے، تاکہ عدم شرکت سے ان کا وزن کم نہ ہو، حالانکہ بدر کو تاریخ اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے، وہ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن پاک نے اس کو یوم الفرقان کہا ہے، خدا نے تمام شرکائے بدر کے گناہ معاف کر دیئے ہیں، بدری صحابہ کی یہ عزت تھی کہ حضرت عمر کے عہد میں ان کے وظائف سب سے زیادہ تھے کسی صحابی کے نام کے ساتھ بدری کہنا خاص امتیاز کا سبب شمار کیا جاتا تھا، حضرت کعب کی حدیث یہ ہے۔

"عن عبداللہ بن کعب قال کعب لما تخلف عن رسول اللہ ﷺ فی غزوة تبوک غیر انی کنت تخلفت فی غزوة بدر ولم یعاقب احد تخلف عنھا انما خرج النبی ﷺ یرید عیر قریش حتی جمع اللہ بینہ وبینھم علی غیر میعاد" (غزوۂ تبوک، بخاری)

حضرت کعب کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہا بجز غزوۂ تبوک کے اور ہاں غزوۂ بدر میں بھی شریک نہ تھا اور جو اس پر شریک نہ ہوا، اس پر کچھ عتاب نہیں ہوا، کیونکہ آنحضرت ﷺ قریش کے قافلہ کے لیے نکلے تھے کہ خدا تعالیٰ نے دونوں فریق کو اچانک مقابل کر دیا۔

(سیرت النبی، جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۵)

اقول: بے شک قرآن مجید کے بعد احادیث کا درجہ ہے احادیث ہی قرآن مجید کی صحیح تفسیر ہیں، حدیث کعب بن مالک جیسی اور بھی حدیثیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ قافلہ تجارت سے تعرض کرنے کے لیے نکلے تھے مگر اس تعرض سے اصلی غرض قریش کی شامی تجارت کا راستہ بند کرنا تھا، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، وہ حدیثیں یہ ہیں۔

(۱) اخرج ابن جریر وابن ابی حاتم وابن مردویة والبیھقی فی الدلائل عن ابی ایوب الانصاری قال قال لنا رسول الله ﷺ ونحن بالمدینة وبلغه ان عیر ابی سفیان قد اقبلت فقال ماترون فیھا لعل الله یغنمنا ویسلمنا فخرجنا الحدیث" (درمنثور للسیوطی)

ابن جریر اور ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے اور بیہقی نے دلائل میں روایت کی ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاری نے کہا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ہم سے ارشاد فرمایا اور ہم مدینہ میں تھے اور حضور کو خبر آ پہنچی تھی کہ ابوسفیان کا قافلہ آ گیا ہے پس حضور نے فرمایا کہ اس میں تمہاری کیا رائے ہے؟ شاید اللہ تعالیٰ ہم کو غنیمت دے اور سلامت رکھے، پس ہم (قافلہ کے لیے) مدینہ سے نکلے۔

(۲) اخرج ابن جریر وابن المنذر ابن مردویة عن ابن عباس رضی الله تعالی عنھما فی قوله واذ یعدکم الله احدی الطائفتین قال اقبلت عیر اھل مکة من الشام فبلغ اھل المدینة ذلک فخرجوا ومعھم رسول الله ﷺ یرید العیر الحدیث" (درمنثور للسیوطی)

ابن جریر اور ابن المنذر اور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ''وَاِذْیَعِدُکُمُ اللّٰهُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ'' کی تفسیر میں فرمایا کہ اہل مکہ کا قافلہ تجارت شام سے آیا، پس اہل مدینہ کو جو اس کی خبر پہنچی تو وہ نکلے اور ان کے ساتھ رسول اللہ ﷺ تھے جو بقصد قافلۂ تجارت نکلے تھے۔

(۳) اخرج ابن اسحق وابن جریر وابن المنذر عن ابن عباس رضی الله عنھما قال لما سمع رسول الله ﷺ بابی سفیان مقبلا من الشام ندب المسلمین الیھم وقال ھذہ عیر قریش فیھا اموالھم فاخرجوا الیھا لعل الله یملککموھا فانتدب الناس فخف بعضھم وثقل بعضھم وذلک انھم لم یظنوا ان رسول الله ﷺ یلقی حربا الحدیث" (درمنثور للسیوطی)

ابن اسحاق اور ابن جریر اور ابن منذر نے روایت کیا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے سنا کہ ابوسفیان شام سے آ رہا ہے، تو مسلمانوں کو ان کی طرف نکلنے کے لیے بلایا اور فرمایا کہ یہ قریش کا قافلہ تجارت ہے جس میں ان کے مال ہیں سو ان کی طرف نکلو، شاید اللہ تعالیٰ تمہیں غنیمت دے پس لوگوں نے حضور کی دعوت کو قبول کیا، لہٰذا بعض نے نکلنے میں جلدی کی اور بعض نے سستی کی، اس سستی کی وجہ یہ تھی کہ انہیں خیال نہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو لڑائی پیش آئے گی۔

حضرت کعب بن مالک ﷺ کی حدیث صحیح بخاری کے علاوہ صحیح مسلم (کتاب التوبۃ، باب حدیث توبۃ کعب بن مالک وصاحبیہ) میں بھی موجود ہے، اس کی صحت میں کیا شک ہوسکتا ہے؟ یہ حدیث مسئلہ زیر بحث میں نہایت قابل غور ہے، کیونکہ یہ" ولو تواعدتم لاختلفتم فی المیعاد" (الآیۃ) کی صحیح تفسیر ہے جس کا بیان پہلے آچکا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ جو کچھ مولوی شبلی صاحب نے اس بحث میں ثابت کرنا چاہا ہے، وہ قرآن وحدیث صحیح کے خلاف ہے، یہ کہنا کہ اس سے حضرت کعب کا مقصود فقط اپنے تخلف کا عذر کرنا ہے اور وہ بجا ہے، کیونکہ مسلمان مدینہ منورہ سے محض تجارت سے تعرض کے لیے نکلے تھے۔

قال الشبلی النعمانی:

اس (حدیث کعب بن مالک) کے برخلاف حضرت انس کی حدیث ہے جو بخاری ومسلم دونوں میں مذکور ہے۔

(۱) عن انس ان رسول اللہ ﷺ شاور حین بلغہ اقبال ابی سفیان قال فتکلم ابوبکر فاعرض عنہ فتکلم عمر فاعرض عنہ فقام سعد بن عبادۃ فقال ایانا ترید یا رسول اللہ ﷺ والذی نفسی بیدہ لو امرتنا ان نخیضھا البحر لاخضناھا ولو امرتنا ان نضرب اکبادھا الی برک الغماد لفعلنا قال فندب رسول اللہ ﷺ الناس فانطلقوا حتی نزلوا بدرا"

حضرت انس سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو جب ابوسفیان کے آنے کی خبر معلوم ہوئی تو آپ نے مشورہ طلب کیا، حضرت ابوبکر بولے تو آپ نے توجہ نہ فرمائی، پھر حضرت عمر بولے تو آپ نے ان کی طرف بھی توجہ نہ فرمائی پھر حضرت سعد بن عبادہ کھڑے ہوئے اور کہا یارسول اللہ؟ کیا آپ کا روئے سخن ہم انصار کی طرف ہے خدا کی قسم اگر آپ دریا میں سواری ڈالنے کا ہمیں حکم دیں تو ہم ڈال دیں گے تو ہم جائیں گے اگر برک الغماد تک جانے کا حکم دیں گے، حضرت انس کہتے ہیں کہ اس کے بعد لوگوں کو شرکت جنگ کی دعوت دی، لوگ چل پڑے اور بدر پر اترے۔

(۲) ووردت علیھم روایا قریش وفیھم غلام اسود لبنی الحجاج فاخذوہ فکان اصحاب رسول اللہ ﷺ یسألون عن ابی سفیان واصحابہ فیقول مالی علم بابی سفیان ولکن ھذا ابوجھل وعتبۃ وشیبۃ وامیۃ بن خلف فاذا قال ذلک ضربوہ فقال نعم انا اخبرکم ھذا ابوسفیان فاذا ترکوہ فقال مالی بابی سفیان من علم ھذا ابوجھل و ...... رسول اللہ ﷺ قائم یصلی فلما رای ذلک الضرب قال والذی نفسی بیدہ لتضربوہ اذا صدقکم وتترکوہ اذا کذبکم"

اور (پہلے) قریش کا ہراول دستہ آکر اترا، اس میں بنی حجاج کا ایک حبشی غلام تھا، اصحاب رسول اللہ ﷺ نے

اسے گرفتار کرلیا اور اس سے ابوسفیان کا حال پوچھنے لگے وہ کہتا تھا مجھے ابوسفیان کی خبر نہیں، لیکن یہ ابوجہل عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف آرہے ہیں، جب وہ کہتا تو لوگ اس کو مارتے، وہ کہتا اچھا ابوسفیان کا بتاتا ہوں، تب اس کو چھوڑ دیتے، تو پھر وہ کہتا تو مجھ کو ابوسفیان کی خبر نہیں، لیکن ابوجہل وغیرہ رؤسائے قریش آرہے ہیں، آنحضرت ﷺ نماز میں مشغول تھے، آپ نے یہ دیکھ کر فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جب وہ سچ کہتا ہے، تو تم اس کو مارتے ہو اور جب جھوٹ بولتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو۔

حدیث کے پہلے ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ابوسفیان کے آنے کا حال معلوم ہوا، اسی وقت آپ نے مہاجرین وانصار سے مشورہ کیا اور انصار سے اعانت کی خواہش ظاہر کی اور یہ متفقا ثابت ہے کہ ابوسفیان کی آمد کا حال مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا تھا، اس بناء پر یہ محقق طور پر ثابت ہو چکا کہ اس غزوہ کی شرکت کے لیے آپ نے انصار سے مدینہ ہی میں خواہش کی تھی، ورنہ اگر باہر نکل کر یہ معاملہ پیش آتا جیسا کہ کتب سیرت میں مذکور ہے، کہ آنحضرت ﷺ نے مشورہ کے بعد لوگوں کو شرکت کی دعوت دی حالانکہ ارباب سیرت کے مطابق واقع یہ ہونا چاہیے کہ انصار معاہدہ اور معمول سابق کے خلاف شرکت کے لیے نکلے! آنحضرت ﷺ نے پھر ان کا عندیہ دریافت فرمایا اور اس کے بعد شرکت کے لیے آمادہ کیا، ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک مجنونانہ بات ہے۔ حدیث کے دوسرے ٹکڑے سے بوضاحت تمام محقق ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو وحی کے ذریعہ سے یا کسی اور طریقہ سے یہ پہلے ہی سے معلوم تھا کہ تجارتی قافلہ کا نہیں، بلکہ جنگی فوج کا مقابلہ ہے گو عام لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو۔ اس حدیث میں ایک گرہ اور کھولنا ہے اگر پہلے صرف ابوسفیان کا آنا معلوم ہوا تھا اور قریش کے حملہ کی خبر نہ تھی، تو آنحضرت ﷺ اس اصرار اور سروسامان سے کیوں اجتماع کا اہتمام فرماتے؟ اس لیے ابوسفیان کی آمد کے بجائے موقع کا اقتضاء یہ ہے کہ یہ ہو کہ ''جب مشرکین مکہ کی آمد کی خبر معلوم ہوئی'' چنانچہ اسی واقعہ کو انہیں الفاظ کے ساتھ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ نے مسند۔ (جلد اول صفحہ نمبر ۱۱۷) میں ابن ابی شیبہ نے مصنف میں (منتخب کنز العمال غزوۂ بدر میں) اور ابن جریر نے تاریخ (جلد ۳ صفحہ نمبر ۱۲۸۹) میں اور بیہقی نے دلائل میں روایت کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے اور اس کے راوی معرکہ بدر کے ہیرو اسد اللہ علی بن ابی طالب ہیں۔

عن علی قال لما قدمنا المدینة اصبنا من ثمارها فاجتویناها و اصابنا بها وعک و کان النبی ﷺ یتخبر عن بدر فلما بلغنا ان المشرکین قد اقبلوا سار رسول اللہ ﷺ الی بدر و بدر بئر فسبقنا المشرکین الیھا"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ آئے، تو وہاں پھل کھانے کو ملے جو ہمارے ناموافق مزاج تھے، اس لیے ہم لوگ بیمار ہو گئے، آنحضرت ﷺ بدر کو پوچھا کرتے تھے، جب ہم کو خبر ملی

کہ مشرکین آرہے ہیں تو جناب رسول اللہ ﷺ بدر کو چلے ، بدر ایک کنواں کا نام ہے جہاں ہم مشرکین سے پہلے پہنچ گئے۔

(اس کے بعد بدر کے تمام واقعات وجزئیات مذکور ہیں) اس میں صاف تصریح ہے کہ مشرکین مکہ کے حملہ کی خبرسن کر آپ نکلے تھے اور بدر پر آکر قیام فرمایا تھا، اس پوری حدیث میں ابوسفیان کے قافلۂ تجارت کا ذکر تک نہیں ہے۔

(سیرت النبی، جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۶، ۲۵۸)

اقول: اس مقام پر مولوی شبلی صاحب کی حدیث دانی کو دیکھئے کہ حدیث کعب بن مالک جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں ہے، اس کو تو آپ صرف صحیح بخاری میں سمجھتے ہیں اور حدیث انس جو صرف مسلم میں ہے، اسے صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں بنا رہے ہیں حدیث انس کا جو مطلب آپ سمجھے ہیں، وہ بھی عجیب ہے، اس حدیث سے ایک اردو ترجمہ خوان بھی سمجھ سکتا ہے کہ جب ابوسفیان کے آنے کی خبر مدینہ میں پہنچی، تو آپ نے قافلۂ تجارت سے تعرض کرنے کے لیے مشورہ طلب کیا، نہ کہ غزوۂ بدر کے لیے، خبر پہنچے قافلۂ تجارت کے آنے کی، اور مشورہ لیا جائے غزوۂ بدر کے لیے! یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ بے شک یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ارباب سیر نے تو مشورہ کا مقام مدینہ سے باہر وادی ذفران بتایا ہے اور اس حدیث میں خاص مدینہ منورہ ہے قاعدۂ اصول کے مطابق ان دونوں میں تطبیق دینی چاہئے اگر تطبیق ممکن ہو تو ایک کو ترجیح دی جائے، یہاں ترجیح کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ تعارض تطبیق سے رفع ہوسکتا ہے، چنانچہ زرقانی علی المواھب اللدنیۃ صفحہ نمبر ۴۱۴ میں ہیں۔

قال الحافظ ویمکن الجمع بانہ ﷺ استشارھم مرتین الاولی بالمدینۃ اول مابلغہ خبر العیر وذلک بین من لفظ مسلم انہ شاور حین بلغہ اقبال ابی سفیان و الثالثۃ کانت بعد ان خرج کمافی حدیث الجماعۃ"

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ تطبیق ممکن ہے بدیں طور کہ آنحضرت ﷺ نے ان سے دو دفعہ مشورہ طلب کیا، پہلی دفعہ مدینہ میں جبکہ آپ کو قافلۂ تجارت کی خبر پہنچی اور یہ مسلم کے الفاظ شاور حین بلغہ اقبال ابی سفیان (آپ نے مشورہ کیا جبکہ ابوسفیان کے آنے کی خبر پہنچی) سے واضح ہے، دوسری دفعہ مدینہ سے باہر جیسا کہ اوروں کی حدیث میں ہے۔

یہ تطبیق کیسی اچھی ہے، چونکہ انصار نے بیعت کے وقت آنحضرت ﷺ سے یہ عہد کیا تھا کہ جب آپ مدینہ میں ہوں گے، تو ہماری امان میں ہوں گے، لہٰذا ان سے دو دفعہ مشورہ طلب کیا گیا، پہلی دفعہ مدینہ سے نکلنے کے وقت، یہ مشورہ محض قافلۂ تجارت سے تعرض کے لیے تھا، دوسری دفعہ وادی ذفران میں جبکہ قریش کے مکہ سے آنے کی خبر لگی، یہ

مشورہ فوج قریش سے مقابلہ کے لیے تھا، حدیث انس کے دوسرے ٹکڑے میں جو حبشی غلام کا قصہ مذکور ہے، وہ بدر پہنچ کر وقوع میں آیا ہے، اس سے یہ کیونکر ثابت ہوسکتا ہے کہ مدینہ ہی میں آنحضرت ﷺ کو معلوم ہو گیا تھا کہ جنگی فوج کا مقابلہ ہے، مولوی شبلی صاحب کا بار بار کہنا کہ آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ سے بڑے سامان کے ساتھ اچھی طرح تیاری کر کے نکلے تھے، بالکل بے اصل ہے، ہم اپنے قول کے ثبوت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی کی دوسری حدیث پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے۔

عن ثابت عن انس بن مالک قال بعث رسول الله ﷺ بسبسة عينا ينظر ما صنعت عير ابی سفيان فجاء و ما فی البيت احد غيری رسول الله ﷺ قال لا ادری ما استثنی بعض نسائه قال فحدثه الحديث قال فخرج رسول الله ﷺ فتكلم فقال ان لنا طلبة فمن كان ظهره حاضرا فليركب معنا فجعل رجال يستاذنونه فی ظهرانهم فی علو المدينة فقال لا الا من كان ظهره حاضرا فانطلق رسول الله ﷺ و اصحابه حتی سبقوا المشركين الی بدر (الحديث) (صحيح مسلم، كتاب الجهاد باب سقوط فرض الجهاد عن المعذورين)

حضرت ثابت ؓ سے روایت ہے کہ حضرت انس بن مالک ؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بسبسہ ؓ کو بطور جاسوس بھیجا کہ ابوسفیان کے قافلہ کا حال دریافت کرو، پس حضرت بسبسہ آئے اور دولت خانہ میں سوائے میرے اور رسول اللہ ﷺ اور کوئی نہ تھا، راوی نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں کہ انس نے ازواج مطہرات میں سے کسی کو مستثنیٰ نہ کیا، راوی کا قول ہے کہ انس نے مجھ سے بیان کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نکلے، پس آپ نے کلام کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارا مطلوب ایک ہے جس کا سواری کا اونٹ موجود ہو، وہ سوار ہو کر ہمارے ساتھ چلے، پس لوگ آپ سے ان اونٹوں کے لانے کیلئے جو مدینہ کے بالائی حصہ میں تھے، اجازت مانگنے لگے، آپ نے فرمایا نہیں، مگر وہ جس کا سواری کا اونٹ حاضر ہے، پس رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب روانہ ہوئے یہاں تک کہ مشرکین سے پہلے بدر میں پہنچ گئے۔

اس حدیث مسلم سے ناظرین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مسلمان مدینہ منورہ سے کیسی جلدی اور کس بے سروسامانی میں نکلے ہیں اور نکلے بھی قافلہ کے لیے ہیں۔ علامہ ابن قیم (زاد المعاد، غزوۂ بدر) یوں لکھتے ہیں۔

وجملة من حضر بدر من المسلمين ثلثمائة وبضعة عشر رجلا من المهاجرين ستة وثمانون ومن الاوس احد وستون ومن الخزرج مائة وسبعون والما قل عدد الاوس عن الخزرج وان كانوا اشد منهم واقوی شوكة ...... عند اللقاء لان منازلهم كانت فی عوالی المدينة وجاء النفير بغتة وقال النبی ﷺ لا يتبعنا الا من كان ظهره

حاضر افاستأذنه رجال ظهورهم كانت في علو المدينة ان يسأنى بهم حتى يذهبوا الى ظهورهم فابى ولم يكن عزمهم على اللقاء ولا اعدواله عدة ولا تاهبواله اهبة ولكن جمع الله بينهم وبين عدوهم على غير ميعاد"

مسلمانوں کی تعداد جو بدر میں حاضر ہوئے، تین سودس سے کچھ اوپر تھی، مہاجرین میں سے ۸۳، اوس میں سے ۶۱، اور خزرج میں سے ۱۷۰ تھے، اوس اگرچہ شوکت میں خزرج کی نسبت شدید وقوی تھے اور لڑائی کے وقت زیادہ ثابت تھے، مگر ان کی تعداد خزرج سے اس لیے کم تھی کہ ان کے گھر مدینہ کی بالائی آبادی میں تھے اور روانگی اچانک ہوگئی، اور نبی اکرم ﷺ نے فرمادیا کہ ہمارے ساتھ وہی چلے گا جس کے پاس سواری کا اونٹ موجود ہو، اس پر ان لوگوں نے جن کے اونٹ مدینہ کے بالائی حصہ میں تھے، آپ سے اجازت طلب کی کہ آپ مہلت دیں کہ ہم اپنے اونٹ لے آئیں، مگر آپ نے اجازت دینے سے انکار کیا اور ان کا ارادہ لڑائی کا نہ تھا اور نہ لڑائی کے لیے کوئی سامان تیار کیا تھا اور نہ اس کے لیے کوئی تیاری کی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اور ان کے دشمنوں کو بغیر وعدہ مقابل کردیا۔

بیان بالا سے صاف ظاہر ہے کہ مدینے سے نکلتے وقت کوئی خاص تیاری نہیں کی گئی، ورنہ فقط دو گھوڑے ستر اونٹ اور تین سو پانچ اصحاب ساتھ نہ ہوتے، بلکہ اس سے کئی گنا سامان ساتھ ہوتا، مولوی شبلی صاحب کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ فوج قریش مکہ سے مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے نہیں نکلی تھی، چنانچہ صحیح بخاری (کتاب المغازی، باب من یقتل ببدر) میں حدیث عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما میں یہ الفاظ ہیں۔

فلما كان يوم بدر استنفر ابو جهل الناس قال ادركوا عيركم فكره امية ان يخرج "

جب بدر کا دن آیا ابو جہل نے لوگوں کو نکلنے کی دعوت دی اور کہا ''تم اپنے قافلۂ تجارت کو بچاؤ'' پس امیہ نے نکلنا پسند نہ کیا۔

اس حدیث بخاری سے صاف ظاہر ہے کہ قریش مکہ سے اپنے قافلے کو بچانے کے لیے نکلے تھے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جو حدیث پیش کی گئی ہے، اس میں اختصار ہے اور صرف مدینہ سے باہر کے واقعات بیان کیے گئے ہیں، اس میں یہ مذکور نہیں کہ مدینہ میں مشرکین کے آنے کی خبر پہنچی، بدر کے حالات کا دریافت کرنا اور مشرکین کی آمد کی خبر کا آنا یقیناً مدینہ سے باہر وقوع میں آیا جیسا کہ قرآن واحادیث صحیحہ سے ثابت ہے، حضرت علی کی دوسری حدیث میں جو بروایت ابن عساکر کنز الایمان (جزء خامس صفحہ نمبر ۲۶۶) میں مذکور ہے، بخار کا آنا بھی مدینہ میں نہ تھا، حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

عن على قال لما كان ليلة بدر اصابنا وعك من حمى وشيئى من مطر الحديث"

حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ فرماتے ہیں کہ جب بدر کی رات آئی، تو ہمیں تپ کی تکلیف اور کچھ بارش ہوئی۔

بہر حال تپ کا آنا کہیں ہو، مشرکین کے مکہ سے آنے کی خبر مدینہ میں نہ پہنچی تھی اور مسلمان مدینہ منورہ سے محض قافلۂ تجارت سے تعرض کے لیے نکلے تھے۔

نتیجہ: ہماری تحقیقات بالا سے جو قرآن مجید اور احادیث صحیحہ پر مبنی ہے، غزوۂ بدر کے متعلق واقعات میں ترتیب حسب ذیل ہے۔

ہجرت کے بعد قریش نے مسلمانوں کو حج وعمرہ سے روک دیا، اس پر مسلمانوں نے ان کی شامی تجارت کا راستہ بند کرنے کا ارادہ کیا تا کہ وہ مذہبی مداخلت سے باز آجائیں، اسی غرض کے لیے مسلمانوں نے ان کے قافلوں سے چھیڑ خانی شروع کی، چنانچہ جب آنحضرت ﷺ کی بذریعہ وحی ابوسفیان کے قافلۂ تجارت کے آنے کی خبر لگی تو آپ نے بالخصوص انصار سے قافلۂ تجارت پر حملہ کرنے کے لیے استمزاج فرمایا، چنانچہ آپ فوری نا تمام تیاری کر کے نہایت جلدی سے مدینہ سے نکلے، وادیٔ ذفران میں حضرت جبرائیل علیہ السلام حضور اقدس ﷺ کی خدمت بابرکت میں قریش کے مکہ سے آنے کی خبر دار دونوں جماعتوں (قافلۂ تجارت وفوج قریش) میں سے ایک کے وعدے کے ساتھ نازل ہوئے، حضور نے مہاجرین وانصار سے دوبارہ استمزاج فرمایا کہ وہ دونوں جماعتوں میں سے کسے چاہتے ہیں، اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو طائفہ ثانیہ پر فتح کی بشارت دی، لہذا حضور جاں نثارانہ تقریریں سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا ''اللہ کی قسم! گویا میں قریش کے مرنے کی جگہوں کو دیکھ رہا ہوں'' قصہ کوتاہ آنحضرت ﷺ وہاں سے بدر پہنچے، جہاں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عظیم دی۔

قال الشبلی النعمانی: ان قطعی نصوص کے بعد اگر چہ کسی اور استدلال کی ضرورت نہیں، لیکن لیطمئن قلبی کے طور پر واقعات ذیل پر لحاظ کرنا چاہیے۔

(۱) آنحضرت ﷺ نے اس سے پہلے قریش کے قافلوں پر حملہ کرنے کے لیے جس قدر سرایا بھیجے اور جن میں بیس تیس آدمی سے لے کر سو دو دو سو تک کی جمعیت تھی، ان میں کبھی کسی انصاری کو نہیں بھیجا، ارباب سیر اس خاص امر کو یہ تصریح لکھتے ہیں اور اس تصریح کی اس لیے ضرورت سمجھتے ہیں کہ انصار نے بیعت کے وقت مدینہ سے باہر نکلنے کا اقرار نہیں کیا تھا، اس بناء پر اگر اس دفعہ بھی مدینہ سے نکلنے کے وقت صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو انصار ساتھ نہ ہوتے، حالانکہ اس واقعہ میں انصار کی تعداد مہاجرین سے زیادہ تھی، یعنی کل فوج ۳۰۵ تھی جن میں ۷۴ مہاجرین اور باقی سب انصار تھے، یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ جس وقت مدینہ سے آپ نکلے یہ خبر آچکی تھی کہ قریش مدینہ پر آرہے ہیں، اسی بناء پر آپ نے انصار کو مخاطب کیا، کیونکہ معاہدۂ بیعت کے موافق اب انصار سے کام لینے کا وقت آچکا تھا۔

(سیرت النبی جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۸)

اقول: مولوی شبلی صاحب نے اس مقام تک جو نصوص قطعی پیش کی ہیں ان کا حال تو ناظرین پر واضح ہو چکا ہے، اب مولوی صاحب بلاسند اپنے قیاسات بیان کرتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ قریش کے مکہ سے آنے کی خبر مدینہ میں نہ پہنچی تھی، ہاں قافلہ ابوسفیان کے شام سے آنے کی خبر پہنچ چکی تھی، لہذا بنا بر معاہدہ بیعت حضور اقدس ﷺ نے مدینہ ہی میں قافلہ تجارت سے تعرض کرنے کے لیے انصار سے مشورہ طلب فرمایا جیسا کہ حدیث مسلم کے حوالے سے پہلے بیان ہوا، لہذا مولوی صاحب کی خامہ فرسائی بے سود ہے۔

قال الشبلی النعمانی: (۲) مکہ سے جو قافلہ تجارت کے لیے شام کو جایا کرتا تھا، مدینہ کے پاس سے ہو کر گزرتا تھا، مدینہ سے مکہ تک جس قدر قبائل آباد تھے، عموماً قریش کا اثر نہ تھا، اس بناء پر اگر کاروان تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو شام کی طرف بڑھتا تھا، یہ بالکل خلاف قیاس ہے کہ کاروان تجارت شام سے آ رہا ہے، آنحضرت ﷺ کو خبر ہو چکی ہے اور آپ بجائے اس کے کہ شام کی طرف بڑھیں، مکہ کی طرف جاتے ہیں اور پانچ منزل مکہ کی طرف جا کر خبر آتی ہے کہ قافلہ بچ کر نکل گیا اور قریش سے جنگ پیش آ جاتی ہے۔ (سیرت النبی جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۸،۲۵۹)

اقول: اس میں شک نہیں کہ جب مسلمان مدینہ منورہ سے نکلے تو ان کا مقصود فقط کاروان تجارت سے تعرض کرنا تھا، مولوی شبلی صاحب کا یہ قیاس بالکل درست ہے کہ انہیں شام کی طرف بڑھنا چاہیے تھا، مگر چونکہ قافلہ کا ٹھیک مقام اور پہنچنے کا وقت معلوم نہ تھا، اس لیے حضور اقدس ﷺ نے پہلے دو آدمیوں کو شام کی طرف بغرض تجسس بھیجا۔ چنانچہ طبقات ابن سعد میں ہے۔

لماتحین رسول اللہ ﷺ انصراف العیر من الشام التی کان خرج لھا یریدھا حتی بلغ ذوالعشیرۃ بعث طلحۃ بن عبیداللہ التیمی وسعید بن زید بن عمرو بن نفیل یتجسسان خبر العیر فبلغا التجبار من ارض الحوراء فنزلا علی کشد الجھنی فاجارھما وانزلھما وکتم علیھما حتی مرت العیر ثم خرجا وخرج معھما کشد خفیرا حتی اوردھما ذا المروۃ وساحلت العیر واسرعت فساروا باللیل والنھار فرقا من الطلب فقدم طلحۃ وسعید المدینۃ لیخبرا رسول اللہ ﷺ خبر العیر فوجداہ قد خرج "

چونکہ رسول اللہ ﷺ شام سے اس قافلہ کی واپسی کے منتظر تھے جس کے قصد سے ذوالعشیرہ تک تشریف لے گئے تھے، اس لیے آپ نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ تیمی اور سعید بن زید بن عمرو بن نفیل کو بطور جاسوس قافلہ کی خبر لانے

کے لیے بھیجا، چنانچہ وہ دونوں تجبار واقع سرزمین حوراء تک پہنچے اور کشد جہنی کے ہاں اتارا اور ان کو پوشیدہ رکھا یہاں تک کہ قافلہ گزر گیا، پھر وہ دونوں نکلے اور ان کے ساتھ کشد بھی بطور رہنما نکلا، یہاں تک کہ ان کو ذوالمرۃ لے آیا اور قافلہ ساحل کی طرف ہولیا اور جلدی چلا، اہل قافلہ گرفتاری کے ڈر سے دن رات چلتے تھے، پس طلحہ اور سعید مدینہ منورہ میں آئے، تا کہ رسول اللہ ﷺ کو قافلہ کی خبر دیں مگر حضور اقدس ﷺ ان کے پہنچنے سے پہلے روانہ ہو چکے تھے۔

ذوالمروہ (دیکھو معجم البلدان) وادی القری میں ہے جو مدینہ منورہ سے شام کے راستے میں ہے، چونکہ ذوالمروہ سے قافلہ مدینہ کا راستہ چھوڑ کر ساحل بحر کو ہولیا تھا، اور بچنے کے لیے شب و روز چلتا تھا، اس لیے حضرت طلحہ وسعید رضی اللہ عنہما کے مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے وہ ساحل بحر کے رخ دور نکل گیا تھا کہ اس اثنا میں حضرت بسیسہ رضی اللہ عنہ اس کی خبر لائے، یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کو نہایت جلدی مدینہ منورہ سے نکلنا پڑا اور انہوں نے بجائے شمال مدینہ کے مدینہ منورہ کے جنوب مغرب کو ساحل بحر کا رخ کیا تا کہ اسے جا گھیریں۔ مولوی شبلی صاحب نے اس قسم کے اور قیاسات بھی پیش کیے ہیں جو نظر برا ختصار پس انداز کیے جاتے ہیں۔

اللھم انی اسئلک بحبیبک سیدنا ومولنا محمد ن المصطفی ﷺ وباھل بدر ﷺ ان تبلغنی فی الدارین اقصی مرامی وتغفرلی ولوالدی ولمشائخی ولاحبائی ولسائر المؤمنین والمؤمنات وان تؤید الاسلام والمسلمین" (غزوات النبی)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ○ (آیۃ نمبر ۱۲۶)

(1) اور یہ فتح اللہ نے نہ کی مگر تمہاری خوشی کیلئے اور اسی لئے کہ اس سے تمہارے دلوں کو چین ملے اور مدد نہیں مگر اللہ غالب حکمت والے کے پاس سے۔ (کنزالایمان)

(2) اور نہیں بنایا اس کو (امداد کو) اللہ نے مگر خوشخبری تمہارے لئے اور تا کہ اطمینان حاصل ہو جائے تمہارے دلوں کو اس کی وجہ سے، اور نہیں ہے امداد مگر اللہ کی طرف سے جو غالب ہے (اور) حکمت والا۔ (نجوم الفرقان)

﴿وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ﴾ اس میں ضمیر منصوب "نصر" مصدر کی طرف لوٹ رہی ہے جو "نصرکم" کے ضمن میں

موجود ہے، یعنی فعل مصدر پر دلالت کر رہا، یا ضمیر ''امداد'' کی طرف لوٹ رہی ہے جس پر یمددکم دلالت کر رہا ہے، مطلب یہ ہوا کہ نہیں بنایا مدد کو مگر بشارت تمہارے لئے۔ تفسیر ابن کثیر نے انزال کی طرف ضمیر لوٹائی ہے جس پر منزلین دلالت کر رہا ہے، اب مطلب یوں ہو جائے گا اور نہیں بنایا اسے (فرشتوں کے نازل کرنے کو) اللہ نے مگر خوشخبری تمہارے لئے۔

اعتراض: ''بُشْرٰی'' اسم ہے ابشار سے، اور ''وَلِتَطْمَئِنَّ'' فعل ہے، یہاں عطف فعل کا اسم پر ہے جو نحویوں کے نزدیک پسندیدہ طریقہ نہیں۔

جواب اول: امداد میں دو چیزیں مطلوب ہیں، ایک مطلوب ہونے میں دوسری چیز سے قوی ہے، وہ دو چیزیں یہ ہیں۔

(۱) دلوں میں سرور کو داخل کرنا جو مراد ہے (اِلَّا بُشْرٰی) سے۔

(۲) دوسری چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معاونت اور امداد پر دلوں کو اطمینان حاصل ہو جائے، تاکہ وہ بزدل نہ ہو جائیں ''وهذا هو المقصود الاصلى'' یہی مقصود اصلی ہے۔

''ففرق بين هاتين العبارتين تنبيها على حصول التفاوت بين هذين الامرين فى المطلوبية فكونه بشرى مطلوب ولكن المطلوب الاقوى حصول الطمانينة''

ان دونوں عبارتوں میں اس لئے فرق رکھا ہے کہ اس پر تنبیہ کر دی جائے کہ دونوں چیزوں کے مطلوب ہونے میں فرق ہے، اگرچہ بشارت بھی مطلوب ہے، لیکن اطمینان قلب زیادہ قوی مطلوب ہے۔

''فلهذا ادخل التعليل على فعل الطمانينة فقال (ولتطمئن)

یہی وجہ ہے کہ مقصود اصلی اطمینان قلب تو اس پر لام داخل کیا، امداد کرنے کی وجہ تمہارے دلوں کو اطمینان دینا تھا۔

اس کی نظیر قرآن پاک کی یہ آیۃ کریمہ بھی ہے ''والخيل والبغال والحمير لتركبوها وزينة'' یعنی ان پر سوار ہو جاؤ، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ تم ان سے زینت حاصل کرو، لیکن ان دونوں چیزوں میں سے ''ولما كان المقصود الاصلى هو الركوب ادخل حرف التعليل عليها'' مقصود اصلی سوار ہونا ہے اسلئے اس پر لام تعلیلیہ داخل کیا ہے۔ (ماخوذ از مفاتیح الغیب المعروف بالکبیر)

اعتراض: اللہ تعالیٰ کے افعال معلل بالاغراض (کسی غرض اور علت پر موقوف) نہیں ہوتے، تو اس زیر بحث آیۃ کریمہ اور دوسری آیۃ جو بطور نظیر پیش کی ان میں لام تعلیلیہ کے آنے کا کیا مطلب؟

جواب: یہ چیزیں بندوں کیلئے علت ہیں، اللہ تعالیٰ کیلئے کوئی چیز علت نہیں۔ (راقم)

جواب دوم: پہلے اعتراض کا یہ دوسرا جواب ہے کہ "ولتطمئن" میں واؤ زائد عاطفہ نہیں کہ اس پر کسی قسم کا کوئی گناہ لازم آئے۔

﴿وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾

''اور نہیں امداد مگر اللہ کی طرف سے جو غالب (اور) حکمت والا۔''

"والغرض منه ان يكون توكلهم على الله لا على الملائكة" غرض اس بیان سے یہ ہے کہ صحابہ کرام کو متنبہ (خبردار) کرنا مقصود تھا کہ فرشتوں کی امداد کی طرف توجہ نہ کرنا، بلکہ کامل بھروسہ اللہ تعالیٰ پر رکھنا کہ حقیقی طور پر وہی ہے امداد کرنے والا، یہ ظاہری فقط اسباب ہیں۔

"وهذا تنبيه على ايمان العبد لا يكمل الا عند الاعراض عن الاسباب والاقبال بالكلية على مسبب الاسباب"

اور اس سے ایمان والوں کو تنبیہ کی گئی کہ بندے کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوتا، اور اعلیٰ درجہ تک نہیں پہنچتا جب تک وہ اسباب سے اعراض نہ کرے، یعنی اسباب کو مؤثر حقیقی نہ سمجھے، بلکہ مؤثر حقیقی صرف اللہ تعالیٰ کو سمجھے۔

﴿اَلْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾

''فالعزيز اشارة الى كمال قدرته'' اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت "عزیز" ذکر فرما کر اس طرف اشارہ کیا کہ اسے کمال قدرت حاصل ہے۔

"والحكيم اشارة الى كمال علمه فلا يخفى عليه حاجات العباد ولا يعجز عن اجابة الدعوات"

اور رب تعالیٰ نے اپنی صفت حکیم ذکر فرما کر یہ بتایا کہ اللہ کو کامل اور حقیقی علم حاصل ہے وہ اپنے بندوں کی حاجات کو جانتا ہے، ان کی کوئی حاجت ان پر مخفی نہیں، اور ان کی دعاؤں کو قبول کرنے سے کوئی چیز اسے عاجز نہیں کر سکتی۔ جس ذات کی یہ شان ہے اس کا امداد کرنا سوائے اس کی رحمت کے نہیں، اور نہ ہی اس کی اعانت حاصل ہے سوائے اس کے فضل و کرم کے۔ (کبیر)

اعتراض: انهم لو كانوا اجساما كثيفة وجب ان يراهم الكل وان كانوا اجساما لطيفة هوائية تعذر ثبوتهم على الخيل"

فرشتے اگر اجسام کثیفہ تھے تو ضروری تھا کہ ان کو سب لوگ دیکھتے، اگر اجسام لطیفہ ہوائیہ تھے تو ان کو گھوڑوں پر سوار متعذر (مشکل) ہے، پتہ چلا کہ فرشتے گھوڑوں پر سوار ہو کر امداد کیلئے آئے تھے یہ قول درست نہیں۔

جواب: یہ اعتراض قوانین شریعت کے خلاف ہے، اور نہ ہی وہ اعتراض کرسکتا ہے جو یہ اعتراف کرے "انه تعالی قادر علی مایشاء فعال لمایرید" کہ اللہ تعالی قادر ہے ہر چیز پر جسے وہ چاہے، اور وہ کرتا ہے جس کام کا وہ ارادہ کرتا ہے، جب قرآن پاک کی آیات میں واضح طور پر فرشتوں کا آنا اور امداد کرنا ثابت ہے اور احادیث سے ثابت ہے جو متواتر کے قریب ہیں تو ان کا انکار بہرہ اور گونگا ہی کرسکتا ہے "فکأن الاصم اصم عن سماعه او اعمی عن رؤية رباعه" گویا کہ کفر کی وجہ سے جو بہرہ ہے وہ آیات واحادیث کو سننے سے بھی بہرہ ہے، اور کفر کی وجہ سے جو حق راہ کو دیکھنے سے اندھا ہے وہ قرآن پاک کی آیات مبارکہ اور احادیث مبارکہ کو حق دیکھنے سے بھی اندھا ہے۔ (روح المعانی)

اعتراض: اکیلے جبریل نے لوط علیہ السلام کی قوم کو زیروزبر کردیا تھا، فرشتے جب بدر میں آگئے تھے تو لوگوں کو لڑائی کرنے کا حکم کیوں دیا گیا، اور اتنے فرشتوں کے آنے کا کیا فائدہ تھا ایک جبریل ہی کفار قریش کو قتل کرسکتے تھے۔

جواب: لوط علیہ السلام کی قوم جب مستحق عذاب ہوگئی تو وہ دائرہ تکلیف (مکلف ہونے) سے باہر آگئے، اس لئے جبریل نے ان کو زیروزبر کردیا، لوگوں کو ان سے لڑنے کا حکم نہیں دیا گیا کیونکہ وہ تمام گمراہ تھے سوائے لوط علیہ السلام کے اور ان کی بچیوں کے، لیکن یہاں تو صحابہ کرام مکلف تھے اسلئے ان کو لڑائی کرنے کا حکم دیا گیا، جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے کہ اتنی تعداد میں فرشتے کیوں آئے صرف جبریل ہی کافی تھے، اس کی وجہ پہلے بیان کی جاچکی ہے کہ فرشتے لڑائی کرنے کیلئے نہیں آئے تھے صرف مسلمانوں کے اطمینان قلب کیلئے آئے تھے، ہاں کہیں کہیں کفار پر ضرب بھی لگادی جیسا کہ پہلے حدیث پاک سے یہ مسئلہ ثابت کیا جاچکا ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

"فان الانسان معتاد بتثبت الاسباب فيطمئن قلبه عندملاحظة الاسباب بالنصر عندكثرة الاعوان"

اصل وجہ یہ ہے کہ انسان کی ایک عادت ہے کہ وہ اسباب کا سہارا لیتا ہے، جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ امداد کے ظاہری اسباب پائے گئے ہیں، اور کثیر مددگار پائے گئے ہیں تو اس کا دل مطمئن ہوجاتا ہے۔

(مظہری)

یہی وجہ ہے کثیر تعداد میں فرشتوں کے آنے کی، صحابہ کرام چونکہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی پر کامل ایمان رکھتے تھے آپ نے جب رب تعالی کا ارشاد گرامی سنادیا تو انہوں نے اس پر ایمان لایا کہ ہاں یقیناً کثیر تعداد میں فرشتے ہماری امداد کو آگئے، کہیں کہیں کسی فرشتے کو انسانی شکل میں گھوڑے پر سوار بعض صحابہ نے دیکھ بھی لیا۔

لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ٥ (آیۃ نمبر ۱۲۷)

(1) اس لئے کہ کافروں کا ایک حصہ کاٹ دے یا انہیں ذلیل کرے کہ نامراد پھر جائیں۔ (کنز الایمان)

(2) تا کہ کاٹ دے ایک حصہ کافروں کا یا ذلیل کر دے ان کو کہ وہ لوٹیں محروم ہو کر۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

"لِيَقْطَعَ" میں "لام کی" جو حقیقت میں لامِ جارہ ہی ہوتا ہے اس کا تعلق ﴿وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾ سے ہے۔

"والمعنى ان المقصود من نصركم بواسطة امداد الملائكة هو ان يقطعوا طرفا من الذين كفروا اى يهلكوا طائفة منهم ويقتلوا قطعة منهم"

مطلب یہ ہے کہ تمہاری فرشتوں کے ذریعے امداد کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کافروں کی ایک طرف کو کاٹ دیا جائے یعنی ایک گروہ کو ہلاک کر دیا جائے کہ وہ میدان جنگ میں قتل کر دیئے جائیں۔ "لِيَقْطَعَ" کا تعلق" ولتطمئن قلوبكم به" سے بھی کیا گیا ہے، البتہ اس صورت میں حرف عطف واؤ کو حذف کیا گیا ہے، اس صورت میں مطلب یوں ہو جائے گا، یہ امداد تمہارے لئے اللہ تعالیٰ نے بشارت بنائی اور تمہارے دلوں کو اطمینان پہنچانے کیلئے، تا کہ اس امداد کے ذریعے تمہارے دلوں کو اطمینان حاصل ہو خاص کر کے کافروں کے ایک حصہ کے کٹ جانے سے تمہارے دلوں کو اور زیادہ اطمینان حاصل ہو جائے۔ "طرفا" ای طائفة وقطعة ""طرفا" کا معنیٰ ایک گروہ اور ایک ٹکڑا، ایک حصہ، "طرف" ذکر کیا، وسط ذکر نہیں کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وسط تک پہنچنے کیلئے ضروری ہے کہ پہلے ایک طرف سے شروع کرے، اس سے جنگی تدبیر میں بتادی، جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا "قاتلوا الذين يلونكم" قتال کرو ان لوگوں سے جو تمہارے قریب ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

یعنی پہلے ایک طرف کے قریب لوگوں سے جنگ کی جائے، ان کو ختم کر کے آگے بڑھا جائے، ایسا نہ ہو کہ ایک مرتبہ ہی درمیان میں گھس جائے، کفار ادھر ادھر سے گھیرے میں لے کر اسے شکست سے دوچار نہ کر دیں۔

"اويكبتهم "يذلهم بالهزيمة" (جلالين) یا ان کو شکست دے کر ذلیل و خوار کر دے، الكبت: فتاء ه مبدلة من الدال وهو الغيظ الذى يحرق الكبد""الكبت" اصل میں "الكبد" ہے، دال کو تاء بنایا گیا، کبد کا معنیٰ ہے "جگر" کلیجہ" پھر "کبت" اس غیظ و غضب پر بولا گیا جس سے جگر اور کلیجہ جل اٹھے۔ (صاوی)

اسی مناسبت سے لغت میں یہ معنی بھی استعمال ہے۔ "الکبت فی اللغة صرع الشئی علی وجهه"" الکبت" کا لغوی معنی یہ ہے "کسی چیز کا چہرا کے بل گر جانا" "اوندھا ہونا" سرنگوں ہونا، الٹا ہونا کہ سر نیچے اور پاؤں اوپر ہونا وغیرہ اس قسم کے معانی میں عام طور پر استعمال ہوتا رہتا ہے، اسی طرح کہا جاتا ہے "کبته فانکبت" میں نے اسے چہرے کے بل گرایا تو وہ گر گیا۔

"والمرادبه الاخزاء والاهلاک واللعن والهزيمة والغيظ والاذلال فكل ذلك ذكره المفسرون في تفسير الكتب"

مفسرین کرام نے "کبت" کی تفسیر میں مرادی معانی مختلف بیان کئے ہیں تقریباً مقصد سب کا ایک ہی ہے، وہ معانی یہ بیان کئے گئے ہیں "رسوا کرنا، ہلاک کرنا، لعنت کرنا، شکست دینا، غیظ و غضب کرنا اور ذلیل کرنا۔ (کبیر)

﴿فَيَنْقَلِبُوْا خَائِبِيْنَ﴾ "کہ وہ لوٹیں محروم ہو کر۔"

وقوله (خائبين) الخيبة هي الحرمان "خیبۃ کا معنی ہے محروم ہونا، اسی وجہ سے **راقم** نے یہی ترجمہ کیا ہے" کہ وہ لوٹیں محروم ہو کر" "خیبۃ" اور "یاس" میں فرق یہ ہے "ان الخيبة لاتكون الا بعد التوقع واما الياس فانه قد يكون بعد التوقع وقبله" کہ بیشک "خیبۃ" اس محرومیت اور رسوائی پر بولتے ہیں جو توقع کے بعد حاصل ہو، کام کے ہونے کی توقع تھی لیکن وہ کام نہ ہوا بلکہ محرومیت حاصل ہوئی، اور یاًس کبھی توقع کے بعد امید کے ختم ہونے پر بولتے ہی، اور کبھی اس پر بولتے ہیں کہ توقع تو نہیں تھی لیکن پہلے ہی کام ہونے کی امید ختم ہوگئی۔ فنقيض الياس الرجاء ونقيض الخيبة الظفر" والله اعلم ، یاًس کی نقیض "رجاء" ہے، یعنی "یاًس" کا معنی ناامید ہونا، اور رجاء کا معنی ہے "امید رکھنا" اور خیبۃ کی نقیض "ظفر" ہے "خیبۃ" کا معنی ہے کامیاب نہ ہونا، اور "ظفر" کا معنی ہے "کامیاب ہونا۔ (کبیر)

علامہ رازی رحمہ اللہ کی تفسیر کبیر کو دیکھنے کے بعد اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ بہت خوب نظر آئے گا، آپ نے یوں ترجمہ کیا "کہ نامراد پھر جائیں۔

تنبیہ: بعض مفسرین کرام نے اس آیہ کریمہ کو غزوہ احد کے متعلق ذکر کیا ہے، لیکن زیادہ جمہور محققین نے بدر کے ساتھ متعلق کیا ہے، اگر غزوہ احد کے ساتھ متعلق ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ جب تم نے درہ کو چھوڑ دیا تھا اور بظاہر نبی کریم ﷺ کے حکم کی تم سے اجتہادی خطاء سے مخالفت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری امداد کی کہ سولہ یا اٹھارہ کافر قتل

ہو گئے تھے، اور تمہیں میدان جنگ میں قائم رکھ کر ان کو رسواء کر کے لوٹا دیا۔ (ماخوذ از کبیر)

تنبیہ: (لیقطع طرفا من الذین کفروا) بالقتل والاسر" (جلالین)

تاکہ کاٹ دے ایک طرف کافروں کی، یعنی ان کو قتل کرا کے اور قید کرا کے ان کی طرف کاٹ دیا جائے، یعنی ستر کی تعداد میں وہ قتل ہو گئے اور ستر قید ہو گئے، یہی تفسیر البحر المحیط میں بھی ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

لَیۡسَ لَکَ مِنَ الۡاَمۡرِ شَیۡءٌ اَوۡ یَتُوۡبَ عَلَیۡہِمۡ اَوۡ یُعَذِّبَہُمۡ فَاِنَّہُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ○ (آیۃ نمبر ۱۲۸)

(1) یہ بات تمہارے ہاتھ نہیں یا انہیں توبہ کی توفیق دے یا ان پر عذاب کرے کہ وہ ظالم ہیں۔ (کنز الایمان)

(2) نہیں ہے آپ کیلئے کسی امر سے کوئی چیز، یہاں تک کہ وہ ان کی توبہ قبول کرے، یا ان کو عذاب دے بیشک وہ ظالم ہیں۔ (نجوم الفرقان)

مقام پر خطر ایمان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھنا:

(لَیۡسَ لَکَ مِنَ الۡاَمۡرِ شَیۡءٌ) ای لاتملک لھم نفعافتصلحھم ولاضرافتھلکھم فنفی ذلک من حیث الایجادوالاعدام وامامن حیث الدلالۃ والشفاعۃ فھوالدلیل الشفیع المشفع جعل اللہ مفاتیح خزائنۃ بیدہ فمن زعم ان النبی ﷺ کآحادالناس لایملک شیئااصلاولانفع بہ لاظاھراولاباطنافھو کافرخاسرالدنیاوالآخرۃ واستدلالہ بھذہ الآیۃ ضلال مبین" (صاوی)

"آپ کیلئے کسی امر میں کوئی خبر نہیں" یہ راقم نے لغوی ترجمہ کیا ہے، مطلب اس کا تفسیر صاوی میں بہت خوب بیان کیا گیا ہے، کہ آپ کے ہاتھ میں کسی چیز کا موجود کرنا یعنی تخلیق کرنا یا کسی چیز کا معدوم کرنا یعنی فوت کرنا نہیں، کہ آپ ذاتی طور پر ان کو نفع نہیں پہنچا سکتے جو ان کیلئے نفع مند ہو اور نہ ہی آپ ذاتی طور پر ان کو نقصان پہنچا سکتے ہیں جو ان کو ہلاک کر دے۔

"والمعنی ان اللہ مالک امرھم علی الاطلاق فامان یھلکم اویکبتھم اویتوب علیھم ان اسلمواا ویعذبھم تعذیباشدیدااخرویاان اصروا" (روح البیان)

معنی یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ ان کے تمام امور کا مطلقاً مالک ہے، ان کو ہلاک یا ان کو ذلیل و رسوا کرے یا ان کو ایمان کی توفیق عطاء کر دے کہ وہ ایمان لے آئیں تو ان کی توبہ قبول کر لے، اور اگر وہ کفر پر اصرار

کریں تو ان کو شدید اخروی عذاب دے''

(فانهم ظالمون) قد استحقوا التعذیب بظلمهم " (بیشک وہ ظالم ہیں) یعنی بوجہ ظلم کرنے کے وہ مستحق عذاب ہیں۔ عنوان کے مطابق تفسیر صاوی کی بعد والی عبارت پر توجہ کریں'' کہ نبی کریم ﷺ سے ایجاد کرنے اور معدوم کرنے کی نفی کی گئی ہے، جہاں تک راہنمائی کرنے اور شفاعت کرنے کا تعلق ہے اس میں آپ کو اختیار دیا گیا ہے، آپ کو رب تعالیٰ نے "شافع مشفع" بنایا ہے کہ آپ شفاعت فرماتے ہیں اور آپ کی شفاعت کو قبول کیا جاتا ہے آپ کے ہاتھوں میں اللہ تعالیٰ نے خزانوں کی چابیاں دے دیں، جو شخص یہ گمان کرے کہ نبی کریم ﷺ امت کے عام آدمیوں کی طرح ہیں، کسی چیز کے ظاہرا اور باطنا مالک نہیں وہ کافر ہے دنیا اور آخرت میں خسارت میں ہے، اگر کوئی اس آیہ کریمہ سے نبی کریم ﷺ کے اختیار کی نفی ثابت کرنے کی کوشش تو وہ واضح گمراہ ہے، اور اس کا یہ باطل استدلال کھلی گمراہی ہے۔

شان نزول میں چند احتمالات:

اگرچہ بظاہر چند احتمالات نظر آرہے ہیں لیکن تمام ہی حقیقت میں معتبر ہیں۔ کئی واقعات کے بعد آیہ کریمہ جب نازل ہو تو وہ سب ہی مجموعی طور شان نزول ہوتے ہیں۔

(۱) شان نزول میں ایک قول یہ ہے کہ یہ آیہ کریمہ غزوہ احد کے متعلق نازل ہوئی جب نبی کریم ﷺ کا دانت مبارک شہید کردیا گیا اور آپ کا سر مبارک زخمی کردیا گیا۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیہ کریمہ بیر معونۃ کے متعلق نازل ہوئی، جہاں حفاظ وقراء کو شہید کردیا گیا تھا۔

شان نزول کی مکمل تفصیل:

پہلا قول: جب پہلا قول مراد لیا جائے لیا جائے کہ یہ آیہ کریمہ غزوہ احد کے متعلق نازل ہوئی تو اس میں پھر تین احتمال ہیں۔

ایک احتمال یہ ہے:

"وقیل اراد ان یدعو علیهم فنزلت هذه الآیة" کہ نبی کریم ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ احد والے کفار

کے خلاف دعاء کریں کہ وہ تباہ و برباد ہو جائیں، تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی جس سے آپ کو منع کیا گیا کہ یہ معاملہ رب تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے آپ نے احد میں شریک کفار کے متعلق دعاء ہلاکت کرنے کا ارادہ کیوں فرمایا؟ اس کی وجہ اس حدیث پاک سے دیکھئے۔

﴿ عن انس ابن مالک ان رسول اللهﷺ کسرت رباعیته وشج فی راسه فجعل یسلت الدم عنه ویقول کیف یفلح قوم شجوانبیهم و کسروارباعیته وهویدعوهم الی الله تعالی فانزل الله تعالی "لیس لک من الامرشیٔ"

حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ کا جب رباعیہ دانت کا کچھ حصہ شہید کر دیا گیا (آپ کا سر مبارک زخمی کر دیا گیا تو آپ وہ خون صاف کر رہے تھے اور ارشاد فرما رہے تھے وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جنہوں نے اپنے نبی کے سر اور چہرہ کو زخمی کر دیا اور دانت کا ایک حصہ شہید کر دیا حالانکہ وہ نبی ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہے (تو اس وقت آپ نے ارادہ فرمایا کہ ان کیلئے دعاء ہلاکت کریں) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیۃ کریمہ نازل فرمائی۔

دوسرا احتمال اس میں یہ ہے:

﴿ روی احمدوالبخاری عن ابن عمرقال سمعت رسول اللهﷺ یقول اللهم العن فلاتا،وفی روایة اللهم العن اباسفیان اللهم العن الحارث بن هشام اللهم العن سهیل بن عمرواللهم العن صفوان ابن امیة فنزلت هذه الآیة الی آخرفتیب علیهم کلهم"

مسند احمد اور بخاری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ذکر کی کہ آپ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا "اے اللہ فلاں پر لعنت کر" ایک روایت میں (صراحۃ مذکور) ہے کہ آپ یہ کہہ رہے تھے "اے اللہ ابوسفیان پر لعنت بھیج، اے اللہ حارث بن ہشام پر لعنت بھیج، اے اللہ سہیل بن عمرو پر لعنت بھیج، اے اللہ صفوان بن امیہ پر لعنت بھیج تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی، یہ تمام لوگ ایمان لے آئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کو قبول فرمالیا۔

تیسرا احتمال اس میں یہ ہے:

﴿ وقال سعیدبن المسیب ومحمدبن اسحاق لمارأی رسول اللهﷺ والمسلمون یوم احدمانال اصحابهم من جزع الآذان والانوف وقطع المذاکیرقالوالئن انالنا الله منهم لنفعلن بهم مثل مافعلواولنمثلن بهم مثلة،لم یمثلهااحدمن العرب باحد،فانزل

الله هذه الآية وقيل اراد النبی ﷺ ان يدعو عليهم بالاستيصال فنزلت هذه الآية "

سعید بن میتب اور محمد بن اسحاق کہتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں نے احد کے دن دیکھا کہ بعض صحابہ کرام (حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ) کے کان اور ناک کاٹ دیئے گئے، اور ان کا آلہ تناسل کاٹ دیا گیا یعنی ان کو مثلہ بنا دیا گیا، تو انہوں نے کہا اگر ہمیں موقع ملا تو ہم بھی کافروں کو مثلہ بنا کر ان کی شکلوں کو بگاڑ دیں گے، کیونکہ اس سے پہلے عرب میں کسی ایک نے بھی کسی کو مثلہ نہیں بنایا تھا، یہ پہلا موقع تھا جہاں کفار نے مثلہ بنانے کا رواج قائم کیا، رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر مسلمانوں کو اس ارادہ سے منع فرما دیا، کہ انہوں نے اگر غلط کام کیا ہے تو تم اس کے جواب میں ایسا نہ کرنا، اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی اس حالت کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ ان کی تباہی و بربادی کی دعاء کی جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا۔ (ماخوذ از کبیر و مظہری)

روایات میں تطبیق کیسے؟

ابھی تک جو روایات بیان کی گئی ہیں ان میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے غزوۂ احد میں کافروں کے تباہ و برباد ہو جانے کی دعاء کا ارادہ کیا، بلکہ چند لوگوں پر نام لے کر لعنت بھی فرمائی، لیکن دوسری روایت ان روایات کے خلاف نظر آتی ہے، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔

۞ **عن ابن مسعود قال كانی انظر الی رسول الله ﷺ يحكی نبيامن الانبياء ضربه قومه وهو يمسح الدم عن وجهه ويقول "رب اغفرلی لقومی فانهم لايعلمون"**

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں گویا کہ اب بھی رسول اللہ ﷺ کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ انبیاء کرام میں سے ایک نبی کی حکایت بیان کر رہے تھے کہ اللہ کے نبی کو اس کی قوم نے مارا، وہ اللہ کا نبی اپنے چہرے سے خون صاف کر رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا، اے میرے رب میری قوم کی مغفرت فرما بیشک وہ نہیں جانتے۔

"قال علماؤنا فالحاكی فی حديث ابن مسعود هو الرسول ﷺ وهو المحكی عنه"

علماء کرام نے بیان کیا ہے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں مراد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ خود اپنا واقعہ بیان فرما رہے تھے، اگرچہ غائب کے صیغے استعمال کیے ہیں، لیکن دوسری روایت میں وضاحت موجود ہے۔

۞ **انه ﷺ لما كسرت رباعيته وشج وجهه يوم احد شق ذلك علی اصحابه شقاشديدا وقالوا لودعوت عليهم فقال انی لم ابعث لعاناولكن بعثت داعيا ورحمة اللهم اغفرلقومی فانهم لايعلمون"**

نبی کریم ﷺ کے دانت مبارک کا کچھ حصہ احد کے دن شہید کر دیا گیا، آپ کا سر مبارک اور چہرا زخمی کر

دیا گیا تو آپ کے صحابہ کرام پر شاق گذرا بڑی شدید کوفت ہوئی صحابہ کرام کو، انہوں نے عرض کیا" کاش آپ ان لوگوں کے خلاف دعاء ہلاکت کر دیتے" تو آپ نے فرمایا بیشک مجھے لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا، لیکن مجھے دعاء کرنے والا اور رحمت بنا کر بھیجا گیا، اے اللہ میری قوم کی مغفرت فرمادے بیشک وہ نہیں جانتے۔ (ماخوذ از قرطبی)

وجۂ تطبیق : جب تک نبی کریم ﷺ کو کافروں کے خلاف دعاء ہلاکت کرنے سے منع نہیں کیا گیا اس وقت تک آپ نے ان کے خلاف دعاء کی لیکن وہ بھی اس وقت جبکہ کافروں نے اللہ تعالی کے احکام میں خلل ڈالنے کی کوشش کی، ذاتی تکلیف کی وجہ سے آپ نے کسی کے خلاف دعاء نہیں کی، جب آپ کو منع فرمادیا گیا تو اس کے بعد آپ نے کفار کے خلاف دعاء ہلاکت نہیں کی۔ (راقم)

"قال القفال رحمه الله وكل هذه الاشياء حصلت يوم احد فنزلت هذه الآية عندالكل فلايمتنع حملها على كل الاحتمالات "

قفال رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ احد کے ساتھ متعلق تمام واقعات پہلے گئے، آیۃ کریمہ بعد میں نازل ہوئی، اسلئے آیۃ کریمہ تمام احتمالات کو شامل ہے۔ (کبیر)

دوسرا قول : دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ بئر معونہ کے واقعہ کے بعد نازل ہوئی، بئر معونۃ کا واقعہ مختصر اس روایت میں دیکھئے، تفصیلی واقعہ مدارج النبوت سے (انشاء اللہ قریب ہی ذکر کیا جائے گا۔

❁ عن ابن عمر انه سمع رسول الله ﷺ اذارفع رأسه من الركوع في الركعة الاخيرة من الفجر يقول اللهم العن فلانا وفلانا وفلانا بعد مايقول سمع الله لمن حمده ربنالك الحمد فانزل الله عليه ليس لك من الامرشئى الى قوله فانهم ظالمون " (رواه البخاري)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے سنا جب آپ نے اپنا سر مبارک فجر کی دوسری رکعت کے رکوع سے اٹھایا تو آپ فرمارہے تھے اے اللہ فلاں، فلاں، فلاں پر لعنت فرما، یہ دعاء آپ رکوع سے سر اٹھا کر "سمع الله لمن حمده" اور "ربنالك الحمد" کے بعد پڑھ رہے تھے، تو اللہ تعالی نے یہ مکمل آیہ کریمہ ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ﴾ نازل فرمائی، تو آپ کو دعاء سے منع فرمادیا، یہ دعاء بئر معونہ کے بعد کی گئی۔

بئر معونہ کا تفصیلی واقعہ:

ہجرت کو چوتھے سال ماہ صفر میں بئر معونہ کا واقعہ درپیش آیا، بئر معونہ کا نام سریۃ المنذر بن عمرو، اور سریۃ

القری بھی ہے، بئر معونہ ہذیل کے شہروں میں سے ایک موضع ہے، جو مکہ اور عسفان کے درمیان واقع ہے، اس جگہ کا ابو براء عامر بن مالک بن جعفر مدینہ منورہ میں آیا، وہ قبیلہ نجد اور بنی عامر سے تھا، اور نبی کریم ﷺ کی مجلس میں آیا، نبی کریم ﷺ نے اسے دعوت اسلام دی لیکن اس نے اسلام تو قبول نہ کیا، البتہ دین اسلام کی اس نے بہت تعریف کی، کہ آپ کا دین مبارک ہے، اور آپ ملت حنیف پر قائم ہیں، اس نے کہا میری قوم بہت بڑی ہے آپ صحابہ کی ایک جماعت کو میرے ساتھ بھیجیں تا کہ وہ ان کو تبلیغ کریں ہو سکتا ہے وہ ایمان لے آئیں، اس کا مطلب یہ تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی دعوت کو قبول کرلوں، اور آپ کے حکم کی اطاعت کروں لیکن میں اپنی قوم کا لحاظ کرتا ہوں، وہ ایمان لائیں گے تو میں بھی ایمان لے آؤں گا، نبی کریم ﷺ نے اصل واقعہ کے متعلق پہلے ہی خبر دے دی، اور ارشاد فرمایا کہ میں نجدیوں سے بے خوف نہیں ہوں مجھے خطرہ ہے کہ وہ سرکشی کریں گے۔

ابو عامر نے کہا آپ فکر نہ کریں آپ کے صحابہ میری پناہ اور میری حفاظت میں ہوں گے، آپ ان کی تبلیغ دین کیلئے ضرور بھیجیں، نبی کریم ﷺ پر لازم ہو گیا تھا کہ آپ تبلیغ دین کیلئے صحابہ کرام کی ایک جماعت کو بھیجیں، اگر چہ اصل سامنے آنے والے حالات سے بھی باخبر کر دیا، آپ نے اپنے ستر صحابہ کرام کو ان کے ساتھ بھیج دیا، جو حفاظ اور قراء تھے، یہ فقراء تھے جو جنگل سے لکڑیاں لا کر ازواج مطہرات کی خدمت میں پیش کرتے تھے، اور بیچ کر اصحاب صفہ کیلئے بھی کھانا لاتے تھے، یہ زیادہ انصاری حضرات تھے، جب رات آئی تو نماز، ذکر، اور تلاوت قرآن میں مشغول ہوئے صحابہ کرام کی اس جماعت کا امیر حضرت منذر بن عمرو کو بنایا، اور کچھ خطوط بھی نجد اور بنی عامر کے رئیسوں کے نام لکھ کر ان کو دیئے۔

ابو براء عامر بن مالک کا ایک بھتیجا عامر بن طفیل بن مالک تھا جو سرکش، دین کا مخالف اور مسلمانوں کا دشمن تھا، برخلاف اس کے ابو براء عامر سرکش نہیں تھا اور مسلمانوں سے اسے دشمنی اور عداوت نہ تھی، مسلمانوں کی جماعت جب بئر معونہ پر پہنچی تو انہوں نے اونٹوں کو چرانے کیلئے عمرو بن امیہ ضمری اور حارث بن صمہ کے سپرد کیا، اور حضور ﷺ کا خط خرام بن ملحان کے سپرد کیا، یہ بنی عامر کی طرف مبعوث تھے۔

خیال رہے کہ اس وقت کی اصطلاح میں امیر خاص ہوتا تھا، اور مبعوث امیر سے عام ہوتا تھا، خرام اپنے ساتھ دو آدمیوں کو لے کر گئے تا کہ نبی کریم ﷺ کے خطوط عامر بن طفیل تک پہنچائیں، انہوں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو پیچھے رکھا کہ پہلے میں جاتا ہوں، ان سے امان طلب کرتا ہوں، اگر انہوں نے امان دے دی تو تم بھی آجانا کہ میں تمہارے لئے بھی امان طلب کرلوں گا اگر انہوں نے امان نہ دی مجھے شہید کر دیا تو تم اپنے ساتھیوں سے جا کر مل جانا۔

خرام نے ان لوگوں سے امان طلب کی کہ مجھے امان دو تا کہ میں رسول اللہ ﷺ کا مکتوب گرامی تم تک پہنچاؤں،

لیکن عامر بن طفیل نے کسی آدمی کو اشارہ کیا جس نے نیزہ مارا وہ پار ہو کر دوسری طرف نکل گیا۔ اسکے بعد خرام نے اپنے چہرے سے خون صاف کرتے ہوئے کہا "اللہ اکبر فزت برب الکعبہ" رب کعبہ کی قسم میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں'' یعنی رسول اللہ ﷺ کے حکم کی بجا آوری میں، میں نے شہادت حاصل کر لی، عامر بن طفیل نے اپنے قبیلہ بنی عامر سے امداد طلب کی کہ تم میرے ساتھ بئر معونہ کی طرف چلو تا کہ وہاں پہنچ کر مسلمانوں کو قتل کر دیں، لیکن اس کے قبیلہ کے لوگوں نے انکار کر دیا کہ مسلمانوں کو ابو عامر نے پناہ دے رکھی ہے اسلئے ہم اس کے وعدہ کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتے، اس نے دوسرے قبائل سلیم، رعل، اور ذکوان کے پاس آدمی بھیج کر ان سے امداد طلب کر لی۔ اس نے اپنے ساتھ کثیر جماعت جمع کر لی اور بئر معونہ کی طرف روانہ ہو گیا، وہاں مسلمانوں کو گھیرے میں لے لیا، مسلمان جب گھیرے میں آ گئے تو رب تعالی کے حضور عرض کیا اے مولاء کائنات ہمارا اسلام رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچا دے، تو رب تعالی کے حکم سے جبریل نے ان دردمندوں کا سلام بارگاہ نبوی میں پیش فرمایا۔

نبی کریم ﷺ نے پہلے ہی صحابہ کرام کو خبر دے دی کہ تمہارے ساتھی مصیبت میں مبتلاء ہو گئے اور حق تعالی سے مناجات کر رہے ہیں کہ ہمارے حال کی خبر ہمارے ساتھیوں کو پہنچا، ہم تیری رضاء چاہتے ہیں، جس میں تو راضی ہے ہم بھی اس میں راضی ہیں۔ صحابہ کرام نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، ان کے پاس اسلحہ نہیں تھا، کفار زیادہ تعداد میں تھے اور مسلح تھے، صحابہ کرام جوانمردی، ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے ہوئے سب ہی شہید ہو گئے، ابھی تک منذر بن عمرو کو ان لوگوں نے شہید نہیں کیا تھا بلکہ ان کو امان دینے کی پیشکش دی، لیکن انہوں نے اسے ٹھکرا دیا، آخر کار یہ بھی کافروں سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے، مسلمانوں کو ایک سبق دے دیا کہ مسلمانوں کے لشکر کے امیر، جنگی جرنیل وقائد کفار کے سامنے سر نہ جھکانا بلکہ جرأت اور بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو جانا کہیں ضمیر فروش بن کر، ایمان فروش کر کافروں سے صلح کر کے، مسکراہٹ سے سر جھکا کر معاہدہ پر دستخط نہ کرنا، مسلمانوں کا اسلحہ کافروں کے حوالہ کر کے ہمیشہ کیلئے مسلمانوں کی گردن میں ذلت کا طوق نہ ڈال دینا۔

عمر بن عمیر ضمیری اور حارث بن صمہ جو اونٹوں کو چراگاہ کی طرف لے گئے تھے، واپس آئے تو دیکھا کہ گرد و غبار چھایا ہوا ہے اور لشکر والے مقام پر پرندے اڑ رہے ہیں، اور کافروں کا لشکر بلندی پر چڑھ رہا ہے یعنی بلند گھاٹیوں کے راستہ واپس جا رہا ہے، ادھر دیکھا کہ ہمارے تمام ساتھی شہید ہو گئے ہیں، ان دونوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے عمرو بن عمیر نے کہا ہمیں رسول اللہ ﷺ کے پاس واپس چلا جانا چاہئے، لیکن حارث بن صمہ نے کہا شہادت حاصل کرنے کا بہت اچھا موقع ہے اسے اپنے ہاتھ نہ جانے دیا جائے، یہ دونوں کافروں پر جھپٹ

پڑے، حارث نے دو کافروں کو قتل کر دیا، کافروں نے جب ان کو قید کرنا چاہا تو حارث کے سر سے خون بہہ رہا تھا لیکن پھر بھی دو اور کافروں کو قتل کر دیا، بعد میں خود بھی شہید ہو گئے، لیکن عمرو بن عمیر کو قید کر لیا گیا، عامر بن طفیل نے ان کو اپنا غلام بنا کر سر منڈا کر آزاد کر دیا، اس لئے کہ اس کی ماں پر ایک غلام آزاد کرنا لازم تھا، ان کو اجازت دی کہ تم آزاد ہو مدینہ (منورہ) جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔

عامر بن طفیل نے عمرو بن عمیر سے پوچھا تم اپنے ساتھیوں کو پہنچانتے ہو؟ انہوں نے کہا ہاں سب کو پہنچانتا ہوں، وہ ان کے ساتھ آیا، ایک ایک کا نام ونسب پوچھا جو آپ نے بتا دیا، اس نے پوچھا کیا تمہارا کوئی آدمی غائب بھی ہے، انہوں نے کہا ہاں عامر بن فہیرہ جو حضرت ابو بکر صدیق ﷛ کے آزاد کردہ غلام تھے وہ بھی ہمارے ساتھ تھے لیکن یہاں موجود نہیں، اس نے پوچھا وہ کیسا شخص تھا؟ انہوں نے بتایا وہ ہم سے فاضل ترین شخص تھا اور سب سے اول اسلام لانے والوں سے تھا، تو عامر بن طفیل نے کہا جب ان کو شہید کیا گیا تو میں نے دیکھا کہ ان کو آسمان کی طرف اٹھا کر لے جایا جا رہا ہے، عامر بن طفیل نجدی ملعون، شقی القلب کتنا ہی بدنصیب اور بدبخت تھا کہ صحابہ کرام کی جماعت مقدسہ کی برکات وکرامات کو دیکھ کر بھی اس کے دل میں اثر نہ ہوا اور ایمان نہ لایا بنی کلاب کا ایک شخص جبار بن سلمی جو کافروں کے درمیان تھا، اس سے منقول ہے کہ جب میں نے عامر بن فہیرہ کو نیزہ مارا تو وہ دوسری طرف پار ہو گیا، تو میں نے سنا وہ کہہ رہا ہے "فزت برب الکعبہ "رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا، میں نے دیکھا کہ اسے آسمانوں پر لے جایا جا رہا ہے، اس منظر کو دیکھ کر میں دل میں سوچنے لگا کہ عامر کے الفاظ "فزت برب الکعبہ" کا حقیقی مطلب کیا ہو سکتا ہے؟ تو میں نے بعد میں ایک مسلمان ضحاک بن سفیان کلابی سے ان الفاظ کا مطلب پوچھا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ اس کا مطلب یہ تھا "فزت برب الکعبہ" رب کعبہ کی قسم میں جنت میں جانے میں کامیاب ہو گیا، یہ سن کر جبار بن سلمی نے اسلام قبول کر لیا، سبحان اللہ سعادت مند لوگ کرامات کو دیکھ کر ایمان لے آتے ہیں، ارشاد باری تعالی ہے

﴿اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ﴾

"جو ذکر کی تابعداری کرتے ہیں اور بے دیکھے رحمٰن سے ڈرتے ہیں انہیں کو آپ کا ڈرانا مؤثر ہے تو انہیں مغفرت اور اجر کریم کی بشارت دیجئے۔"

بخاری نے بھی عامر بن طفیل کے قول کو ذکر کیا کہ میں نے دیکھا عامر کو آسمانوں پر لے جایا جا رہا ہے، قسطلانی کہتے ہیں کہ واقدی کی روایت میں ہے ان کو زمین نے چھپا لیا، پھر کافروں نے دیکھا، ابو براء چونکہ اپنی ذمہ داری پر صحابہ کرام کی اس جماعت کو لے کر گیا تھا، اور اس وقت کافر بھی وعدے کا پاس کرتے تھے، اسلئے ابو براء اپنے بھتیجے عامر

بن طفیل کی غداری سے بہت زیادہ شرمندہ ہوا، لیکن ایمان نہ لا سکا، فرق یہ تھا کہ عامر بن طفیل پر شیطان غالب رہا یہ مسلمان کا شدید مخالف رہا، اور اس نے بھی ایمان نہ لایا، اور ابو براء پر دنیا غالب رہی وہ بھی ایمان نہ لایا، کافر دونوں ہی رہے البتہ ایک سرکش اور مسلمانوں سے عناد رکھنے والا تھا، اور دوسرا کچھ نرم گوشہ رکھنے والا تھا" نبی کریم ﷺ نے دعاء فرمائی "اللھم اکفنی عامرا" اے اللہ ہمیں عامر سے بچا" وہ یہ تھی وہ غدار، دھوکہ باز تھا، کسی قانون کا اپنے آپ کو پابند نہیں سمجھتا تھا، ایسا شخص پر خطر ہوتا ہے کہ وعدہ اور کرے، اور کام اور کرے، جب فقراء اصحاب رسول کے شہید ہونے کی خبر پہنچی تو رسول اللہ ﷺ بہت زیادہ غمزدہ اور پریشانی ہوئے، تو نبی کریم ﷺ نے ایک ماہ اور چالیس دن کے قریب قنوت نازلہ پڑھی اور چند قبائل کے خلاف دعاء ہلاکت فرمائی۔ (ماخوذ از مدارج النبوۃ جلد نمبر ۲)

قنوت نازلہ کا ثبوت احادیث سے:

حدثنا عمرو بن عثمان حدثنا بقية عن ابی حمزة قال حدثنی محمد قال حدثنی سعيد بن المسيب و ابو سلمة بن عبدالرحمن ان اباهريرة كان يحدث ان رسول الله ﷺ كان يدعو فی الصلوة حين يقول سمع الله لمن حمده ربنا لک والحمد ثم يقول وهو قائم قبل ان سجد اللهم انج الوليد بن الوليد وسلمة بن هشام وعياش ابن ابی ربيعة والمستضعفين من المؤمنين اللهم اشدد وطاتک علی علی مضر واجعلها عليهم كسنی يوسف ثم يقول الله اكبر فيسجد وضاحية مضر يؤمئذ مخالفون لرسول الله ﷺ (نسائی باب القنوت فی الصبح)

حضرت ابوھریرہ ؓ حدیث بیان کرتے تھے کہ بیشک رسول اللہ ﷺ نماز میں دعاء کرتے تھے جبکہ "سمع الله لمن حمدہ" اور "ربنا ولك الحمد" کہہ لیتے تھے، پھر آپ کھڑے ہو کر سجدہ سے پہلے یہ کہتے تھے، اے اللہ ولید ابن ولید اور سلمہ بن ہشام اور عیاش بن ربیعہ اور کمزور وضعیف مؤمنین کو نجات دے، اے اللہ مضر کو ذلیل کر اور ان کو اس طرح قحط سالی میں مبتلاء کر جیسے یوسف علیہ السلام کی قوم قحط سالی میں مبتلاء ہوئی تھی، پھر آپ اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کرتے (مضر قبیلہ کے خلاف دعاء کرنے کی وجہ یہ تھی) کہ مضر رسول اللہ ﷺ کے (دین کے) مخالف تھے۔

حدثنا محمد حدثنا سفيان قال خفظناه من الزهری عن سعيد عن ابی هريرة قال لما رفع رسول الله ﷺ راسه من الركعة الثانية من صلوة الصبح قال انج الوليد بن الوليد وسلمة بن هشام وعياش بن ربيعة والمستضعفين بمكة اللهم اشدد وطاتک علی مضر واجعلها عليهم سنين كسنی يوسف" (نسائی باب القنوت فی الصبح)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ جب اپنا سر صبح کی نماز کی دوسری رکعت سے اٹھاتے تو یہ دعاء کرتے (دعاء کا ترجمہ وہی جو پہلی حدیث میں بیان کیا ہے) قنوت نازلہ جب تک جائز رہا اسی کے مطابق مسلم نے یہ عنوان قائم کیا۔

باب استحباب القنوت فی جمیع الصلوات اذانزلت نازلة العیاذبالله واستحبابه فی الصبح دائماوبیان ان محله بعد رفع الرأس من الرکوع فی الرکعة الاخیرة واستحباب الجهریة" (مسلم شریف جلداول صفحه نمبر۲۵۷)

باب اس کے بیان میں کہ قنوت تمام نمازوں میں پڑھنا مستحب ہے جبکہ مسلمانوں پر کوئی مصیبت نازل ہو "العیاذ باللہ" خصوصا صبح کی نماز میں ہمیشہ پڑھنا مستحب ہے، اور باب اس چیز کے بیان میں کہ قنوت نازلہ کا محل آخری رکعت کے رکوع سے سر اٹھانے کے بعد ہے، اور باب اس چیز کے بیان میں کہ قنوت نازلہ کا محل آخری رکعت کے رکوع سے سر اٹھانے کے بعد ہے، اور مستحب یہ ہے کہ بلند آواز سے پڑھے، یہ تھا مسلم شریف کا عنوان جس میں بیان کیا گیا ہے کہ مصیبت کے تمام نمازوں میں قنوت نازلہ پڑھا گیا ہے، اور صبح کی نماز میں زیادہ مرتبہ پڑھا گیا ہے۔

تنبیہ: نبی کریم ﷺ نے ایک ماہ یا کچھ دن زائد قنوت نازلہ پڑھا، پھر اسے پڑھنا چھوڑ دیا یعنی اب قنوت نازلہ پڑھنا درست نہیں کیونکہ یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔

قنوت نازلہ کی منسوخیت احادیث سے:

عن عاصم قال سألت انس بن مالک عن القنوت فقال قدکان القنوت قبل الرکوع اوبعده قال قبله قال فان فلاناأخبرنی عنک انک قلت بعدالرکوع فقال کذب انماقنت رسول الله ﷺ بعد الرکوع شهراأراه کان بعث قومايقال لهم القراء زهاء سبعين رجلاالی قوم مشرکين دون اولئک وکان بينهم وبين رسول الله ﷺ عهدفقنت رسول الله ﷺ شهرا يدعوعليهم"

(بخاری باب القنوت قبل الرکوع وبعدہ، مسلم باب استحباب القنوت فی جمیع الصلوات)

عاصم کہتے ہیں میں نے حضرت انس بن مالک ﷺ سے قنوت کے متعلق پوچھا کہ رکوع کے بعد ہے یا پہلے؟ انہوں نے کہا رکوع سے پہلے، یہ کہتے ہیں، میں نے کہا مجھے تو ایک شخص نے تمہارے متعلق خبر دی ہے کہ تم کہتے ہو رکوع کے بعد قنوت ہے، انہوں نے کہا اس شخص نے جھوٹ بولا ہے، ہاں البتہ یقینی بات ہے رسول اللہ ﷺ نے ایک مہینہ رکوع کے

بعد قنوت پڑھا جب آپ نے تقریباً ستر اشخاص کو مشرک قوم کی طرف بھیجا وہ لوگ جن کو بھیجا گیا تھا ان کو قراء کہا جاتا تھا، لیکن مشرک ان کے درپے ہوئے (ان کو شہید کر دیا گیا) حالانکہ ان لوگوں نے درمیان اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان عہد تھا (ان کی وعدہ شکنی اور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کو شہید کرنے کی وجہ سے) نبی کریم ﷺ نے ان کے خلاف ایک مہینہ تک دعاء کی، اس حدیث سے واضح ہوا وتر کا قنوت رکوع سے پہلے ہے، قنوت نازلہ رکوع کے بعد ہے، وہ ایک مہینہ تک پڑھا گیا، پھر چھوڑ دیا گیا، اب منسوخ ہو چکا ہے۔

❁ عن محمد قال قلت لانس هل قنت رسول الله ﷺ في صلوة الصبح قل نعم بعد الركوع يسيرا" (بخاری باب القنوت قبل الرکوع وبعدہ، مسلم باب استحباب القنوت فی جمیع الصلوات)

محمد (ابن سیرین) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا نبی کریم نے صبح کی نماز میں قنوت پڑھا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں رکوع کے بعد تھوڑا عرصہ پڑھا ہے۔

عن ابی مجلز عن انس بن مالک قال قنت رسول الله ﷺ شهرا بعد الركوع في صلوة الصبح يدعو على رعل وذكوان ويقول عصية عصت الله ورسوله
(بخاری باب غزوۃ الرجیع ورعل وذکوان، باب استحباب القنوت فی جمیع الصلوات)

ابومجلز حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز میں رکوع کے بعد ایک مہینہ قنوت پڑھا، رعل اور ذکوان (قبائل) کے خلاف دعاء کی اور فرمانے لگے "قبیلہ عصیہ" اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کا نافرمان ہے۔

❁ عن محمد بن سيرين عن انس بن مالک ان رسول الله ﷺ قنت شهرا بعد الركوع في صلوة الفجر يدعو على بني عصية" (مسلم باب استحباب القنوت فی جمیع الصلوات)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز کے بعد ایک ماہ قنوت (نازلہ) پڑھا اور بنی عصیہ کے خلاف دعاء کرتے رہے۔

❁ عن قتادة عن انس ان رسول الله ﷺ قنت شهرا يدعو على (احياء من) احياء العرب ثم تركه" (مسلم باب استحباب القنوت فی جمیع الصلوات)

حضرت قتادہ فرماتے ہیں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا بیشک رسول اللہ ﷺ ایک مہینہ عرب کے بعض قبائل کے خلاف دعاء فرماتے رہے پھر اسے چھوڑ دیا، اس مضمون کی اور کئی احادیث ہیں جن سے ثابت ہو رہا ہے کہ قنوت نازلہ منسوخ ہو چکا ہے۔

فائدہ : ابھی تک جو احادیث ذکر کی گئی ہیں، ان سے ضمناً یہ مسئلہ ثابت ہوا کہ وتر میں قنوت رکوع سے پہلے پڑھا

گیا، اور قنوت نازلہ رکوع کے بعد پڑھا گیا پھر چھوڑ دیا گیا، اور یہ بات ثابت ہوئی کہ تمام نمازوں میں قنوت نازلہ پڑھا گیا، لیکن صبح کی نماز میں زیادہ پڑھا گیا پھر منسوخ ہو گیا۔

تنبیہ: غیر مقلدین وتر میں رکوع کے بعد قنوت پڑھتے ہیں، اپنے اس موقف پر جب دلیل پیش کرتے ہیں تو قنوت نازلہ والی احادیث پیش کرتے ہیں، یا تو لفظ قنوت کو دیکھ کر انہوں نے یہی سمجھا کہ وتر کا قنوت اور قنوت نازلہ ایک چیز ہے، یعنی وہ قنوت وتر اور قنوت نازلہ میں فرق نہیں سمجھے کہ قنوت وتر ہمیشہ کیلئے جاری ہے اور قنوت نازلہ ایک ماہ یا کچھ دن زائد پڑھا گیا پھر چھوڑ دیا گیا، اے حنفیو میری دعاء بھی آپ کیلئے ہے آپ بھی کوشش کریں کہ غیر مقلدین کے جال میں پھنسنے سے بچ جائیں۔

شان نزول کے اقوال میں کوئی اختلاف نہیں:

ایک قول کے مطابق اس آیۃ کریمہ کا شان نزول غزوہ احد کا واقعہ ہے، اور دوسرے قول کے مطابق بئر معونہ کا واقعہ ہے، اور جن احادیث میں بعض قبائل پر لعنت کا ذکر ہے ان میں بنی لحیان کا بھی ذکر آتا ہے، بنی لحیان بئر معونہ میں شریک نہیں تھے بلکہ سریہ رجیع میں شریک تھے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ سریہ رجیع میں شرکاء کے خلاف دعاء کی گئی، بظاہر ان اقوال میں تعارض نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں کوئی تعارض نہیں، اسلئے کہ سریہ رجیع اور بئر معونہ بہت قریب قریب ہیں، اسی لئے صاحب مواہب لدنیہ نے بیان کیا ہے کہ سب خبریں (یعنی سریہ رجیع اور بئر معونہ کی) رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک ہی وقت پہنچیں، اسی وجہ سے ایک دعاء میں مختلف طوائف وقبائل کو شامل کر لیا گیا، بخاری کی حدیث میں جو بنی لحیان کا ذکر ہے اس کی توجیہ بھی یہی ہے۔ (ماخوذ از مدارج النبوۃ حصہ دوم، ذکر بئر معونہ)

"ویحتمل ان یقال ان قصة رعل وذکوان کان عقیب غزوة احد باربعة اشهر فی صفر سنة اربع من الهجرة فلعلها نزلت فی جمیع ذلک وتاخیر نزول الآیة عن سبب نزولها قلیلا غیر مستبعد"

غزوہ احد کے چار ماہ بعد صفر کے مہینہ میں ہجرت کے چوتھے سال رعل وذکوان مسلمانوں کے قتل عام میں شریک ہوئے، اسلئے نبی کریم ﷺ نے احد میں بھی کافروں کے خلاف دعاء کی اور سریہ رجیع میں شریک ہونے والے کافروں کے خلاف بھی دعاء کی اور بئر معونہ والے کافروں کے خلاف بھی دعاء کی تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی، کسی آیۃ کریمہ کا کچھ واقعات کے بعد کچھ تاخیر سے نازل ہونا کوئی بعید نہیں۔ (مظہری)

نبی کریم ﷺ کو کافروں کے خلاف دعاء سے کیوں منع کیا گیا؟

والحکمة فی منعه ﷺ من الدعاء علیهم ولعنهم ان الله تعالی علم من حال بعض الکفار انه سیسلم فیتوب علیهم او سیولد من بعضهم ولد یکون مسلما بر اتقیا فلاجل هذا المعنیٰ منعه الله تعالی من الدعاء علیهم لان دعوته ﷺ مجابة ولو دعا علیهم بالهلاک هلکوا اجمیعا" (خازن)

نبی کریم ﷺ کو کافروں کے خلاف دعاء کرنے سے منع کرنے میں حکمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کو علم حاصل ہے کہ بعض کافر مسلمان ہو جائیں گے، کفر سے تائب ہو جائیں گے ان کی توبہ قبول کر لی جائے گی، اور کئی کافر وہ ہیں جو خود تو کافر ہی رہیں گے لیکن ان کی اولاد مسلمان ہو جائے گی، اور وہ لوگ نیک اور پرہیز گار ہو جائیں گے، اس وجہ سے آپ کو دعاء کرنے سے منع کیا کہ اگر آپ نے دعاء کر دی تو اسے قبول کیا جائے گا کافر سب ہلاک ہو جائیں گے، حالانکہ ان میں سے بعض نے اسلام قبول کرنا ہے، اور بعض کی اولاد نے اسلام قبول کرنا ہے۔

سریہ رجیع کے متعلق بخاری کی ایک روایت:

حدثنی ابراهیم بن موسی اخبرنا هشام بن یوسف عن معمر عن الزهری عن عمرو ابن ابی سفیان الثقفی عن ابی هریرة ﷺ قال بعث النبی سریة عینا وامر علیهم عاصم بن ثابت وهو جد عاصم بن عمر بن الخطاب فانطلقوا حتی اذا کان بین عسفان ومکة ذکروا لحی من هذیل یقال لهم بنو لحیان فتبعوهم بقریب من مائة رام فاقتصوا آثارهم حتی اتوا منزلا نزلوه فوجدوا فیه نوی تمر تزودوه من المدینة فقالوا هذا تمر یثرب فتبعوا آثارهم حتی لحقوهم فلما انتهی عاصم واصحابه لجوا الی فدفد وجاء القوم فاحاطوا بهم فقالوا لکم العهد والمیثاق ان نزلتم الینا ان لا نقتل منکم رجلا فقال عاصم اما انا فلا انزل فی ذمة کافر اللهم اخبر عنا نبیک فقاتلوهم حتی قتلوا عاصما فی سبعة نفر بالنبل، وبقی خبیب وزید ورجل آخر فاعطوهم العهد والمیثاق فلما اعطوهم العهد والمیثاق نزلوا الیهم فلما استمکنوا منهم حلوا اوتار قسیهم فربطوهم بها فقال الرجل الثالث الذی معهما هذا اول الغدر فابی ان یصحبهم فجرروه وعالجوه علی ان یصحبهم فلم یفعل فقتلوه وانطلقوا بخبیب وزید حتی باعوهما بمکة فاشتری خبیبا بنو الحارث بن عامر بن نوفل وکان خبیب هو قتل الحارث یوم بدر فمکث عندهم اسیرا حتی اذا اجمعوا قتله استعار موسی من بعض بنات الحارث لیستحد بها فاعارته قالت فغفلت عن صبی لی فدرج الیه حتی اتاه فوضعه علی فخذه

فلما رأيته فزعت فزعة عرف ذاك مني وفي يده الموسى فقال اتخشين ان اقتله ما كنت لافعل ذلك ان شاء الله وكانت تقول ما رأيت اسيرا قط خيرا من خبيب لقد رأيته ياكل من قطف عنب وما بمكة يومئذ ثمرة وانه لموثق في الحديد وما كان الا رزق رزقه الله فخرجوا به من الحرم ليقتلوه فقال دعوني اصلي ركعتين ثم انصرف اليهم فقال لولا ان تروا ان مابي جزع من الموت لزدت فكان اول من سن الركعتين عند القتل هو ثم قال اللهم احصهم عددا، ثم قال:

ما ابالي حين اقتل مسلما　　على اي شق كان لله مصرعي

وذلك في ذات الاله وان يشا　　يبارك على اوصال شلو ممزع

ثم قام اليه عقبة بن الحارث فقتله وبعثت قريش الى عاصم ليؤتوا بشيء من جسده يعرفونه وكان عاصم قتل عظيما من عظمائهم يوم بدر فبعث الله عليه مثل الظلة من الدبر فحمته من رسلهم فلم يقدروا منه على شيء"

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے ایک سریہ (چھوٹے لشکر) کو جاسوسی کیلئے بھیجا، اوران پر عاصم بن ثابت کو امیر بنایا، یہ نانا تھے حضرت عاصم بن عمر بن الخطاب کے، یہ لوگ چلے یہاں تک کہ عسفان اور مکہ کے درمیان پہنچے تو ہذیل قبیلہ کو ان کی اطلاع مل گئی، ان کو بنی لحیان کہا جاتا تھا ان لوگوں نے صحابہ کرام کا ایک سو تیر اندازوں سے خبر ملتے ہی پیچھا کیا، یہاں تک کہ وہ لوگ وہاں پہنچ گئے جہاں یہ اترے تھے، وہاں انہوں نے کھجوروں کی گٹھلیاں پائیں جو صحابہ کرام مدینہ طیبہ سے زادراہ لے کر گئے تھے، انہوں نے کہا یہ تو یثرب کی کھجوریں ہیں، انہوں نے صحابہ کرام کے قدموں کے نشانوں پر چلتے ہوئے ان کو پالیا، عاصم ﷺ اور دوسرے صحابہ نے پہاڑ کی پناہ لی، لیکن انہوں نے صحابہ کرام کو گھیرے میں لے لیا، انہوں نے کہا ہم تمہارے ساتھ وعدہ کرتے ہیں کہ اگر تم ہمارے پاس آجاؤ تو ہم تم میں سے کسی ایک کو بھی قتل نہیں کریں گے عاصم نے کہا میں کسی کافر کے وعدہ اور امان پر اعتبار کرتے ہوئے نیچے نہیں اترتا، پھر دعاء کی اے اللہ اپنے نبی کو ہماری خبر پہنچا دے، کفار نے ان حضرات سے لڑائی کی تو یہ مقابلہ کرتے ہوئے سات آدمی شہید ہوگئے، ایک حضرت عاصم اور چھ دوسرے (چونکہ کفار ایک سو تیر انداز اور تین سو غیر مسلح تھے، لیکن مسلمان صرف دس تھے اور وہ بھی بہت معمولی اسلحہ رکھتے تھے) ان میں سے حضرت خبیب اور حضرت زید، اور ایک تیسرے شخص (جن کا نام ابن اسحاق کی روایت میں واضح طور پر عبداللہ بن طارق ظفری آیا ہوا ہے) باقی رہ گئے، کفار نے ان کو امان دینے کا وعدہ کیا، وہ نیچے اتر آئے، کافر جب ان پر قادر ہوگئے تو ان کے تیر کے کمانوں کے وتر (چمڑے کے دھاگے) کھولے، اوران کو باندھ لیا، تیسرے شخص (عبداللہ بن طارق) نے کہا یہ پہلا غدر (دھوکہ) ہے، انہوں نے

کافروں کے ساتھ چلنے سے انکار کردیا، کفار نے ان کو گھسیٹا اور بہت کوشش کی کہ یہ ہمارے ساتھ چلیں، لیکن انہوں نے انکار کردیا، کفار نے ان کو شہید کردیا۔

حضرت خبیب اور حضرت زید رضی اللہ عنہما کو یہ قید کر کے مکہ میں لے گئے تاکہ ان کو بیچ دیں، حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو حارث بن عامر بن نوفل کے بیٹوں نے خرید لیا کیونکہ انہوں نے بدر میں حارث کو قتل کیا تھا، یہ ان کے پاس قیدی کی حیثیت سے رہے، جب ان سب نے حضرت خبیب کو شہید کرنے پر اتفاق کرلیا، تو انہوں نے حارث کی بیٹیوں میں سے کسی ایک بیٹی سے استرہ طلب کیا تاکہ زیر ناف بال دور کرلیں، اس نے ان کو عاریۃً استرہ دے دیا، وہ کہتی ہے میں اپنے ایک چھوٹے بچے سے غافل ہوگئی، وہ اچانک خبیب کے پاس چلا گیا خبیب نے اسے ران پر بٹھالیا، میں نے جب یہ منظر دیکھا تو میں بہت زیادہ ڈرگئی، خبیب نے میرے ڈر کو پہچان لیا اور اس کے ہاتھ میں استرہ بھی تھا، اس نے کہا کیا تو ڈرگئی کہ میں اس بچے کو قتل کردوں گا، میں ان شاء اللہ ایسا کبھی نہیں کروں گا، وہ کہتی ہے میں نے خبیب سے اچھا کوئی قیدی نہیں دیکھا، وہ کہتی ہے میں نے انگور کا (گچھہ) کھاتے ہوئے دیکھا، حالانکہ مکہ میں ان دنوں میں (انگور کا) پھل موجود نہیں تھا آپ لوہے کی بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے، آپ کو کھانے کی کوئی خبر نہیں دی جارہی تھی لیکن اللہ تعالیٰ آپ کو رزق عطاء فرمارہا تھا، جب کفار نے آپ کو حرم سے نکالا تاکہ ان کو قتل کردیں، آپ نے کہا مجھے اجازت دو کہ میں دو رکعت نفل ادا کرلوں، دو رکعت ادا کر کے آپ خود ہی کافروں کے پاس پہنچ گئے، آپ نے کہا اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ تم کہو گے میں موت سے گھبرا رہا ہوں تو میں اور زیادہ نماز ادا کرتا، سب سے پہلے قتل کے وقت دو رکعت نفل ادا کرنے کو آپ نے ہی جاری کیا جو آپ کی سنت ہے پھر آپ نے عرض کیا (میرے قتل میں شریک) سب کو تو برباد کردے، پھر آپ نے دو شعر پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے۔

(مجھے کوئی پرواہ نہیں جب میں حالت اسلام میں شہید کردیا جاؤں، کہ اللہ کیلئے میں کس کروٹ پر گررہا ہوں۔ یہ سب کچھ اللہ کی رضاء کی خاطر ہے، وہ چاہے، تو میرے اعضاء کو علیحدہ کر کے مجھے برکت عطاء کردے)

پھر عقبہ بن حارث ان کی طرف کھڑا ہوا اور انہیں شہید کردیا، قریش نے وہاں کچھ لوگوں کو بھیجا جہاں حضرت عاصم کو شہید کیا گیا تھا تاکہ ان کے جسم کا کچھ حصہ کاٹ کرلے آئیں، ہم اس کو پہنچانیں کہ یہ عاصم ہی ہے، کیونکہ انہوں نے بدر میں ان کے ایک بڑے لیڈر (عقبہ بن معیط کو نبی کریم ﷺ کے حکم سے) قتل کردیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک لشکر بھیج دیا جس نے ان پر سایہ کردیا، اور اللہ کی بھیجی ہوئی مخلوق نے ان کی حفاظت کی، کفار ان کے کسی عضو کو کاٹنے پر قادر نہ ہوسکے۔

وضاحت حدیث:

بخاری کے باب سے بعض حضرات غلطی میں پڑھے انہوں نے یہ سمجھا کہ بئر معونہ اور سریہ رجیع کا واقعہ ایک ہے۔

"ولیس کذلک لان غزوۃ الرجیع کانت سریۃ عاصم وخبیب فی عشرۃ انفس وھی مع عضل والقارۃ وبئر معونہ کانت سریۃ القراء السبعین وھی مع رعل وذکوان"

حالانکہ ایک واقعہ نہیں، کیونکہ سریہ رجیع میں امیر عاصم ہیں، اور خبیب اس میں ہے، یہ دس افراد پر مشتمل قافلہ تھا، ان کا مقابلہ عضل اور قارہ گاؤں کے لوگوں سے ہوا، اگرچہ بخاری نے عضل اور قارہ کا ذکر نہیں کیا لیکن ابن اسحاق کی روایت میں یہ ذکر موجود ہے، اور بئر معونہ کے سریہ میں ستر قراء تھے جن کو شہید کیا گیا، اس میں امیر منذر بن عمرو تھے، اور نائب امیر خرام بن ملحان تھے، اس میں کفار قبائل اور ذکوان تھے۔

غزوہ اور سریہ میں فرق:

دوطرح کا ان میں فرق جس جنگ میں نبی کریم ﷺ نے شرکت کی اسے غزوہ کہا جاتا ہے اور جس میں آپ نے شرکت نہیں کی اسے سریہ کہا جاتا ہے، اور دوسرا فرق یہ ہے کہ بڑا لشکر جو کم از کم چار سو افراد پر مشتمل ہو اسے غزوہ کہا جاتا ہے، اور اس سے کم کو سریہ کہا جاتا ہے۔

❁ غزوہ بدر کی بحث میں ہے "بعث عشرۃ عینا" یہاں مذکور ہے "بعث النبی ﷺ سریۃ عینا" اور غزوہ کی روایت میں ہے "بعثھم عیونا الی مکۃ لیاتوہ بخبر قریش" ان تمام الفاظ کا مجموعی مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سریہ (رجیع) میں دس صحابہ کرام کو جاسوسی کیلئے بھیجا کہ وہ قریش کی خبر لا کر دیں "امر" میں میم مشدد ہے، یعنی امیر بنایا "اللھم اخبر نبیک" عاصم نے دعاء کی اے اللہ اپنے نبی کو ہماری خبر پہنچادے۔

"وفی روایۃ الطیالسی عن ابراھیم بن سعد فاستجاب اللہ عاصم فاخبر رسولہ خبرہ اصحابہ بذلک یوم اصیبوا"

طیالسی نے ابراہیم بن سعد سے روایت کی کہ اللہ تعالی نے عاصم کی دعاء کو قبول کرلیا، اور اپنے رسول اللہ ﷺ کو ان کی خبر دے دی، اور آپ نے اپنے صحابہ کرام کو ان حضرات کی شہادت کی خبر دے دی "من بعض بنات الحارث" حدیث شریف میں حارث کی بعض بیٹیوں کا جو ذکر ہے، اس کا نام زینب بنت حارث ہے جو حضرت خبیب ﷺ کے قاتل عقبہ بن حارث کی بہن ہے۔

مقام توجہ: بخاری شریف کی اس روایت میں، اور ایک روایت میں جو ذکر ہے اس سے مراد مشہور

خبیب یعنی خبیب بن عدی ہیں، وہی بدر میں حاضر ہوئے، انہوں نے ہی حارث کو قتل کیا تھا، صرف حافظ دیا مطی نے تمام معروف روایات سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بدر میں شریک ہونے والے خبیب بن اساف ہیں، اسی نے حارث کو قتل کیا وہ خزرجی ہیں، اور خبیب بن عدی اوسی ہیں، راقم کے نزدیک بخاری وغیرہ کا قول ہی صحیح نظر آتا ہے،

"من قطف عنب" بکسر القاف وھو العنقود" قطف کے قاف کے نیچے زیر ہے، مراد گچھہ اور خوشہ ہے

"لموثق بالحدید "ای مقید بالحدید " آپ کو لوہے کی بیڑیوں سے جکڑا ہوا تھا، "دعونی اصلی "بعض روایات "اصل" بغیر یاء کے ہے کہ مضارع جواب امر میں مجزوم ہے، جن روایات میں یاء ہے، ان میں "لامکی "محذوف ہے، اصل میں "لاصلی " ہے، آپ نے دو رکعت جو ادا کیں وہ مقام تنعیم میں ادا کیں۔

"اللھم احصھم عددا" دعاء علیھم بالاستئصال والھلاک بحیث لایبقی منھم احد"

حضرت خبیب ﷺ نے جو قاتلین کے خلاف دعاء کی "اللھم احصھم عددا" اس کا لغوی معنی تو یہ ہے "اے اللہ ان کی تعداد کو گن لے" اور مرادی معنی یہ ہے اے اللہ ان کو تباہ و برباد کر دے تا کہ ان میں سے کوئی بھی باقی نہ رہے۔ ایک روایت میں "واقتلھم بددا" آیا ہوا ہے، جس کا معنی ہے ان کو متفرق متفرق کر کے قتل کر دے"

"مثل الظلة "بضم الظاء المعجمة وھی السحابة "قوله من الدبر بفتح الدال المھملة وسکون الباء المواحدة وھی الزنابیر، وقیل ذکورا النحل"

ظلمة کا معنی ہے بادل اور "دبر" کا معنی ہے "بھڑ" یا شہد کی نذکر کھیاں" مطلب یہ ہے کہ رب تعالی کی بھیجی ہو مخلوق بھڑوں اور شہد کی مکھیوں نے ان پر بادل کی طرح سایہ کر دیا، "فحمته ای منعته " اس مخلوق نے ان کے جسم کی حفاظت کی، کافروں کو ان کے جسم تک نہ پہنچنے دیا، وہ ان کے جسم سے کسی ایک عضو کو بھی نہ کاٹ سکے۔

(عمدۃ القاری، جزء ۱۷ صفحہ نمبر ۱۶۸، ۱۶۹)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ○ (آیۃ نمبر ۱۲۹)

(1) اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور جو کچھ زمین میں ہے، جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے عذاب کرے اور اللہ بخشنے والا مہربان۔ (کنز الایمان)

(2) اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں، بخشش کرتا ہے جس کو چاہے اور عذاب دیتا ہے جسے چاہے، اور اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ (نجوم الفرقان)

﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ "اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں"

"ای ملکا (بالضم) وملکا (بالکسر) وخلقا واقتدارا" سب چیزوں پر اسے ہی بادشاہی حاصل ہے اور سب چیزیں اسی کی مملوک ہیں، اور سب چیزیں اسی کی مخلوق ہیں، اور سب چیزوں پر اسے ہی قدرت حاصل ہے کسی ایک کو اس میں دخل اندازی کی کوئی طاقت حاصل نہیں۔ 'فالامر کله یفعل مایشاء ویحکم مایرید" تمام امور اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں، وہ جو چاہے وہی کرتا ہے، اور وہ جو ارادہ کرتا ہے وہی حکم دیتا ہے۔ (روح المعانی)

"ولم یقل (من) لان الامر الاشارة الی الحقائق والماهیات فدخل فیه الکل"

لفظ "ما" ذکر کیا ہے "من" نہیں ذکر کیا، اسی لئے کہ "ما" سے مراد تمام حقائق اور ماہیات ہیں کہ سب چیزیں خواہ ان کا تعلق حقائق سے ہو یا ماہیات سے ہو وہ اللہ کی مخلوق ہیں اور اسی کی مملوک ہیں "يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ" (بخشش کرتا ہے جس کو چاہے اور عذاب دیتا ہے جسے چاہے)

اہل سنت وجماعت کا مذہب:

اس مسئلہ میں اہل سنت وجماعت کا مذہب یہ ہے کہ کہ سب کائنات اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک ہے، اللہ تعالیٰ اپنی ملکیت میں جو چاہے تصرف کرے، اسے یہ حق حاصل ہے۔

"انه سبحانه له ان یدخل الجنة بحکم الهیته جمیع الکفار والمردة، وله ان یدخل النار بحکم الهیته جمیع المقربین والصدیقین"

کہ وہ پاک ذات اپنے معبود ہونے اور خالق ومالک ہونے کے لحاظ سے جو چاہے تصرف کرے، خواہ وہ تمام کفار اور

سرکشوں کو جنت میں داخل کردے" یہ اس کا حق ہے، خواہ وہ چاہے کہ اپنے معبود ہونے کے لحاظ سے مقربین وصدیقین کو جہنم میں داخل کردے، اس پر کوئی شخص اعتراض نہیں کرسکتا۔

"فعل الله لایوجب علی الله شیئا البتة فلا الطاعة توجب الثواب ولا المعصیة توجب العقاب"

اللہ تعالیٰ پر کوئی فعل واجب نہیں، نہ طاعت پر ثواب دینا اس پر واجب ہے اور نہ ہی معصیت پر عقاب دینا اس پر واجب ہے، بلکہ تمام امور اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔

اعتراض : الیس انه ثبت انه لایغفر لکفار ولایعذب الملائکة ولانبیاء" کیا یہ بات یقینی طور پر ثابت نہیں کہ بیشک وہ کافروں کی بخشش نہیں فرمائے گا، اور فرشتوں اور انبیاء کرام کو عذاب نہیں دے گا، پھر اس کا مطلب کیا کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو نیک لوگوں کو عذاب دے دے اور چاہے تو کفار کو بخش دے۔

جواب : قلنا مدلول الآیة انه لو اراد لفعل ولا اعتراض علیه وهذا القدر لایقتضی انه یفعل اولا یفعل " آیۂ کریمہ سے یہ ثابت ہورہا ہے "اگر وہ ارادہ کرتا تو ایسے کرلیتا" کیونکہ ساری کائنات اس کی مخلوق ہے، اپنی مخلوق اور مملوک میں جو چاہے تصرف کرے، اتنے مسئلہ میں کوئی اعتراض نہیں، اور نہ ہی اس سے یہ لازم آرہا ہے کہ وہ ایسے کرے گا یا نہیں کرے گا۔ اسی وجہ سے روح المعانی تفسیریوں کی گئی:

(یغفر لمن یشاء) ان یغفر له من المؤمنین فلا یعاقبه علی ذنبه فضلا منه "(ویعذب من یشاء) ان یعذبه عدلا منه " (روح المعانی)

"وہ مغفرت فرماتا ہے جس کے چاہے" یعنی وہ چاہے تو مؤمنوں کی مغفرت فرمادے، انہیں عذاب نہ دے یہ اس کے فضل کا فیصلہ ہے، اور جسے چاہے عذاب دے یہ اس کے عدل کا فیصلہ ہوگا۔

معتزلہ کا مذھب : وہ کہتے ہیں یہ جائز ہی نہیں کہ بغیر توبہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کی مغفرت کرے۔

اہلسنت اور معتزلہ کا آسان لفظوں میں فرق:

اہل سنت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا مغفرت فرمانا اور عذاب دینا کسی شرط سے مقید نہیں، اللہ تعالیٰ جو چاہے وہ کرتا ہے اس کیلئے کوئی مانع نہیں، معتزلہ کے نزدیک مغفرت مشروط ہے توبہ نہ کرنے سے، یعنی ان کے نزدیک جائز ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ بغیر توبہ کے کسی کی مغفرت کرے، لیکن اہل سنت کے نزدیک یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر توبہ کے اپنے فضل سے مغفرت فرمادے۔

معتزلہ کی دلیل : انہوں نے اپنے مذہب پر حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی ایک روایت پیش کی۔

"روی عن الحسن انه قال یغفر لمن یشاء بالتوبة ولایشاء ان یغفر الاللتائبین ویعذب من یشاء ولایشاء ان یعذب الاالمستوجبین للعذاب"

حضرت حسن بصری کہتے ہیں "وہ جس کی چاہے مغفرت کرے" اس کا مطلب ہے توبہ کے ذریعے وہ مغفرت فرماتا ہے وہ نہیں چاہتا کہ مغفرت فرمائے سوائے توبہ کرنے والوں کے، اور عذاب دیتا ہے جسے چاہے وہ نہیں چاہتا کہ عذاب دے سوائے مستحقین عذاب کے۔

وعن عطاء یغفر لمن یتوب الیه ویعذب من لقیه ظالما" عطاء کہتے ہیں وہ مغفرت فرماتا ہے اس کی جو توبہ کرے ، اور وہ عذاب دیتا ہے اسے جو اس سے حالت ظلم میں ملاقات کرے، یعنی گناہوں سے توبہ نہ کر کے گناہ ساتھ لے جائے اس حال میں رب تعالیٰ سے ملاقات کرے، گناہ بھی حقیقت میں ظلم ہی ہیں۔

معتزلہ کی دوسری دلیل :

ان المذنب اذاعلم انه لایعاقب علی ذنبه کان ذلک تقریر اله و اغراء للغیر علیه وهذاینافی حکمة ارسال الرسل علیهم السلام"

وہ کہتے ہیں گنہگار کو جب یہ پتہ چلے گا کہ اسے عذاب نہیں دیا جاتا تو وہ گناہ پر قائم رہے گا، اور گناہ کرنے پر دلیر ہوگا، اور غیر کو بھی گناہوں پر ابھارے گا، یہ رسولوں کے بھیجنے کی حکمت کے مخالف ہے۔

اہل سنت و جماعت کی طرف سے رد:

"فالآیة ظاهرة فی نفی الوجوب علی الله تعالی وانه یجوز ان یغفر سبحانه للمذنب ویعذب المصلح"

آیۃ کریمہ ظاہر طور پر واضح کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں اس کیلئے جائز ہے کہ گناہگار کی مغفرت کر دے اور نیک کو عذاب دے، اگر چہ وہ کسی نیک کو عذاب دیتا نہیں، فقط اس کی قدرت واختیار میں ہے، البتہ گنہگار کو اپنے فضل سے بخش دے تو اس کی مرضی کی بات ہے، کافر کی وہ اپنے وعدہ کے مطابق مغفرت فرماتا نہیں، اگر چہ اس کے اختیار میں ہے کہ وہ مغفرت کر دے، جو روایات انہوں نے پیش کی ہیں ان کی اسناد کا ہی پتہ نہیں، لھذا ان سے استدلال باطل ہے، ان کی عقلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ اہلسنت و جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ جس کی مغفرت چاہے اسے بخش دے اس کے ساتھ توبہ کی کوئی قید نہیں، اور کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ میری گناہوں کو رب نے ضرور بخشنا ہے،

جب کسی کو علم ہی نہیں کہ رب نے کس کی مغفرت کرنی ہے تو گناہوں پر قائم رہنا اور گناہوں پر دلیر ہونا یہ قول ہی باطل ہے۔ (ماخوذ از شیخ زادہ و روح المعانی)

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ ''اور اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے''

اس سے واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ کی جہت احسان جہت گرفت پر غالب ہے۔ (از روح المعانی)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁
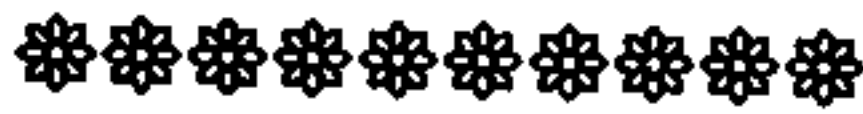
يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝
(آیۃ نمبر ۱۳۰)

(1) اے ایمان والو! سود دونا دون نہ کھاؤ، اور اللہ سے ڈرو اس امید پر کہ تمہیں فلاح ملے۔ (کنزالایمان)

(2) اے ایمان والو! نہ کھاؤ سود دونا دون، اور ڈرو اللہ سے تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالیٰ نے پہلے ان نعمتوں کا ذکر فرمایا جو مؤمنوں کو عطاء کیں، ارشاد فرمایا: ﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ﴾ الآیۃ'' اور ان کی امر دین میں اصلاح کا ذکر فرمایا، پھر جہاد کا ذکر کیا، اب امر، نہی ترغیب و ترہیب کا ذکر شروع کیا، اس آیۃ کریمہ میں نہی کا ذکر ہے، جس میں سود کھانے سے منع کیا گیا، اس لحاظ پر صرف ترتیب کا تعلق ہے کلام میں استیناف پایا گیا ہے۔ جب یہ لحاظ کیا جائے کہ مشرکین نے جنگوں میں سودی مال خرچ کیا تو مؤمنوں کو اس لئے منع کیا گیا کہ کہیں ان کے دل میں بھی سودی مال کی لگن پیدا نہ ہو جائے۔

عین ممکن ہے کہ مؤمنوں کے دلوں میں یہ بات آ گئی ہو کہ ہم بھی سودی مال جمع کرتے ہیں تاکہ مشرکین سے انتقام لے سکیں، اس لحاظ پر یہ آیۃ کریمہ ماقبل سے متعلق ہے، البتہ نزول کے لحاظ سے سود کی ممانعت والی آیات میں سے سب سے پہلے یہ نازل ہوئی، کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ پہلے سود کی حرمت والی کوئی آیۃ نازل ہو چکی ہو، اس کے بعد صحابہ کرام نے سود کا مال جمع کرنے کی تمنا کی ہو۔

دونا دون سود کی ممانعت کیوں؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں سودی کاروبار کا طریقہ یہ تھا کہ کسی کو سود پر مال دیا جاتا جب ادائیگی کا وقت آجاتا لیکن وہ شخص قرض ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتا، تو مال دینے والا کہتا تم میرا سود بڑھا دو میں تمہاری ادائیگی کی مہلت بڑھا دیتا ہوں، ایک سو درہم قرض لیا ہوا کبھی ہزار یا اس سے کم وبیش ہو جاتا، اس طرح ان کے ظالمانہ طریقہ سے ان کو منع کیا۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ ''اور ڈرو اللہ سے تاکہ تم کامیاب ہوجاؤ۔''

رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں ''سود کھانے سے نہی فرمائی'' اس نہی میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا واجب ہے، اس لئے کہ فلاح (کامیابی) اس پر موقوف ہے، اگر کسی شخص نے سود کھایا اور اللہ سے نہ ڈرا تو اس سے فلاح زائل ہوجائے گی، یہ آیۃ کریمہ واضح طور پر دلالت کر رہی ہے کہ سود حاصل کرنا حرام ہے، گناہ کبیرہ ہے، جو لوگ سود کو گناہ صغیرہ کہتے ہیں، ان کا قول سراسر باطل ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

اعلیٰ حضرت اور بیضاوی رحمہما اللہ:

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے "لعلکم تفلحون" کا ترجمہ کیا (اس امید پر کہ تمہیں فلاح ملے) علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے "لعلکم تفلحون" کی تفسیر "راجین الفلاح" سے کی، اس سے شیخ زادہ نے یوں وضاحت کی، قولہ "راجین الفلاح" کہ بیضاوی رحمہ اللہ نے "لعلکم تفلحون" کی تفسیر "راجین الفلاح" (فلاح کی امید کرتے ہوئے) سے کیوں کی؟

لما كانت كلمة لعل للترجي والاشفاق وهما لا يصلحان الا عند الجهل بالعاقبة وذلك على الله محال جعل الترجي راجعا الى العباد"

اسلئے کہ ''لعل'' ترجی (امید) کیلئے استعمال ہوتا ہے، یا ڈرانے کیلئے، یہ دونوں معانی وہاں استعمال ہوتے ہیں جہاں کوئی شخص انجام سے بے خبر ہو، یہ معانی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے محال ہیں، اسلئے ترجی کی نسبت بندوں کی طرف کی گئی، لھذا یہ معنی درست نہیں ہوگا کہ ''شاید تم کامیاب ہوجاؤ'' اسی طرح یہ معنی بھی درست نہیں کہ ''امید ہے تم کامیاب ہوجاؤ'' ہاں یہ معنی درست ہے ''اور تم ڈرو اللہ سے فلاح کی امید کرتے ہوئے۔

راقم اورروح المعانی:

(لعلکم تفلحون)ای لکی تفلحوا" تا کہ تم کامیاب ہوجاؤ، البتہ روح المعانی میں بھی دوسرا معنی بیضاوی کے موافق ہی لیا گیا ہے "راجین الفلاح"

فائدہ : ولایخفی ان اقتران الرجاء بالتخویف یفیدان العبدینبغی ان یکون بین الرجاء والخوف فهماجناحاه اللذان یطیربهماالی حضائرالقدس"(روح المعانی)

ادھر فرمایا گیا" واتقوا الله "اور اللہ سے ڈرو" اور ادھر فرمایا گیا "لعلکم تفلحون " کامیابی کی امید کرتے ہوئے ،یعنی خوف اور رجاء دونوں چیزوں کو ذکر کیا گیا ہے، اس سے یہ بتایا گیا کہ بندے کیلئے ضروری ہے کہ وہ امید اور خوف کے درمیان رہے، یہ دونوں بندے کو رب تعالی کے حضور اڑا کر لے جاتے ہیں۔

مقام توجه: آیۃ کریمہ میں ربو کے ساتھ "اضعافامضاعفة "(دونادون)ذکر کیا یہ اس طرح کی قید نہیں کہ درجہ شرط اسے حاصل ہو کہ دونا دون سود نہ لیا جائے تو حلال ہو جائے ،نہیں نہیں ایسا ہرگز نہیں ، بلکہ "والربو محرم جمیع "ربو کی تمام قسمیں حرام ہیں، سورۃ بقرہ میں ربو کو تفصیلی طور پر بیان کر دیا گیا ہے، وہاں مطلق ہے، یہاں جو"اضعافا مضاعفه "ذکر کیا گیا ہے"فهذه الحال لامفهوم لها ولیست قیدافی النهی " یہ ان لوگوں کا ایک حال بیان کیا گیا ہے یہ نہی کی قید نہیں کہ دونا دون نہ ہو تو جائز، ایسا کہنا کلمہ کفر ہے۔ (البحرالمحیط)

خیال رهے: کہ اس رواج کے مطابق سود کے طور پر جانور بھی لئے جاتے تھے، تم یہ قرض لے لو اور مجھے اتنے عرصہ میں یہ مال بھی واپس کرنا ہے اور ساتھ بطور ربو بنت لبون (دوسالہ اونٹنی) دے دینا میں اتنی مدت قرض بڑھا دیتا ہوں۔ (البحرالمحیط)

اس وقت ربوان کے دلوں میں گھر کر چکا تھا، ان کیلئے ربو کا چھوڑنا مشکل کام تھا، اسی وجہ سے ان کو اللہ تعالی سے ڈرنے کا حکم دیا، اس وجہ سے کہ انسان کی عادت میں جو خلاف شرع کام آگئے ہوں ان کو تقوی کے ذریعے چھوڑنا آسان ہوتا ہے۔ (البحرالمحیط)

تنبیه : ثم ذکر ان التقوی سبب لرجاء الفلاح وهو الفوزوامربهامطلقالامقیدابفعل الربو"

پھر یہ ذکر فرمایا کہ تقوی ذریعہ ہے فلاح حاصل کرنے کیلئے ،تقوی کا حکم مطلق ہے، یہ فعل ربو سے مقید نہیں ،یعنی یہ مطلب نہیں کہ صرف سود حاصل کرنے کے ساتھ تقوی کا تعلق ہے، بلکہ حکم یہ دیا گیا کہ ہر معاملہ میں تقوی اختیار کرو،

اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ (البحر المحیط)

اس ظالمانہ نظام (سودی نظام) کو اسلام نے ختم کردیا، کیونکہ اس سے اگر ایک طبقہ میں تن آسان، حرام خوری، حرص وبخل کے جذبات پرورش پاتے ہیں تو قوم کے دوسرے طبقہ میں حسد وعناد اور منافرت کی تخم ریزی ہوتی ہے۔ وہ امت جسے دنیا میں تبلیغ توحید وہدایت کا ایک عظیم المرتبت مشن سرانجام دینا ہو اس میں ایسے عناصر کو کب برداشت کیا جاسکتا ہے جو ملی وحدت کو پارہ کردیں۔ (ضیاء القرآن)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ O (آیۃ نمبر ۱۳۱)

(1) اور اس آگ سے بچو جو کافروں کیلئے تیار کر رکھی ہے۔ (کنز الایمان)

(2) اور بچو اس آگ سے جو تیار کی گئی ہے کافروں کیلئے۔ (نجوم الفرقان)

﴿وَاتَّقُوا النَّارَ﴾ "آگ سے بچو"

ای احترزوا عن متابعة المرابين وتعاطى مايتعاطونه من اكل الربوا المفضى الى دخول النار"

(آگ سے بچو) اس کا مطلب یہ ہے کہ سود خوروں کی تابعداری سے بچ جاؤ، سود کھانے والے کی طرح تم بھی نہ ہوجانا بلکہ سود حاصل کرنے سے بچ کر رہو، کیونکہ سود خوری انسان کو جہنم کی آگ کی طرف لے جاتی ہے۔

﴿اَلَّتِىٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ "(بچو اس آگ سے) جو تیار کی گئی ہے کافروں کیلئے۔"

اعتراض: جہنم میں تو چور، زانی، ڈاکو دوسروں پر ناحق تہمت لگانے والے، قاتل وغیرہ بھی داخل کئے جائیں گے، تو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے" کا کیا مطلب ہے؟

جواب اول: (اعدت للكافرين) وهى الطبقة التى اشد حرها وتضاعف عذابها وهى غير النار التى يدخلها عصاة امة محمد ﷺ فانها دون ذلك "

وہ آگ جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے وہ جہنم کا اور طبقہ ہے جس میں شدید گرمی ہوگی، اور اس میں سخت عذاب ہوگا، اور وہ آگ جس میں نبی کریم ﷺ کی امت کے نافرمان لوگ جائیں گے وہ اور طبقہ ہوگا، اس میں حرارت کم ہوگی بنسبت

کافروں کیلئے تیار کی ہوئی آگ سے، اور اس میں عذاب بھی بنسبت اس کے کم ہوگا۔

"وفیه اشارة الی ان اکلة الربو علی حفرة الکفرة"

اسی سے ضمنی طور پر یہ مسئلہ سمجھ آگیا کہ سود کھانے والے کافروں کی آگ کے گڑھے کے کنارے پر ہیں۔

جواب دوم: اس میں ایک احتمال یہ بھی پایا گیا ہے کہ "اعدت للکافرین" صفت تخصیص کیلئے نہیں، بلکہ

"ان النار مطلقا مخلوقة للکافرین معدة لهم اولاد بالذات وغیرهم یدخلها علی وجه التبع"

وہ آگ مطلقا کافروں کیلئے پیدا کی گئی ہے اور انہیں کیلئے ابتدائی طور بالذات تیار کی گئی ہے، اور دوسرے بالتبع اس میں داخل کئے جائیں گے، یعنی اگرچہ وہ آگ پیدا کئے جانے اور تیار کئے جانے کے لحاظ پر تو کافروں سے خاص ہے، لیکن اس آگ میں داخل کیا جانا کافروں کے ساتھ خاص نہیں بلکہ مؤمن گنہگار بھی اس میں داخل کئے جائیں گے۔
(روح المعانی)

اس آیۃ کریمہ میں وعید ہے یا رجاء:

کان ابوحنیفةص یقول هی اخوف آیة فی القرآن حیث اوعدالله المؤمنین بالنار المعدة للکافرین ان لم یتقوه ویجتنبو امحارمه" (مدارک وخازن)

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیۃ کریمہ قرآن پاک میں بہت زیادہ خوف دلانے والی ہے کہ اس میں اللہ تعالی نے مؤمنوں کو اس آگ سے ڈرایا ہے جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے کہ اگر وہ حرام کاموں سے نہ بچے تو اس آگ میں داخل کئے جائیں گے جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔

وقال الواحدی فی هذه الآیة تقویة لرجاء المؤمنین رحمة من الله لانه قال اعدت للکافرین فجعلهامعدة للکافرین دون المؤمنین" (خازن)

واحدی نے یہ کہا ہے کہ اس آیۃ میں مؤمنوں کو اللہ تعالی کی رحمت کی امید دلائی گئی، کیونکہ اللہ تعالی نے فرمایا "اُعِدَّتْ لِلْکَافِرِیْنَ" کہ وہ کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے نہ کہ مؤمنوں کیلئے، واحدی کے قول کے مطابق ہی زمخشری معتزلی کا قول بھی ہے۔ معتزلہ کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو بے خوف بنایا جائے تاکہ وہ بلاخطر عیاش ہو جائیں، گناہ کرنے میں دلیر ہو جائیں، آجکل ہمارے ملک پاکستان میں سب معتزلہ کے نظریات کو ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر پیش کیا جارہا، عذاب قبر کا انکار کیا جارہا ہے یہ وہی مذہب ہے جو صدیوں پہلے معتزلہ نے پیش کیا۔

تهدید شدید: قال ابن عباس هذاالتهدیدللمؤمنین ان یستحلوا ماحرم الله علیهم من الربوو غیره ممااوجب الله فیه النار" (خازن)

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں، اس آیہ کریمہ سے مؤمنوں کو بہت زیادہ ڈرایا گیا ہے، کہ اللہ تعالی نے جن چیزوں کو تم پر حرام کیا ہے ان کو حلال سمجھ کر اور جن چیزوں کو تم پر واجب کیا ہے ان سے انکار کر کے کہیں اس آگ کا اپنے آپ کو مستحق نہ بنادینا جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔

معتزلہ کا مذہب باطل ہے:

معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ جنت اور جہنم ابھی پیدا نہیں کی گئیں، بلکہ قیامت کو پیدا کی جائیں گی، لیکن ان کا یہ مذہب باطل ہے
"لان قوله تعالى (اعدت) اخبار عن الماضي فلابد ان يكون قد دخل ذلك الشيئ في الوجود"
اس لئے کہ اللہ تعالی کا ارشاد گرامی (اُعِدَّتْ) ماضی کا صیغہ ہے، قانون یہ ہے کہ جب تک کسی لفظ کا حقیقی معنی مراد لیا جاسکے مجازی معنی مراد نہیں لیا جاتا، لھذا واضح ہوا کہ جہنم کی آگ پیدا کی جاچکی ہے۔

سود کھانا کتنا عظیم جرم ہے:

بعض حضرات نے کہا ہے کہ سود کھانے والوں کو کافروں کی آگ سے ڈرایا گیا ہے، نہ کہ گنہگاروں کو آگ سے ڈرایا گیا، خیال رہے کہ جہنم کی آگ کے ساتھ طبقے ہیں، ایک گنہگاروں کیلئے آگ کا طبقہ ہے، جس میں گرفت تو ہوتی ہے لیکن ذلت حاصل نہیں ہوتی، بلکہ گناہوں کی آلودگی سے پاک وصاف کرنا مقصود ہوگا جس طرح سونے کو آگ کی بھٹی میں ڈال کر کھوٹ سے پاک کیا جاتا ہے، اور ایک طبقہ آگ کا منافقوں کیلئے ہے جو جہنم کے تمام طبقات سے نیچے ہے، اس میں بہت شدید عذاب ہوگا، رب تعالی نے اس ذکر یوں فرمایا ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ او رجہنم کی آگ کے پانچ طبقات کافروں کیلئے تیار کئے گئے ہیں جن میں کفار کو عذاب ہوگا اور ان کی اس میں ذلت بھی ہوگی، اسی لئے رب تعالی نے اسے ﴿عَذَابٌ مُّهِیْنٌ﴾ (رسوا کرنے والے عذاب) قرار دیا ہے۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

چو پاک آفریدت بہش باش پاک　　　　کہ ننگست ناپاک رفتن بخاک

جب رب تعالی نے تجھے پاک پیدا کیا تو ہوش میں پاک ہو کر رہ کہ شرم کی بات ہے　خاک میں گناہوں سے ناپاک ہو کر جانا۔

بیا پی بیفشاں از آئینہ گرد　　　　کہ صیقل نگیرد چو زنگار خورد

(دل کے) آئینہ کو لگاتار صاف کرتا رہ کہ جب زنگ نے اسے کھالیا تو اسے نکل (صاف) نہیں کیا جاسکے گا۔ (از روح البیان)

"جلاء القلب انمايحصل بذكرالله وتلاوة القرآن والصلوة على النبى ﷺ وخيرالاذكار كلمة التوحيدوهى العروة الوثقى"

دل کی صفائی حاصل ہوتی ہے، اللہ تعالی کے ذکر سے اور قرآن پاک کی تلاوت سے، اور نبی کریم ﷺ پر درود پاک پڑھنے سے اور کلمۂ توحید سے جو کہ تمام ذکروں سے بہتر ذکر ہے اور مضبوط رسی ہے۔

ابراہیم خواص رحمہ اللہ نے بیان فرمایا دل کی دوا پانچ چیزوں میں ہے، قرآن پاک کو تدبر سے تلاوت کیا جائے، اور پیٹ کو خالی رکھے، یعنی کم کھائے، اور رات کو قیام کرے اور سحری کے وقت اللہ تعالی کی طرف عاجزی سے رجوع کرے، اور نیک لوگوں کی مجلس اختیار کرے، ان عادات پر عمل کرنے سے انسان آگ سے بچ جائے گا، اور رب تعالی کا اسے قرب حاصل ہوگا۔ (ماخوذ از روح البیان)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَاَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ۝ (آیۃ نمبر ۱۳۲)

(1) اور اللہ و رسول کے فرمانبردار ہو اس امید پر کہ تم رحم کئے جاؤ۔ (کنز الایمان)

(2) اور اطاعت کرو اللہ اور (اسکے) رسول کی، تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

اس سے پہلی آیۃ کریمہ میں وعید کا ذکر کیا گیا، یعنی آگ سے ڈرایا گیا، اور اس آیۃ کریمہ میں وعد کا ذکر ہے، یعنی رحم کرنے کا، البتہ اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔

معتزلہ : معتزلہ کہتے ہیں کہ اس آیۃ میں بھی وعید ہے، اس لئے کہ جب رحم کرنے کو اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت پر موقوف کیا گیا ہے تو اسی سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ یہ آیۃ کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے۔

"من عصى الله ورسوله فى شئ من الاشياء انه ليس اهلا للرحمة وذلك يدل على قول اصحاب الوعيد"

کہ جس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی کسی چیز میں نافرمانی کی وہ رحمت کا مستحق نہیں، تو پتہ چلا کہ یہ آیۃ کریمہ وعید پر دلالت کر رہی ہے۔

اہل سنت و جماعت کا قول:

اس مسئلہ میں اہل سنت و جماعت کا موقف یہ ہے کہ ایک چیز کا ظاہر طور پر ثبوت جب ہو رہا ہے تو آیۃ کریمہ

اسی پر محمول ہوگی کہ اس میں اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور اس پر رحم کرنے کو مرتب کیا گیا لھذا یہ خوشبخت لوگوں کیلئے وعدہ ہے، یعنی ان پر رحم کئے جانے کی ان کیلئے بشارت ہے، اگر چہ ضمنی طور پر سمجھ آرہی ہے کہ اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کے نافرمانوں کیلئے رحم کرنے کا وعدہ نہیں، لیکن فضل وکرم سے رحم کرنے کی نفی بھی نہیں کی گئی اسلئے اس آیۃ کریمہ کو مطلقا وعید پر محمول کرنا درست نہیں، ضمنی طور پر وعید ثابت وہو سکتی ہے لیکن وہ بھی مطلق نہیں، کیونکہ رب تعالی اپنے فضل وکرم گنہگاروں پر رحم کردے تو اس کی مرضی کی بات ہے۔ (کبیر بالوضاحت)

اطاعت کن چیزوں میں کی جائے:

اگر چہ بعض حضرات نے اس مقام پر اس آیۃ کریمہ کو خاص کیا ہے (اَطِیْعُوْا اللّٰہَ)فی الفرائض (والرسول)فی السنن "اللہ کی اطاعت کرو فرائض میں اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو سنتوں میں۔

"وقیل فی تحریم الربو والرسول فیما بلغکم من التحریم"

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ رب تعالی نے ربو کو حرام کیا اس کے حرام کرنے میں اللہ تعالی کی اطاعت کرو اور رسول اللہ ﷺ نے جو تم تک اس کی حرمت کو پہنچایا ہے اس میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرو۔

"وقیل واطیعوا اللہ والرسول فیما یأمرکم بہ وینھا کم عنہ"

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ حکم مطلق ہے کہ اللہ تعالی اور اس کے رسول انے جن جن چیزوں کا تمہیں حکم دیا ہے یا جن جن چیزوں سے تمہیں روکا ہے ان تمام اوامر ونواہی میں اللہ تعالی اور اس کے رسول اکی اطاعت کرو۔ (البحر المحیط)

یہی مذہب جمہور کا ہے کہ خصوص مورد کا لحاظ نہیں کہ آیۃ کریمہ کس موقع پر نازل کی گئی بلکہ عموم الفاظ کا لحاظ کیا گیا ہے کہ یہ حکم عام ہے جمیع اوامر ونواہی کو شامل ہے۔

فائدہ جلیلہ: دوبارہ "اطیعوا" ذکر نہیں کیا گیا یعنی "وَاَطِیْعُوْا الرَّسُوْلَ" نہیں کہا گیا بلکہ لفظ "اللہ" پر عطف کیا گیا، اس کی وجہ یہ ہے "فان طاعۃ الرسول طاعۃ اللہ" بیشک رسول اللہ ﷺ کی طاعت درحقیقت اللہ تعالی کی ہی طاعت ہے، رب تعالی نے اس مسئلہ کو واضح طور پر ان الفاظ مبارکہ سے بیان کیا ﴿مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ﴾ جو شخص رسول (ﷺ) کی اطاعت کرتا ہے وہ اللہ کا مطیع ہے۔ (البحر المحیط)

(لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ)ای لکی تنالوا رحمۃ اللہ وراجین رحمتہ" (روح المعانی)

یعنی جو دو احتمال "لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ" میں بیان کئے ہیں وہی دو یہاں بھی پائے گئے ہیں، ایک یہ کہ

"لعل "کَیْ" کے معنی میں ہو، اب معنی یہ ہو" تا کہ تم پر رحم کیا جائے"

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ "لعل" ترجی کیلئے استعمال ہو نسبت ترجی کی بندوں کی طرف ہو، رب تعالی کی طرف نہ ہو، اب آیۃ کریمہ کا وہی ترجمہ ہوگا جو اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی نے کیا (اور اللہ و رسول کے فرمانبردار ہو اس امید پر کہ تم رحم کئے جاؤ) یعنی نسبت امید اور توقع کی بندوں کی طرف کی جاسکتی ہے لیکن اللہ تعالی کی طرف نہیں کی جاسکتی" "لعل" اور "عسی" کی نسبت (امید اور شاید) کی نسبت رب تعالی کی طرف نہیں کی جاسکتی بیضاوی کے حوالہ سے ایک آیۃ سے پیچھے "لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ" میں دیکھئے۔

مودودی صاحب کا ترجمہ دونوں جگہ باطل ہے:

انہوں نے "لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ" کا ترجمہ کا کیا "امید ہے کہ فلاح پاؤ گے" یہاں امید کی نسبت انہوں نے اللہ تعالی کی طرف کردی جو یقیناً غلط ہے اور جمہور مفسرین کرام کی مخالفت ان کے ترجمہ سے لازم آرہی ہے۔ مودودی صاحب نے "لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ" کا ترجمہ کیا ہے "توقع ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا" رب تعالی کا علم تو قطعی اور یقینی ہے، اس کی طرف یہ نسبت کرنا "امید ہے" "توقع ہے"، کسی طرح بھی صحیح نہیں۔

"لعل وعسی فی امثال ذلک عزة التوصل الی ماجعل خبر اله (بیضاوی) لما کانت لعل للترجی والاشفاق وهمالایصلحان الاعندالجهل بالعاقبة وذلک علی الله محال جعل الترجی راجعاالی العباد" (شیخ زاده)

اس قسم کے مقامات میں لعل اور عسی کا استعمال اس پر دلالت کرتا ہے کہ جو خبر بنائی گئی ہے اس کا بندوں تک پہنچنا غالب ہے، وجہ اصل میں یہ ہے کہ "لعل" ترجی کا معنی دیتا ہے جس میں امید پائی جاتی ہے، اور عسی میں بھی رجاء پائی جاتی ہے، اسی طرح "لعل" کبھی ڈرانے کے معنی بھی استعمال ہوتا ہے، یہ دونوں معانی اس مقام میں نہیں لئے جاسکتے کیونکہ یہ وہاں مراد لئے جاسکتے ہیں جہاں انجام سے بے خبری ہو، رب تعالی انجام سے بے خبر نہیں، ہاں البتہ امید کی نسبت بندوں کی طرف کی جاسکتی ہے۔

❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊❊

وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ O (آیة نمبر ۱۳۳)

(1) اور دوڑو اپنے رب کی بخشش اور ایسی جنت کی طرف جس کی چوڑان میں سب آسمان و زمین آجائیں پرہیزگاروں کیلئے تیار کر رکھی ہے۔ (کنز الایمان)

(2) اور جلدی کرو اپنے رب کی بخشش کی طرف اور جنت کی طرف اس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی (چوڑائی) کی طرح ہے، وہ تیار کی گئی ہے پرہیزگاروں کیلئے۔ (نجوم الفرقان)

راقم نے ترجمہ سورۃ حدید کی آیۃ کے مطابق کیا ہے۔

"سَابِقُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ" (وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ) یعنی وبادروا وسابقوا الی مایوجب المغفرة من ربکم وھی الاعمال الصالحة المأمور بفعلها"

"جلدی کرو اپنے رب کی بخشش کی طرف" یعنی جلدی کرو، سبقت لے جاؤ ایسے اسباب کی طرف جو تمہارے رب کی طرف سے بخشش کا ذریعہ بنیں، وہ نیک اعمال ہیں جن کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔"

اسباب مغفرت میں چند اقوال:

(۱) قال ابن عباس ھو الاسلام "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بخشش کا سبب اسلام ہے "مغفرة" نکرہ ذکر کیا گیا، مراد اس سے مغفرت عظیمہ ہے جو عظمت میں انتہاء درجہ تک پہنچی ہوئی ہے، یہ وہ مغفرت ہے جو اسلام کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

(۲) روی عن علیص انہ قال ھو اداء الفرائض "حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بخشش کا مطلب سب فرائض کو ادا کرنا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ لفظ مطلق ذکر کیا گیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ کل فرائض کا ادا کرنا مراد ہو۔

(۳) والثالث انہ الاخلاص وھو قول عثمان بن عفانص "حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد اخلاص ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ جمیع عبادات میں اخلاص معتبر ہے، لھذا اخلاص ذریعہ بخشش ہے اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ﴾ اور ان کو نہیں حکم دیا گیا مگر یہ

کہ اللہ کی بندگی کریں خالص اسی کیلئے دین کریں۔

(۴) الرابع قال ابو العالیة هو الهجرة "چوتھا قول ابوالعالیہ کا ہے کہ بخشش کا سبب ہجرت ہے۔

(۵) والخامس انه الجهاد هو قول الضحاک ومحمد بن اسحاق " پانچواں قول ضحاک اور محمد بن اسحاق رحمہما اللہ کا ہے مغفرت کا سبب جہاد ہے، اس لئے کہ یہاں آگے پیچھے جہاد کا ہی ذکر ہے، لھذا مغفرت کا سبب جہاد کو ہی قرار دینا زیادہ بہتر ہے۔

(۶) السادس قال سعید بن جبیر انها التکبیرة الاولی " چھٹا قول حضرت سعید بن جبیر ﷺ کا ہے کہ بیشک اس سے مراد نماز کی پہلی تکبیر ہے، جو بخشش کا ذریعہ ہے۔

(۷) السابع قال عثمان انها الصلوات الخمس " ساتواں قول بھی حضرت عثمان ﷺ کا ہے اس سے مراد پانچ نمازیں ہیں، اسلئے کہ بخشش کا سبب پانچ نمازوں کا ادا کرنا ہے۔

(۸) والثامن قال عکرمة انها جمیع الطاعات لان اللفظ عام فیتناول الکل " آٹھواں قول حضرت عکرمہ ﷺ کا ہے کہ تمام طاعات مراد ہیں کیونکہ لفظ عام ہے جو جمیع طاعات کو شامل ہے۔

(۹) التاسع قال الاصم سارعوا ای بادروا الی التوبة من الربوا والذنوب " نواں قول اصم کا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم سود اور گناہوں سے توبہ کرنے کی طرف جلدی کرو۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالی نے سود کے استعمال کرنے سے منع کیا، پھر ارشاد فرمایا ﴿وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ تو اس سے یہ واضح ہوا کہ پہلے جس نہی (ممانعت) کا ذکر ہے اسی کو جلدی چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

تمام اقوال کا جامع قول:

تمام اقوال کا جامع قول وہی ہے جو خازن سے نقل کیا گیا ہے کہ اس سے مراد "وهی الاعمال الصالحة المامور بفعلها" تمام نیک اعمال ہیں جن پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اسی وجہ سے علامہ رازی رحمہ اللہ نے تمام اقوال ذکر کرنے کے بعد یہ فرمایا۔

"والاولی ماتقدم من وجوب حمله علی اداء الواجبات والتوبة عن جمیع المحظورات لان اللفظ عام فلاوجه فی تخصیصه "

زیادہ بہتر یہی ہے کہ اس کو عام رکھا جائے معنی اس کا یہ ہو کہ واجبات کے ادا کرنے اور تمام ممنوعات

سے توبہ کرنے کی طرف جلدی کرو اسلئے کہ یہ اسباب بخشش ہیں، چونکہ لفظ عام ہے اسلئے کسی معنی کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

﴿وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ﴾

''اور جلدی کرو جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے''۔

جلالین میں یوں تفسیر بیان کی گئی:

(وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوَاتُ وَالْاَرْضُ)ای کعرضهما لووصلت احداهمابالاخری ، والعرض السعة''
''اور (جلدی کرو) جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے۔''

یعنی اگر تمام آسمانوں اور زمینوں کو علیحدہ علیحدہ کر کے ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر رکھا جائے تو ان کی وسعت کی طرح جنت کی وسعت ہے، یعنی مقصود ہی وسعت کو بیان کرنا ہے، مقدار بیان کرنا کہ جنت کی چوڑائی زمین وآسمان کی چوڑائی جتنی ہے، یہ مقصود ہی نہیں۔ جلالین کے تفسیری الفاظ ''کعرضها'' پر صاوی میں یوں تحریر کیا گیا ہے ''اشاربذلک الی ان الکلام حذف مضاف واداة التشبیه'' کہ مفسر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ''کعرضها'' کے الفاظ نکال کر اس طرف اشارہ کیا کہ اس کلام میں مضاف حذف ہے اور حرف تشبیہ بھی حذف ہے۔ صاوی میں ہی یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس میں دو احتمال پائے گئے ہیں ایک حقیقی کہ مراد ہی ہو جو جلالین میں بیان کی گئی ہے کہ تمام آسمانوں اور تمام زمینوں کی چوڑائی کی علیحدہ علیحدہ کر کے جوڑا جائے پھر بھی جنت کی چوڑائی ان سے زیادہ ہوگی، اور دوسرا معنی مجازی مراد لیا جائے کہ جنت کی وسعت زمین وآسمان کی وسعت سے بھی زیادہ ہے، راقم کے نزدیک یہی مجازی معنی لینا عوام کو سمجھانے کیلئے بہتر ہے۔

مختصر مطلب:

(وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ)ای کعرضهاصفة لجنة وتخصیص العرض بالذکر للمبالغة فی وصفهابالسعة والبسطة علی طریقة التمثیل فان العرض فی العادة ادنی من طول''

جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے، یہاں چوڑائی کا ذکر کیا گیا ہے جس میں جنت کی وسعت اور بساطت کو کامل طریقہ سے بیان کیا گیا ہے، اور تمثیل کے طور پر کہ آسمانوں اور زمین کی وسعت کی طرح جنت بھی وسیع اور بسیط (کشادہ) ہے عرض عام طور پر طول سے چھوٹی ہوتی ہے۔

جب عرض کی اتنی بڑی وسعت ہے تو طول یقیناً بہت ہی وسیع ہوگا۔ (تفسیر ابی السعود)

❁ روی ان هرقل ارسل الی النبی ﷺ انک کتبت تدعونی الی جنة عرضها السموات والارض فاین النار؟ فقال رسول الله ﷺ سبحان الله فاین اللیل اذا جاء النهار"

روایت بیان کی گئی کہ ہرقل نے اپنا ایک قاصد نبی کریم ﷺ کی طرف بھیجا کہ تم نے اپنے خط میں مجھے جنت کی دعوت دی ہے جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے (جب جنت اتنی وسیع ہے) تو آگ کہاں ہوگی؟ (یعنی اس کیلئے تو کوئی جگہ ہی باقی نہیں رہے گی) تو نبی کریم ﷺ نے (کیسا ہی حکیمانہ) جواب دیا۔

سبحان اللہ! جب دن آتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا یہ جواب آپ کی خصوصی صفت "جوامع الکلم" کے مطابق ہے کہ مختصر الفاظ کثیر معانی پر مشتمل ہیں۔

"قیل معناه والله اعلم بذلک انه اذا دار الفلک حصل النهار فی جانب واللیل فی ضد ذلک الجانب فکذلک الجنة فی جهة العلو والنار فی جهة اسفل"

نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کا معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب آسمان پھرتا ہے تو ایک جانب دن ہوتا ہے اور دوسری جانب رات ہوتی ہے، اسی طرح جنت اوپر کی جانب ہے اور جہنم نیچے کی جانب ہے۔

❁ وروی طارق ابن شهاب ان ناسا من الیهود سالوا عمر بن الخطاب رضی الله عنه وعنده اصحابه فقالوا ارایتکم قولکم "وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" فاین النار؟ فقال عمر بن الخطاب ارایتم اذا جاء اللیل فاین یکون النهار واذا جاء النهار فاین یکون اللیل فقالوا ان لمثلها فی التوراة"

طارق ابن شہاب سے روایت ذکر کی گئی کہ یہود کے چند لوگ حضرت عمر ﷺ سے آکر سوال کرنے لگے جب کہ آپ کے اصحاب بھی آپ کے پاس موجود تھے، انہوں نے کہا تمہاری اس تمہارے (قرآن کے) قول کے مطابق کیا رائے ہے جو یہ کہا گیا "وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے، جب جنت کی اتنی وسعت ہے تو آگ کہاں ہوتا ہے؟ اور جب دن آتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے تو وہ کہنے لگے ہاں توراۃ میں بھی اسی طرح ہے۔

"ومعناه حیث یشاء الله" مطلب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں چاہا وہیں آگ کو رکھ دیا اور جہاں چاہا وہاں جنت کو رکھ دیا، اس کی قدرت میں بڑی وسعت ہے، جس وسعت کی کوئی حد نہیں۔ (خازن)

اعتراض: رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَفِی السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ﴾ اور آسمانوں میں تمہارا رزق

ہے اور جس چیز کا تمہیں وہ دیا گیا ہے "وارادبالذی وعدنا به الجنة" جس چیز کا ہمیں وعدہ دیا گیا ہے وہ جنت ہے، اب آیۃ کریمہ کا مفہوم یہ ہو گیا اور آسمانوں میں تمہارا رزق ہے اور آسمانوں میں جنت ہے، جب جنت آسمانوں میں ہے تو وہ آسمانوں میں سما گئی، آسمان اس پر حاوی ہو گئے، تمام آسمانوں سے جنت کی وسعت کیسے ثابت ہو گی؟

جواب: المرادمن قولناانهافی السموات انهافوق السماوات وتحت العرش"

ہم نے جو یہ بیان کیا ہے "انها فی السماوات" یہاں اصل میں "فی" بمعنی "علی" کے ہے جیسا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِي جُذُوعِ النَّخْلِ﴾ میں "فی" بمعنی "علی" کے ہے، فرعون نے جادوگروں کو کہا میں تمہیں ضرور بر ضرور کھجور کے تنوں پر سولی چڑھادوں گا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ کھجور کے تنوں میں سولی چڑھادوں گا لھذا ہم جنت کے متعلق جو یہ کہتے ہیں "انها فی السماوات" اس کا مطلب یہ ہے "انها فوق السماوات وتحت العرش" کہ بیشک جنت آسمانوں کے اوپر اور عرش کے نیچے ہے، رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی "وماتوعدون" کا بھی یہی مطلب ہے کہ جس جنت کا تمہیں وعدہ دلایا جا رہا ہے وہ آسمانوں کے اوپر ہے۔ (خازن بالوضاحت)

❁ فان فی حدیث ابی ذرعن النبی ﷺماالسماوات السبع والارضون السبع فی الکرسی الاکدراهم القیت فی فلاة من الارض وماالکرسی فی العرش الاکحلقة القیت فی فلاة من الارض "فهذه مخلوقات اعظم بکثیر جدامن السماوات والارض وقدرة الله اعظم من ذلک کله"

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ حدیث میں یہ بھی ذکر ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا سات آسمان اور سات زمینیں کرسی میں ہوں تو ایسے ہوں گی جیسے کہ درہم جنگل میں ڈال دیئے جائیں، اور کرسی عرش میں ہو تو ایسے ہو گی جیسے لوہے کی انگوٹھی کو جنگل میں ڈال دیا جائے، یہ مخلوقات آسمانوں اور زمینوں سے بہت عظیم ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت ان تمام سے زیادہ عظیم ہے۔ (منقول از قرطبی)

❁ واخرج مسلم وابن المنذر والحاکم وصححه عن انس ان رسول الله ﷺقال یوم بدر قوموا الی جنة عرضها السموات والارض فقال عمیربن الحمام الانصاری یارسول الله جنة عرضها السموات والارض قال نعم قال بخ بخ لاوالله یارسول الله ﷺلابدان اکون من اهلهاقال فانک من اهلهافاخرج تمیرات من قرنه فجعل یاکل منهن ثم قال لئن حییت حتی آکل تمرالی هذه انهالحیاة طویلة فرمی بماکان معه من التمرثم قاتلهم حتی قتل"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، بیشک رسول اللہ ﷺ نے بدر کے دن فرمایا" کھڑے ہو جاؤ اس جنت کی طرف

جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی (چوڑائی) کی طرح ہے، عمیر بن الحمام انصاری نے فرمایا یارسول اللہ (کیا) جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں وہ صحابی کہنے لگے بڑی خوشی کا مقام ہے، بڑی خوشی کا مقام ہے، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی یارسول اللہ میں ضرور اس کا اہل بنوں گا حضور ﷺ نے فرمایا بیشک تم اس کے اہل ہو، انہوں نے اپنے توشہ دان سے کچھ کھجوریں نکالیں، ان کو کھانا شروع کیا، پھر کہنے لگے اگر میں زندہ رہا تو پھر کھجوریں کھالوں گا (کیونکہ یہاں سے زندہ رہنے کے بعد) بیشک زندگی طویل ہوگی، ان کے پاس جو کھجوریں تھیں وہ انہوں نے پھینک دیں، پھر کفار سے قتال کیا یہاں تک کہ وہ شہید ہو گئے، وہ صحابی کا قسم اٹھا کر کہنا کہ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں اس کا ضرور اہل بنوں گا، اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد کہ ہاں تم اس کے اہل ہو" رب تعالیٰ نے اسے سچا کر دکھایا، کہ وہ صحابی بارشاد نبوی شہید کر جنت کے اہل بنے۔ (منقول از در منثور)

❀ **وفی الصحیح ان ادنی اھل الجنۃ منزلۃ من یتمنی ویتمنی حتی اذاانقطعت بہ الامانی"**

صحیح (بخاری) میں ہے کہ بیشک اہل جنت کا ادنی مرتبہ یہ ہوگا کہ ان کو تمنا حاصل ہوگی، اور تمنا اسی وقت حاصل ہوگی جب اپنی آرزوں اور امیدوں کو ختم کرلیں۔ (منقول از قرطبی)

﴿اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ﴾ "وہ تیار کی گئی پرہیزگاروں کیلئے۔"

آیہ کریمہ میں لفظ "اُعِدَّت" ماضی کا صیغہ ہے، جس کو اپنے حقیقی معنی اور حقیقی زمانہ سے بلاوجہ نہیں پھیرا جاسکتا **"ودلت الآیۃ علی ان الجنۃ والنار مخلوقتان"** اور آیہ کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ بیشک جنت اور نار (جہنم) پیدا کی جاچکی ہیں، معتزلہ کا یہ کہنا کہ ابھی پیدا نہیں کی گئیں بلکہ یوم آخرت (قیامت کے دن) پیدا کی جائیں گی، ان کا یہ قول باطل ہے۔ متقی سے مراد یہ ہے کہ وہ شرک سے بچے، جیسے سورۃ حدید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

﴿وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ﴾

"اور جنت (کی طرف سبقت کرو) جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے، وہ تیار کی گئی ہے ان لوگوں کیلئے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا۔"

یا متقی کا معنی یہ ہے کہ وہ گناہوں سے بچنے والے ہیں، جب یہ معنی لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ بغیر سزا کے جنت میں چلے جائیں گے، اور اگر پہلا معنی شرک سے بچنے والا لیا جائے کہ وہ شرک سے تو بچتے ہیں لیکن گناہوں سے نہیں بچتے تو پھر مطلب یہ ہوگا **"فھی لھم ایضا فی العاقبۃ"** کہ ان کو بھی آخر کار جنت حاصل ہوگی، یعنی اگر گناہوں کی سزا ان کو حاصل ہونی ہوئی تو سزا کے بعد گناہوں کی آلودگی سے پاک ہو کر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ (مدارک)

اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَالۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ○ (آیۃ نمبر ۱۳۴)

(1) وہ جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں خوشی میں اور رنج میں اور غصہ پینے والے ہیں اور لوگوں سے درگذر کرنے والے اور نیک لوگ اللہ کے محبوب ہیں۔ (کنزالایمان)

(2) (پرہیزگار) وہ ہیں جو خرچ کرتے ہیں آسانی میں اور مشکل میں، اور وہ روکنے والے ہیں غصہ کو، اور درگذر کرنے والے ہیں لوگوں سے اور اللہ محبت کرتا ہے احسان کرنے والوں سے۔ (نجوم الفرقان)

﴿اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ﴾ "وہ جو خرچ کرتے ہیں آسانی میں اور مشکل میں۔"

راقم نے ترجمہ روح المعانی کے ان الفاظ سے لیا ہے ﴿فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ﴾ ای فی الیسر والعسر "آسانی میں اور مشکل میں، یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے روح المعانی کے ہی ان الفاظ سے لیا "وقیل فی حال السرور والاغتمام" اور بیان کیا گیا کہ وہ خوشی کی حالت میں اور غم کی حالت میں خرچ کرتے ہیں، طلباء کرام کے فائدہ کیلئے دونوں معانی پیش کر دیے گئے "وقیل فی الحیاۃ وبعد الموت بأن یوصی" اور بیان کیا گیا ہے کہ وہ زندگی میں خرچ کرتے ہیں، اور موت کے بعد خرچ کرنے کی وصیت کرتے ہیں۔

"وقیل فیمایسر کالنفقۃ علی الولدوالقریب وفیمایضر کالنفقۃ علی الاعداء"

اور بیان کیا گیا ہے کہ وہ ان لوگوں پر خرچ کرتے ہیں جن پر خرچ کرنا انہیں خوش لگتا ہے، جیسے اولاد پر اور قریبوں رشتہ داروں پر خرچ کرتے ہیں، اور خرچ کرتے ہیں ان پر جن پر خرچ کرنے سے ان کو ضرر محسوس ہوتا ہے جیسا کہ دشمنوں پر ان کا خرچ کرنا۔ (روح المعانی)

مشکل اور آسانی میں خرچ کرنے کا اور مطلب یہ ہے:

"لایترکون الانفاق فی کلتاالحالتین فی الغنی والفقر والرخاء والشدۃ ولافی حال فرح وسرور ولافی حال محنۃ ولابلاء سواء کان الواحد منھم فی عرس اوحبس فانھم لایدعون الاحسان الی الناس"

کہ وہ حالت غناء اور فقر (امیر وغریب ہونے کی حالت) میں خرچ کرتے ہیں، کسی حال میں وہ خرچ کرنا نہیں چھوڑتے رزق کی کشادگی اور تنگی میں خرچ کرتے ہیں، اور خوشی اور فرحت کے حال میں اور محنت اور مصیبت کے حال

میں خرچ کرنا چھوڑتے، پرہیزگاروں میں سے کوئی ایک خواہ شادی میں ہو یا قید میں وہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں، اور مال خرچ کرنے پر لوگوں کے سامنے اپنے احسان کا کوئی دعوی نہیں کرتے، رب تعالی نے جب یہ ذکر فرمایا "اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ" جنت پرہیزگاروں کیلئے تیار کی گئی" تو یہاں جنت میں جانے کا ایک سبب سخاوت کو بیان کیا لیکن سخاوت لوگوں پر شاق ہوتی ہے، اسلئے کہ انسان اپنے آپ کو حاجتمند سمجھتے ہوئے جب فقیروں کی غمخواری کرتے ہوئے ان پر خرچ کرتا ہے، اور دشمن کے ساتھ جہاد کرنے میں جب مال خرچ کرتا ہے تو اسے بہت مشکل نظر آتا ہے۔ (خازن)

شان سخاوت اور مذمت بخیل پر احادیث مبارکہ:

❁ عن ابی هريرة ان رسول الله ﷺ قال السخی قريب من الله قريب من الناس قريب من الجنة بعيدمن النار والبخيل بعيدمن الله بعيدمن الناس بعيدمن الجنة قريب من النار ولجاهل سخی احب الی الله تعالی من عابدبخيل" (اخرجه الترمذی)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سخی اللہ تعالی کے قریب ہے اور لوگوں کے قریب ہے اور جنت کے قریب ہے، اور آگ سے دور ہے، اور بخیل (کنجوس) اللہ سے دور ہے اور لوگوں سے دور ہے، اور آگ کے قریب ہے، جاہل سخی اللہ تعالی کی بنسبت کنجوس عابد کے زیادہ محبوب ہے۔ (منقول از خازن)

❁ عن ابی هريرة انه سمع رسول الله ﷺ يقول مثل البخيل والمنفق كمثل رجلين عليهما جنتان من حديدمن لديهما الی تراقيهمافاماالمنفق فلاينفق الاسبغت اووفت علی جلده حتی تخفی ثيابه وتعفواثره واماالبخيل فلايريدان ينفق شيئاالالزقت كل حلقة مكانهافهويوسعهافلاتتسع الجنة الدرع من الحديد" (بخاری ومسلم)

حضرت ابوھریرہ ﷺ فرماتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا بخیل اور خرچ کرنے والے کی مثال ایسے ہی جیسے دو شخص ہوں جنہوں نے لوہے کی زرہ پہن رکھی ہوں، وہ زرہ ان کے پستانوں (سینہ کے وسط) سے سینہ کے اوپر گلے کے قریب ہڈیوں تک ہوں، خرچ کرنے والا نہیں خرچ کرتا مگر یہ کہ اس کے چمڑے پر وہ زرہ مکمل ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ اس کے کپڑوں کو چھپالیتی ہے، اور اس کا اثر (اس کے قدموں کے نشانوں کو) مٹادیتی ہے، اور کنجوس خرچ کرنے کا ارادہ نہیں کرتا مگر یہ کہ وہ زرہ اپنی جگہ سے چمٹ جاتی ہے، وہ اسے وسیع کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ زرہ لوہے کی ہوتی ہے اس لئے اس کے وسیع کرنے سے وہ وسیع نہیں ہوتی۔ (منقول از خازن)

❁ عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ مامن يوم يصبح العبادفيه الاملكان ينزلان فيقول

احدھما اللھم اعط منفقا خلفا ویقول الآخر اللھم اعط ممسکا تلفا" (بخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرۃ ﷺ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندوں پر کوئی صبح نہیں آتی مگر یہ کہ اس میں دو فرشتے نازل ہوتے ہیں، ان میں سے ایک کہتا ہے اے اللہ اپنی راہ میں خرچ کرنے والے کو اس کے بدلے اور عطاء کر، اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ مال روک کر رکھنے والے (یعنی اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے والے) کے مال کو تباہ و برباد کر۔ (منقول از خازن)

❁ **وعن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ ﷺ قال قال اللہ تبارک وتعالی انفق ینفق علیک"**

حضرت ابو ہریرۃ ﷺ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالی فرماتا ہے تم مال (میری راہ میں) خرچ کرو، تم پر مال خرچ کیا جائے گا۔ (منقول از خازن)

یعنی جو شخص اللہ تعالی کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے اللہ اسے اور مال عطاء کرتا ہے۔

❁ **رواہ البھیقی عن جابر والطبرانی عن عائشۃ وعن ابن عباس مرفوعا السخاء خلق اللہ الاعظم"**

بیہقی نے حضرت جابر ﷺ سے اور طبرانی سے حضرت نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث بیان کی، یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالی نے سخاوت کو عظیم مرتبہ عطاء کر کے پیدا کیا۔ (منقول از مظہری)

❁ **وقال رسول اللہ ﷺ السخاء شجرۃ من اشجار الجنۃ اغصانھا متدلیات فی الدنیا فمن اخذ بغصن منھا قادۃ ذلک الغصن الی الجنۃ والبخل شجرۃ من الشجار النار اغصانھا متدلیات فی الدنیا فمن اخذ بغصن من اغصانھا ذلک الغصن الی النار" رواہ الدارقطنی والبھیقی عن علی ﷺ وابو نعیم فی الحلیۃ عن جابر ﷺ والخطیب عن ابی سعید ﷺ وابن عساکر عن انس ﷺ والدیلمی فی مسند الفردوس عن معاویۃ ﷺ "**

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سخاوت جنت کے درختوں میں سے ایک درخت ہے، جس کی شاخیں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں، جس نے ان ٹہنیوں میں سے ایک ٹہنی کو پکڑا تو وہ شاخ اسے جنت میں لے جائے گی، اور بخل (کنجوسی) جہنم کے درختوں میں سے ایک درخت ہے، اس کی شاخیں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں، جس نے اس کی شاخوں میں سے ایک شاخ کو پکڑا تو وہ اسے جہنم میں لے جائے گی۔ (یہ روایت دار قطنی اور بیہقی نے حضرت علی ﷺ سے بیان کی، ابن عدی اور بیہقی کی ایک اور روایت حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے منقول ہے، اور ابو نعیم نے حلیہ میں حضرت جابر ﷺ سے اور خطیب نے حضرت سعید ﷺ سے اور ابن عساکر نے حضرت انس ﷺ سے اور دیلمی نے مسند فروس میں حضرت معاویہ ﷺ سے بیان کی۔

(منقول از مظہری)

وعن ابی هریرة ﷺ قال قال رسول الله ﷺ سبق درهم مائه الف، فقال رجل وكيف ذالك یارسول الله فقال رجل له مال كثیراخلمن عرضه مائةدرهم تصدق بهاورجل لیس له الادرهمان فاخذاحدهمافتصدق به" (رواه النسائی وصححه وابن خزیمة والحاكم)

حضرت ابوہریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک درہم ایک لاکھ درہموں پر سبقت لے جاتا ہے، ایک شخص نے عرض کیا، یارسول اللہ یہ کیسے ہوگا؟ آپ نے فرمایا ایک شخص کے پاس بہت زیادہ مال ہوتا ہے وہ اس مال سے ایک لاکھ روپے خرچ کرتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں وہ صدقہ کرتا ہے اور ایک شخص کے پاس صرف دو درہم ہوتے ہیں وہ ان میں سے ایک صدقہ کرتا ہے۔ (منقول از مظہری)

حدیث پاک سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ اصل میں ثواب کا دارومدار نیت پر ہے اور مشکل میں خرچ کرنے پر ہے یقینی طور پر دو درہموں میں سے ایک خرچ کر دینا خلوص نیت پر مبنی ہے، اور دینے والے نے کتنی مشکل سے وہ ایک درہم خرچ کیا کہ خود حاجتمند تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے اس نے اپنے حاجت کی پرواہ نہ کی، یہی وجہ ہے کہ کثیر مال والے کے ایک لاکھ دراہم پر وہ غالب آ گیا۔ مقصود یہ ہے کہ خلوص نیت سے رب تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کیا جائے، کثیر مال والا کثیر خرچ کرے، اور قلیل مال والا قلیل مال خرچ کرے۔

روی عن عائشة رضی الله عنهاانهاتصدقت بحبة عنب" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ انگور کا ایک دانہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کیا۔

وعن بعض السلف انه تصدق ببصلة"، بعض سلف صالحین سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک پیاز صدقہ کیا۔

وفی الخبر "اتقوا النار ولو بشق تمرة" حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آگ سے بچ جاؤ خواہ کھجور کے ایک حصہ سے۔

ردوا السائل ولو بظلف محرق" سائل کو لوٹاؤ خواہ (بکری کے) پاؤں کی جلی ہوئی ہڈی سے۔

مطلب واضح ہے کہ سائل کو کوئی نہ کوئی چیز دے کر لوٹاؤ، خواہ وہ تھوڑی سے تھوڑی ہی کیوں نہ ہو۔

﴿وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾ "اور وہ روکنے والے ہیں غصہ کو۔"

کظم (ض) کظم الباب، دروازہ بند کیا" کظم النهر "نہر کو روکا، کظم القربۃ، مشکیزہ کو بھر کر اس کا منہ باندھا" کظم

البعیر "اونٹ جگالی کرنے سے رک گیا" کظم فلان علی جرته "فلاں کے پیٹ میں بات نہیں پچتی" کظم غیظه "فلاں نے اپنے غصہ کو پی لیا۔ (المنجد)

اعلی حضرت رحمہ اللہ نے یہی ترجمہ کیا ہے، یہ لغوی ترجمہ بھی ہے، اور بامحاورہ بھی ہے، اور تفسیر روح المعانی نے بھی ایک ترجمہ یہی کیا ہے "والمتجرعین للغیظ" اور غصہ کو پینے والے ہیں۔

راقم نے بیضاوی سے ترجمہ لیا ہے، علامہ بیضاوی رقمطراز ہیں "الممسکین علیه الکافین عن امضائه" المنجد سے جو معانی ذکر کئے ہیں، ان کے مناسب ہی مفسرین کرام نے مختلف الفاظ سے وضاحت کی۔

"یقال کظم غیظه اذاسکت علیه ولم یظهره لابقول ولابفعل"

کہا جاتا ہے "کظم غیظه" وہ اپنے غصہ پر خاموش رہا، نہ زبان سے نہ فعل سے اس کا اظہار کیا۔

"قال المبردتاویله انه کتم علی امتلائه منه یقال کظمت السقاء اذملأته وسددت علیه"

مبرد نے کہا ہے "کظم غیظه" کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے غصہ کو چھپایا باوجود اس کے کہ وہ غصہ سے بھرا ہوا تھا، جس طرح کہا جاتا ہے "کظمت السقاء" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے مشکیزہ بھر کر اس کا منہ بند کر دیا "ویقال فلان لایکظم علی جرته اذاکان لا یحتمل شیئا" جب کوئی شخص اپنے غصہ کو برداشت نہ کرے تو کہا جاتا ہے "فلان لایکظم علی جرته" فلاں شخص اپنے جگالی سے نہیں رکتا، یعنی غصہ کے وقت بڑبڑا رہا ہے جیسے جانور جگالی کرتا ہے تو اس کی بڑبڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے "کظم ماء" اس نے پانی بند کر لیا "کظم بابا" اس نے دروازہ بند کر لیا "کظم طریقا" اس نے راستہ روک لیا، ان معانی کے مطابق "وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ" کا ترجمہ ہوگا وہ غصہ کو بند کرنے والے ہیں، وہ غصہ کر روکنے والے ہیں، کسی چیز کے بند کرنے اور روکنے کے آلہ کو "سدادة" یا "کظامة" کہا جاتا ہے، اسی طرح کہا جاتا ہے "اخذ فلان یکظم فلان اذااخذ بمجری نفسه" فلاں شخص فلاں پر اپنے غصہ کو اندر اندر ہی گھما رہا ہے، صرف غصہ بھرا سانس لے رہا ہے، لیکن ظاہر نہیں کر رہا، یہ بھی اس معنی کے مناسب ہے کہ کہا جاتا "کظم البعیر کظوما اذاامسک علی مافی جوفه ولم یجتر" اونٹ نے جگالی نہیں کی چارہ کو اپنے پیٹ میں روک رکھا ہے، **راقم** کے نزدیک زیادہ بہتر ہے یوں کہا جائے "کظم البعیر علی جرته ویحرکه" اونٹ جگالی کر رہا ہے وہ اپنے چارہ کو اندر اندر ہی گھما رہا ہے۔

غصہ کو روکنے کی فضیلت میں احادیث مبارکہ:

❀ عن سهیل بن معاذعن انس الجهنی عن ابیه ان رسول الله ﷺ قال من کظم غیظا وهو

یستطیع ان ینفذه دعاه الله یوم القیامة علی رؤس الخلائق حتی یخیره فی ای الحور شاء" (ترمذی، ابوداؤد)

انس جہنی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے غصہ کو روک رکھا حالانکہ وہ اس کو نافذ کرنے پر قادر تھا تو اللہ تعالی قیامت کے دن اسے تمام مخلوق کے سامنے بلائے گا، یہاں تک کہ اسے اختیار دے گا کہ جو حور چاہتا ہے وہ لے لے۔ (منقول از خازن)

خیال رہے کہ "علی رؤس الخلائق" کا عجیب مفہوم یہ ہے کہ وہ پیچھے کھڑا ہوگا، تمام لوگوں کے سروں کے اوپر سے آواز دے کر اسے قریب بلا کر یہ مژدہ سنایا جائے گا کہ تجھے اختیار ہے جو حور چاہتا ہے لے لے۔

❁ عن ابی هریرة ﷺ قال قال رسول الله ﷺ لیس الشدید بالصرعة انما الشدید الذی یملک نفسه عند الغضب" (بخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ شخص بہادر نہیں جو کسی کو پچھاڑ دے، بلکہ بہادر وہ شخص ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کا مالک ہو۔ (منقول از خازن)

اپنے آپ کے مالک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے غصہ پر قبضہ کر سکے۔

❁ عن ابن عمر مرفوعا من کف غضبه ستر الله عورته" (رواه ابن ابی الدنیا)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث مروی ہے (یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا) جس شخص نے اپنے غصہ کو روک رکھا اللہ تعالی اس کے عیوب کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ (منقول از مظہری)

❁ اخرج عبدالرزاق وابن جریر وابن المنذر عن ابی هریرة فی قوله والکاظمین الغیظ ان النبی ﷺ قال من کظم غیظا وهو یقدر علی انفاذه ملأه الله امنا وایمانا" واخرجه البیهقی عن ابن عمر مثله"

حضرت ابو ہریرہ ﷺ نے رب تعالی کے ارشاد گرامی "وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ" کی وضاحت میں حدیث شریف بیان کی، بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے غصہ کو روکا حالانکہ وہ اسے جاری کرنے پر قادر تھا تو اللہ تعالی اسے امن وایمان سے بھر دے گا، بیہقی نے حضرت ابن عمر ﷺ سے بھی اس طرح حدیث بیان کی۔ (منقول از در منثور)

❁ واخرج البیهقی عن علی بن الحسین ان جاریة جعلت تسکب علیه الماء یتهیا للصلوة فسقط الابریق من یدها علی وجهه فشجه فرفع راسه الیها فقالت ان الله یقول والکاظمین الغیظ قال قد کظمت غیظی قالت والعافین عن الناس قال قد عفا الله عنک قالت والله یحب المحسنین قال اذهبی فانت حرة"

بیہقی نے حضرت علی بن الحسین (زین العابدین) رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی کہ ان کی ایک لونڈی آپ کو نماز کی تیاری کیلئے وضوء کرا رہی تھی کہ اس کے ہاتھ سے لوٹا گرا جو آپ کے چہرے پر آ لگا، اور آپ کا چہرا زخمی ہو گیا، آپ نے (غصہ سے) اپنے سر کو اس کی طرف اٹھایا، تو اس نے کہا اللہ تعالی نے (متقین کی شان میں) فرمایا "وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ" وہ غصہ کو روکنے والے ہیں، آپ نے فرمایا "قد كظمت غيظي" تحقیق میں نے اپنے غصہ کو روک لیا ہے، اس نے پھر کہا (اللہ کا ارشاد گرامی ہے) "وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ" وہ لوگوں سے درگذر کرنے والے ہیں، آپ نے فرمایا "قَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ" اللہ تعالی تمہیں معاف فرمائے (یعنی میں نے درگذر کر لیا، تمہیں معاف کر دیا برکت حاصل کرنے کیلئے اللہ تعالی کی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا اللہ تمہیں معاف فرمائے) اس نے پھر کہا (اللہ تعالی نے فرمایا) وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ" تو آپ نے فرمایا "جا تو آزاد ہے" (منقول از درمنثور)

❁ واخرج البيهقي في شعب الايمان عن عمرو بنٌ عبسة ان رجلا سال النبی ﷺ ماالايمان فقال الصبر والسماحة وخلق حسن"

عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا ایمان (کامل) کیا ہے، آپ نے فرمایا صبر کرنا، سخاوت کرنا، اور اچھے اخلاق رکھنا۔ (منقول از درمنثور)

❁ واخرج الاصبهانی فی الترغیب عائشة سمعت رسول الله ﷺ يقول وجبت محبة الله علی من اغضب فحلم"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا اس شخص کو اللہ تعالی کی محبت حاصل ہوتی ہے جو غصہ کی حالت میں برداشت سے کام لیتا ہے۔ (منقول از درمنثور)

❁ واخرج الطبرانی فی الاوسط والبیهقی فی الشعب وضعفه عن عائشة مرفوعا قال الشئوم سوء الخلق"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مرفوع حدیث بیان کی یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا نحوست، بدبختی بد خلقی میں ہے، اگرچہ اس حدیث کو بیہقی نے ضعیف کہا ہے (لیکن دوسری اسناد سے یہی حسن یا صحیح بھی ثابت ہے۔ (منقول از درمنثور)

❁ واخرج البزار وابن حبان عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ الا اخبركم بخياركم قالوا بلی یارسول الله ﷺ قال اطولكم اعمارا واحسنكم اخلاقا"

حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں تم میں سے بہتر لوگوں کی خبر نہ دوں، صحابہ کرام نے عرض کی ہاں یارسول اللہ ﷺ ضرور خبر دیں، آپ نے فرمایا جو تم میں سے بڑی عمر

والے ہوں اور اچھے اخلاق والے ہوں۔ (منقول از در منثور)

❁ واخرج ابن ابی شیبة واحمدو الطبرانی بسند جید عن جابر بن سمرة قال قال رسول الله ﷺان الفحش والتفحش لیسامن الاسلام فی شیٔ وان احسن الناس اسلاما احسنهم خلقا"

حضرت جابر بن سمرہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک فحش کلامی اور بد اخلاقی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، بیشک لوگوں میں وہی لوگ اچھے اسلام والے ہیں جو اچھے اخلاق والے ہیں۔ (منقول از در منثور)

❁ واخرج ابو داود والنسائی عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ کان یدعو اَللّٰهُمَّ اِنِّیٓ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَسُوْءِ الْاَخْلَاقِ"

حضرت ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ دعاء فرماتے تھے (تعلیم امت کیلئے) اے اللہ بیشک میں تیری پناہ طلب کرتا ہوں بدبختی اور منافقت اور بد اخلاقی سے۔ (منقول از در منثور)

❁ واخرج البیهقی فی الاسماء والصفات عن عائشة قالت قال النبی ﷺ الرفق یمن والخرق شؤم واذا اراد الله باهل بیت خیرا ادخل علیهم باب الرفق ان الرفق لم یکن فی شیٔ قط الازانه وان الخرق لم یکن فی شیٔ قط الاشانه وان الحیاء من الایمان وان الایمان فی الجنة ولو کان الحیاء رجلا کان رجلا صالحا وان الفحش من الفجور وان الفجور فی النار ولو کان الفحش رجلا یمشی فی الناس لکان رجلا سوأ"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا نرمی سے برکت حاصل ہوتی ہے، اور سختی سے نحوست و بدبختی حاصل ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ جب کسی گھر والوں پر بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو ان پر نرمی کا دروازہ کھول دیتا ہے، بیشک نرمی کسی چیز میں نہیں پائی جاتی مگر یہ کہ اسے مزین بنا دیتی ہے، اور سختی کسی چیز میں نہیں پائی جاتی مگر یہ کہ اسے بدنما بنا دیتی ہے، بیشک حیاء ایمان کا حصہ ہے، اور بیشک ایمان جنت میں جانے کا سبب خاص ہے، جس انسان کو حیاء حاصل ہو وہ شخص نیک ہوتا ہے اور بیشک بے حیائی فجور ہے اور بیشک فجور آگ میں جانے کا ذریعہ ہے، اگر کسی شخص کو فحش کلامی حاصل ہو تو وہ لوگوں میں چلتے برا نظر آ رہا ہوگا۔ (منقول از در منثور)

﴿وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ﴾ "اور درگذر کرنے والے ہیں لوگوں سے۔"

"العفو عن الناس اجل ضروب فعل الخیر" لوگوں کو معاف کر دینا بھلائی کے کاموں میں بہت بڑا کام ہے۔ انسان جب درگذر سے کام لیتا ہے تو اسے اپنے حقوق خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں، درگذر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ

جو سزا کا مستحق ہو، اسے سزا نہ دی جائے بلکہ معاف کر دیا جائے۔ "عَنِ النَّاسِ" سے مراد کون سے لوگ ہیں، اس میں ابو العالیہ اور کلبی اور زجاج نے یہ بیان کیا "وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ" "یرید عن المممالیک" لوگوں کو معاف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے غلاموں کو معاف کر دیتے ہیں، ابن عطیہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ مطلب لینا زیادہ بہتر ہے "اذھم الخدمة فھم یذنبون کثیرا والقدرة علیھم متیسرة" جب کہ خدام سے غلطیاں بہت ہوتی ہیں، اور مالک حضرات کو ان پر قدرت میسر ہوتی ہے "وانفاذ العقوبة سھل" اور انہیں سزا دینا آسان ہوتا ہے۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے بیان فرمایا "وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ" "عن ظلمھم واساء تھم، وھذا عام وھو ظاھر الآیة" لوگوں سے درگذر نے کا حکم ظاہر آیۃ کریمہ سے عام ہے کہ کسی شخص کے ظلم اور اس کے برائی سے درپیش آنے کو معاف کر دیا جائے، اس وجہ سے کہ رب تعالیٰ نے دوسرے مقام پر بھی اسے عام ہی ذکر فرمایا "وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ" جب انہیں کوئی غضب دلا دے تو وہ اسے معاف کر دیتے ہیں۔ (منقول از قرطبی)

راقم کے نزدیک بھی یہ حکم عام ہے ہر صاحب طاقت کو چاہئے کہ وہ اپنے تحت افراد کی غلطیوں کو معاف کر دے، اگر معاف کرنے سے وہ زیادہ جرائم پیشہ ہو جائیں تو سرزنش کی جائے۔

﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ "اور اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

یعنی ان کو ثواب عطاء کرتا ہے۔ سری سقطی رحمہ اللہ نے فرمایا۔

"الاحسان ان تحسن وقت الامکان فلیس کل وقت یمکنک الاحسان"

احسان یہ ہے کہ جب بھی طاقت حاصل ہو تو تم احسان کرو، کیونکہ ہر وقت احسان کرنے کی تمہیں قدرت حاصل نہیں۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا:

بادر بخیر اذ ما کنت مقتدرا	فلیس فی کل وقت انت مقتدر
تم بھلائی کی طرف جلدی کرو جب تمہیں قدرت حاصل ہو	ہر وقت تمہیں (بھلائی کی) قدرت حاصل نہیں ہوتی

ابو العباس جمانی نے کتنے ہی حسین شعر بیان کئے:

لیس فی کل ساعة واوان	لتھیا صنائع احسان
ہر گھڑی ہر وقت میں نہیں حاصل ہوتے	احسان کرنے کے ذرائع
واذا امکنت فبادر الیھا	حذرا من تعذر الامکان

جب تمہیں قدرت حاصل ہو تو احسان کے ذرائع کی طرف جلدی کرو اس ڈر سے کہ کہیں اس قدرت میں پھر عذر درپیش نہ آجائے۔ (قرطبی)

❁ قال رسول اللہ ﷺ ان ھؤلاء من امتی قلیل الامن عصم اللہ"
(رواہ الثعلبی فی تفسیرہ عن مقاتل والبیھقی فی مسندالفردوس من حدیث ابن مالک (رحمھم اللہ)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں یہ لوگ (درگذر کرنے والے) بہت کم ہیں ہاں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ جسے اپنی حفاظت میں لے لے۔

"عن الثوری رحمہ اللہ الاحسان ان تحسن الی المسیٔ فان الاحسان الی المحسن متاجرۃ"
ابو سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں احسان یہ ہے کہ جو تمہارے ساتھ برائی سے درپیش آئے تم اس پر احسان کرو، جب کوئی احسان کرے تو اس پر احسان کرنا تو عام عادت جاری ہے۔ (مظہری)

خیال رہے:

خیال رہے کہ جبریل علیہ السلام کا نبی کریم ﷺ سے سؤال کرنا ''احسان کیا ہے؟اور آپ کا جواب دینا "الاحسان ان تعبد ربک کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک" یہ تفصیلی طور پر سورۃ فاتحہ کی بحث نجوم الفرقان میں دیکھئے۔

فائدہ جلیلہ: غصہ کو روکنے کے مطلب سے اس طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو فنا کر دیتے ہیں ان کی میں اور اکڑ ختم ہو جاتی ہے، اسلئے وہ اپنے غصہ کو روک رکھتے ہیں "لان الغیظ منشاہ رذائل النفس من الکبر والحسد والحقد والبخل ونحو ذلک" غصہ کی وجہ سے انسان سے گھٹیا کام سرزد ہوتے ہیں، غصہ کی بڑی وجوہ تکبر اور حسد، کینہ اور بخل وغیرہ جیسی برائیاں ہیں۔ لوگوں کو معاف کرنے سے اشارہ اس طرف ہے کہ اپنے دل کو فناء کے درجہ میں پہنچایا جائے "لان بفناء القلب یسقط الناس عن نظر اعتبارہ ویری الافعال کلھا منسوبۃ الی اللہ تعالی" اسلئے کہ جب دل کو دنیا سے دور کر کے اللہ کی یاد میں فناء کر دیا جائے تو اس وقت اس کی نظر لوگوں کی طرف نہیں ہوگی بلکہ تمام افعال اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب سمجھے گا، وہ کسی انسان کا مؤاخذہ کرنا جائز نہیں سمجھے گا بلکہ یہی سمجھے گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اسی کے حکم کو تسلیم کرتا ہے۔

"ولعل الانفاق فی السراء والضراء عبارۃ عن علم اشتغال قلوبھم بامتعۃ الدنیا، واللہ اعلم"

اللہ تعالیٰ نے متقین کی جو یہ شان بیان کی کہ وہ مشکل اور آسانی میں، خوشی اور غم میں اللہ کی راہ میں مال خرچ

کرتے ہیں، اس سے اشارہ ہے اس طرف کہ ان کو دنیا کے مال سے محبت نہیں ہوتی، مال ان کے سامنے صرف دنیا کی زندگی گذارنے کیلئے ضروری ہوتا ہے، دنیا کے مال سے محبت نہیں لگاتے کہ مال کے جانے سے وہ غم میں مبتلاء ہو جائیں، بلکہ ان کو مال کے آنے اور جانے کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی۔ (ماخوذ از مظہری)

احسان کی دو قسمیں ہیں: یعنی غیر پر احسان کرنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ اسے نفع پہنچائے، اور دوسری قسم یہ ہے کہ اس سے ضرر کو دور کرے، نفع پہنچانے کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں ہے ﴿اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ﴾ وہ خرچ کرتے ہیں آسانی میں اور مشکل میں۔

"ویدخل فیہ انفاق العلم و ذلک بان یشتغل بتعلیم الجاھلین وھدایۃ الضالین ویدخل فیہ انفاق المال فی وجوہ الخیرات و العبادات"

اس میں علم خرچ کرنے کا ذکر بھی ہے، کیونکہ مال کی کوئی قید نہیں، وہ لوگ بھی احسان کرنے والے یعنی نفع پہنچانے والے ہیں جو جاہلوں کو تعلیم دیتے ہیں، اور گمراہوں کو ہدایت دیتے ہیں، اور اس میں مال خرچ کرنے کا ذکر بھی ہے، تمام خیرات و بھلائی کی قسموں میں مال خرچ کرنا، اور عبادات میں مال خرچ کرنا جیسے زکوۃ، صدقہ فطر وغیرہ ادا کرنا۔

احسان کی دوسری قسم:

احسان کی دوسری قسم یہ ہے کہ غیر سے ضرر کو دور کرنا، اس کی پھر دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ دنیا میں ضرر کو دور کیا جائے **"وھو ان لایشتغل بمقابلۃ تلک الاساءۃ باساءۃ اخری"** وہ یہ ہے کہ کسی کی برائی کے مقابل برائی نہ کی جائے بلکہ اس سے اچھائی کی جائے اس کا ذکر "وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ" میں آ گیا" اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی سے اخروی ضرر دور کی جائے **"وھو ان یبرئ ذمتہ عن التبعات و المطالبات فی الآخرۃ"** وہ یہ ہے کہ آخرت میں جن چیزوں کے پیچھا کرنے اور مطالبہ کرنے کا اسے حق حاصل ہے وہ دنیا میں ہی معاف کر دے، اس کا ذکر "وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ" میں آ گیا، لھذا آیۂ کریمہ غیر پر احسان کرنے کی تمام قسموں کو شامل ہو گئی جب یہ تینوں امور یعنی "مشکل اور آسانی میں مال خرچ کرنا" اور "غصہ کو روکنا" اور "لوگوں سے درگذر کرنا" غیر پر احسان کرنے میں مشترک ہیں تو اس کے بعد ان تمام امور کا ثواب ذکر کیا "وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ" اور اللہ محبت کرتا ہے احسان کرنے والوں سے **"فان محبۃ اللہ للعبد اعم درجات الثواب"** بیشک اللہ تعالیٰ کی بندوں سے محبت کرنا ثواب کے تمام درجات کو شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہر قسم کا، ہر درجہ کا ثواب عطاء فرماتا ہے۔ (کبیر)

"فعلی العاقل ان یسارع الی العمل بالحسنات من الاحسان وانواع الخیرات سریعاقبل الفوات لان فی التاخیر آفات"

عقلمند انسان پر لازم ہے کہ وہ نیکیوں کے کام کرنے میں جلدی کرے، یعنی احسان کرے اور ہر قسم کی بھلائیاں ان کے فوت ہونے سے پہلے جلدی کرے، کیونکہ تاخیر میں آفات ہیں، یعنی نفس اور شیطان اسے راہ راست سے روکنے کی کوشش کریں گے۔

جواں مردا جوانمردی بیاموز — زمردان جہان مردی بیاموز

اے جوان مرد جوانمردی سیکھ — جہان کے مردوں سے مرد بننا سیکھ

درون از کین جویان نگاہ دار — زبان از طعن بدگویان نگاہ دار

تو اپنے باطن کو کینہ تلاش کرنے والون کے کینہ سے محفوظ رکھ — بدکلامی والوں کے طعنوں سے تو اپنی زبان کو محفوظ رکھ

نکوئی کن آں کہ با تو بد کرد — کزاں بد رخنہ دراقبال خود کرد

نیکی کی اس سے جس نے تیرے ساتھ برائی کی — کہ اس نے برائی سے اپنے بخت میں نقصان پیدا کیا

کنوں وقت تخم ست اگر پروری — گر امید داری کہ خرمن بری

اب بیج بونے کا وقت ہے اگر تو فصل پالنا چاہتا ہے اگر تو امید رکھتا ہے کہ کھلیان حاصل کرے۔ (تو نیکیوں میں جلدی کر)

"یعنی ان کنت تامل الجنة فاعبدربک بانواع العبادات مادمت فی الحیاة فان الفرصة غنیمة والمتاخرین عن الیسر الی الله مغبون"

یعنی اگر تو جنت حاصل کرنے کی امید رکھتا ہے تو اپنے رب کی تمام عبادات پر عمل کر جب تک زندہ ہے، بیشک فرصت کو تو غنیمت جان، جو اللہ تعالی کی طرف چلنے سے تاخیر کرتا ہے، اسے غبن کر لیا جاتا ہے (یعنی نفس و شیطان اسے راہ راست سے ہٹا دیتے ہیں) (روح البیان)

وَالَّذِیْنَ اِذَافَعَلُوْافَاحِشَةً اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوْاللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْالِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُالذُّنُوْبَ اِلَّااللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْاعَلٰى مَافَعَلُوْاوَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○ (آیۃ نمبر ۱۳۵)

(1) اور وہ کہ جب کوئی بے حیائی یا اپنی جانو پر ظلم کریں اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی چاہیں اور گناہ کون بخشے سواء اللہ کے اور اپنے کیے پر جان بوجھ کر اڑ نہ جائیں۔ (کنزالایمان)

(2) وہ جنہوں نے کیا بے حیائی کا کام یا ظلم کیا اپنی جانوں پر تو اللہ کو یاد کیا اور بخشش طلب کی اپنے گناہوں کی، اور کون بخشتا ہے گناہوں کو سوائے اللہ کے، اور نہیں اصرار کیا انہوں نے اس پر جو انہوں نے کیا اور وہ جانتے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

(۱) پچھلی آیات میں پہلے جنت کا وصف بیان کیا "اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ" پرہیزگاروں کیلئے تیار کی گئی ہے، اس کے بعد متقین کی ایک قسم کا ذکر کیا "احدھما الذین اقبلوا علی الطاعات و العبادات" یعنی متقین کی دو قسمین ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ابتدائی طور پر ہی طاعات اور عبادات کی طرف متوجہ ہوئے، وہ گناہوں سے محفوظ رہے، ان کے اوصاف اللہ تعالی نے بیان فرمائے کہ وہ مشکل میں اور آسانی میں خرچ کرتے ہیں، اور وہ غصہ کو روک رکھتے ہیں، اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں۔

وثانیھما الذین اذنبوا ثم تابوا وھو المراد بقولہ "وَالَّذِیْنَ اِذَافَعَلُوْافَاحِشَہ" متقین کی دوسری قسم یہ ہے کہ ان سے گناہ تو سرزد ہوئے لیکن وہ ان پر نادم ہو گئے، اور توبہ کر لی، ان لوگوں کا ذکر ہی اس آیۃ کریمہ میں ہو رہا ہے جس کی بحث جاری ہے" یعنی (وَالَّذِیْنَ اِذَافَعَلُوْافَاحِشَةً) الآیۃ" میں اسی کا ذکر ہے۔ توبہ کرنے والا فرقہ بھی، گناہ نہ کرنے والے فرقہ کی طرح متقی بن جاتا ہے۔

"وذلک لان المذنب اذاتاب عن الذنب صار حالہ کحال من لم یذنب قط فی استحقاق المنزلۃ والکرامۃ عنہ اللہ"

اس کی وجہ یہ ہے کہ گنہگار جب گناہوں سے توبہ کر لیتا ہے تو اس کا حال وہی ہو جاتا ہے جیسا کہ حال اس شخص کا ہوتا ہے جس نے کبھی گناہ کیا ہی نہیں ہوتا، یعنی توبہ کر لینے والوں کو بھی اللہ تعالی کے ہاں ایسے ہی بلند مرتبہ اور

کرامت کا مستحق ٹھہرالیا جاتا ہے جیسا کہ گناہ نہ کرنے والوں کو بلند مرتبہ اور کرامت کا مستحق ٹھہرالیا جاتا ہے۔

(۲) ماقبل سے دوسرا تعلق یہ ہے کہ پچھلی آیۃ کریمہ میں بیان فرمایا "وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ" (اللہ محبت رکھتا ہے احسان کرنے والوں سے) یعنی غیروں پر احسان کرنے والے اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔ اب اس آیۃ کریمہ میں بیان کیا جارہا ہے "وندب فی ھذہ الآیۃ الی الاحسان الی النفس" کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے نفس پر احسان کرنے والے بھی پسند ہیں "فان المذنب العاصی اذاتاب کانت تلک التوبۃ احسانا منہ الی نفسہ" اس لئے کہ گنہگار جب سچے دل سے توبہ کرلیتا ہے تو اس کا توبہ کرنا اس کے اپنے نفس پر اس کا احسان کرنا ہے، اسی لئے وہ رب تعالیٰ کو پسند ہے۔

شان نزول: (۱) شان نزول کی ایک وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دو شخصوں یعنی انصاری اور ثقفی کے درمیان بھائی چارہ قائم کردیا، وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے تھے، ایک ساتھ ہی رہتے تھے، نبی کریم ﷺ جہاد وغیرہ کے سفر میں جن جن لوگوں کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا ہوتا، قرعہ اندازی کے ذریعے ان میں سے ایک کو اپنے ساتھ لے جاتے اور دوسرے کو دونوں گھروں کا نظام چلانے کیلئے چھوڑ جاتے۔ ایک مرتبہ قرعہ اندازی کے ذریعے نبی کریم ﷺ نے اپنے ساتھ ثقفی کو سفر میں لیا۔ اور انصاری کو پیچھے چھوڑا، انصاری سے غلطی یہ ہوئی کہ وہ ثقفی کی غیر موجودگی میں ان کی زوجہ کی طرف کھڑا ہوا کہ اس کا بوسہ لے لے، لیکن اس عورت نے اپنے چہرے پر اپنا ہاتھ رکھ لیا۔ تو وہ انصاری اپنے اس فعل پر نادم ہوگیا۔ جب ثقفی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ لوٹے تو انصاری کو گھر میں نہ پایا، معاملہ کا پتہ چلا کہ وہ تو ایک پہاڑ میں پریشان ہوکر سرگرداں ہوکر پھر رہے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ میرے گناہ کی وجہ سے جو میں توبہ کررہا ہوں اسے قبول فرمالے۔ رسول اللہ ﷺ خاموش رہے کہ اللہ تعالیٰ کا جو حکم آئے گا وہی ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے کی توبہ کو قبول فرماتا ہے۔

(۲) شان نزول کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ مؤمنین کہنے لگے کہ بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کے ہاں ہم سے زیادہ مکرم ہیں کیونکہ وہ کوئی گناہ کرلیں تو ان کے دروازے کی چوکھٹ پر ان کے گناہ کو لکھ دیا جاتا ہے، اور ساتھ ہی یہ لکھ دیا جاتا ہے "اجدع انفک، افعل کذا" تیرا ناک کٹ جائے (تو ذلیل ہوجائے) تو اس طرح کر۔ یعنی جرائم سے دور رہ اور اچھے نیکی کے کام کر۔ صحابہ کرام کا مطلب یہ تھا کہ جب بنی اسرائیل کے گناہوں کے گناہوں کو ان کے دروازے پر لکھ دیا جاتا ہے تو وہ اس رسوائی سے بچنے کیلئے گناہوں سے بھی کافی حد تک دور رہتے ہوں گے، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا "وبین انھم اکرم علی اللہ منھم حیث جعل کفارۃ ذنبھم الاستغفار

"اور مؤمنین کو تسلی دی کہ تمہارا مقام میرے نزدیک مکرم ہے بنی اسرائیل کو تو گناہوں پر توبیخ کر کے رسوا کیا جاتا ہے، لیکن تمہارے گناہوں کا کفارہ توبہ کو بنا دیا گیا، تو سچے دل سے توبہ کرو اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی بخشش طلب کرو، اللہ تعالیٰ گناہ معاف کر دے گا۔ (کبیر)

یعنی شان نزول کی دونوں وجوہ میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ دونوں وجہ کے پائے جانے پر آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

مختصر مطلب:

اگر چہ ترجمہ سے کافی حد تک مطلب تو سمجھ آ رہا ہے لیکن ذرا آسان کرنے کیلئے قدرے وضاحت کی جاتی ہے جو لوگ بے حیائی کا کام کر لیں، یا گناہوں کے ذریعے اپنے آپ پر ظلم کر لیں، لیکن پھر وہ اللہ کو یاد کریں، یعنی اپنے گناہوں پر پشیمان ہو جائیں اور اپنے گناہوں کی اللہ تعالیٰ سے مغفرت (بخشش) طلب کریں، اور وہ یقین کر لیں کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں، اور وہ اپنے گناہوں پر اصرار نہ کریں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ گناہوں پر اصرار جائز نہیں، بلکہ توبہ سے ہی گناہوں کے وبال سے نکل سکتا ہے۔

فاحشہ اور ظلم میں فرق:

مفسرین کرام نے مختلف الفاظ سے ان دونوں گناہوں میں فرق کیا ہے، ان وجوہ میں بھی کوئی تعارض نہیں، بلکہ تمام وجوہ فرق پائی جاتی ہیں۔ "فاحشة "فعلة بالغة فی القبح کالزنا" ہر وہ گناہ جس میں زیادہ قباحت اور بے حیائی پائی جائے اسے "فاحشة" کہا جاتا ہے (او ظلموا انفسهم) بان اذنبوا ای ذنب کان" اور ہر قسم کے گناہ کو ظلم کہا جاتا ہے "وقیل الفاحشة الکبیرة وظلم النفس الصغیرة" اور بیان کیا گیا ہے کہ کبیرہ گناہ کو فاحشہ کہا جاتا ہے، اور صغیرہ کو ظلم کہا جاتا ہے "ولعل الفاحشة مایتعدی وظلم النفس مالیس کذلک" وہ گناہ جو متعدی ہو یعنی گناہ کرنے والوں سے تجاوز کر کے دوسروں کو بھی نقصان پہنچائے، اسے فاحشہ کہا جاتا ہے، اور آگے دوسروں کی طرف متجاوز نہ ہو اسے ظلم کہا جاتا ہے۔ (بیضاوی)

بیضاوی نے جو وجوہ فرق بیان کی ہیں وہ کبیر میں بھی بیان کی گئی ہیں، اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے "الفاحشة هی الزنا وظلم النفس هی القبلة واللمسة والنظرة" فاحشہ سے مراد زنا، اور ظلم نفس سے مراد بوسہ اور چھونا اور نظر کرنا۔

تنبیہ: صغیرہ گناہوں پر انسان مصر نہ رہے یعنی صغیرہ گناہوں کا بار بار ارتکاب کرنے سے وہ کبیرہ بن جاتے

ہیں "والصغیرہ یجب الاستغفار منھا" (صغیرہ سے بھی استغفار کرنا ضروری ہے) علامہ رازی رحمہ اللہ نے تو ان الفاظ کے بعد یوں تحریر کیا۔

"بدلیل ان النبی ﷺ کان ماموراً بالاستغفار وھو قولہ "واستغفر لذنبک" وما کان استغفار دالا علی الصغائر بل علی ترک الافضل " (کبیر)

اس کی مکمل بحث ان شاء اللہ اپنے مقام پر ہی آئے گی۔

راقم نے "وَالَّذِیْنَ اِذَافَعَلُوْا فَاحِشَةً" کا ترجمہ کیا ہے "اور وہ جنہوں نے کیا بے حیائی کا کام" یہ ترجمہ کبیر کی اس عبارت سے لیا گیا "الفاحشة ھھنا نعت محذوف والتقدیر "فعلوا فعلة فاحشة"

آیۃ کریمہ کے نزول پر شیطان کی پریشانی و بے قراری:

❁ واخرج الترمذی عن عطاف بن خالد انہ قال بلغنی انھالمانزلت صاح ابلیس بجنودہ وحثاعلی رأسہ التراب ودعابالویل والثبورحتی جاء تہ جنودہ من کل بروبحر فقالوا، مالک یاسیدناقال آیة نزلت فی کتاب اللہ لایضر بعدھااحدامن بنی آدم ذنب قالواوماھی؟فاخبرھم" قالوا انفتح لھم باب الاھواء فلایتوبون ولایستغفرون ولایرون الاانھم علی الحق فرضی منھم بذلک"

عطاف بن خالد کہتے ہیں کہ مجھے یہ خبر ملی کہ جب یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی تو شیطان نے چیخ و پکار کرکے اپنے لشکر کو بلانا شروع کیا، اور اپنے سر پر مٹی ڈالنے لگا، ہائے ہلاکت، ہائے بربادی کی آوازیں دینے لگا، بحروبر (تری اور خشکی) سے اس کے تمام لشکر جمع ہوگئے، انہوں نے کہا اے ہمارے سردار تمہیں کیا ہوگیا؟ اس نے کہا اللہ کی کتاب (قرآن پاک) میں ایک آیۃ نازل ہوئی جس میں یہ بیان کہا گیا آج کے بعد کسی مؤمن کو کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچا سکے گا کیونکہ وہ گناہوں سے توبہ کرکے متقی پرہیزگار بن جائیں گے، انہوں نے پوچھا وہ کون سی آیۃ ہے تو شیطان نے ان کو اس آیۃ (وَالَّذِیْنَ اِذَافَعَلُوْا فَاحِشَةً الآیہ) کے متعلق خبر دی، تو وہ کہنے لگے ہم ان کیلئے خواہشات کا دروازہ کھول دیں گے، وہ توبہ نہیں کریں گے، بخشش طلب کریں گے اور جو کام بھی کریں گے اسے وہ حق سمجھیں گے، شیطان اپنے چیلوں کی یہ بات سن کر راضی ہوگیا۔
(منقول از روح البیان)

﴿ذَکَرُوااللہَ﴾ "انہوں نے یاد کیا اللہ کو۔"

اس یاد کرنے کی دو وجہ ہیں، ایک یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وعید اور اس کے عذاب اور اس کے جلال کو یاد کرتے

ہیں یہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور اس سے حیاء کرنے کے ذرائع ہیں۔ پھر ارشاد فرمایا "فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ" وہ اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں، یعنی استغفار اللہ تعالیٰ سے اس کے عذاب، نہی اور وعید کو یاد کرنے کا اثر اور نتیجہ ہے، اسی مفہوم کو دوسری آیۃ کریمہ میں یوں بیان کیا گیا۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طَآئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾ (الاعراف آیة نمبر ۲۰۱)

بیشک وہ لوگ جو تقوی اختیار کیئے ہیں جب چھوتا ہے انہیں کوئی خیال شیطان کی طرف سے تو وہ (خدا کو) یاد کرنے لگتے ہیں تو فوراً ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ **دوسری وجہ** اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنا عظمت بیان کرنا اور اس کی بزرگی بیان کرنا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے جب سوال کیا جائے تو پہلے اللہ تعالیٰ کی ثناء بیان کرنا ضروری ہے۔

"فھنا لما كان المراد الاستغفار من الذنوب قدموا عليه الثناء على الله تعالى ثم اشتغلوا بالاستغفار عن الذنوب"

اس آیۃ کریمہ میں بھی مقصود جب گناہوں سے توبہ کرنا ہے تو پہلے اللہ کو یاد کرنے کا ذکر کیا، پھر گناہوں سے استغفار کا ذکر کیا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ﴾ "تو بخشش طلب کی انہوں نے اپنے گناہوں کی۔"

مراد اس سے صحیح توبہ کرنا جو اللہ تعالیٰ کے ہاں درجہ مقبولیت حاصل کرلے "وهو الندم على فعل ما مضى مع العزم على ترك مثله في المستقبل" وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے ماضی کے گناہوں پر نادم ہو جائے، اور مستقبل میں گناہ کو چھوڑنے کا پکا ارادہ کرلے، صرف زبان سے استغفار کرنے سے گناہوں کا زوال نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کی طرف کامل توجہ کرنے سے، اسی سے معافی طلب کرنے سے گناہوں کا زوال ہوگا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ "اور کون بخشتا ہے گناہوں کو سوائے اللہ کے۔"

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

یہاں بظاہر استفہام ہے، لیکن سوال مقصود نہیں بلکہ استفہام انکاری پایا گیا ہے، کون بخشتا ہے یعنی کوئی بھی گناہوں کو نہیں بخشتا سوائے اللہ کے، مقصد بیان کرنے کا یہ ہے کہ بندہ رب تعالیٰ کے بغیر کسی اور سے بخشش طلب نہ کرے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں بندے کو عذاب دینے پر قادر ہے تو وہی عذاب کو دور کرنے پر قادر ہے

"فصح انه لایجوز طلب الاستغفار الامنه" صحیح یہی ہے کہ بخشش صرف رب تعالیٰ سے ہی طلب کی جاسکتی ہے۔

﴿وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَافَعَلُوْا﴾ "اور نہیں اصرار کیا انہوں نے اس پر جو انہوں نے کیا۔"

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

"فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ" یہ جملہ معطوف علیہ ہے "وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَافَعَلُوْا" جملہ معطوف ہے، درمیان میں ﴿وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ یہ جملہ معترضہ ہے (وَلَمْ يُصِرُّوْا) یدیموا (عَلٰى مَافَعَلُوْا) بل اقلعوا عنه" (جلالین) یعنی وہ اپنے گناہوں پر قائم نہیں رہتے، بلکہ توبہ کر کے یعنی رب تعالیٰ سے گناہوں کی بخشش طلب کر کے گناہوں کو زائل کر دیتے ہیں۔

﴿وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ "اور وہ جانتے ہیں۔"

دینی طلباء کرام بہتر سمجھتے ہیں:

کہ جس طرح ترکیب ہوگی، اسی طرح معنی ہوگا، ایک ترکیب اس جملہ کی یہ ہے کہ یہ حال واقع ہو رہا ہے، اس صورت میں معنوی طور پر عبارت یہ ہوگی "ولم یصروا علی مافعلوا من الذنوب حال ماکانوا عالمین بکونها محظورة محرمة" وہ اصرار نہیں کرتے گناہوں کے فعل پر حالانکہ وہ جانتے ہیں، کہ یہ کام ممنوع اور حرام ہے، اس لئے کہ جو شخص کسی فعل کی حرمت کو نہیں جانتا اسے کبھی معذور سمجھا جاتا ہے، لیکن جو شخص کسی فعل کی حرمت کو نہیں جانتا وہ معذور نہیں سمجھا جاتا۔ **دوسری** ترکیب یہ ہے کہ یہ جملہ معطوفہ ہے، اس سے عقل، تمیز اور گناہوں سے بچنے پر قادر ہونا مراد ہو، اب معنی یہ ہوگا، اور وہ جانتے ہیں، یعنی عقل وتمیز رکھتے ہیں، اسی لئے وہ گناہوں پر اصرار نہیں کرتے بلکہ توبہ کرتے ہیں، رب تعالیٰ سے معافی طلب کرتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

وضاحت کیلئے مزید اقوال دیکھئے:

(وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ) قال ابن عباس وهم یعلمون انها معصية وان لهم ربا يغفرها" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی "وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ" کا مطلب یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ گناہ کا کام ہے، اور بیشک ان کا رب ہی ان کی بخشش فرمائے گا "وقیل معناه وهم یعلمون ان الله یملک مغفرة

الذنوب" اوراس کا معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ بیشک اللہ تعالی گناہوں کی مغفرت کا مالک ہے۔
"وقیل وهم یعلمون ان الله لایتعاظمه العفوعن الذنوب وان کثرت" اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالی پر گناہوں کا معاف کرنا بھاری نہیں خواہ گناہ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں "وقیل وهم یعلمون انهم ان استغفرو اغفرلهم" اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ بیشک انہوں نے اگر مغفرت طلب کی تو ان کی مغفرت کر دی جائے گی۔ (خازن)

استغفار کی فضیلت کا بیان:

❁ عن علی بن ابی طالب ﷜ انه قال انی کنت اذاسمعت حدیثامن رسول الله ﷺنفعنی الله منه ماشاء ان ینفعنی واذاحدثنی احدمن الصحابة استحلفته فاذاحلف لی صدقته وانه حدثنی ابوبکروصدق ابوبکرانه سمع رسول الله ﷺیقول مامن عبدمؤمن اوقال مامن رجل یذنب ذنبافیقوم فیتطهرثم یصلی رکعتین ثم یستغفرالله الاغفرالله له ثم قرأهذه الآیة والذین اذافعلوافاحشة اوظلموا انفسهم ذکرواالله الی آخرالآیة" (اخرجہ ابوداود والترمذی)

حضرت علی ﷜ فرماتے ہیں بیشک میں نے جب رسول اللہ ﷺ سے حدیث سنی اللہ تعالی نے مجھے نفع عطاء کیا جو نفع وہ دینا چاہتا، جب مجھے کسی ایک صحابی نے حدیث بیان کی تو میں نے اس سے قسم طلب کی جب مجھے قسم اٹھا کر بتایا گیا تو میں نے اس کی تصدیق کر دی، بیشک مجھے حضرت ابوبکر ﷜ نے حدیث بیان کی، بیشک آپ نے سچ بیان فرمایا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا کوئی مومن بندہ نہیں کہ وہ گناہ کرلے پھر کھڑا ہو جائے، پاکیزگی اختیار کرلے، پھر دو رکعتیں پڑھے پھر اللہ تعالی سے بخشش طلب کرے مگر یہ کہ اللہ تعالی اس کی بخشش فرماتا ہے، پھر آپ نے یہی آیۃ کریمہ ﴿وَالَّذِیْنَ اِذَافَعَلُوْافَاحِشَةً﴾ مکمل آیۃ کریمہ پڑھی۔ (منقول از خازن)

❁ عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺوالذی نفسی بیده لولم تذنبوالذهب الله بکم ولجاء بقوم یذنبون فیستغفرون فیغفرلهم" (رواہ مسلم)

حضرت ابوھریرہ ﷜ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالی تمہیں لے جاتا، ایک اور قوم کو لے آتا جو گناہ کرتیتو اللہ تعالی ان کی مغفرت فرماتا۔ (منقول از خازن)

سحری کے وقت استغفار:

سیدالاستغفار و ان وقته الاسحار فالاستغفار عظیم وثوابه جسیم" سیدالاستغفار کا وقت سحری کا وقت ہے، سحری کے وقت استغفار عظیم استغفار ہے، اور اس کا ثواب بہت بڑا ثواب ہے۔

سید الاستغفار:

روی الترمذی عن النبی ﷺ انه قال من قال استغفر الله الذی لااله الاھوالحی القیوم واتوب الیه غفرله وان کان قدفرمن الزحف"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا، جس شخص نے کہا "اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَآاِلٰهَ اِلَّاهُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ" تو اس کی بخشش کردی جاتی ہے اگرچہ وہ جنگ سے بھاگ آئے۔ (منقول از قرطبی)

❁ وروی مکحول عن ابی ھریرة قال مارایت اکثر استغفارا من رسول الله ﷺ وقال مکحول مارایت اکثر استغفار من ابی ھریرة وکان مکحول کثیر الاستغفار"

حضرت مکحول ﷺ فرماتے ہیں حضرت ابوھریرہ ﷺ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ استغفار کرنے والا کوئی نہیں دیکھا، مکحول ﷺ فرماتے ہیں میں نے حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے زیادہ استغفار کرنے والا نہیں دیکھا، مکحول خود بھی بہت زیادہ استغفار کرتے تھے۔ (منقول از قرطبی)

خطباء کے فائدہ کیلئے:

قال سھل بن عبدالله، اَلْجَاهِلُ مَیِّتٌ، وَالنَّاسِیْ نَائِمٌ، وَالْعَاصِیْ سَكْرَانُ، وَالْمُصِرُّ هَالِكٌ"

سہل بن عبداللہ رحمہ اللہ کہتے ہیں، جاہل میت کی طرح ہے، بھولنے والا سونے والے کی طرح ہے، اور نافرمان نشے والے کی طرح ہے، اور گناہوں پر اصرار کرنے والا ہلاک ہونے والے کی طرح ہے۔ (قرطبی)

فائدہ: الاصرار ھوان ینوی الایتوب فاذانوی التوبة النصوح خرج عن الاصرار"

گناہوں پر اصرار کرنے والا جب خالص توبہ کرنے کی نیت کر لیتا ہے تو وہ اصرار سے نکل جاتا ہے۔

انسان تفکر کرے اور دعا بھی کرے:

گناہوں پر اصرار ختم ہوجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے توبہ کی توفیق عطاء کردیتا ہے جب وہ قرآن پاک میں تفکر

کرتا ہے اور اسے جنت کا تفصیلی تذکرہ جو رب تعالیٰ نے فرمایا وہ اور مطیعین سے وعدہ اور آگ کا عذاب نافرمانوں کیلئے اور ان پر تہدید (دھمکیاں) وغیرہ جب اس کے ذہن میں آجائیں گی تو اسکے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کی رحمت کی امید آجائے گا تو یہ رب تعالیٰ سے دعاء کرے گا، اس کی طرف رجوع کرے گا یہ توفیق بھی اسے رب تعالیٰ سے ہی حاصل ہوگی کہ وہ توبہ کرلے اور اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرلے۔ (منقول از قرطبی)

تنبیہ: حقوق العباد جب تک ادا نہیں کرے گا اس وقت تک اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول نہیں کرے گا، اس لئے توبہ کرنے والے کیلئے ضروری ہے کہ اگر اس کے ذمہ حقوق العباد ہیں تو ان کو ادا کرے۔ (منقول از قرطبی)

❁ **عن ابی هريرة عن النبی ﷺ فیمایحکی عن ربه تعالٰی قال اذااذنب عبدذنبافقال اللهم اغفرلی ذنبی قال تبارک وتعالٰی اذنب عبدی ذنباعلم ان له ربایغفر الذنب ویاخذبالذنب، وفی روایة اعمل ماشئت قدغفرت لک، قال عبدالاعلی لاادری أقال فی الثالثة او الرابعة اعمل ماشئت"**

حضرت ابو ہریرہ ﷛ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب تعالیٰ (کی رحمت) کی حکایت اس طرح بیان کی کہ بندہ جب گناہ کرتا ہے اور (توبہ کرتا) کہتا ہے اے اللہ میرے گناہ معاف کردے، اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے گناہ کرلیا ہے، اسے معلوم ہے کہ بیشک اس کا رب ہے جو گناہوں کی مغفرت بھی کرتا ہے اور گناہوں پر پکڑتا بھی ہے، (رب تعالیٰ ان الفاظ سے اس کی مغفرت کردیتا ہے) بندہ پھر گناہ کرلیتا ہے پھر عرض کرتا ہے اے اللہ میرے گناہ کو معاف کردے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے گناہ کرلیا ہے، وہ جانتا ہے کہ اس کا رب ہے جو گناہ معاف کرتا ہے، اور گناہوں پر پکڑ بھی وہی کرتا ہے، ایک روایت میں ہے کہ (بندہ جب بار بار غلطی کرتا ہے اور رب تعالیٰ سے ہی معافی طلب کرتا ہے) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تو جو چاہے عمل کر میں نے تیری مغفرت کردی۔

گذشتہ سے پیوستہ:

آیۃ کریمہ کے شان نزول کی دو وجہ شروع میں بیان کردیں، روح البیان، معالم التنزیل وغیرہ نے ایک اور وجہ بھی بیان کی کہ" کہ ایک شخص جس کا نام تیہان تھا، وہ کھجوریں بیچتا تھا، اس کا لقب تمار تھا، اس تیہان تمار کے پاس ایک حسین عورت کھجوریں خریدنے کیلئے آئی تو اس نے عورت کو اپنے گلے لگا لیا اور بوسہ لے لیا، لیکن پھر اپنی غلطی پر نادم ہوگیا (توبہ کی غرض سے کہ غلطی معاف ہوجائے) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اپنا معاملہ آپ پر پیش کیا، تو اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی، آیۃ کریمہ کے شان کی تین وجوہ ذکر کرنے کے بعد علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"وانت تعلم انه لامانع من تعدد سبب النزول وایاما کان فباطلاق اللفظ ینتظم مافعله الرماة انتظاما اولیا"

اور تمہیں معلوم ہے کہ نزول کے اسباب کے تعدد میں کوئی ممانعت نہیں، کئی واقعات کے بعد آیۃ کریمہ کا نزول ہوا ایسا ممکن ہے اس میں کوئی خرج نہیں، شان نزول کوئی بھی ہو عموم الفاظ سے مطلب یہی ہے کہ جو بھی گناہ کرلے اور ان گناہوں پر جمانہ رہے بلکہ فوراً رب تعالیٰ کو یاد کرے اور اس سے گناہوں کی مغفرت طلب کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کردے گا۔ (منقول از روح المعانی)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

اُولٰئِکَ جَزَاؤُھُمْ مَغْفِرَۃٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَؕ (آیۃ نمبر ۱۳۶)

(1) ایسوں کو بدلہ ان کے رب کی بخشش اور جنتیں ہیں، جن کے نیچے نہریں رواں ہمیشہ ان میں رہیں، اور کامیوں کا کیا اچھا نیگ ہے۔ (کنز الایمان)

(2) یہی بلند مرتبہ ہیں وہ جن کا بدلہ بخشش ہے ان کے رب کی طرف سے، اور جنتیں ہیں جاری ہیں ان کے نیچے نہریں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، کتنا ہی اچھا ہے اجر (نیک) عمل کرنے والوں کا۔ (نجوم الفرقان)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"اولئک" کی ترکیب میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ یہ جملہ استنافیہ ہو اس صورت میں اس کا "مشارالیہ" "اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ" میں جو متقین کا ذکر ہے اور پچھلی آیۃ میں جو توبہ کرنے والوں کا ذکر ہے۔ وہ مجموعی طور پر ہے، یعنی یہی متقین اور تائبین کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے بخشش ہے۔ الخ

اور دوسری ترکیب یہ ہے کہ پچھلی آیۃ کریمہ جو موصول "والذین" ہے اس موصول اور صلہ کی یہ خبر ہو تو اس صورت میں "مشارالیہ" صرف تائبین ہوں گے۔ یعنی توبہ کرنے والے ہی وہ لوگ ہیں جن کا بدلہ مغفرت ہے ان کے رب کی طرف سے۔ الخ (مظہری)

راقم نے "اولئک" کا ترجمہ کیا ہے "یہی بلند مرتبہ ہیں" یہ ترجمہ تفسیر ابی السعود سے لیا گیا ہے۔

"اولئک" اشارة الی المذکورین آخرا باعتبار اتصافهم بما مر من الصفات الحمیدة وما فیه من معنی البعد للاشعار ببعد منزلتهم وعلو طبقتهم فی الفضل"

"اولئک" کا اشارہ پچھلی آیات میں جن لوگوں کا ذکر ہے ان کی طرف ہے، ان کی اچھی صفات کی وجہ سے ذکر فرمایا کہ وہ اچھی جزاء کے مستحق ہیں "اولئک" اشارہ بعید کیلئے ہے حالانکہ ان لوگوں کا ذکر قریب ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ فضیلت میں ان کا مرتبہ بلند ہونے اور ان کا طبقہ بلند ہونے کی وجہ سے گویا کہ ان مرتبہ کے لحاظ پر بعد (دوری) حاصل ہے، طلباء کرام جانتے ہیں اسے "بعد رتبی" کہا جاتا ہے، حقیقت میں قرب اور شان اور فضیلت میں بعد دونوں چیزوں کا اعتبار کرتے ہوئے راقم نے ترجمہ کیا ہے "یہی بلند مرتبہ ہیں" واللہ اعلم بالصواب

دو امر مطلوب ہیں:

ایک یہ کہ عذاب سے محفوظ رکھنا، اس کا تذکرہ "مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ" میں کیا ہے، کہ ان کے گناہوں کی ستر پوشی کی جاتی ہے اور ان کی بخشش کی جاتی ہے۔ **دوسری چیز** مطلوب یہ ہے کہ ان کو ثواب پہنچانا اس کا ذکر ﴿جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا﴾ (اور ان کی جزاء) جنتیں ہیں جاری ہیں ان کے نیچے نہریں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے "نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ" ذکر فرما کر یہ واضح کر دیا "ان الذی یحصل لهم من ذلک وهو الغفران والجنات یکون اجر العلهم وجزاء علیه" بیشک ان کو جو مغفرت اور جنتیں (باغات) جو حاصل ہوں گی یہ ان کے نیک عمل پر اجر اور جزاء ان کو حاصل ہونی ہے۔ (کبیر)

تنبیہ: **قال القاضی، وهذا یبطل قول من قال ان الثواب تفضل من الله ولیس بجزاء علی عملهم"**

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی "وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ" (کتنا ہی اچھا ہے اجر (نیک) عمل کرنے والوں کا) سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ ان لوگوں کا یہ قول باطل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ثواب صرف اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہوتا ہے، کسی عمل کا بدلہ نہیں ہوگا، یہ قول درست نہیں کیونکہ واضح طور پر ان الفاظ مبارکہ میں عمل پر اجر و ثواب کا ذکر کیا۔ (کبیر)

اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا﴾ "بیشک اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا اجر اس کا جو اچھا عمل کرتا ہے" بھی

اسی پر دلالت کر رہا ہے کہ ان کو نیک عمل پر اجر وثواب حاصل ہوگا۔ راقم کا اس پر موقف یہ ہے کہ نیک اعمال اجر وثواب کا ذریعہ ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم بھی ان کے شامل حال رہتا ہے، کیونکہ اگر وہ چاہے تو بغیر عمل کے بھی مغفرت فرما دے۔

ماقبل اور مابعد سے تعلق:

اس آیۃ کریمہ کا ماقبل سے تعلق یہ ہے کہ پہلے ذکر کیا گیا توبہ کرنے والوں کا جو اپنے گناہوں پر اصرار نہیں، اب ذکر کیا جا رہا ہے کہ جو خلوص دل سے توبہ کرتے ہیں، اور اپنے گناہوں پر جمے نہیں رہتے، اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت اور جنات عطاء کرتا ہے۔ مابعد سے تعلق یہ کہ غزوۂ احد میں بعض صحابہ کرام پسپا ہو گئے تھے، اس ذکر سے پہلے ہی یہ بیان کر دیا "من فر ثم تاب ولم یصر فلہ مغفرۃ اللہ" جو شخص پسپا ہو گیا لیکن اس نے توبہ کر لی اور اپنی خطاء پر جما نہیں رہا اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کر دی۔ (ماخوذ از قرطبی)

راقم نے چند سطر پہلے اپنا موقف ذہنی سوچ سے لکھا، روح البیان سے اسے تائید ان الفاظ سے حاصل ہوگئی

"وَنِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِيْنَ" المخصوص بالمدح محذوف ای ونعم اجر العاملین ذلک ای ماذکر من المغفرۃ والجنات والتعبیر عنھما بالاجر المشعر بانھما تستحقان بمقابلۃ العمل وان کان بطریق التفضل لمزید الترغیب فی الطاعات والزجر عن المعاصی" (روح البیان)

"نعم" فعل مدح ہے اس کا مخصوص بالمدح "ذلک" محذوف ہے جس کا اشارہ مغفرت اور جنات کی طرف ہے یعنی وہ مغفرت اور جنات کے مستحق ہوں گے کہ ان کے اعمال اچھے ہوں گے ہاں البتہ ان کو اللہ تعالیٰ کا فضل بھی حاصل ہوگا جس کی وجہ سے ان کو نیکیوں میں رغبت زیادہ حاصل ہوگی، اور معاصی سے زجر حاصل ہوگی۔

انسان عمل سے بے نیاز نہ ہو:

"روی ان اللہ تعالی اوحی الی موسی علیہ السلام "ماا قل حیاء من یطمع فی جنتی بغیر عمل یاموسی کیف اجود برحمتی علی من یبخل بطاعتی"

روایت بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ وہ شخص کتنی ہی کم حیاء والا ہے جو بغیر عمل کے میری جنت کی طمع رکھتا ہے۔ اے موسیٰ میں اسے اس پر جنت عطاء کرنے کی کیسے سخاوت کروں جو

میری طاعت کرنے میں بخل کرتا ہے۔ (روح البیان۔بحرالمحیط)

❁ وعن شهر بن حوشب طلب الجنة بلاعمل ذنب من الذنوب وانتظار الشفاعة بلاسبب نوع من الغرور وارتجاء الرحمة ممن لایطاع حمق وجهالة"

شہر بن حوشب کا قول یہ ہے کہ جنت کی طلب بغیر عمل کے گناہوں میں سے ایک گناہ،اور بغیر سبب کے شفاعت کی انتظار دھوکہ کی قسموں میں سے ایک قسم ہے،اور رحمت کی امید اس ذات سے کرنا جس کی اطاعت ہی نہ کی جائے حماقت وجہالت ہے۔ (روح البیان،بحرالمحیط)

حضرت رابعہ بصریہ رحمہا اللہ اکثر طور پر یہ شعر پڑھا کرتی تھیں۔

ترجوالنجاة ولم تسلک مسالکها ان السفینة لاتجری علی الیبس"

تو نجات کی امید کرتا ہے اور اس کے راستوں پر نہیں چلتا۔بیشک کشتی خشکی پر نہیں چلا کرتی۔(روح البیان)

فائدہ: سب سے عمدہ چیز ایمان ہے، یہ توحید سے حاصل ہوتا ہے اسلئے کہ توحید شرک کے منافی ہے،وہ ایمان وتوحید انسان کو توبہ اور استغفار کی طرف پہنچاتے ہیں،مومن وموحد کیلئے یہی بلندی مقام ہے کہ وہ توبہ استغفار کی طرف پہنچاتے ہیں،مومن وموحد کیلئے یہی بلندی مقام ہے کہ وہ توبہ واستغفار کے ذریعے متقین میں آجائے تاکہ وہ جنت میں داخل ہوسکے۔اللہ تعالی کی ذات وصفات پر ایمان رکھنے والے اور اللہ تعالی کی واحدانیت پر ایمان رکھنے والے بندہ کے لائق یہی ہے کہ وہ اپنے اختیار سے اللہ تعالی کے احکام تسلیم کرتا رہے اور اللہ تعالی نے جن کاموں سے روکا ہے ان سے رک جائے،اور یہ بھی ایمان رکھے "وان كان التوفيق الى جانب العمل ايضا من عنايته تعالى" کہ عمل کی توفیق بھی اللہ تعالی کی مہربانی سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

نخست اوارادت بدل درنہاد پس این بندہ برآستان سرنہاد

سب سے پہلے بندہ اپنے دل کے ارادہ کو رب کے در پر رکھے اس کے بعد بندہ اپنے رب تعالی کے آستانہ پر سر رکھے۔یعنی ایمان پہلے لائے اور پھر رب تعالی کی عبادت کرے۔

طالب حق کیلئے یہ ضروری ہے:

کہ وہ کامل ادب کو بجالائے تاکہ ادب کے ذریعے بلند مراتب تک پہنچ جائے،کیا تم نہیں دیکھتے کہ رسول اللہ ﷺ صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے پاک ہونے کے باوجود اللہ تعالی سے ہر روز ستر یا سو مرتبہ استغفار کرتے،اس کی

وجہ یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے ادب کو بجالایا جائے۔

وبکمال ادبه وصل الی ماوصل حتی صار اتباعه سببا لمحبة الله كما قال الله تعالى

"قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله"

نبی کریم ﷺ رب تعالیٰ کے کامل ادب کو بجالانے کی وجہ سے اس عظیم درجہ پر پہنچے کہ آپ کی تابعداری اللہ تعالیٰ کی محبت کا ذریعہ بن گئی، اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿قُلۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ﴾ (اے محبوب) آپ فرمادیجئے اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری تابعداری کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔ نبی کریم ﷺ اتنے بلند و بالا منصب پر قائم ہونے کے باوجود "ومع ذلک کان خوفه واجلاله فی غایة والکمال" کامل درجہ کا اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کے جلال کا لحاظ دل میں رکھتے تھے۔ اے نبی کریم ﷺ کے امتی، آپ کی اتباع کرنے والے تیرے لئے تو اور ہی ضروری ہے کہ تو اپنے آقا ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اور اپنے آقا و مولیٰ کی تابعداری کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں رکھ، اللہ تعالیٰ کے جاہ و جلال کو بھی دل میں بسالے، **راقم** کے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت پر بھی قوی امید رکھ اور اس کے جمال کی طرف بھی دھیان رکھ۔ (ماخوذ از روح البیان)

علامہ اسمٰعیل حقی رحمہ اللہ نے اپنے لئے اور دوسرے مؤمنین کیلئے دعاء کی راقم کی بھی اپنے لئے اور تمام مؤمنین کیلئے وہی دعاء ہے۔

"وفقنی الله وایاکم الی مایجب ویرضی ویداوی بلطفه وکرمه هذه القلوب المرضی فان بیده مفاتیح الاصلاح والفوز بالبغیة والظفر بالفلاح"

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو توفیق عطاء فرمائے کہ ہم وہی کام کریں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہوں اور جن پر وہ راضی ہوجائے، اے اللہ اپنے لطف و کرم سے ہمارے مریض دلوں کو دواء دے دے (تاکہ ان کو شفا حاصل ہوجائے) اصلاح اور مقاصد کے حصول کی کامیابی اور فلاح پر کامیاب کرنے کی چابیاں رب تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہی ہے (اس لئے اسی پر امید ہے کہ وہ ہمیں بھی یہ مقاصد عطاء فرمائے گا)۔ (روح البیان)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"خَالِدِيْنَ فِيْهَا" حال مقدرة من الضمير المجرور فی (جزاؤهم) لانه مفعول به معنی اذهو فی قوة یجزیهم الله جنات خالدین فیها"

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں "خَالِدِيْنَ فِيْهَا" "جزاؤهم" کی مجرور ضمیر یعنی مضاف الیہ سے حال مقدرہ ہے کیونکہ وہ معنی مفعول ہے، معنوی لحاظ پر مطلب یوں ہوگیا، وہ ان کو جزاء عطاء کرے گا یعنی جنات عطاء کرے گا تو

اس حال میں انہیں وہاں ہمیشہ رہنا ہوگا۔ (روح المعانی)

حال مقدرہ کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ جس کام نے مستقبل میں حاصل ہونا ہو اور اس حال میں کسی چیز نے واقع ہونا ہو۔

مؤمنین کے تین طبقات ہیں:

(۱) متقین (۲) تائبین (۳) مصرین

(۱) **متقین:** کو اللہ تعالیٰ نے اجر و ثواب عطاء کرنے کا اور مغفرت کرنے کا اپنے فضل و کرم سے وعدہ کر رکھا ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا ﴿وَلَا نُضِيعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ اور ہم ضائع نہیں کرتے اجر احسان کرنے والوں کا۔

(۲) **تائبین:** یعنی توبہ کرنے والوں سے رب تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مغفرت کا اور جنت عطاء کرنے کا وعدہ فرمایا۔ جس کا ذکر اس زیر بحث آیۃ کریمہ اور اس سے پچھلی آیۃ کریمہ میں ہے۔

(۳) **مصرین:** یعنی گناہوں پر اصرار کرنے والوں کے متعلق کیا حکم ہے؟ اس میں دو مذہب ہیں۔

ایک مذہب یہ ہے:

ان غیر المصریین تغفر ذنوبهم ویدخلون الجنة و اماالهاتدل علی ان المصریین لاتغفر ذنوبهم و لایدخلون الجنة کمازعمه البعض "

یعنی بعض لوگوں نے یہ کہا کہ جب رب تعالیٰ نے مغفرت کا وعدہ توبہ کرنے والوں سے فرمایا اور ساتھ ہی یہ فرمایا "وَلَمْ يُصِرُّوْعَلٰى مَافَعَلُوْا" کہ وہ اپنے برے افعال پر اصرار نہ کریں یعنی گناہوں پر جمے نہ رہیں تو رب تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے گا تو اس سے پتہ چل گیا کہ جو گناہوں پر اصرار کریں گے تو ان کے گناہوں کو رب تعالیٰ نہیں بخشے گا اور نہ ہی ان کو جنت میں داخل کرے گا

یہ مذہب صحیح نہیں:

علامہ آلوسی رحمہ اللہ اسے رد فرماتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں۔

کمازعمه البعض فلا، لان السکوت عن الحکم لیس بیانا لحکمهم عندبعض "

بعض لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ گناہوں پر اصرار کرنے والوں کی مغفرت نہیں ہوگی اور وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے ان کا یہ گمان درست نہیں، اس لئے کہ بعض محققین نے یہ بیان کیا ہے کہ ایک حکم بیان کر دیا جائے دوسرا نہ بیان کیا جائے تو وہ بیان کئے جانے والے حکم سے خود بخود بیان نہیں ہو جاتا، گناہوں پر اصرار نہ کرنے والوں اور توبہ کرنے والوں کا حکم بیان

کردیا گیا ہے کہ ان کی مغفرت اللہ تعالیٰ فرمائے گا اور ان کو جنات عطاء فرمائے گا، لیکن اس سے اصرار کرنے والوں کا حکم خود بخود صادر نہیں ہوتا کیونکہ ان کے متعلق بیان ہی نہیں کیا گیا، بلکہ ان کے حکم سے سکوت کیا گیا ہے۔

دوسرا مذہب: یہی صحیح ہے کہ گناہوں پر اصرار کرنے والے اگر گناہوں کو جائز سمجھتے ہوں تو وہ کافر ہوں گے اور ان کی مغفرت نہیں ہوگی اور وہ جنت میں بھی داخل ہوں گے اور اگر وہ گناہوں کو گناہ ہی سمجھتے ہوئے غلطی سے گناہوں پر اصرار کرتے ہوں، ان گناہوں پر جمے ہوئے ہوں تو وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہیں رب تعالیٰ چاہے تو ان کو اپنے فضل سے معاف کردے اور چاہے تو ان کو گناہوں کا عذاب دے دے۔

تفضّل کی دو قسمیں ہیں:

ایک قسم یہ ہے کہ وہ عمل پر مرتب ہوتا ہے جیسا کہ کھانے پر سیر ہونا مرتب ہوتا ہے اس کا نام اجر و جزاء ہے۔

تفضّل کی دوسری قسم:

ھو محض التفضل حقیقة واسما" وہ فقط مہربانی ہے حقیقۃ بھی اور نام کے لحاظ سے بھی صرف رب کا فضل اور مہربانی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا کبیرہ گناہوں کا معاف کرنا اور جنت میں اللہ تعالیٰ کا اپنا دیدار سے مشرف فرمانا جو بھی اس کی شان کی لائق ہوگا اس دیدار کی کیفیت کو بیان نہیں کیا جاسکتا یہ سب عمل کے بغیر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہوگا اس کا نام ہی عفو، کرم، تفضّل اور مہربانی ہے اسے اجر و ثواب نہیں کہا جاسکتا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

نکتہ: "**ونعم اجر العاملین**"**لان المتدارک کالعامل لتحصل بعض مافوت علی نفسه وکم بین المحسن والمتدارک والمحبوب والاجیر ولعل تبدیل لفظ الجزاء بالاجر لھذه النکته**" (بیضاوی)

اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ﴿وَنِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِیْنَ﴾ اور اچھا ہے اجر (نیک) عمل کرنے والوں کا، گناہوں سے توبہ کرکے اپنی تقصیر کا تدارک کرنے والے ایسے ہی ہیں جیسے اپنی ذاتی کوئی چیز فوت ہوجائے تو اسے حاصل کرلے۔ ابتدائی طور پر احسان کرنے والے، اور غلطیوں کا تدارک کرنے والوں میں بہت بڑا فرق ہے اور رب تعالیٰ کی رضاء کیلئے عمل کرنے والے رب تعالیٰ کے محبوب بن جاتے ہیں، اور جنت کیلئے عمل کرنے والے اجر (مزدور) کے درجے میں ہوتے ہیں، ان دونوں میں بھی بہت بڑا فرق ہے، اسی نکتہ کیلئے جزاء کے بعد اجر ذکر کیا کہ ان کا عمل ہی حصول جنت کیلئے ہے تو ان کی جزاء حقیقت میں اجر کا درجہ رکھتی ہے۔

قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ سُنَنٌ فَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ○ (آیۃ نمبر ۱۳۷)

(1) تم سے پہلے کچھ طریقے برتاؤ میں آچکے ہیں تو زمین میں چل کر دیکھو، کیسا انجام ہے جھٹلانے والوں کا۔ (کنز الایمان)

(2) تحقیق گذر گئے تم سے پہلے طریقے، تو چلو زمین میں تو دیکھو کیسے ہوا انجام جھٹلانے والوں کا۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

پچھلی آیۃ میں اللہ تعالیٰ کے وعدہ کا ذکر ہے جو طاعت پر اور معصیت سے توبہ پر مغفرت اور جنت عطاء کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے، اب اس آیۃ کریمہ میں فعل طاعت پر اور گناہوں سے توبہ کرنے پر ابھارا گیا ہے "وھو تامل احوال القرون الخالیۃ من المطیعین والعاصین" وہ ہے گذرے ہوئے لوگوں کے احوال میں غور وفکر کرنا، یعنی مطیع اور عاصی لوگوں کی حالات میں غور وفکر کرو تا کہ تمہیں طاعت کرنے اور گناہ سے بچنے یا گناہ سے توبہ کرنے کا پتہ چل جائے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿قَدۡ خَلَتۡ﴾ (تحقیق گذر گئے)

واحدی نے بیان کیا ہے کہ لغت میں "الخلو" کا معنی ہے "انفراد" وہ مکان جو خالی ہو رہنے والوں سے منفرد ہوا سے "المکان الخالی" کہا جاتا ہے۔ اور گزرے ہوئے زمان پر بھی بولا جاتا ہے، کہا جاتا ہے 'الزمان الخالی" گذرا ہوا زمانہ" کیونکہ وہ بھی اب موجود نہیں۔ موجود ہونے سے خالی ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے "الامم الخالیۃ" گذری ہوئی قومیں۔ "سنن جمع ہے "سنۃ" کی، "واما السنۃ فھی الطریقۃ المستقیمۃ" سنت ایک جاری طریقہ کو کہا جاتا ہے۔ اور وہ مثال جو جاری ہوا سے بھی سنت کہا جاتا ہے۔

اس لفظ کے اشتقاق میں چند وجوہ ہیں:

(۱) یہ وزن ہے "فعلۃ" کا، لیا ہوا ہے "سن الماء یسنہ" سے یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب پانی لگاتار گرایا جائے۔ "السن الصب للماء" پانی کے بہانے کو "السن" کہا جاتا ہے۔ عرب حضرات جاری پانی سے

جاری راستہ کو تشبیہ دے کر "الطریقة المسنونة"

(۲) یا ماخوذ ہے "سن الرمح" سے نیزے کو پھل لگانا۔ "سن الاسنان" دانتوں میں مسواک کرنا۔ "استسن" عمر رسیدہ ہونا "حمأ مسنون" بدبودار مٹی "الفعل المنسوب الی النبی ﷺ سمی سنة" نبی کریم ﷺ کے فعل کو سنت کہا جاتا ہے یہ معنی سب سے زیادہ مشہور ہے۔ (ماخوذ از کبیر المنجد)

﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ﴾ ان الفاظ مبارکہ سے مراد یہ ہے "قَدْ انْقَضَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنُ الله تعالى فى الامم السالفة" تحقیق گذر گئے تم سے پہلے اللہ تعالیٰ کے طریقے تم سے پہلے گذری ہوئی امتوں میں، (کبیر)

"قيل سنن" ای "امم" و "السنة الامة" بعض حضرات کا قول ہے کہ "سنة" کا معنی "امت" ہے۔ "سنن" جمع ہے "سنة" کی اسلئے "سنن" کا معنی ہے "امتیں" اب "قَدْ انْقَضَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ" کا مطلب یہ ہوگیا تحقیق گذر گئیں تم سے پہلے امتیں۔ سنن کا معنی "امتیں" جو لیا گیا ہے، وہ ایک شاعر کے شعر سے لیا گیا ہے کسی شاعر نے کہا۔

ماعاين الناس من فضل كفضلكم ولا راوا مثلكم فى سالف السنن

لوگوں نے تمہارے فضل جیسا کوئی فضل نہیں دیکھا اور نہ ہی انہوں نے دیکھا تمہارے جیسے گزری ہوئی امتوں میں۔

اس شعر میں "سنن" کو "امم" (امتیں) کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از معالم التنزیل للبغوی)

پہلے طریقے، یا پہلی امتیں گذر گئیں اس سے مراد کیا ہے؟

اس مسئلہ میں دو قول ہیں، فالاكثرون من المفسرين على ان المراد سنن الهلاك والاستئصال" بدليل قوله تعالى ﴿فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾ ایک قول اس میں اکثر مفسرین کا ہے کہ مراد "سنن" سے ان کی ہلاکت اور بربادی ہے یعنی تم سے پہلے امتوں کی ہلاکت اور تباہی اور بربادی گذر چکی ہے، یہ معنی ان الفاظ مبارکہ سے سمجھ آرہا ہے ﴿فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾ (تو دیکھو کیسے ہوا انجام جھٹلانے والوں کا) یعنی انہوں نے دنیا کی حرص اور دنیا کی طلب کیلئے انبیاء کرام اور رسولوں کی مخالفت کی، پھر وہ تباہ و برباد ہو گئے ان کی دنیا کے اثرات ختم ہو گئے، "وبقى اللعن فى الدنيا والعقاب فى الآخرة عليهم" اور ان پر دنیا میں لعنت باقی رہی اور آخرت میں ان کو عذاب ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کو پہلے لوگوں کے حالات میں غور و فکر کرنے کی رغبت دلائی کہ ان کے حالات میں غور و فکر کر کے ایمان پر قائم رہو اور دنیا کی ریاست اور دنیاوی جاہ و جلال سے اعراض کر لو، دوسرا قول اس

مسئلہ میں مجاہد رحمہ اللہ کا ہے "وقال مجاھد بل المراد سنن الله تعالی فی الکافرین و المؤمنین" کہ "سنن" سے مراد پہلی امتیں ہیں مطلقا، یہ کافر امتوں اور مؤمن امتوں دونوں کو شامل ہے، دنیا نہ مؤمنوں کے ساتھ قائم رہی اور نہ ہی کافروں کے ساتھ رہی، البتہ مؤمنوں کی اچھی تعریف دنیا میں قائم ودائم ہے، اور آخرت میں ان کو بہت بڑا ثواب حاصل ہوگا۔ اور کافروں پر دنیا میں لعنت قائم رہے گی، اور آخرت میں وہ عذاب میں مبتلاء ہوں گے۔

پہلے قول پر دلیل یہ قائم کی گئی ہے کہ رب تعالی نے فرمایا ﴿فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ﴾ تو دیکھو کیسا ہے انجام جھٹلانے والوں کا" اس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلی کافروں امتوں کے احوال میں غور وفکر کا حکم دیا گیا ہے، تو اس کا جواب دوسرے قول والوں نے یہ دیا ہے "ثم انه تعالی قال" فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ "لان التأمل فی حال احدالقسمین یکفی فی معرفة حال القسم الآخر" کہ مراد تو عام ہے کہ پہلے گذرے ہوئے مؤمنوں اور کافروں دونوں کے احوال میں غور وفکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن ذکر صرف ایک فریق کا بظاہر نظر آتا ہے کہ حکم دیا گیا تو دیکھو تم انجام جھٹلانے والوں کا" لیکن ایک فریق کے ذکر اور اس کے احوال میں تامل کرنے سے دوسرے فریق میں تامل کرنے کا حکم خود بخود پتہ چل جاتا ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ کے اس قول پر در منثور میں ایک روایت مذکور ہے۔

❁ **اخرج عبدین حمید وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم عن مجاهد فی قوله "قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ" یعنی تداول من الکفار والمؤمنین فی الخیر والشر"**

عبد بن حمید اور ابن جریر اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالی کے ارشاد گرامی ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ﴾ کا مطلب یہ ہے، کہ آگے پیچھے گذر جانے والے مؤمنین کے خیر کے حالات اور کفار کے شر کے حالات کو دیکھو۔ (منقول از در منثور)

راقم کا اپنا موقف تو اگرچہ پہلے قول سے متفق ہے جو اکثر مفسرین کرام کا ہے، تاہم حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ کے ترجمہ میں بریکٹ میں الفاظ بڑھا کر اور تفسیر میں دوسرے قول کو ترجیح دی گئی۔

ضیاء القرآن میں ترجمہ یوں پیش کیا گیا "گزر چکے ہیں تم سے پہلے (قوموں کے عروج وزوال کے) قاعدے پس سیر کرو زمین میں اور (اپنی آنکھوں سے) دیکھو کہ کیسا انجام ہوا (دعوت حق کو) جھٹلانے والوں کا۔ تفسیر یوں کی گئی "سنن" جمع ہے سنت کی، اور سنت وہ راستہ ہے جو شاہراہ عام ہو، وہ طرز زندگی ہے جس کا ہمیشہ التزام اور پابندی کی جائے، غزوۂ احد کی تکلیفات، بدر کی فتح مبین، سود خواری کے نقصان عظیم اور مرد مؤمن کی صفات کا ذکر فرمانے کے بعد بتایا جا رہا ہے کہ زمین کے اس کھلے ہوئے صفحہ پر تم سے پہلے گزری ہوئی اقوام کے حالات جلی قلم سے مرقوم ہیں، تم انہیں پڑھ لو، فتح وسرخروئی کی عزت انہیں دی گئی جو ان صفات کے مالک تھے اور ناکامی وذلت انہیں

کے حصہ میں آئی جوان سے محروم تھے، قدرت کے قوانین یکساں اور اٹل ہیں، کسی کیلئے انہیں توڑا نہیں جاتا۔
(ضیاء القرآن)

اصل مقصود عبرت پکڑنا ہے:

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی "فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا" میں چل کر ہی پہلے لوگوں کے حالات دیکھنا لازم نہیں۔ "بل المقصود تعرف احوالهم، فان حصلت هذه المعرفة بغير المسير في الارض كان المقصود حاصلا" بلکہ مقصد یہ ہے کہ تم ان کے احوال کو پہچانو، اگر تمہیں چلنے کے بغیر ہی پہلے لوگوں کے حالات کا پتہ چل جائے تو مقصد حاصل ہو گیا۔ یعنی پہلے لوگوں کے حالات کو دیکھ کر، ان کے حالات کو سن کر، ان کے حالات کو کتابوں میں پڑھ کر عبرت حاصل ہو گیا، ہاں البتہ یوں کہا جا سکتا ہے۔

"ان المشاهدة آثار المتقدمين اثر اقوى من اثر السماع" کہ چل کر جانا ان اجڑی بستیوں کو دیکھنا، ان کی قبروں اور بوسیدہ ہڈیوں کو دیکھنا یہ زیادہ قوی ہے بنسبت سننے کے لھذا رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی "فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ" یقیناً اسی فائدہ پر مرتب ہے، جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، یعنی

"شنیده کے باشد مثل دیده"

سنی ہوئی باتوں میں وہ اثر نہیں جو دیکھی ہوئی میں ہے۔

ان آثارنا تدل علينا	فانظروا بعدنا الى الآثار
بیشک ہمارے آثار (نشانات) ہم پر دلالت کر رہے ہیں	ہمارے بعد ہمارے نشانات کو دیکھنا

یعنی شاعر نے بھی حالات، علامات، نشانات کو دیکھنے کا حکم دیا۔ (ماخوذ از کبیر بوضاحت)

اعتراض: رب تعالیٰ نے حکم دیا ہے "فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ" تو رب تعالیٰ کے امر کو ماننا ضروری ہے، یہ کہنا کیسے صحیح ہے کہ مقصود عبرت پکڑنا ہے خواہ دیکھ کر، خواہ سن کر، خواہ کتب میں پڑھ کر عبرت حاصل کر لے۔

جواب: "امر ندب لا على سبيل الوجوب بل المقصود تعرف احوال الماضين" کہ یہ امر استحبابی ہے، وجوبی نہیں۔ مقصد پہلے لوگوں کے حالات کو پہچاننا ہے، خواہ کسی طرح بھی پہچانے۔
(خازن بوضاحت)

فائدہ: وفيه ايضا زجر للكافرين عن كفره لانه اذا تامل احوال الكفار واهلاكهم صار ذلك داعيا له الى الايمان"

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾ سے کافروں کو بھی

زجر (ڈانٹ ڈپٹ) کی گئی کہ تم بھی اپنے سے پہلے کفار کے احوال اور ان کی بربادی کو دیکھو، اس میں غور وفکر کرو، اگر تم نے ضد اور ہٹ دھرمی کو چھوڑ کر، ان کے احوال میں نظر کی تو تمہیں بھی عبرت حاصل ہوگی کہ تمہیں ایمان کی طرف آنے کی یہ دعوت ہوگی۔ (خازن)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ۝ (آیۃ نمبر ۱۳۸)

(۱) یہ لوگوں کو بتانا اور راہ دکھانا اور پرہیزگاروں کو نصیحت ہے۔ (کنزالایمان)

(۲) یہ بیان ہے لوگوں کیلئے۔ اور ہدایت ہے اور نصیحت ہے پرہیزگاروں کیلئے۔ (نجوم الفرقان)

﴿هٰذَا﴾ ای القرآن اوقوله قدخلت اومفهوم قوله فانظروا (بَيَانٌ لِّلنَّاسِ) عامة (هٰذَا) من الضلالة (وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ) خاصة فانهم هم المنتفعون به" (مظہری)

"ھٰذَا" کا ارشاد یا قرآن پاک کی طرف ہے، یا "قَدْ خَلَتْ" کی طرف ہے، یا "فَانْظُرُوْا" کے مفہوم کی طرف ہے یعنی یہ ہے کہ اے لوگو تم پہلے لوگوں کے حالات کو دیکھو گے تو یہ تمہارے لئے بیان ہوگا۔ ﴿بَيَانٌ لِّلنَّاسِ﴾ سے پتہ چلا کہ یہ حکم عام ہے مؤمنوں اور کافروں کو، ﴿هُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ﴾ یہ ہدایت ہے اور نصیحت ہے پرہیزگاروں کیلئے۔ یہ حکم پرہیزگاروں کیلئے خاص کیا گیا، کیونکہ اس سے نفع پرہیزگاروں نے ہی حاصل کیا ہے۔

بیان وہدایت وموعظت میں فرق:

(۱) ایک وجۂ فرق یہ ہے کہ "بَیَانٌ" اس دلالت وراہنمائی کو کہتے ہیں جو شبہات حاصل تھے ان کو زائل اس کے ذریعے زائل کردیا جائے۔

ہدایت: سیدھی راہ کا بیان ہے کہ اس راہ پر چل کر بھٹکنے سے بچ جائے۔

موعظت: اس کلام کو کہا جاتا ہے جس میں دین کے خلاف راہ پر چلنے سے زجر پائی جائے۔ یعنی کلام میں ڈانٹ ڈپٹ ہو، اور زور پایا جائے تاکہ وہ غیر شرعی راہ پر چلنے سے رک جائے۔

"فالحاصل ان البیان جنس جنس تحته نوعان، احدهما الکلام الهادی الی ماینبغی فی الدین وهو الهدی، الثانی الکلام الزاجر عما لاینبغی فی الدین وهو الموعظة"

حاصل یہ ہے کہ بیشک بیان جنس (عام) ہے۔اور اس کے نیچے دونوعیں ہیں۔ایک وہ کلام ہے جو ہدایت ہے دے اس راہ پر چلنے کی جو دین میں پسندیدہ ہے اسے ہدایت کہتے ہیں۔اور دوسری قسم وہ کلام ہے کہ جس سے روکا جائے ایسی راہ سے جو دین میں پسندیدہ نہیں۔اسے موعظت کہا جاتا ہے۔

(۲) دوسری وجہ فرق یہ ہے کہ "ان البیان ھو الدلالة، واما الھدی فھو الدلالة بشرط کونھا مفضیة الی الاھتداء" بیان مطلقا دلالت (راہنمائی) کو کہتے ہیں۔لیکن ہدایت وہ دلالت ہے جو اس ہدایت کو قبول کرنے کی طرف پہنچاتے۔

مقام توجہ: ایک وجہ تو تفسیر مظہری سے بیان کی جا چکی ہے کہ "بیان عام ہے لوگوں کیلئے" اور ہدایت اور موعظت خاص ہیں متقین کیلئے۔کیونکہ ہدایت کا جب مطلب ہی یہ ہے کہ جسے ہدایت دی جائے وہ اسے قبول کرلے، اور موعظت کا جب مطلب ہی یہ ہے کہ جب کسی کو غیر شرعی کاموں سے روکا جائے تو وہ رک جائے یہ حاصل ہی صرف متقین کو ہے۔

"لیکن دوسری وجہ" یہ بیان کی گئی کہ بیان، ہدایت اور موعظت سب کا تعلق متقین سے ہے ﴿لِلنَّاسِ﴾ میں بھی الف لام عہد خارجی ہے، جس سے مراد وہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔یعنی یہ قرآن بیان ہے خاص لوگوں کیلئے یعنی وہی خاص لوگ پرہیزگار ہیں جو قرآن پاک کے بیان سے ہدایت اور موعظت حاصل کرتے ہیں۔یہی مفہوم ﴿اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ﴾ آپ ڈرائیں ان کو جو جو تمہاری نصیحت کو قبول کریں۔

اور آیۃ ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ "بیشک اللہ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں"، بھی اسی مضمون کو واضح کر رہی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ O (آیۃ نمبر ۱۳۹)

(۱) اور نہ سستی کرو اور نہ غم کھاؤ تم غالب آؤ گے اگر ایمان رکھتے ہو۔ (کنز الایمان)

(۲) اور نہ کمزور دل ہو جاؤ، اور نہ غم کرو، حالانکہ تم ہی غالب ہو گے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ (نجوم الفرقان)

مختصر تفسیر لیکن جامع:

(وَلَا تَهِنُوْا) ای ولا تضعفوا فی انفسکم لتنفتقروا الی اتخاذهم بطانة ومنشاهذا الضعف الحزن من اذیاتهم (وَلَا تَحْزَنُوْا) اذلا تصل اذیاتهم الی اتلافکم بل هم التالفون (وانتم الاعلون) ای الاغلبون لکن انما تغلبون (ان کنتم مؤمنین) مخلصین لانه انما وعد النصر للمؤمنین" (تفسیر تبصیر الرحمن)

اور نہ کمزور دل ہو جاؤ کہ تمہیں محتاجی حاصل ہو کافروں کو راز دار بنانے کی، اس کمزور دلی کی وجہ ان کی طرف سے اذیتیں (تکالیف) حاصل ہونا جو غم میں ڈالنے کا سبب بنتی ہیں، اور غم نہ کرو اس لئے کہ ان کی طرف سے کوئی اذیت (تکلیف) تمہیں نہیں پہنچے گی جو تمہیں ہلاکت میں ڈالے، بلکہ وہ ہی مٹ جائیں گے، اور تم ہی غالب رہو گے لیکن تمہیں غلبہ اسی وقت حاصل رہے گا جب تم مخلص مؤمن ہو گے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ مخلص مؤمن کو ہی امداد پہنچانے کا ہے، **راقم** نے "وَلَا تَهِنُوْا" کا ترجمہ (اور نہ کمزور دل ہو جاؤ) یہ تفسیر تبصیر الرحمٰن کے ان تفسیری الفاظ سے لیا ہے "ولا تضعفوا فی انفسکم" اور "وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ" کا ترجمہ **راقم** نے کیا ہے، حالانکہ تم ہی غالب ہو گے، یہ ترجمہ تفسیر ابی السعود کے ان الفاظ سے لیا ہے (وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ) جملة حالية من فاعل الفعلين ای والحال انکم الاعلون الغالبون "یعنی "وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ" جملہ حالیہ ہے، جو دونوں فعلوں یعنی "وَلَا تَهِنُوْا" اور "وَلَا تَحْزَنُوْا" کے فاعل سے، اب معنی یہ ہو گیا "اور نہ کمزور دل ہو جاؤ اور نہ غم کرو حالانکہ تم ہی غالب ہو گے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے ایک آیۃ کریمہ میں ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ﴾ ذکر فرمایا، اور دوسری آیۃ کریمہ میں بیان فرمایا ﴿هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ﴾ تو پچھلی دونوں آیتیں، اس آیۃ کریمہ ﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا﴾ کیلئے مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اب ان تینوں آیتوں کا مفہوم ہو گیا۔

"اذا بحثتم عن احوال القرون الماضية علمتم ان اهل الباطل وان اتفقت لهم الصولة لكن كان مآل الامر الى الضعف والفتور، وصارت دولة اهل الحق عالية وصولة اهل الباطل مندرسة"

جب تم پہلے گذرے ہوئے لوگوں کے حالات کی تفتیش کرلو گے تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ بیشک باطل راہ پر چلنے والوں کو اگرچہ وقتی طور پر دبدبہ بھی حاصل ہو، لیکن انجام ان کا بزدلی اور ان کا نقصان اور تباہی ہے، حق راہ پر چلنے والوں کو بلندی حاصل ہوتی ہے اور باطل راہ پر چلنے والے مٹ کر رہتے ہیں لہذا اے مومنو احد کے مقام پر وقتی طور پر جو دبدبہ حاصل ہوگیا وہ تمہارے دلوں کو کمزور نہ کرے، اور تمہیں بزدل نہ بنادے، اور تمہیں عاجز نہ کردے، بلکہ ضروری ہے کہ جس طرح تمہارے دل پہلے سے مضبوط اور قوی آرہے ہیں، اب بھی اسی طرح تم قوی دل اور مضبوط دل ہوکر رہو "فان الاستعلاء سيحصل لكم والقوة والدولة راجعة اليكم" بیشک غلبہ تمہیں ہی حاصل ہونا ہے، قوت و مضبوطی اور بلند بخت تمہاری طرف ہی لوٹ کر آنے ہیں۔ (کبیر)

شان نزول کے متعلق روایات:

❁ اخرج ابن جرير عن الزهرى قال كثر فى اصحاب محمد ﷺ القتل والجرح حتى خلص الى كل امرئ متهم الباس فانزل الله القرآن فآسى فيه بين المؤمنين باحسن ما آسى به قوما كانوا قبلهم من الامم الماضية فقال ولا تهنوا ولا تحزنوا الى قوله لبرز الذين كتب عليهم القتل الى مضاجعهم"

ابن جریر کی زہری سے روایت ہے کہ احد کے مقام میں کثیر تعداد میں صحابہ کرام شہید ہوگئے اور زخمی ہوگئے، مسلمانوں کے دل پر ایک عجیب پریشانی کی کیفیت طاری ہوگئی تو رب تعالیٰ نے ان کے دلوں کو تسلی دی جو بنسبت پہلی تسلی یعنی گذرے ہوئے لوگوں کے حالات کو دیکھنے کی رغبت دلانے سے بھی زیادہ اچھی تسلی ہے، یعنی تسلی دینے کیلئے ہی اللہ تعالیٰ نے ﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا﴾ سے لے کر ﴿لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ﴾ آیات نازل فرمائیں۔ (منقول از درمنثور)

❁ واخرج ابن جرير من طريق العوفى عن ابن عباس قال اقبل خالد بن الوليد يريد ان يعلو عليهم الجبل فقال النبى ﷺ اللهم لا يعلون علينا فانزل الله وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ"

ابن جریر نے حضرت ابن عباس ؓ کی روایت کو نقل کیا کہ خالد بن ولید (جو احد میں کافر تھا) پہاڑ پر

چڑھ کر مسلمانوں پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعاء کی اے اللہ ان کو ہم پر غلبہ نہ دے، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۂ کریمہ کو نازل فرمایا۔ (منقول از در منثور)

☆ **واخرج ابن جرير وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابن جريج قال انهزم اصحاب رسول الله ﷺ فی الشعب يوم احد فسألوا مافعل النبی ﷺ وما فعل فلان فنعی بعضهم لبعض وتحدثوا ان النبی ﷺ قتل فكانوا فی هم وحزن فبينماهم كذلك علاخالد ابن الوليد بخيل المشركين فوقهم علی الجبل وكان علی احدمجبتی المشركين وهم اسفل من الشعب فلمارأوا النبی ﷺ فرحوافقال النبی ﷺ اللهم لا قوة لنا الابك وليس احد يعبدك بهذا البلد غيرهؤلاء النفر فلاتهلكهم وثاب نفرمن المسلمين رماة فصعدوا فرموا خيل المشركين حتی هزمهم الله وعلا المسلمون الجبل فذلك قوله وانتم الاعلون ان كنتم مؤمنين"**

ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے ابن جریج کی روایت کو نقل کیا کہ صحابہ کرام احد میں وقتی طور پر پسپا ہو گئے، نشیبی وادیوں میں چلے گئے، ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے، نبی کریم ﷺ کا کیا حال ہے، فلاں صحابی کا کیا حال ہے، فلاں کا کیا حال ہے، تو بعض صحابہ نے دوسرے بعض صحابہ کرام کے شہید ہو جانے کی خبر دی اور یہ خبر بھی ملی کہ نبی کریم ﷺ بھی شہید ہو گئے، تو صحابہ کرام بہت زیادہ غم اور حزن میں مبتلاء ہو گئے، صحابہ کرام اسی پر پریشانی کے حال میں تھے، خالد بن ولید مشرکین کے لشکر کے ایک جانب دائیں یا بائیں (یعنی میمنہ یا میسرہ) پر امیر مقرر تھا، اس نے مشرکین کی ایک جماعت کو ساتھ لیا پہاڑ کے اوپر چڑھنے کا ارادہ کیا جبکہ صحابہ کرام وادیوں کے نشیبی علاقہ میں تھے، صحابہ کرام نے جب نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ صحیح سلامت ہیں تو وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے، غم جاتا رہا، ادھر نبی کریم ﷺ دعاء فرمارہے تھے "اے اللہ تیرے بغیر ہمیں کوئی قوت حاصل نہیں، اس شہر میں اے اللہ ان چند لوگوں کے بغیر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں، اس لئے اے اللہ تو ان کو ہلاکت میں نہ ڈال (صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کو صحیح سلامت دیکھ کر خوش ہوئے تو ان کے جنگی جذبات ابھر گئے، ادھر مصطفیٰ ﷺ کی دعاء کو شرف قبولیت حاصل ہو گیا) تو صحابہ کرام کے تیر اندازوں کی ایک جماعت واپس لوٹ آئی، انہوں نے ایک بلند مقام سے مشرکوں پر تیر اندازی شروع کر دی، اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کو شکست دے دی، مشرک بھاگ پڑے، اور مسلمانوں نے پہاڑ پر قبضہ کر لیا، رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ﴾ (اور تم ہی غالب ہو گے اگر تم ایمان رکھتے ہو) آب و تاب سے جگمگانے لگا۔ (منقول از در منثور)

کچھ ذکر احد کا تیسرے پارہ میں گذر گیا اور کچھ آنے والی آیات میں (انشاء اللہ) آجائے گا۔

تنبیہ: روایات میں تطبیق دینے کیلئے راقم نے "علا خالد ابن الولید" کا ترجمہ کیا ہے خالد بن ولید نے پہاڑ پر چڑھنے کا ارادہ کیا، اور اگر ظاہری الفاظ کو دیکھ کر یوں معنی کیا جائے کہ "خالد بن ولید اپنے ساتھ مشرکوں کی ایک جماعت کو لے کر پہاڑ کے اوپر چڑھ گیا" اب مطلب یہ ہوگیا کہ مسلمانوں نے مشرکین کو بلند مقام سے تیر اندازی کر کے پہاڑ سے نیچے دھکیل دیا، اور خود پہاڑ پر قابض ہو گئے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

"اعلون" اصل میں "اعلوون" ہے واؤ تیسری جگہ سے چوتھی جگہ آ گئی، ماقبل کی حرکت مخالف ہے، واؤ کو یاء سے تبدیل کیا، یاء متحرک ماقبل مفتوح یاء کو الف سے تبدیل کیا، الف اور واؤ کے درمیان التقاء ساکنین ہو گیا، الف کو حذف کر دیا "اعلون" ہو گیا۔

﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ﴾ میں چند وجوہ:

(۱) ان میں سے پہلی وجہ یہ ہے بیشک تمہارا حال اعلیٰ ہے ان کے حال سے قتل میں، یعنی احد میں بظاہر جو تمہیں تکلیف پہنچی (حقیقت میں کوئی تکلیف نہ تھی کیونکہ شہادت سے حیات جاودانی حاصل ہوگئی) کافروں کو بدر میں اس کی بنسبت دوگنی تکلیف پہنچی، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا﴾ کیا جب پہنچی تمہیں کچھ مصیبت حالانکہ تم پہنچا چکے ہو (دشمن کو اس سے دوگنی) (اس آیۃ کی تفصیل اسی کی وضاحت میں ان شاء اللہ آجائے گی)

(۲) اولان قتالکم اللہ وقتالھم للشیطان" مؤمنوں کے غلبہ کی اور وجہ یہ ہے کہ ان کا قتال یعنی جہاد اللہ تعالیٰ کیلئے ہے اور کافروں کی جنگ شیطان کیلئے ہے، یہی وجہ ہے کہ مؤمن جنگ میں قتل کر دیا جائے تو وہ شہید ہے اسے جاودانی زندگی حاصل ہوگئی، اسے مردہ کہنا بلکہ اسے مردہ گمان کرنا بھی ناجائز ہے، اور کافر جنگ میں قتل کر دیا جائے تو مردود مر گیا، نیست و نابود ہو گیا، اسے کچھ منصب حاصل نہ ہوا۔

(۳) اولان قتالھم للدین الباطل وقتالکم الدین الحق" اور وجہ تمہارے بلند ہونے کی یہ ہے کہ کافروں کا دین باطل ہے وہ اسی کیلئے لڑائی کرتے ہیں، اور تمہارا دین حق ہے، تمہاری لڑائی دین حق کیلئے ہے، دین حق کیلئے

لڑائی حقیقت میں بلندی ہی ہے۔

(۴) "والمراد وانتم الاعلون بالحجة والتمسک بالدین والعاقبة الحمیدة"

اور مراد یہ ہے کہ تمہیں دلائل اور دین کے ساتھ تمسک (یعنی دین حق پر قائم رہنے) اور اچھا انجام حاصل ہونے کی وجہ سے بلندی حاصل ہے۔

(۵) یعنی ان یکون المعنی وانتم الاعلون من حیث انکم فی العاقبة تظفرون بهم وتستولون علیهم"

اور مطلب یہ ہے کہ تمہیں آخرت میں کافروں پر بلندی حاصل ہوگی، اس لئے کہ تمہیں ان پر غلبہ حاصل ہوگا، اور تمہیں کامیابی حاصل ہوگی، وہ خسارے میں ہوں گے۔

﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾ ''اگر تم ایمان رکھتے ہو''

اس میں بھی چند وجوہ ہیں۔

(۱) الاول وانتم الاعلون ان بقیتم علی ایمانکم، والمقصود بیان ان الله تعالی انما تکفل باعلاء درجتهم لأجل تمسکهم بدین الاسلام"

ایک وجہ ان میں سے یہ ہے کہ تم ہی بلند رہو گے اگر تم اپنے ایمان پر قائم رہے، سب سے مقصود وجہ ہی یہ ہے باقی وجوہ ضمنی ہیں، یعنی اللہ تعالی تمہیں بلند درجات اسی لئے عطاء فرمائے گا کہ تم دین اسلام پر قائم رہو، یعنی دین اسلام پر قائم رہنا تمہاری بلندی کا سبب ہے۔

(۲) والثانی وانتم الاعلون فکونوا مصدقین لهذه البشارة ان کنتم مصدقین بما یعدکم الله ویبشرکم به من الغلبة"

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ تم ہی بلند ہو گے تم اس بشارت کی تصدیق کرنے والے رہو، یعنی اگر تمہیں اللہ تعالی کے وعدہ اور اس کی بشارت پر یقین رہا اور اس کی تمہیں تصدیق رہی تو تمہیں غلبہ بھی حاصل رہے گا، اصل اس وجہ کی دارومدار بھی تصدیق پر ہے، اور تصدیق ہی ایمان ہے۔

(۳) والثالث التقدیر "وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ" فان الله تعالی وعد بنصرة هذا الدین فان کنتم من المؤمنین علمتم ان هذه الواقعة لاتبقی بحالها، وان الدولة تصیر للمسلمین والاستیلاء علی العدو یحصل لهم"

اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ (تم کمزور دل نہ ہو جاؤ، اور نہ ہی غم کرو، اور بلند تم ہی ہو اگر تم ایمان رکھتے ہو) یعنی اللہ تعالی نے اس دین کی امداد کرنے کا وعدہ فرمایا کہ اگر تم ایمان پر قائم

رہے تو اللہ تعالی کی امداد تمہیں حاصل رہے گی، لہذا تم اس پر بھی یقین کرلو کہ احد میں جو وقتی طور پر کفار کو غلبہ حاصل ہوا، اس نے ہمیشہ قائم تو نہیں رہنا، کامیابی اور دشمن پر غلبہ تو مسلمانوں کو ہی حاصل رہنا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

اس آخری وجہ کو نظر میں رکھتے ہوئے احد کا نقشہ پھر سے ذہن میں لائیے تو مسئلہ نکھر کو سامنے آجائے گا، کہ احد میں ابتدائی طور پر مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا، یہاں تک کہ مال غنیمت جمع کرنا صحابہ کرام نے شروع کردیا، پہاڑ کے درہ پر پچاس صحابہ کرام کو کھڑا کیا گیا تھا، ان کے اجتہاد میں خطاء ہوگئی کہ وہ مسلمانوں کی کامیابی کو دیکھ کر درہ کو چھوڑ کر مال غنیمت کو جمع کرنے میں شریک ہوگئے، نبی کریم ﷺ نے تو انہیں کھڑا ہونے کا حکم دیا تھا، آپ کے حکم کی انتظار کئے بغیر آپ یہاں سے ہٹ جانے کا حکم کب فرماتے ہیں، ان کا درہ کو چھوڑنا ان کے اجتہاد میں خطاء ہوئی۔

رب تعالی نے ان کو تھوڑی دیر کیلئے آزمائش میں ڈال دیا، کفار اس درہ سے پہاڑ کی پچھلی جانب سے آکر مسلمانوں پر یکبارگی حملہ آور ہوگئے تو مسلمان ستر کی تعداد میں شہید ہوگئے، اور کچھ زخمی ہوگئے، لیکن جب مسلمانوں نے پہاڑ سے تیراندازی کی تو کفار احد کے مقام کو چھوڑ کر بھاگ گئے، کفار کو شکست ہوئی، مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا، اور اللہ تعالی کے ارشاد گرامی ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ کی جلوہ گری واضح ہوگئی۔ (راقم)

فائدہ جلیلہ:

حضور ﷺ کے عہد مبارک میں اور اس کے بعد جب بھی باطل سے صحابہ کرام کی جنگ ہوئی صحابہ ہی فتح یاب ہوئے، حتی کہ ہر وہ لشکر جس میں ایک صحابی بھی شامل ہوا اس نے کبھی شکست نہیں کھائی، اور یہ صحابہ کرام کے مؤمن کامل ہونے کی دلیل ہے۔ (ضیاء القرآن)

ایمان کے بغیر مادی وسائل بے کار ہیں:

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ایمان کو قوت دنیا کی ساری مادی قوتوں سے زیادہ توانا ہے، جس قوم کے افراد کے دلوں میں ایمان اور یقین کی شمع روشن ہوتی ہے دنیا کی کوئی طاقت ان کو شکست نہیں دے سکتی، مادی وسائل بھی اسی وقت کارگر ثابت ہوتے ہیں جب ان کو استعمال کرنے والا اپنے مقصد حیات پر محکم یقین رکھتا ہو۔ (ضیاء القرآن)

حالیہ دور میں افغانستان اور عراق میں مسلمان جانوں کے نذرانے پیش کر رہے ہیں، امریکہ جیسے سرمست ہاتھی سے ٹکر لگائے ہوئے ہیں، (ان شاء اللہ) عیسائی بھاگنے پر مجبور ہوجائیں گے۔

شہید ہونے والے مہاجرین صحابہ کرام کے اسماء گرامی:

احد میں جو صحابہ کرام شہید ہوئے ستر کی تعداد میں ان میں اکثریت انصار کی تھی مہاجرین پانچ تھے، حمزہ بن عبدالمطلب، مصعب بن عمیر نبی کریم ﷺ کے علمبردار، عبداللہ بن جحش نبی کریم ﷺ کے پھوپھی کے بیٹے، عثمان بن شماس اور سعد جو کہ عتبہ کے غلام تھے۔ (تفسیر ابی السعود ؒ)

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

اِنۡ یَّمۡسَسۡکُمۡ قَرۡحٌ فَقَدۡ مَسَّ الۡقَوۡمَ قَرۡحٌ مِّثۡلُهٗ وَتِلۡکَ الۡاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیۡنَ النَّاسِ وَلِیَعۡلَمَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَیَتَّخِذَ مِنۡکُمۡ شُهَدَآءَ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیۡنَ ۝ (آیۃ نمبر ۱۴۰)

(1) اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچی تو وہ لوگ بھی ویسی ہی تکلیف پا چکے ہیں، اور یہ دن ہیں جن میں ہم نے لوگوں کیلئے باریاں رکھی ہیں، اور اس لئے کہ اللہ پہچان کرادے ایمان والوں کی اور تم میں سے کچھ لوگوں کو شہادت کا مرتبہ دے اور اللہ دوست نہیں رکھتا ظالموں کو۔ (کنزالایمان)

(2) اگر پہنچی تمہیں کوئی تکلیف تو تحقیق پہنچ چکی ہے قوم کو تکلیف اسی کی مثل، اور یہ دن ہیں پھیرتے ہیں ہم ان کو لوگوں کے درمیان، اور (اس لئے) تاکہ پہچان کرادے اللہ ایمان والوں کی، اور بنائے تم میں سے بعض کو شہید اور اللہ نہیں محبت رکھتا ظالموں سے۔ (نجوم الفرقان)

﴿اِنۡ یَّمۡسَسۡکُمۡ قَرۡحٌ﴾

القرح (بفتح القاف) زخم، پھوڑا، شدید خارش جو اونٹ کے بچوں کیلئے مہلک ہو، جمع قروح، القوح (بضم القاف) ہر چیز کا اول حصہ، کنواں کھودتے وقت پہلی مرتبہ جو پانی نکالا جائے، ہر مہینہ کے ابتداء کی تین راتیں، القرح بفتح القاف والراء اونٹ کو خارش ہونے کی حالت، قرحه قرحا (ف) زخمی کرنا، قرح البئر، اسی جگہ کنواں کھودنا جہاں پہلے نہ کھودا گیا ہو قرحه بالحق، حق کے ساتھ استقبال کرنا، قرح قروحا (ف) قرح قرحا (س) الفرس، گھوڑے کے چاروں دانت نکلنا، اقترح الخطبة "فی البدیہ" خطبہ دینا۔ (المنجد)

آیۃ کریمہ میں دونوں قراءتیں ہیں، القرح بالفتح والضم لغتان کالضعف وقد قرئ بھما" "القرح" میں قاف کی زبر اور پیش دونوں لغتیں استعمال ہیں، جیسے ضعف میں ضاد پر زبر اور پیش دونوں طرح استعمال ہے، اسی طرح "قــرح" میں قاف پر زبر اور پیش دونوں جائز ہیں، معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے "وقیل ھو بالفتح الجراح وبالضم المھا" اور فرق بھی بیان کیا گیا ہے، کہ جب زبر کے ساتھ استعمال ہو تو معنی ہوگا "زخمی کرنا" اور جب پیش سے استعمال ہوگا تو معنی ہوگا زخم کا درد اسی طرح تیسری قراءت قاف اور راء دونوں کی زبر سے بھی پڑھا گیا ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

قرح، نکرہ ہے، اسی لئے اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے "کوئی تکلیف" **راقم** نے بھی وہی نقل کیا ہے۔

﴿اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ﴾

"اگر پہنچی تمہیں کوئی تکلیف تو تحقیق پہنچ چکی ہے قوم کو تکلیف اسی کی مثل۔"

"القوم" معرفہ ہے، الف لام عہد خارجی ہے، قوم سے مراد کفار مکہ ہیں، یعنی اے مسلمانو اگر تمہیں احد میں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو قریش کی قوم کفار کو بھی اس سے پہلے اسی طرح تکلیف پہنچ چکی، اس میں مسلمانوں کو تسلی بھی دی گئی اور جہاد پر قائم رہنے کا بھی گویا کہ حکم دیا گیا ہے، اور مومنو کو جہاد پر برانگیختہ بھی کیا گیا ہے، اس لئے کہ اگر قوم کی تکلیف سے مراد بدر کی تکلیف ہو تو مطلب یوں ہوگا۔

"والمعنی ان نالوا منکم یوم احد فقد نلتھم منھم قبلہ یوم بدر ثم لم یضعف ذلک قلوبھم ولم یثبطھم عن معاودتکم بالقتال فانتم احق بان لاتضعفوا فانکم ترجون من اللہ مالا یرجون"

اگر احد کے دن کفار کو تم پر کچھ دیر کیلئے برتری حاصل ہوئی تو تحقیق تم بدر کے دن ان پر مکمل طور پر برتری حاصل کر چکے ہو، وہ کافر نہ کمزور دل ہوئے اور نہ ہی تمہارے ساتھ دشمنی کی وجہ سے جنگ سے رکے ہیں لہٰذا تم زیادہ حق رکھتے ہو کہ نہ ہی تم کمزور دل ہو جاؤ (اور نہ ہی جہاد سے دور ہونا) کیونکہ تم اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمت کی امید رکھتے ہو، وہ کافر اس کی کوئی امید نہیں رکھتے۔ (تفسیر ابی السعود)

اور دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو خطاب کیا گیا کہ اگر تمہیں احد میں تکلیف پہنچی ہے تو کافروں کو

اس سے پہلے احد میں تکلیف پہنچ چکی ہے، کیونکہ بیس سے زائد کفار احد میں قتل ہو چکے تھے، ان کے علمبردار طلحہ بن ابی طلحہ کو بھی حضرت علی المرتضی ﷺ نے قتل کر دیا تھا۔ (ماخوذ از تفسیر ابی السعود)

اعتراض: کفار تو بیس پچیس کی تعداد میں مرے تھے، لیکن صحابہ کرام تو ستر کی تعداد میں شہید ہوئے تو "قَرْحٌ مِّثْلُهٗ" (کفار کو اسی کی مثل تکلیف پہنچی) کہنا کس طرح صحیح ہے۔

جواب: یجب ان یفسر القرح فی ھذا التاویل بمجرد الانھزام لا بکثرة القتلیٰ"

اس صورت میں "قَرْحٌ مِّثْلُهٗ" کا مطلب یہ ہوگا کہ تمہیں تکلیف پہنچی تو تم وقتی طور پر پسپا ہو گئے، ان کو تو پہلے بھی شکست ہوئی اور بعد میں بھی مکمل شکست ان کو ہی ہوئی کہ وہی میدان کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔

(ماخوذ از کبیر)

﴿وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ "اور یہ دن ہیں پھیرتے ہیں ہم ان کو لوگوں کیلئے۔"

المداولة: نقل الشی من واحد الی آخر" ایک چیز کو ایک سے دوسرے کی طرف منتقل کر دینے کو مداولۃ کہا جاتا ہے، رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿لِكَيْلَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ﴾ (سورۃ الحشر، آیہ نمبر ۸)

(تاکہ (مال) نہ پھیرتا رہے تمہارے غنیوں کے درمیان) ای تتداولونھا ولاتجعلون للفقراء منھا نصیبا" ایسا نہ ہوا اغنیاء کہ تم آپس میں ہی ایک دوسرے کی طرف مال منتقل کرتے رہو کہ فقراء کا حصہ ہی اس میں مقرر نہ کرو، اسی طرح کہا جاتا ہے "الدنیا دول" دنیا ایک قوم سے دوسری کی طرف پھرتی رہتی ہے اب اس لغوی معنی کو سمجھنے کے بعد آیہ کریمہ کا معنی واضح ہو گیا۔

"والمعنی ان ایام الدنیا ھی دول بین الناس لا یدوم مسارھا ولا مضارھا فیوم یحصل فیہ السرور لہ والغم لعدوہ ویوم آخر بالعکس من ذلک ولا یبقی شئی من احوالھا ولا یستقر اثر من آثارھا"

کہ دنیا کے دن لوگوں میں پھرتے رہتے ہیں، نہ ہی ہمیشہ خوشی کے دن ہوتے ہیں، اور نہ ہی ہمیشہ غم کے کبھی ایک شخص کو خوشی حاصل ہوتی ہے اور اس کے دشمن کو غم لاحق ہوتا ہے، کبھی معاملہ اس کے الٹ ہوتا ہے کہ اسے غم لاحق ہوتا ہے اور اس کے دشمن کو خوشی حاصل ہوتی ہے، یعنی دنیا کے دنوں کے حالات میں بقاء نہیں اور نہ ہی ان کے اثرات میں قرار ہے۔ (کبیر)

انتباہ شدید: واعلم انہ لیس المراد من ھذہ المداولة ان اللہ تعالیٰ تارة ینصر المؤمنین واخری ینصر الکافرین وذلک لان نصرة اللہ منصب شریف واعزاز عظیم فلایلیق بالکافر بل المراد

من ھذہ المداولة انه تارة يشدد المحنة على الكفار واخرى على المؤمنين"
آیۂ کریمہ کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کبھی مؤمنوں کی امداد کرتا ہے اور کبھی کافروں کی امداد کرتا ہے، اس لئے کہ رب تعالیٰ کا امداد کرنا منصب شریف اور بہت بڑا اعزاز ہے، رب تعالیٰ اعلیٰ منصب اور بڑا اعزاز کافروں کو نہیں عطاء کرتا، ہاں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان دن پھیرتا رہتا ہے کہ کبھی کفار کو مشقت میں ڈال دیا جاتا ہے اور ان کو تکلیف دی جاتی ہے، اور کبھی مؤمنوں کو تکلیف دی جاتی ہے۔ (کبیر)

لوگوں میں دنوں کے پھیرنے کا فائدہ کیا ہے؟

اس میں چند وجوہ ہیں فائدہ کی۔

(۱) اگر ہمیشہ کافروں کو مشقت اور تکلیف میں ڈالا جاتا، اور مؤمنوں پر کوئی شدت نہ آتی، اور نہ ہی انہیں کوئی تکلیف دی جاتی۔

"لحصل العلم الاضطراری بان الایمان حق وما سواہ باطل ولو کان کذلک لیبطل التکلیف والثواب والعقاب"

تو اس صورت میں اضطراری طور پر (بغیر سوچنے اور فکر کرنے کے) ایمان حاصل ہوتا کہ ایمان حق ہے، اور اس کے علاوہ سب کچھ باطل ہے، اضطراری ایمان کا نہ انسان کو مکلف بنایا جاتا ہے، اور نہ ہی اسے ثواب اور عذاب دیا جاتا ہے، اسی وجہ سے کبھی محنت ومشقت مؤمنوں پر مسلط کی جاتی ہے اور کبھی کافروں پر

"لتکون الشبھات باقیة والمکلف یدفعھا بواسطة النظر فی الدلائل الدالة علی صحة الاسلام فیعظم ثوابه عند الله"

تاکہ شبہات باقی رہیں، اور عاقل بالغ انسان اسلام کے حق ہونے کے دلائل میں غور وفکر کرلے اور مشکوک وشبہات کو زائل کرلے تاکہ اسے اللہ تعالیٰ کے ہاں ثواب دیا جائے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ مؤمن کی کبھی لغزشیں اور گناہ بھی ہوتے ہیں، اسلئے اسے مشقت وتکالیف میں مبتلاء کیا جاتا "فیکون عندالله تشدید المحنة علیه فی الدنیا ادباله" تاکہ دنیا میں ہی اس کے بعض گناہوں کا کفارہ بن جائے اور اسے آخرت میں عذاب سے بچالیا جائے، مؤمن کا یہ اعزاز ہے اور اس کے ادب کا لحاظ کیا گیا ہے۔

سبحان الله! اے مؤمن ذرا تو اپنا مقام دیکھ کہ اللہ تعالیٰ بھی تیرے ادب کا لحاظ کرتا ہے۔ "واما

تشدید المحنة علی الکافر فانه یکون غضبا من الله علیه" لیکن کافروں کو محنت ومشقت میں ڈالنا ان کو ذلت میں ڈالنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ان پر غضب مسلط ہے۔

(۳) دنیا کی لذتیں اور دنیا کی تکالیف اور درد ہمیشہ قائم نہیں رہتے بلکہ بدلتے رہتے ہیں اور اخروی نعمتیں اور سعادت (اجر وثواب) ہمیشہ کیلئے قائم رہنے والے ہیں، انسان کو اس پر سوچنے اور فکر کرنے کی گویا کہ دعوت دی گئی کہ تو ذرا غور تو کر "فان الله یمیت بعد الاحیاء ویسقم بعد الصحة فاذا حسن ذلک فلم لایحسن ان یبدل السراء بالضراء" کہ اللہ تعالیٰ زندگی کے بعد موت عطاء کرتا ہے اور صحت کے بعد بیماری عطاء کرتا ہے جب یہ سب کچھ اچھا ہے تو یہ کیوں نہیں اچھا کہ وہ خوشی کو پریشانی سے بدل دے۔ (ماخوذ از کبیر)

دنوں کے پھیرنے اور کافروں کی ابتدائی شکست پر حدیث پاک:

اسی آیۃ کریمہ کی تفسیر میں علامہ بغوی رحمہ اللہ نے معالم التنزیل میں اور علامہ علاؤ الدین علی بن محمد المعروف بالخازن نے تفسیر خازن میں بخاری کی یہ حدیث نقل فرمائی۔

❁ حدثنا عبید الله بن موسی عن اسرائیل عن ابی اسحاق عن البراء ﷺقال لقینا المشرکین یومئذ واجلس النبی ﷺجیشا من الرماة وامر علیهم عبد الله وقال لاتبرحوا ان رأیتمونا ظهرنا علیهم فلا تبرحوا وان رأیتموهم ظهروا علینا فلاتعینونا فلما لقینا هربوا حتی رأیت النساء یشتددن فی الجبل رفعن عن سوقهن قدبدت خلاخلهن فاخذوا یقولون الغنیمة الغنیمة فقال عبدالله بن جبیر عهد الی النبی ﷺان لاتبرحوا فابوا فلما ابوا صرف وجوههم فاصیب سبعون قتیلا واشرف ابو سفیان فقال افی القوم محمد فقال لاتجیبوه فقال افی القوم ابن ابی قحافة قال لا تجیبوه فقال افی القوم ابن الخطاب فقال ان هؤلاء قتلوا فلو کانوا احیاء لأجابوا فلم یملک عمر نفسه فقال کذبت یا عدوالله ابقی الله علیک ما یحزنک قال ابو سفیان اعل هبل،فقال النبی ﷺاجیبوه قالوا مانقول؟قال قولوا"الله اعلی واجل"قال ابو سفیان لناالعزی ولاعزی لکم فقال النبی ﷺاجیبوه قالوا ما نقول؟قال قولوا"الله مولنا ولا مولی لکم"قال ابو سفیان یوم بیوم بدر والحرب سجال وتجدون مثلة لم آمربها ولم تسؤنی" (بخاری جلد کتاب المغازی،باب غزوه احد)

ترجمہ مع تشریح:

براء بن عازب ﷺ فرماتے ہیں ہم اس دن (احد کے دن) مشرکوں سے ملے یعنی ان سے ہمارا مقابلہ کیلئے آمنا سامنا ہوا، نبی کریم ﷺ نے (پہاڑ کے درہ میں) تیر اندازوں کا ایک لشکر بٹھایا، اور ان پر حضرت عبداللہ بن جبیر ﷺ کو امیر مقرر فرمایا یہ خوات بن جبیر بن نعمان کے بھائی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم نے یہاں سے ہٹنا نہیں، اگر تم ہمیں دیکھو کہ ہم ان پر غالب ہو گئے تو پھر بھی تم نے ہٹنا نہیں، اور اگر تم ان (کافروں) کو دیکھو کہ وہ ہم پر غالب آ گئے ہیں تو تم نے ہماری امداد نہیں کرنی، زہیر کی ایک روایت میں یوں مذکور ہے "وان رأیتمونا تخطفنا الطیر" اگر تم ہمیں اس حال میں دیکھو کہ ہمیں پرندے نوچ رہے ہیں تو پھر بھی تم نے اپنی جگہ سے ہٹنا نہیں، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت جو مسند احمد اور طبرانی اور مستدرک حاکم میں ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں۔

"ان النبی ﷺ اقامهم فی موضع ثم قال لهم احموا ظهورنا فان رأیتمونا نقتل فلاتنصرونا فان رأیتمونا قد غنمنا فلا تشرکونا"

بیشک نبی کریم ﷺ نے ان کو ایک جگہ پر کھڑا کیا، پھر ان کو فرمایا کہ تم ہماری پیٹھوں کی امداد کرنا یعنی ہم میدان جنگ میں کافروں کے مقابل ہوں گے اور تم یہاں ہی ہمارے پیچھے کھڑے رہنا، حضرت براء کہتے ہیں کہ جب ہمارا مقابلہ کافروں سے ہوا تو وہ شکست کھا کر بھاگ گئے، یہاں تک کہ میں نے ان کی عورتوں کو شدید بھاگتے ہوئے دیکھا جو پہاڑوں کی وادیوں کی طرف جا رہی ہیں، دوڑتے ہوئے ان کی پازیبیں اور پنڈلیاں نظر آ رہی تھیں، ایک روایت میں ہے

"یسندن" بضم اوله وسکون السین المهملة بعدها نون مکسورة ودال مهملة ای یصعدن یقال اسند فی الجبل یسند اذا صعد"

"یسندن" جس کا معنی ہے کہ وہ عورتیں بھاگ بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ رہی تھیں ادھر پہاڑ کے درے میں کھڑے صحابہ کرام مسلمانوں کی فتح کو دیکھ کر "الغنیمة الغنیمة" (اس پر زبر ہے) یعنی غنیمت کو حاصل کرو، جب تمہارے اصحاب غالب آ چکے ہیں تو تم کس چیز کی انتظار کر رہے ہو، زہیر کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں

"فقال عبداللہ انسیتم ما قال لکم رسول اللہ؟ قالوا واللہ لنأتین الناس فلنصیبن من الغنیمة"

حضرت عبداللہ بن جبیر نے ان لوگوں کو کہا "کیا تم رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کو بھول گئے ہو، جو آپ نے تمہیں

فرمایا تھا، لیکن وہ کہنے لگے قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہم ضرور برضرور لوگوں کو ملیں گے اور مال غنیمت ضرور ہی حاصل کریں گے، حضرت عبداللہ بن جبیر نے کہا نبی کریم ﷺ نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ تم نے یہاں سے ہٹنا نہیں، لیکن لوگوں نے انکار کیا "فلما ابوا صرف وجوھھم" جب انہوں نے انکار کیا تو ان کے چہرے پھر گئے، یعنی "تحیروا فلم یدروا این یذھبون واین یتوجھون" وہ حیران ہو گئے ان کو پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور کس طرف متوجہ ہو رہے ہیں، تو اس حال میں ستر صحابہ کرام کو شہید کر دیا گیا۔

ابو سفیان بن حرب جو اس وقت رئیس المشرکین تھا، ایک بلندی پر چڑھ کر کہنے لگا کیا اس قوم میں محمد ہیں؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسے کوئی جواب نہ دو، پھر وہ کہنے لگا کیا اس قوم میں ابن ابی قحافہ (یعنی ابو بکر) ہیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے کوئی جواب نہ دو، پھر وہ کہنے لگا کیا اس قوم میں ابن خطاب (یعنی عمر) ہیں، پھر وہ خود ہی کہنے لگا یہ سب قتل کر دیئے گئے اگر زندہ ہوتے تو جواب دیتے، ابھی رسول اللہ ﷺ نے کوئی ارشاد نہیں فرمایا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کی بات کو سن کو صبر نہ کر سکے، آپ نے فرمایا اے اللہ کے دشمن تو نے جھوٹ کہا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان تمام کو تجھ پر زندہ رکھا ہوا ہے جو تجھے پریشان کرتے رہیں گے۔

ابو سفیان نے کہا "اعل ھبل" "اعل" علا یعلو سے امر کا صیغہ ہے "ھبل" (بضم الھاء وتخفیف الباء الموحدۃ) ان کے بت کا نام ہے، جو انہوں نے کعبہ میں رکھا ہوا تھا، حرف نداء اس میں محذوف ہے یعنی "یاھبل" ہے اصل معنی اس کا یہ ہے "اے ہبل بلند رہ" مرادی معانی مختلف بیان کئے گئے ہیں، اے ہبل تیرا دین غالب رہے، اے ہبل تیرا امر بلند رہے اور تیرا دین غالب رہے، اس کے اس قول پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اس کو جواب دو" صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ ہم اسے کیا جواب دیں؟ آپ نے فرمایا تم اسے کہو "اللہ اعلی واجل" اللہ سب سے بلند اور سب سے بزرگ ہے۔

ابو سفیان نے کہا ہمارا عزی ہے، تمہارا کوئی عزی نہیں (عزی بھی ان کے بت کا نام تھا کہ یہ ہمیں نفع پہنچاتا ہے) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسے جواب دو، صحابہ کرام نے عرض کیا "ہم کیا کہیں؟ آپ نے فرمایا تم کہو "اللہ مولنا ولا مولی لکم" اللہ ہمارا مولی ہے اور تمہارا کوئی مولی نہیں پھر ابو سفیان نے کہا "آج کا دن بدر کے دن کا بدل ہے" اور لڑائی اس طرح ہے جس طرح ڈول کے مقابل ڈول نکالا جائے، یعنی لڑائی میں دن پھرتے رہتے ہیں، بدر میں ہمارے ستر آدمی قتل ہو گئے تھے، اور آج احد میں تمہارے ستر آدمی قتل (شہید) ہو گئے، اور ابو سفیان کہنے لگا، اگر تم اپنے کسی شخص کو مثلہ پاؤ تو میں نے اسے حکم نہیں دیا، اس نے مجھے غم میں نہیں ڈالا۔ **مثلہ** اسے کہا جاتا ہے جس کے

اعضاء کاٹ دیئے جائیں، جیسا کہ حضرت حمزہ ﷺ کی شہادت کی بعد جگر کو کاٹ کر دیا چبایا"فلم تستطع ان تسیفھافلفظتھا"، لیکن وہ اسے نگل نہ سکی بلکہ اس نے آپ کے جگر کو پھینک دیا، ابن اسحاق کی ایک روایت میں ہے کہ ابوسفیان نے کہا"واللہ ما رضیت وما سخطت وما نھیت وما امرت"، قسم اللہ کی میں مثلہ بنانے پر نہ راضی ہوا اور نہ ہی ناراض ہوا، اور نہ ہی میں نے حکم دیا اور نہ ہی میں منع کیا اور حضرت ابن عباس ﷺ کی روایت میں ہے۔

"ولم یکن ذلک عن رأی سراتنا،ثم ادرکتہ حمیة الجاھلیة اماانہ اذاکان لم یکرھہ"

کہ ابوسفیان نے کہا مثلہ بنانے میں ہمارے کسی بڑے آدمی (کسی سردار) کی رائے شامل نہیں، حضرت ابن عباس ﷺ فرماتے ہیں کہ پھر اسے جاہلیت کی حمیت لاحق ہوگئی، جاہلیت کی حمیت یہ تھی کہ اپنے خاندان کی ہی حمایت کرنی ہے، خواہ وہ باطل راہ پر ہی کیوں نہ ہوں، حضرت حمزہ ﷺ کو مثلہ بنانے والی ابوسفیان کی زوجہ ھندہ تھی، یہی وجہ ہے کہ اس نے کہا

"ولم تسؤنی "ای والحال ان المثلة التی فعلوھا لم تسؤنی وان کنت ماامرت"

مجھے اس سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی، یعنی مثلہ بنانے کا اگرچہ میں نے کوئی حکم نہیں دیا، لیکن جو مثلہ بنایا گیا ہے اس نے مجھے کوئی غمزدہ نہیں کیا، اور نہ ہی مجھے کوئی برا لگا۔

(تشریح ماخوذ از عمدۃ القاری المعروف بالعینی ج۱۷ صفحہ نمبر۱۴۲)

صحابہ کرام کے پسپا ہونے اور ستر کی تعداد میں شہید ہونے کی وجہ:

اس کی ایک وجہ تو یہی ہے جو اس حدیث پاک سے واضح ہو رہی ہے کہ جب وہ درہ کو چھوڑ کر مال غنیمت جمع کرنے کیلئے وہاں سے ہٹے ہی تھے تو رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کی بظاہر مخالفت ہوگئی جس کی وجہ سے وہ متحیر ہو کر پھرنے لگے، انہیں معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں اور کدھر متوجہ ہیں، صحابہ کرام کی اس لغزش کی وجہ ان کی بے اختیار غلطی (جسے خطاء کہا جاتا ہے) بھی ہوسکتی ہے، اور ان کی اجتہادی خطاء بھی ہوسکتی ہے، اور شیطان کا وسوسہ بھی ہوسکتا ہے، اور سب سے بڑی وجہ رب تعالیٰ کی طرف سے آزمائش تھی جس کے اسباب بے اختیار غلطی اور اجتہادی خطاء اور شیطانی وسوسہ وغیرہ تھے۔ لیکن دوسری وجہ بھی حدیث پاک سے دیکھئے۔

❁ روی عن ابن ابی طالب علی ﷺ،قال جاء جبریل الی النبی ﷺ یوم بدر فقال لہ خیر اصحابک فی الاساری ان شاء والقتل،وان شاء واالفداء علی ان یقتل منھم عام المقبل مثلھم فقالو االفداء ویقتل منا" (اخرجہ الترمذی وقال حدیث حسن)

حضرت علی المرتضی ﷺ سے مروی ہے کہ جبریل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ اپنے صحابہ کو بدر میں قید ہونے والے کفار کے بارے میں اختیار دے دیں، اگر وہ قتل کرنا چاہیں تو قتل کر دیں، اور اگر فدیہ لینا چاہیں تو فدیہ لے کر چھوڑ دیں، لیکن اگر انہوں نے فدیہ لیا تو آنے والے سال میں ان کے اتنے آدمی ہی شہید کردئے جائیں گے (چونکہ قیدی کفار بھی ستر تھے تو ستر صحابہ کرام ہی شہید کردئے گئے) تو صحابہ کرام نے (جبریل کے اس پیغام کو سن کر) کہا کہ ہم ان کا فدیہ لیتے ہیں تا کہ آنے والے سال ہمارے اتنے آدمی ہی شہید ہو جائیں (ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے) سبحان اللہ صحابہ کرام کے دل میں شہادت کی کتنی ہی زیادہ تمنا تھی، رب تعالیٰ نے ان کی اس تمنا کو پورا کرتے ہوئے "فانجز اللہ وعدہ بشھادۃ اولیائہ بعد ان خیرھم فاختار والقتل" ان سے وعدہ لیا کہ اگر تم فدیہ لینا چاہتے ہو تو تمہیں آنے والے سال میں کفار قیدیوں کی تعداد میں شہید کردیا جائے گا، تو صحابہ کرام نے فدیہ لینا پسند کرلیا کہ ٹھیک ہے "ہمیں اتنی ہی تعداد میں شہید کردیا جائے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کردیا اپنے پیاروں کو شہید کرادیا" اسی آیۃ کریمہ میں قریب ہی آنے والے الفاظ مبارکہ ﴿وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ﴾ اس پر روشن دلیل ہیں۔ (منقول از قرطبی)

﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ "اور (اس لئے) تا کہ پہچان کرادے اللہ ایمان والوں کی۔"

راقم نے یہ ترجمہ اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ سے نقل کیا، آپ کے ترجمہ کنز الایمان کی خوبی کو دیکھنے کیلئے پہلے **راقم** کی تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان کو دیکھئے۔

﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾

اور اس لئے کہ معلوم کرے اللہ جن کو ایمان ہے۔	(محمود الحسن صاحب)
تا کہ اللہ ایمان والوں کو جان لے۔	(عبد الماجد دریا آبادی)
تا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو جان لیویں۔	(اشرف علی صاحب)
اور اس واسطے کہ معلوم کرے جن کو ایمان ہے۔	(شاہ عبد القادر صاحب)
اور اس لئے کہ اللہ پہچان کرادے ایمان والوں کی۔	(اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ)

جنگ احد کا ذکر ہو رہا تھا کہ اے مسلمانو اگر تمہیں احد میں تکلیف پہنچی تو کفار کو بدر میں اسی طرح تکلیف پہنچی، یہ دن ہم لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں، اس کے بعد ذکر ہے ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اس پر جلالین نے "علم

ظہور" سے تفسیر کی، اس پر حاشیہ یہ ہے "علم ظهور ای علم وجود ای علمنا متعلقا بالوجود الخارجی "یعنی یہاں علم کا تعلق وجود خارجی سے کہ جس کو اللہ تعالیٰ پہلے ہی سے جانتا ہے تاکہ اس کو خارج میں ظاہر فرمائے۔

"والعلم فیه مجاز عن التمیز من باب اطلاق اسم السبب علی المسبب ای لیمیز الثابتین علی الایمان من غیرهم" (روح المعانی)

یہاں علم کا مجازی معنیٰ "جدا کرنا، تمیز پیدا کرنا" ہے، یعنی سبب کا نام مسبب پر اطلاق ہے (مجاز مرسل ہے) یعنی معنیٰ یہ ہوا کہ ایمان پر ثابت رہنے والوں کو ان کے غیروں سے ممتاز کر دے، اب اس تفسیر (یعنی روح المعانی کی تفسیر) کے مطابق اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ پر غور کریں "اللہ پہچان کرا دے ایمان والوں کی"، کہ یہ نفیس ترجمہ ہے جس میں کوئی سطحی ذہن والا بھی وہم وگمان نہیں کر سکتا کہ شاید اللہ تعالیٰ نے ان کو آزمائش میں ڈال کر جانا پہلے علم نہیں تھا۔ (تسکین الجنان صفحہ نمبر ۸۹،۹۰)

مزید وضاحت: تفسیر صاوی اور تفسیر کبیر سے دیکھئے۔

"قوله علم ظهور "جواب عن سؤال مقدر حاصله ان علم الله قدیم لایتجدد فکیف ذلک؟ فاجاب بأن المرادلیظهر متعلق علمه بتمیز المؤمن غیره، والمعنی ان نصرة الکافر تارة لیست لمحبة الله بل لیتمیز المؤمن من المنافق"

(ولیعلم الله) علم ظهور" جلالین میں یہ تفسیر اس لئے کی گئی کہ ایک سؤال کا جواب دیا گیا ہے، سؤال یہ کہ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم ہے، وہ کوئی نیا نیا حاصل ہونے والا نہیں تو رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہاں معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ظاہر کر دے (یا یوں کہہ لیں اللہ تعالیٰ ایمان والوں کی پہچان کرا دے، مطلب ایک ہی ہے) اور مؤمن اور غیر مؤمن کو ایک دوسرے سے جدا کر دے، کیونکہ کافر کی ظاہری برتری اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے نہیں، بلکہ مؤمن اور منافق کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنا مقصود ہے۔ (صاوی)

جب دلائل عقلیہ اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حوادثات کو ان کے واقع ہونے سے پہلے جانتا ہے، تو واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تغیر محال ہے۔ ہاں البتہ علم سے مراد معلومات لئے جائیں اور قدرت سے مقدورات مراد لئے جائیں تو ان میں تغیر واقع ہوتا رہتا ہے، جہاں بھی بظاہر جب یہ نظر آئے کہ علم میں تجدد ہے تو اس سے مراد معلومات میں ہی تجدد ہوگا۔

آیۃ کریمہ کے چند مطالب:

(۱) لیظھر الاخلاص من النفاق والمؤمن عن الکافر" ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمن کے اخلاص کو ظاہر کردے، جس سے پتہ چل جائے کہ منافق اور کافر میں اخلاص نہیں۔

(۲) والثانی لیعلم اولیاء اللہ فاضاف الی نفسہ تفخیما" دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہاں حذف مضاف ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کے علم کو اپنی ذات کی طرف منسوب کر کے اولیاء کرام کی عظمت وشان کو بیان کیا، ہوسکتا ہے کہ مقصد بیان یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ولی جان لیں ایمان والوں کو۔

(۳) وثالثھا لیحکم بالامتیاز فوضع العلم مکان الحکم بالامتیاز لان الحکم بالامتیاز لایحصل الابعد العلم"

اس کا تیسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ (مؤمن اور کافر کے درمیان) امتیاز کا حکم نافذ کردے علم کو امتیاز کے فیصلہ کی جگہ رکھ دیا جائے، کیونکہ امتیاز کا حکم علم کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔

(۴) ورابعھا لیعلم ذلک واقعامنھم کما کان لیعلم انہ سیقع لان المجازاۃ تقع علی الواقع دون المعلوم الذی لم یوجد"

اس کا چوتھا مطلب یہ ہے کہ یہاں علم کے حاصل ہونے کی بات نہیں بلکہ علم کے تعلق کی بات ہے یعنی ایک علم ازلی ہے وہ کام کے واقع ہونے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ اور دوسرے علم کا تعلق جو معلوم سے ہوتا ہے وہ تعلق تب ہی ہوتا ہے جب معلوم معرض وجود میں آئے کیونکہ جزاء واقع پر مرتب ہوتی ہے نہ کہ معلوم پر۔ (کبیر)

اسی چوتھے معنی کہ مطابق حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے ترجمہ یوں کیا"اور یہ اس لئے کہ دیکھ لے اللہ تعالیٰ ان کو جو ایمان لائے۔ آپ نے تفسیر میں ذکر فرمایا" جمہور کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم دو طرح کا ہے، ایک یہ کہ مستقبل میں یوں واقع ہوگا یہ علم تو ازل سے حاصل ہے، اس علم پر کوئی جزاء یا سزا، مدح یا ذم مرتب نہیں ہوتی، لیکن جب کوئی معلوم چیز علم باری کے مطابق خارج میں موجود ہوجاتی ہے تو اس وقت یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ اب یہ چیز عدم سے وجود میں آگئی اور اسی پر جزاء وسزا مرتب ہوتی ہے، یہاں آیۃ میں علم کا یہی معنی مراد ہے جسے علم ظہور کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے "قول الجمھور ان المراد بالعلم علم الظھور"(المنار) جمہور کا قول یہی ہے کہ علم سے مراد علم ظہور ہے۔ (ضیاء القرآن)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

"علم" کا کبھی ایک مفعول ہوتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے "علمت زیدا" میں نے زید کو جان لیا" یعنی ذات زید کو جانا اور اسے پہچانا اور "علم" کبھی دو مفعولوں کا محتاج ہوتا ہے، جسے کہا جاتا ہے "علمت زیدا کریما" میں نے زید کے کریم ہونے کا یقین کر لیا آیۃ کریمہ میں "علم" کہ دو مفعول ہیں ایک مفعول محذوف ہے، معنوی لحاظ پر عبارت یوں ہوگی "وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا متميزين بالايمان من غيرهم" تا کہ اللہ تعالی پہچان کرا دے ایمان والوں کی کہ وہ ایمان کی وجہ سے غیروں سے ممتاز ہیں۔ یعنی لوگوں کے درمیان دنوں کے پھیرنے کی حکمت ہی یہ ہے کہ اللہ تعالی خالص ایمان والوں کو "جو صبر سے کام لینے والے ہیں اور اسلام پر ثابت قدم ہیں" ممتاز کر دے ان لوگوں سے جو صرف ایمان کا دعوی کرتے ہیں اور حقیقت میں ایمان سے دور ہیں، یعنی منافق ہیں۔ دوسرے احتمال کا پایا جانا بھی ممکن کہ "علم" کا ایک مفعول ہو، اب معنوی طور پر عبارت یوں ہوگی "وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا لما يظهر من صبرهم على جهاد عدوهم" تا کہ اللہ تعالی ایمان والوں کی ذاتوں کی پہچان کرا دے جب ان کا صبر دشمن کے خلاف جہاد کرتے ہوئے ظاہر ہو جائے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ﴾ "اور بنائے تم میں سے بعض کو شہید۔"

یہاں سے دنوں کے پھیرنے کی دوسری حکمت بیان کی جا رہی ہے کہ تمہیں شہداء بنائے، شہداء جمع شاہد کی ہے یا شہید کی ہے۔ دونوں احتمال پائے جا سکتے ہیں اگر شاہد کی جمع ہو تو مطلب یہ ہوگا۔

"وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ بماصدر منهم من الذنوب والمعاصى، فان كونهم لهم شهداء على الناس منصب عال ودرجة عالية"

کہ اللہ تعالی تمہیں لوگوں کے گناہ اور معاصی کرنے پر گواہ بنا دے، اس لئے کہ ایمان والے مخلصین کو لوگوں پر گواہ بنانے سے ان کا منصب بلند اور درجہ ثابت ہوگا۔

دوسرا احتمال: دوسرا احتمال کہ شہداء جمع شہید کی ہو، زیادہ مفسرین کرام نے یہی معنی لیا ہے، اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ بھی اسی کے مطابق ہے اور **راقم** نے بھی آپکے ترجمہ کو ہی نقل کیا ہے۔

"والثانى المراد منه ويكرم قوما بالشهادة" جب شہداء جمع شہید کی ہو تو مطلب یہ ہوگا تا کہ بنائے تم میں سے بعض کو شہید اور شہادت کی وجہ سے ان کو مکرم بنائے۔ مسلمان بدر میں خود ہی شہادت کی تمنا کر رہے تھے، ان کی دعاء کو

شرف قبولیت بخشا تو ان کو احد میں ستر کی تعداد میں شہادت نصیب ہوگئی۔

"القرآن مملوء من تعظيم حال الشهداء" قرآن شہیدوں کی تعظیم کے بیان سے بھرا ہوا ہے، ارشاد باری تعالی ہے

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾

اور ہرگز نہ گمان کرو "ان لوگوں کو جو شہید کردیے اللہ کی راہ میں" مردہ بلکہ وہ زندہ ہیں ان کے رب کے ہاں ان کو رزق دیا جاتا ہے۔

اور ارشاد فرمایا:

﴿فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصّٰلِحِيْنَ﴾

پس وہ ان کیساتھ ہوں گے جن پر اللہ کا انعام ہے وہ انبیاء ہیں اور صدیقین ہیں اور شہداء ہیں اور صالحین ہیں۔

اس آیہ کریمہ میں انبیاء کرام کے بعد صدیقین کا ذکر فرمایا، صدیقین کے بعد شہیدوں کا ذکر فرمایا۔

"فكانت هذه المنزلة هي المنزلة الثالثة للنبوة" تو اس سے اسی طرف ارشاد فرمایا کہ شہیدوں کا انبیاء کرام کے بعد تیسرا عظیم درجہ ہے۔ (کبیر)

اسی سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوا کہ انبیاء کرام کے بعد دوسرا مرتبہ صدیقین کو حاصل ہے، جن میں رئیس الصدیقین حضرت ابوبکر صدیق ﷺ ہیں جو انبیاء کرام کے بعد سب شہیدوں سے افضل ہیں۔

شہید کو شہید کہنے کہ وجہ:

نبی کریم ﷺ کی امت قیامت کے دن پہلی امتوں پر اور انبیاء کرام کے حق میں گواہی دے گی ان میں خصوصی درجہ اللہ کی راہ میں قتل کئے جانے والے کو ہوگا، اسی وجہ سے کہ وہ رب تعالی کے حضور لوگوں پر گواہی دینے کیلئے حاضر ہوں گے تو ان کو شہید کہا جاتا۔ "وقيل سمي شهيدا لانه مشهود له بالجنة" اور وجہ یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے کو جنت میں حاضر کردیا جاتا ہے لھذا اسے شہید کہا جاتا ہے۔

"وقيل سمي شهيدا لان ارواحهم احتضرت دار السلام لانهم احياء عند ربهم وارواح غيرهم لاتصل الى الجنة"

شہید کو شہید کہنے کی اور وجہ یہ ہے کہ ان کی روحوں کو جنت میں حاضر کردیا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے رب کے

ہاں زندہ ہوتے ہیں، اور ان کے بغیر دوسرے لوگوں کی روحوں کو جنت میں اسی وقت نہیں پہنچایا جاتا بلکہ حساب و کتاب کے بعد دوسرے لوگوں کی روحوں کو جنت میں داخل کیا جائے گا۔ شہیدوں کو عظیم مرتبہ حاصل ہوگا، ان کے عظیم مراتب کو قرآن پاک کی ان آیات میں دیکھئے۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَھُمۡ وَاَمۡوَالَھُمۡ بِاَنَّ لَھُمُ الۡجَنَّۃَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَیُقۡتَلُوۡنَ وَعۡدًا عَلَیۡہِ حَقًّا فِی التَّوۡرٰىۃِ وَالۡاِنۡجِیۡلِ وَالۡقُرۡاٰنِ وَمَنۡ اَوۡفٰی بِعَہۡدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَیۡعِکُمُ الَّذِیۡ بَایَعۡتُمۡ بِہٖ وَذٰلِکَ ھُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ﴾ (سورۃ التوبۃ، آیۃ نمبر ۱۱۱)

''بیشک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کے مال اور جان خرید لئے ہیں اس بدلے پر ان کیلئے جنت ہے اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑیں تو ماریں اور مریں، اس کے ذمہ کرم سچا وعدہ توراۃ اور انجیل اور قرآن میں، اور اللہ سے زیادہ قول کا پورا کون؟ تو خوشیاں مناؤ اپنے سودے کی جو تم نے اس سے کیا ہے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔''

﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ھَلۡ اَدُلُّکُمۡ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنۡجِیۡکُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ○ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ وَتُجَاھِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِاَمۡوَالِکُمۡ وَاَنۡفُسِکُمۡ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ○ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ وَیُدۡخِلۡکُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِھَا الۡاَنۡھٰرُ وَمَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیۡ جَنّٰتِ عَدۡنٍ ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ﴾ (سورۃ الصف آیات نمبر ۱۰ تا ۱۲)

''اے ایمان والو کیا میں بتادوں وہ تجارت جو تمہیں دردناک عذاب سے بچائے۔ ایمان رکھو اللہ اور اس کے رسول پر اور اللہ کی راہ میں اپنے مال وجان سے جہاد کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔ وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں باغوں میں لے جائے گا جن کے نیچے نہریں رواں، اور پاکیزہ محلوں میں جو بسنے کے باغوں میں ہیں یہی بڑی کامیابی ہے۔''

❁ وفی صحیح البستی عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ مایجد الشہید من القتل الا کمایجد احدکم من القرحۃ''

صحیح بستی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی گئی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شہید قتل سے نہیں پاتا مگر وہ جو تم میں سے کوئی ایک زخم کی خراش سے پاتا ہے۔ یعنی جس طرح خراش سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی اسی طرح شہید کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

❁ وروی النسائی عن راشد بن سعد عن رجل من اصحاب النبی ﷺ ان رجلا قال یا رسول اللہ ﷺ مابال المؤمنین یفتنون فی قبورھم الا الشہید قال کفی ببارقۃ السیوف علی راسہ فتنۃ''

نسائی نے راشد بن سعد سے روایت بیان کی جو نبی کریم ﷺ کے ایک صحابی سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ کیا وجہ ہے کہ سب مؤمنوں کو قبر کے سؤال وجواب میں مبتلاء ہونا ہے لیکن شہید کو نہیں؟ تو آپ نے فرمایا اس کے سر پر بجلی کی طرح چمکتی تلوار چلا کر ہی اسے آزمالیا گیا۔

❁ **حدثنا انس بن مالک انه قتل منهم یوم احد سبعون و یوم بئر معونة و سبعون و یوم الیمامة سبعون قال بئر معونة علی عهد رسول الله ﷺ و یوم الیمامة علی عهد ابی بکر یوم مسیلمة الکذاب"** (بخاری کتاب المغازی باب من قتل من المسلمین یوم احد)

حضرت انس بن مالک ؓ فرماتے ہیں احد کے دن ستر صحابہ کرام شہید کردئے گئے اور بئر معونہ کے دن ستر صحابہ کرام شہید کردئے گئے اور یمامہ کے دن ستر صحابہ کرام شہید کردئے گئے۔ بئر معونہ کا واقعہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ثابت ہوا، اور یمامہ کا واقعہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے زمانہ میں ہوا جبکہ آپ نے مسیلمہ کذاب سے جنگ کی۔ (منقول از قرطبی)

بئر معونہ کا ذکر تو پہلے تفصیلی طور پر کردیا گیا ہے، جو صحابہ کرام کو تبلیغ کی غرض سے دھوکہ سے بلا کر شہید کردیا گیا۔ یمامہ کا واقعہ مختصر یہ ہے کہ جھوٹے مدعی نبوت مسیلمہ کذاب (جس نے نبی کریم ﷺ کے آخری ایام میں ہی نبوت کا دعوی کردیا تھا) کے مقابلے کیلئے حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے خالد بن ولید کو جنگ کا امیر مقرر کیا، دونوں فریقوں کا ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہوا، یہ جنگ بہت مشکل اس لئے تھی کہ مرتدین کا لشکر بہت بڑی تعداد میں تھا، نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد ایک لاکھ سے زائد جاہل لوگ اس کے اردگرد جمع ہو چکے تھے، جنگ یمامہ میں مسیلمہ کذاب کے ساتھ چالیس ہزار آدمی تھے اور حضرت خالد بن ولید ؓ کے ساتھ چوبیس ہزار آدمی تھے، ابتدائی طور پر مسلمانوں کے قدم ڈگمگائے تھے، مگر آخر میں بحکم "الاسلام یعلو ولا یعلی" (اسلام غالب ہے اور مغلوب نہیں) کے حکم کے تحت دشمنوں نے شکست کھائی مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔

"وولی الکفار الادبار و دخل اکثرهم الحدیقة و احاط بهم الصحابة لم دخلوها من حیطانها و ابوابها فقتلوا من فیها من المرتد من اهل الیمامة"

اور کفار پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے، جان بچانے کی خاطر ایک باغ میں گھس گئے اور صحابہ کرام نے ان کو گھیرے میں لے لیا اور دیواروں پھلانگ کر باغ کے اندر پہنچ گئے، کوئی دروازوں سے اندر چلے گئے، وہاں مرتدین یمامہ کو قتل کردیا، یہاں تک کہ مسلمانوں نے مسیلمہ کا پیچھا کیا، حضرت وحشی بن حرب ؓ آگے نیزہ اس کے سینے پر مارا جو اس کی پیٹھ سے نکل گیا، پھر جلدی ابودجانہ سماک بن حرب آگے بڑھے جنہوں نے تلوار سے اسے قتل کردیا۔

"وكان جملة من قتلوا فى الحديقة وفى المعركة قريبامن عشر آلاف مقاتل وقيل احدوعشرون الفا"
مرتدین جو باغ میں قتل کردیے گئے اور میدان جنگ میں جوان کی لڑائی کرنے والے قتل کردیے گئے وہ دس ہزار تھے، بلکہ ایک روایت میں یہ ذکر ہے کہ اکیس ہزار کی تعداد میں مرتدین قتل کردیے گئے۔
"وقتل من المسلمين ستمائة وقيل خمس مائة والله اعلم وفيهم من الصحابة سبعون رجلا"
مسلمان اس جنگ میں پانچ سو اور چھ سو کے درمیان شہید ہوئے جن میں ستر صحابہ کرام تھے اور باقی تابعین تھے۔ (ماخوذ مدارج النبوۃ جلد دوم، وعمدۃ القاری شرح بخاری ج ۱۷ صفحہ نمبر ۱۶۳)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

اس آیۃ کریمہ سے یہ واضح ہوا کہ "ان جميع الحوادث بارادة الله تعالى" کہ تمام حوادث اللہ تعالی کے ارادہ سے پائے جاتے ہیں، اسلئے کہ منصب شہادت ایک عظیم درجہ ہے، اور شہادت کے اصول کے لئے کفار کا مؤمنوں پر مسلط ہونا ضروری ہے اس کے بغیر شہادت کا اصول نہیں جب شہادت کفار کے تسلط کے بغیر حاصل نہیں ہوتی "فحينئذ يكون قتل الكفار للمؤمنين من لوازم تلك الشهادة" تو پتہ چلا کہ کافروں کا مؤمنوں کو قتل کرنا شہادت کے لوازمات سے ہے۔
"فاذاكان تحصيل تلك الشهادة العبدمطلوبالله تعالى وجب ان يكون ذلك القتل مطلوبالله تعالى"
جب بندے کا شہادت کو حاصل کرنا اللہ تعالی کو مطلوب، اور شہادت کافر کے قتل کرنے کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے تو کافر کا مسلمان کو قتل کرنا بھی مطلوب ہوا۔ ﴿وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ﴾ سے اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ جب شہادت رب تعالی کی طرف سے حاصل ہوتی ہے۔
"وذلك يدل على ان فعل العبدخلق الله" تو اسی سے پتہ چل گیا کہ بندے کا فعل اللہ تعالی کی تخلیق کی وجہ سے ہے، یعنی بندوں کے افعال اللہ تعالی کی مخلوق ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ﴾ "اور اللہ تعالی نہیں محبت کرتا ظالموں سے۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں "ظالمون" سے مراد مشرکین ہیں، یعنی اللہ تعالی

مشرکوں سے محبت نہیں کرتا۔ یعنی جو لوگ جہاد پر صبر نہ کر کے ایمان پر ثابت نہیں رہتے رب تعالیٰ ان کو پسند نہیں کرتا، اور اسی سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ کافروں کو اگر بظاہر کبھی برتری دے دے تو اس میں بھی مومنین کا ہی فائدہ ہوتا ہے کہ ان کو منصب شہادت حاصل ہو جاتا ہے "لا لأنہ یحبھم" اس کی وجہ یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت رکھتا ہے وہ تو کافروں سے محبت رکھتا ہی نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِيْنَ۝ (آیۃ نمبر ۱۴۱)

(1) اور اس لئے کہ اللہ مسلمانوں کا نکھار کر دے اور کافروں کو مٹا دے۔ (کنزالایمان)

(2) اور اس لئے کہ نکھار دے اللہ تعالیٰ انہیں جنہوں نے ایمان لایا اور مٹا دے کافروں کو۔ (نجوم الفرقان)

محص: (ف) محصا۔ الظبی فی عدوہ" تیز دوڑنا "المذبوح برجلہ" مذبوح کا تڑپنا "بفلان العرض" کسی کو زمین پر پھینکنا فلان من فلان، بھاگنا" البرق" بجلی کا چمکنا "اللہ مابک" زائل کرنا، الشیُ ہر عیب سے پاک کرنا" السنان" بھالے کو صیقل کرنا" الذھب بالنار" سونے کو صاف کرنا یعنی سونے کو آگ کی بھٹی میں ڈال کر صاف کر کے نکھار دیا جائے۔

آیۃ کریمہ میں یہی معنی لیا گیا ہے:

المحص الورم، ورم کا کم ہونا، المحص والممحص والمحیص والممحوص من الخیل مضبوط ساخت کا گھوڑا، المحاص، چمکنے والی بجلی "الامحص" ہر جھوٹے، سچے کا عذر قبول کرنے والا۔ (المنجد)

محق: (ف) محقا الشیء، باطل کرنا، مٹانا، اللہ الشیُ گھٹانا، برکت کھونا، الحرُّ الشیء جلانا "المحق" کھجور کے قریب قریب لگے ہوئے پودے "ماحق الصیف" موسم گرما کی شدت "الامحق" بے برکت۔ (المنجد)

اس آیۃ کریمہ میں تیری حکمت بیان کی جا رہی ہے، اور درمیان میں ﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ جملہ معترضہ ہے۔

دونوں آیات کا مختصر مطلب:

اگر تمہیں احد میں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو کافروں کو اسی کی مثل بدر میں تکلیف پہنچ چکی ہے، بلکہ احد میں بھی کافروں کے بیس سے زائد آدمی قتل کردئے گئے تو اس لحاظ پر مطلب یہ ہوگا کہ کافروں کی قوم کو احد میں تم سے پہلے تکلیف پہنچ چکی ہے۔ یہ دن ہم لوگوں میں پھیرتے رہتے ہیں کبھی مسلمانوں کو فتح عطاء کردی اور کبھی کفار کو بظاہر وقتی طور پر برتری دے دی تا کہ اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو کفار سے ممتاز کرکے ان کی پہچان کرادے، اور بعض مؤمنوں کو شہادت کا درجہ عطاء کردے، اور مؤمن جب اس مشکل میں ایمان پر ثابت رہیں گے تو ان کو گناہوں سے پاک وصاف کرکے سونے کی طرح صاف وشفاف کرکے ان میں نکھار پیدا کردے اور کافروں کو مٹادے، وجہ اس کی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں فرماتا۔ (ماخوذ از صاوی)

اعتراض: لوگوں میں دنوں کے پھیرنے پر کافروں کے مٹانے کا ذکر اس آیۃ کریمہ میں کیسے صحیح ہے؟ جبکہ احد میں تو کافروں کو بظاہر برتری حاصل ہوئی تھی۔

جواب: **قولہ تعالیٰ (ویمحق الکافرین) ای فانھم اذا ظفروا ابغوا وبطروا، فیکون ذلک سبب دمارھم وھلاکھم ومحقھم وفنائھم"**

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ﴾ (اور کافروں کو مٹادے) کا مطلب یہ ہے کہ جب ان کو ظاہری طور پر کامیابی حاصل ہوتی ہے تو بغاوت وسرکشی کرتے ہیں، جو ان کی تباہی اور ہلاکت اور ان کے مٹ جانے اور ان کے فناء ہوجانے کا سبب بنتی ہے۔ (از ابن کثیر وصابونی)

تین معانی میں سے جو چاہیں مراد لے لیں:

یمحص یختبر" اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو آزمائے کہ کون ایمان پر قائم رہتے ہیں اور ڈگمگاتے ہیں "**یمحص ای یطھر**" اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو گناہوں سے پاک کرے، یعنی جب وہ ایمان پر ثابت رہیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو گناہوں سے پاک وصاف وشفاف کردے گا، اور ان کو نکھار دے۔ "**یمحص ای یخلص**" اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے گناہوں کو مٹادے اور انہیں معاف کردے۔ یہ اسی طرح جس طرح کہا جاتا ہے "**اللھم محص عنا ذنوبنا**" اے اللہ ہمارے گناہوں کو مٹادے۔ اس آیۃ کریمہ میں ﴿وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا﴾ کا معنی یہ ہوگیا "**فالمعنی علیہ لیبتلی المؤمنین لیثیبھم ویخلصھم من ذنوبھم**" کہ اللہ

تعالیٰ مؤمنوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے تاکہ ان کو ثواب عطاء کرے اور ان کے گناہوں کو مٹا دے۔ (ماخوذ از قرطبی)

❁ واخرج ابن ابی حاتم عن عكرمة قال لما ابطا على النساء الخبر خرجن يستخبرن فاذا رجلان مقتولان على دابة او على بعير فقالت امرأة من الانصار من هذان قالوا فلان وفلان اخوها وزوجها وابنها فقالت مافعل رسول الله ﷺ؟"قالوا حي"قالت فلا ابالي يتخذ الله من عباده الشهداء ونزل القرآن على ماقالت"

ابن ابی حاتم نے حضرت عکرمہ سے ایک روایت بیان کی، کہ جب عورتوں پر خبر کے پہنچنے میں تاخیر ہوگئی، تو وہ خبر طلب کرنے کیلئے نکلیں، تو شہیدوں کو ایک سواری پر لایا جارہا تھا، تو اس عورت نے پوچھا کہ یہ دو شہید کون ہیں؟ تو اسے بتایا گیا کہ یہ فلاں اور فلاں دو شخص ہیں، ایک اس عورت کا خاوند اور ایک بھائی تھا یا ایک خاوند اور ایک بیٹا تھا، اس عورت نے پوچھا نبی کریم ﷺ کیسے ہیں؟ تو اسے بتایا گیا کہ آپ صحیح زندہ اور سلامت ہیں، تو اس عورت نے کہا کہ اب مجھے کوئی پروہ نہیں کہ آپ زندہ اور سلامت ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے بعض کو شہادت کا مرتبہ عطاء کردیا، تو اسی وقت یہ الفاظ مبارکہ نازل ہوئے ﴿وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ﴾ کہ تم میں سے بعض کو شہید بنائے۔ (منقول از درمنثور)

سبحان اللہ! صحابہ اور صحابیات کا کتنا صبر تھا، کہ اپنے بھائی اور خاوند، یا کہ اپنے خاوند اور اپنے بیٹے کی پرواہ نہیں، بلکہ خوشی ہوئی کہ ان کو شہادت کا مرتبہ حاصل ہوگیا، فکر صرف نبی کریم ﷺ کی لاحق ہوئی، آپ کی حیات کی خبر سن کر اس کے دل کو اطمینان حاصل ہوگیا۔

محص اور محق میں فرق:

دونوں لفظوں میں مطابقت پائی گئی کہ ہر ایک کا معنی "ازالہ" ہے البتہ محص کا معنی یہ ہے "في الاول ازالة الآثار وازاحة الاوضار" کہ آثار کو زائل کردینا یعنی علامات اور نشانات مٹا دینا، اور میل کچیل کو دور کردینا "وفي الثاني ازالة العين واهلاك النفس" دوسرے یعنی "محق" کا معنی ہے عین چیز کو مٹا دینا اور نفس کو ہلاک کردینا "واصل المحق تنقيص الشئ قليلا قليلا" اصل میں محق کا معنی ہے کسی چیز کو آہستہ آہستہ مٹا دینا۔ (روح المعانی)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ O (آیۃ نمبر ۱۴۲)

(1) کیا اس گمان میں ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی اللہ نے تمہارے غازیوں کا امتحان نہ لیا اور نہ صبر والوں کی آزمائش کی۔ (کنزالایمان)

(2) کیا تم نے گمان کیا کہ ابتداً داخل ہو جاؤ گے جنت میں، حالانکہ نہیں آزمایا اللہ نے انہیں جنہوں نے جہاد کیا تم میں سے، اور نہیں آزمایا صبر کرنے والوں کو۔ (نجوم الفرقان)

یعنی جنت میں ابتدائی طور پر جانے کی یوں ہی امید نہ کرے، بلکہ اللہ تعالی کی طرف سے امتحانوں میں کامیابی حاصل کرے، جہاد کرنے کی آزمائش میں پورا اترے، اور رب تعالی کی طرف سے دی ہوئی تکالیف پر صابر رہے، تو اللہ تعالی اسے جنت عطاء فرمائے گا۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

جلالین میں ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ﴾ کی تفسیر "بَلْ اَحَسِبْتُمْ" سے کی گئی، اس پر صاوی نے لکھا "ام" منقطعہ ہے اسی وجہ سے مفسر رحمہ اللہ نے "بل" سے تفسیر کی جو اضراب انتقالی پر دلالت کر رہا ہے، اور مفسر رحمہ اللہ نے ہمزہ مقدر نکالا ہے، جو استفہام انکاری پر دلالت کر رہا ہے

"والمعنی لا تظنوا یاایھاالمؤمنون الکم تدخلون الجنة مع السابقین بمجردالایمان من غیر جهاد وصبر بل مع الجهاد والصبر"

معنی یہ ہے کہ اے مؤمنو تم گمان نہ کرو کہ تم جنت میں ابتدائی طور پر داخل ہونے والوں کے ساتھ بغیر جہاد اور صبر کے صرف ایمان کے ساتھ ہی چلے جاؤ گے، بلکہ جہاد اور صبر سے جنت میں السابقون الاولون کے ساتھ داخل ہو گے۔

طلباء کرام ایک اور مسئلہ کی طرف توجہ کریں:

"لما" نافیہ ہے "یعلم" مجزوم ہے، التقاء ساکنین کی وجہ سے کسرہ دیا گیا۔ (صاوی)

تسکین الجنان فی محاسن کنزالایمان سے اقتباس:

﴿وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ وَ يَعْلَمَ الصَّابِرِينَ﴾

''ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو جانا ہی نہیں جنہوں نے جہاد کیا اور صبر نہ کرنے والوں کو جانا'' (عبدالماجد صاحب)

''حالانکہ ابھی خدا نے تم میں سے جہاد کرنے والوں کو تو اچھی طرح معلوم نہیں کیا اور یہ مقصود ہے کہ وہ ثابت قدم رہنے والوں کو معلوم کرے۔ (فتح محمد صاحب)

اور ابھی تک معلوم نہیں کیا اللہ نے جو لڑنے والے ہیں تم میں سے اور معلوم نہیں کیا ثابت رہنے والوں کو' (محمود الحسن صاحب)

اور ابھی معلوم نہیں کیا اللہ نے جو لڑنے والے تم میں سے اور معلوم کرے ثابت رہنے والے۔ (شاہ عبدالقادر صاحب)

''اور ابھی اللہ نے تمھارے غازیوں کا امتحان نہ لیا اور صبر کرنے والوں کی آزمائش کی''

(اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے مفسرین کی بحث بآسانی سمجھ میں آتی ہے، کہ یہاں اللہ کے علم کی کیسے نفی ہے؟ یہ تو ممکن نہیں کہ کہا جائے ابھی تک اللہ نے معلوم نہیں کیا۔

ای ولما تجاهدوا لان العلم متعلق بالمعلوم فتدل نفی العلم بمنزلة نفی متعلقه لانه منتف بانتفائه تقول ماعلم الله فی فلان خیرا ای مافیه خیر حتی یعلمه'' (مدارک)

یعنی یہاں مقصد نفی جہاد ہے، نفی علم نہیں اس لئے کہ علم کا تعلق معلوم سے ہے، نفی معلوم کی جگہ نفی علم کو رکھا گیا ہے، کیونکہ معلوم کہ انتفاء سے علم کا انتفاء ہوتا ہے، جیسے تم کہو ''ما علم الله فی فلان خیرا'' اس کا یہ معنی نہیں کہ اللہ نے فلاں میں خیر کو جانا نہیں، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ فلاں میں خیر ہے ہی نہیں جو اللہ تعالیٰ کے علم سے متعلق ہو، مقصود بھی یہی ہے کیونکہ ما قبل آرہا ہے کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، ابھی تو اللہ نے تمہیں جہاد میں آزمایا بھی نہیں اور نہ صبر کرنے والوں کی آزمائش کی۔

فان رجاء الاجرمن غیر عمل ممن یعلم انه منوط به مستبعدعندالعقول ولهذاقیل :

ترجوالنجاة ولم تسلک مسالکها ان السفینة لاتجری علی الیبس

وورد عن شهر بن حوشب طلب الجنة من غیر عمل ذنب من الذنوب وانتظار الشفاعة بلا سبب نوع من الغرور وارتجاء الرحمة ممن لا یطاع حمق وجهالة''

(روح المعانی)

اجر کی امید بغیر عمل کئے یہ جانتے ہوئے کہ اس کی دارومدار بھی اسی پر ہے یہ عقل سے بعید ہے، اسی وجہ سے یہ کہا گیا ''نجات کی امید اس راہ پر چلنے کے بغیر کشتی کو خشکی پر چلانے کے مترادف ہے، شہر بن حوشب کہتے ہیں بغیر عمل کے طلب جنت گناہ ہے، انتظار شفاعت بلا سبب دھوکہ میں مبتلاء ہونا ہے، اور رحمت کی امید بغیر اطاعت کے جہالت و بے وقوفی ہے، اس تقریر سے واضح ہوا کہ یہاں نفی آزمائش جہاد و صبر ہے نہ کہ نفی علم۔

نفی اللازم نفی الملزوم و کثیرا ما یقال ما علم اللہ تعالی فی فلان خیرا ویراد ما فیہ خیر حتی یعلمہ'' (روح المعانی)

اس عبارت کا مفہوم وہی ہے جو پہلے مدارک کے حوالہ سے گزر چکا ہے۔

''ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ و الحال انہ لم یتحقق منکم الجہاد و الصبر'' (روح المعانی)

کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم سے جہاد اور صبر ثابت ہی نہیں ہوا، اس عبارت سے بھی واضح ہو رہا ہے کہ ''نفی جہاد و صبر ہے، نہ کہ نفئ علم۔ (تسکین الجنان صفحہ ۹۱،۹۲)

''ظاھرا لآیۃ یدل علی وقوع النفی علی العلم ،والمراد وقوعہ علی نفی المعلوم ،والتقدیر ،ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یصدر الجہاد عنکم ،وتقریرہ ان العلم متعلق بالمعلوم کما ھو علیہ ،فلما حصلت ھذہ المطابقۃ لا جرم حسن اقامۃ کل واحد منھا مقام الآخر ''

آیۃ کریمہ سے ظاہری طور پر معنی یہ سمجھ آ رہا ہے کہ علم کی نفی ہو رہی ہے، لیکن مراد معلوم کی نفی ہے علم کی نہیں ،آیۃ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ، کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم سے جہاد صادر ہی نہیں ہوا واضح ہوا کہ علم معلوم سے متعلق ہوتا ہے، جس طرح معلوم ہو، جب مطابقت ضروری ہے تو یقیناً علم کو معلوم کے درجہ میں ،اور معلوم کو علم کے درجہ میں رکھنا جائز ہے۔ (کبیر)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

''قال الزجاج اذا قیل فعل فلان فجوابہ انہ لم یفعل، واذا قیل قد فعل فلان فجوابہ لم یفعل، لانہ لما اکد وفی جانب الثبوت بقد لاجرم اکدفی جانب النفی بکلمۃ لما''

زجاج نے کہا ہے کہ جب کہا جائے فلاں نے یہ کام کیا ہے، تو اس کی نفی مقصود ہو تو کہا جائے گا۔ ''انہ لم یفعل'' اس نے یہ کام نہیں کیا، اور اگر ثبوت کی جانب تاکید لگائی جائے لفظ قد سے، تو نفی کی جانب لفظ

لمـا "سے تاکید آئے گی "قـد فـعـل" تحقیق اس نے یہ کام کیا تو اس کے جواب میں کہا جائے گا "لما یفعل"، تحقیق اس نے نہیں کیا۔ (کبیر)

کیا خوب نتیجہ پیش کیا گیا:

"واعـلـم ان حاصل الكلام ان حب الدنيا لا يجتمع مع سعادة الآخرة" آیۃ کریمہ سے نتیجہ یہ حاصل ہوا کہ دنیا کی محبت، آخرت کی نیک بختی کے ساتھ جمع نہیں ہوتی، جتنی قدر ایک بڑھے گی اتنی مقدار میں دوسری میں کمی آئے گی، اگر دنیا کی محبت بڑی تو آخرت کی سعادت میں کمی آئے گی، اور اگر آخرت کی محبت بڑھی تو دنیا کی محبت میں کمی آجائے گی، اس کی وجہ اصل میں یہ ہے کہ دنیاوی کمال اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک دنیا کی طرف دل نہ لگایا جائے، اسی طرح اخروی سعادت اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب دل اللہ تعالی کے سوا تمام، چیزوں سے ہٹا کر اللہ تعالی کی محبت کی طرف لگادے، اسی محبت الٰہیہ سے اس کا دل پر رہے۔

"وهذان الا مران لا يجتمعان ،فلهذا السروقع الاستبعاد الشديد في هذه الآية من اجتماعهما"

یہ دونوں امر آپس میں جمع نہیں ہوتے، اسی راز کے پیش نظر ان دونوں چیزوں یعنی محبت دنیا اور سعادت اخرویہ کے اجتماع سے دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے، اللہ تعالی کی محبت اور آخرت کی محبت صرف زبانی دعوی سے حاصل نہیں ہوتی، یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو بھی اللہ تعالی کے دین کا اقرار کرے وہ سچا بھی ہو، بلکہ محبوب اور مکروہ چیزوں کے مسلط کرنے سے اصلی محبت کا پتہ چلتا ہے، اگر محبوب سے منافع حاصل ہو تو محبت برقرار رہے اور محبوب کی طرف سے آزمائش کیلئے بے رخی پائی جائے تو محبت زائل ہو جائے تو یہ حقیقت میں محبت ہی نہیں۔

"فـان الـحـب لا يـنـقص بالجفاء ولا يزداد بالوفاء،فان بقى الحب عند تسليط اسباب البلاء ظهران ذلک الحب کان حقيقيا"

بیشک محبت جفاء سے کم نہیں ہوتی اور وفاء سے بڑھتی نہیں، اگر محبت اس وقت بھی باقی رہے جب آزمائش کے اسباب اس پر مسلط کئے جائیں تو یہی حقیقی اور کامل محبت ہے "اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ" کے ساتھ ہی فلهذا الحكمة قال ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ کیا تم گمان کرتے ہو کہ جنت میں "اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ" کے ساتھ ہی داخل ہو جاؤ گے، صرف رسول اللہ ﷺ کی تصدیق سے بغیر جہاد اور صبر میں مبتلاء ہونے سے پہلے؟ نہیں ایسا نہیں، بلکہ پہلے تمہیں جہاد سے آزمایا جائے گا، اور شدید محنت میں مبتلاء کر کے تمہارے صبر کی دوسرے لوگوں کو پہچان

کرائی جائے گی، جب تم اس معیار میں پورے اترو گے تو رب تعالی کے محبوب بن جاؤ گے، پھر پہلے ہی مرحلہ میں تم جنت میں داخل کردیئے جاؤ گے۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ میں "میم" کے کسرہ والی ایک قرأت ہے، وہ واضح ہے کہ اس میں پہلے "لما" بواسطہ عطف ساتھ مل جائے گا، اور ایک قرأت میں "میم" پر رفع بھی پڑھا گیا ہے، اس صورت میں واؤ استینافیہ ہے یا حالیہ ہے "کانہ قیل ولما تجاھدوا وانتم صابرون" اس قرأت کے مطابق معنی یہ ہے، اور تم نے جہاد ہی نہیں کیا تمہارا صبر سامنے آتا تو رب تعالی اس کی پہچان کرا دیتا، لیکن مشہور قرأت روایۃ ابی حفص کے مطابق ہمارے سامنے "نصب" والی ہے، اس صورت میں "ان" مقدر ہوگا یا واؤ صرف ہوگی، اور کلام اس طرح ہوگی جیسے "لاتاکل السمک وتشرب اللبن" میں ہے، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مچھلی کھانے اور دودھ کے پینے کو جمع نہ کرو، اب اس قانون کے مطابق آیۃ کریمہ کا مطلب یوں ہوگا ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ والحال انہ لم یتحقق منکم الجھاد والصبر ای الجمع بینھما" کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم (ابتداء) جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ تم سے جہاد اور صبر ثابت ہی نہیں ہوئے۔ (روح المعانی)

﴿وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ ذکر فرمایا ﴿وَيَعْلَمَ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا﴾ نہیں ذکر فرمایا کہ دوام واستمرار بھی حاصل ہو جائے اور آیات کے آخری الفاظ "**عاملین، مکذبین، متقین** اور **صابرین** ایک جیسے ہو جائیں۔

ابتدائی کلاسوں کے دینی طلباء اسے نہ بھولیں:

آپ صرف کی کتب میں ثلاثی مجرد کے ابواب میں "حسب یحسب" ماضی اور مضارع مکسور العین پڑھ رہے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ مادہ، یہ الفاظ کسی اور باب پر نہیں آتے، بلکہ قرآن پاک میں ماضی مکسور العین اور مضارع مفتوح العین ہی استعمال ہے، اس کی تفصیل یہ ہے "حسبہ" (ن) حسبا، حسابا، حسبانا، حسبانا، حسبۃ، حسابۃ، گننا شمار کرنا حسبہ (س ح) حسبانا، محسبۃ، گمان کرنا، خیال کرنا "حسبۃ" "شریف الاصل ہونا" (المنجد)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ O (آیۃ نمبر ۱۴۳)

(1) اور تم تو موت کی تمنا کیا کرتے تھے اس کے ملنے سے پہلے تو اب وہ تمہیں نظر آئی آنکھوں کے سامنے۔ (کنزالایمان)

(2) اور تحقیق تم تمنا کرتے تھے موت کی پہلے اس کے پالینے کے، تو تحقیق (اب) تم نے اسے دیکھ لیا، اس حال میں کہ تم اسے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ رہے ہو۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی نے جب نبی کریم ﷺ کے ذریعے صحابہ کرام کے سامنے بدر والے شھداء کی شان بیان کی اور ان کا اپنے ہاں مقام تکریم وعزت بیان کیا تو جو لوگ بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے ان کے دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ ہمیں بھی شہادت حاصل ہو اور ہم اپنے بھائیوں سے جاملیں، تو اللہ تعالی نے ان کے سامنے موت کے اسباب ظاہر کر دیئے وہ کچھ دیر کیلئے پسپا ہو گئے تو اللہ تعالی نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرمایا کہ تم تو موت کو طلب کر رہے تھے جب موت کے اسباب تمہاری آنکھوں کے سامنے آ گئے تو تم پسپا (کیوں) ہو گئے۔ (خازن)

﴿وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ﴾ "اور تحقیق تم تمنا کر رہے تھے موت کی"۔

موت کی طلب کا مطلب یہ ہے کہ تم جنگ کر رہے تھے کہ ہمیں پھر جنگ کا موقع ملے، یا مراد یہ ہے کہ تم شہادت طلب کر رہے تھے، جب مراد اسباب موت لیا جائے کہ تم اسباب موت طلب کر رہے تھے تو بیان کردہ دونوں صورتوں کو یہ شامل ہے۔

﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ﴾ "پہلے اس کے پالینے کے"۔

"من قبل ان تشاهدوه وتعرفوا شدته" یعنی موت کے اسباب کا مشاہدہ کرنے سے پہلے اور موت کی شدت کی پہچان سے پہلے تم موت کی تمنا کر رہے تھے۔

﴿فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ﴾ "تحقیق (اب) تم نے اسے دیکھ لیا ہے"۔

"فقد رايتموه معاينين له حين قتل دونكم من قتل من اخوانكم" تحقیق اب تم نے اس کا معاینہ کر لیا ہے

کہ تمہارے بھائی تمہارے سامنے شہید کردیئے گئے

"رایتم" اس مقام میں بمعنٰی "ابصرتم" کے ہے، اس کا ایک مفعول ہے، جس کا معنٰی ہے دیکھنا، کبھی "رایت" یقین کرنے کے معنٰی میں استعمال ہوتا ہے اس وقت اس کے دو مفعول ہوتے ہیں، لیکن یہاں وہ معنٰی مراد نہیں۔

﴿وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾ "اس حال میں کہ تم اسے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ رہے ہو"۔

یہ جملہ تاکید کیلئے ہے، جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ "رایت" کا حقیقی معنٰی دیکھنا معتبر ہے، مجازی معنٰی نہیں لیا گیا، کیونکہ کبھی دل کی توجہ کو بھی رؤیۃ سے تعبیر کرلیا جاتا ہے۔

مختصر مطلب:

تقریبا شان نزول سے ہی پتہ چل گیا کہ صحابہ کرام شہادت کی طلب کی دعاء کررہے تھے، احد میں ان کے سامنے اسباب شہادت آگئے، لیکن وہ وقتی طور پر پسپا ہوگئے، تو رب تعالی نے فرمایا تم تو موت (شہادت) کی تمنا کر رہے تھے جب تک تمہارے سامنے اسباب موت نہیں آئے، لیکن اسباب موت تمہارے سامنے جب آئے تو تم اس کا معاینہ کررہے تھے، ضمناً اس میں توبیخ بھی پائی گئی کہ تم خود ہی پہلے شہادت طلب کررہے تھے اور جب تمہارے سامنے اسباب شہادت آگئے تو تم وقتی طور پر کچھ دیر کیلئے پسپا ہوگئے گئے، اگرچہ بعد میں تم لوٹ آئے اور کفار کو تم نے شکست بھی دے دی، لیکن تمہارا کچھ دیر کیلئے پسپا ہونا بھی تمہاری شان کے لائق نہیں تھا۔ (ماخوذ از بیضاوی وشیخ زادہ)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ○ (آیۃ نمبر ۱۴۴)

(1) اور محمد تو ایک رسول ہیں، ان سے پہلے اور رسول ہو چکے تو کیا اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید ہوں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جو الٹے پاؤں پھرے گا اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، اور عنقریب اللہ شکر والوں کو صلہ دے گا۔ (کنزالایمان)

(2) اور نہیں ہیں محمد مگر رسول، تحقیق گذر چکے ہیں اس سے پہلے رسول، تو کیا وہ انتقال فرمائیں، یا شہید کر دیئے جائیں تو تم پھر جاؤ گے الٹے پاؤں، اور جو الٹے پاؤں پھرے گا، تو ہر گز نہیں نقصان کرے گا اللہ کا کچھ (بھی) اور عنقریب جزاء دے گا اللہ شکر کرنے والوں کو۔ (نجوم الفرقان)

اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ بہت ہی انبیاء کرام کے ادب واحترام کے عین مطابق ہے، **راقم** نے لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے، کافی حد تک کوشش کی گئی کہ کوئی لفظ بھی ایسا نہ ہو جو ادب کے خلاف ہو۔ واللہ اعلم بالتبیان۔

راقم کی کتاب تسکین الجنان فی محاسن کنزالایمان کو دیکھئے، مترجمین نے کس طرح تراجم کئے۔

﴿اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ﴾

پھر اگر وہ مر گیا یا مارا گیا۔	(محمود الحسن صاحب)
پھر کیا وہ اگر مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں۔	(مودودی صاحب)
سو اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں۔	(عبدالماجد دریاآبادصاحب)
پھر کیا اگر وہ مر گیا یا مارا گیا۔	(شاہ عبدالقادر صاحب)
بھلا اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں۔	(فتح محمد صاحب)
تو کیا اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید ہوں۔	(اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ)

نبی کریم ﷺ کے متعلق ذکر کیا جا رہا ہے، جنگ احد میں جب شیطان نے نبی کریم ﷺ کے شہید ہو جانے کی افواہ پھیلا دی، صحابہ بہت زیادہ پریشان ہو گئے، اس وقت رب تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ سے پہلے روگردانی کر جاؤ گے ،اب توجہ طلب بات یہ ہے کہ کون سا معنی نبی کریم ﷺ کی شان کے لائق ہے، ادب و احترام پر دلالت کر رہا ہے، جس میں شہید ہونے اور انتقال فرمانے کا ذکر ہے یا وہ تراجم اچھے ہیں جن میں "مر گیا یا مارا گیا" ذکر ہے، یا ذکر ہے "مر جائیں یا قتل ہو جائیں" یا ذکر ہے وفات پا جائیں یا مارے جائیں، یا جس میں یہ ذکر ہے (مر جائیں یا مارے جائیں) تراجم کو دیکھنے کے بعد یقیناً یہ کہنا پڑے گا کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہی بہتر ہے، اہل دانش (سمجھدار لوگوں) پر یہ مخفی نہیں۔ (تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان صفحہ ۹۲)

شان نزول:

درمنشور میں کئی روایات نقل کی گئی ہیں، تقریباً مطلب سب کا ایک ہی ہے، الفاظ مختلف ہیں، تفسیر خازن سے شان نزول نقل کیا جا رہا ہے، تاکہ اختصار رہے، درمنشور کی تمام روایات کو نقل کرنے میں بہت طوالت پائی جاتی ہے۔

۞ **عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ اشتد غضب الله علی من قتله نبی فی سبیل الله اشتد غضب الله علی قوم ادموا وجه نبی الله قالوا وفشا فی الناس ان محمدا ﷺ قد قتل فقال بعض المسلمین لیت لنا رسولا الی عبد الله بن أبی فیأخذ لنا امانا من ابی سفیان و جلس بعض الصحابة و القوا بایدیهم وقال الناس من المنافقین ان کان محمد قد قتل فالحقوا بدینکم الاول ،وقال انس بن النضر عم انس بن مالک یا قوم ان کان محمد قد قتل فان رب محمد لم یقتل وما تصنعون بالحیاة بعد رسول الله فقاتلوا علی ما قاتل علیه ،وموتوا علی ما مات علیه،ثم قال اللهم انی اعتذر الیک مما یقول هؤلاء یعنی المسلمین وابرأ الیک مما جاء به هؤلاء یعنی المشرکین ثم شد بسیفه فقاتل حتی قتل ثم ان رسول الله ﷺ انطلق الی الصخرة وهو یدعو الناس،فاول من عرف رسول الله ﷺ کعب بن مالک قال قد عرفت عینیه تزهران تحت المغفر فنادیت باعلی صوتی یا معشر المسلمین ابشروا هذا رسول الله ﷺ فاشار الی ان اسکت فانحازت الیه طائفة من اصحابه فلامهم النبی ﷺ علی الفرار فقالوا یا رسول الله فدیناک بآبائنا وامهاتنا اتانا الخبر بانک قد قتلت فرعبت قلوبنا فولینا مدبرین،فانزل الله عزوجل وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل "**

حضرت ابن عباس ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا شدید غضب اس شخص پر ہوتا ہے جسے

اللہ کے نبی اللہ کی راہ میں قتل کر دیں، اور اس قوم پر بھی اللہ تعالی کا شدید غضب ہے جس نے اللہ کے نبی چہرے کو خون آلود کر دیا، صحابہ کرام نے بیان کیا کہ لوگوں میں یہ خبر پھیل گئی کہ حضرت محمد ﷺ شہید ہو گئے ہیں، بعض مسلمانوں نے کہا (جنہوں نے نیا نیا اسلام قبول کیا تھا) کاش کہ ہمیں کوئی قاصد ملتا جس کو ہم عبد اللہ بن ابی (یہ منافقوں کا سردار تھا) کے پاس بھیجتے، وہ ہمیں ابوسفیان سے پناہ لے کر دیتا، اور بعض صحابہ کرام (ایمان میں پختہ، مخلصین) بھی ہتھیار ڈال کر بیٹھ گئے، منافقین کہنے لگے اگر محمد (ﷺ) شہید ہو گئے تو تم اپنے پہلے دین کی طرف لوٹ آؤ (یعنی دین اسلام کو چھوڑ دو) حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا تھے، کہنے لگے اے میری قوم اگر محمد ﷺ شہید ہو گئے تو آپ کا رب تو زندہ ہے وہ تو شہید نہیں ہوا رسول اللہ ﷺ کے بعد تم زندہ رہ کر کیا کرو گے، اسی راہ پر (اللہ کی راہ میں) تم بھی جنگ کرو جس پر رسول اللہ ﷺ نے جنگ کی، اور تم بھی اسی طرح شہید ہو جاؤ جس میں آپ شہید ہوئے، پھر آپ نے اللہ تعالی کے حضور عرض کیا اے اللہ میں تیرے حضور عذر پیش کرتا ہوں (معافی طلب کرتا ہوں) اس سے جو یہ (نئے نئے اسلام قبول کرنے والے) مسلمان کہہ رہے ہیں، اور اے اللہ مشرکوں سے جو فعل سرزد ہوا (کہ نبی کریم ﷺ کو زخمی کیا) اس سے میں براءت طلب کرتا ہوں، پھر آپ نے تلوار سے کفار پر شدید حملہ کیا قتال کرتے ہوئے شہید ہو گئے، پھر بیشک رسول اللہ ﷺ ایک پتھر کی چٹان کی طرف چلے، اور لوگوں کو بلانے لگے، سب سے پہلے جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کو پہچانا وہ کعب ابن مالک رضی اللہ عنہ تھے، وہ کہتے ہیں میں نے آپ کی نورانی آنکھوں کی چمک کو خود کے نیچے دیکھا، تو میں نے بلند آواز سے نداء دی، اے مسلمانوں کی جماعت خوش ہو جاؤ رسول اللہ ﷺ یہ ہیں، آپ نے مجھے خاموش رہنے کا حکم دیا، لیکن صحابہ کرام کا ایک گروہ آپ کے پاس پہنچ گیا، نبی کریم ﷺ نے ان کو ملامت کی کہ تم لوگ کیونکہ پسپا ہو گئے تھے؟ انہوں نے عرض کیا ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہوں ہم نے جب یہ خبر سنی کہ آپ شہید ہو گئے تو ہمارے دلوں پر رعب طاری ہو گیا، تو ہم پسپا ہو گئے، اس وقت یہ آیہ کریمہ ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ نازل ہوئی۔ (منقول از خازن)

نبی کریم ﷺ کی شہادت کی خبر شیطان نے اڑائی:

❁ رمی عبد الله بن قمیئة الحارثی رسول الله ﷺ بحجر فکسر رباعیته و شج وجهه واقبل یرید قتله فذب عنه مصعب بن عمیر وهو صاحب الرایة یوم بدر ویوم احد حتی قتله ابن قمیئة فظن انه قتل رسول الله ﷺ فقال قد قتلت محمدا وصرخ صارخ الا ان محمدا قد قتل و کان الصارخ الشیطان ففشافی الناس خبر قتله" (رواه مجاهد و ضحاک)

مجاہد اور ضحاک سے مروی ہے کہ عبداللہ بن قمیئہ حارثی نے رسول اللہ ﷺ کو پتھر مارا آپ کا رباعیہ دانت مبارک کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا، اور آپ کا چہرا مبارک زخمی ہو گیا، وہ آپ کو شہید کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، لیکن نبی کریم ﷺ کے لشکر کے علمبردار حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے آپ کی طرف سے دفاع کیا، یہ بدر میں بھی علمبردار تھے اور احد میں بھی، یہ دفاع کرتے ہوئے شہید ہو گئے، ابن قمیئہ کافر نے سمجھا کہ اس نے نبی کریم ﷺ کو شہید کر دیا، اس نے کہا میں نے محمد (ﷺ) کو شہید کر دیا، ادھر کوئی چلا چلا کر کہہ رہا ہے خبردار بیشک محمد کو شہید کر دیا گیا، وہ چلا چلا کر اعلان کرنے والا شیطان تھا، اس طرح نبی کریم ﷺ کی شہادت کی خبر پھیل گئی۔ (منقول از کبیر)

❁ حدثنا اسحاق بن نصر حدثنا عبدالرزاق عن معمر بن همام سمع ابا هريرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ اشتد غضب الله على قوم فعلوا بنبيه يشير الى رباعيته اشتد غضب الله على رجل يقتله رسول الله ﷺ فى سبيل الله.

(بخاری کتاب المغازی باب ما اصاب النبی ﷺ یوم احد)

معمر بن ہمام فرماتے ہیں میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کا غضب شدید ہے اس قوم پر جنہوں نے اپنے نبی سے یہ کام کیا، آپ اپنے رباعیہ دانت مبارک کی طرف اشارہ فرما رہے تھے، اور شدید اللہ کا غضب اس شخص پر ہو گا جسے اللہ کے نبی نے اللہ کی راہ میں قتل کر دیا گیا۔

وضاحت حدیث:

"ان النبی ﷺ لما جرح یوم احد وشج وجهه وكلمت شفته وكسرت رباعيته"

احد کے دن نبی کریم ﷺ کو جب زخمی کیا گیا تو آپ کا چہرا زخمی کر دیا گیا، اور آپ کے ہونٹ زخمی کر دیئے گئے، اور آپ کا رباعیہ دانت مبارک ٹوٹ گیا۔

"رباعیته" بفتح الراء وبتخفيف الباء الموحدة وتخفيف الباء آخر الحروف وهى السن التى تلى الثنية من كل جانب وللانسان اربع رباعيات"

انسان کے سامنے والے دو دانت نیچے ثنایا سفلی اور سامنے والے اوپر کے دو دانت ثنایا علیا کہلاتے ہیں، نیچے یا اوپر ثنایا کے ساتھ دائیں طرف اور بائیں طرف ایک ایک دانت رباعیہ کہلاتے ہے، اس طرح ہر انسان کے چار چار دانت رباعیہ ہیں۔ (ماخوذ از عمدۃ القاری للعینی ج ۷ اصفحہ نمبر ۱۶۰)

ابن ہشام نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل فرمائی کہ بیشک عتبہ بن ابی وقاص فرماتے ہیں "وهو الذى كسر رباعيته النبى ﷺ السفلى وجرح شفته السفلى" نبی کریم ﷺ کا نیچے والا رباعیہ دانت مبارک ٹوٹ گیا تھا، اور آپ کا نیچے والا ہونٹ زخمی ہو گیا تھا۔ (عمدۃ القاری للعینی شرح بخاری ۷ اصفحہ نمبر ۱۵۵)

نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں قتل ہونے والا بد بخت:

اقبل ابی ابن خلف الجمحی وقد حلف لیقتلن محمدا فقال بل اناقتله یاکذاب این تفر فحمل علیه فطعنه فی جیب الدرع یخور خوار الثور فاحتملوه فلم یلبث الابعض یوم حتی راحت روحه الی الهاویة"

ابی بن خلف جمحی نے قسم اٹھائی کہ وہ ضرور بضرور محمد کو قتل کر دے گا، تو آپ نے فرمایا بلکہ میں ہی اسے قتل کروں گا، پھر آپ نے فرمایا اے کذاب (بڑے جھوٹے) کہاں بھاگ رہا ہے یہی کہتے ہوئے آپ نے اس پر حملہ کر دیا تو اس کی زرہ کے گریبان میں نیزہ مار دیا، وہ بیل کی طرح ڈکارنے لگ گیا، دوسرے کفار اسے اٹھا کر لے گئے کچھ دیر کے بعد ہی وہ مر گیا، اور اس کی روح جہنم کے مقام ہاویہ میں پہنچ گئی۔

اللہ کے شدید غضب کی وجہ:

"اشتد غضب الله"معناه ان ذلک من اعظم السیآت عنده ویجازی علیه"

اللہ تعالیٰ کا اس قوم پر شدید غضب ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اللہ کا نبی قتل کر دے اور اس قوم پر بھی اللہ تعالیٰ کا سخت غضب ہوتا ہے جو اللہ کے نبی کو زخمی کر دے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بد بختوں کا گناہ بہت بڑا ہوتا ہے اس لئے اس کی سزا بھی بہت بڑی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے شدید غضب سے بڑھ کر اور کیا سزا ہوگی؟

❁ حد ثنا قتیبة بن سعید حد ثنا یعقوب عن ابی حازم انه سمع سهل بن سعد وهو یسأل عن جرح رسول الله ﷺ فقال اما والله انی لا عرف من کان یغسل جرح رسول الله ﷺ ومن کان یسکب الماء وبما دووی قال کانت فاطمة علیها السلام بنت رسول الله ﷺ تغسله وعلی رضی اللہ عنہ یسکب الماء بالمجن فلما رأت فاطمة ان الماء لا یزید الدم الا کثرة اخذت قطعة من حصیر فاحر قتها و الصقتها فاستمسک الدم وکسرت رباعیته یومئذ وجرح وجهه وکسرت البیضة علی رأسه"

(بخاری کتاب المغازی باب ما اصاب النبی من الروح یوم احد)

ابو حازم کہتے ہیں میں نے سہل بن سعدؓ سے سنا جب ان سے رسول اللہ ﷺ کے زخموں کے متعلق پوچھا جا رہا تھا، تو وہ فرما رہے تھے، خبردار قسم ہے اللہ تعالیٰ کی بیشک میں جانتا ہوں کون نبی کریم ﷺ کے زخم کو دھو رہا تھا اور کون پانی بہا رہا تھا اس پر کیا دوا لگائی گئی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ زخموں کو دھو رہی تھیں اور حضرت علی اس پر ڈھال سے پانی بہا رہے تھے جب حضرت فاطمہ نے دیکھا کہ دھونے سے

خون زیادہ ہی بہہ رہا ہے (بند نہیں ہو رہا) تو آپ نے چٹائی کا ایک ٹکڑا جلا کر کر اس کی راکھ زخم پر اسے چپکا دیا تو خون رک گیا اور اس دن آپ کا ایک رباعیہ دانت ٹوٹ گیا تھا دانت ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ آپ کا سر بھی زخمی ہو گیا تھا۔

❁ عن معمر عن الزهری قال ضرب وجه النبی ﷺ یومئذ بالسیف سبعین ضربة وقاه الله شرها کلها" (رواه عبدالرزاق)

زھری رحمہ اللہ فرماتے ہیں احد کے دن نبی کریم ﷺ کے چہرے پر تلوار کی ستر ضربیں لگائی گئیں، لیکن اللہ تعالی نے آپ کو تمام کی شر سے محفوظ رکھا "قیل یحتمل ارادة حقیقة السبعین و المبالغة فی الکثرة" حدیث شریف میں جو ستر ضربوں کا ذکر ہے، اس میں دو احتمال ہیں، ایک تو یہ کہ ستر کی تعداد ہی معتبر ہو، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ کثرت معتبر ہو، کیونکہ اہل عرب ستر کو کثرت کے معنی میں بھی عام طور پر استعمال کرتے ہیں، اس صورت میں معنی ہوگا آپ کو کثیر ضربیں، تلوار کی لگائی گئیں، لیکن اللہ تعالی نے آپ کو تمام کی شر سے محفوظ رکھا۔ (عمدة القاری شرح بخاری ج ۱۷ صفحہ نمبر ۱۶۱)

روی عبد الرزاق مرسلا عن الزهری قال ضرب وجه رسول الله ﷺ سبعون ضربة بالسیف وقاه الله شرها کلها ورمی عتبة بن وقاص لعنه الله رسول الله ﷺ باربعة احجار فکسر منها رباعیته الیمنی السفلی وجرح شفته السفلی"

نبی کریم ﷺ کو عتبہ بن وقاص لعنہ اللہ نے چار پتھر مارے جس سے آپ کا نیچے والا دایاں ایک رباعیہ دانت مبارک ٹوٹ گیا، اور آپ کا نیچے والا ہونٹ مبارک زخمی ہو گیا۔ (منقول از مظہری)

خیال رہے کہ روایات میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ آپ پر پتھراؤ کرنے والا عبداللہ بن قمیئہ بھی تھا اور عتبہ بن وقاص بھی تھا۔

نبی کریم ﷺ اور پندرہ صحابہ کرام کی ثابت قدمی:

روی البیهقی عن المقداد والذی بعثه بالحق ما زال رسول الله ﷺ من مکانه شبرا واحدا وانه لقی وجه العدو وتفئی الیه طائفة من اصحابه وتفترق مرة فربما رأیته قائما یرمی عن قوسه ویرمی بالحجر وثبت مع رسول الله ﷺ خمسه عشر رجلا ثمانیة من المهاجرین ابو بکر وعمر وعلی وطلحة وزبیر وعبدالرحمن بن عوف وسعد بن ابی وقاص وابوعبیدة بن الجراح وسبعة من الانصار الحباب بن المنذر وابودجانة وعاصم بن ثابت والحارث بن صمة وسهل بن حنیف وسعد بن معاذ و قیل سعد بن عبادة ومحمد بن مسلمة ﷺ اجمعین"

بیہقی نے حضرت مقداد ﷺ سے روایت نقل کی وہ فرماتے ہیں قسم اس ذات کی جس نے نبی کریم ﷺ کو حق سے مبعوث فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ اپنی جگہ سے ایک بالشت بھی نہیں ہٹے، بیشک آپ دشمن کے سامنے جم کر کھڑے رہے، صحابہ کرام کا ایک گروہ لوٹ کر آتا، پھر وہاں سے ہٹ جاتا، (یعنی عجیب حیرانگی چھائی ہوئی تھی، صحابہ کرام کو معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ کیا کیا جائے) میں نے کئی مرتبہ رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ کھڑے ہیں اپنی قوس سے تیر چلا رہے ہیں، میں نے کئی مرتبہ آپ کو پتھر پھینکتے ہوئے دیکھا، آپ کے ساتھ پندرہ صحابہ کرام جم کر کھڑے رہے، آٹھ مہاجرین میں سے تھے، حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص اور ابوعبیدہ بن جراح، اور سات انصار سے تھے حضرت حباب بن منذر، حضرت ابودجانہ، حضرت عاصم بن ثابت، حضرت حارث بن صمہ، حضرت سہل بن بن حنیف، حضرت سعد بن معاذ، حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت محمد بن مسلمہ ﷺ اجمعین۔ (منقول از مظہری)

تنبیہ: یہ پندرہ صحابہ کرام جم کر کھڑے ہونے والے وہ ہیں جو ظاہری حیات میں قائم رہے، ورنہ شہید ہونے والوں کی اکثریت جم کر کھڑے ہونے والوں کو ہی تھی، حضرت مصعب بن عمیر ﷺ کا پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ آپ نبی کریم ﷺ کا دفاع کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ﴾ (سورہ الاحزاب آیۃ نمبر ۲۳)

''مسلمانوں میں کچھ وہ مرد ہیں جنہوں نے سچا کر دیا جو عہد اللہ سے کیا تھا تو ان میں اپنی منت پوری کر چکا'' اس آیہ کریمہ میں ان صحابہ کرام کا ذکر ہے جو جم کر کھڑے رہے اور شہید ہو گئے، اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا انس بن نضر جن کا ذکر پہلے شان نزول میں ہو چکا ہے، انہوں نے رب تعالیٰ سے کیا ہوا عہد اور مانی ہوئی منت کو کیسے پورا کیا، آیئے ذرا اس کی ایک جھلک دیکھئے۔

❁ اخبرنا حسان بن حسان حد ثنا محمد بن طلحة حد ثنا حميد عن انس رضي الله عنه ان عمه غاب عن بدر فقال غبت عن اول قتال النبي ﷺ لئن اشهدني الله مع النبي ﷺ ليرين الله ما اجد فلقي يوم احد فهزم الناس فقال اللهم اني اعتذر اليک مما صنع هؤلاء يعني المسلمين وابرأ اليک مما جاء به المشركون فتقدم بسيفه فلقي سعد بن معاذ فقال اين يا سعد اني اجد ريح الجنة دون احد فمضى فقتل فما عرف

حتی عرفته اخته بشامة او ببنانه وبه بضع وثمانون من طعنة وضربة ورمية بسهم"
(بخاری ج ۲ کتاب المغازی باب غزوۃ احد)

حضرت انس بن مالک ﷺ فرماتے ہیں میرے چچا (انس بن نضر) بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے، آپ کہتے ہیں میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ آپ کے پہلے غزوہ میں شریک نہیں ہو سکا، اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے نبی کریم ﷺ کے ساتھ کسی غزوہ میں حاضر ہونے کی توفیق عطاء فرمادی تو ضرور بر ضرور اللہ تعالیٰ دیکھے گا کہ میں کیا کوشش کرتا ہوں، غزوہ احد میں یہ شریک ہوئے لیکن لوگوں (مسلمانوں) کو وقتی طور پر کچھ پسپائی حاصل ہوگئی، انہوں نے عرض کیا اے اللہ بیشک میں تیرے حضور عذر پیش کرتا ہوں جو کام مسلمانوں سے سرزد ہوا، اور میں اس سے بری ہوں جو مشرکوں نے کیا، پھر آپ تلوار لے کر آگے بڑھے، حضرت سعد بن معاذ ﷺ سے ملاقات ہوگئی، اے سعد تم کہاں جا رہے ہو؟ میں تو احد کے قریب جنت کی بو پا رہا ہوں، پھر آپ نے دشمن سے مقابلہ کیا یہاں تک کہ شہید ہو گئے، آپ کو کوئی پہچان نہیں رہا تھا کہ یہ شہید ہونے والا کون ہے، یہاں تک کہ آپ کی بہن نے آپ کو نقوش اور انگلیوں کے پوروں سے پہچانا، اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کو اسی سے زائد زخم تلوار اور نیزے اور پتھروں کے آئے تھے۔

❁ رمی سعد بن وقاص حتی اندقت ستة قوسه ونثر رسول الله ﷺ كنانته فقال له ارم فداک ابی و امی" (رواه البخاری)

حضرت سعد بن ابی وقاص ﷺ نے احد کے دن اس ثابت قدمی سے تیراندازی کی کہ آپ کی چھ کمانیں ٹوٹ گئیں تھیں، نبی کریم ﷺ نے اپنی ترکش کے تمام تیران کے سامنے پھیلا دیئے، آپ نے فرمایا میرے ماں باپ تم پر قربان تیر مارو (یعنی اسی طرح بہادری سے دشمن کو تاک تاک کر تیر مارو)

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ﴾ "اور نہیں محمد ہیں مگر رسول۔"

"یعنی لیس هو ربا یستحیل علیه الفنا والموت وماهو یدعوا الناس الی عبادته"

یعنی وہ رب نہیں کہ ان کا انتقال نہ ہو سکے، وہ تو صرف رب تعالیٰ کی ذات ہے جو "حی قیوم" ہمیشہ کیلئے زندہ اور قائم دائم ہے وہ "حی لا یموت" وہ ہمیشہ کیلئے زندہ ہے اس پر موت نہیں آتی، نبی کریم ﷺ تو اللہ تعالیٰ کے بندہ ہیں، اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف لوگوں کو دعوت دینے والے ہیں، اس لئے آپ کا انتقال ہو سکتا ہے۔

قد خلت مضت وماتت من قبله الرسل فیسموت هو ایضا"

آپ سے پہلے رسول گذر چکے ہیں، یعنی ان کا وصال ہو گیا تو آپ کا وصال بھی ہو سکتا ہے۔

﴿اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ﴾

''کیا اگر آپ انتقال فرمائیں یا شہید کردیے جائیں تو تم پھر جاؤ گے الٹے پاؤں''

یہ سوال ''استفہام انکاری'' قانون کے مطابق ہے، یعنی اگر آپ انتقال فرما جائیں یا شہید ہو جائیں تو کیا تم پہلے کفر یہ دین کی طرف پھر جاؤ گے، جبکہ تمہیں معلوم ہے کہ آپ سے پہلے انبیاء کرام دنیا سے تشریف لے گئے، تو تمہیں ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے بلکہ دین اسلام پر تمہیں قائم رہنا ضروری ہے۔

﴿وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا﴾

''اور جو شخص الٹے پاؤں پھرے وہ ہرگز نہیں نقصان پہنچا سکے گا اللہ کو کچھ بھی''

یعنی کسی کے دین سے پھر جانے، العیاذ باللہ مرتد ہونے سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں، بلکہ اس شخص کا اپنا ہی نقصان ہے۔

﴿وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ﴾ ''اور عنقریب جزاء دے گا اللہ شکر کرنے والوں کو۔''

جو اللہ تعالیٰ کی نعمت یعنی اسلام پر ثابت قدم رہ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اجر و ثواب عطاء فرمائے گا۔
(تفسیر ماخوذ از مظہری)

اسم گرامی سے متعلق بحث:

الحمد الشکر والرضاء والجزاء وقضاء الحق والتحمید حمدالله مرة بعد مرة ومنه محمد کانه حمد مرة بعد مرة'' (القاموس)

شکر اور رضاء اور جزاء اور قضاء حق (حق کی ادائیگی) پر لفظ ''الحمد'' بولا جاتا ہے اور تحمید کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بار بار تعریف کی جائے، اسی سے لفظ محمد لیا ہوا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی بار بار تعریف کیے جانے کی کوئی انتہاء نہیں۔ (مظہری)

محمد هو المستغرق لجمیع المحامد لان الحمد لا یستوجبه الا الکامل، والتحمید فوق الحمد، فلا یستحقه الا المستولی علی الا مرفی الکمال واکرم الله نبیه وصفیه باسمین مشتقین من اسمه جل جلاله ''محمد واحمد''

حضرت محمد ﷺ تمام محامد (تعریفوں) کے جامع ہیں، کیونکہ حمد وہی معتبر ہے جو کامل ہو، اور تحمید حمد سے بھی اوپر درجہ رکھتی ہے، لفظ محمد تحمید سے لیا ہوا ہے، جب تحمید کیلئے ضروری ہے کہ وہ کامل امور پر مشتمل ہو تو لفظ محمد جو آپ کا

اسم گرامی ہے وہی آپ کے کمالات کو واضح کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو دو نام وہ عطاء فرمائے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اسم گرامی محمود سے مشتق فرمائے ہیں، آپ کے وہ دو اسم گرامی محمد اور احمد (ﷺ) ہیں۔ حضرت حسان ﷺ نے کیا خوب فرمایا:

الم تر ان الله ارسل عبده ببرهانه والله اعلى وامجد

وشق له من اسمه ليجله فذوا العرش محمود وهذا محمد"

کیا تم نے دیکھا نہیں بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو بھیجا۔ برہان (دلائل ومعجزات) عطاء کر کے اللہ بلند اور بزرگ ہے اور اس نے اپنے نام سے آپ کا نام مشتق کیا ہے تاکہ آپ کو بزرگی عطاء کرے، صاحب عرش محمود ہے اور یہ محمد ہیں۔
(ماخوذ از معالم التنزیل للبغوی)

نبی کریم ﷺ کے باپ تو آپ کی ولادت سے پہلے ہی انتقال فرما گئے تھے، آپ کی ولادت کے ساتویں روز آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کا نام محمد رکھا "ولما سئل عن ذلك قال لرؤية رآها رجوت ان يحمد في السماء والارض" جب آپ سے سوال کیا گیا کہ آپ نے اپنے پوتے کا یہ نام کیوں رکھا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے خواب میں یہی دیکھا کہ میں اپنے پوتے کا یہ نام رکھوں، مجھے امید ہے کہ اس کی تعریف زمین وآسماں میں زیادہ سے زیادہ ہوتی رہے گی "محمد" کا معنی جب یہ ہے کہ جس کی بار بار تعریف کی جائے، زیادہ سے زیادہ تعریف کی جائے اور وہ تعریف کبھی ختم نہ ہو، لفظ محمد کی ضد لفظ مذمم ہے، قریش کے کافر لوگ نبی کریم ﷺ کو "معاذ اللہ" گالیاں دیتے تھے لیکن مذمم کہہ کر گالیاں دیتے تھے، وہ اپنی زبان کو تو سمجھتے تھے، انہیں یہ معلوم تھا کہ محمد کہہ کر گالیاں نہیں دی جاسکتیں، میرے پیارے مصطفیٰ ﷺ نے رب تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا "الم تروا كيف صرف الله تعالى عنى لعن قريش وشتمهم يشتمون مذمما وانا محمد" کیا تم دیکھتے نہیں ہو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے قریش کی گالیوں کو کس طرح پھیرا ہوا ہے، وہ گالیاں دیتے ہیں مذمم کو میں تو محمد ہوں (یعنی میں مذمم نہیں کہ ان گالیوں کی زد میں آؤں) (روح المعانی)

ﷺ وعن ابى هريرة قال قال رسول الله ﷺ الا تعجبون كيف يصرف الله عنى شتم قريش ولعنهم يشتمون مذمما ويلعنون مذمما وانا محمد" (رواہ البخاری، مشکوۃ باب اسماء النبی ﷺ)

"وقد جمع هذا الاسم الكريم من الا سرار مالا يحصى" یہ اسم گرامی اتنے راز اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے جو شمار میں نہیں آسکتے، یہ اسم گرامی نبی کریم ﷺ کے سیدالانبیاء ہونے پر بھی دلالت کر رہا ہے، آپ کے متعلق یہ بھی کلام قدیم یعنی قرآن پاک میں بیان کیا گیا ﴿اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ﴾ بیشک آپ مرسلین سے ہیں، پھر آپ کا نام بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی آپ کے دادا کو القاء کیا گیا یعنی آپ کے دل میں ڈالا گیا

کہ آپ کا نام محمد رکھا جائے تو اسی سے واضح کر دیا کہ جس کا نام ہی محمد (ﷺ) ہے وہ سب انبیاء کرام سے افضل ہے اور سب کا سردار ہے کیونکہ زمین و آسمان میں اس کی سب سے زیادہ تعریف ہو رہی ہے، اس کی تعریف خود انبیاء کرام بھی کر رہے ہیں، پھر آپ کا افضل الانبیاء ہونا اور سید الانبیاء ہونا واضح ہو گیا۔

"وعبر عنه ﷺ بهذا الاسم هنا لانه اول اسمائه واشهر وبه صرخ الصارخ"

یہاں زیر بحث آیہ کریمہ میں بھی تمام رسولوں کا ذکر فرمایا ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ اور آپ کا اسم گرامی بھی ذکر فرمایا ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ﴾ میں یہ نام آپ کا سب سے پہلے رکھا گیا، آپ کے اسماء میں سے بھی پہلا ہے اور تمام ناموں میں سے بھی آپ کا نام پہلا ہے کیونکہ اس سے پہلے کسی شخص کا نام محمد نہیں تھا، آپ کا نام تو غیبی آواز دینے والے نے آپ کے دادا کو آواز دے کر بلکہ چلا چلا کر کہا کہ اس بچے کا نام محمد (ﷺ) رکھا جائے، اس سے واضح ہو رہا ہے کہ آپ افضل الانبیاء ہیں۔ (ماخوذ از روح المعانی)

تنبیہ: روح المعانی نے ایک جگہ ذکر فرمایا "**ولما سئل عن ذلک قال لرؤية رآها**" آپ کے دادا سے پوچھا گیا کہ آپ نے یہ نام اپنے پوتے کا کیوں رکھا؟ تو آپ نے فرمایا کہ مجھے خواب میں یہی حکم دیا گیا کہ میں یہی نام رکھوں، اور دوسری جگہ یہ فرمایا "**وبه صرخ الصارخ**" یہی نام غیبی طور آواز سے رکھنے کا حکم دیا گیا، ان دونوں میں تطبیق بظاہر نظر نہیں آتی، تو اس کا ایک جواب یہ ہے کہ حقیقت میں خواب میں ہی آپ کو یہ نام رکھنے حکم دیا گیا تھا "**وبه صرخ الصارخ**" کا مطلب یہ ہے کہ غزوہ احد میں آواز دینے والا، چلانے والا چلا کر یہ کہہ رہا تھا "**قد قتل محمد**" محمد شہید کر دیئے گئے، اب دونوں جملوں کا علیحدہ علیحدہ مطلب بیان کر دیا گیا، لیکن **راقم** کا موقف "شروح احادیث میں مختلف الفاظ کو دیکھ کر" یہ ہے کہ آپ کے دادا کو خواب میں بھی یہ نام رکھنے کا حکم دیا گیا، اور آپ کے دل میں القاء بھی کیا گیا، اور غیبی آواز دینے والے نے بھی یہ کہا کہ یہ نام رکھا جائے، اسی وجہ سے "**وبه صرخ الصارخ**" کا **راقم** نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

قال عباس بن مرداس:

اخاتم الانبياء انک مرسل بالخير کل هدى السبيل هدا کا

ان الاله نبى عليک محبة فى خلقه ومحمدا اسما کا

عباس بن مرداس نے کہا، اے خاتم الانبیاء بیشک آپ کو بھیجا گیا، خیر عطاء کر کے اور آپ کو تمام سیدھے راستوں کا ہادی بنایا گیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ کی محبت ڈال دی تمام مخلوق میں اور آپ کا نام محمد رکھا۔ (ماخوذ از قرطبی)

عن جبیر بن مطعم قال سمعت النبیﷺان لی اسماء انا محمدوانا احمد وانا الماحی الذی یمحو اللہ بی الکفر وانا الحاشر الذی یحشر الناس علی قدمی وانا العاقب والعاقب الذی لیس بعدہ نبی" (بخاری ومسلم ؛مشکوۃ باب اسماء النبیﷺ)

حضرت جبیر بن مطعم ﷺ فرماتے ہیں، میں نے نبی کریم ﷺکوفرماتے ہوئے سنابیشک میرے کئی نام ہیں، میں محمد ہوں اور میں احمد ہوں،اور ماحی ہوں کہ میرے ذریعے اللہ تعالی کفر کو مٹاتا ہے،اور میں حاشر ہوں کہ لوگ میرے قدموں پر(میرے پیچھے تابع ہو کر)جمع کئے جائیں گے،اور میں عاقب (آخری نبی)ہوں کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

"وسیحمدہ الاولون والآخرون فی المقام المحمود تحت اللواء الممدود"

نبی کریم ﷺ کی تعریف سب اولین وآخرین مقام محمود میں لواء الحمد کے نیچے کریں گے۔(مرقاۃ ج۱۱صفحہ نمبر۱۷)

دینی طلباءکرام کے فائدہ کیلئے:

﴿وَمَامُحَمَّدٌ اِلَّارَسُوْلٌ﴾ میں قصر قلب پایا گیا ہے،اس میں منافقین کارد پایا گیا ہے، کیونکہ انہوں نے ضعیف الاعتقاد نئے اسلام قبول کرنے والوں کوکہا"ان کان محمد قتل فارجعوا الی دینکم ودین آباء کم" اگرمحمد شہید ہو گئے ہیں تو اپنے پہلے دین کی طرف لوٹ جاؤ جوتمہارے آباءاجداد کا دین ہے،تورب تعالی نے ان کا اس آیۃ کریمہ کے ذریعے ردفرمایا کہ تم محمد ﷺکومعبود سمجھ رہے ہو کہ ان کا وصال نہیں ہونا یہ غلط ہے بلکہ وہ تو اللہ تعالی کے عبد (بندہ ہیں)ان پر وفات آسکتی ہے،(اسی کوقصر قلب کہا جاتا ہے) (صاوی)

فافادان محمدا عبد مرسل یجوز علیہ الموت لا رب معبود حتی تترک عبادۃ اللہ عنہ اجل موتہ لان المقصود من وجودہ تبلیغ رسالۃ ربہ ولذلک نزل قرب وفاتہ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا ولکن یجب علینا تعظیمہ واحترامہ حیا ومیتا واعتقاد ان معجزاتہ باقیۃ واتباعہ وطاعتہ قال تعالی من یطع الرسول فقد اطاع اللہ ولم یقل وھو حی وقال تعالی(وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ) ولم یقل لاصحابک وقال علیہ الصلوۃ والسلام حیاتی خیر لکم ومماتی خیرلکم ممن اعتقد ان النبیﷺ لا نفع بہ بعد الموت بل ھو کاحادالناس فھوالضال المضل" (صاوی)

اسی سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوگیا کہ بیشک حضرت محمد مصطفیٰ ﷺاللہ کے بندہ اور رسول ہیں،آپ رب اور

معبود نہیں کہ آپ کے وصال کی وجہ سے اللہ تعالی کی عبادت کو ہی چھوڑ دیا جائے، آپ کو موجود کرنے یعنی آپ کو دنیا میں مبعوث کرنے (رسول بنا کر بھیجنے) میں مقصود یہ تھا کہ آپ اپنے رب تعالی کے پیغامات بندوں تک پہنچائیں، اسی وجہ سے آپ کے وصال کے قریب رب تعالی نے ارشاد فرمایا ''آج میں نے مکمل کر دیا تمہارے لئے تمہارا دین، اور میں نے پسند کرلیا ہے تمہارے لئے اسلام کو دین، لیکن ہم پر لازم ہے کہ آپ کی ہم تعظیم کریں، آپ کی ظاہری حیات میں جن خوش بخت مسلمانوں نے آپ کو پایا ان پر اپنی تمام زندگی میں لازم تھا آپ کی تعظیم واحترام کرنا، آپ کے وصال کے بعد بھی مؤمنین پر لازم ہے کہ وہ زندگی بھر آپ کی تعظیم واحترام کریں، اور کہ عقیدہ رکھیں کہ آپ کے معجزات باقی ہیں اور آپ کی اتباع اور اطاعت کرنا ہمیشہ کیلئے باقی ہے، اس لئے کہ اللہ تعالی نے فرمایا ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ جس شخص نے (اللہ کے) رسول کی اطاعت کی تحقیق وہ اللہ کا مطیع (فرمانبردار) ہوا''

اس ارشاد گرامی کو زندگی کی حالت سے مقید نہیں کیا کہ جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ان کی ظاہری حیات میں کی وہ اللہ کا مطیع ہوا، بلکہ اللہ تعالی نے یہ ارشاد مطلق فرمایا کہ جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی وہ اللہ کا مطیع ہوا، یعنی خواہ آپ کی ظاہری حیات میں آپ کی اطاعت کی یا وصال کے بعد آپ کی طاعت کی اور رب تعالی نے فرمایا ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ اور ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کیلئے'' اس آیۃ کریمہ میں بھی یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے تمہیں نہیں بھیجا مگر تم اپنے اصحاب کیلئے رحمت ہو، جب یہ نہیں کہا، بلکہ یہ فرمایا کہ آپ تمام جہانوں کیلئے رحمت ہیں، جب آپ تمام جہانوں کیلئے رحمت ہیں تو تمام جہانوں پر لازم ہے کہ وہ آپ کی فرمانبرداری کریں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''**حیاتی خیرلکم ومماتی خیرلکم**'' میری حیات تمہارے لئے بہتر ہے اور میری وفات تمہارے لئے بہتر ہے، اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ نبی کریم ﷺ اپنے وصال کے بعد نفع نہیں پہنچا سکتے، بلکہ آپ عام لوگوں کی طرح ہی ایک فرد ہیں تو وہ شخص خود بھی گمراہ ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے والا ہے۔

(صاوی)

قصر افراد کا قول صاحب مفتاح نے کیا ہے کہ یہ خلاف مقتضی ظاہر ہے کہ جب انہوں نے آپ کی عدم بقاء کو بعید سمجھا تو گویا کہ انہوں نے آپ کے وصال کو بعید سمجھتے ہوئے انکار کا درجہ حاصل کیا، جیسے کوئی انکار کردے کہ یہ نہیں ہو سکتا ''**کانهم اعتقدوا فيه وصفين الرسالة والبعد عن الهلاک فقصر على الرسالة نفيا للبعد عن الهلاک**'' گویا کہ انہوں نے یہ اعتقاد رکھا تھا کہ آپ کو دو وصف حاصل ہیں، ایک رسالت اور دوسرا وصال کا نہ ہونا، تو ایک وصف پر اسے بند کردیا کہ آپ تو صرف رسول ہیں، آپ کے وصال نہ ہونے کی بات درست نہیں، یہ قصر افراد ہے۔

(روح المعانی)

طلباء کرام خلاصہ کلام یوں یاد کریں:

جب یہ عقیدہ رکھا جائے کہ آپ کا وصال نہیں ہوسکتا تو اس کے جواب میں یہ کہا جائے ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ﴾ یعنی جب آپ رب نہیں بلکہ آپ رسول ہیں آپ پر وفات آسکتی ہے تو یہ قصر قلب ہے، خیال رہے کہ اس قول میں نفی رسالت نہیں، بلکہ عقیدہ آپ کے وصال کے نہ ہونے کا تھا، جب آپ کے وصال کو ثابت کیا گیا تو قصر قلب ہوا، اس میں یہ اعتراض لغو ہوگا کہ قصر قلب میں تو نفی رسالت کا عقیدہ لازم آئے گا۔

اور اگر عقیدہ یہ ہو کہ آپ رسول بھی ہیں لیکن پھر بھی آپ کے وصال کے نہ ہونے کا اعتقاد باطل ہے اس مشکل مسئلہ کو طلباء آسان لفظوں میں یوں سمجھیں کہ جب کوئی کہے کہ میرا یہ کام حامد نے کیا ہے تو زاہد یہ کہے کہ یہ کام تو میں نے ہی کیا ہے (حامد نے نہیں کیا) یہ قصر قلب ہے، اور اگر کوئی یہ کہے کہ میرا یہ کام حامد اور زاہد نے مل کر کیا ہے تو اس کے جواب میں جب حامد یہ کہے کہ یہ کام تو صرف میں نے کیا ہے میرے ساتھ زائد شریک نہیں تھا تو یہ قصر افراد ہے۔

نبی کریم ﷺ کے وصال کے وقت اسی آیۃ کریمہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا استدلال:

نبی کریم ﷺ کا جب وصال ہوا تو کچھ لوگ کہنے لگے آپ پر وفات طاری نہیں ہوئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی یہی کہہ رہے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ گم سم ہو گئے، کچھ کہہ نہیں رہے تھے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ لوگوں سے مخفی ہو گئے، جب صحابہ کرام کی پریشانی کا یہ عالم تھا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مقام سُنُخ سے یعنی مدینہ طیبہ کے باہر مقام میں تھے وہاں سے آئے تو آپ نے اسی آیۃ کریمہ سے دلیل پیش کی کہ آپ کا وصال ہو گیا، بخاری میں یہ حدیث اختصار سے پیش کی گئی، ابن ماجہ میں تفصیلاً ذکر ہے، دیکھئے۔

❁ عن عائشہ رضی اللہ عنہما قالت لما قبض رسول اللہ ﷺ وابوبکر عندامرأته ابنة خارجة بالعوالی فجعلوا یقولون لم یمت النبی ﷺ انما ھو بعض ما کان یاخذ عندالوحی ،فجاء ابو بکر فکشف عن وجهه وقبل بین عینیه وقال انت اکرم علی اللہ من ان یمیتک مرتین،قد واللہ مات رسول اللہ ﷺ وعمر فی ناحیة المسجد یقول واللہ مامات رسول اللہ ﷺ ولا یموت حتی یقطع ایدی اناس من المنافقین کثیر وار جلھم،فقام ابوبکر فصعد المنبر فقال:من کان یعبداللہ فان اللہ حی لم یمت ومن کان یعبد محمدا فان محمدا(وَمَامُحَمَّدٌ اِلَّارَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ

شَيْـًٔاوَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ)قال عمر فلكأني لم اقرأها الا يومئذ" (رواه ابن ماجة)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب نبی کریم ﷺ کی روح قبض ہوگئی، تو اس وقت حضرت ابوبکر صدیق ﷜ مدینہ طیبہ کے باہر اطراف میں اپنی زوجہ بنت خارجہ کے پاس موجود تھے، لوگ کہہ رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ پر وفات طاری نہیں ہوئی، بلکہ آپ پر وحی کی کیفیت طاری ہے (کیونکہ وحی کی صورت میں آپ پر کبھی غنودگی طاری ہوتی جو بیہوشی کی طرح ہوتی) حضرت ابوبکر ﷜ آئے تو آپ نے نبی کریم ﷺ کے چہرے سے کپڑا ہٹایا، اور آپ کی آنکھوں کے درمیان بوسہ کیا، اور عرض کیا کہ آپ اللہ تعالی کے ہاں مکرم ہیں کہ وہ آپ کو دو مرتبہ وفات عطاء فرمائے (یعنی آپ پر فقط آن کی آن میں وفات طاری ہوئی پھر آپ ہمیشہ زندہ ہوگئے) آپ نے فرمایا قسم ہے اللہ تعالی کی رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو چکا ہے، ادھر حضرت عمر ﷜ مسجد کی ایک طرف کہہ رہے تھے قسم ہے اللہ تعالی کی رسول اللہ ﷺ پر وفات طاری نہیں ہوئی، اور نہ ہی آپ کو فوت کیا جائے گا، اگر منافقین نے یہ کہا کہ آپ فوت ہوگئے تو ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں گے (حضرت ابوبکر ﷜ مسجد میں آگئے) آپ کھڑے ہوئے، پھر منبر پر تشریف لے آئے، اور فرمایا جو شخص اللہ تعالی کی عبادت کرتا ہے تو بیشک اللہ تعالی زندہ ہے، وہ فوت ہونے سے پاک ہے، اور جو شخص محمد ﷺ کی عبادت کرتا ہے تو وہ فوت ہو چکے ہیں، پھر آپ نے یہی آیۃ کریمہ بطور دلیل پیش کی ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔاوَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ﴾ حضرت عمر ﷜ فرماتے ہیں (میری پریشانی کا یہ عالم تھا) کہ میں نے گویا کہ یہ آیۃ کریمہ پڑھی ہی نہیں، اب حضرت ابوبکر ﷜ سے سن رہا ہوں۔

وائلی ابونصر عبیداللہ نے اپنی کتاب "الابانۃ" میں ذکر کیا "ورجع عن مقالته التي قالها" حضرت عمر ﷜ جو یہ فرما رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ کا نہ وصال ہوا اور نہ ہوگا، اس قول سے آپ نے رجوع فرمالیا، وائلی کی مکمل روایت دیکھئے۔

❁ عن انس بن مالک انه سمع عمر بن الخطاب حين بويع ابو بكر في مسجد رسول الله ﷺ واستولى على منبر رسول الله ﷺ تشهد قبل ابي بكر فقال اما بعد فاني قلت لكم امس مقالة وانها لم تكن كما قلت، واني والله ما وجدت المقالة التي قلت لكم في كتاب انزله الله ولا في عهد عهده اليّ رسول الله ﷺ ولكني كنت ارجو ان يعيش رسول الله ﷺ حتى يدبرنا، يريدان يقول حتى يكون آخرنا موتا، فاختار الله عزوجل رسوله الذي عنده على الذي عندكم، وهذا الكتاب الذي هدى الله به رسوله

فخذوا به تهتدوا لما هدی له رسول اللهﷺ"

حضرت انس بن مالک ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر ﷺ سے سنا، جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نبی کریم ﷺ کی مسجد میں بیعت کی گئی تو حضرت عمر ﷺ نے ان سے پہلے شہادتین پڑھیں، پھر آپ نے کہا "اما بعد" بیشک میں نے کل تمہیں کہا تھا، لیکن ایسے نہیں تھا جیسے میں نے کہا، بیشک میں نے اپنی بات کو کتاب اللہ میں نہیں پایا، اور نہ ہی میرے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے اس قسم کا کوئی وعدہ فرمایا تھا، لیکن میں امید رکھتا تھا کہ آپ ظاہری حیات میں ہم میں موجود رہیں گے، لیکن آپ ہمیں پیچھے چھوڑ کر تشریف لے گئے، ہمارے ارادہ میں یہ تھا کہ آپ ہم سب کے بعد تشریف لے جائیں گے، لیکن وہ ذات کریم جو ہم میں موجود تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے ہاں پسند کر لیا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب جو کہ رسول اللہ ﷺ کیلئے بھی ہدایت تھی اسی کے مطابق تم عمل کرو تا کہ رسول اللہ ﷺ کی ہدایت پر تم قائم رہو۔

یعنی صحابہ کرام اتنی پریشانی میں مبتلاء ہو گئے تھے کہ ان کو یہ آیۃ کریمہ، اور دوسری آیات جن میں وفات کا ذکر ہے ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ اور ﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ﴾ گویا کہ ان کو بھول ہی گئی تھیں، یوں سمجھ آرہا تھا کہ وہ پہلی مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق ﷺ سے سن رہے ہیں" وخرج الناس یتلونها فی سکک المدینة کانها لم تنزل قط الا ذلک الیوم" لوگ مدینہ طیبہ کی گلیوں میں ان آیات کو یوں پڑھ رہے تھے کہ پتہ چل رہا تھا کہ یہ آج ہی نازل ہوئی ہیں ایسے وقت میں جب کہ تمام صحابہ کرام کے حوصلہ پست ہو گئے تھے، اس وقت حضرت ابوبکر ﷺ نے بہادری اور علم سے کام لیتے ہوئے یہ آیۃ کریمہ پڑھ کر تمام کو مطمئن کر دیا "هذا الآية ادل دلیل علی شجاعة الصدیق وجرأته" تو یہ آیۃ کریمہ حضرت ابوبکر صدیق ﷺ کی شجاعت اور جرأت پر دلالت کر رہی ہے، کامل شجاعت و جرأت وہی ہوتی ہے جو مصائب کے وقت دل مطمئن رہے، نبی کریم ﷺ کے وصال سے بڑھ کر اور بڑی مصیبت کیا ہو سکتی تھی، حضرت ابوبکر صدیق ﷺ کا اپنے دل کو مطمئن رکھنا آپ کی شجاعت جرأت کی وجہ سے ہی تھا۔ (ماخوذ از قرطبی)

نبی کریم ﷺ کو موت و حیات میں اختیار دیا گیا، آنے والی احادیث مبارکہ مشکوۃ کے باب الکرامات کے بعد باب سے ذکر کی جارہی ہیں مشکوۃ میں صرف ''باب'' لکھا گیا ہے عنوان قائم نہیں کیا گیا البتہ مرقاۃ میں بیان کیا گیا ہے "فقیل المعنی هذا باب فی بیان هجرة اصحابه من مکة وبیان وفاته ﷺ" اور بعض نسخوں میں باب کا یہ عنوان قائم کیا گیا "باب ما یتعلق بموته ﷺ من المقدمات"

❁ عن ابی السعید الخدری ﷺ ان رسول الله ﷺ جلس علی المنبر فقال ان عبدا خیره الله بین ان یؤتیه من زهرة الدنیا ماشاء وبین ما عنده فاختار ما عنده فبکی ابو بکر قال

فدیناک بآبائنا وامهاتنا فعجبناله فقال الناس انظروا الی هذا الشیخ یخبر رسول اللهﷺ عن عبد خیره الله بین ان یؤتیه من زهرة الدنیا وبین ما عنده وهو یقول فدیناک بآبائنا وامهاتنا فکان رسول اللهﷺ هوالمخیر وکان ابو بکر اعلمنا"متفق علیه"

حضرت ابوسعیدؓ فرماتے ہیں، بیشک رسول اللہﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے ،تو آپ نے فرمایا''ایک بندے کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ وہ دنیا کے منافع حاصل کرلے جب تک چاہے، یا اسے پسند کرلے بندے کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ وہ دنیا کے منافع حاصل کرلے جب تک چاہے، یا اسے پسند کرلے جو اس کیلئے (مدارج اور نعمتیں) اللہ تعالیٰ کے ہاں ہیں، تو اللہ کے بندے نے اللہ تعالیٰ کے ہاں نعمتوں کو پسند کرلیا ہے، تو حضرت ابوبکرؓ رونے لگے، عرض کرنے لگے''ہمارے ماں باپ آپ پر قربان''ہمیں ان پر تعجب ہوا، لوگ کہنے لگے، اس شیخ کی طرف دیکھئے، نبی کریمﷺ ایک بندے کی خبر دے رہے ہیں کہ رب تعالیٰ نے اسے اختیار دیا ہے کہ چاہے تو وہ دنیا کی نعمتوں کو پسند کرلے اور چاہے تو آخرت کی نعمتوں کو پسند کرلے، اور یہ (شیخ رو رہے ہیں اور) کہہ رہے ہیں کہ ہمارے ماں باپ آپ پر قربان، حالانکہ نبی کریمﷺ نے اپنے متعلق ہی خبر دی تھی کہ آپ کو اختیار دیا گیا، حضرت ابوبکرؓ ہم سے زیادہ علم رکھنے والے تھے۔

حدیث پاک کی مختصر وضاحت:

حضرت ابوبکرؓ کے رونے کی وجہ آپ کی کامل سمجھ اور کامل علم تھا کہ آپ کو پتہ چل گیا تھا کہ اس مرض کی حالت میں نبی کریمﷺ کا یہ ارشاد گرامی آپ کے اپنے متعلق ہی ہے کہ آپ ہم سے جدا ہو رہے ہیں، نبی کریمﷺ کا یہ ارشاد مقدمات مراتب اولیاء سے تھا، کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو خصوصی مراتب سے نوازتا ہے، صرف اپنے وصال کی خبر اشارہ سے دینی مقصود نہیں تھی، بلکہ نبی کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ خبر واضح طور پر دے، راوی نے کہا کہ تعجب کر رہے تھے کہ یہ شیخ کہہ رہے ہیں''ہمارے ماں باپ آپ پر قربان''اور یہ کیوں رو رہے ہیں، یہ درحقیقت دوسرے لوگوں کا نبی کریمﷺ کے اشارہ کو نہ سمجھنا تھا، حضرت ابوبکرؓ کو شیخ کہنے کی دو وجہ تھیں، ایک آپ کی عمر کی زیادتی کہ آپ اس وقت اکاسٹھ سال کے تھے، اور دوسری وجہ آپ کی عقل اور فہم (سمجھ) کی زیادتی تھی''ان کبره المقتضی لو قاره وزیادة عقله وفهمه''آپ کی عمر کی زیادتی اور آپ علم وعقل کی زیادتی کا یہی تقاضا تھا کہ آپ کی عزت کرتے ہوئے آپ کیلئے لفظ شیخ (بزرگ) کا استعمال کیا جائے، آپ کے اس ارشاد گرامی کے بعد جلدی ہی آپ کا وصال ہو گیا تو لوگوں کو پتہ چل گیا کہ آپ کا ارشاد اپنے متعلق ہی تھا، حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے کامل علم کی وجہ سے اسے سمجھ رہے تھے جسے ہم نہیں سمجھ سکے۔ (مرقاۃ ج ۱۱ صفحہ نمبر ۲۳۶، ۲۳۷)

تمام انبیاء کرام موت وحیات میں مختار تھے:

❁ وعن عائشة قالت سمعت رسول الله ﷺ يقول ما من نبی يمرض الا خير بين الدنيا والآخرة وكان فی شكواه الذی قبض فيه اخذته بحة شديدة فسمعته يقول مع الذين انعمت عليهم من النبيين والصديقين والشهداء الصالحين فعلمت انه خير" (متفق عليه)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کوئی نبی نہیں کہ وہ مریض ہوں مگر یہ کہ انہیں دنیا اور آخرت (میں سے ایک) کا اختیار دیا جاتا ہے، جب آپ مریض ہوگئے جس مرض میں آپ کا وصال ہوگیا، اور آپ کو سانس کی شدید تکلیف ہوئی، تو میں نے آپ سے سنا کہ آپ فرمارہے تھے (ان لوگوں کے ساتھ جن پر تیرا انعام ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین) تو میں نے سمجھ لیا کہ آپ کو بھی اختیار دے دیا گیا ہے۔

(فعلمت انه خير) "الى بين القاء فی الدنيا وما عند الله فی الاخرى من لقاء المولى"

تو مجھے معلوم ہوگیا کہ آپ کو اختیار دے دیا گیا ہے یعنی چاہیں تو دنیا میں باقی رہیں، اور چاہیں تو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کریں، اور آخرت میں اس کے ہاں نعمتوں کی طرف تشریف لے جائیں۔ (مرقاۃ ج ۱۱ صفحہ نمبر ۲۴۰)

حدیث پاک میں استعمال الفاظ کی وضاحت:

(شكواه ای فی مرضه) كان فی شكواه کا معنی یہ ہے آپ اپنی مرض میں تھے۔

(بُحّة) کا معنی "غلظ الصوت وخشونته" آواز کو موٹا ہوجانا اور آواز کی سختی کا پیدا ہونا۔

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا "هی شئی يغوص فی الحلق فيغير له الصوت فيغلظ" کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی چیز گلے میں رک جائے جس کی وجہ سے اس کی آواز بدل جائے اور موٹی ہوجائے۔

"وقيل المراد هنا سعلة، ففی القاموس السعال والسعلة بضمهما وهی حركة تدفع بها الطبيعة اذى عن الرئة والا عضاء التی تتصل بها"

بعض حضرت نے کہا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ پھیپھڑوں کی تکلیف کی وجہ سے جو کھانسی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ (مرقاۃ ج ۱۱ صفحہ نمبر ۳۴۰)

مطلب سب کا وہی ہے جو راقم نے اپنے ترجمہ میں سب اقوال کو جمع کرلیا "آپ کو سانس کی تکلیف ہوئی"

مرض وصال میں نبی کریم ﷺ کی بے قراری کی وجہ:

وعن عائشة قالت ان من نعم الله علی ان رسول الله ﷺ توفی فی بیتی وفی یومی وبین سحری ونحری وان الله جمع بین ریقی وریقه عند موته دخل علی عبدالرحمن ابن ابی بکروبیده سواک وانا مسندة رسول الله ﷺ فرأیته ینظر الیه وعرفت من طبعه انه یحب السواک فقلت آخذه لک فاشار برأسه ان نعم فتناوله فاشتد علیه وقلت الینه لک فاشار برأسه ان نعم فلینته فامره وبین یدیه رکوة فیهاماء فجعل یدخل یدیه فی الماء فیمسح بهما وجهه وهویقول لا اله الا الله ان للموت سکرات ثم نصب یده فجعل یقول فی الرفیق الاعلی حتی قبض ومالت یده" (رواه البخاری)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک اللہ کی نعمتوں میں سے مجھ پر یہ (عظیم) نعمت تھی کہ نبی کریم ﷺ کا وصال میرے حجرہ میں ہوا، اور میرے دن (میری باری کے دن) میں ہوا، اور میرے سینہ اور میرے سینہ کے اوپر گلے کے ساتھ ہڈیوں کے درمیان آپ کا سر تھا اس حال میں آپ کا وصال ہوا (یعنی آپ نے میرے سینہ کے ساتھ سہارا لگایا ہوا تھا) اور آپ کی وفات کے وقت اللہ تعالی نے میرے اور آپ کے لعاب کو جمع فرمایا، میرے پاس (میرے بھائی) عبدالرحمٰن بن ابی بکر آئے ان کے ہاتھ میں مسواک تھی، میں نے نبی کریم ﷺ کو سہارا دیا ہوا تھا، میں نے آپ کو دیکھا کہ آپ میری طرف دیکھ رہے ہیں مجھے آپ کی طبیعت کے بارے میں علم تھا کہ آپ مسواک کو پسند کرتے ہیں، میں نے عرض کیا، میں آپ کیلئے کیا یہ مسواک لے لوں؟ آپ نے اپنے سر مبارک سے اشارہ فرمایا ہاں لے لو، آپ نے اسے اپنے منہ میں لیا لیکن وہ سخت تھی (اسے چبانا مشکل تھا) تو میں نے کہا کیا میں آپ کو نرم کردوں؟ آپ نے سر کے اشارہ سے فرمایا کہ ہاں لے لو، میں نے اس مسواک کو اپنے دانتوں سے نرم کیا اور آپ کے دانتوں پر اسے میں پھیرنے لگی (اس طرح میرا اور آپ کا لعاب جمع ہوگیا) آپ کے سامنے پانی کا ایک پیالہ تھا، آپ اپنے ہاتھوں کو پانی میں داخل کرتے، پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے چہرے پر پھیرتے، اور آپ یہ فرمار ہے تھے "لا الـه الا اللـه ان للموت سکرات" اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں، بیشک موت کے سکرات ہیں پھر آپ نے اپنا ہاتھ اٹھایا، اور آپ کے ہاتھ ڈھلک گئے (آپ کی برقراری کی وجہ یہی تھی کہ آپ رفیق اعلی یعنی اللہ تعالی سے ملنے کو بے قرار و بے تاب تھے۔

مختصر وضاحت حدیث:

جامع الاصول میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ابتدائی تکلیف سر کے درد سے شروع ہوئی، جبکہ آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

کے حجرہ میں تھے، پھر آپ کی تکلیف بڑھ گئی جب آپ کا وصال ربیع الاول میں پیر کے دن تھا، وقت چاشت کا تھا، آپ کا وصال دو ربیع الاول کو ہوا، یا بارہ ربیع الاول کو ہوا اگر چہ بارہ ربیع الاول والاقول زیادہ مشہور ہے، اور زیادہ حضرات کا بھی یہی قول ہے۔ لیکن تحقیق کی نظر سے پہلا قول زیادہ معتبر ہے کہ آپ کا وصال دو ربیع الاول کو ہوا، کیونکہ دو مسائل میں اتفاق ہے کہ آپ نے حج الوداع جب فرمایا تو ذی الحج جمعہ کا دن تھا، اور آپ کا جب وصال ہوا تو پیر کا دن تھا، ذی الحج کے بیس یا اکیس دن محرم اور صفر کے تیس تیس دن اور ربیع الاول کے اگر بارہ دن لئے جائیں تو کل دن ترانوے بنتے ہیں جب تمام چاند تیس تیس دن کے شمار ہوں لیکن ان میں ایک یا دو چاند انتیس کے ہیں اس طرح کل دن اکانوے ہوئے، جب نو ذی الحج جمعہ ہو تو اکانوے دنوں کے بعد بارہ ربیع الاول جمعرات کو بنتی ہے لہذا بارہ ربیع الاول کو پیر کے دن وصال والاقول تحقیق کے طور پر صادق نہیں آتا، اور دو ربیع الاول تک اکاسی دن بنتے ہیں، جب نو ذی الحج جمعہ ہو اور اس کے اکاسی دن بعد دو ربیع الاول پیر بنتا ہے لہذا تحقیقی قول آپ کے وصال کا دو ربیع الاول والا ہی ہے یہی وجہ ہے کہ چشتی اولیاء کرام کے درباروں میں آپ کا یوم وصال دو ربیع الاول کو منایا جاتا ہے، دربار عالیہ گولڑہ شریف "جو راقم کا پیر خانہ ہے" میں سید الاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ رحمہ اللہ کے دور سے لے کر آج تک اسی پر عمل ہو رہا ہے۔ (راقم)

"سکرات الموت" ای شدائد ومشقات عظیمة" سکرات موت کا معنی موت کے شدائد اور عظیم مشقت مراد ہے، ترمذی شریف "منکرات الموت او سکرات الموت" مذکور ہے، جو راوی کو شک ہے تاہم دونوں کا معنی ایک ہے "ثم نصب یدہ" پھر آپ نے اپنا ہاتھ دعاء کیلئے اٹھایا، یا آسمانوں کی طرف اشارہ کرنے کیلئے اٹھایا، پھر آپ نے دعاء فرمائی "بالرفیق الا علی" اے اللہ مجھے رفیق اعلی سے ملادے، رفیق اعلی سے مراد کیا ہے ؟اس کے کئی مطالب بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) اے اللہ مجھے انبیاء کرام سے ملادے۔ (۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ مجھے مقام محمود میں پہنچادے۔

(۳) تیسرا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ مجھے جنت میں پہنچادے۔ (۴) چوتھا مطلب یہ ہے کہ "رفیق اعلی" سے مراد اللہ تعالی ہے کہ اے اللہ مجھے اپنے آپ سے ملالے اس پر کچھ بحث ہے "وقیل الرفیق الا علی من اسمائہ تعالی من الرفق" یہ بیان کیا گیا ہے کہ "الرفیق الا علی' اللہ تعالی کے اسماء گرامی سے ہے، اور رفق سے ماخوذ ہے

"ثم رایت التور بشتی قال قد ذهب بعضهم فی الرفیق الا علی انه اسم من اسماء الله تعالی"
تور پشتی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ بعض حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ رفیق اعلی اللہ تعالی کے اسماء گرامی سے ہے۔

"قال الازهری غلط قائل وقوله ان الله رفیق لم یوجب اطلاق هذا الاسم علیه" ازہری نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالی کا نام رفیق نہیں، اس لئے اس پر رفیق کا اطلاق صحیح نہیں

"قال الفاضل الطیبی لم لا یجوز ان یستدل بهذا الحدیث علی اطلاق هذا الا سم علیه وما المانع"
علامہ طیبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ اس حدیث پاک سے اس پر دلیل پائی جاتی ہے کہ اللہ تعالی پر اس کا اطلاق صحیح ہے کوئی مانع موجود نہیں۔ (از مرقاۃ ج ۱۱ صفحہ نمبر ۲۳۹)

راقم نے اللہ تعالی کی صفات اور اسماء کے توقیفی ہونے یا غیر توقیفی ہونے کی بحث بہت تفصیل سے نجوم الفرقان کی جلد اول میں بیان کی ہے، ارباب ذوق وہیں دیکھیں، مسئلہ کو سمجھانے کیلئے صرف ایک فیصلہ کن بحث کو دوبارہ ذکر کر رہا ہوں۔

نکتہ: علامہ غزالی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ اسم اور چیز ہے، صفت اور، آپ نے فرمایا۔
"اسمی ومحمد واسمک ابو بکر فهذا من باب الا سماء واما الصفات فمثل هذا الانسان بکونه طویلا فقیها کذا و کذا"
میرا نام محمد ہے اور تمہارا نام ابوبکر ہے، اسے اسم کہا جاتا ہے، لیکن جب کہا جائے کہ یہ انسان لمبا ہے، یہ فقیہ ہے، زائد ہے، متقی ہے، سخی ہے وغیرہ یہ صفات ہیں۔
اذاعرفت هذاالفرق فیقال امااطلاق الاسم علی الله قال یجوزالا عندوروده فی القرآن والخبرو امالصفات فانه لا یتوقف علی التوقیف" (از تفسیر کبیر)
جب تمہیں اسم اور صفت میں فرق کا پتہ چل گیا تو اب یہ کہا جائے گا کہ اللہ تعالی کے اسماء تو وہی ہوں گے، جن کا ذکر قرآن پاک اور احادیث میں ہوگا، البتہ صفات اللہ تعالی کی بے حد ہیں، وہ توفیقیہ نہیں۔

اس بحث کے بعد واضح ہو گیا کہ اللہ تعالی پر بطور صفت "رفیق اعلی" کا اطلاق صحیح ہے، اب مسئلہ نکھر کر واضح ہو گیا کہ حقیقت میں بے قراری کی وجہ رب تعالی سے ملاقات تھی، کہ ملاقات میں تاخیر نہ ہو، بلکہ ملاقات جلدی ہو، اگرچہ بظاہر تکلیف، سردرد، اور کبھی کبھی بیہوشی کا طاری ہو جانا بھی تھا، جہاں تک آپ کی دعاء میں "اللهم اعنی علی منکرات الموت" یا "اللهم اعنی علی سکرات الموت" کے الفاظ ہیں، کہ اے اللہ میری امداد فرما منکرات موت پر اور سکرات موت پر، یہ تعلیم امت کیلئے دعاء تھی، اور رب تعالی کی قدرت اور اپنے عجز کا اظہار تھا۔ (راقم)

نبی کریم ﷺ کو اپنی وفات کا وقت معلوم تھا:

❁ وعن انس قال لما ثقل النبی ﷺ جعل یتغشاه الکرب فقالت فاطمة واکرب اباه فقال

لیس علی ابیک کرب بعد الیوم فلما مات قالت یا ابتاہ اجاب ربادعاہ،یا ابتاہ من جنة الفردوس ماواہ،یا ابتاہ الی جبریل ننعاہ فلما دفن قالت فاطمة یا انس اطابت انفسکم ان تحثوا علی رسول اللہ ﷺ التراب" (رواہ البخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، جب نبی کریم ﷺ پر بیماری شدید ہوگئی،تو آپ کو تکالیف نے ڈھانپ لیا،تو حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہما نے کہا، ابا جان پر کتنی ہی بڑی مصیبت آئی ہوئی ہے،تو آپ نے فرمایا کل تمہارے باپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی، جب آپ کا (دوسرے دن ہی) وصال ہوگیا تو حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے کہا "اے ابا جان آپ نے اپنے رب کے بلانے کو قبول کرلیا ہے" اے ابا جان جنة الفردوس آپ نے اپنا ٹھکانا بنالیا، اے ابا جان، ہم جبریل سے آپ کی وفات کا تذکرہ کرتے ہیں، جب آپ کو دفن کردیا گیا،تو آپ نے کہا "اے انس کیا تم لوگوں نے نبی کریم ﷺ پر مٹی ڈالنی پسند کرلی تھی۔

حدیث پاک کی مختصر وضاحت:

فقال لها لیس علی ابیک کرب بعد الیوم" یعنی ان الکرب کان بسبب شدة الالم ،وصعوبة الوجع وبعد هذا الیوم لا یکون ذلک لان الکرب کان بسبب العلائق الجسمانیة وبعد الیوم ینقطع العلائق الصوریة"

آپ کے ارشاد گرامی کہ "آپ کے باپ پر آج کے بعد کوئی مصیبت نہیں رہے گی" کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنے وصال کی خبر دے دی کہ آج ہی میرا وصال ہو رہا ہے، اس تکلیف کا تعلق درد کی شدت، اور مرض کی وجہ سے مشکل تکلیف ہے، جب وصال ہو جائے گا تو تکالیف خود بخود اٹھ جائیں گی ،یعنی صوری تکالیف ختم ہو جائیں گی، حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے نبی کریم ﷺ وصال پر الفاظ گرامی "یا ابتاہ اجاب ربا دعاہ، الخ" سے پتہ چلا کہ کسی کی وفات پر نوحہ کرنا تو منع ہے لیکن اظہار غم کی وجہ سے اس قسم کے الفاظ ذکر کرنا جائز ہے، جو آپ کے اظہار غم سے واضح ہو رہا ہے۔

(یا ابتاہ الی جبریل ننعاہ)ای نظهر خبر موته الیه من النعی،وفی الا زهار ای نبکی الیه وقیل نعزیه وقیل نخبرہ"

"ننعاہ" النعی سے لیا ہوا ہے، جس کا معنی ہوتا "موت کی خبر دینا" یعنی بے قراری میں آپ یوں کہہ رہی تھیں کہ ہم آپ کی وفات کی خبر کا اظہار جبریل سے کریں گے، کہ اے جبریل اب تمہارا وحی لانا ختم ہو چکا ہے، اور معنی

یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم اپنا رونا جبریل کو دکھائیں گے، اور معنی یہ بیان کیا گیا کہ ہم جبریل سے تعزیت کریں گے، اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم جبریل کو آپ کی وفات کی خبر دیں گے، یہ وہی معنی جو سب سے پہلے بیان کیا گیا ہے اس لحاظ پر کل تین معانی بیان ہوئے، ان تین میں سے بہتر کون سا معنی ہے، اس کے متعلق علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے یوں بیان کیا "اقول واوسطها اعلاها" میں کہتا ہوں ان تین معانی میں سے جو درمیان میں مذکور ہے وہی مراد لینا زیادہ بہتر ہے، وہ تعزیت ہے، خیال رہے کہ تعزیت کا معنی "کسی کو صبر دلانا" یعنی ہم خود بھی صبر سے کام لیں گے اور جبریل کو بھی صبر دلائیں گے، حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے آپ کے وصال پر مرثیہ کہا۔

ماذا علی من شم تربة احمد　　ان لا یشم مدی الزمان غوا لیا

کیا ہے اس پر جس نے نبی کریم ﷺ کی تربت کو سونگھا　　وہ نہیں سونگھے گا طویل زمانہ مصائب و آلام

صبت علی مصائب لو انها　　صبت علی الایام صرن لیا لیا

مجھ پر اتنی مصیبتیں ڈال دی گئیں اگر وہ دنوں پر ڈال دی جاتیں تو یقیناً وہ راتیں بن جاتیں

عن عائشه قالت لما قبض رسول الله ﷺ اختلفوا فی دفنه فقال ابو بکر سمعت من رسول الله ﷺ شیئا قال ما قبض الله نبیا الا فی الموضع الذی یحب ان یدفن فیه ادفنوه فی موضع فراشه" (رواه الترمذی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا، تو صحابہ کرام کا آپ کے دفن کے بارے میں اختلاف ہوا، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق کچھ سنا ہے، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی نبی کی روح کو قبض نہیں فرماتا مگر اسی جگہ پر جہاں وہ اپنے نبی کے دفن ہونے کو پسند کرتا ہے، اسلئے آپ کو وہیں دفن کرو جہاں آپ روح کے قبض ہونے کے وقت تشریف فرما تھے۔

مختصر وضاحت حدیث:

"**اختلفوا فی دفنه ای فی موضع دفنه**" صحابہ کرام کا آپ کے دفن میں اختلاف ہوا کہ کس جگہ آپ کو دفن کیا جائے، بعض نے کہا آپ کو مکہ مکرمہ میں دفن کیا جائے، اور بعض نے کہا آپ کو اپنے جد امجد ابراہیم علیہ السلام کے پاس دفن کیا جائے "**او فی نفس الدفن**" اسی طرح صحابہ کرام پریشانی کی وجہ سے یہ فیصلہ بھی نہیں کر پا رہے تھے کہ آپ کو دفن بھی کرنا ہے یا نہیں۔

کما روی الترمذی فی الشمائل عن سالم بن عبید و کانت له صحبة قالوا لابی بکر یا

صاحب رسول اللهﷺایدفن رسول اللهﷺ؟قال نعم "قالوا این؟قال فی المکان الذی قبض الله فیه روحه فان الله لم یقبض روحه الا فی مکان طیب فعلموا انه قد صدق"

ترمذی نے شمائل (باب) میں سالم بن عبید کی روایت نقل کی کہ وہ صحابی تھے، صحابہ کرام نے حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا کیا نبی کریمﷺ کو دفن کیا جائے گا؟ آپ نے فرمایا ہاں دفن کیا جائے گا، پھر صحابہ کرام نے پوچھا آپ کو کہاں دفن کیا جائے گا؟ آپ نے فرمایا اسی جگہ میں جہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح کو قبض کیا، بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح کو نہیں قبض کیا مگر اسی جگہ میں جو پاکیزہ ہے، صحابہ کرام نے معلوم کرلیا، بیشک آپ نے سچ کہا ہے(فقال ابو بکر سمعت من رسول اللهﷺشیئا)ای ما نسیته) حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا میں نے اس کے متعلق رسول اللہﷺ سے کچھ سنا ہے، یعنی میں اسے بھولا نہیں "ما نسیته" کے الفاظ شمائل ترمذی میں موجود ہیں۔

(فقال ای رسول الله(ما قبض الله نبیا الا فی الموضع الذی یحب)ای النبی اویرید الله (ان یدفن)ای ذلک النبی فیه الی فی ذلک المکان"

رسول اللہﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نہیں قبض کرتا کسی نبی کی روح کو مگر اسی جگہ میں جسے وہ پسند کرتا ہو دفن کئے جانے کو، اس میں دو احتمال ہیں، ایک یہ وہ نبی جس جگہ دفن ہونے کو پسند کریں وہاں ان کی روح کو قبض کیا جاتا ہے، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ اس نبی کو یہاں دفن کیا جانا چاہیے وہاں روح کو قبض کیا جاتا ہے، حضرت ابوبکرؓ نے یہ حدیث بیان کرنے کے بعد صحابہ کرام کو کہا "ادفنوه فی موضع فراشه" نبی کریمﷺ کو وہاں ہی دفن کرو جہاں آپ کی چارپائی اور بستر تھے۔

اللہ تعالیٰ کا نبی جہاں فوت ہوتا ہے، وہاں ہی دفن کرنے کی حکمت یہ ہے کہ "لیکون شرف المکان بالمکین ویتشرف به اهل التمکن" اس جگہ کو اللہ کے نبی "جنہوں نے وہاں مکین ہونا ہے" سے شرف حاصل ہو جائے پھر مکان کی شرافت و برکت سے اس بستی کے تمام باشندوں کو برکت حاصل ہوتی ہے۔

اللہ کے نبی وصال سے پہلے اپنا مکان جنت میں دیکھ لیتے ہیں:

عن عائشه قالت کان رسول اللهﷺیقول وهو صحیح انه لن یقبض نبی حتی یری مقعده من الجنة ثم یخیر" الحدیث (منفوق علیه)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریمﷺ حالت صحت میں فرماتے تھے کہ ہرگز کسی نبی کی روح قبض نہیں کی جاتی یہاں تک کہ وہ اپنا مکان جنت میں دیکھ لیتے ہیں، پھر انہیں اختیار دے دیا جاتا ہے

(کہ جنت میں آنا چاہتے ہو یا دنیا میں رہنا چاہتے ہو، جسے چاہتے ہو پسند کرلو)

۞ وعن عائشه قالت كان رسول الله ﷺ يقول في مرضه الذي مات فيه يا عائشه ما ازال اجد الم الطعام الذي اكلت بخيبر وهذا اوان وجدت انقطاع ابهري من ذلك السم"

(رواه البخاري)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ اپنی اس مرض میں ارشاد فرماتے تھے جس میں آپ کا وصال ہوگیا کہ اے عائشہ میں ہمیشہ اس طعام کا درد پاتا رہا جو میں نے خیبر میں کھایا تھا میں اس وقت یہ سمجھتا ہوں کہ میرے دل کی رگیں اس زہر کی وجہ سے کٹ رہی ہیں۔

مختصر وضاحت:

خیبر میں ایک یہودیہ عورت نے آپ کو بکری کا زہر آلود گوشت دیا تھا، جو آپ نے معمولی یعنی ایک لقمہ تناول کرنے پر ہاتھ پیچھے کھینچ لیا تھا کہ اس گوشت نے میرے ساتھ کلام کیا ہے کہ میں زہر آلود ہوں، وہ جو ایک لقمہ گوشت کھایا تھا اس کا اثر لگاتار جاری رہا کہ آپ کو درد محسوس ہوتا رہا، یہاں تک کہ وصال کے وقت اس کا اثر زیادہ مقدار میں لوٹ کر آگیا، جس کی وجہ سے آپ کا وصال ہوگیا، اس طرح آپ کو درجہ شہادت حاصل ہوگیا۔ (از مرقاۃ باب صلوۃ النبی ﷺ)

(ابهری) بفتح الهمزة والهاء بينهما موحدة وهو عرق يتعلق به القلب" دل کے ساتھ رگ کو "ابھری" کہا جاتا ہے یہ رگ کٹ جائے تو انسان پر وفات طاری ہو جاتی ہے (السم) سین پر تینوں حرکتیں پڑھی جا سکتی ہیں ضمہ، فتحہ، کسرہ "والضم اشهر" پیش زیادہ مشہور ہے "والفتح اكثر"، لیکن اب تلفظ زیادہ زبر سے ہی ہو رہا ہے۔

(مرقاۃ ج ۱۱ صفحہ نمبر ۲۴۳)

نبی کریم ﷺ کی نماز جنازہ میں کوئی امام نہیں تھا:

یعنی آپ کی نماز جنازہ ہماری نماز جنازہ کی طرح نہیں تھی، بلکہ صحابہ کرام تھوڑی تعداد میں آتے اور آپ پر درود پاک اور دعاء پڑھ کر چلے جاتے۔

۞ قد خرج ابن ماجة باسناد حسن بل صحيح من حديث ابن عباس وفيه فلما فرغوا من جهازه يوم الثلثاء وضع على سريره في بيته، ثم دخل الناس على رسول الله ﷺ ارسالا يصلون عليه حتى اذا فرغوا ادخلوا النساء حتى اذا فرغن ادخلوا الصبيان ولم يؤم الناس على رسول الله ﷺ"

حضرت ابن عباس ﷺ کی حدیث جو ابن ماجہ نے سند حسن بلکہ سند صحیح سے تخریج کی اس میں یہ ذکر ہے کہ جب لوگ نبی کریم ﷺ کے کفن و دفن سے منگل کے دن فارغ ہوئے، تو آپ کو اپنے گھر چارپائی پر رکھ دیا گیا، لوگ تھوڑی تھوڑی تعداد میں آگے پیچھے آتے رہے اور درود پاک پڑھ کر واپس ہو جاتے، یہاں تک کہ جب سب مرد فارغ ہو گئے تو عورتوں کو اجازت دی گئی، جب وہ سب فارغ ہو گئیں تو بچوں کو اجازت دی گئی، رسول اللہ ﷺ پر (نماز جنازہ میں) کوئی امام نہیں تھا۔ (منقول از قرطبی)

امیر المؤمنین سیدنا علی المرتضی ﷺ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے جنازہ شریف پر کسی نے امامت نہیں کی کیونکہ آپ ایام حیات اور ممات میں سب کے امام ہیں، نبی کریم ﷺ کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ پر متعدد نمازیں پڑھی گئیں، اور تنہا تنہا لوگوں نے پڑھیں، ورنہ عام لوگوں کی ایک ہی نماز جنازہ ہے، اور وہ بھی جماعت سے یہ بھی خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیات پر دوسروں کو قیاس نہیں کیا جا سکتا، لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ نبی کریم ﷺ پر کون سی دعاء پڑھی جائے تو حضرت عبد اللہ بن مسعود ﷺ نے مشورہ دیا کہ حضرت علی ﷺ سے پوچھو، جب لوگوں نے آپ سے پوچھا، تو آپ نے فرمایا تم یہ دعاء پڑھو۔

"ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی یاایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما، اللھم ربنا لبیک وسعدیک صلوات اللہ البرا لرحیم والملائکۃ المقربین والنبیین والصدیقین والشھداء والصالحین واسبح لک من شئی یا رب العالمین علی محمد بن عبد اللہ خاتم النبیین وسید المرسلین وامام المتقین ورسول رب العالمین الشاھدالبشیر الداعی باذنک السراج المنیر وعلیہ السلام"

اس دعاء کو شیخ زین الدین مراغی نے اپنی کتاب تحقیق النصرۃ میں بیان کیا ہے۔ (مدارج النبوۃ ج ۲ حالات وصال)

نبی کریم ﷺ کی تدفین میں تاخیر:

نبی کریم ﷺ کا وصال دوشنبہ (پیر) کو ہوا اور سہ شنبہ (منگل) پورا دن گذر گیا، اور آپ کا تخت شریف آپ کے گھر میں رہا آپ کو چہار شنبہ (بدھ) کی رات کو دفن کر دیا گیا، وجہ اس کی یہ تھی کہ تمام لوگ آپ کی نماز جنازہ ادا کر لیں، یہاں تک کہ سب لوگ جب نماز ادا کر چکے تو پھر آپ کو دفنایا گیا۔

شیعہ کا اعتراض باطل ہے:

اہل تشیع کا یہ کہنا کہ صحابہ کرام نے حضور ﷺ کی نماز جنازہ ادا نہیں کی یہ بالکل لغو قول ہے، اور حقیقت سے دور

ہے، یہ ان کا قول باطل ہے اور کذب بیانی ہے، بلکہ آج کے شیعہ حضرات اپنی کتابوں سے ناواقف ہیں، آیئے شیعہ حضرات کی حدیث کی کتاب اصول کافی کو دیکھئے۔

عن ابی جعفر علیہ السلام قال قلت له کیف کانت الصلوة علی النبی ﷺ وانه قال لما غسله امیر المؤمنین علیہ السلام وکفنه سجاه ثم ادکل علیه عشرة تدار واحوله ثم وقف امیر المؤمنین علیہ السلام فی وسطهم وقال (اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا) فیقول القول کما یقول حتی صلی علیه وسلم اهل المدینة واهل العوالی" (اصول کافی)

حضرت جعفر علیہ السلام سے مروی ہے کہ میں نے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کی نماز جنازہ کیسے ادا کی گئی تھی؟ تو انہیں بتایا گیا کہ جب امیر المؤمنین علیہ السلام نے آپ کو غسل دیا اور کفن پہنا دیا اور ڈھانپ دیا تو دس آدمی آپ کے جسد مبارک کے پاس آئے اور ارد گرد پھرے، پھر امیر المؤمنین علیہ السلام ان کے درمیان کھڑے ہوئے اور پڑھا۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ قوم نے بھی یہی پڑھا جو امیر المؤمنین پڑھ رہے تھے یہاں تک کہ تمام اہل مدینہ نے پڑھا اور ارد گرد تمام دیہات والوں نے پڑھا۔

اہل تشیع کی اپنی ہی حدیث نے واضح کر دیا کہ حضور ﷺ کی نماز جنازہ تمام صحابہ کرام نے ادا کی۔

نبی کریم ﷺ کے وصال پر تغیر احوال:

عن انس قال لما قدم رسول الله ﷺ المدینة لعبت الحشبة بحرابهم فرحا لقد ومه رواه ابو داود، وفی ردایة الدرمی قال ما رأیت یوما قط کان احسن ولا رضوأ من یوم دخل علینا فیه رسول الله ﷺ وما رأیت یوما کان اقبح ولا اظلم من یوم مات فیه المدینة اضاء منها کل شئی فلما کان الیوم الذی مات فیه اظلم منها کل شئی وما نفضنا ایدیناعن التراب وانا لفی دفنه حتی انکرنا قلوبنا"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ میں آئے تو حبشہ کے لوگوں نے آپ کے تشریف لانے کی خوشی میں نیزہ بازی کا کھیل پیش کیا۔ (رواہ ابوداود)

دارمی کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا میں نے آج تک کوئی دن اتنا زیادہ حسین نہیں دیکھا، اتنا زیادہ روشن دن کوئی نہیں دیکھا اس دن سے جس دن سے ہمارے پاس (مدینہ طیبہ میں) تشریف لائے اور میں نے

کوئی دن اتنا برنہیں دیکھا اور نہ ہی اتنا تاریک دن کوئی دیکھا اس دن سے جس دن رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا، اور ترمذی کی روایت میں ہے کہ حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں جس دن نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے ہر چیز روشن ہوگئی، اور جس دن آپ کا وصال ہوا ہر چیز تاریک ہوگئی، اور ابھی ہم نے (آپ کے دفن کی) مٹی سے ہاتھ بھی نہیں جھاڑے تھے بلکہ ابھی آپ کے دفن میں مشغول تھے یہاں تک کہ ہمارے دلوں نے انکار کیا۔

نبی کریم ﷺ جس دن مدینہ طیبہ میں تشریف لائے وہ دن بہت حسین تھا "ای ازھر فی الخاطر" جو دل کو بہت زیادہ خوش کرنے والا تھا، اور بہت ہی زیادہ روشن تھا "ای فی نور الظاھر" اس سے مراد ظاہری نور ہے جس نور نے مدینہ طیبہ کی ہر چیز کو روشن کر دیا تھا "وھذا یدل علی ان الاضاءۃ کانت محسوسۃ" اس سے واضح طور پر پتہ چل رہا ہے کہ وہ روشنی محسوس ہو رہی تھی، اور جس دن آپ کا وصال ہوا وہ دن بڑا قبیح تھا "الی اسوا واحزن فی القلب" یعنی وہ دن دلوں کو غم میں ڈالنے والا اور بدحال کرنے والا تھا، اور اس دن مدینہ طیبہ کی ہر چیز تاریک ہو گئی، اس کی وجہ یہ تھی "فان نورہ شمس العالم الصوری والمعنوی" کہ نبی کریم ﷺ کا نور عالم صوری اور عالم معنوی کیلئے سورج کی حیثیت رکھتا تھا، جب وہ سورج ہی غروب ہو گیا تو ہر چیز نے تاریک ہونا ہی تھا۔

اعتراض: جب نبی کریم ﷺ کا نور عالم صوری اور عالم معنوی کیلئے سورج تھا، تو آپ کے وصال سے کل جہان کو تاریک ہو جانا چاہئے تھا، صرف مدینہ طیبہ کے تاریک ہونیکی تخصیص کیوں؟

جواب: "وتخصیص المدینۃ لکونھا اقرب لنسبۃ رؤیۃ الراوی انسب" مدینہ طیبہ کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ وہ قریب تھا، راوی نے اپنے دیکھنے کے لحاظ پر بیان کیا ہے، ورنہ حقیقت یہی ہے کہ آپ کے وصال سے کل جہاں غم اور پریشانی کی وجہ سے ظاہر طور پر تاریک ہو گیا تھا "حتی انکرنا قلوبنا" ابھی ہم نے نبی کریم ﷺ کے دفن کی مٹی سے ہاتھ بھی نہیں جھاڑے تھے کہ ہمارے دلوں نے انکار کیا۔

ای تغیرت حالنا بوفاۃ رسول اللہ ﷺ وظھور انواع الظلمۃ علینا ولم نجد قلوبنا علی کانت علیہ من انوار الصفاء الرقۃ والالفۃ فیما بیننا لا نقطاع مادۃ الوحی وفقد ان برکۃ صحبتہ والراکسیر حضور حضرتہ"

آپ کے وصال سے ہمارے حالات بدل گئے، اور ہم پر تاریکی کی انواع کا ظہور ہوا، ہمارے دلوں میں صفائی اور نرمی اور الفت کے انوار باقی نہ رہے، یعنی جو ہمارے درمیان الفت تھی وہ وحی کے آنے کے اختتام کی وجہ سے جاتی رہی، اور اس کی وجہ آپ کی صحبت کی برکت کا ختم ہو جانا تھا، آپ کے حضور

ہماری موجودگی کیلئے آپ کی برکت اکسیر اعظم کی حیثیت رکھتی تھی جو ختم ہوگئی۔

دینی طلباء کرام:

"حتی انکرنا قلوبنا" حدیث پاک میں ایسا جملہ وارد ہے کہ اگر اسے نہ سمجھا جائے تو ایمان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔

"قال التور بشتی یرید انهم لم یجدوا قلوبهم علی ما کانت علیه من الصفاء والالفة لانقطاع مادة الوحی وفقد ان ما کان یمدهم من الرسول الله ﷺ من التائید والتعلیم ولم یرد انهم لم یجدوها علی ما کانت من التصدیق"

تورپشتی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ "حتی انکرنا قلوبنا" (یہاں تک کہ ہمارے دلوں نے انکار کردیا) کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں جو صفائی اور الفت تھی وہ وحی کے ختم ہوجانے کی وجہ اس طرح نہ رہی جو پہلے تھی، کیونکہ پہلے نبی کریم ﷺ کی تائید سے اور آپ کی تعلیم سے صفائی قلب اور الفت بڑھتی رہتی تھی، آپ کے تشریف لے جانے سے اس کی کیفیت پہلے والی نہ رہی۔

ہاں ضرور توجہ کیجئے، اس کا مفہوم یہ نہیں کہ ہمارے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی تصدیق ہی ختم ہوگئی' میرے عزیز طلباء کرام! اگر یہ معنیٰ کرو گے تو صحابہ کرام کی طرف کفر منسوب کرو گے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اس سے تو اپنے ایمان سے ہاتھ دھونے لازم آئیں گے۔ (مرقاۃ ج ۱۱ صفحہ نمبر ۲۴۱ مع نصیحت طلباء از راقم)

❁ **وعن عائشه قالت ما ترک رسول الله ﷺ دینارا ولا درهما ولا شاة ولا بعیرا ولا وصی بشئی"** (رواه مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے نہ کوئی دینار چھوڑا اور نہ درہم اور نہ بکری اور نہ اونٹ اور نہ ہی کسی چیز کی آپ نے وصیت کی، دوسری روایت یہ ہے۔

"ذکروا عند عائشة رضی الله عنهاان علیا ﷺ کان وصیا فقالت متی اوصی الیه وقد کنت مسندله حتی مات"

صحابہ کرام نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی ﷺ کو خلیفہ مقرر کرنے کی کوئی وصیت فرمائی؟ تو آپ نے فرمایا کہ آپ نے کب وصیت فرمائی، میں نے آپ کو سہارا دیا ہوا تھا (یعنی آپ میرے سینہ سے سہارا لگائے ہوئے تھے) تو آپ کا وصال ہوگیا۔

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "متی اوصی" اور "لااوصی بشئی" کا یہ ہے۔

"لااوصی بثلث ما له ولا وغیره اذلم یکن له مال ولااوصی الی علی ولا الی غیره خلاف ما یزعمه الشیعة"

کہ آپ نے تہائی حصہ مال وغیرہ کی کوئی وصیت نہیں کی کیونکہ آپ کا مال ہی نہیں تھا، اور نہ ہی آپ نے حضرت علی ﷺ کیلئے کوئی وصیت کی اور نہ ہی کسی اور کیلئے آپ نے کوئی وصیت کی "ولا اوصی بشئی" کا جب مطلب واضح ہوگیا، اب یہ سمجھنا آسان ہوگیا۔

"واما الاحادیث الصیحة فی وصیته ﷺ بکتاب الله ووصیته لاهل البیت واخراج الیهود من جزیرة العرب واجازة الوفد فلیست مرادة بقولها ولا اوصی"

لیکن احادیث صیحہ میں جو نبی کریم ﷺ کی وصیت کا ذکر ہے کہ آپ نے کتاب اللہ کو لازم پکڑنے یعنی قرآن پاک کے مطابق عمل کرنے کی وصیت کی، اور اہل بیت کے ساتھ محبت کرنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے اور یہود کو جزیرہ عرب سے نکال دینے اور باہر سے آنے والے وفود سے اچھا سلوک کرنے کی آپ نے جو وصیت کی وہ "لااوصی بشئی" میں نہیں آتی کہ اس میں تو نفی مال کی وصیت کرنے اور خلیفہ نامزد کرنے کی ہے۔

"واما الارض التی کانت له ﷺ بخیبر وفدک فقد سلبها ﷺ فی حیاته وجعلها صدقة للمسمین"

لیکن وہ زمین جو نبی کریم ﷺ کی خیبر میں یا فدک کی زمین وہ آپ نے اپنی ظاہری حیات میں ہی مسلمانوں کیلئے وقف کی دی تھی۔

اعتراض: اہل سیر نے بیان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے کثیر تعداد میں اونٹ اور بیس اونٹنیاں تھیں جن کی صحابہ کرام مدینہ طیبہ کے باہر اطراف میں حفاظت کرتے تھے، اور ان کا دودھ رات کو آتا تھا، اور سات بکریوں اور سات بھیڑوں کا دودھ آتا تو "یشربون من البانها" وہ دودھ پیتے تو یہ کہنا کس طرح صحیح ہے کہ آپ کے وصال کے وقت آپ کے پاس کوئی مال نہیں تھا؟

جواب: "فلا یصلح لمعارضة هذا الحدیث الصحیح ولو صح لحمل علی انها کانت من ابل الصدقة وکان اصحابه الفقراء من اهل الصفة وغیرهم یشربون من البانها"

اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ جن احادیث میں مال کی نفی کا ذکر ہے وہ سند صحیح سے ثابت ہیں، جو اہل سیر نے بیان کیا ہے یہ احادیث صیحہ نہیں، اگر ان کا صحیح ہونا ثابت بھی ہو جائے تو پھر بھی نبی کریم ﷺ کی ملکیت ثابت نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ مال فقراء صحابہ کرام کے نفع حاصل کرنے کیلئے رکھا ہوا تھا، وہ دودھ پینے والے اہل صفہ تھے جو فقراء صحابہ کرام

تھے، جن کا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا بلکہ وہ فقط دین کے حاصل کرنے والے طلباء کرام تھے۔ (مرقاۃ ج۱۱ صفحہ نمبر ۲۵۴، ۲۵۵)

اب اس کے بعد بخاری کی ایک حدیث دیکھئے جو ماقبل بحث کی وجہ سے آسانی سے سمجھ آئیگی۔

❁ **عن عمر وبن الحارث (خی جویریة قال ما ترک رسول الله ﷺ عند موته دینارا ولا درهما ولا عبدا ولا امة ولا شیئا الا بغلته البیضاء وسلاحه وارضا جعلها صدقة"**

(رواہ بخاری)

عمرو بن حارث الخزاعی جو ام المؤمنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہما کے بھائی ہیں فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ اپنے وصال کے وقت نہ کوئی دینار چھوڑا اور نہ درہم اور نہ غلام اور نہ کنیز اور نہ کوئی اور چیز مگر سفید خچر اور ہتھیار اور زمین جن کو آپ نے صدقہ کر دیا، یعنی فقیر مسلمانوں کیلئے وقف کر دیا۔

مختصر وضاحت حدیث:

باقی روایات میں غلاموں اور کنیزوں کا ذکر نہیں تھا، اس میں وہ وضاحت بھی موجود ہے "**ففیه دلالة علی ان ماذکر من رقیق النبی ﷺ فی جمیع الاخبار کان اما مات واما اعتقه**" نبی کریم ﷺ کی ظاہری حیات میں آپ کے جن غلاموں اور کنیزوں کا ذکر ہے، ان میں سے کوئی پہلے ہی فوت ہو چکے تھے اور کچھ کو آپ نے وصال سے پہلے ہی آزاد کر دیا تھا۔

(جعلها صدقة) وضمیر جعلها راجع الی کل الثلاثة لا الی الارض فقط فانه ﷺ قال نحن معشر الانبیاء لا نورث ماتر کنا صدقة"

"جعلها" کی ضمیر تینوں کی طرف لوٹ رہی ہے، صرف "ارض" کی طرف نہیں لوٹ رہی، کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ہم انبیاء کرام کا گروہ جو مال چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا، ہماری کوئی وراثت تقسیم نہیں کی جاتی، مطلب یہ ہوا کہ آپ کی سفید خچر اور آپ کا اسلحہ اور زمین سبھی صدقہ کر دیا گیا۔

"**قال العسقلانی ای تصدق بمنفعة الارض فصار حکمها حکم الوقف**" علامہ عسقلانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ صدقہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ زمین کی منفعت صدقہ کی گئی، زمین کا وقف کا حکم رہا کہ اس کا کوئی مالک نہیں تھا، البتہ خاندان نبوت کو اس کا متولی بنا دیا گیا تھا۔

قبر کے سامنے سجدہ کرنے کی ممانعت:

نبی کریم ﷺ نے وفات سے پانچ دن پہلے فرمایا "جان لو اور آگاہ ہو جاؤ کہ تم سے پہلے ایسے لوگ گذرے ہیں

جنہوں نے انبیاء وصلحاء کی قبروں کو مساجد یعنی سجدہ گاہ بنالیا تھا، تمہیں لازم ہے کہ ایسا نہ کرنا، ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا "لعن الله اليهود والنصارى اتخذوا قبور انبيائهم مساجد" اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو یہود ونصاری پر کہ انہوں نے انبیاء کرام کی قبور کو سجدہ گاہ بنالیا، ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا، اے اللہ میری قبر کو میرے بعد بت نہ بنانا، خدا کا غضب اور اس کا قہر ان لوگوں پر زیادہ ہو جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا، بلاشبہ اے مسلمانو میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں اور فرمایا "الاهل بلغت اللهم اشهد اللهم اشهد" خبردار میں نے تمہیں خبردار کر دیا، اے اللہ گواہ رہ اے اللہ گواہ رہ۔ خیال رہے کہ صاحب قبر کو معبود سمجھ کر سجدہ کیا جائے تو یہ شرک ہے، اور اگر معبود تو اللہ تعالیٰ کو مانا جائے لیکن پھر بھی قبر کو سجدہ کرلیا جائے تو یہ حرام ہے، اگرچہ شرک نہیں۔

❁ نبی کریم ﷺ کے پاس سات دینار کہیں سے آئے تھے جن کو آپ خرچ نہیں کر سکے تھے، بیمار ہو گئے، شدید بیماری کی حالت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا ان سونے کے ٹکڑوں کو کہیں بھیج دو کہ وہ فقراء پر خرچ ہو جائیں، آپ کے یہ ارشاد فرمانے کے ساتھ ہی آپ کی بیماری میں شدت آ گئی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کی خدمت میں لگ گئیں، آپ کو جب ہوش آیا تو پوچھا کہ وہ دینار خرچ ہو گئے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا، ابھی نہیں خرچ ہوئے، نبی کریم ﷺ پر معمولی افاقہ سے بیماری میں اور زیادہ شدت آ جاتی، پھر آپ پوچھتے کہ سونے کے ٹکڑے خرچ ہو گئے؟ تین مرتبہ کچھ افاقہ ہوا، اور پھر بیماری کی شدت ہو جاتی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپکی خدمت کی وجہ سے اور شدید اضطراب و پریشانی کی وجہ سے وہ دینار فقراء پر تقسیم نہ کرا سکیں اس کے بعد کچھ افاقہ ہوا تو وہ حضرت علی ؓ کے پاس بھیج دیئے گئے تا کہ یہ مستحقین میں خرچ کر دیئے جائیں۔

سبحان اللہ! مال سارا اللہ کی راہ میں خرچ کرا دیا اور خود دنیا سے تشریف لے جا رہے تو گھر کے چراغ میں تیل نہیں تھا جب دوشنبہ (پیر) کی شام ہوئی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کسی انصاری عورت کے گھر چراغ بھیجا کہ اگر تمہارے گھر تیل ہو تو اس میں چند قطرے ڈال دیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نزع کے عالم میں ہیں یعنی نزع کی حالت میں گھر میں چراغ میں تیل نہیں، رات اسی حال میں گذر گئی، صبح چاشت کے وقت آپکا وصال ہو گیا "اللهم ارفع درجاته واغفرلنا بحرمته ﷺ" (ماخوذ از مدارج النبوۃ جلد دوم ذکر وصال النبی ﷺ)

اعلیٰ حضرت عظیم البرکۃ مولانا الشاہ احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا۔

مالک کونین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں
دو جہاں کی نعمتیں ہیں ان کے خالی ہاتھ میں

نبی کریم ﷺ کی قبرانور کا مقام عرش اعلیٰ سے بلند:

اس مسئلہ میں اہل علم کا اختلاف ہے کہ مکہ مکرمہ افضل ہے یا مدینہ طیبہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور بعض صحابہ کرام اور اکثر اہل مدینہ اور امام مالک رحمہ اللہ مدینہ طیبہ کی افضلیت کے قائل ہیں، لیکن نبی کریم ﷺ کی قبرانور کے مقام کی افضلیت میں کوئی اختلاف نہیں۔

"ونقل القاضی عیاض وغیره الاجماع علی تفضیل ما ضم الاعضاء الشریفة حتی علی الکعبة المنیفة وان الخلاف فیما عداه ونقل عن ابی عقیل االحنبلی ان تلک البقعة افضل من العرش وصرح الفا کهانی بتفضیلها علی السماوات قال بل الظاهر المتعین تفضیل جمیع الارض علی السماء لحلوله علیه الصلوة والسلام بها وحکاه بعضهم عن الاکثرین لخلق الانبیاء منها ودفنهم فیها"

قاضی عیاض رحمہ اللہ اور دوسرے اہل علم سے یہ منقول ہے کہ اس پر امت کا اجماع ہے کہ زمین کا وہ حصہ جس سے نبی کریم ﷺ کے اعضاء شریفہ کا تعلق ہے وہ کعبہ مکرمہ سے افضل ہے، اختلاف اس مقام کے غیر میں ہے کہ مکہ مکرمہ افضل ہے یا مدینہ طیبہ، فاکہانی رحمہ اللہ نے تصریح فرمائی ہے کہ اس مقام کو تمام آسمانوں پر افضلیت حاصل ہے، اور انہوں نے کہا کہ ظاہر بات یہ ہے کہ تمام زمین کو تمام آسمانوں پر افضلیت حاصل ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ زمین میں تشریف فرما ہیں، اکثر اہل علم نے تو زمین کی افضلیت پر یہی دلیل قائم کی ہے، کچھ اور حضرات نے یہ کہا ہے کہ تمام انبیاء کرام زمین سے پیدا ہوئے اور زمین میں مدفون ہیں، اس لحاظ پر بھی زمین کو آسمانوں پر فضیلت حاصل ہے۔

"وقال النووی والجمهور علی تفضیل السماء علی الارض ای ما عدا ما ضم الاعضاء الشریفة ومحل الخلاف فیما عداالکعبة فهی افضل من بقیة المدینة اتفاقا ما عدا موضع قبره المقدس"

علامہ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جمہور علماء کرام اس طرف ہیں کہ آسمانوں کو زمین پر افضلیت حاصل ہے، سوائے اس مقام کے جس سے حضور ﷺ کے اعضاء شریفہ کا تعلق ہے، لیکن یہ بھی خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کی قبرانور کے بغیر باقی مدینہ طیبہ پر کعبہ شریف کو فضیلت حاصل ہے۔ (مرقاۃ جلد ۲ صفحہ نمبر ۱۹۰)

یہ مسائل ایمان کی سلامتی اور نبی کریم ﷺ کی محبت سے حاصل ہوتے ہیں، جن لوگوں کے دل نبی کریم ﷺ کی محبت سے خالی ہوتے ہیں، وہ ان مسائل کو سن کر جل جاتے ہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ کی قبر شریف کعبہ شریف اور مکہ مکرمہ سے افضل ہے، یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی، ان لوگوں کیلئے دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں محبت رسول اللہ ﷺ اور عظمت رسول اللہ ﷺ پیدا کردے تو ان شاء اللہ یہ مسائل خود بخود سمجھ آجائیں گے۔ (راقم)

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ○ (آیۃ ۱۴۵)

(1) اور کوئی جان بے حکم خدا مر نہیں سکتی سب کا وقت لکھا رکھا ہے، اور جو دنیا کا انعام چاہے ہم اس میں سے اسے دیں اور جو آخرت کا انعام چاہے ہم اس میں سے اس دیں اور قریب ہے کہ ہم شکر والوں کو صلہ عطاء کریں۔ (کنزالایمان)

(2) اور نہیں ہے کسی نفس کو مرنا سوائے اللہ کے حکم کے، (موت کا وقت) لکھا ہوا، مقرر ہے اور جو ارادہ رکھتا ہے دنیا کے فائدہ کا ہم دیتے ہیں اس کو اس سے، اور جو شخص ارادہ رکھتا ہے آخرت کے فائدہ کا ہم دیتے ہیں اس کو اس سے، اور جلدی ہم جزاء (بدلہ) دیں گے شکر کرنے والوں کو۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق کی چند وجوہ:

(۱) "منافقین" نے جب غزوۂ احد میں یہ خبر اڑائی کہ محمد ﷺ قتل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو نازل فرما کر ان کا رد کیا کہ ہر ذی روح چیز کی موت اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے، اس کے حکم اور اس کی قضاء وتقدیر کے بغیر کسی پر موت نہیں آسکتی قتل یا موت وقت معین میں آتے ہیں، وقت سے پہلے نہیں آتے، منافقین کا اصل مقصد نئے نئے اسلام لانے والے ضعیف الاعتقاد لوگوں کو دین سے پھیرنا تھا کہ جب محمد (ﷺ) قتل ہو گئے تو تم اس دین سے پھر جاؤ، تو رب تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ سے ان کا رد کیا۔

"فکما انہ لومات فی دارہ لم یدل ذلک علی فساد دینہ فکذا اذاقتل وجب ان لایؤثر ذلک فی فساد دینہ"

یعنی موت کا وقت مقرر ہے، اگر آپ کی وفات اپنے گھر میں آگئی تو دین میں کوئی فساد اور خرابی لازم نہیں آئے گی، اگر آپ کو شہید کر دیا گیا تو پھر بھی دین میں کوئی خلل لازم نہیں آئے گا۔

(۲) "آیۃ کریمہ" کے نزول سے مسلمانوں کو جہاد پر ابھارا گیا ہے، اور انہیں یہ بتایا گیا ہے کہ "ان الحذر لایدفع القدر" بیشک ڈرنے سے تقدیر ٹل نہیں سکتی، اس لئے کہ موت وقت سے پہلے نہیں آتی، اور وقت آجائے تو موت کو کوئی

چیز ٹال بھی نہیں سکتی "فلافائدة فی الجبن والخوف" بزدلی اور خوف میں کوئی فائدہ نہیں۔

(۳) "اس آیۃ کریمہ" کو نازل فرما کر یہ بتایا گیا کہ اللہ تعالی نے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت فرمائی اور آپ کو اس خوفناک معرکہ سے بچایا، "فان تلک الواقعة مابقی سبب من اسباب الهلاک الاوقد حصل فیها" غزوہ احد میں کفار کی یلغار اور گھیراؤ النے کی وجہ سے بظاہر ہلاکت کے اسباب میں سے کوئی سبب باقی نہیں رہا تھا۔

"ولکن لما کان الله حافظا وناصرا ماضره شئ من ذلک، وفیه تنبیه علی ان اصحابه قصروا فی الذب عنه"

لیکن اللہ تعالی نے جب آپ کی حفاظت اور امداد فرمائی تو کوئی چیز بھی آپ کو نقصان نہ پہنچا سکی، اس میں اس پر تنبیہ کی گئی غزوہ احد میں صحابہ کرام سے آپ سے کفار کے دفاع میں کوتاہی واقع ہوگئی تھی، اگرچہ اجتہادی خطاء تھی۔

(۴) "منافقین" نے جب مؤمنین کے متعلق یہ کہا ﴿لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَامَاتُوْا وَمَاقُتِلُوْا﴾ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ ان پر موت واقع ہوتی اور نہ وہ شہید کئے جاتے۔

فاخبر الله تعالی ان الموت والقتل کلاهما لایکونان الاباذن الله وحضور الدجل"
(واللہ اعلم بالصواب)

تو اللہ تعالی نے خبر دی کہ بیشک موت اور قتل دونوں ہی اللہ کے حکم کے بغیر نہیں پائے جائے سکتے، اور موت کے وقت سے پہلے موت نہیں آتی۔ (ماخوذ از کبیر)

"اِذْن" کے کئی معانی بیان کئے گئے ہیں:

(۱) "الاذن هو الامر" اذن کا ایک معنیٰ "امر" بیان کیا گیا ہے "والمعنی ان الله تعالی یأمر ملک الموت بقبض الارواح فلایموت احد الابهذا الأمر" اب مطلب یہ ہوا کہ بیشک اللہ تعالی ملک الموت (عزرائیل) کو روحوں کے قبض کرنے کا حکم دیتا ہے، کسی ایک کی موت سوائے اس کے امر کے نہیں آتی۔

(۲) "الاذن هو التکوین والتخلیق والایجاد" اذن کا معنیٰ ہے "تکوین، تخلیق، ایجاد" سب کا مطلب ایک ہی مراد لیا گیا ہے یعنی موت وحیات کا خالق اللہ تعالی ہے، کہ موت وحیات پر اللہ تعالی کے بغیر کوئی قادر نہیں "فاذن المراد ان نفسا لن تموت الابما اماتها الله تعالی" اب مطلب یہ ہوگیا کہ کسی نفس پر موت نہیں واقع ہوتی سوائے اس کے کہ جسے اللہ تعالی موت عطاء کرے۔

(۴) "الاذن" بمعنی العلم" اذن کا معنی "علم" ہے۔ یعنی موت اس وقت سے پہلے نہیں آتی جو اللہ تعالی کے علم میں ہے،"واذا جاء ذلک الوقت لزم الموت" جب وہ وقت آتا ہے تو موت کا آنا لازم ہو جاتا ہے۔ یہی مضمون رب تعالی کے اس ارشاد گرامی سے زیادہ واضح ہو رہا ہے۔ ﴿فَاِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ﴾ "جب موت کا وقت آجاتا ہے تو ایک گھڑی اس میں نہ دیر ہوتی ہے، اور نہ ہی جلدی۔"

(۵) "الخامس "قال ابن عباس الاذن هو قضاء الله وقدره" پانچواں معنی جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے کہ اذن کا معنی قضاء و تقدیر ہے،"فانه لايحدث شيء الا بمشيته وارادته" یعنی اللہ تعالی کے ارادہ اور مشیت کے بغیر کوئی چیز واقع نہیں ہو سکتی۔ اسلئے موت صرف اس کے ارادہ اور مشیت سے واقع ہو سکتی ہے۔ (ماخوذ از کبیر ج۹ ص ۲۳)

﴿كِتَابًا مُّؤَجَّلًا﴾ "(موت کا وقت) لکھا ہوا، مقرر ہے۔"

ایک احتمال (کتابا)

"مصدر مؤكد لماقبله اذالمعنى كتب الموت كتابا (مُؤَجَّلًا) موقتا بوقت معلوم لايتقدم ولايتاخر ولو ساعة"

"کتابا" مصدر ہے، جو فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے اور تاکید کا معنی دے رہا ہے۔ اب معنی واضح ہو گیا کہ "موت کا وقت لکھا ہوا ہے، اس کا وقت مقرر ہے، اس میں ایک گھڑی بھی جلدی نہیں، اور نہ ہی دیر ہے۔ (روح البیان ج ۲ ص ۱۰۵)

دوسرا احتمال: یہ ہے کہ کتابا" مصدر نہ ہو بلکہ اسم ہو،"المراد بالكتاب المؤجل الكتاب المشتمل على الآجال" اس صورت میں مطلب یہ ہوگا، کہ ہر ایک کی موت کا وقت "کتاب مؤجل" میں مذکور ہے، یعنی وہ کتاب جس میں لوگوں کی اموات کا ذکر موجود ہے۔ "کتاب مؤجل" سے مراد لوح محفوظ ہے، جیسا کہ احادیث میں مذکور ہے اللہ تعالی نے قلم کو حکم دیا "اکتب" لکھ۔ "فكتب ماهو كائن الى يوم القيامة" تو اس نے قیامت تک ہونے والے واقعات کو لکھ دیا۔

واعلم ان جميع الحوادث لابد ان تكون معلومة لله تعالى وجميع حوادث هذاالعالم من الخلق والرزق والاجل والسعادة والشقاوة لابد وان تكون مكتوبة في اللوح المحفوظ فلو وقعت بخلاف علم الله لانقلب علمه جهلا ولانقلب ذلك الكتاب كذبا وكل ذلك محال، واذا كان الأمر كذلك ثبت ان الكل بقضاء الله وقدره" (کبیر ج۹ ص ۲۴)

یقینی بات ہے کہ تمام حوادث اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں۔ اور اس جہان کے تمام حوادث خلق، رزق، اجل، نیک بختی اور بدبختی سب ہی لوح محفوظ میں لکھے ہوئے ہیں۔ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں، اس کے خلاف نہیں ہوسکتیں، اگر اس کے خلاف ہوں تو اللہ تعالیٰ کے علم کا جہل ہونا لازم آئے گا، اور اس کی کتاب یعنی لوح محفوظ کا جھوٹا ہونا لازم آئے گا، یہ محال ہے، تو اسی سے یہ واضح ہوگیا کہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر میں ہیں تقدیر کی مناسب حد تک بحث نجوم الفرقان جلد دوم پہلے پارہ میں گذر چکی ہے۔

مقتول کی موت وقت مقرر پر ہے:

وظاهر الآية يؤيد مذهب اهل السنة القائلين ان المقتول ميت بأجله اى بوقته المقدر له"

جب آیۃ کریمہ میں یہ واضح کر دیا گیا کہ ہر نفس کی موت وقت مقرر پر آتی ہے، وہ وقت لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے، تو اسی آیۃ کریمہ سے یہ مسئلہ بھی سمجھ میں آگیا کہ "مقتول" (جسے قتل کر دیا گیا ہو) کی موت اپنے وقت مقرر پر آتی ہے، اس کی موت کا وقت یہی مقرر تھا، اگر قاتل اسے نہ قتل کرتا تب بھی اس نے اسی وقت میں مرنا تھا جس وقت میں قتل ہوا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے موت کے وقت کے مقرر ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ اس کی موت کا سبب قتل ہوگا۔

معتزلہ کا مذہب:

اس مسئلہ میں یہ ہے کہ مقتول کی موت قاتل کی وجہ سے آتی ہے، اگر قاتل اسے قتل نہ کرتا تو اس نے اس وقت نہیں مرنا تھا، اس لئے ان کا قول یہ ہے۔

"ان للمقتول اجلين احدهما القتل والآخر الموت وانه لولم يقتل لعاش الى اجله الذى هو الموت"

کہ مقتول کی موت کے دو وقت مقرر کئے گئے، ایک قتل اور دوسرا موت کا وقت، اگر قتل نہ کیا جاتا تو اس وقت اس پر موت نہ آتی بلکہ اس پر موت دوسرے وقت میں آتی، معتزلہ نے اپنے موقف پر ان احادیث کو پیش کیا جن میں طاعات کی وجہ سے عمر کے زیادہ ہونے کا ذکر ہے۔

اہلسنت نے ان کا جواب یہ دیا ہے:

کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ﴾ جب موت کا وقت آتا ہے تو اس میں تقدیم وتاخیر (جلدی، دیر) نہیں۔ جہاں تک احادیث میں طاعات کی وجہ سے عمر کی

زیادتی کا ذکر ہے ان سے مراد یہ ہے۔

"ان الطاعة تزید فی العمر انها تزید فیما هو المقصود الاهم منه وهو اکتساب الکمالات والخیرات والبرکات"

کہ بیشک طاعت سے عمر کی مقصود چیزوں میں زیادتی ہوتی ہے، یعنی اسے کمالات کے حاصل کرنے اور خیرات وبرکات کے حاصل کرنے کی زیادہ توفیق حاصل ہوتی ہے۔اگر عمر کی زیادتی مراد ہوتو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تقدیر میں ذکر ہوگا کہ اگر اس نے یہ طاعت نہ کی اس کی عمر چالیس سال ہوگی۔اور اگر اس نے طاعت کی تو اس کی عمر ستر سال ہوگی، لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ اس نے یہ طاعت ضرور کرنی ہے لھذا اس کی عمر ستر سال ہی ہونی ہے۔
(ماخوذ از روح المعانی ج ۳ ص ۷۶،۷۷)

﴿وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا﴾

''اور جو ارادہ رکھتا ہے دنیا کے فائدہ کا ہم دیتے ہیں اس کو اس سے، اور جو شخص ارادہ رکھتا ہے آخرت کے فائدہ کا ہم دیتے ہیں اس کو اس سے۔''

غزوہ احد میں منافقین بھی شریک ہوئے تھے جن کا مقصد مال غنیمت حاصل کرنا اور شہرت حاصل کرنا تھا، اور مخلصین مؤمنین بھی شریک ہوئے تھے جن کا مقصد رب تعالی کی رضاء مندی اور خوشنودی حاصل کرنا تھا۔ان دونوں فریقوں کا تذکرہ فرمادیا کہ جو دنیا کا نفع حاصل کرنے کیلئے حاضر ہوتے ہیں، ان کو صرف دنیا کا مال ہی دیا جاتا ہے وہ آخرت کے ثواب سے محروم ہوجاتے ہیں۔اور جو آخرت کے ثواب کیلئے حاضر ہوتے ہیں ان کو آخرت کا ثواب دیا جاتا ہے، درحقیقت وہی لوگ کامیاب ہیں۔

۞ وعن انس بن مالک ان النبی ﷺ قال من کانت نیته طلب الآخرة جعل الله غناه فی قلبه وجمع له شمله واتته الدنیا وهی راغمة ومن کانت نیته طلب الدنیا جعل الله الفقر بین عینیه وشتت علیه امره ولایأتیها منها الاما کتب الله له،،
(رواہ ابوداود فی کتاب الزکوۃ، معالم التنزیل للبغوی ج ۱ ص ۳۵۹)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص کی نیت آخرت کو طلب کرنے کی ہو تو اللہ تعالی اس کے دل میں غناء پیدا کر دیتا ہے، اور اسے ہمت عطاء کر دیتا ہے، اور دنیا اس کے پاس خود بخود آجاتی ہے اگر چہ وہ اس کے نزدیک حقیر ہوتی ہے، اور جس شخص کی نیت آخرت کو طلب کی ہو اللہ تعالی اس کی آنکھوں میں احتیاجی

رکھ دیتا ہے، اس کا معاملہ بکھر جاتا ہے، اسے کچھ میسر نہیں ہوتا سوائے اس کہ اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے جو لکھ دیا ہے۔
(ماخوذ از بغوی مع حاشیہ)

❁ عن عمر بن الخطاب ﷺ قال قال رسول اللہ ﷺ انما الاعمال بالنیات و انما لکل امرئی مانوی فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا أو أمرأۃ یتزوجھا فھجرتہ الی ماھاجر الیہ"
(بخاری ومسلم)

حضرت عمر بن خطاب ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اعمال کا دارومدار نیات پر ہے، بیشک ہر شخص کیلئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی، جس شخص نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی (رضامندی) کے لئے ہجرت کی، تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہی ہجرت ہے، اور جس شخص نے دنیا کی طرف ہجرت کی وہ اسے پائے گا یا کہ عورت کیلئے جس نے ہجرت کیلئے وہ اس سے نکاح کرلے گا، جس غرض سے وہ ہجرت کرے گا وہ اس غرض کو پائے گا۔

"فعلی السالک ان یھاجر الی اللہ ورسولہ ویجاھد من غیر ان یخاف لومۃ لائم حتی یصل الی اللہ ویتخلص من الاضطرار"

راہ سلوک پر چلنے والوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہی ہجرت کریں، اور اللہ کی راہ میں جہاد کریں، کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈریں، تا کہ وہ اس خالص عمل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرلیں اور اضطرار سے چھٹکارا حاصل کرلیں۔ (روح البیان ج ۲ ص ۱۰۶)

﴿وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ﴾ اور جلدی ہی ہم جزا (بدلہ) دیں گے شکر کرنے والوں کو۔

"سنعطیھم من فضلنا ورحمتنا فی الدنیا والآخرۃ بحسب شکرھم وعملھم"

یعنی جلدی ہی ہم اپنے فضل اور رحمت سے ان کو ان کے شکر اور عمل کے مطابق نوازیں گے دنیا اور آخرت میں۔

خلاصہ تفسیر:

ہر انسان کی موت کا وقت مقرر ہے۔ موت وقت سے پہلے نہیں آتی، اور نہ ہی وقت مقرر سے آگے جاتی ہے، انسان اپنے اعمال میں جو نیت کرتا ہے اسی کے مطابق اسے جزاء حاصل ہوتی ہے، دنیا حاصل کرنے کی غرض سے اگر کوئی عمل کرتا ہے تو وہ دنیا کو ہی حاصل کرتا ہے، آخرت کے ثواب سے محروم ہو جاتا ہے، اور جو شخص اللہ کی رضاء کیلئے عمل کرتا ہے اور اخروی ثواب حاصل کرنے کیلئے تو اللہ تعالیٰ اسے آخرت میں ثواب عطاء فرمائے گا، کیونکہ حقیقت میں وہی اللہ

تعالیٰ کے شکر گذار ہیں۔ اعمال کی دارومدار نیت پر ہے، ایک ہی عمل دو مختلف نیتوں سے مختلف حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

"من وضع الجبهة على الارض فى صلوة الظهر والشمس قدامه فان قصد بذلك السجود عبارة الله كان ذلك من الشرف دعائم الاسلام وان قصد به عبادة الشمس كان ذلك من اعظم دعائم الكفر"

ایک شخص نے ظہر کی نماز ادا کرتے ہوئے سجدہ کیا، پیشانی کو زمین پر رکھا، سورج سامنے تھا، اگر سجدہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی نیت تو اس نے اسلام کے اعلیٰ ستون کا سہارا لیا۔ اور اگر اس نے سورج کی عبادت کی نیت کی تو اس نے کفر کیا۔

اس سے واضح ہوا "ان المؤثر فى طلب الثواب والعقاب المقصود والدواعى لاظواهر الاعمال" بیشک ثواب وعذاب کے حصول میں اصل مؤثر مقصود اور حقیقی اسباب ہیں۔ ظاہری اسباب حقیقی مؤثر نہیں۔
(ماخوذ از روح البیان ج۲ ص۱۰۵،۱۰۶)

خصوص مورد کا لحاظ نہیں، عموم الفاظ کا لحاظ ہے:

واعلم ان هذه الآية وان وردت فى الجهاد خاصة، لكنها عامة فى جميع الاعمال"

جان کہ بیشک یہ آیۃ اگرچہ جہاد کے متعلق نازل ہوئی ہے، لیکن تمام اعمال کو شامل ہے۔ یعنی ہر عمل میں خصوص نیت کا اعتبار ہے ظاہری اسباب کا لحاظ نہیں۔ لھذا انسان کو چاہیے ہر عمل میں اللہ تعالیٰ کی رضاء ہی مدنظر ہو۔
(ماخوذ از کبیر ج۹ ص۲۵)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ○ (آیۃ ۱۴۶)

(1) اور کتنے ہی انبیاء نے جہاد کیا ان کے ساتھ بہت خدا والے تھے تو نہ سست پڑے ان مصیبتوں سے جو اللہ کی راہ میں ان پہنچیں اور نہ کمزور ہوئے اور نہ دبے اور صبر والے اللہ کو محبوب ہیں۔ (کنز الایمان)

(2) اور کتنے ہی نبیوں نے جہاد کیا، جبکہ ان کے ساتھ اللہ والے بہت تھے، تو نہ سست پڑے وہ جوان کو مصیبتیں پہنچیں اللہ کی راہ میں، اور نہ کمزور ہوئے، اور نہ وہ دبے، اور اللہ محبت کرتا ہے صبر کرنے والوں سے۔ (نجوم الفرقان)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"كَاَيِّنْ" مرکب ہے کاف مثلیہ اور ایّ سے، اس میں کثرت والا معنیٰ آ گیا، یہ کم خبریہ کے معنیٰ کو متضمن ہو گیا، کم خبریہ کی تمیز غالباً مکسور ہوتی ہے اور اس سے پہلے من آتا، لیکن کبھی من کا حذف کرنا جائز بھی ہوتا ہے، اس وقت وہ منصوب ہوتا ہے لیکن "كَاَيِّنْ" کے آخر میں نون تنوین ہوتا ہے، اس کے ہوتے ہوئے "مِنْ" کو حذف کرنا اور اضافت کی وجہ سے جر دینا جائز نہیں "ولم یجیٔ فی التنزیل الا کذا" قرآن پاک میں صرف اس ایک صورت میں استعمال ہے۔

"قاتل معه ربیون کثیر" خبر لقوله کاین لانها مبتدأ والفعل مسند الی ظاهره"

(كَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ) مبتدا ہے، اور "قاتل معه ربیون کثیر" خبر ہے۔ "قاتل" فعل کا فاعل اسم ظاہر یعنی "ربیون" ہے۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا" کتنے ہی نبی (گذر گئے) کہ ان کے ساتھ ملکر جہاد کیا بہت اللہ والوں نے۔ (ضیاء القرآن میں تقریباً یہی ترجمہ بیان کیا گیا) (روح البیان بالوضاحت ج ۲ ص ۱۰۷)

لیکن اس ترجمہ میں اللہ والوں کا جہاد کرنا صراحۃً سمجھ آئے گا، اور انبیاء کرام کا ضمناً، دوسری ترکیب یہ ہے کہ قاتل کا فاعل ہو ضمیر ہو، اور حرف عطف محذوف ہو " رِبِّيُّوْنَ" معطوف ہو، "مَعَهٗ" ظرف ہو اور خبر مقدم ہو اور " كَثِيْرٌ" مبتداء مؤخر ہو، یہ جملہ مفعول فیہ ہو۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا، کتنے ہی انبیاء نے جہاد کیا اور بہت تعداد میں ان کے ساتھ ملکر اللہ والوں نے (بھی) جہاد کیا۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اسی ترکیب کے مطابق ہے، راقم نے بھی یہی نقل کیا، یہی زیادہ بہتر نظر آیا کہ اس

میں انبیاء کرام اوران کے ساتھ ملکر اللہ والوں کا جہاد کرنا "بالاصالۃ" سمجھ آئے گا، انبیاء کرام کا جہاد ضمناً نہیں بلکہ صراحۃً سمجھ آئے گا۔ ایک اور ترکیب یہ بیان کی گئی کہ "قَاتَلَ" کا فاعل ضمیر ہے، جو "مبنی" کی طرف لوٹ رہی ہے۔اور "مَعَہٗ رِبِّیُّوْنَ" حال ہے فاعل سے،اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کتنے ہی نبیوں نے جہاد کیا اس حال میں کہ ان کے ساتھ اللہ والے بہت تھے۔ (بیضاوی)

"رِبِّیُّوْنَ" کا مطلب ہے "ربانی "رب والے" "ربی" "راء پر تینوں حرکتیں پڑھی گئی ہیں، فتحہ، ضمہ، کسرہ۔فتحہ اصل ہے اور کسرہ یا ضمہ تغیرات نسبیہ سے ہے، کیونکہ عرب جب کسی کلمہ کی نسبت کرتے اور آخر میں یاء نسبت لگاتے ہیں تو اس کلمہ کی حرکات کو بدل دیتے ہیں، جیسے بصری کو باء کے کسرہ سے پڑھتے ہیں۔اور "دھری" کی دال میں تینوں حرکتیں پڑھ لیتے ہیں۔

ایک نئے فتنہ نے جنم لیا:

آجکل فتنہ باز جہلاء نے ہزاروں بزرگان دین کو جاہل بنانے کیلئے یہ شوشہ چھوڑ ہوا ہے کہ "خداحافظ" نہ کہو بلکہ اللہ حافظ کہو، کیونکہ "خدا" اللہ تعالیٰ کا نام نہیں۔جب یہ لوگ یوں کہیں گے کہ "خدا" اللہ کا نام نہیں تو ان کی بات کو سننے والے یہ کہیں گے کہ سعدی، رومی، شیرازی اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ (معاذ اللہ) جاہل تھے،نہیں نہیں ایسی بات نہیں بلکہ یہ لوگ خود جاہل ہیں، کتب کو پڑھنا اور سمجھنا ان کی قسمت میں نہیں،صرف فتنہ کھڑا کرنا ان کا وتیرہ ہے،اسماء باری تعالیٰ کی بحث نجوم الفرقان کے پہلے حصہ میں گذر چکی ہے۔یہاں تو مختصر طور پر صرف اتنا ذکر کیا جارہا ہے۔کہ لفظ "خدا" کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر صحیح ہے۔

"فان قیل کیف صح اطلاق الموجود والواجب والقدیم ونحوذلک کلفظ خدا بالفارسیۃ ممالم یرد بہ الشرع"

اعتراض یہ کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ پر موجود، واجب اور قدیم،اور فارسی میں لفظ خدا کا اطلاق کس طرح صحیح ہے؟

قلنا بالاجماع،وقد یقال کلمۃ التوحید یصح اطلاق الموجود وھو من الادلۃ الشرعیۃ لانہ قد ثبت بالقرآن والحدیث ان الاجماع حجۃ اما القرآن فقولہ تعالی کنتم خیرامۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر،ولواجتمعوا علی الخطاء لامروا بالمنکرونھوا عن المعروف،واما الحدیث فقولہ علیہ السلام لاتجتمع امتی علی الضلالۃ"

اس اعتراض کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ کہنا ہی غلط ہے کہ اللہ تعالی پر ''واجب اور قدیم اور خدا'' کا اطلاق شریعت میں نہیں۔ جب ان الفاظ کا اطلاق اجماع امت سے ثابت ہے تو شریعت سے ہی ثابت ہے، کیونکہ اجماع امت شرعی دلائل اربعہ (چار) میں سے ایک دلیل ہے۔ اجماع کا دلیل شرعی ہونا قرآن پاک اور حدیث پاک سے ثابت ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالی ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾

تم بہتر ہو ان سب امتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں بھلائی کا حکم دیتے ہو، اور برائی سے منع کرتے ہو۔
(کنز الایمان)

اگر آپ کے علماء مجتہدین کسی خطاء پر مجتمع ہو جائیں تو وہ (معاذ اللہ) برے کاموں کا حکم دینے والے ہوں گے، اور اچھے کاموں سے منع کرنے والے ہوں گے، ایسا ہو نہیں سکتا کیونکہ یہ رب تعالی کے ارشاد کے مخالف ہوگا۔ حدیث پاک میں بھی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی واضح ہے کہ میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔ واضح ہوا کہ لفظ ''خدا'' جس کا معنی ہے واجب الوجود'' کا اطلاق اللہ تعالی پر شرعی دلیل اجماع امت سے ثابت ہے۔ خیال رہے کہ لفظ خدا اصل میں خود آئی ہے'' جس کا معنی یہ ہے کہ وہ خود بخود قائم ہے، اسے کوئی قائم کرنے والا نہیں۔ (شرح عقائد مع نبراس ص ۱۷۲، ۱۷۳)

''ربیون'' کا ایک اور معنی بیان کیا گیا ہے کہ یہ ماخوذ ہے ''ربة'' راء کے کسرہ اور با کی تشدید سے، اس کا معنی ہے ''جماعت'' اب معنی یہ ہوگا کتنے نبیوں نے جہاد کیا ان کے ساتھ کثیر جماعتیں تھیں۔ (روح البیان ج ۲ ص ۱۰۷)

﴿فَمَا وَهَنُوْا لِمَا اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا﴾

''تو نہ سست ہوئے وہ جو پہنچی ہیں مصیبتیں ان کو اللہ کی راہ میں، اور نہ وہ کمزور ہوئے اور نہ وہ دبے۔''

''فَمَا وَهَنُوْا'' میں فاء عاطفہ ہے، اس کا عطف ہے، قاتل پر۔ اور اس کا معنی ہے ''فما افتروا وما انکسرت همتهم'' تو وہ نہ سست ہوئے اور نہ ان کی ہمت ٹوٹی ﴿لِمَا اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ جو پہنچی ہیں مصیبتیں ان کو اللہ کی راہ میں'' یعنی جہاد میں جو ان کو زخم پہنچے یا اور تکالیف پہنچیں تو وہ ان کی وجہ سے سست نہیں ہوئے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

یہ مطلب جو ابھی بیان کیا ہے یہ اس وقت ہوگا جب ''فَمَا وَهَنُوْا'' اور ''لِمَا اَصَابَهُمْ'' کی ضمیریں تمام ''رِبِّيُّوْنَ'' کی طرف لوٹیں، اور اگر جہاد میں شریک ہونے والے جو شہید ہو گئے ان کے بغیر جو باقی رہنے والے ہیں

ان کی طرف ضمیریں لوٹائیں تو معنی یہ ہوگا"مااعتراهم من قتل اخوانهم والخوف والحزن وغیرذلک" تو وہ اپنے بھائیوں کی شہادت کی وجہ سے نہ سست ہوئے اور نہ ہی ان کو کوئی خوف وحزن لاحق ہوا۔ "وَمَاضَعُفُوْا" اور نہ وہ کمزور ہوئے، یعنی دشمن کے سامنے انہوں نے کوئی کمزوری نہیں دکھائی، اور نہ ہی وہ جہاد سے کمزوری دکھا کر پیچھے ہوئے، اور نہ ہی وہ دشمن سے دبے۔

"واصله استكن يستكن(باب افتعال)من السكون لان الخاضع يسكن لصاحبه ليفعل به مايريده" والالف لاشباع الفتحة"

" استکن" یستکن" باب افتعال ہے، سکون سے لیا ہوا ہے الف فتحہ کو لمبا کر کے اشباع کیلئے بنایا گیا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے صاحب یعنی مدمقابل سے یوں دب کر سر جھکا کر رہے کہ وہ جو چاہے کرتا پھرے۔

اللہ والوں کی شان بیان فرمائی کہ وہ انبیا اکرام سے مل کر دشمن سے جہاد کرتے ہوئے دشمن سے کبھی دبے نہیں، دشمن کے سامنے کبھی سر جھکا کر نہیں رہے، بلکہ حقیقت یہی ہے کہ وہ سر اٹھا کر رہے، دشمن ان سے دبا رہا، دوسرا احتمال یہ ہے کہ "استکان" کون سے لیا ہوا ہو، اصل میں "استکون" تھا، اور واؤ کو الف سے تبدیل کیا گیا، معنی اس صورت میں بھی وہی ہوگا۔ جو پہلی صورت میں بیان کیا گیا۔

آیۃ کریمہ کا اشارۃً مفہوم یہ ہوا:

وهذا تعريض بما اصابهم من الوهن والانكسار عند استيلاء الكفرة عليهم والارجاف بقتل النبی ﷺ وبضعفهم عند ذلک عن مجاهدة المشرکین واستكانتهم لهم حين ارادوا ان يعتضدوا بابن ابی المنافق فی طلب الامان من ابی سفیان"

"اس آیۃ کریمہ" میں جب یہ بیان کیا گیا کہ کتنے ہی اللہ والوں نے کثیر انبیاء سے ملکر جہاد کیا لیکن وہ نہ سست ہوئے، اور نہ ہی وہ کمزور ہوئے اور نہ ہی وہ دبے، تو اشارۃً صحابہ کرام کو سمجھایا گیا (کہ غزوہ احد میں کفار کے اچانک حملہ سے اور اس خبر سے کہ نبی کریم ﷺ شہید ہو گئے، تمہارے حوصلے پست ہو گئے، دشمن سے جہاد میں تم نے وقتی طور پر کمزوری دکھائی، اور تم میں منافقین اور کچھ ضعیف الاعتقاد کفار سے دب گئے جب انہوں نے یہ ارادہ کر لیا کہ وہ ابن ابی منافق سے امداد طلب کریں کہ وہ ابی سفیان سے ان کو پناہ لے کر دے) کہ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

﴿وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ﴾ ''اور اللہ پسند کرتا ہے صبر کرنے والوں کو۔''

یعنی جو لوگ جہاد میں دشمن کی سختیوں اور ان کی طرف سے لاحق ہونے والی مصیبتوں کو برداشت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا ہے، انہیں پسند کرتا ہے، یعنی ان کی امداد فرماتا ہے اور ان کی قدر و منزلت کو بلند فرماتا ہے۔
(ماخوذ از روح البیان ج۲ ص۱۰۷)

اولیاء محبوب اللہ است دان کس نیازارد حبیبش در جہان
جان لو اللہ کے ولی اللہ کے محبوب ہیں کوئی بھی ستاتا نہیں اپنے محبوب کو جہان میں۔

دینی طلباء کرام کیلئے:

''کَاَیِّنْ'' میں چار لغات ہیں:۔

(۱) **ایک** تو یہی جو مشہور ہے اور اصل ہے کہ ای پر کاف داخل ہے، البتہ نون سے یہ کلمہ لکھا جاتا ہے جس سے اشارہ کیا جاتا ہے کہ یہ کلمہ دو لفظوں سے مرکب ہے، اسلئے ای کے معنی میں بھی تبدیلی ہے، یعنی کم خبریہ کے معنی کو متضمن ہے، جو کثرت کا معنی دے رہا ہے، یعنی کتنے ہی کثیر انبیاء کرام نے جہاد کیا'' خیال رہے کہ معنی سب صورتوں میں یہی رہے گا، صرف تلفظ میں تین صورتیں اور ہیں۔

(۲) **دوسری** صورت یہ ہے کہ یہ لفظ ''کَآئِنْ'' بروزن فاعل ہے۔ اصل کیئی ہے، یاء کو الف سے تبدیل کیا گیا جیسا کو ییاس میں دوسری یاء کو الف سے تبدیل کر کے یا ء س بھی پڑھا جاتا ہے۔

(۳) **تیسری** صورت یہ ہے کہ یہ لفظ ''کئن'' بروزن کعن پڑھا جاتا ہے، کائن میں سے ہی تخفیف کیلئے الف حذف کردیا جاتا ہے، باقی کئن رہ گیا۔

(۴) **چوتھی** صورت یہ ہے کہ یہ لفظ ''کَاْیِنْ'' پڑھا جاتا ہے اس کا وزن کعین ہے، جو اصل میں کیئی ہے اس میں قاعدہ تقلیب جاری کیا گیا، ہمزہ کو یاء کی جگہ اور یاء کو ہمزہ کی جگہ رکھا۔ ''وَھَنُوْا'' میں بھی تین طرح کا تلفظ ہے۔ ھا ء کے فتحہ سے، کسرہ سے اور ضمہ سے ''الوھن انکسار الجد بالخوف'' خوف کی وجہ سے کوشش میں سستی پڑ جائے تو اسے ''الوھن'' کہا جاتا ہے ''وھن الشئ'' سست ہونا، کمزور ہونا، اوھن باب افعال، وھن باب تفعیل کا معنی ہے ضعفتہ (عین مشدد) میں نے اسے ذرا کر سست کردیا، کمزور کردیا ''الواھنۃ'' ''القصیری وھی اسفل الاضلاع'' پسلیوں کے نیچے حصہ کو ''واھنۃ الاضلاع'' یا ''قصار الاضلاع'' کہا جاتا ہے۔ جب کوئی اونٹ سست

تار ہو جائے تو کہا جاتا "الوھن" یعنی "هذا الابل وهن" یعنی یہ اونٹ سست رفتار ہو گیا۔ "الوهن ساعة تمضی من اللیل" رات کی ایک گھڑی گذر جائے تو اسے بھی "وھن" کہا جاتا ہے۔ او هنا صرنا فی تلک الساعة (اوهنا میں نون مشدد ہے) یعنی ہم رات کی فلاں گھڑی میں گذرے۔ (القرطبی)

فائدہ جلیلہ: قال الحسن البصری وجماعة من العظماء لم یقتل نبی فی حرب قط"

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اور دوسرے عظیم اہل علم نے یہ بیان کیا ہے کہ کوئی نبی بھی جنگ میں شہید نہیں ہوئے (تفسیر ابی السعود) وجہ اس کی یہ تھی کہ کفار انبیاء کرام کی مسلمانوں کے سامنے تذلیل نہ کریں کہ مسلمانوں کے حوصلے پست ہو جائیں۔ بنی اسرائیل کے متعلق جو ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ وہ انبیاء کو ناحق شہید کرتے ہیں، اس سے مراد ان کا جنگ میں شہید کرنا نہیں بلکہ آگے پیچھے داؤ لگا کر شہید کرنا مراد ہے۔

فائدہ جلیلہ: رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں ﴿فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ کہ کثیر انبیاء کرام اور ان کے ساتھ کثیر تعداد میں اللہ والے جہاد کرتے ہیں اللہ کی راہ میں "فان کون فی سبیله عزوجل بمایقوی قلوبهم ویزیل وهنهم" اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے خود بخود دل قوی ہو جاتے ہیں اور ان کی کمزوری زائل ہو جاتی ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

اللہ تعالیٰ کا صابرین سے محبت کرنے کا کیا مطلب؟

﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ﴾ ای علی مقاساة الشدائد ومعاناة المکاره فی سبیل الله فینصرهم ویعظم قدرهم"

اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے، یعنی جو جہاد میں سختیاں برداشت کرتے ہیں، اور کفار کی طرف سے مصائب پہنچائے جانے پر اللہ کی راہ میں صبر کرتے ہیں تو اللہ ان سے محبت کرتا ہے۔ یعنی ان کی امداد کرتا ہے ان قدر و منزلت کو بڑھاتا ہے۔ محبت کا یہاں یہی معنی ہے۔

نکتہ: " والاظهار فی موضع الاضمار للثناء علیهم بحسن الصبر والاشعار بعلة الحکم"

پہلے ذکر آ رہا ہے ﴿مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ﴾ اب بظاہر عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّهُمْ﴾ ذکر کیا جاتا تو کافی تھا، لیکن " الصّٰبِرِيْنَ " اسم ظاہر ذکر کیا گیا، اس کی دو وجہ ہیں ایک تو یہ کہ ان کے حسن صبر کی تعریف کرنی مقصود تھی، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان سے محبت کرنے کی بظاہر علت سمجھ آ جائے اگرچہ اللہ تعالیٰ کے افعال کسی علت سے نہ محتاج ہیں اور نہ ہی کسی علت کے تابع ہیں۔ (تفسیر ابی السعود مع الوضاحۃ)

" رِبِّيُّوْنَ " امعنی بیان کیا گیا ہے "اللہ والے" اللہ والے کون سے لوگ مراد ہیں، اس میں تین احتمال بیان کیے گئے ہیں۔

(۱) "واخرج ابن جریر من طریق سعید بن جبیر عن ابن عباس فی قولہ ربیون کثیر قال علماء کثیرون"
ابن جریر نے حضرت ابن عباس ﷺ سے روایت ذکر کی کہ اللہ والوں سے مراد' علماء ہیں، کہ کثیر علماء انبیاء کرام کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے، یہی مطلب عبد بن حمید، اور ابن المنذ راور ابن ابی حاتم کی روایات'' جو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے ہیں'' میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

(۲) "واخرج ابن جریر عن ابن زید قال الربیون الاتباع والربانیون الولاۃ" ابن جریر نے ابن زید سے روایت بیان کی کہ "رِبِّیُّوْنَ" سے مراد حکام کے تبعین ہیں، اور ربانیون سے مراد حکام ہیں۔

(۳) تیسرا احتمال جو پہلے بیان کیا گیا ہے کہ "رِبِّیُّوْنَ" کا ایک معنی کثیر جماعتیں ہیں۔ واخرج (ابن جریر) عن طریق العوفی عن ابن عباس فی قولہ "رِبِّیُّوْنَ کَثِیْرٌ" قال الربیوهم الجمیع الکثیرة" جریر نے ایک روایت حضرت ابن عباس ﷺ سے بیان کی کہ "رِبِّیُّوْنَ کَثِیْرٌ" کا مطلب بہت جماعتیں ہے۔ (درمنثور)

راقم کے نزدیک روایات میں کوئی تعارض نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ کتنے ہی کثیر تعداد میں انبیاء کرام نے جہاد کیا، ان کے ساتھ بہت اللہ والوں کی جماعتوں نے بھی جہاد کیا وہ اللہ والے علماء صلحاء اور انبیاء کی طرف مقرر کئے ہوئے عاملین (حکام) اور ان کے تبعین تھے۔

خلاصہ کلام: اس آیۃ کریمہ میں مسلمانوں کو جہاد پر برانگیختہ کیا گیا۔ کہ اے مسلمانو! تم بھی اللہ کی راہ میں جہاد کرو کیونکہ کثیر تعداد میں پہلے انبیاء کرام نے جہاد کیا اور ان کی معیت میں کثیر اللہ والوں نے جہاد کیا، ان کو اللہ کی راہ میں کفار کے ہاتھوں جو تکالیف پہنچیں وہ ان کی وجہ سے نہ ہی سست ہوئے اور نہ ہی کمزور اور نہ ہی کفار سے وہ دبے۔ بلکہ صبر سے کام لیا، اللہ تعالی کی محبت ان کو حاصل ہوئی کہ اللہ تعالی نے ان کی امداد فرمائی اور ان کے مدارج کو بلند کیا۔ لھذا تمیں بھی چاہئے کہ تم سست نہ پڑو، کوئی کمزوری نہ دکھاؤ، کفار سے نہ دبو، بلکہ صبر سے کام لو اللہ تعالی تمہارے ساتھ محبت کرے گا، تمیں اپنی نصرت عطاء کرے گا۔

مقام افسوس: آجکل مسلمان کفار کے سامنے سر جھکا کر وقت گذار رہے ہیں، کفار سے دبے ہوئے، کفار کے سامنے سر اٹھانے کی طاقت نہیں۔ نصرانیوں کے یار بنے ہوئے ہیں، یہودیوں کے فلسطین پر ناجائز قبضہ کو ماننے کیلئے بے تاب ہیں، صحیح چمچہ یہود و نصاری کو مل گیا جو ہنود کا غمخوار بھی ہے اور قادیانیوں کا طرفدار بھی۔

"اللھم انا نعوذبک من الیھود والنصاری وملاعقھم، اللھم اھد المؤمنین الذین یقتلون المسلمین"

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّا اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْۤ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ۝ (آیة ص ۱۴۷)

(1) اور کچھ بھی نہ کہتے تھے سوا اس دعاء کے کہ اے رب ہمارے بخش دے ہمارے گناہ اور جو زیادتیاں ہم نے اپنے کام میں کیں اور ہمارے قدم جما دے اور ہمیں ان کافر پر مدد دے۔ (کنز الایمان)

(2) اور نہیں تھا ان کا کوئی قول سوائے اس کے کہ انہوں نے کہا اے ہمارے رب بخش دے ہمارے گناہوں کو اور ہماری زیادتیوں کو جو ہمارے کاموں میں ہوئیں، اور ثابت رکھ ہمارے قدموں کو اور امداد فرما ہماری کافروں کی قوم پر۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

پچھلی آیۃ کریمہ میں اللہ والوں کی بہادری اور صبر اور سستی میں نہ پڑنے، اور کفار سے نہ دبنے کا ذکر کیا، یہ تمام چیزیں ظاہری اعضاء سے تعلق رکھتی ہیں۔ اب اس آیۃ کریمہ میں ان کا دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے، دعاء کرنے، رب تعالیٰ سے بخشش طلب کرنے اور رب تعالیٰ کی طرف جھکنے کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ (البحر المحیط)

﴿اِلَّا اَنْ قَالُوْا﴾ عام اشیاء سے مستثنیٰ مفرغ ہے، یعنی دشمن سے ملاقات کے وقت اور جنگ کی تنگیوں میں اور مختلف قسم کی مصیبتوں کے پہنچنے میں، اور ہر قسم کے شدائد اور ہولناکیوں میں اللہ والے لوگوں کی صرف یہی دعاء تھی اے ہمارے رب! ہماری مغفرت فرما۔ (روح البیان ج ۲ ص ۱۰۷)

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا﴾ ''اے ہمارے رب بخش دے ہمارے گناہوں کو''

''ذُنُوْبَنَا'' الصغائر منها و الكبائر ''ذُنُوْبَنَا'' تمام صغائر اور کبائر گناہوں کو شامل ہے۔ یعنی اے ہمارے رب ہمارے تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کو بخش دے۔

﴿وَاِسْرَافَنَا فِیْۤ اَمْرِنَا﴾ ''اور (بخش دے) جو زیادتیاں ہم نے اپنے کام میں کیں''

''یعنی ما اسرفنا فيه فتخطينا الى العظام من الذنوب لان الاسراف الافراط في الشيء ومجاوزه الحدفيه''

یعنی اے ہمارے رب جو ہم نے زیادتیاں کی ہیں اپنے کاموں میں ان کو بخش دے، اس سے مراد گناہ کبیرہ ہیں کیوں کہ کسی چیز میں افراط (زیادتی) کی جائے، اور حد سے تجاوز کیا جائے تو اسے اسراف کہا جاتا ہے۔ یہ تخصیص بعد از تعمیم ہے۔ یعنی "ذُنُوْبَنَا" میں اگر چہ تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کا ذکر آ چکا ہے۔ لیکن پھر "اِسْرَافَنَا" کہہ کر خصوصی طور پر کبیرہ گناہوں کی بخشش طلب کی۔ (ماخوذ از خازن ج ۱ ص ۲۹۱)

دعاء میں عجز پایا گیا ہے:

اضافوا الذنوب والاسراف الی انفسهم مع کونهم ربانیین براء من التفریط فی جنب الله هضما لها واستقصارا لهم واسنادا لما اصابهم الی اعمالهم"

اللہ والے اگر چہ گناہوں سے پاک تھے، لیکن انہوں نے چھوٹے اور بڑے گناہوں کو اپنی طرف منسوب کیا اور رب تعالیٰ سے بخشش طلب کی، جس سے اپنی عاجزی کا اظہار کیا، اور کفار کے ہاتھوں پہنچنے والی مشکلات کو اپنے اعمال کی طرف منسوب کیا۔ (روح البیان ج ۱ ص ۱۰۷)

پہلے مغفرت کی دعاء کی تا کہ گناہوں کے معاف ہونے کے بعد زبان پاک وصاف ہو جائے، اور اس میں مقام قبولیت آ جائے، اس کے بعد دعاء کی ﴿وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا﴾ اور ثابت رکھ ہمارے قدموں کو۔

﴿وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ﴾ "اور امداد فرما ہماری کافروں کی قوم پر"

یہ تمام دعاء مقام قبولیت میں واقع ہوئی، کیونکہ دعاء میں عجز پایا گیا ہے، پاکیزہ لوگوں کی پاکیزہ زبانوں سے دعاء نکلی جو قبولیت کے قریب تھی۔ وہ اللہ والے یہ دعاء ہمیشہ کرتے ہی رہے حالانکہ ان کی زبانوں سے کوئی ایسا جملہ نہیں صادر ہوا جس میں ان کے متزلزل ہونے اور جزع وفزع کا کوئی شائبہ بھی نہیں پایا گیا۔ ان کی یہ دعاء ہی ان کے عجز پر اور اپنے تمام امور کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے پر دلالت کر رہی ہے۔ (روح البیان ج ۲ ص ۱۰۷)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ﴾ قول پر نصب ہے یہ "كَانَ" کی خبر مقدم اور ﴿اِلَّا اَنْ قَالُوْا﴾ میں "اَنْ" کی وجہ سے فعل مصدر کی تاویل میں ہے اسلئے وہ اسم کان ہے جو مؤخر ہے۔ اور اعم الاشیاء سے مستثنیٰ مفرغ ہے۔ (روح المعانی ج ۳ ص ۱۷۴)

تمام مترجمین نے ترجمہ میں اختصار کیا ہے، راقم نے بھی اختصار سے ہی کام لیا ہے، ورنہ روح المعانی کی ترکیب کے مطابق

مکمل ترجمہ ﴿وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا﴾کا یہ ہے۔"اور نہیں تھی کوئی چیز سوائے ان کے یہ بات کہنے کے"

دوسری قراءت: ابن کثیر اور عاصم کی روایت میں "قَوْلُهُمْ" کو مرفوع پڑھا گیا ہے کہ وہ اسم کان ہے، اور ﴿اِلَّآ اَنْ قَالُوْا﴾ خبر ہے۔اس صورت میں معنی یہ ہوا" وما كان قولهم شيئا من الاشياء الاهذا القول المبنئ عن احسان المحاسن" اور نہیں تھا ان کا قول چیزوں میں سے کوئی چیز سوائے اس قول کے جو ان کے محاسن کے کمالات کی خبر دے رہا ہے"یعنی ان کی دعاء اور ان کا عجز کتنا ہی مستحسن امر تھا۔ (ماخوذ از روح المعانی ج۳ص۷۴،۷۵)

ثابت قدمی کا ایک اور مطلب:

ایک مطلب تو پہلے بیان کر دیا گیا ہے کہ ان کی دعاء کا مطلب یہ تھا کہ اے اللہ ہمیں جنگ میں ثابت قدم رکھنا، ہم پسپا نہ ہوں، پیچھے نہ بھاگیں، اور دوسرا مطلب یہ ہے "ثبتنا على دينك الحق" ہمیں اپنے دین حق پر ثابت رکھنا۔
(روح المعانی ج۳ص۷۵)

دعاء کیسی ہو؟ نبی کریم ﷺ کی تعلیم امت کیلئے دعاء دیکھئے، کوئی کتنا بڑا ہی کیوں نہ ہو، رب تعالی سے عجز وانکساری سے دعاء کرے۔

- وفی صحيح المسلم "عن ابی موسى الأشعرئ عن النبی ﷺ انه كان يدعو بهذا الدعاء. ﴿اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ خَطِیْئَتِیْ وَجَهْلِیْ وَاِسْرَافِیْ فِیْ اَمْرِیْ وَمَااَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّیْ﴾

مسلم شریف میں حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی دعاء کا ذکر فرمایا، جو نقل کر دی گئی۔

"فعل الانسان ان يستعمل ما فی كتاب الله وصحيح السنة من الدعاء ويدع ماسواه ولايقول أختار كذا فان الله تعالى قداختار لنبيه واوليائه وعلمهم كيف يدعون"

انسان کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ قرآن پاک اور حدیث پاک میں مذکور دعاؤں میں سے کوئی دعاء کرے یہ نہ کہے کہ میرے نزدیک یہ دعاء زیادہ مختار ہے، اسلئے کہ وہی دعائیں زیادہ مختار ہیں جو اللہ تعالی نے اپنے نبی کریم ﷺ کو اور اپنے اولیاء کو سکھائی ہیں کہ یہ دعائیں تم کرو۔ (قرطبی ج۴ص۲۳۰)

میدان جنگ میں وہی دعاء کرے جو اللہ والوں نے کی:

وفی هذا دليل على مشروعية الدعاء عندلقاء العدو وان يدعو بهذا الدعاء المعين وقدجاء فی القرآن ادعية اعقب الله بالاجابة فيها"

قرآن پاک کی زیر بحث آیۃ کریمہ سے یہ واضح ہوگیا کہ دشمن کی ملاقات پر دعاء کرنا مشروع ہے، اور دعاء بھی یہ خاص معین دعاء کرے جو اللہ والے کرتے رہے۔

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ۝﴾

اگرچہ قرآن پاک میں اور دعاؤں کا بھی ذکر ملتا ہے، لیکن جہاد کے دوران یہ خصوصی دعاء کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بعد آنے والی آیۃ کریمہ میں اس دعاء کی قبولیت کا ذکر فرمایا گیا۔ (البحر المحیط ج ۳ ص ۱۱۱)

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ۝ (آیۃ نمبر ۱۴۸)

(1) تو اللہ نے ان کو دنیا کا انعام دیا اور آخرت کے ثواب کی خوبی اور نیکی والے اللہ کو پیارے ہیں۔ (کنز الایمان)

(2) تو دیا ان کو اللہ نے دنیا کا ثواب، اور آخرت کے ثواب کی خوبی، اور اللہ پسند فرماتا ہے احسان کرنے والوں کو۔ (نجوم الفرقان)

﴿فَآتَاهُمُ اللَّهُ﴾ "تو دیا ان کو اللہ نے"

(فَآتَاهُمُ اللَّهُ) "ای بسبب "قولهم ذلک کماتؤذن به الفاء" 'فاء' سے آیۃ کریمہ کو شروع کیا گیا، فاء دلالت کرتی ہے "تعقیب مع الوصل" پر یعنی ایک کام کے اوپر دوسرا کام ساتھ ہی مرتب ہو جائے، اس لئے مطلب یہ ہوا کہ ان کی دعاء کے بعد جلدی ہی اللہ تعالی نے ان کی دعاء کو قبول کرلیا۔

﴿ثَوَابَ الدُّنْيَا﴾ "دنیا کا ثواب"

ان کی دعاء کو قبول کرتے ہوئے اللہ تعالی نے ان کو دنیا کا ثواب عطاء فرمادیا، دنیا کے ثواب سے کیا مراد ہے؟ "وقال قتادة الفتح والظهور والتمكن والنصر" قتادہ نے بیان کیا ہے کہ دنیا کے ثواب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی نے ان کو فتح عطاء کی، اور ان کو کفار پر غلبہ عطاء کیا، ان کو کفار پر طاقت دی اور ان کی امداد کی۔ (ثَوَابَ الدُّنْيَا) ای النصر و الغنيمة قاله ابن جريج" دنیا کے ثواب کا مطلب امداد کرنا اور مال غنیمت دینا۔ (روح المعانی ج ۳ ص ۸۶)

اعتراض: ابن جریج کی تفسیر کس طرح صحیح ہے؟ جبکہ بخاری شریف میں حدیث پاک ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا"واحلت لی الغنائم ولم تحل لأحد قبلی" مال غنیمت صرف میرے لئے ہی حلال کیا گیا ہے، مجھ سے پہلے کسی ایک کیلئے حلال نہیں کیا گیا۔ پہلی امتوں میں مال غنیمت کوایک جگہ رکھ دیا جاتا تھا، قدرتی طور پر آگ آتی اسے کھا جاتی تھی، وہ مال غنیمت جہاد میں شرکاء حضرات خود استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ ابن جریج کی تفسیر میں (ثَوَابَ الدُّنیَا) سے مراد مال غنیمت بھی بیان کیا گیا، جبکہ ذکر پہلے انبیاء کرام کی امتوں میں سے "رِبِّیُّوْنَ" (اللہ والوں) کا ہو رہا ہے، ان کو مال غنیمت دینے کا کیا مقصد؟

جواب: واجیب بأن المال الذی فاخذه النار غير الحيوان واما الحيوان فكان يبقى للغانمين دون الانبياء عليهم السلام"

مال غنیمت کو آگ کھا جاتی تھی لیکن اس مال سے مراد حیوانوں کے بغیر اور مال ہے۔ حیوانوں کو آگ نہیں کھاتی تھی حیوان جہاد میں شرکاء حضرات کو بطور مال غنیمت مل جاتے تھے، اگرچہ انبیاء کرام وہ حیوان بھی حاصل نہیں کرتے تھے۔ (ماخوذ از روح المعانی ج ۳ ص ۸۶ واز البحر المحیط ج ۳ ص ۱۱۲)

﴿وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ﴾ "اور آخرت کے ثواب کی خوبی"

یعنی اللہ تعالی نے ان کی دعاء کے بعد ان کو آخرت کے ثواب کی خوبی (بھی) عطاء کی۔

"ثواب الآخرة الحسن وهو عند ابی جريج" رضوان الله تعالى ورحمته" وعند قتاده هى الجنة، وتخصيص الحسن بهذاالثواب للايذان بفضله ومزيته وانه المعتدبه عنده تعالى"

آخرت کے ثواب کے "حسن (خوبی)" سے مراد ابن جریج کے نزدیک اللہ تعالی کی رضاء مندی اور اس کی رحمت ہے۔ اور ابن قتادہ کے نزدیک اس سے مراد جنت ہے۔ البتہ آخرت کے ثواب کے ساتھ "حسن" (خوبی) کے ذکر کرنے کا یہ فائدہ ہے کہ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ ثواب ہی اللہ کے ہاں زیادہ معتبر ہے، اور اسی میں اللہ تعالی کا خصوصی فضل پایا گیا ہے، اور اسی کے ذریعے رب تعالی نے بندے کو خصوصی فوقیت عطاء کی ہے۔ (روح المعانی ج ۳ ص ۸۶)

"وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ" ای الجنة وحسنه التفضل فوق الاستحقاق" (جلالین)

ثواب آخرت سے مراد جنت ہے، اور حسن سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی اپنے خصوصی فضل سے انہیں ان کے استحقاق سے زیادہ انعام عطاء کرے گا۔

"يعنى ان ثواب الآخرة هوالجنة وهو حسن واحسن الزيادة لهم فوق مايستحقون"

آخرت کے ثواب سے مراد جنت ہے، وہ خود ہی حسین ہے کیونکہ اس میں " حسن " (خوبی) موجود ہے، البتہ اللہ والوں کو ان کی دعاء کے ذریعے ان کے استحقاق سے زیادہ عطاء فرماتا جو "احسن" (بہت خوبی) ہے۔ (صاوی ج ۱ ص ۱۶۲)

فائدہ: ثواب آخرت تمام ہی حسین ہے "فما خصه الله بانه حسن من هذا الجنس فانظر كيف يكون حسنه" جس کو اللہ تعالیٰ نے حسن سے خاص کیا ہے وہ کتنا ہی زیادہ حسین ہوگا۔ ثواب دنیا کے ساتھ حسن کی قید نہیں لگائی گئی کیونکہ یہ قلیل ہے، اور دنیا میں ضرر ونقصان بھی پایا جاتا ہے، اور دنیا کا ثواب ختم بھی ہو جاتا ہے۔

دینی طلباء کے فائدہ کیلئے:

حسن جب حاء پر ضمہ ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے "خوبصورتی" اور اگر فتحہ ہو تو اس کا معنی ہوتا "خوبصورت" یعنی جس میں خوبصورتی پائی جائے۔

قال القفال رحمه الله يحتمل ان يكون الحسن (بالضمة) هو الحسن (بالفتحة) كقوله تعالى (وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا) اى حسنا"

قفال رحمہ اللہ" نے بیان کیا ہے کہ آیۃ کریمہ میں "حسن " (حاء کی پیش سے) جو ذکر ہے، معنوی لحاظ پر "حسن" (حاء کی زبر سے ہو) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ میں "حسن" (پیش سے) "حسن" (زبر والی صورت میں) کے معنی میں ہے۔ اس میں مبالغہ پایا گیا ہے کہ آخرت کا ثواب اتنا زیادہ حسین ہے گویا کہ عین حسن بن گیا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "فلان جود و كرم اذا كان في غاية الجود والكرم" فلاں جود وکرم ہے۔ یعنی بہت زیادہ جود وکرم اسے حاصل ہے۔

فائدہ جلیلہ: اس سے پہلے رب تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی بیان ہو چکا ہے۔

﴿وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا﴾

"جو شخص ارادہ رکھتا ہے دنیا کے ثواب کا ہم اسے دیتے ہیں اس میں سے، اور جو شخص آخرت کے ثواب کا ارادہ رکھتا ہے ہم اسے دیتے ہیں اس میں سے۔"

اس آیۃ میں دونوں جگہ "منها" ذکر ہے۔ "من" تبعیض کیلئے ہے۔ یعنی دنیا کا بعض ثواب دیتے ہیں اور آخرت کا بعض ثواب دیتے ہیں۔ لیکن زیر بحث آیۃ کریمہ میں "من" مذکور نہیں۔ وجہ فرق کیا ہے؟ وجہ فرق یہ ہے کہ جو لوگ

آخرت کے ثواب کا ارادہ رکھتے ہیں۔

"انما اشتغلوا بالعبودية لطلب الثواب فكانت مرتبتهم نازلة" وہ عبودیت میں ثواب کی طلب کیلئے مشغول ہوتے ہیں، ان کا مرتبہ گھٹیا ہے۔ لیکن اس زیر بحث میں جن اللہ والوں کا ذکر ہے۔

"فانهم لم يذكروا في انفسهم الاالذنب والقصور" انہوں نے اپنے نفسوں کا سوائے گناہوں اور قصور کے ذکر نہیں کیا، یہی مراد ان کی اس دعاء میں ہے۔

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا﴾

"اے ہمارے رب ہمارے گناہوں اور ہمارے کاموں میں ہمارے حد سے تجاوز کی بخشش فرما۔"

"ولم يروا التدبير والنصرة والاعانة الا من ربهم" اور انہوں نے تدبیر اور نصرت واعانت کو صرف اپنے رب سے طلب کیا، ان کی دعاء، ﴿وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾ کا یہی مطلب ہے۔

"فكان مقام هؤلاء في العبودية في غاية الكمال" لھذا ان لوگوں کو مقام عبودیت میں بہت کمال حاصل ہے۔

"فلا جرم اولئک فازوا ببعض الثواب وهؤلاء فازوا بالكل" اسی وجہ سے یقیناً وہ لوگ جن کا ذکر پچھلی آیۃ کریمہ میں ہے وہ بعض ثواب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، وہ جن لوگوں کا ذکر اس آیۃ کریمہ میں ہے وہ کل ثواب حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے یعنی ان کو اللہ تعالیٰ کی مکمل رضاء مندی اور رحمت حاصل ہوگئی۔

"وايضا اولئک ارادوا الثواب وهؤلاء ماارادوا الثواب وانما ارادوا خدمة مولاهم فلاجرم اولئک حرموا وهؤلاء اعطوا ليعلم ان كل من اقبل على خدمة الله اقبل على خدمته كل ماسوى الله"

اور وجہ فرق یہ ہے کہ جن لوگوں کا پچھلی آیۃ کریمہ میں ذکر ہے انہوں نے ثواب کا ارادہ کیا اس لئے وہ مکمل ثواب حاصل کرنے سے محروم رہے، اور جن لوگوں کا اس آیۃ کریمہ میں ذکر ہے انہوں نے ثواب کا ارادہ نہیں کیا، بلکہ اپنے مولیٰ کی خدمت کا ارادہ کیا اس لئے ان کو مکمل ثواب عطاء کیا گیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی خدمت (عبادت) میں مشغول ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے سواء تمام مخلوق اس کی خدمت میں مشغول ہوتی ہے۔ (کبیر ج۹ ص۲۹)

﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ "اور اللہ محبت کرتا ہے احسان کرنے والوں پر"

نبی کریم ﷺ نے احسان کی وضاحت فرمائی جبکہ جبریل نے آپ سے پوچھا "ما الاحسان يا رسول

الله" یارسول اللہ احسان کیا ہے؟ تو آپ نے اسے جواب دیا "ان تعبد الله کانک تراہ" تم اللہ کی عبادت کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اس مقام میں مفسرین کرام نے دو معنی بیان کئے ہیں ایک بندے اور رب تعالیٰ کے درمیان جو طاعت پائی جاتی ہے یہ اسے لازم پکڑتا ہے، یعنی کامل مطیع اور کامل عبادت گذار ہوتا ہے، اور دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے نبی کے ساتھ ثابت قدم رہے کہ یا تو ہم شہید ہو جائیں گے یا غالب ہو جائیں گے، اس سے پہلے ہم نبی کا ساتھ چھوڑ کر کہیں بھاگ کر نہیں جائیں گے، میدان جنگ سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ (البحرالمحیط ج ۳ ص ۱۱۲)

دقیقہ لطیفہ: جب بندے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں اور رب تعالیٰ کے حضور عرض کرتے ہیں۔ ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا﴾ تو اللہ تعالیٰ ان کا نام محسن رکھ دیتا ہے کہ یہ محسن ہیں۔ گویا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے اس بندے کو یوں نداء دی جاتی ہے

"اذااعترفت باساء تک وعجزک فانا اصفک بالاحسان واجعلک حبیبا لنفسی حتی تعلم انہ لاسبیل للعبد الی الوصول الی حضرة اللہ الاباظہار الذلة والمسکنتو العجز"

کہ اے میرے بندے جب تو نے اپنے گناہوں کا اعتراف کرلیا ہے اور اپنے عجز کا تو نے اظہار کر دیا ہے تو میں تجھے احسان کا وصف عطاء کر رہا ہوں، اور تجھے اپنا حبیب بنا رہا ہوں، تا کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور مقبولیت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان اپنے آپ کو کمتر سمجھے اور مسکینی اختیار کرے اور عجز اختیار کرے، اور وجہ ان کو محسنین کہنے کی یہ ہے کہ جب انہوں نے جہاد میں ثابت قدم رہنے کی اور دشمن کے خلاف امداد حاصل کرنے کی دعاء رب تعالیٰ سے کی تو ان کو اللہ تعالیٰ نے صفت احسان عطاء کی۔

"وھذا یدل علی ان العبد لایمکنہ الاتیان بالفعل الحسن الااذا اعطاہ اللہ ذلک الفعل واعانہ علیہ"

تو اسی سے واضح ہو گیا کہ بندہ کو اچھا فعل عمل میں نہیں لا سکتا جب تک اللہ تعالیٰ اسے وہ فعل عطاء نہ کرے اور اس کی امداد نہ کرے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو محسن ہونا قرار دیا تو اس پر جزاء یہ مرتب فرمائی کہ اے میرے بندو جب تم احسان کرنے والے ہو یعنی میری طاعت وعبادت کو لازم پکڑنے والے ہو تو میں تمہیں اپنی محبت سے نواز رہا ہوں کہ تم میرے محبوب ہو، یعنی بندوں کو جب احسان حاصل ہوتا ہے تو رب تعالیٰ بھی ان پر احسان فرماتا ہے۔ رب تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ کرم پر یہ لازم کیا۔

﴿هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ﴾ "کہ احسان کی جزاء نہیں سوائے احسان کے۔"

"وکل ذلک یدل علی انه سبحانه هو الذی یعطی الفعل الحسن للعبد ثم انه یثیبه علیه لیعلم العبد ان الکل من الله وباعانة الله"

اس تمام بحث سے یہ پتہ چلا کہ اللہ تعالی بندے کو فعل حسن عطاء کرتا ہے، پھر اس اچھے فعل پر اسے اللہ تعالی جزاء عطاء فرماتا ہے، تاکہ بندے کو معلوم ہو جائے کہ سب کچھ اللہ تعالی کی توفیق اور اس کی امداد سے حاصل ہے۔ (کبیر ج۹ ص ۳۰،۲۹)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ "وضع المظهر موضع المضمر للاشعار بانهم هم المحسنون"

یہاں اسم ظاہر "مُحْسِنِیْنَ" ذکر کیا، ضمیر نہیں ذکر کی یوں نہیں کیا "وَاللّٰهُ یُحِبُّهُمْ" کہ اللہ ان سے محبت کرتا ہے، اس لئے کہ ضمیر لانے کی صورت میں اتنا تو پتہ چل جاتا کہ اللہ تعالی نے "رِبِّیُّوْنَ" (اللہ والوں) کو دنیا کا ثواب اور آخرت کے ثواب کی خوبی عطاء کی اور اللہ ان سے محبت کرتا ہے، لیکن اس سے یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ وہ احسان کرنے والے بھی ہیں۔ لیکن جب اسم ظاہر ذکر کیا تو یہ بہت واضح ہو گیا کہ وہ اللہ والے محسن ہیں اور اللہ تعالی محسنین سے محبت کرتا ہے۔ (تفسیر مظہری ج۲ ص ۱۵۳)

محبت کے حاصل ہونے سے تمام نیک بختیاں حاصل ہو جاتی ہیں:

"ومحبة الله للعبد عبارة عن رضاء عنه وارادة الخیریة فهی مبدأ لکل سعادة"

اللہ تعالی کی محبت بندے کو حاصل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بندے کو رب تعالی کی رضاء حاصل ہو جاتی ہے، اور اللہ تعالی اسے خیر و بھلائی عطاء فرماتا ہے، اللہ تعالی کی رضاء و محبت اور اس کی طرف سے ارادہ خیر سے ہر طرح کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے۔

والصبر والاحسان من صفات الله تعالی والله تعالی یحب صفاته ویحب من تخلق بصفاته ولهذا قال "﴿وَاللّٰهُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ﴾ ﴿وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾"

صبر و احسان حقیقت میں اللہ تعالی کی صفات ہیں، اللہ تعالی اپنی صفات کو پسند فرماتا ہے، اسی طرح جو شخص اللہ تعالی کی صفات سے متصف ہو اسے بھی اللہ تعالی پسند فرماتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی نے فرمایا ﴿وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ اور اللہ محبت رکھتا ہے احسان کرنے والے سے۔

لما زاد لخواص عباده کرامة التخلق باخلاقه ابتلاهم بقتال العدو ولبتهم عند الملاقاة فاستخرج من معادن ذواتهم جواهر صفاته المکنونة فیها المکرمة بهابنو آدم"

جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خاص نعموں سے نوازنے کا ارادہ فرماتا ہے یعنی ان کو اپنی صفات سے متصف کرنا چاہتا ہے تو ان کو میدان جنگ میں آزماتا ہے جب وہ وہاں ثابت قدم رہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو اسطرح نکھار کر مکرم بنا دیتا ہے جیسے معدنیات سے جواہر کو نکھار کر نکالا جائے۔ (ماخوذ از روح البیان ج ۲ ص ۱۰۷)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خَاسِرِيْنَ ○ (آیة نمبر ۱۴۹)

(1) اے ایمان والو اگر تم کافروں کے کہے پر چلے تو وہ تمہیں الٹے پاؤں لوٹا دیں گے پھر ٹوٹا کھا کے پلٹ جاؤ گے۔ (کنز الایمان)

(2) اے ایمان والو اگر تم نے اطاعت کی کافروں کی وہ لوٹا دیں گے تمہیں الٹے پاؤں تو تم پھرو گے نقصان اٹھاتے ہوئے۔ (نجوم الفرقان)

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾

"اے ایمان والو اگر تم نے اطاعت کی کافروں کی۔"

شان نزول میں چند احتمال ہیں:

(۱) ابن جریر اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے ابن جریج سے روایت کی کہ یہ آیۃ نازل ہوئی کہ " لاتنتصحوا الیهود والنصاری عن دینکم ولاتصدقوهم بشیٔ فی دینکم" اے ایمان والو تم یہود و نصاری سے اپنے دین کے متعلق کوئی نصیحت قبول نہ کرو، اور نہ ہی اپنے دین کے متعلق ان کی کسی چیز میں تصدیق کرو ورنہ وہ تمہیں دین سے پھیر دیں گے۔ (در منثور ج ۷ ص ۸۳)

(۲) وقال علی رضی الله عنه یعنی المنافقین قولهم للمؤمنین عندالهزیمة ارجعوا الی اخوانکم وادخلوا فی دینهم" (معالم التنزیل للبغوی ج ۱ ص ۳۶۰، مظهری ج ۲ ص ۱۵۳)

شان نزول:

کے متعلق دوسرا قول حضرت علی ﷺ کا ہے کہ منافقین نے جب ایمان والوں کو کہا کہ تم پسپا ہو گئے، کفار نے اچانک تم پر حملہ کر کے تمہیں بہت بڑا نقصان پہنچادیا ہے، لھذا تم اپنے بھائیوں (کفار قریش) کی طرف لوٹ جاؤ، اور ان کے دین میں داخل ہو جاؤ، اگر محمد نبی ہوتے تو شہید نہ ہوتے، یہ اس وقت کی بات ہے جب شیطان نے یہ خبر اڑائی تھی کہ محمد شہید کر دیئے گئے۔ منافقین مشورہ دے رہے تھے کہ عبداللہ بن ابی کے پاس چلو تا کہ وہ سفارش کر کے ابوسفیان سے تمہیں امان لے کر دے، تو یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی۔

﴿یَرُدُّوْکُمْ عَلٰی اَعْقَابِکُمْ﴾ "وہ لوٹا دیں گے تمہیں الٹے پاؤں۔"

حقیقت میں لغوی معنی یہ ہے کہ وہ لوٹا دیں گے تمہیں ایڑیوں کے بل، مرادی ترجمہ وہی ہے جو ذکر کر دیا گیا۔ مطلب اس کا یہ ہے "یرجعو کم الی ما کنتم علیه قبل الاسلام عن الشرک" کہ وہ تمہیں شرک کی طرف لوٹا دیں گے، جہاں تم اسلام سے پہلے تھے۔

﴿فَتَنْقَلِبُوْا خَاسِرِیْنَ﴾ "تو تم پھرو گے نقصان اٹھاتے ہوئے۔"

یعنی اگر (بالفرض) تم نے کافروں کی اطاعت کر لی، ابوسفیان سے پناہ حاصل کر لی تو تم دنیا اور آخرت میں نقصان اٹھانے والے ہو گے، اس طرح تم نقصان اٹھاتے ہوئے دین اسلام سے کفر و شرک کی طرف پھر جاؤ گے۔
(تفسیر مظہری ج ۲ ص ۱۵۳، ۱۵۴)

تنبیہ: واعلم ان اللفظ لما کان عاما وجب ان یدخل فیه خسران الدنیا والآخرة" (کبیر ج ۹ ص ۳۱)

﴿فَتَنْقَلِبُوْا خَاسِرِیْنَ﴾ میں لفظ خاسرین عام ہے، لھذا اس کی عمومیت (عام ہونے) کو دیکھتے ہوئے ضروری ہے کہ اس سے مراد دنیا اور آخرت کا خسارا مراد لیا جائے کہ تم لوٹو گے دنیا اور آخرت کا خسارا اٹھاتے ہوئے۔

دنیا و آخرت کا خسارا کتنا عظیم ہے:

اما خسران الدنیا فلأن اشق الاشیاء علی العقلاء فی الدنیا الانقیاد للعدو والتذلل له واظهار الحاجة الیه، واما خسران الآخرة فالحرمان عن الثواب

المؤبد والوقوع فی العقاب المخلد" (کبیر ج ۹ ص ۳۱)

اگر تم نے کفار کی تابعداری کی تو تم دین اسلام سے کفر کی طرف پھر جاؤ گے اور بہت نقصان اٹھاتے ہوئے پھرو گے اس لئے کہ تم اپنے دشمن کے سامنے سر جھکاؤ گے، اس کے سامنے عجز کا اظہار کر کے اپنے آپ کو ذلیل کرو گے۔ اور اپنی حاجات کا ذکر اپنے دشمن سے کرو گے، اس سے اپنی حاجات طلب کرو گے تو اس سے بڑھ کر دنیا میں تمہیں خسارا کیا حاصل ہوگا؟ ہر عقلمند شخص اسے اپنے لئے بہت بڑا نقصان سمجھتا ہے۔ اور آخرت کا خسارا تمہیں یہ حاصل ہوگا کہ تم دائمی ثواب سے محروم ہو جاؤ گے اور ہمیشہ کے عذاب میں مبتلاء ہوگا۔

فائدہ: آیۃ کریمہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ کفار، یہود و نصاری سے اپنی حاجات طلب کرنا، ان کے سامنے سر جھکانا، ان کے سامنے عاجز ہو کر رہنا، ان سے ڈرنا سوائے دنیا اور آخرت کے خسارا کے کچھ نہیں۔ کبھی ان کو کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ کاش کہ اسلامی ممالک کے حکمرانوں کے قرآن پاک کی یہ آیۃ کریمہ سمجھ آجائے، اور کفار سے دوستی قائم کر کے جو خسارا حاصل کر رہے ہیں اس سے بچ سکیں، لیکن افسوس یہ سر جھکاتے ہی چلے جا رہے ہیں، یہود و نصاری سے بڑھ کر ان کے پیچھے اسلام کو نقصان پہنچانے کیلئے پیش پیش ہیں، لیکن جس چیز کی رب تعالی حفاظت کر رہا ہو اسے کون مٹا سکتا ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ○ (آیۃ نمبر ۱۵۰)

(1) بلکہ اللہ تمہارا مولی ہے وہ سب سے بہتر مددگار ہے۔ (کنز الایمان)

(2) بلکہ اللہ مددگار ہے تمہارا اور وہ سب سے بہتر مدد فرمانے والا ہے۔ (نجوم الفرقان)

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ نے "مَوْلٰىكُمْ" کا ترجمہ تمہارا مولا" کیا تا کہ مفسرین کرام کے بیان کئے ہوئے تمام معانی کو شامل ہو جائے۔

(بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ) محبکم وناصرکم وحافظکم علی دینه فلاتتولوا غیره تعالی"
(مظهری ج۲ ص ۱۵۵)

بلکہ اللہ تمہارا مولی ہے، یعنی وہ تمہارے ساتھ محبت رکھتا ہے۔ وہ تمہارا مددگار ہے، وہ تمہاری حفاظت کرنے والا ہے تمہیں اپنے دین پر قائم رکھ کر، لھذا تم اللہ تعالی سے اس کے غیروں کی طرف نہ پھرو یعنی دین اسلام پر قائم

رہو۔"والمعنی لیس الکفار اولیاء فیطاعوا فی شیٔ بل اللہ مولاکم" مطلب یہ ہے کہ کافر تمہارے ولی، مددگار، حامی وناصر نہیں کہ تم ان کی اطاعت کرو، ان کی اطاعت نہ کرو، بلکہ تمہارا مولی اللہ ہے تم اس کی اطاعت کرو۔

"وقرأ الحسن بنصب الجلالة علی معنی بل اطیعوا اللہ لأن الشرط السابق یتضمن معنی النھی ای لاتطیعوا الکفار فتکفروا بل اطیعوا اللہ مولاکم"

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے لفظ "اللہ" پر نصب (زبر) پڑھی ہے، اور فعل "اَطِیْعُوْا" کو محذوف مانا ہے کہ پہلے مذکور شرط ﴿اِنْ تُطِیْعُوا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَرُدُّوْکُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ﴾ سے یہ سمجھ آرہا ہے کہ یہاں بھی نہی پائی گئی ہے معنی یہ ہے کہ کافروں کی اطاعت نہ کرو، ان کی اطاعت کرنے سے کافر ہو جاؤ گے، بلکہ اللہ تعالی کی اطاعت کرو وہی تمہارا مولی ہے۔ (البحر المحیط ج ۳ ص ۱۱۳)

﴿وَھُوَ خَیْرُ النّٰصِرِیْنَ﴾ "وہ سب سے بہتر مدد فرمانے والا ہے۔"

اللہ تعالی سب سے بہتر مددگار کیوں ہے؟ اسلئے کہ "انہ تعالی ھو القادر علی نصرتک فی کل ماترید" اللہ تعالی قادر ہے، تم اس سے جو مدد طلب کرو وہ تمہاری امداد فرماتا ہے، کیونکہ وہ تمہاری امداد فرمانے پر قادر ہے، اس کی قدرت سے کوئی بعید نہیں۔ سب سے بہتر مددگار ہونے کی اور وجہ یہ ہے "وھو العالم الذی لایخفی علیہ دعاؤک وتضرعک" کہ اللہ تعالی ہر ظاہر و باطن کو جانتا ہے، اس لئے تمہاری دعاء اور تمہاری عاجزی اس سے چھپی ہوئی نہیں، تم جو دعاء کرتے ہو اور اپنی عاجزی پیش کرتے ہو اللہ تعالی، سے جانتا ہے اور وہ تمہاری امداد فرماتا ہے۔

سب سے بہتر مددگار ہونے کی اور وجہ یہ ہے "ھو الکریم الذی لایبخل فی جودہ" کہ اللہ تعالی کریم ہے، وہ جواد ہے اسے بخل حاصل نہیں، وہ جتنا چاہے عطاء کرنے اس کے خزانہ میں کوئی کمی نہیں۔ بعض انسان اگرچہ دوسروں کی امداد کرتے ہیں لیکن ان کی امداد کو اللہ تعالی کی امداد سے کیا نسبت ہوسکتی ہے ان کی قدرت وعلم وسخاوت کو جب رب تعالی کی قدرت وعلم وجود کے مقابل کچھ نسبت حاصل نہیں تو یقیناً بندوں کی مدد دوسرے بندوں کی بنسبت رب تعالی کی امداد کے کمترین رہتی ہے۔

اور وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی دنیا اور آخرت میں امداد فرما تا ہے، بندوں کو ذاتی طور پر خود بخود یہ طاقت حاصل نہیں۔ (اگرچہ انبیاء کرام اور صلحاء کو شفاعت کرنے کا حق یوم آخرت کو دیا جائے گا لیکن وہاں بھی حقیقی امداد رب تعالی کی طرف سے حاصل ہوتی ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ رب تعالی بندوں کی حاجات کو جانتا ہے وہ ان کو سوال سے پہلے ہی عطاء کر دیتا ہے، بندوں کو یہ طاقت حاصل نہیں۔ (ماخوذ از کبیر ج ۹ ص ۳۱)

لھذا اے انسان تو اپنے گناہوں کی معافی صرف اللہ تعالیٰ سے ہی طلب کر، معاف کرنے کی صرف اسے ہی طاقت حاصل ہے۔

کنوں بایدت عذر تقصیر گفت — نہ چوں نفس ناطق زگفتن بخفت

اب تجھے چاہئے کہ تو اپنے گناہوں کا عذر پیش کر — اس وقت (کوئی فائدہ) نہیں کہ تیری زبان بولنے سے بند ہو جائے

تو پیش از عقوبت در عفو کوب — کہ سودے ندارد فغان زیر چوب

تو سزا سے پہلے معافی کا دروازہ کھٹکا — اس وقت شور کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا جب ڈنڈہ تیرے سر پر پڑ رہا ہوگا

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَکُوْا بِاللّٰہِ مَالَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ سُلْطٰنًا وَّمَاْوٰھُمُ النَّارُ وَبِئْسَ مَثْوَی الظّٰلِمِیْنَ○ (آیۃ نمبر ۱۵۱)

(1) کوئی دم جاتا ہے کہ ہم کافروں کے دلوں میں رعب ڈالیں گے کہ انہوں نے اللہ کا شریک ٹھہرایا جس پر اس نے کوئی سمجھ نہ اتاری اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور کیا برا ٹھکانا ناانصافوں کا۔ (کنزالایمان)

(2) عنقریب ہم ڈالیں گے کافروں کے دلوں میں رعب اس وجہ سے کہ انہوں نے شریک ٹھہرایا اللہ سے (اسے) کہ نہیں نازل ہوئی اس (کے شریک ہونے) پر کوئی حجت، اور ان کا ٹھکانا آگ ہے، اور کتنا ہی برا ٹھکانا ہے ناانصافوں کا (نجوم الفرقان)

شان نزول:

❁ واخرج ابن ابی حاتم عن ابن عباس فی ھذہ الآیۃ قال قذف اللہ فی قلب ابی سفیان الرعب فرجع الی مکۃ فقال النبی ﷺ ان اباسفیان قداصاب منکم طرفا وقد رجع وقذف اللہ فی قلبہ الرعب"

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس ؓ سے اس آیۃ کریمہ کا شان نزول یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابوسفیان کے دل میں رعب ڈال دیا ہے، نبی کریم ﷺ صحابہ کرام کو بتایا کہ ابوسفیان کو تمہارا خوف لاحق ہو گیا

اور اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں رعب ڈال دیا، اسی لئے وہ مکہ کی طرف لوٹ گیا۔ (درمنثور ج۲ص ۸۳)

ابن جریر نے سدی سے تفصیلی روایت ذکر کی ہے:

❁ "اخرج ابن جریر عن السدی قال لما ارتحل ابو سفیان والمشرکون یوم احد متوجهین نحو مکة انطلق ابو سفیان حتی بلغ بعض الطریق ثم انهم ندموا فقالوا بئسما صنعتم انکم قتلتموهم حتی لم یبق الا الشرید ترکتموهم ارجعوا فاستأصلوا فقذف الله فی قلوبهم الرعب فانهزموا فلقی اعرابیا فجعلوا له جعلا فقالوا له ان لقیت محمد افاخبرهم بماقد جمعنالهم، فاخبر الله رسوله ﷺ فطلبهم حتی بلغ حمراء الاسد فانزل الله فی قلوب الذین کفروا الرعب الآیة" (درمنثور ج ۲ ص ۸۳)

"ابن جریر" نے سدی روایت ذکر ہے کہ جب ابوسفیان اور دوسرے مشرکین غزوہ احد سے مکہ کی طرف لوٹے، ابوسفیان نے راستہ میں چلتے ہوئے کہا اور۔ تھ ہی دوسرے مشرکین بھی کہنے لگے، وہ سب بظاہر پشیمان ہورہے تھے، اور ایک دوسرے کو کہہ رہے تھے، تم نے بہت ہی برا کیا ہے کہ مسلمانوں کو تم نے قتل تو کیا ہے لیکن بہت ان میں سے بکھرے ہوئے تھے جن کو تم نے قتل نہیں کیا وہ باقی رہ گئے ہیں، اس لئے واپس چلو ان کا مکمل صفایا کردو، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا وہ بھاگ گئے، اس طرح حقیقت میں شکست انہیں ہی ہوئی، حالانکہ وہ پہلے ایک اعرابی کو کہہ رہے تھے کہ محمد کو ل کر بتاؤ کہ ہم ایک مرتبہ پھر تم پر جمع ہو کر مقابلہ کر رہے ہیں۔ ادھر رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خبر دے دی آپ نے بھی اپنے ان صحابہ کو جو غزوہ احد میں شریک ہوئے تھے اور زخمی بھی تھے، ساتھ لیا کفار کا پیچھا کیا، جب نبی کریم ﷺ مقام حمراء میں پہنچے تو یہ آیۃ کریمہ ﴿سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ نازل ہوئی۔ تو وہ رعب میں آ گر ڈر کے مارے بھاگ گئے۔ خیال رہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ کو اس خاص موقع پر نازل کیا، لیکن یہ اپنے مضمون کے لحاظ پر عام ہے، یعنی کافر ہمیشہ ہی مسلمانوں سے ڈرتے ہی رہیں گے۔ (خازن) البتہ یہ ضروری ہے کہ مسلمان ان کے مقابلہ کیلئے نکلیں، تو ان شاء اللہ کافر ہر میدان سے دم دبا کر بھاگ جائیں گے۔

❁ واخرج مسلم عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ قال نصرت بالرعب علی العدد" (درمنثور ج۲ص ۸۳)

مسلم شریف میں حضرت ابوھریرہ ﷺ سے مروی ہے کہ بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دشمن پر رعب ڈال کر میری امداد فرمائی گئی۔

❁ واخرج احمد والترمذی وصححه وابن المنذر وابن مردویه والبیهقی فی سننه عن

ابی امامة ان رسول اللهﷺ قال فضلت علی الانبیاء باربع ارسلت الی الناس کافة وجعلت لی الارض کلها ولأمتی مسجدا وطهورا فاینما رجل أدرکه من أمتی الصلوة فعنده مسجده وعنده طهوره ونصرت بالرعب مسیرة شهر یقذفه فی قلوب اعدائی واحل لنا الغنائم" (درمنثور ج ۲ ص ۸۳)

''ابوامامہ'' فرماتے ہیں بیشک رسول اللہﷺ نے فرمایا مجھے انبیاء پر چار چیزوں سے فضیلت دی گئی مجھے تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا، اور میرے لئے اور میری امت کیلئے تمام زمین کو مسجد اور مطہر (پاکیزہ کرنے والی) بنادیا گیا، میری امت میں سے جہاں بھی کسی شخص نے نماز کے وقت کو پالیا وہاں ہی (وہ زمین) اس کیلئے مسجد ہے۔ اور وہاں ہی اس کیلئے پاکیزہ کرنے والی چیز (یعنی مٹی موجود ہے) اور ایک مہینہ کی راہ سے میرے دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈال کر میری امداد کی گئی، اور مال غنیمت میرے لئے حلال کردیا گیا۔

ان دونوں روایات سے بھی عموم سمجھ آتا ہے، کیا یہ عموم صرف نبی کریمﷺ کیلئے تھا یا آپ کی امت کو بھی یہ شرف حاصل ہے کہ کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا گیا؟ راقم کے نزدیک یہ حکم عام ہے جو امت مصطفیٰ کریمﷺ کو بھی حاصل ہے۔ ''الرعب'' عین کے سکون سے ہے، البتہ عامر اور کسائی کی قراءت میں عین کے پیش سے پڑھا گیا ہے۔

''وھما لغتان'' یہ دونوں لغتیں ہیں جو جائز ہیں۔ ''رعب'' میں مصدری معنی بھی پایا جاتا ہے ''رعبته رعبا'' میں نے اس پر رعب ڈالا۔ اس طرح جو رعب میں آجائے اسے مرعوب کہا جاتا، اور ''رعب'' میں اسمی معنی بھی پایا جاتا ہے، یعنی ''خوف'' کو رعب کہا جاتا ہے۔ ''والرعب الاسم واصله من الملء'' رعب کا اصل میں معنی ہے بھر دینا۔ کہا جاتا ہے ''سیل راعب یملأ الوادی'' ندی وادی کو بھر رہی ہے۔ ''رعبت الحوض، ملأته'' میں نے حوض کو بھر دیا ہے۔ خوف اور فزع کو اس لئے رعب کہا جاتا ہے کہ یہ مشرکین کے دلوں کو خوف سے بھر دیتا ہے۔

اب ﴿سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ کا معنی ہوگیا ''سنملأ قلوب المشرکین خوفا وفزعا'' ہم عنقریب مشرکوں کے دلوں کو خوف اور فزع سے بھر دیں گے۔ (قرطبی ج ۴ ص ۲۳۲)

تنبیه: القاء حقیقی معنی کے لحاظ پر اجسام سے متعلق ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات گرامی میں ہے ''والقی الالواح'' (اور ڈال دیا تختیوں کو) اور ارشادات باری تعالیٰ ہے ﴿فَأَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ﴾ (تو انہوں نے اپنی رسیاں اور عصاء ڈالے) اور ذکر ہے ﴿فَأَلْقَىٰ مُوسَىٰ عَصَاهُ﴾ (تو ڈالا موسیٰ نے اپنا عصا) القاء کا مجازی معنی دلوں

میں کسی چیز کوڈال دینا جیسا کہ اسی زیر بحث میں ہے ﴿سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا الرُّعْبَ﴾ عنقریب ہم ڈال دیں گے کافروں کے دلوں میں رعب" اسی طرح اورارشاد باری تعالی ﴿وَاَلْقَیْتُ عَلَیْکَ مَحَبَّۃً مِّنِّیْ﴾ میں نے تجھ پر اپنی طرف کی محبت ڈالی، یعنی موسی علیہ السلام کی محبت لوگوں کے دلوں میں ڈالی، یہی وجہ تھی کہ فرعون نے موسی علیہ السلام کی وجہ سے بنی اسرائیل کے ہزاروں بچوں کو قتل کر دیا، لیکن موسی علیہ السلام کو اپنے گھر پالا، کیونکہ فرعون کے دل میں بھی آپ کی محبت کوڈال دیا گیا تھا۔

﴿بِمَا اَشْرَکُوْا بِاللّٰہِ﴾ "اس وجہ سے کہ انہوں نے شریک ٹھہرایا اللہ سے۔"

﴿مَالَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ﴾ "ای باشراکہ وقیل بعبادتہ" یعنی کفار جسے اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں اس کے شریک ہونے اوراس کے معبود ہونے پر کوئی دلیل) اللہ تعالی نے نہیں اتاری (روح المعانی) یعنی مشرکین نے کئی معبود بنا رکھے ہوتے ہیں، وہ اس میں حیران ہوتے ہیں کہ کسی کی عبادت کریں اور کسی کی عبادت نہ کریں، ان کے معبودوں پر ان کے پاس کوئی عقلی اور نقلی دلیل موجود نہیں تھی، ان کا حال تو یہ تھا کہ ایک پتھر خوبصورت دیکھا تو اس کی پوجا شروع کر دی اور جب اس سے زیادہ خوبصورت اور کوئی پتھر نظر آیا تو پہلے بت کو پھینک کر نئے بت کی پوجا کرنے لگ گئے۔

(سلطانا)"حجة وبیانا وعذرا وبرھانا" یعنی نہیں نازل ہوئی اس کے شریک ہونے اور معبود ہونے پر کوئی حجت ودلیل، اور نہ ہی نازل ہوا اس پر کوئی بیان، اور نہ ہی نازل ہوا ان پر کوئی عذر اور نہ ہی برھان۔"انہ حجة اللہ عزوجل" کہ وہ اللہ تعالی کی حجت دلیل ہے زمین میں۔اور دوسری وجہ یہ ہے"انہ ذوالحجة" کہ بادشاہ صاحب حجت ودلیل ہے کہ وہ اپنے فیصلے دلائل سے کرتا ہے، اسی لئے اسے سلطان کہا جاتا ہے۔"قال الزجاج انہ من السلیط الذی یضاء بہ السراج وھو دھن السمسم" زجاج نے کہا ہے کہ "سلطان" ماخوذ ہے سلیط سے، سلیط اس چیز کو کہتے ہیں جس سے چراغ روشن کیا جاتا ہے۔اگر چہ چراغ میں استعمال ہونے والا کوئی تیل بھی ہو اسے سلیط کہا جاتا ہے۔تاہم زیادہ طور پر اس کا اطلاق تلوں کے تیل پر ہے۔جیسا کہ امرؤالقیس نے کہا ہے" اما السلیط بالذبال المفتل"اس نے بٹی ہوئی بتی پر تیل انڈیلا"فالسلطان یستضاء بہ فی اظھار الحق وقمع الباطل" اس معنی کے لحاظ پر بادشاہ کو سلطان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ بادشاہ کے ذریعے حق کے اظہار اور باطل کے مٹانے کی روشنی حاصل کی جاتی ہے۔"وقیل للامراء سلاطین لانھم الذین بھم یتوصل الناس الی تحصیل الحقوق" اس معنی کے لحاظ پر بادشاہوں کو سلاطین کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح چراغ سے راہ کو تلاش کیا جاتا ہے اسی طرح بادشاہوں کے ذریعے لوگ اپنے حقوق حاصل کرتے ہیں۔

قال اللیث"السلطان القدرة لأن اصل بنائہ من التسلیط،وعلی ھذا سلطان الملک قوتہ وقدرتہ"

لیث نے بیان کیا ہے کہ سلطان کا معنی قدرت ہے، یہ لیا ہوا ہے تسلیط سے جس کا معنی ہے قدرت، اس معنی کے لحاظ پر بادشاہ کی قوت وقدرت کو بھی سلطان کہا جاتا ہے۔"قال ابن دريد السليط الحديد، والسلاطة "لو ہے کو سلیط کہا جاتا ہے۔اور آلات کی تیزی کو حدۃ کہا جاتا ہے۔اسی معنی کی مناسبت سے یوں کہا جا سکتا ہے"السلطان يقهر بالسلطان على السلطان" بادشاہ طاقت سے دوسرے بادشاہ پر قہر کرتا ہے اور دبدبہ ڈالتا ہے۔"والسليطة المراة الصخابة والسليط الرجل الفصيح اللسان" چلانیوالی عورت کو سلیطہ کہا جاتا ہے۔اور فصیح اللسان شخص کو سلیط کہا جاتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر ج۹ص ۳۳، قرطبی ج۴ص ۲۳۲)

اعتراض: رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿مَالَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا﴾ نہیں نازل کی اس پر کوئی حجت، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حجت نہ ہو، ہوسکتا ہے کہ حجت تو ہو لیکن اللہ تعالی نے اسے اتارا نہ ہو اور ظاہر نہ کیا ہو۔

جواب: "لو كان لانزل الله به سلطانا فلما لم ينزل به سلطانا وجب عدمه"

اگر دلیل ہوتی تو اللہ تعالی ضرور نازل فرماتا، جب اس نے کوئی دلیل نازل نہیں کی تو اس کا مطلب واضح ہے کہ کافروں کے معبودوں اور ان کے شریک ٹھہرانے پر حقیقت میں کوئی دلیل ہی نہیں۔

وحاصل الكلام فيه مايقوله المتكلمون ان هذا ممالادليل عليه فلم يجز اثباته ومنهم من يبالغ فيقول لادليل عليه فيجب نفيه"

حاصل کلام اس میں جو متکلمین نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس پر کوئی دلیل نہیں لھذا اسے ثابت کرنا جائز نہیں۔بعض حضرات نے اس پر زیادہ مبالغہ کرتے ہوئے یوں کہا ہے کہ جس پر دلیل نہیں اس کی نفی واجب ہے۔ (کبیر ج۹ص ۳۳)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

قضیہ سالبہ وجود موضوع کو نہیں چاہتا، یعنی ضروری نہیں کہ موضوع موجود ہو پھر اس سے نفی کی جائے، موضوع موجود نہ ہو اور اس سے نفی کرنا صحیح ہے، جیسا کہا جائے"شريک الباري ليس بمستحق العبادة"شریک باری تعالی مستحق عبادت نہیں، اس جملہ کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی شریک باری تعالی ہے کہ ہم اس کی عبادت نہیں کر سکتے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کی کوئی رب تعالی کا نہ شریک ہے اور نہ ہی عبادت کے مستحق ہے۔اسی طرح کہا جاتا ہے"ولاترى الضب بها ينحجر" تو گوہ کو بل میں گھستے ہوئے نہیں دیکھ رہا"فالمراد نفيهما جميعا" یہاں مراد دونوں چیزوں کی نفی ہے، یعنی نہ گوہ ہے اور نہ ہی وہاں بل (سوراخ) ہے۔

"وذکر عدم انزال الحجة مع استحالة تحققها من باب انتفاء المقید لانتفاء قیده اللازم ای لاحجة حتی ینزلها"

یہاں آیۃ کریمہ میں جو حجت کے نازل نہ کرنے کا ذکر ہے اس سے حجت کے پائے جانے کی بھی نفی کی جارہی ہے، یہ اسی طرح ہے جیسا کہ قید بھی "منتفی" ہو اور قید بھی "منتفی" ہو۔لھذا یہاں مطلب یہ ہے کہ حجت ہے ہی نہیں کہ اسے اتارا جائے۔ (ماخوذ از روح المعانی ج۳ص۸۸)

رب تعالیٰ کی شرکت پر حجت کا پایا جانا محال ہے:

یہ دین کا مسئلہ بدیہی ہے کہ رب تعالیٰ کا نہ ہی کوئی شریک ہی اور نہ ہی اس کی شرکت پر کوئی دلیل قائم ہے۔شرکت پر دلیل کا پایا جانا محال ہے۔

"امافی الاشراک بالربوبیة وظاهر اذکیف یأمر الله سبحانه باعتقاد ان خالق العالم اثنان مشترکان فی وجوب الوجود والاتصاف بکل کمال"

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی ربوبیت میں شرکت کی اجازت دی جائے یہ محال ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی حکم دے کہ تم عقیدہ رکھو کہ جہان کے خالق دو ہیں اور واجب الوجود ہونے میں اور تمام کامل صفات کے حاصل کرنے میں وہ برابر شریک ہیں۔واضح ہوا کہ رب تعالیٰ کی شرکت پر کوئی حجت نہیں تھی کہ اسے نازل کیا جاتا۔

واما الاشراک فی الالوهیة الذی علیه اکثر المشرکین فی عهد رسول الله ﷺ فلأنه یفضی الی الأمر باعتقاد اشیاء خلاف الواقع مما کان المشرکون یعتقدونهم فی اصنامهم"

رب تعالیٰ کی الوہیت (اس کے معبود ہونے) میں شرکت محال ہے، کیونکہ مشرکین کا بتوں کی پوجا کرنا خلاف واقع چیز کا اعتقاد تھا جو باطل ہے۔واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے شریک ہونے کے تمام احتمالات باطل ہیں۔لھذا شرکت پر نہ کوئی حجت تھی نہ ہی اسے نازل کیا گیا۔ (ماخوذ از روح المعانی ج۳ص۸۸)

صانع صرف ایک ہے:

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر یہ دلیل قائم کی گئی "لا سبیل الی اثبات الصانع الا باحتیاج المحدثات الیه" صانع وہی ہوسکتا ہے کہ تمام محدثات (تمام مخلوق) اس کے محتاج ہو، جب ساری کائنات محتاج صرف رب تعالیٰ کی ہے تو اسی سے پتہ چل گیا کہ صانع صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، (ماخوذ از کبیر ج۹ص۳۳)

کاش کہ جہلاء علامہ رازی رحمہ اللہ کے قول کو سمجھتے:

هذه الآية دالة على فساد التقليد وذلك لان الآية دالة على ان الشرک لادليل عليه فوجب ان يكون القول به باطلا"

اس آیۃ کریمہ سے پتہ چلا کہ تقلید کا قول فاسد ہے۔ کیونکہ آیۃ کریمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ رب تعالی کے شریک کے پائے جانے پر کوئی دلیل نہیں، اس لئے ضروری ہے کہ شریک ٹھہرانے پر دلیل کے قائم ہونے کا اگر کوئی دعوی کرے تو اس کا قول باطل ہوگا اور اس کی تقلید بھی باطل ہوگی۔ (کبیر ج۹ ص۳۳)

علامہ رازی رحمہ اللہ کے اس قول سے بعض لوگ مطلقا تقلید کی نفی کرتے ہیں، اور کہتے یہ ہیں کہ علامہ رازی رحمہ اللہ بھی تقلید کی نفی کرتے ہیں۔ یہ قول ان لوگوں کا باطل ہے، کیونکہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے تقلید کی نفی کے دو قول مختلف جگہ پر بیان کئے ہیں، ایک یہ کہ اعتقادیات میں تقلید نہیں۔ اور دوسرا قول جو یہاں بیان کیا ہے کہ جس چیز کا باطل ہونا صریح ہو اس کی تقلید نہیں، جیسا کہ رب تعالی کا شریک ٹھہرانا باطل ہے اور اس پر کوئی دلیل قائم کرنا بھی باطل ہے، لھذا اس کی تقلید بھی نہیں کی جاسکتی، تیسرا قول جو نجوم الفرقان" میں پہلے ہی بیان کیا جاچکا ہے کہ فروع میں تقلید ہے۔ یہی تین قول بفضلہ تعالی ہمارا مسلک ہے۔ لھذا ضروری ہے کہ اہل علم کے اقوال کو سمجھا جائے۔ (راقم)

﴿وَمَأْوٰىهُمُ النَّارُ﴾ "اور ان کا ٹھکانا آگ ہے۔"

یعنی مشرک جہنم کی آگ میں رہیں گے، یہی ان کا ٹھکانا ہوگا، اس سے پہلے اللہ تعالی نے مشرکوں کے دنیا کے حال کو بیان کیا، ﴿سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ (کہ ہم عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے) اب ان کے اخروی حال کو بیان کیا جارہا ہے، "وهي ان ماواهم ومسكنهم النار" کہ ان کا ٹھکانا، ان کا مسکن جہنم کی آگ ہوگا۔

﴿وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ﴾ "کتنا ہی برا ٹھکانا ہے ظالموں کا۔"

یہاں مخصوص بالذم محذوف ہے، اور وہ نار (آگ) ہے، یعنی" آگ ظالموں کا کتنا ہی برا ٹھکانا ہے۔ یہاں اسم ظاہر کو لایا اسم ضمیر کو نہیں۔ تاکہ ان کا ظالم ہونا واضح طور پر ذکر ہو جائے اور ان کا مستحق آگ ہونے کا سبب بھی معلوم ہو جائے، کہ آگ ان کا ٹھکانا ہوگی، جو بہت برا ٹھکانا ہوگا ان کا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ظالم ہیں، ظالم کا حق یہی ہے کہ ان کو سخت عذاب دیا جائے۔

(ماخوذ از مظہری ج۳ ص۱۵۴)

﴿مَأْوٰی﴾ اور ﴿مَثْوٰی﴾ میں فرق:

(مَـأْوٰی) لیا ہے اوی یأ وی اویا واواء (ض) گھر میں اترنا، اور گھر میں ٹھکانا لیا" کبھی اس کا معنیٰ" کسی پر رحم کرنا، نرم دل ہونا، ترس کھانا" بھی آتا رہتا ہے، لیکن اس وقت مصدر "اویۃ" آتا ہے۔ (مَثْوٰی) لیا ہوا ہے، ثوی یثوی ثواء (ض) سے، اس کا معنیٰ کسی جگہ ٹھہرنا، آباد ہونا اور کسی آدمی کا مرنا "اثـوی" ٹھہرنا، کسی کی مہمانی کرنا "اثـواہ" کسی کو ٹھہرانا۔ (مثوی ظرف مکان ہے) اب فرق واضح ہو گیا کہ ماٰوی میں آباد ہونا، اور مستقل ٹھہرنا لازم نہیں، بلکہ صرف گھر میں اترنا اور گھر میں ٹھکانا لینا مراد ہے، لیکن مثوی میں ٹھکانا بنانا لازم ہے، یہی وجہ ہے کہ (مَـأْوٰی) کو پہلے ذکر کیا، وہ عام ہے اور (مَثْوٰی) کو بعد میں ذکر کیا وہ خاص ہے۔ (ماخوذ از المنجد، والبحر المحیط ج ۳ ص ۱۱۵)

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰٮكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (آیۃ نمبر ۱۵۲)

(1) اور بیشک اللہ نے تمہیں سچ کر دکھایا اپنا وعدہ جبکہ تم اس کے حکم سے کافروں کو قتل کرتے تھے یہاں تک کہ جب تم نے بزدلی کی اور حکم میں جھگڑا ڈالا اور نافرمانی کی بعد اس کے کہ اللہ تمہیں دکھا چکا تمہاری خوشی کی بات تم میں کوئی دنیا چاہتا تھا اور تم میں کوئی آخرت چاہتا تھا پھر تمہارا منہ ان سے پھیر دیا کہ تمہیں آزمائے اور بے شک اس نے تمہیں معاف کر دیا اور اللہ مسلمانوں پر فضل کرتا ہے۔ (کنز الایمان)

(2) اور تحقیق سچ کر دکھایا تمہیں اللہ نے اپنا وعدہ جب تم قتل کر رہے تھے ان کو اس کے حکم سے یہاں تک کہ تمہاری رائے ضعیف ہوگئی اور تم نے جھگڑا کیا امر میں، اور نافرمانی کی تم نے اس کے بعد کہ اس نے دکھایا تمہیں جو تم پسند کرتے تھے، تم میں بعض وہ ہیں جو دنیا کا ارادہ رکھتے تھے اور تم میں سے

بعض وہ ہیں جو آخرت کا ارادہ رکھتے تھے، پھر اس نے پھیر دیا تمہیں ان سے تا کہ تمہیں آزمائے اور تحقیق معاف کر دیا اس نے تمہیں اور اللہ فضل فرمانے والا ہے مؤمنوں پر۔ (نجوم الفرقان)

مختصر مطلب:

اللہ تعالی کا ایمان والوں سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے یہ وعدہ ہے۔

﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ (سورۃ آل عمران، آیۃ نمبر ۱۳۹)

''اور نہ سستی کرو اور نہ غم کھاؤ تمہیں غالب آؤ گے اگر ایمان رکھتے ہو۔'' (کنز الایمان)

اللہ تعالی نے یہ وعدہ غزوہ احد میں بھی سچا کر دیا کہ مؤمنین کافروں کو رب تعالی کے حکم اور اس کے فضل سے قتل کر رہے تھے، جسے وہ پسند کرتے تھے یعنی فتح کو وہ ابتدائی طور پر مکمل کامیابی حاصل کر لی یہاں تک کہ مال غنیمت جمع کرنے لگے، لیکن صحابہ کرام سے اجتہادی خطاء ہوگئی کہ نبی کریم ﷺ سے کئے ہوئے وعدہ میں اور آپ کے اس حکم میں کہ تم نے اس درہ کو نہیں چھوڑنا خواہ ہمیں فتح حاصل ہو یا نہ ہو، اس میں صحابہ کرام اختلاف کرنے لگے کچھ نے کہا اب فتح ہو چکی ہے مال غنیمت جمع کیا جا رہا ہے اس لئے ہمیں بھی مال غنیمت جمع کرنے میں شریک ہو جانا چاہئے۔ وہ مال غنیمت جمع کرنے کیلئے درہ چھوڑ آئے، لیکن کچھ حضرات نے کہا ہم درہ نہیں چھوڑیں گے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں درہ نہ چھوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اس اختلاف پر اور درہ کے خالی ہونے پر کفار کو اچانک حملہ کرنے کا موقع مل گیا، جس سے صحابہ کرام ادھر ادھر بکھر گئے گویا کہ ان سے ضعف رائے واقع ہوئی۔

اس کی وجہ یہی تھی کہ درہ میں کھڑے ہوئے تیراندازوں نے دنیا کا مال حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا، کہ وہ مال غنیمت جمع کرنے کی غرض سے درہ کو چھوڑ آئے، اگر چہ حضرت عبداللہ بن جبیر اور ان کے دس ساتھی (رضی اللہ عنہم) آخرت کے ثواب کا ارادہ رکھتے ہوئے اپنی جگہ جمے رہے اور شہید ہو گئے، لیکن انتالیس حضرات کے درہ چھوڑنے کی وجہ معاملہ الٹ ہو گیا۔ رب تعالی نے ایمان والوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ نے تمہیں کفار سے پھیر دیا کہ پہلے تم ان پر غالب آ رہے تھے لیکن اب وہ تم پر چھا رہے تھے جس کی وجہ سے رب تعالی نے تمہیں ان سے پھیر دیا یعنی تم ادھر ادھر بکھر گئے، یہ درحقیقت تمہاری آزمائش تھی کہ اس حال میں ایمان پر کون قائم رہتا ہے اور کون نہیں۔ اور اللہ تعالی نے اس کے بعد تمہیں معاف کر دیا کہ تم ایمان پر قائم رہے، اللہ تعالی ایمان والوں پر فضل فرمانے والا ہے۔

اس آیۃ کا ماقبل سے تعلق اور شان نزول:

اس میں چند وجوہ پائی گئی ہی۔

(۱) جب نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام غزوہ احد سے مدینہ طیبہ کی طرف لوٹے حال یہ تھا کہ ستر صحابہ کرام شہید ہو چکے تھے اور کثیر تعداد میں شدید زخمی تھے، اس کیفیت کو دیکھتے ہوئے راستہ میں "قال ناس من اصحابه من این اصابنا هذا وقد وعدنا الله النصر فانزل الله هذه الآية" بعض صحابہ کرام نے یہ کہا کہ ہمیں یہ مصیبت کہاں سے پہنچ گئی حالانکہ رب تعالی نے ہمارے ساتھ امداد کا وعدہ فرمایا تھا، تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی، کہ اللہ تعالی نے اپنی امداد کا وعدہ سچا کر دیا تھا، تمہیں کامیابی عطاء کردی تھی لیکن تم اپنی غلطی کی وجہ سے آزمائش میں مبتلاء ہو گئے۔

(۲) بعض حضرات نے اور وجہ یہ بیان کی کہ نبی کریم ﷺ نے خواب دیکھا کہ ایک دنبہ ذبح کیا جارہا ہے، "فصدق الله رؤياه بقتل طلحة بن عثمان صاحب لواء المشركين يوم احد وقتل بعده تسعة نفر على اللواء" تو اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کے اس خواب کو سچا کر دیا کہ مشرکوں کا علمبردار طلحہ بن عثمان احد کے دن قتل ہو گیا، اور اس کے بعد مشرکوں کے نو شخص قتل ہو گئے جو ان کے علمبردار تھے، نبی کریم ﷺ کے اس خواب کے سچا ہونے کے متعلق نازل فرمایا ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ﴾ تحقیق سچ کر دیا اللہ نے جو تمہارے ساتھ وعدہ کیا تھا۔

(۳) جائز ہے کہ اس وعد سے مراد، اللہ تعالی کا قول ہو ﴿وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ﴾ البتہ ضرور بر ضرور اللہ تعالی اس کی امداد کرے گا جو اس کے دین کی امداد کرے گا۔ رب قدوس نے اپنے وعدہ کو مشروط کر دیا کہ جو اس کے دین یا اس کے رسول ﷺ کی امداد کرے گا تو اللہ تعالی بھی اس کی امداد کرے گا، رب تعالی نے اپنے اس وعدہ کو سچا کر دیا کہ جب تک تم رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق درہ میں کھڑے رہے تم ہی کافروں کو قتل کرتے رہے، لیکن جب آپ کے حکم خلاف تم درہ سے ہٹ گئے تو تم پسپا ہو گئے۔

(۴) اور اس سے مراد وہ وعدہ ہے جو ساتھ ہی پہلی آیۃ کریمہ میں بیان کیا گیا ﴿سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ عنقریب ہم ڈال دیں گے کافروں کے دلوں میں رعب" اب اس آیۃ کریمہ کو نازل کر کے یہ بیان کیا کہ اللہ تعالی نے اپنا وعدہ سچا کر دیا کہ کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیا کہ وہ بھاگ کر چلے گئے۔ (ماخوذ از کبیر ج ۲ ص ۳۴)

"صدق" دومفعولوں کی طرف متعدی ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے "صدقتہ الوعد والوعید" میں نے فلاں سے کئے ہوئے وعدہ یا وعید کو سچا کر دیا۔ آیۃ کریمہ میں ایک مفعول "کم" ضمیر ہے، اور دوسرا مفعول "وعدہ" ہے۔ اصل میں ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ﴾ کا یہ ہے کہ تحقیق سچا کر دیا تمہارے ساتھ اللہ نے اپنا وعدہ"

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ اور پیر محمد کرم شاہ بھیروی الازہری رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے "سچ کر دکھایا" **راقم** نے بھی یہی نقل کیا، یہ صرف اردو محاورہ ہے ورنہ دکھایا کسی لفظ کا معنی نہیں۔ ﴿اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ﴾ جب تم قتل کر رہے تھے ان کو اس (رب تعالیٰ) کے حکم سے "حسہ" (ن) حسا (بالفتحہ) قتل کرنا، جڑ سے اکھیڑ دینا۔ آیۃ کریمہ میں یعنی معنی لیا گیا ہے، اس کے اور بھی کئی معانی ہیں "حس البرد الزرع" سردی کا کھیتی کو مار دینا، جلا دینا "حسّ" (ض) حسا (بالفتحۃ) الشیٔ، معلوم کرنا۔ حس (س ض) حسا (بالفتحہ و بالکسر) بالخبر یقین کرنا، معلوم کرنا۔ (المنجد بالاختصار)

(بِاِذْنِهٖ) ای بعلمہ "اللہ کے علم سے۔ (ای بتیسیرہ و توفیقہ" اللہ کے آسان کرنے سے اور اس کی توفیق سے۔

(روح المعانی)

﴿اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ﴾ ای تقتلونھم ذریعا بقضاء اللہ" جب تم ان کو قتل کر رہے تھے اللہ کے حکم سے۔

(معالم التنزیل للبغوی)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ بغوی رحمہ اللہ کے مطابق ہے، **راقم** نے بھی یہی معنی نقل کیا ہے۔ مختصر مطلب جو بیان کیا گیا ہے۔ اس سے مسئلہ کافی حد تک سمجھ آ چکا ہے، تاہم کچھ وضاحت کی جا رہی ہے۔

وصدق الوعد ھو انھم ھزموا المشرکین اولا و کان المشرکون فی ثلاثۃ آلاف ومعھم مائتا فرس والمسلمون فیٔ سبعمائۃ رجل"

اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے امداد کا کیا ہوا وعدہ سچا کر دیا کہ شروع میں مشرکوں کو مسلمانوں نے شکست دی حالانکہ مشرکین کی تعداد تین ہزار تھی، ان کے پاس دو سو گھوڑے تھے، لیکن مؤمنین کی تعداد سات سو تھی، کیونکہ تین سو کی تعداد میں منافقین بھاگ آئے تھے۔

"ومعنی تحسونھم" تقتلونھم و کانوا قتلوا من المشرکین اثنین وعشرین رجلا"

﴿اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ﴾ کا معنی یہ ہے کہ جب تم قتل کر رہے تھے، ابتدائی طور پر صحابہ کرام نے بائیس مشرکین کو قتل کر دیا تھا۔ (البحر المحیط ج ۳ ص ۱۱۵)

﴿حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ﴾ "یہاں تک کہ تمہاری رائے جب ضعیف ہو گئی۔"

﴿حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ﴾ ای جبنتم وضعفتم وقیل معناہ ضعف رایکم وملتم الی الغنیمۃ

فان الحرص من ضعف العقل"

ایک معنی ﴿حَتّٰی اِذَا فَشِلْتُمْ﴾ کا وہی علامہ قاضی مظہری رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے جو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے کنز الایمان سے نقل کیا جا چکا ہے یہاں تک کہ تم بزدل ہو گئے، ضعیف ہو گئے۔ لیکن دوسرا معنی جو بیان کیا گیا راقم کو اس سے زیادہ اتفاق ہو رہا ہے، شان صحابہ کے مطابق بہت خوب ہے، وہ یہ ہے "یہاں تک کہ تمہاری رائے ضعیف ہو گئی اور تم غنیمت کی طرف مائل ہو گئے، بیشک عقل کے ضعف کی وجہ سے ہی حرص و لالچ آتی ہے۔ (مظہری ج۲ ص۱۵۴)

﴿وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ﴾ "اور جھگڑا کیا تم نے حکم میں۔"

(فِی الْاَمْرِ) ای امر النبی ﷺ بالمقام فی سفح الجبل للرمی فقال بعضکم نذهب فقد نصر اصحابنا، وبعضکم لانخالف امر النبی"

اور تم نے جھگڑا کیا امر میں' اس امر سے مراد نبی کریم ﷺ کا پچاس تیراندازوں کو پہاڑ کے درہ میں کھڑا کر کے یہ ارشاد فرمانا تم نے یہاں سے ہٹنا نہیں، نبی کریم ﷺ کے اس امر میں انہوں نے اختلاف کیا جب مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تو بعض حضرات نے کہا کہ ہمارے اصحاب کو فتح حاصل ہو چکی ہے، اب ہمیں ان کے ساتھ مل کر مال غنیمت جمع کرنا چاہئے، اور بعض حضرات نے کہا کہ ہم تو نبی کریم ﷺ کے امر کی مخالفت نہیں کر سکتے، ہم تو یہاں ہی کھڑے رہیں گے۔

﴿وَعَصَیْتُمْ﴾ "اور تم نے نافرمانی کی۔"

"وَعَصَیْتُمْ" امرہ ﷺ فترکتم المرکز لطلب الغنیمة" اور تم نے نبی کریم ﷺ کے حکم کی نافرمانی کی کہ مرکز کو چھوڑ دیا، مال غنیمت حاصل کرنے لگے۔ یہاں مرکز سے مراد پہاڑ کا درہ جس پر نبی کریم ﷺ نے تیرانداز لوگوں کو کھڑا کیا تھا، نبی کریم ﷺ نے اپنے لشکر کو پانچ حصوں میں تقسیم فرمایا، ایک کو آگے کھڑا کیا، اور ایک کو پیچھے، اور ایک کو بائیں، اور ایک کو درمیان میں، یہی جو درمیان میں تھے ان کو ہی پہاڑ کے درہ میں کھڑا کیا تھا اور ان کو وہاں سے نہ ہٹنے کا حکم دیا تھا۔

﴿مِنْ بَعْدِ مَآ اَرٰکُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ﴾ "اس کے بعد کہ اس نے دکھایا تمہیں وہ جسے تم پسند کرتے تھے۔"

یعنی تمہیں پسند تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری امداد کرے اور تمہیں کامیابی عطاء کرے، ابتدائی طور پر اللہ تعالیٰ نے تمہیں کامیابی عطاء کر دی اور تمہاری امداد فرما دی، لیکن تم نے نبی کریم ﷺ کے امر میں اختلاف کر کے اور اس کی نافرمانی کر کے اپنے آپ میں ضعف رائے قائم کر دیا جس کی وجہ سے معاملہ الٹ ہو گیا۔ (ماخوذ از جلالین وصاوی ج۱ ص۱۶۳)

واقعہ احد کی ابتداء میں احادیث بیان کی جاچکی ہیں، تاہم اس مقام میں دوبارہ درمنثور اور ابن کثیر میں بخاری اور مسند امام احمد سے کچھ روایات بیان کی گئی ہیں، انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے یہاں بخاری کی ایک روایات کو دوبارہ ذکر کیا جارہا ہے۔

❀ عن البراء قال لقينا المشركين يومئذ واجلس النبی ﷺ جيشا من الرماة وامر عليهم (عبد الله بن جبير) وقال لا تبرحوا ان رأيتمونا ظهرنا عليهم فلاتبرحوا، وان رايتموهم ظهروا علينا فلاتعينونا، فلما لقيناهم هربوا حتى رأيت النساء يشتددن فی الجبل رفعن عن سوقهن قدبدت خلاخلهن فاخذوا يقولون الغنيمة الغنيمة فقال عبدالله بن جبير عهد الى النبی ﷺ ان لاتبرحوا فأبوا فلما ابوا اصرف وجوههم فاصيب سبعون قتيلا فأشرف ابوسفيان فقال أفی القوم محمد فقال لاتجيبوه، فقال أفی القوم ابن ابی قحافة قال لاتجيبوه فقال أفی القوم ابن الخطاب، فقال ان هؤلاء قتلوا فلو كانوا احياء لأجابوا، فلم يملك عمر نفسه فقال له كذبت ياعدو الله ابقى الله لک مايحزنک، قال أبوسفيان اعلى هبل، فقال النبی ﷺ أجيبوه، قالوا مانقول؟ قال قولوا "الله اعلى وأجل" قال ابو سفيان لنا العزى ولاعزى لكم، فقال النبی ﷺ أجيبوه، قالوا مانقول؟ قال قولوا الله مولنا ولامولى لكم، قال ابوسفيان يوم بيوم بدر والحرب سجال، وستجدون مثلة لم آمربها ولم تسؤنی" (بخاری غزوہ احد)

حضرت براء ﷺ فرماتے ہیں ہمارا مشرکوں سے آمنا سامنا ہوا اس دن (یعنی غزوہ احد کے دن) اور نبی کریم ﷺ نے تیراندزوں کو ایک جگہ پر بٹھادیا (یعنی پہاڑ کے درہ میں ان کو قائم کردیا) اوران پر ایک شخص (عبداللہ بن جبیر) کو امیر مقرر دیا، اوران کو ارشاد فرمایا یہاں سے ہٹنا نہیں۔ اگر تم ہمیں دیکھو کہ ہم ان پر غالب آرہے ہیں تو یہاں سے نہ ہٹنا۔ اگر تم انہیں ہم پر غالب ہوتے ہوئے دیکھو تو ہماری امداد نہ کرنا۔ (راوی کہتے ہیں) جب ہم ان سے ملے تو وہ (کفار) بھاگ گئے، یہاں تک کہ میں نے ان کی عورتوں کے اپنی پنڈلیوں سے کپڑے چڑھا کر ان کو پہاڑ کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا، ان کی پازیبیں نظر آرہی تھیں، (اب انہوں نے درے پر کھڑے صحابہ کرام نے) کہنا شروع کیا غنیمت، غنیمت (یعنی مال غنیمت جمع کرنے میں شریک ہوجاؤ) تو حضرت عبداللہ بن جبیر نے کہا مجھ سے نبی کریم ﷺ نے وعدہ لیا ہوا ہے تم یہاں سے نہ ہٹنا، توان حضرات نے انکار کردیا، جب انہوں نے (وہاں قائم رہنے سے) انکار کردیا، توان کو اللہ نے ان کافروں سے پھیردیا، یعنی وہ ادھر ادھر بکھر گئے، اور ستر صحابہ کرام شہید ہوگئے، ابوسفیان نظریں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا اور کہنے لگا کیا اس قوم میں محمد ہیں؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسے کوئی جواب نہ دو پھر اس نے کہا کیا اس قوم میں

ابن ابی قحافہ (ابوبکر) ہیں، تو آپ نے فرمایا اسے کوئی جواب نہ دو، پھر کہنے لگا کیا اس قوم میں عمر ہیں۔ پھر خود ہی کہنے لگا بیشک یہ سب لوگ قتل ہو گئے، اگر زندہ ہوتے تو جواب دیتے، تو حضرت عمرؓ اس کی بات سن کر صبر نہ رکھ سکے، آپ نے فرمایا اے اللہ کے دشمن ان سب کو اللہ تعالیٰ نے زندہ رکھا ہوا ہے جو تجھے غم میں ڈالتے رہیں گے، ابوسفیان نے کہا اے ہبل بلند ہے (ہبل ان کے بت کا نام تھا، یعنی ہبل کو بلندی حاصل رہے) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اب اسے جواب دو، صحابہ کرام نے پوچھا اسے کیا جواب دیں، تو آپ نے فرمایا تم اسے یہ کہو "الله اعلی و اجل" اللہ ہی بلند اور بزرگ ہے۔ پھر ابوسفیان نے کہا ہمارا (معبود) عزیٰ ہے، تمہارا کوئی عزیٰ نہیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم اسے جواب دو، صحابہ کرام نے پوچھا ہم اسے کیا جواب دیں؟ تو آپ نے فرمایا یہ کہو "الله مولنا ولا مولی لکم" اللہ ہمارا مولیٰ ہے، تمہارا کوئی مولیٰ نہیں۔ ابوسفیان نے کہا آج کا دن بدر کے دن کا بدلہ ہے، لڑائی باری باری ہے، تم (اپنے مقتولوں میں) مثلہ پاؤ گ (حضرت حمزہؓ اس نے مراد لیا) میں نے یہ حکم نہیں دیا اور تم مجھے برا نہ کہنا، اس حدیث پاک میں غزوہ احد کا مکمل نقشہ پیش کر دیا گیا، اور زیر بحث آیہ کریمہ کا مکمل مفہوم بھی سمجھ آ گیا۔

﴿مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ﴾

''تم میں سے بعض وہ ہیں جو دنیا کا ارادہ رکھتے تھے، اور بعض وہ ہیں جو آخرت کا ارادہ رکھتے تھے۔''

﴿مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا﴾ یعنی الغنیمة قال ابن مسعود ماشعرنا ان احدا من اصحاب النبی ﷺ یرید الدنیا وعرضها حتی کان یوم احد"

''تم میں سے بعض وہ ہیں جو دنیا کا ارادہ رکھتے تھے'' یعنی مال غنیمت کا ارادہ رکھتے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں ہمیں یہ معلوم نہیں کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام نے بھی دنیا کے مال کا ارادہ کیا ہو، یہاں تک کہ غزوہ احد کے بعد اس آیہ کریمہ کے نزول سے پتہ چلا۔

﴿وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ﴾ وهم الذين ثبتوا فی مرکزهم ولم یخالفوا امر نبیهم" اور تم میں سے بعض وہ ہیں جو آخرت کا ارادہ رکھتے تھے، یہ وہ لوگ ہیں جو مرکز میں ثابت قدم رہے، یعنی جہاں پہاڑ کے درہ میں نبی کریم ﷺ نے کو ان کھڑا کیا تھا وہیں قائم رہے، اور نبی کریم ﷺ کے حکم کی انہوں نے کوئی مخالفت نہیں کی۔ یہ عبداللہ بن جبیر اور ان کے ساتھی تھے، خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل جو اس وقت کافر تھے انہوں نے درہ میں ثابت قدم رہنے والوں پر حملہ کر کے ان کو شہید کر دیا۔ (قرطبی ج ۴ص ۲۳۷)

فائدہ جلیلہ: والعتاب مع من انهزم لامع من ثبت، فان من ثبت فاز بالثواب، وهذا کمانه

اذاحل بقوم عقوبة عامة فأهل الصلاح والصبيان يهلكون ولكن لايكون ماحل بهم عقوبة بل هو سبب المثوبة" "واللہ اعلم"
(قرطبی ۴ ص ۲۴۷)

اس آیۃ کریمہ میں ان حضرات کو عتاب کیا گیا (یعنی ان کی سرزنش کی گئی) جو مرکز سے ہٹ گئے تھے اور پسپا ہو گئے تھے۔ ان کو عتاب نہیں کیا گیا جو ثابت قدم رہے تھے، ثابت قدم رہنے والے اگرچہ شہید ہو گئے تھے لیکن انہوں نے منصب شہادت جیسا عظیم مرتبہ اور ثواب عظیم حاصل کیا، یہ اسی طرح ہے جیسا کہ کسی قوم پر عذاب آئے تو بدکاروں کیلئے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے باغیوں کیلئے، حدود سے تجاوز کرنے والوں کیلئے تو وہ عذاب ہے، لیکن جو نیک لوگ اور بچے اس کی گرفت میں آتے ہیں تو ان کیلئے وہ ذریعہ ثواب ہوتا ہے۔

﴿ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ﴾ "پھر اس نے پھیر دیا تمہیں ان سے۔"

﴿ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ﴾ ايها المسلمون صرفكم الله بشئوم عصيانكم عن الكفار بالهزيمة حتى حالت الحالة فغلبوكم (ليبتليكم) اى ليمتحنكم حتى يظهر المؤمنين من المنافقين او المعنى لينزل البلاء عليكم بما صنعتم"

"پھر اس نے تمہیں ان سے پھیرا" یعنی اے مسلمانو اللہ تعالیٰ نے تمہیں کفار سے پھیرا یعنی پسپا کر دیا، وجہ اس کی یہ تھی کہ تم نے نبی کریم ﷺ کے حکم کو بجا نہیں لایا، یہاں تک جنگ کی حالت بدل گئی، پہلے تم فتح حاصل کر رہے تھے اب کفار کو بظاہر غلبہ حاصل ہو گیا۔ رب تعالیٰ نے تمہیں کفار سے جو پسپا کیا اس میں تمہاری آزمائش تھی کہ مؤمنین منافقین سے ممتاز ہو جائیں۔ **یا دوسری** وجہ "لِيَبْتَلِيَكُمْ" (میں یہ ہے کہ وہ تمہیں مصیبت میں مبتلا کرے بوجہ اس کے جو تم نے کیا) یعنی تمہیں کفار سے پھیر کر اور ان کو ظاہری طور پر غلبہ دے کر رب تعالیٰ نے تمہیں مصیبت میں مبتلاء کر دیا۔
(مظہری ج ۳ ص ۱۵۵)

(لِيَبْتَلِيَكُمْ)"اى ليمتحن صبر كم على المصائب وثباتكم على الايمان عندهما"
"تاکہ تمہیں آزمائے" یعنی تمہارا امتحان لے کہ تم مصیبتوں کے پہنچنے پر کتنا صبر کرتے ہو، اور کتنا ایمان پر ثابت رہتے ہو۔
(البحر المحیط ج ۳ ص ۱۱۷)

اعتراض: امتحان تو وہ لیتا ہے جسے پتہ نہ ہو کہ یہ کسی درجہ کا ہے، رب تعالیٰ علیم وخبیر ہے اس کے امتحان لینے کا کیا مطلب۔

جواب: (لِيَبْتَلِيَكُمْ)اى يعاملكم معاملة من يمتحنكم ليظهر ثباتكم على الايمان عندها"
(روح البیان ج ۲ ص ۱۱۰)

امتحان لینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمہارے ساتھ وہ معاملہ کرتا ہے جو اس شخص سے معاملہ کیا جاتا ہے جس کا امتحان لیا جاتا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ تمہیں لوگوں کے سامنے نکھارنا مقصود ہے، کہ بعض تو ثابت قدم رہے لیکن پسپا ہونے والے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی وجہ سے رب تعالیٰ کے عفو وکرم کے مستحق ہو گئے،

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

یہاں چند بحثیں وہ ہیں جن کا تعلق اصطلاحات سے جن کو طلباء کرام تو جانتے ہیں لیکن عوام نہیں جانتے، ان میں اسے ایک بحث یہ ہے ﴿حَتّٰی اِذَا فَشِلْتُمْ﴾ شرط ہے، جہاں شرط ہو وہاں جزاء کا پایا جانا ضروری ہے، اس شرط کی جزاء کیا ہے؟ تو اس کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ شرط نہیں بلکہ "حتی" "الی" کی طرح غایت کیلئے استعمال ہو رہا ہے، اب مطلب یہ ہو گیا ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ حَتّٰی اِذَا فَشِلْتُمْ﴾ تحقیق تمہارے ساتھ اللہ نے اپنا وعدہ سچ کر دیا یہاں تک کہ تمہاری رائے میں ضعف آ گیا، یہ نصرت کی انتہاء بیان کی گئی۔

اگر اسے شرط تسلیم کیا جائے تو اس صورت میں بصریوں نے یہ جواب دیا ہے کہ اس کی جزاء محذوف ہے، وہ یہ ہے "منعکم الله نصره" کہ جب تم بزدل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے تم سے اپنی امداد کو روک لیا۔ کوفی حضرات نے جواب دیا "وَعَصَيْتُمْ" میں واؤ زائد ہے جیسا کہ "وتله للجبين ونادیناه" میں "ونادیناه" میں واؤ زائد ہے۔ اب تقدیر عبارت کی یہ ہو گئی ﴿حَتّٰی اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ﴾ یہاں تک کہ جب تمہاری رائے ضعیف ہو گئی اور تم نے جھگڑا کیا امر میں تو تم نافرمان ہو گئے، یعنی "وَعَصَيْتُمْ" جزاء ہے۔

اعتراض: یہ توجیہ کیسے درست ہے جبکہ ضعف اور جھگڑا معصیت ہے، اور جزاء بھی معصیت ہو جائے تو ایک ہی چیز شرط اور وہی جزاء ہو گی "لزم كون الشیٔ علة وذلك فاسد" اس صورت میں ایک چیز اپنے آپ کی علت بن جائے گی، یہ فاسد ہے، درست نہیں۔

جواب: ضعف اور جھگڑا سبب بنے ہیں اس جگہ سے ہٹنے کا جہاں نبی کریم ﷺ نے کھڑا کیا تھا۔ جب اس جگہ سے وہ ہٹ گئے تو اس پر عصیان مرتب ہوا، لھذا شرط اور ہے، جزاء اور ہے۔ "فلم يلزم تعليل الشیٔ بنفسه" کوئی چیز اپنی ذات کیلئے علت نہیں بنی۔ یہ بھی خیال رہے کہ بصریوں کے نزدیک واؤ زائد نہیں۔ لھذا ان پر نہ کوئی اعتراض اور نہ اس کا جواب۔ (ماخوذ از کبیر ج۹ ص۳۶)

تنبیہ: قيل الفشل هو الضعف وقيل الفشل هو الجبن وهذا باطل بدليل قوله

تعالی ﴿وَلَاتَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا﴾ ای فتضعفوا لانه لایلیق به ان یکون المعنی فتجبنوا"
بعض حضرات نے "فشل" کا معنی ضعف رائے بیان کیا، اور بعض نے اس کا معنی بزدلی مراد لیا، لیکن یہ باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلَاتَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا﴾ کا مطلب یہی ہے کہ جھگڑا نہ کرو، ورنہ ضعیف رائے والے ہو جاؤ گے، "بزدل ہو جاؤ گے" معنی لینا مناسب نہیں۔ (ماخوذ از کبیر ج۹ ص۳۶)

مقام توجہ: ﴿مِنْ بَعْدِ مَآ اَرٰکُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ﴾ زیادہ متنبہ کیا گیا، یا زیادہ عتاب پایا گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ
" انهم لما شاهدوا ان الله تعالى اكرمهم بانجاز الوعد كان من حقهم ان يمتنعوا عن المعصية فلما اقدموا عليها لاجرم سلبهم الله ذلك الاكرام واذاقهم وبال امرهم"
جب انہوں نے یہ مشاہدہ کر لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی امداد کر کے ان کو مکرم بنا دیا تو ان کا حق یہ تھا کہ وہ امر کی مخالفت نہ کرتے، لیکن جب ان سے مخالفت سرزد ہوئی اللہ تعالیٰ نے ان سے پہلے والا اکرام واپس لے لیا۔

امر میں اختلاف کا کیا مطلب:

ایک وجہ تو پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ امر سے مراد نبی کریم ﷺ کا امر ہے یہ امر ضد ہے نہی کی۔ یعنی نبی کریم ﷺ نے جہاں کھڑے رہنے کا حکم دیا وہاں کھڑے رہنے میں صحابہ کرام کا اختلاف ہو گیا، اس طرح نبی کریم ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی ہوئی۔ اور مطلب اس کا یہ بیان کیا گیا ہے "ان الأمر ههنا بمعنى الشان والقصة اى تنازعتم فيما كنتم فيه من الشان" کہ بیشک امر یہاں شان اور قصہ کے معنی میں ہے، اب مطلب یہ ہوا کہ تم جس حال میں تھے اس میں تم نے اختلاف کیا کہ یہاں کھڑے رہیں یا نہ رہیں۔ یہ معنی بھی عجیب بھلا معلوم ہوتا ہے کہ براہ راست نبی کریم ﷺ کے امر کی طرف مخالفت کی نسبت نہیں کی گئی بلکہ ان کے اپنے حال کی طرف مخالفت کی نسبت کی گئی جو ضمنی طور پر نبی کریم ﷺ کے امر کی طرف منسوب ہے۔

﴿وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾
"اور تحقیق معاف کر دیا اس نے تمہیں اور اللہ فضل فرمانے والا مومنوں پر۔"

سبحان اللہ! صحابہ کرام کے درہ کو چھوڑنے کی وجہ سے اور پسپا ہونے کی وجہ سے جو کیفیت انہیں لاحق ہوئی جسے عصیان سے تعبیر کیا گیا رب تعالیٰ نے اس معاف فرما دیا، اس معاف فرمانے کا تذکرہ بہت تاکید سے

فرمایا۔ایک لام سے تاکید کی گئی کہ وہ "مؤطأ للقسم" ہے۔کیونکہ ماضی پر قد داخل ہوا اور اس پر لام تاکید آئے تو وہاں پتہ چلتا ہے کہ یہاں قسم پائی گئی، پھر "قد" بھی تحقیق کا معنی دے رہا ہے۔گرائمر کے اس ضابطہ کے مطابق مکمل معنی یوں ہو گیا۔اور قسم ہے اللہ کی تحقیق اس نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔اللہ تعالیٰ تمام ایمان والوں پر اپنا فضل فرماتا ہے، جب اس کی مہربانیاں اور رحمتیں تمام ایمان والوں پر ہیں تو صحابہ کرام پر تو یقیناً اور زیادہ رحمت پائی گئی ہے۔اگر غزوہ احد میں صحابہ کرام کے درہ کو چھوڑنے اور پسپا ہونے کو کوئی شخص آڑ بنا کر صحابہ کرام کی شان میں گستاخی کرے تو وہ بدقسمت ہے کہ رب تعالیٰ جب معافی کرنے کا اعلان کر رہا ہے تو وہ صحابہ کرام پر تبرا بازی کر رہا ہے، آیئے ایسے شخص کا منہ بند کرنے کیلئے ،ایک حدیث پاک کو دیکھئے۔

❁ حدثنا عبدان اخبرنا ابوحمزة عن عثمان بن موهب قال جاء رجل حج البيت فرأى قوما جلوسا فقال من هؤلاء القعود قالوا هؤلاء قريش قال من الشيخ قالوا ابن عمر فأتاه فقال انى سائلک عن شئ اتحدثنى قال انشدک بحرمة هذاالبيت اتعلم ان عثمان بن عفان فريوم احد قال نعم قال فتعلمه تغيب عن بدر فلم يشهدها قال نعم قال فتعلم انه تخلف عن بيعة الرضوان فلم يشهدها قال نعم قال فكبر،قال ابن عمر تعال لأخبرک ولأبين لک عما سألتنى عنه اما فراره يوم احدفاشهد ان الله عفاعنه واما تغيبه عن بدر فانه كان تحته بنت رسول الله ﷺ وكانت مريضة فقال له النبى ﷺ ان لک اجر رجل ممن شهد بدرا وسهمه واما تغيبه عن بيعة الرضوان فانه لوكان احد اعزببطن مكة من عثمان بن عفان لبعثه مكانه فبعث عثمان وكانت بيعة الرضوان بعد ماذهب عثمان الى مكة فقال النبى ﷺ بيده اليمنى هذه يدعثمان فضرب بها على يده فقال هذه لعثمان اذهب بهذاالآن معک"

(بخاری ج۲ کتاب المغازی باب قول الله تعالى ان الذين تولوا منكم الخ)

عثمان بن موہب فرماتے ہیں ایک شخص بیت اللہ شریف کا حج کرنے کیلئے آیا،اس نے ایک قوم کو بیٹھے ہوئے دیکھا،تو اس نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں جو بیٹھے ہوئے ہیں؟تو اسے بتایا گیا یہ قریش ہیں،اس نے پوچھا یہ بزرگ کون ہیں؟تو اسے بتایا گیا یہ ابن عمر رضی اللہ عنہ ہیں،تو وہ ان کے پاس آیا،تو کہنے لگا میں آپ سے کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں،کیا آپ مجھے ان کا جواب دو گے،اس بیت اللہ شریف کی حرمت کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ بیشک عثمان بن عفان احد کے دن پسپا ہو گئے تھے؟تو آپ نے فرمایا،ہاں۔پھر اس نے پوچھا کیا تم جانتے ہو وہ بدر سے غائب تھے،وہاں حاضر نہیں ہوئے تھے،آپ نے فرمایا،ہاں۔پھر اس نے پوچھا کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ بیعت رضوان سے پیچھے رہے

اس امر میں حاضر نہیں تھے آپ نے فرمایا ہاں تو اس نے (خوشی سے) اللہ اکبر کہا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا آؤ میں تمہیں خبر دوں اور تمہیں ان سوالوں کو وضاحت سے بیان کروں جو تم نے مجھ سے سوال کئے، غزوہ احد میں حضرت عثمان ﷺ کا پسپا ہونا، میدان چھوڑ کر ہٹ جانا، اس کے متعلق میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا، (اس لئے کہ) رب تعالیٰ نے اعلان فرمایا ﴿وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ﴾ تحقیق اس نے تمہیں معاف کر دیا ہے) لیکن بدر میں حاضر نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی زوجیت میں نبی کریم ﷺ کی بیٹی تھی جو شدید مریض تھیں (تو نبی کریم ﷺ نے خود ہی ان کو مدینہ طیبہ میں چھوڑا) نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہیں اجر و ثواب بدر میں شریک ہونے والے کا حاصل ہے اور تمہارا حصہ بھی بدر والے کا ہے۔ بیعت رضوان میں غائب ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اگر کوئی اور شخص ان سے مکہ والوں کو زیادہ عزیز ہوتا تو نبی کریم ﷺ اس کو بھیجتے، آپ نے حضرت عثمان ﷺ کو مکہ میں لوگوں سے بات چیت کیلئے بھیج دیا۔ بیعت رضوان آپ کے مکہ میں جانے کے بعد ہوئی، نبی کریم ﷺ نے اپنے دائیں ہاتھ کو دوسرے ہاتھ میں لیا اور فرمایا یہ عثمان کی بیعت ہے۔ پھر حضرت ابن عمر ﷺ نے اس شخص کو فرمایا یہ میری باتیں ساتھ لے جا۔

یہ حدیث بخاری نے مناقب عثمان میں بھی ذکر کی ہے، وہاں شیخ علامہ بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"والذی یظهر انه کان متعصبا علی عثمان ص فلذلک قال الله اکبر مستحسنا"

وہ سوال کرنے والا شخص حضرت عثمان ﷺ سے تعصب رکھتا تھا، اسی وجہ سے جب تک حضرت ابن عمر ﷺ اس کے سوالوں کے جوابوں میں ہاں کہتے رہے۔ ہاں اسی طرح ہوا، تو وہ خوش ہو رہا تھا، اسی خوشی پر اس نے اللہ اکبر کہا۔

اسی سے راقم کو یہ بھی سمجھ آیا کہ کسی سے تعصب کے وقت، کسی ناجائز کام پر خوش ہو کر اللہ اکبر کہنا منافقین اور رافض کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس متعصب کے نظریات فاسدہ کو دیکھ کر حضرت ابن عمر ﷺ نے ہر سوال کا جواب مستحسن طریقہ سے واضح کر دیا کہ اس کی حقیقت اور وجہ کیا ہے۔ حضرت عثمان ﷺ کی جو زوجہ بیمار تھی جن کی وجہ سے نبی کریم ﷺ ان کو بدر میں ساتھ نہ لیا بلکہ مدینہ طیبہ میں ہی ان کو چھوڑا وہ حضرت رقیہ ﷺ تھیں جو رسول اللہ ﷺ کی بیٹی تھیں۔

"اذهب بها الآن معک" کے دو مطلب ہیں ایک یہ "اقرن هذا العذر بالجواب حتی لایبقی لک فیما اجبتک به حجة علی ما کنت تعتقده من غیبة عثمان ﷺ" میں نے تمہیں مختصر جواب صرف "نعم" (ہاں) سے دیتے تھے ان کے ساتھ یہ وضاحتیں اور وجوہ بھی ساتھ ملاؤ، اب تم جو اپنا باطل عقیدہ رکھتے تھے وہ ان

جوابات کی وجوہ کے بعد رد ہو جائے گا، تمہارے پاس کوئی حجت نہیں رہے گی۔

جواب کی دوسری وجہ "قال الطیبی قاله ابن عمر تهكما به ای توجه بما تمسکت به فانه لاینفعک بعد مابینت لک" علامہ طیبی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ نے اس شخص سے بات بطور تہکم کی، مطلب اس کا یہ ہے کہ آپ نے گویا کہ یہ کہا کہ بیشک تو نے جو سوال اپنے تعصب پر دلیل بنانے کیلئے کئے میری وضاحت کے بعد تجھے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ (عینی ج۱۶ص۲۰۷)

غزوہ احد میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ ثابت رہنے والے حضرات:

بلاذری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ مہاجرین میں سے ثابت رہنے والے حضرات یہ تھے، ابوبکر، عمر، عبدالرحمن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ بن عبیداللہ، زبیر بن عوام اور ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم اور انصار میں سے یہ تھے حباب بن منذر، ابودجانہ، عاصم بن ثابت بن ابی الافلح، حارث بن الصمۃ، اسید بن حضیر، سعد بن معاذؓ اور بعض حضرات نے کہا کہ سہل بن حنیف بھی ثابت رہنے والے انصار میں تھے۔ (عینی ج۱۶ص۲۰۷)

فائدہ جلیلہ: اللہ تعالیٰ نے جو ارشاد فرمایا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ''اور اللہ فضل فرمانے والا ہے ایمان والوں پر۔''

"ان ذلک العفو بطريق التفضل والاحسان لابطريق الوجوب عليه ای شانه ان يتفضل عليهم بالعفو"

اللہ تعالیٰ نے جو پسپا ہونے والے صحابہ کرام کو معاف کیا یہ اس کا فضل وکرم اور اس کا احسان تھا، رب تعالیٰ پر کوئی واجب نہیں تھا، لیکن اس کی شان ہی یہ ہے کہ وہ مؤمنوں کو توبہ پر معاف فرماتا ہے اور ان پر فضل وکرم فرماتا ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

حضرت ابن عباسؓ کا شاندار استدلال:

❁ واخرج الامام احمد وجماعة عن ابن عباس رضی الله عنهما انه قال مانصر الله تعالى نبيه فی موطن کمانصره يوم احد فانكروا ذلک فقال ابن عباسؓ بينی وبين من أنكرذلک كتاب الله ان الله تعالى يقول يوم احد "وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ" ای تقتلونهم "وهو التفسير المالور واستشهد عليه الحبر بقوله عتبة الليثی"

"تحسهم (ای نقتلهم) بالبيض حتى كاننا نفلق منهم بالجماجم حنظلا"

وبقوله ومنا الذی لاقی بسیف محمد　　فحس (ای قتل)به الاعداء عرض العساکر"

امام احمد رحمہ اللہ اور حضرات نے بھی ابن عباس ﷺ سے روایت ذکر کہ آپ فرماتے ہیں اللہ تعالی نے اپنے نبی کریم ﷺ کی اتنی امداد کہیں نہیں فرمائی جتنی احد میں فرمائی، آپ کے اس قول پر بعض لوگوں نے انکار کیا، تو حضرت ابن عباس ﷺ نے فرمایا کہ میرے اور انکار کرنے والوں کے درمیان کتاب اللہ فیصلہ کرنے کیلئے کافی ہے۔ جب رب تعالی نے احد والوں ؓ کے متعلق فرمایا ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ﴾ تحقیق اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دیا جب تم ان کو قتل کر رہے تھے" ایمان والوں کا مشرکین کو قتل کرنا اللہ تعالی کی امداد کی وجہ سے ہی تھا۔ جب آپ سے نافع بن ازرق نے پوچھا کیا عرب حضرات نے "حس" کا معنی قتل لیا ہے۔ آپ نے دو شعر بطور دلیل پیش کئے جن میں ایک جگہ "نحسهم" استعمال ہوا ہے، جس کا معنی ہے"ہم ان کو سفید تلواروں کے ذریعے قتل کر رہے تھے، ان کی کھوپڑیوں کو ہم تے کی طرح ازار ہے تھے۔

دوسرے شعر کا معنی:

ہم میں سے وہ جس نے محمد ﷺ کی تلوار سے ملاقات کی، اس نے دشمن کو قتل کیا لشکروں میں گھس گیا۔ (ماخوذ از درمنثور ج ۲ ص ۸۹)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِیْۤ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمْ وَاللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ O (آیۃ نمبر ۱۵۳)

(1) جب تم منہ اٹھائے چلے جاتے تھے اور پیٹھ پھیر کر کسی کو نہ دیکھتے اور دوسری جماعت میں ہمارے رسول تمہیں پکار رہے تھے تو تمہیں غم کا بدلہ غم دیا اور معافی اس نے سنائی کہ جو ہاتھ سے گیا اور جو افتاد پڑی اس کا رنج نہ کرو اور اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔ (کنزالایمان)

(2) یاد کرو جب تم دور ہو رہے تھے، اور پیچھے توجہ نہیں کر رہے تھے کسی ایک پر، اور رسول بلا رہے تھے تمہیں دوسری جماعت میں، تو پہنچایا تمہیں غم پر غم تا کہ تم غمگین نہ ہو اس پر جو تم سے ضائع ہو گئی، اور نہ اس پر جو پہنچی ہے تمہیں، اور اللہ خبر رکھنے والا ہے جو تم کرتے ہو۔ (نجوم الفرقان)

﴿اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِیْۤ اُخْرٰىكُمْ﴾

"جب تم دور ہو رہے تھے اور پیچھے توجہ نہیں کر رہے تھے کسی ایک پر اور رسول بلا رہے تھے تمہیں دوسری جماعت میں"

آیۂ کریمہ کا ماقبل سے تعلق ہے یا استیناف پایا گیا:

اس میں ایک احتمال یہ ہے کہ "انه ابتداء كلام لاتعلق له بماقبله والتقدير اذكر اذتصعدون" اس کا تعلق ماقبل سے نہیں بلکہ جملہ استینافیہ ہے، اور اذکر مقدر ہے۔ یعنی یاد کرو جب تم دور ہو رہے تھے، (راقم نے یہی ترجمہ کیا ہے) ایک اور اس میں احتمال یہ ہے کہ اس کا تعلق ماقبل سے ہے، ماقبل سے تعلق میں پھر تین احتمال ہیں، ایک یہ کہ اس کا تعلق ﴿وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ﴾ سے ہو، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ تحقیق اس (اللہ) نے معاف کر دیا تمہیں جب تم دوری کی طرف جا رہے تھے۔ **دوسرا احتمال** یہ ہے کہ اس کا تعلق ﴿ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ﴾ سے ہو، اس صورت میں معنی یہ ہوگا "پھر تمہیں پھیرا ان سے تا کہ تمہیں آزمائے جب تم دور ہوئے جا رہے تھے۔ (کبیر ج۹ ص۳۹)

تیسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا تعلق '' لِیَبْتَلِیَکُمْ '' سے ہو، اس صورت میں معنی یہ ہوگا '' پھر تمہیں پھیرا ان سے جب تم دور ہوئے جا رہے تھے۔ (کبیر ج۹ص۳۹)

مختصر مطلب:

جب کفار نے اچانک حملہ کیا تو صحابہ کرام پریشان ہوگئے، دائیں، بائیں بکھر گئے، کوئی پہاڑ پر چڑھ رہا تھا اور کوئی وادیوں میں جا رہا تھا، اور کوئی کھلی زمین میں دوڑ دوڑ کر جا رہا تھا، ہر شخص اپنی پریشان میں مبتلاء تھا کوئی کسی کی طرف توجہ نہیں کر رہا تھا، پیچھے مڑ کر کوئی نہیں دیکھ رہا تھا، حالانکہ رسول اللہ ﷺ پیچھے ثابت رہنے والی جماعت میں بکھر جانے والوں کو بلا رہے تھے، اللہ تعالی نے صحابہ کرام کو غم کے بدلے غم پہنچایا تا کہ وہ غمگین نہ ہوں جو ان سے نعمتیں فوت ہوئیں ان پر، اور نہ ہی مصیبتوں کے پہنچنے پر غمگین ہوں۔ اللہ تعالی تمام اعمال پر خبر رکھنے والا ہے، یہی مضمون صحابہ کرام کو خطاب کرتے ہوئے رب تعالی نے بیان فرمایا '' اِذْتُصْعِدُوْنَ ''

عبدالرحمٰن سلمی اور حسن اور قتادہ رحمھم اللہ کی قراءت میں تاء اور عین کے فتحہ سے پڑھا گیا، صعود سے ماخوذ ہے۔ ''والصعود ای الارتفاع علی الجبال والسطوح'' اس قراءت کے مطابق پہاڑ پر چڑھنا مراد ہوگا، کیونکہ ''صعود'' کا معنی پہاڑ پر اور چھت پر چڑھنا ہے۔ اور مشہور قرأت میں تا پر ضمہ اور عین کے نیچے کسرہ ''اصعاد'' (باب افعال) سے لیا ہوا ہے، اس کا معنی ہے ''السیر فی مستوی الارض'' ہموار زمین میں چلنا ''وقال المبرد اصعد اذا ابعد فی الذھاب'' مبرد نے کہا ہے کہ اصعد کا معنی دور چلے جانا۔

راقم نے یہی معنی ذکر کیا ہے۔ ''وقال المفضل صعد واصعد بمعنی واحد'' مفضل رحمہ اللہ '' نے بیان کیا ہے ''صعد اور اصعد'' کا ایک ہی معنی ہے ''قال ابو حاتم یقال اصعدت اذا مضیت حیال وجھک'' ابو حاتم کہتے ہیں، جب کہا جائے ''اصعدت'' تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے، تو منہ اٹھائے چل رہا تھا، یعنی بغیر سوچے سمجھے جدھر منہ آ رہا تھا ادھر ہی چل رہا تھا، اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ بعینہ اسی کے مطابق ہے '' جب تم منہ اٹھائے چلے جاتے تھے '' (ماخوذ از معالم التنزیل ج ا ص ۳۶۲)

راقم نے مختصر مطلب میں یہ لکھا ہے بعض حضرات پہاڑ پر چڑھ رہے تھے، بعض وادی میں جا رہے تھے، بعض کھلی زمین میں دوڑ کر جا رہے تھے، یہ مطلب درحقیقت تمام قراءتوں کا جامع ہے، اگرچہ ہمارے پاس روایت حفص کے مطابق اصعاد سے ماخود ہے، اسلئے راقم نے ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے۔ ﴿ وَلَاتَلْوٗنَ عَلٰۤی اَحَدٍ ﴾ ای

لاتلتفتون الی احد من شدة الهرب"، تم کسی ایک کی طرف شدید دوڑنے کی وجہ سے توجہ نہیں کر رہے تھے۔
(کبیر ج۹ ص۴۰)

"لایلوی" وہ گردن پھیر کر کسی کی طرف توجہ نہیں کرتا "لوی" اللی فتل الحبل. لویته لیا، لوی بلوی لیا" کا معنی رسی کا بٹنا، "لوی یده ولوی راسه وبراسه اماله" جب اس کے ساتھ ید یا رأس کا تعلق ہو تو ہاتھ کو مائل، سر کو مائل کرنا، "لووا رووسهم" انہوں نے اپنے سروں کو پھیرا، "لوی لسانه" اس نے اپنی زبان کو پھیرا، اس کا معنی یہ بھی آتا ہے، اس نے جھوٹ بولا" تخمینہ سے بات کی، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿یَلْوُوْنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتَابِ﴾ وہ اپنی زبانوں کو کتاب میں پھیرتے ہیں۔ فلان لایلون علی احد اذا امعن فی الهزیمة" فلاں شخص اپنی شکست میں غور وفکر کی وجہ سے کسی اور کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا، "اللواء الراية" جھنڈے کو "لواء" کہتے ہیں کیونکہ ہوا اسے ادھر ادھر مائل کرتی ہے، "اللوية" (واؤ کے نیچے کسرہ اور یاء مشدد) طعام کو دوسرے طعام سے ہٹا کر، پھیر کر ذخیرہ بنانا، (مفردات راغب) ﴿وَلَا تَلْوُوْنَ عَلٰی اَحَدٍ﴾ تم کسی ایک کے طرف گردن پھیر کر مڑ کر نہیں توجہ کر رہے تھے۔

﴿وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْ اُخْرَاكُمْ﴾ "اور رسول بلا رہے تھے تمہیں دوسری جماعت میں۔"

(فی اخراکم) فی ساقتکم وجماعتکم الاخری، والمعنی انه علیه الصلوة والسلام کان یدعوهم وهو واقف فی اخراهم لان القوم بسبب الهزیمة قد تقدموه"

قوم پسپا ہو کر دوڑ کر آگے چلی گئی، نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھ قائم رہنے والے اپنی جگہ پر قائم رہے، یہ لوگ ان آگے جانے والوں سے پیچھے رہ گئے، اب مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ تمہیں پیچھے دوسرے جماعت میں آواز دے رہے تھے، بلا رہے تھے،
(روح البیان ج۲ ص۱۱۱)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا یہی ترجمہ ہے، "اور دوسری جماعت میں ہمارے رسول تمہیں پکار رہے تھے" (کنز الایمان)

راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا:

"والرسول یدعوکم فی اخراکم" ای فی اخراکم ومن ورائکم الی عباد الله انا رسول الله من یکر فله الجنة"
(معالم التنزیل للبغوی ج ۱ ص ۳۶۲)

﴿فِيْ اُخْرَاكُمْ﴾ کا معنی ہے ﴿مِنْ وَّرَائِكُمْ﴾ تمہارے پیچھے ہے۔

حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے یہی ترجمہ کیا "اور رسول کریم بلا رہے تھے تمہیں پیچھے سے (ضیاء القرآن) یعنی آپ

فرمار ہے تھے" میں اللہ کا رسول ہوں جو شخص لوٹے گا اس کیلئے جنت ہے۔ خیال رہے کہ حضرت مفتی احمد یارخان رحمہ اللہ نے بہت خوبصورت انداز میں دونوں تراجم کو یکجا جمع کیا، آپ کا ترجمہ یہ ہے، حالانکہ رسول بلا رہے تھے تم کو تمہاری پچھلی جماعت میں۔ (نعیمی ج۴ص۲۵۸)

﴿ فَاَثَابَكُمْ غَمًّاۢ بِغَمٍّ ﴾ تو پہنچایا تمہیں غم پر غم۔

﴿ فَـاَثَـابَـكُـم ﴾ (تو پہنچایا تمہیں) "اثـاب" ماخوذ ہے لفظ ثواب سے، اس کا غالبا استعمال سوائے خیر سے نہیں۔ اور شر میں بھی اس کا استعمال جائز ہے۔ لغوی معنی کے لحاظ پر اس کا مطلب ہے لوٹنا۔ "ثاب اليه عقله" ای رجع اليه" اس کی عقل اس کی طرف لوٹ آئی، یہی معنی اللہ تعالی کے اس ارشاد گرامی میں پایا گیا ہے۔ ﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ﴾ اور جب بنایا ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لوٹنے کی جگہ" "والمرأة تسمى ثيبا" "لان الواطئ عائد اليها" عورت کو ثیبہ کہا جاتا ہے کہ وطی کرنے والا اس کی طرف لوٹ کر آتا ہے،

"واصل الثواب كل مايعود الى الفاعل من جزاء فعله سواء كان خيرا أوشرا الاانه بحسب العرف اختص لفظ الثواب بالخير"

ثواب کا معنی جب لوٹنا ہے تو اس معنی کے لحاظ پر فعل کی جزاء جو اس پر عمل کرنے والے کی طرف لوٹتی ہے اسے ثواب ہی کہا جاتا ہے خواہ فعل خیر پر جزاء خیر ہو، یا فعل شر کا بدلہ ہو، لیکن اب عرف میں جزاء خیر کو ہی ثواب کہا جاتا ہے، جزاء شر کو ثواب نہیں کہا جاتا۔

اگر لغوی معنی لیں تو یہاں ﴿ فَاَثَابَكُمْ غَمًّاۢ بِغَمٍّ ﴾ میں استعمال درست ہے کہ ان کو غم پر غم پہنچایا۔ اور اگر عرفی معنی لیں تو تہکم ہے، یعنی ان کو مصیبت کے پہنچنے کو ثواب سے تعبیر کر دیا گیا، (کبیر ج۹ص۴۰)

﴿ غَمًّاۢ بِغَمٍّ ﴾ "يحتمل ان تكون بمعنى المعاوضة كما يقال هذا بهذا ای هذا عوض عن ذاك" ایک احتمال یہاں یہ پایا گیا ہے کہ "باء" بدلیت کیلئے ہو، جیسے کہا جاتا ہے "هذا بهذا" یہ بدل ہے اس کا" اعلی حضرت رحمہ اللہ نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے" تو تمہیں غم کا بدلہ غم دیا (کنزالایمان)

ويحتمل ان تكون" بمعنی "مع" "والتقدير اثابهم غمامع غم"

اور احتمال یہ ہے کہ "بـاء" "مـع" کے معنی میں ہو، اب اس صورت میں مطلب ہو غموں کے ساتھ غم، حضرت مفتی احمد یارخان رحمہ اللہ نے یہی ترجمہ کیا ہے" تو پہنچائے تمہیں غم پر غم" (نعیمی) راقم نے بھی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے یہی ترجمہ نقل کیا تاکہ انہیں دونوں احتمال ذہن نشین ہو جائیں، (ماخوذ از کبیر ج۹ص۱۴۰)

پہلے معنی میں چند صورتیں:

جب معنی یہ کیا جائے ''تو تمہیں پہنچایا غم کے بدلہ غم'' تو اس کی چند وجوہ بیان کی گئی ہیں،

(۱) زجاج نے اس کی وضاحت یوں کی کہ تم نے جب رسول اللہ ﷺ کے امر پر عمل نہیں کیا تو تم نے اپنے آپ کو غم پہنچایا، اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے تمہیں غم پہنچایا کہ پسپا ہو گئے اور تمہارے احباب شہید ہو گئے "والمعنی جازاکم من ذلک الغم بھذا الغم" یعنی رسول اللہ ﷺ کو غم پہنچانے کے بدلے تمہیں غم پہنچایا گیا۔

(۲) حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے اس کی وضاحت یوں کی "یرید غم یوم احد للمسلمین بغم یوم بدر للمشرکین" کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آج احد کو تمہیں غم پہنچایا جا رہا ہے تو کل بدر میں مشرکین کو غم پہنچایا جا چکا ہے۔ مقصد اس میں یہ تھا کہ تمہارے دل میں دنیا کی طرف توجہ نہ رہے، نہ تم دنیا کے حاصل ہونے کی وجہ سے خوش ہو، اور نہ ہی تم دنیا کے جانے پر غمناک ہو، یہی مطلب ہے ﴿لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ﴾ ''تاکہ تم غمگین نہ ہو اس پر جو تم سے ضائع ہو گئی اور نہ خوش ہو اس پر جو تمہیں عطاء کیا''

(۳) یجوز ان یکون الضمیر فی قولہ ﴿فَاَثَابَکُمْ﴾ یعود للرسول وا؛ معنی ان الصحابۃ لما راوا ان النبی ﷺ شج وجھہ وکسرت رباعیتہ وقتل عمہ اغتموا لأجلہ والرسول ﷺ لما رأی انھم عصوا ربھم لطلب الغنیمۃ ثم بقوا محرومین من الغنیمۃ وقتل اقاربھم اغتم لأجلھم"

اس میں ایک اور صورت یہ پائی گئی ہے کہ ضمیر ﴿فَاَثَابَکُمْ﴾ کی ہو سکتا ہے کہ ﴿الرَّسُوْلُ﴾ کی طرف لوٹ رہی ہو، مطلب یہ ہے کہ جب صحابہ کرام نے دیکھا کہ بیشک نبی کریم ﷺ کا چہرا زخمی ہو گیا، دانت مبارک ٹوٹ گیا، اور آپ کے چچا حضرت حمزہ ؓ شہید ہو گئے تو صحابہ کرام کو اس وجہ سے غم لاحق ہوا ہو، اور رسول اللہ ﷺ نے جب دیکھا کہ ان لوگوں نے مال غنیمت کی وجہ سے رب تعالیٰ کا حکم ٹال دیا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے امر میں اختلاف درحقیقت رب تعالیٰ کے امر میں اختلاف تھا، تو وہ مال غنیمت سے بھی محروم ہو گئے، ان کے اقرباء بھی شہید ہو گئے تو نبی کریم ﷺ کو صحابہ کرام کا غم لاحق ہوا، اس صورت میں گویا کہ مفہوم یہ ہو گیا ﴿فَاَثَابَکُمْ غَمًّا بِغَمٍّ﴾ تو پہنچایا تمہیں اے رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ نے غم صحابہ کرام کے غم کے بدلے۔

دوسرے معنی میں چند صورتیں:

جب "غمابغم" میں باء کو "مع" کے معنی میں کریں، مطلب یوں ہو ﴿فَاَثَابَکُمْ غَمًّا بِغَمٍّ﴾ تو پہنچائے

تمہیں غموں کے ساتھ غم، یا "باء" علی " کا معنی دے تو اس صورت میں مطلب یوں ہوگا ﴿ فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍ ﴾ تو پہنچائے تمہیں غموں پر غم،

اس معنی کے لحاظ پر چند صورتیں پائی گئی ہیں، لیکن اس سے پہلے دو مثالیں دیکھیں جن میں ایک جگہ "باء "مع" کا معنی دے رہی ہے، اور دوسری جگہ "باء" "علی" "کا معنی دے رہی ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے "مازلت به حتی فعل" ای مازلت معه حتی فعل" میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہا یہاں تک کہ اس نے یہ کیا، یہاں "باء" "مع" "کے معنی میں استعمال ہے۔ اور کہا جاتا ہے "نزلت ببنی فلان" ای علی بنی فلان" میں بنی فلاں پر اترا، اس میں باء "علی" کے معنی میں استعمال ہے۔

(۱) غموں پر غم پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ کثیر غم پہنچائے گئے، دشمن کی طرف سے ان کے مالوں اور جانوں میں نقصان پہنچانے کا غم انہیں لاحق ہوا، پھر احد میں صحابہ کرام کی تکالیف پر تمام مسلمانوں کو غم لاحق ہوا، پھر نبی کریم ﷺ کے زخمی ہونے، اور آپ کے دانت مبارک کے ٹوٹنے کا غم انہیں لاحق ہوا، پھر رسول اللہ ﷺ کے شہید ہو جانے کی خبر اڑانے کی وجہ سے غم انہیں لاحق ہوا، پھر ان سے جو نبی کریم ﷺ کے حکم کی بجا آوری (پورا کرنے) میں کوتاہی ہوئی اس کے عذاب کا خوف کا غم انہیں لاحق ہوا،

(۲) ان الغم الاول مااصابهم عندالفشل والتنازع والغم الثانی ماحصل عندالهزیمة"
بیشک پہلا غم جوان کو ضعف رائے حاصل ہونے پر اور نبی کریم ﷺ کے امر میں تنازع کی وجہ سے حاصل ہوا۔ اور دوسرا غم انہیں پسپا ہونے، میدان میں جم کر کفار کو قتل نہ کرنے کی وجہ سے لاحق ہوا،

(۳) ان الغم الاول ماحصل بسبب فوت الغنائم والغم الثانی ماحصل بسبب ان اباسفیان وخالدبن الولید اطلعا علی المسلمین فحملوا علیهم وقتلوا منهم جمعا عظیما"
پہلا غم انہیں غنیمت کے فوت ہونے کی وجہ سے لاحق ہوا، اور دوسرا غم انہیں حاصل ہوا جب کہ ابوسفیان اور خالد بن ولید نے مسلمانوں کے درہ سے ہٹ جانے پر مطلع ہو کر ان پر چڑھائی کر دی اور ان پر حملہ کر دیا اور ان میں سے ایک بڑی جماعت یعنی ستر صحابہ کرام کو شہید کر دیا۔ (ماخوذ از کبیر ج۹ ص۴۱)

﴿لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ﴾

تا کہ تم غمگین نہ ہو اس پر جو تم سے ضائع ہو گئی اور اس پر جو پہنچی ہے تمہیں۔

یہاں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ اس کا تعلق ہو ﴿وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ﴾ سے، اب مطلب یہ ہوگا کہ تحقیق اس نے تمہیں معاف کر دیا تا کہ تم کسی چیز کے کھو جانے پر غم نہ کرو اور کسی مصیبت کے آنے پر غم نہ کرو، اس کی وجہ یہ ہے

کہ "ان فی عفوہ تعالی مایزیل کل غم وحزن" بیشک اللہ تعالی جب کسی کو معاف فرمادے تو اس کے تمام غم اور پریشانیاں دور ہو جاتی ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا تعلق ﴿فَاَثَابَكُمْ﴾ سے ہو۔اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اس نے تمہیں غم کے بدلے غم پہنچایا تا کہ تمہیں کسی چیز کے ضائع ہونے پر اور کسی مصیبت کے پہنچنے پر کوئی غم نہ ہو۔یعنی نبی کریم ﷺ کے امر کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے اور آپ کو غم پہنچانے کی وجہ سے جو تمہیں پسپا ہونے کا غم رب تعالی نے پہنچایا اس کی وجہ سے باقی تمام غم تمہارے جاتے رہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ

"وذلک لان الغم الحاصل بسبب الاقدام علی المعصیة ینسی الغم الحاصل بسبب مصائب الدنیا"

جب ان کو ظاہری عصیان و نافرمانی پر غم حاصل ہوا تو اس نے باقی دنیا کی مصیبتوں کے غم بھلا دیے، یہ حقیقت ہے کہ بہت بڑے غموں کی وجہ سے چھوٹے غموں کی طرف توجہ ہی نہیں رہتی،" جب دوسرا معنی مراد ہو کہ تمہیں پہنچائے غموں پر غم" تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ رب تعالی نے جب تمہیں پہلے کثیر غم پہنچا دیے ہیں جن کی وجہ سے تم بہت زیادہ غمگین ہو چکے ہو تو اس کے بعد کسی غم کو تم دل میں نہیں لاؤ گے، (ماخوذ از کبیر ج۹ ص۴۲)

اور غموں پر غم پہنچا دینے کی وجہ یہ تھی کہ "لتتمرنوا علی الصبر فی الشدائد وتعتادوا تجرع الغموم فلاتحزنوا علی نفع فات اوضرات" تمہیں مشکلات پر صبر کرنے کی مشق حاصل ہو جائے اور غموں کا گھونٹ پی لینے کی عادت ہو جائے، پھر تمہیں کسی نفع کے فوت ہونے اور ضرر کے پہنچنے پر کوئی غم لاحق نہ ہو، (روح البیان ج۲ ص۱۱۱)

﴿وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ خبر رکھنے والا ہے جو تم عمل کرتے ہو،

"ای عالم باعمالکم وبما قصدتم بھا" یعنی اللہ تعالی تمہارے اعمال اور تمہارے دلی ارادوں کو جانتا ہے۔

فائدہ: صبر، یقین، اور اللہ تعالی پر توکل، اور دنیا، اور دنیا کے حسن مناظر سے بچ کر رہنا، اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت سے بچ کر رہنا، رب تعالی کی طرف سے امداد، کامیابی کے حاصل ہونے کے ذرائع ہیں۔اور ضعف رائے اور تنازع اور دنیا کی طرف توجہ کرنا اور رسول اللہ ﷺ کے امر کو نہ بجالانا یہ مصائب میں مبتلاء ہونے کی اسباب ہیں، اور دشمن سے پسپا ہونے کا سبب ہے۔

"فمن اراد النصرة علی الاعداء الظاهرة والباطنة لایسلک طریقا غیر ماعینه الشارع"

جو شخص ظاہری اور باطنی دشمن پر کامیابی حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اسے چاہیے کہ جو راستہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ نے معین کیا ہے اس سے نہ ہٹے، اور کوئی راہ اختیار نہ کرے، آزمائشوں پر راضی رہے، آخرت کا بھی کوئی غم نہ کرے بلکہ صرف رب تعالیٰ کی طلب کا غم کرے۔

"فطلب الحق الذ من نعیم الدنیا و الآخرۃ" اللہ تعالیٰ کی طلب کا غم دنیا اور آخرت کی نعمتوں سے زیادہ لذیذ ہے۔ دین کے معاملات میں جتنی بھی مصیبتیں آئیں ان پر صبر کرے،

صبر آرد آرزو رانی شتاب   صبر کن واللہ اعلم بالصواب

صبر جلدی ہی آرزوؤں پورا کرتا ہے   صبر کر، اللہ تعالیٰ زیادہ درست جانتا ہے۔ (روح البیان ج ۲ ص ۱۱۱)

حضرت ذوالنون بصری رحمہ اللہ کا ارشاد:

قال ذوالنون قدس سره العزیز ان ادنی منازل المرید ان الله تعالی لو ادخله النار واحاط به عذابه مع هذه الارادة لم یزد دقلبه الاحباله وانسابه وشوقا الیه وکانت الجنة عنده اصغر فی جنب ارادته من خردلقبین السماء والارض فعلی السالک ان یذیق نفسه مرارة الطاعة ویدخلها فی باب التسلیم لیکون عندالله مماله قدر وسبق"

حضرت ذوالنون بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیشک اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا ارادہ رکھنے والے کا ادنی درجہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اسے آگ میں داخل کردے اور عذاب کے ذریعے اس کا احاطہ کرلے تو اس کے ارادہ میں کوئی فرق نہ آئے بلکہ اس کی محبت اللہ تعالیٰ سے بڑھتی چلی جائے، اللہ تعالیٰ سے اس کا انس اور شوق اور زیادہ ہو۔ جنت اسے رائی کے دانے سے بھی چھوٹی نظر آئے، سالک وہی ہے جو طاعت کی مشکلات کو برداشت کرے اور تسلیم کے دروازہ میں داخل ہوجائے تاکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اسے قدر و منزلت حاصل ہوجائے اور اللہ تعالیٰ کے حضور اسے سبقت حاصل ہو۔
(روح البیان ج ۲ ص ۱۱۱)

حکمت آموز قول: روح البیان میں ذکر کیا گیا ہے (سند مذکور نہیں اسلئے سند کی صحت وغیر صحت علامہ اسمٰعیل حقی رحمہ اللہ پر ہے) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اے خلیفۂ رسول اللہ ﷺ کس وجہ سے اس مرتبہ تک پہنچے ہو کہ ہم سے تم سبقت لے گئے؟ آپ نے فرمایا پانچ چیزوں کی وجہ سے:

(۱) اولها وجدت الناس صنفین مریدالدنیا ومرید العقبی فکنت انا مرید المولی" ان میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ میں نے لوگ دو قسم کے پائے، ان میں سے بعض دنیا کا ارادہ کر رہے تھے، اور بعض آخرت کا ارادہ کر رہے، لیکن

میں نے (دنیاو آخرت کا ارادہ نہیں بلکہ) صرف رب تعالیٰ کی رضاء کا ارادہ کیا،

(۲) والثانی مذدخلت فی الاسلام ماشبعت من طعام الدنیا لان لذۃ معرفۃ اللہ شغلتنی عن لذائذ طعام الدنیا" ان میں دوسری وجہ یہ ہے کہ میں جب سے اسلام میں داخل ہوا، میں نے سیر ہو کر دنیا کا طعام نہیں کھایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی معرفت کی لذت نے دنیا کے طعام کی لذت سے پھیر دیا۔

(۳) والثالث مذدخلت فی الاسلام مارویت من شراب الدنیا لان محبۃ اللہ شغلتنی عن شراب الدنیا" ان میں سے تیسری وجہ یہ ہے کہ میں جب سے اسلام میں داخل ہوا میں نے دنیا کا مشروب نہیں پیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت نے مجھے دنیا کے شراب سے پھیر دیا، خیال رہے کہ اس مقام میں شراب سے مراد زیادہ بہتر یہ ہے کہ تشبیہ ثابت کی جائے کہ آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں نے جب سے اسلام قبول کیا مجھے اللہ تعالیٰ کی محبت نے یوں مست کر دیا کہ دنیا کی محبت کا کوئی مشروب میں نے نہیں پیا۔

(۴) والرابع کلما استقبلنی عملان عمل الدنیا وعمل الآخرۃ اخترت عمل الآخرۃ علی عمل الدنیا "ان میں سے چوتھی وجہ یہ ہے کہ جب بھی میرے سامنے دو عمل آئے ایک دنیا کا عمل اور ایک آخرت کا عمل تو میں نے آخرت کے عمل کو دنیا کے عمل پر ترجیح دی،

(۵) والخامس صحبت النبی ﷺ فاحسنت صحبتہ" پانچویں وجہ یہ ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی صحبت کو جب سے اختیار کیا تو میں نے احسن طریقہ سے صحبت کو قائم رکھا، علامہ اسمٰعیل حقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں آپ نبی کریم ﷺ کی صحبت سے کبھی بھی ایک گھڑی سے زیادہ جدا نہیں رہے، یہاں تک کہ آپ نبی کریم ﷺ سے ساتھ غار میں داخل ہوئے طرح طرح کی مشکلات کو آپ نے برداشت کیا لیکن نہ ہی کبھی حضور ﷺ سے آپ نے جدا ہونے کا خیال کیا اور نہ ہی آپ نے کبھی حضور ﷺ کے حکم کو ٹالا۔ (روح البیان ج ۲ ص ۱۱۱)

تنبیہ: نبی کریم ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی غزوہ احد میں صرف چالیس صحابہ کرام سے ہوئی، اور آپ کے ساتھ ثابت رہنے والے اور آپ کی حفاظت کرنے والے چودہ صحابہ کرام تھے جن کے نام ذکر کر دیئے گئے، شہید ہونے والے ستر صحابہ کرام سب ہی ثابت قدم رہنے والے تھے، اور جو شہید نہیں ہوئے ان میں بعض میدان کارزار میں قائم رہے کچھ بکھر گئے۔ لیکن رب تعالیٰ نے بکھر جانے والوں کے نادم ہونے پر ان کو معاف کر دیا، اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق عطاء فرمائے، صحابہ کرام اور اہل بیت کے گستاخ اپنی عاقبت برباد کر رہے ہیں۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مخالفین اور حضرت امام حسین ﷺ کے مخالفین دونوں ایک درجہ کے ہیں۔ رب تعالیٰ ان دونوں فرقوں سے بچائے، کاش کہ حق راہ سادات اور پیروں کو بھی سمجھ آئے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَائِفَةً مِّنْكُمْ وَطَائِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ يُخْفُوْنَ فِيْ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○ (آیۃ نمبر ۱۵۴)

(1) پھر تم پر غم کے بعد چین کی نیند اتاری کہ تمہاری ایک جماعت کو گھیرے تھی اور ایک گروہ کو اپنی جان کی پڑی تھی اللہ پر بے جا گمان کرتے تھے جاہلیت کے سے گمان کہتے کیا اس کام میں کچھ ہمارا بھی اختیار ہے، تم فرمادو کہ اختیار تو سارا اللہ کا ہے اپنے دلوں میں چھپاتے ہیں جو تم پر ظاہر نہیں کرتے کہتے ہیں ہمارا کچھ بس ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے تم فرمادو کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے جب بھی جن کو مارا جانا لکھا جا چکا تھا اپنی قتل گاہوں تک نکل کر آتے اور اس لئے کہ اللہ تمہارے سینوں کی بات آزمائے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے کھول دے اور اللہ دلوں کی بات جانتا ہے۔ (کنز الایمان)

(2) پھر اتاری تم پر غم کے بعد چین کی نیند جو چھا رہی تھی ایک گروہ پر تم میں سے، اور ایک گروہ کو تحقیق غم میں ڈالا ان کی جانوں نے، وہ گمان کرنے لگے اللہ پر بے جا جاہلیت کا گمان" وہ کہنے لگے کیا ہمیں (اختیار) ہے اس کام میں کچھ، تم فرمادو کہ بیشک کام) میں اختیار) تو سارا اللہ کا ہے، وہ پوشیدہ رکھتے ہیں اپنے نفسوں میں جو ظاہر نہیں کرتے آپ پر وہ کہتے ہیں اگر ہمیں اس کام میں کچھ (اختیار) حاصل ہوتا تو ہم نہ قتل کئے جاتے یہاں۔ فرمادیجئے اگر ہوتے تم اپنے گھروں میں البتہ نکل آتے" وہ کہ لکھا گیا ان کیلئے قتل ہونا" اپنے قتل کی جگہ تک، تاکہ آزمائے اللہ جو تمہارے سینوں میں ہے، تاکہ کھول کر نکھار دے اسے جو تمہارے دلوں میں ہے، اللہ جانتا ہے سینوں کی باتوں کو۔ (نجوم الفرقان)

مختصر مطلب:

اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں سے نصرت کا وعدہ فرمایا کہ تمہیں کافروں پر مدد دی جائے گی، انسان نصرت کو اسی وقت نصرت اعتبار کرتا ہے جب اس کا خوف زائل ہو جائے، اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان سے خوف زائل کرنے کا ذکر کیا، تاکہ ان کے دل مطمئن ہو جائیں کہ اللہ تعالیٰ کی امداد کا وعدہ مزید پورا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنی امداد کا ذکر فرمایا ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ﴾ اور تحقیق سچا کر دیا تمہارے ساتھ اللہ نے اپنا وعدہ جب تم ان کو (کافروں کو) قتل کر رہے تھے، لیکن صحابہ کرام سے نبی کریم ﷺ کے حکم کو ماننے میں غلطی ہوئی تو ان پر خوف مسلط کر دیا گیا، پھر ان سے خوف کو ہٹا لیا گیا۔ غزوہ احد میں شریک ہونے والے دو قسم کے لوگ تھے، ایک مخلصین مؤمنین صحابہ کرام اور دوسرے منافقین، ان دونوں فریقوں کا تذکرہ اس آیۃ کریمہ میں فرمایا، مؤمنوں کو خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو غم پہنچایا اور خوف مسلط کیا اس کے بعد تمہیں چین کی نیند عطا فرما دی جس سے تمہارا خوف جاتا رہا، یہ ایک فریق یعنی مخلصین مؤمنین پر نیند چھا گئی، اور دوسرا فریق منافقین کا تھا جن کو جان کی فکر کھائے جا رہی تھی ، وہ جاہلیت کی طرح اللہ تعالیٰ پر بلاوجہ بدگمانی کر رہے تھے، وہ کہہ رہے تھے کاش ہمیں بھی کوئی اختیار ہوتا۔

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ آپ فرما دیں کہ بیشک تمام اختیار تو اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، وہ جو چاہے کرتا ہے، انہوں نے اپنی بدگمانیوں کو دلوں میں چھپا رکھا تھا، اسے ظاہر نہیں کر رہے تھے، وہ کہہ رہے تھے کاش کہ ہمیں کوئی اختیار ہوتا اور ہمارے سردار عبداللہ بن ابی کی بات کو مان کر مدینہ میں رہ کر مدافعانہ (دفاعی) جنگ لڑی جاتی تو یہاں ہمارے بھائی قتل نہ ہوتے، اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو فرمایا کہ آپ ان کو فرما دیں کہ جس کی موت لکھی ہوئی تھی اسے اپنی قتل کی جگہ پہنچنا ہی تھا جہاں وہ پہنچ گیا، احد کے واقعہ کی اصل وجہ یہ بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کے سینوں میں چھپی ہوئی باتوں کا امتحان لے لے، مومنوں کے دلوں سے خوف کو ہٹا دے، مومنوں کے دلوں کو نکھار دے، اور مؤمنوں اور منافقوں میں تمیز کر دے تاکہ آنے والی نسلوں کو مخلصین اور منافقین کا کردار اور ان کے نظریات سمجھ آتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ تو لوگوں کے سینوں میں چھپے ہوئے راز جانتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا﴾ "پھر اتاری تم پر چین کی نیند۔"

﴿ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ﴾ یہ خطاب ایمان والوں کو ہے کہ اے ایمان والو پھر اتاری تم پر، ﴿مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ﴾ غم کے بعد، یعنی جو تمہیں غزوہ احد میں مصیبت پہنچی اور وقتی طور پر شدید خوف لاحق ہوا، اس کے بعد "امنة نعاسا" چین کی

نیند"الامن والامنة واحد" امن اور امنۃ کا ایک ہی معنی ہے، ہاں بعض حضرات نے فرق بھی کیا ہے، وہ یہ کہ "الامن یکون مع زوال الخوف" امن اس وقت حاصل ہوتا ہے جب خوف بھی زائل ہو جائے "والأمنة مع بقاء سبب الخوف" امنۃ اس آرام کو کہتے ہیں جو بظاہر آرام بھی حاصل ہو، لیکن خوف باقی رہے، "والنعاس اخف من النوم" ہلکی نیند کو نعاس کہا جاتا ہے،

"والمعنی اعقبکم بمانا لکم من الخوف والرعب ان امنکم أمناتناموں معد لان الخائف لایکاد ینام فآمنهم بعد خوفهم"

مطلب یہ ہے کہ رب تعالی نے ایمان والوں کا امتحان لے لیا، ان کو مصیبت پہنچا کر ان پر خوف اور رعب مسلط کر دیا، اس کے بعد ان کو امن، چین دے دیا جس کی وجہ سے ان کو نیند آنے لگی، اسی سے واضح ہو گیا کہ ان کے دلوں میں کوئی خوف نہیں رہا تھا کیونکہ جو ڈر رہا ہو نیند تو اس کے قریب بھی نہیں آتی، یہاں سے ایک اور بات نکھر کر سامنے آگئی کہ اس مقام "امنۃ" بغیر خوف کے امن حاصل ہونے کے معنی میں استعمال ہے وہ امن مراد نہیں جس میں خوف باقی رہے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

قوله"نعاسا"بدل اشتمال من امنة وجاز ان یکون مفعولا لانزل"وامنة"حال منه مقدم علیه"

(مظہری ج ۲ ص ۱۵۷)

یہاں دو ترکیبیں پائی گئی ہیں ایک یہ کہ "نعاسا" بدل اشتمال ہو "امنۃ" سے، اسی ترکیب کے مطابق حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے "پھر اتاری اللہ تعالی نے تم پر غم واندوہ کے بعد "راحت (یعنی) غنودگی۔

(ضیاء القرآن ج ۱ ص ۲۷۶)

اور دوسری ترکیب یہ ہے کہ "نعاسا" مفعول ہے "انزل" کا، اور "امنۃ" اس سے حال مقدم ہے، اس کا تفصیلی معنی تو یوں ہوگا "پھر اتاری تم پر نیند حال یہ ہے کہ وہ امن وچین تھی" لیکن اتنے لمبے معنی کو اعلی حضرت مولنا احمد رضاء خان رحمہ اللہ نے مختصر اور خوبصورت انداز میں یوں بیان کیا "پھر تم پر غم کے بعد چین کی نیند اتاری"۔ (کنز الایمان)

راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا لیکن لفظی ترتیب کے مطابق "پھر اتاری تم پر چین کی نیند" (نجوم الفرقان)

﴿یَغْشٰی طَآئِفَةً مِّنْكُمْ﴾ جو چھا رہی تھی ایک گروہ پر تم میں سے" اس گروہ سے مراد کون سا گروہ ہے؟

﴿وَهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا﴾ اس سے مراد یقیناً ایمان والے لوگ ہیں۔ (مظہری ج ۲ ص ۱۵۸)

❁ عن انس عن ابی طلحة قال کنت فیمن تغشاهم النعاس یوم احد حتی سقط سیفی

من یدی مرارا یسقط و آخذه و یسقط فآخذه. (بخاری)

حضرت انس ﷺ حضرت ابوطلحہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں میں بھی ان لوگوں میں تھا جن پر احد کے دن نیند چھارہی تھی، یہاں تک کہ میرے ہاتھ سے کئی مرتبہ تلوار گر گئی، تلوار گر جاتی میں اسے پکڑ لیتا، پھر گر جاتی پھر پکڑتا۔

❁ واخرجه الترمذی عنه قال غشینا النعاس ونحن فی مصافنا یوم احد"
حضرت ابوطلحہ کہتے ہیں ہم پر احد کے دن نیند چھارہی تھی حالانکہ ہم صفوں میں تھے، (منقول از خازن ج۱ ص۲۶۴)

❁ وقال ثابت عن انس عن ابی طلحة قال رفعت راسی یوم احد فجعلت ماأری احدا من القوم الا وهو یمیل تحت جحفة من النعاس"
ابوطلحہ فرماتے ہیں میں نے احد کے دن اپنا سر اٹھا کر دیکھا، میں اپنی قوم کو دیکھ رہا تھا کہ غنودگی کی وجہ سے ڈھالوں کے نیچے ان کے سر مائل ہو رہے تھے (منقول مظہری ج۲ ص۱۵۹)

❁ عن ابن مسعود النعاس فی القتال امنة والنعاس فی الصلوة من الشیطان"
حضرت ابن مسعود ﷺ فرماتے ہیں جنگ میں غنودگی امن ہے اور نماز میں غنودگی شیطان کی طرف سے ہے

❁ "وذلک لأنه فی القتال لایکون الامن غایة الوثوق بالله والفراغ عن الدنیا ولایکون الصلوة الامن غایة البعد عن الله"
وجہ اس کی یہ ہے کہ جنگ میں غنودگی تب ہی آتی ہے جب اللہ تعالی پر کامل بھروسہ ہو، اور دنیا کی طرف اس کی توجہ نہ ہو، اور نماز میں غنودگی کا آنا علامت ہے اس کی کہ یہ شخص اللہ تعالی سے بہت دور ہے، اگر اسے اللہ تعالی کا قرب حاصل ہوتا، اور رب تعالی کا خوف لاحق ہوتا تو اسے غنودگی نہ آتی۔ (کبیر ج۹ ص۴۵)

غنودگی میں فوائد:

(۱) مؤمنوں کی جماعت کو دوران جہاد عام عادت کے خلاف زیادہ ہی ہلکی نیند آگئی، جس کی وجہ سے ان کے ہاتھوں سے تلوار گرتی وہ اٹھاتے پھر گر جاتی "فکان ذلک معجزة ظاهرة للنبی ﷺ" یہ نبی کریم ﷺ کا واضح معجزہ ہے۔ صحابہ کرام نے جب نبی کریم ﷺ کا یہ نیا معجزہ دیکھا تو ان کے ایمان میں اور زیادہ پختگی آگئی،

"ومتی صاروا کذلک ازداد جدهم فی محاربة العدو ووثوقهم بان الله تعالی منجز وعده"
جب ان کے دل میں اور زیادہ ایمان میں پختگی آگئی تو دشمن کے ساتھ ان کی جنگ میں کوشش اور بڑھ گئی۔ اور بہت زیادہ وثوق ان کو حاصل ہوگیا کہ اللہ تعالی نے ان کے ساتھ وعدہ کو ضرور ہی پورا کرنا ہے،

(۲) نیند کے نہ آنے، بیدار رہنے کی وجہ سے ضعف اور سستی آجاتی ہے۔ جب سو جائے، آرام کر لے تو اس کے

بعد چستی اور قدرت وطاقت بڑھ جاتی ہے۔

(۳) صحابہ کرام کو دوران جہاد اس وجہ سے بھی نیند عطاء کی تا کہ وہ اپنے شہید اقرباء کو نہ دیکھیں تا کہ دیکھنے میں انہیں خوف نہ حاصل ہو۔

(۴) دشمن جبکہ بہت تمنار کھتے تھے کہ باقی بچ جانے والے حضرات کو بھی شہید کر دیں تو اللہ تعالی نے مومنوں کو نیند عطاء کر دی اور ان کو سلامت رکھا، "ھذا أدل الدلائل علی ان حفظ الله وعصمته معھم" یہ اس پر بہت بڑی دلیل ہے کہ اللہ تعالی ہی حفاظت کرنے والا ہے، اور وہی بچانے والا ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آجائے تو اللہ تعالی پر بھروسہ بڑھ جاتا ہے اور دل سے خوف جاتا رہتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر ج۹ ص۴۵)

﴿وَطَائِفَةٌ قَدْاَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ﴾ "اور ایک گروہ کو غم میں ڈالا ان کی جانوں نے۔"

"ھم یھم ھما" "الحزن الذی یذیب الانسان" "یقال ھممت الشحم"

وہ غم جو انسان کو پگھلا دے اسے "ھم" کہا جاتا ہے اسی طرح کہا جاتا ہے "ھممت الشحم" میں نے چربی کو پگھلایا۔ "والھم ماھممت به فی نفسک" اسی طرح "ھم" کا معنی ارادہ کرنا بھی آتا ہے۔ یہ معنی قرآن پاک کی بہت آیات میں استعمال ہے۔

"اِذْهَمَّتْ طَّائِفَتَانِ مِنْكُمْ" "وَهَمُّوْابِمَالَمْ يَنَالُوْا" "وَهَمُّوْابِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ"

اس مقام میں کونسا معنی معتبر ہے؟ دونوں معنی لئے جا سکتے ہیں لیکن مراد دونوں سے غم میں ڈالنا ہی ہے۔ "وطائفة قداھمتھم انفسھم" یعنی

حملتھم انفسھم علی الھم لان اسباب الخوف وھی قصد الاعداء کانت حاصلة عندھم"

یعنی ان کی جانوں نے ان کو غم پر برانگیختہ کیا یعنی غم پر ابھارا، کیونکہ ان کو اسباب خوف حاصل تھے کہ ہائے دشمن ہم پر حملہ کر کے ہمیں قتل کر دے گا۔ (خازن ج ۱ ص ۲۹۴)

راقم نے یہی معنی کیا ہے ظاہر الفاظ کے مطابق چونکہ "انفسھم" مرفوع ہے اور فاعل ہے۔ (اور اعلی حضرت رحمہ اللہ نے مرادی معنی پیش کیا ہے، مختصر اور خوب "اور ایک گروہ کو اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی" (کنز الایمان)

اور یہی ڈرنے والا معنی ابو مسلم نے بھی بیان کیا:

"قال ابومسلم من عادة العرب ان یقولوا لمن خاف "قداھمته نفسه"

ابو مسلم کہتے ہیں عرب کی یہ عادت ہے کہ جب کوئی ڈر رکھتا ہو تو کہا جاتا ہے "قداهمته نفسه" تحقیق اس کے نفس نے اسے غم میں ڈال دیا ہے، یعنی اسے اپنی جان کی پڑی ہوئی ہے۔ "ارادہ والا معنیٰ" بھی آتا رہتا ہے "همنی الشئ" فلاں چیز نے مجھے یہ ارادہ کرایا۔ "یعنی عن همی وقصدی" یعنی میرا ارادہ یہ تھا۔ (کبیر ج۹ ص۴۶)

اسی معنیٰ کے لحاظ پر ترجمہ یوں ہوگا "ایک گروہ کو ان کے نفسوں نے ارادہ کرایا (ڈرنے کا) لیکن اس معنیٰ میں تکلف پایا جائے جو مستحسن نہیں۔

"وهؤلاء المنافقون لشدة خوفهم من القتل طار النوم عنهم"

منافقوں کی شدت خوف کی وجہ نیند اڑ گئی تھی،

مومنوں اور منافقوں کے غم میں فرق:

قیل المؤمنون کان همهم النبی ﷺ واخوانهم من المؤمنین، والمنافقون کان همهم انفسهم"

مؤمنوں کو بھی اگر چہ خوف تھا لیکن وہ نبی کریم ﷺ اور اپنے مؤمن بھائیوں کا ان کو اپنی جانوں کا کوئی خوف نہ تھا اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے ان پر نیند کو مسلط کر کے اس خوف کو ان سے دور کر دیا جو انہیں لاحق تھا۔ لیکن منافقوں کو اپنی جان کا خوف تھا، اسلئے وہ خوف سے پگھلے جا رہے تھے، تحقیق قول کی یہ ہے کہ انسان جس چیز میں مشغول ہو اور متفرق ہو دوسری چیز اسے بھول جاتی ہے، اسلئے مومنوں کی توجہ صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف تھی لھذا ان کو جانوں کا خوف نہیں دیا۔ منافقین اپنی جانوں میں مشغول تھے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کرتے تھے اس وجہ سے انہیں خوف اپنی جانوں کا تھا، (ماخوذ از کبیر ج۹ ص۴۶)

﴿يَظُنُّونَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ﴾ وہ گمان کرتے ہیں اللہ پر بے جا جاہلیت کا گمان۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

﴿ غَيْرَ الْحَقِّ ﴾ "مصدر کے حکم میں ہے، معنیٰ اس کا یہ ہے 'یظنون بالله غیر الظن الحق الذی یجب ان یظن به" وہ اللہ پر گمان کرتے ہیں "ظن، حق کا غیر ہے" حالانکہ ان پر واجب تھا کہ وہ حق گمان کرتے، "ظن الجاهلية" بدل عنه "ظن الجاهلية" بدل ہے "غیر الحق" سے، اس ترکیب کا فائدہ یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ کثیر تعداد میں دین ناحق ہیں، ان سب میں سے اہل جاہلیت کے اقوال زیادہ برے ہیں، پہلے

ذکر کیا"انهم يظنون بالله غير الظن الحق" کہ وہ بیشک اللہ تعالی پر بے جا، ناحق گمان کرتے ہیں۔اس کے بعد بیان کیا کہ انہوں نے ناحق دینوں میں سے وہ پسند کیا"هو اكثرها بطلانا وهو ظن اهل الجاهلية" جو اکثر باطل ہے، وہ اہل جاہلیت کا گمان ہے۔ (کبیر ج۹ص۴۷)

﴿يَظُنُّوْنَ بِاللهِ﴾ میں دو قول ہیں، ایک قول یہ ہے کہ "ظن" خاص درجہ علم میں ہو اور اس کا استعمال اسطرح ہو جیسا کہ "حاتم الجود" اور "عمر العدل" کا استعمال ہے، مراد وہ ظن ہو جو دین جاہلیت کے ساتھ خاص ہو۔"اب ترجمہ یہ ہوگا" وہ گمان کرتے ہیں اللہ پر بے جا دین جاہلیت کا گمان"راقم نے ظاہری الفاظ کے مطابق یہی ترجمہ کیا ہے،

دوسرا قول ہے"المراد ظن اهل الجاهلية" اس صورت میں معنی یہ ہوگا وہ گمان کرتے ہیں اللہ پر بے جا جاہلیت والوں کے گمان کی طرح، اعلی حضرت رحمہ اللہ نے اسی کے مطابق ذرا مختصر ترجمہ کیا"اللہ پر بے جا گمان کرتے تھے جاہلیت کے سے گمان۔

جاہلیت کا گمان کیا تھا:

اس کے دو احتمال ہیں۔ایک ان میں سے زیادہ ظاہر ہے وہ یہ کہ

"انهم كانوا يقولون فى انفسهم لو كان محمد محقافى دعواه لما سلط الكفار عليه وهو ظن فاسد"

وہ کہ وہ اپنے دل میں یہ کہتے تھے کہ اگر محمد اپنے دعوی میں حق پر ہوتے تو کافر ان پر مسلط نہ ہوتے، یہ دعوی ان کا باطل تھا، کیونکہ اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کو نبوت کا تاج پہنایا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ رب تعالی آپ کو آزمائش میں نہیں ڈال سکتا،"ان الله تعالى يفعل مايريد ويحكم مايريد" بیشک اللہ تعالی جو چاہے وہ کرتا ہے اور جو چاہے وہ حکم فرماتا ہے، رب تعالی پر کوئی اعتراض نہیں کرسکتا کہ وہ اپنے بندوں کو آزمائش میں کیوں ڈالتا ہے۔اگر غور کیا جائے تو بندے کی آزمائش بھی اس کے مدارج کو بلند کرنے کیلئے کی جاتی ہے کہ وہ اس آزمائش میں پورا اتر کر قرب الہی حاصل کرلے۔

ظن جاہلیت میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ"انهم كانوا ينكرون اله العالم بكل المعلومات القادر على كل المقدورات" کہ وہ رب تعالی جو معبود حقیقی ہے اس کے متعلق یہ گمان کرتے تھے کہ وہ تمام معلومات کا عالم نہیں

اور تمام مقدورات پر قادر نہیں، ان کا یہ گمان باطل تھا،

"وینکرون النبوۃ والبعث فلاجرم ماوثقوا بقول النبیا فی ان اللہ یقویھم وینصرھم"

وہ نبوت اور قیامت کا انکار کرتے تھے اور نبی کریم ﷺ کے اس قول پر وثوق نہیں کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کو قوت دے گا، ان کی امداد کرے گا، ان کا یہ انکار بھی جاہلیت کا گمان تھا، (ماخوذ از کبیر بالاختصار ج۹ ص۴۶)

﴿وَيَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ﴾ "وہ کہنے لگے کیا ہمیں اس کام میں اختیار ہے کچھ"

منافقین کی یہ ایک اور صفت بیان کی جارہی ہے۔ ان کا کلام استفہام انکاری کے طور پر ہے، مطلب یہ ہوا کہ وہ منافقین کہہ رہے تھے کیا ہمیں اس کام میں کوئی اختیار ہے کچھ، یعنی ہمیں تو اس میں کوئی اختیار ہی نہیں تھا، اگر ہمارا کوئی اختیار ہوتا اور ہماری بات کو مانا جاتا تو اس طرح مسلمان قتل نہ ہوتے۔

شان نزول:

غزوۂ احد کیلئے نبی کریم ﷺ نے منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی بن سلول سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ آپ مدینہ طیبہ میں ہی رہیں، یہاں سے ہی کفار کا دفاع کریں، لیکن نبی کریم ﷺ نے اس کی بات کو نہ مانا آپ احد میں تشریف لے گئے، "وقتل من قتل" تو اس میں کئی حضرات شہید ہو گئے۔

"قیل لعبد اللہ بن ابی قد قتل بنو الخزرج "قال "ھل لنا من الامرشیٔ" وھو استفھام علی سبیل الانکار ای مالنا امر یطاع"

تو عبداللہ بن ابی کو کہا گیا بنوخزرج کے لوگ شہید ہو گئے، وہ کہنے لگا کیا ہمیں اس کام میں کوئی اختیار تھا؟ یعنی ہمیں تو کوئی اختیار نہیں تھا ہماری بات کو تو تسلیم ہی نہیں کیا گیا۔

یعنی ان محمدالم یقبل قولی حین امرتہ بان یسکن فی المدینۃ ولایخرج منھا، ونظیرہ ماحکاہ اللہ عنھم انھم قالوا "لواطاعونا ماقتلوا"

یعنی عبداللہ بن ابی کہنے لگا میری بات کو تسلیم نہیں کیا گیا میں نے تو کہا تھا مدینہ میں ہی رہیں باہر نہ نکلیں، رب تعالیٰ نے ان لوگوں قول کو یوں بیان فرمایا کہ وہ کہہ رہے تھے ﴿لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا﴾ اگر یہ (مسلمان) ہماری اطاعت کرتے تو قتل نہ کئے جاتے۔

دوسری وجہ یہ بیان کی گئی کہ منافقین کا یہ کہنا:

"هل لنا من الامر شیٔ" ای هل لنا من الشیٔ الذی کان یعدنا به محمد وهو النصرة والقوة شی وهذا استفهام علی سبیل الانکار"

"کیا ہمیں اس کام میں اختیار ہے کچھ" اس میں ان کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں تو اس میں کچھ اختیار ہی نہیں تھا جو محمد (ﷺ) ہمارے ساتھ نصرت اور غلبہ کا وعدہ کرتے تھے۔ بلکہ (معاذ اللہ) وہ استدلال یہ پیش کرر ہے تھے

"ان محمدا کان کاذبافی ادعاء النصرة والعصمة من الله تعالی لامته"

بیشک محمد (ﷺ) اپنے اس دعوی میں جھوٹے تھے جو وہ اپنی امت کو کہتے تھے کہ تمہیں امداد حاصل ہوگئی۔ (معاذ اللہ) ان منافقین کا استدلال باطل تھا۔ (کبیر ج۹ ص ۴۷)

عبداللہ بن ابی کی طرح معتب بن قشیر اور اس کے ساتھی بھی یہی کہہ رہے تھے "وکانوا خرجوا طمعافی الغنیمة" وہ نکلے ہی تھے مال غنیمت حاصل کرنے کیلئے، جب ان کو غنودگی بھی نہ آئی "وجعلوا یتأسفون علی الحضور ویقولون الأقادیل" خوف ان کو حاصل ہوا تو وہ احد میں اپنے حاضر ہونے پر افسوس کرر ہے تھے، اور اس قسم کے باطل اقوال پیش کرر ہے تھے۔

"قال ازبیر ارسل علینا النوم ذلک الیوم وانی لأسمع قول معتب بن قشیر والنعاس یغشانی یقول لو کان لنا من الأمر شیٔ ماقتلنا ههنا"

حضرت زبیر ﷜ فرماتے ہیں، ہمیں اس دن غزوہ احد میں نیند عطاء کردی گئی، باوجود اس کے کہ نیند مجھ پر چھا رہی تھی لیکن میں معتب بن قشیر کی آواز سن رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا "اگر ہمیں اس امر میں کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کئے جاتے، (قرطبی ج۴ ص ۲۴۲)

﴿قُلۡ اِنَّ الۡاَمۡرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ﴾

"تم فرمادو بیشک کام (میں اختیار) سارا اللہ کا ہے۔"

(قل) یامحمد لهؤلاء المنافقین (ان الأمر کله لله) یعنی النصر والظفر والقضاء والقدر کله لله وبیده یصرفه کیف یشاء ویدبره کیف احب"

مطلب ان الفاظ مبارکہ کا یہ ہوا کہ اے محمد (ﷺ) آپ ان منافقوں کو فرمادو کہ بیشک سارا امر اللہ کیلئے ہے یعنی نصرت اور کامیابی عطاء کرنا، قضاء وقدر (تمام فیصلے اور تقدیر) سب اللہ تعالی کے قبضۂ قدرت میں ہیں وہ پھیرتا ہے جس طرح چاہے، اور تدبیر فرماتا ہے جسطرح پسند کرتا ہے۔ (خازن ج۱ ص ۲۶۴)

تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر میں ہیں:

اس آیۃ کریمہ سے اہل سنت نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ جب منافقین نے یہ کہا "ان محمدالوقبل منارأینا ونصحنا لما وقع فی هذه المحنة" بیشک محمد اگر ہماری رائے کو مانتے اور ہماری نصیحت پر عمل کرتے تو اس مشقت میں نہ پڑتے "فاجاب الله عنه بان الأمر كله لله" تو اللہ تعالیٰ نے یہ جواب دیا کہ امر (کام) سارا اللہ کا ہے، اس جواب سے ہی یہ پتہ چل گیا کہ بندوں کے تمام افعال اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر میں ہیں، اگر اس کی مشیئت سے خارج ہوتے تو منافقین کے شبہ کا ازالہ نہ ہوتا۔

آیۃ کریمہ اور برہان عقلی کا تطابق:

آیۃ کریمہ سے جس طرح ثابت ہوا کہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر میں ہیں اسی طرح عقلی دلیل سے بھی یہی ثابت ہو رہا ہے کہ موجود یا واجب لذاتہ ہوگا یا ممکن لذاتہ ہوگا، ممکن لذاتہ کے وجود کو عدم پر اس وقت تک راجح نہیں کر سکتے جب تک اس کی انتہاء واجب الوجود کی طرف نہ ہو، یعنی ممکن اسی وقت موجود ہوتا ہے جب واجب الوجود اسے موجود کرے "فثبت ان كل ماسوى الله تعالى مستند الى ايجاده وتكوينه" تو ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا سب مخلوق اللہ تعالیٰ کے موجود کرنے سے موجود ہوتی ہے یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ بعض محدثات اور بعض ممکنات تو اللہ تعالیٰ کے موجود کرنے اور پیدا کرنے سے ہی موجود ہوتے ہیں۔ اور بعض خود بخود ہو جاتے ہیں۔

"فتدخل فيه افعال العباد وحركاتهم وسكناتهم وذلك هو المراد بقوله "قل ان الامر كله لله"

بلکہ یہ ثابت ہے کہ تمام بندوں کی حرکات وسکنات اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ﴾ کا یہی مطلب ہے کہ سارا کام اللہ تعالیٰ کا ہے، یعنی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ "هذا كلام فى غاية الظهور لمن وفقه الله للانصاف" یہ مسئلہ بہت زیادہ واضح ہے لیکن سمجھ اسے ہی آسکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ انصاف کی توفیق عطاء کرے۔ (کبیر ج ۹ ص ۴۸)

﴿يُخْفُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ﴾ وہ پوشیدہ رکھتے ہیں اپنے نفسوں میں جو نہیں ظاہر کرتے آپ پر یعنی وہ کفر کو اپنے نفسوں میں پوشیدہ رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ میں شک کرتے ہیں، اور مسلمانوں کے ساتھ نکلنے میں اپنی ندامت کو پوشیدہ رکھتے ہیں (خازن)

والفائدة فى هذا التنبيه ان يكون النبى ﷺ متحرزا عن مكرهم وكيدهم" (کبیر ج ۹ ص ۴۸)

اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ وہ دل میں مخفی رکھتے ہیں جو ظاہر نہیں کرتے، اس سے نبی کریم ﷺ کو خبردار کرنا

مقصود ہے کہ آپ ان کے مکروفریب سے بچ کر رہیں۔

﴿يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا﴾

''وہ کہتے ہیں اگر ہمیں اس کام میں کچھ (اختیار) حاصل ہوتا تو ہم نہ مارے جاتے یہاں۔''

سوال: پہلے جو گذر گیا ﴿يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ﴾ اور اب جو بیان کیا جا رہا ہے ﴿يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ﴾ ان میں کیا فرق ہے بظاہر تو تکرار نظر آتا ہے۔

پہلا جواب: اللہ تعالیٰ نے جب ان کے قول کو بیان فرمایا ﴿يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ﴾ (وہ کہتے ہیں کیا ہمیں اس امر میں (اختیار) تھا کچھ) تو رب تعالیٰ نے اس کا جواب دے دیا ﴿قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ﴾ آپ فرمادیں بیشک امر سارا اللہ کا ہے۔ تو اس جواب پر گویا کہ انہوں نے اعتراض کے طور پر کہا ﴿لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا﴾ اگر ہمیں کوئی اس امر میں اختیار ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کئے جاتے، یعنی مدینہ میں ہی رہتے اور وہاں سے نہ نکلتے، ''فهذا يدل على انه ليس الامر كما قلتم من ان الامر كله لله'' یعنی ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ تمہارا یہ کہنا کہ تمام امور رب تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں یہ درست نہیں۔ تم تو ہماری بات نہ مان کر، مدینہ سے نکل کر یہاں آنے کی وجہ سے قتل کئے گئے ہو۔

ان کا یہ جوب اسی طرح کا تھا جیسے اہل سنت کہتے ہیں رب تعالیٰ نے بندے کو افعال کے کرنے اور نہ کرنے کا اگرچہ اختیار تو دیا ہے لیکن بندہ اپنے افعال کا خالق نہیں۔ اور حقیقت میں ''الامر كله فى الطاعة والمعصية والايمان والكفر بيدالله'' تمام امور اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں، خواہ طاعت ہو یا معصیت، خواہ ایمان ہو یا کفر۔ معتزلہ کہتے ہیں بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے، اللہ تعالیٰ نے بندے کو جب کامل مختار بنادیا تو اب بندے کے افعال اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں نہ رہے۔

اسی طرح منافقین کے کلام میں کوئی مستقل شبہ نہیں پایا گیا بلکہ ''بل يكون الغرض منه الطعن فيما جعله الله تعالى جوابا عن الشبهة الاول'' صرف ان کی غرض پہلے شبہ کے جواب پر طعن کرنا تھا۔ خلاصہ جواب یہ ہے کہ ان کا پہلا قول ایک شبہ تھا، اس کا جواب دیا گیا، پھر ان کا دوسرا قول مستقل شبہ نہیں تھا بلکہ پہلے شبہ کے جواب پر طعن تھا۔

دوسرا جواب: ان کے پہلے قول ﴿هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ کہہ رہے تھے ''هل لنا من النصرة التى وعدنا بها محمد شئ'' کیا ہمیں اس امداد میں سے کچھ امداد

حاصل ہوگی جس کا وعدہ ہمارے ساتھ محمد (ﷺ) نے کیا۔اور دوسرا قول عبداللہ بن ابی کا ہے جمع کا صیغہ اس لئے ذکر کیا گیا کہ اس کے متبعین بھی اس کے ہمنوا تھے، اسی کا راگ الاپ رہے تھے، وہ یہ کہہ رہا تھا "ان محمدا لو اطاعنی وماخرج من المدینۃ ماقتلنا ھھنا" بیشک محمد (ﷺ) اگر میری اطاعت کرتے اور مدینہ سے نہ نکلتے تو یہاں ہمارے اتنے حضرات قتل نہ کئے جاتے۔(ماخوذ از کبیر ج۹ص۴۹)

﴿قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ﴾

فرمایئے اگر ہوتے تم اپنے گھروں میں البتہ نکل آتے "وہ کہ لکھا گیا ان کیلئے قتل ہونا" اپنے قتل کی جگہ تک۔"

یہ الفاظ مبارکہ جن کا ترجمہ ابھی نقل کیا گیا، اور آنے والے دو جملے اللہ تعالی نے ان کے اس قول کے جواب میں ارشاد فرمائے جو انہوں نے کہا ﴿لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا﴾ (اگر ہمیں اس امر میں کچھ (اختیار) حاصل ہوتا تو ہم قتل نہ کئے جاتے یہاں)

"البراز" فضاء، برز حصل فی برازای فضاء، جب کوئی کھلی فضاء میں جائے تو کہا جاتا ہے "برز" پھر کبھی یہ خود بخود ظاہر ہونے پر بولا جاتا، اور کبھی ظاہر کرنے کھولنے پر بولا جاتا۔اور کبھی اللہ کے فضل سے ظاہر ہونے پر، خود بخود ظاہر ہو جیسے "وتری الارض بارزۃ" اور تم دیکھو گے زمین کو کھلا، یعنی اس میں مکانات اور رہنے والے نہیں ہوں گے، اسی معنی کے مناسب "المبارزۃ" ہے، جس کا معنی ہے جنگ کیلئے صف سے باہر نکلنا اور دشمن کے سامنے ظاہر ہونا، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے ﴿وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ﴾ جب وہ (ایمان والے قوم طالوت) نکلے جالوت اور اس کے لشکر کیلئے۔"ظاہر کرنا، کھولنا" معنی لینا، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے ﴿وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ وہ ظاہر ہوں گے اللہ واحد وقہار کیلئے۔مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی جو مستور و محجوب ہے وہ قیامت کے دن منکشف (ظاہر) ہوگا۔یعنی اللہ تعالی اپنے فضل سے لوگوں کو اپنا جلوہ دکھائے گا۔اب اسی میں دو صورتیں ہیں کہ مومنوں کا رب تعالی کو دیکھنا محمود ہوگا کہ وہ اس پر خوش ہوں گے کہ ہمیں سب نعمت عظمی رب تعالی کی جلوہ گری حاصل ہوگی۔اور رب تعالی کا اپنے آپ کو کافروں پر منکشف کا کرنا ان کیلئے غیر محمود ہوگا کیونکہ رب تعالی کا ان پر قہر و غضب ہوگا۔اور ان پر ناراض ہوگا۔"تبرز" اس نے پاخانہ کیا، یہ مجازی معنی ہے اصل معنی ہے وہ فضاء میں گیا۔"امراۃ برزۃ" (بسکون الراء) پاکدامن عورت، یعنی پاکدامنی نے اسے رفعت عطاء کی جو رفعت کی وجہ سے ظاہر

جلوہ گر ہو گئی۔ (ماخوذ از مفردات راغب)

﴿مَضَاجِعِهِمْ﴾ ضجع (ف۔) ضجعا، ضجوعا" پہلو کے بل لیٹنا۔ اضجعه پہلو کے بل لٹانا، پست کرنا، "ضجعت الشمس "سورج کا ڈوبنے کیلئے مائل ہونا تضجع فی الامر کام میں کوتاہی کرنا۔ "ضاجعه "ساتھ لیٹنا مضاجع لیٹنے کی جگہ (المنجد) آیۃ کریمہ میں مراد قتل ہونے کی جگہ۔

مطلب: ان کو جواب واضح ہے کہ تم جہاں بھی اپنے گھروں میں ہو جن کی تقدیر میں قتل ہونا لکھا گیا ہے انہوں نے اپنے قتل کی جگہ ضرور بر ضرور پہنچ جانا ہے۔

"ان الحذر لایدفع القدر والتدبیر لایقاوم التقدیر فالذین قدر الله علیهم القتل لابد وان یقتلوا علی جمیع التقدیرات"

واضح ہوا کہ بچاؤ کرنا تقدیر ٹال نہیں سکتا۔ کوئی تدبیر تقدیر کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں جن کا قتل ہونا لکھ دیا گیا ہے انہوں نے ضرور ہی قتل ہونا ہے، لھذا وہی خوش قسمت شہید ہوئے جن کی تقدیر میں شہادت لکھ دی گئی تھی۔

"ان الله تعالی لما اخبر انه یقتل فلو لم یقتل لانقلب علمه جهلا"

بیشک اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کے قتل ہو جانے کی خبر دے دی، اگر وہ قتل نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ کا علم جہل سے بدل جائے گا، ایسا کبھی ہو نہیں سکتا کہ معاذ اللہ رب تعالیٰ کو جاہل کہا جائے۔ یہ بھی خیال رہے کہ کسی کا قتل ہو جانا یہ ممکنات میں داخل ہے، ابھی پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ تمام ممکنات کی انتہاء اللہ تعالیٰ کے موجود کرنے پر ہے "فلو لم یوجد لانقلبت قدرته عجزا وکل ذلک محال" اگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ کسی کے قتل ہونے کا ہو جائے اور وہ قتل نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عجز بننا لازم آئے گا، یہ محال ہے۔

تنبیہ: کلمہ "کُتِبَ" وجوب کا فائدہ دیتا ہے، جیسا کہ "کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ" اور کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ" میں "تفید وجوب الفعل" وجوب کا فائدہ دیتا ہے، جیسا کہ "کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ" اور "کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ" میں "تفید وجوب الفعل" وجوب فعل کا فائدہ دے رہا ہے۔

"وههنا لایمکن حملها علی وجوب الفعل فوجب حملها علی وجوب الوجود"،

یہاں اس آیۃ کریمہ میں "کُتِبَ" کا معنی وجوب فعل تو نہیں لیا جا سکتا، البتہ وجوب وجود معنی لیا جائے گا۔

(کبیر ج ۹ ص ۴۹)

یہ بھی خیال رہے کہ یہاں "کُتِبَ" کا معنی فرض کرنا نہیں بلکہ "لکھنا" مراد ہے، لیکن لکھنا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے

ہوگا اس کا پایا جانا لازم ہوگا۔

﴿قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ﴾ کے مفسرین کرام نے دو مطلب بیان کئے ہیں:

"الاول "لو جلستم فی بیوتکم لخرج منکم من کتب الله علیهم القتل الی مضاجعهم ومصارعهم حتی یوجد ماعلم الله انه یوجد"

ان میں سے ایک مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ منافقین کو یہ کہا گیا ہے "اگر تم اپنے گھروں میں بیٹھ رہو تو پھر بھی جن لوگوں کا قتل ہو جانا لکھا جا چکا ہے وہ تم میں سے ضرور اپنے قتل کی جگہ پہنچ جائیں گے، اللہ تعالیٰ کے علم میں جس چیز کا پایا جانا لکھا جا چکا ہے اس نے ضرور واقع ہونا ہے۔

"والثانی" کانه قیل للمنافقین لو جلستم فی بیوتکم وتخلفتم عن الجهاد لخرج المؤمنون الذین کتب علیهم قتال الکفار الی مضاجعهم ولم یتخلفوا عن هذه الطاعة بسبب تخلفکم"

ان میں سے دوسرا مطلب یہ ہے کہ منافقین کو کہا گیا ہے کہ اگر تم اپنے گھروں میں بیٹھے رہو اور جہاد سے پیچھے رہ جاؤ تو مومن جن کی قسمت میں کافروں سے جہاد کرنا اور شہید لکھا جا چکا ہے وہ ضرور اپنے مقام شہادت میں پہنچ جائیں گے، تمہارے پیچھے رہنے کی وجہ سے وہ کبھی اس طاعت سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ (کبیر ج ۹ ص ۴۹)

﴿وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ﴾ "تا کہ آزمائے اللہ جو تمہارے سینوں میں ہے"

اللہ تعالیٰ نے ان کے قول ﴿لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا﴾ کا دوسرا جواب ہے۔ قوم نے جب یہ گمان کیا کہ جہاد کی طرف نکلنا باعث فساد ہے تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اس میں تو امتحان لینا مقصود تھا۔

"فهذه المقاتلة مشتملة علی نوعین من المصلحة ان یتمیز الموافق من المنافق، وفی المثل المشهور لاتکرهوا الفتن فانها حصاد المنافقین"

اس جہاد یعنی غزوہ احد میں دو قسم کی مصلحتیں رکھ دی گئی تھیں۔ ایک یہ کہ خالص مومن رب تعالیٰ کے حکم کے مطابق عمل کرنے والے اور منافقین میں امتیاز ہو جائے، یعنی مومنین میں اور زیادہ نکھار آ جائے، دوسری مصلحت اس مثال مشہور کے مطابق تھی

"لاتکرھوا الفتن فانھا حصاد المنافقین" فتنوں کو ناپسند نہ سمجھو یہ تو منافقوں کو کاٹ دینے والی تلواریں ہیں۔ (کبیر ج۹ ص۴۹)

اعتراض: جب پہلے ذکر ہو چکا ہے ﴿ثُمَّ صَرَفَکُمْ عَنْھُمْ لِیَبْتَلِیَکُمْ﴾ (پھر پھیرا تمہیں ان سے تاکہ تمہیں آزمائے) اس کے بعد ﴿وَلِیَبْتَلِیَ اللّٰہُ مَافِیْ صُدُوْرِکُمْ﴾ (تاکہ آزمائے اللہ جو تمہارے سینوں میں ہے) کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے اس میں تو تکرار نظر آتا ہے۔ تکرار غیر مستحسن ہے۔ اس کے دو جواب دیے گئے ہیں۔

پہلا جواب: "الاول لما طال الکلام اعاد ذکرہ" جب کلام لمبا ہو جائے تو دوبارہ ذکر کرنا مستحسن ہے۔

دوسرا جواب: "والثانی الابتلاء الأول ھزیمۃ المؤمنین والثانی سائر الاحوال" پہلی آزمائش جس کا ذکر ہے وہ مؤمنین کا کافروں سے پھر جانا اور پسپا ہو جانے کا ذکر ہے، اور دوسری آزمائش عام احوال میں امتحان لینے کا ذکر ہے۔

﴿وَلِیُمَحِّصَ مَافِیْ قُلُوْبِکُمْ﴾ تاکہ کھول کر نکھار دے جو تمہارے دلوں میں ہے۔

"**محص**" (ف) محصا. الظبی فی عدوہ "تیز دوڑنا" "المذبوح برجلہ" مذبوح کا تڑپنا، بفلان الارض، کسی کا زمین پر پٹکنا۔ "فلان من فلان" بھاگنا"

"**البرق**" بجلی کا چمکنا "اللہ مابك" زائل کرنا، "محص الشیٔ" ہر عیب سے پاک کرنا ۔محص (تفعیل) الشیٔ، کم کرنا۔

"**اللحم**" گوشت کو پٹھے سے صاف کرنا۔ محص الرجل (بنصب اللام) کسی کو آزمانا (المنجد) آیۃ کریمہ میں ایک معنی تو یہی ہے جو راقم نے ذکر کیا، البتہ مرادی مطلب یوں بھی بیان کیا گیا ہے، ﴿وَلِیُمَحِّصَ مَافِیْ قُلُوْبِکُمْ﴾ "فالتمحیص ھھنا کالتزکیۃ والتطھیر، تمحیص" کا یہاں معنی پاک کرنا، صاف کرنا۔ اب ترجمہ یوں ہوگا تاکہ پاک کرے، صاف کرے اسے جو تمہارے دلوں میں ہے۔ (مفردات راغب)

یہاں دو وجہ ذکر کی گئیں ہیں۔

"احدھما ان ھذہ الواقعۃ تمحص قلوبکم عن الوساوس والشبھات"

ایک یہ کہ واقعہ غزوہ احد کا اس لئے پیش آیا تاکہ تمہارے دلوں کو وسوسوں اور شبہات سے پاک وصاف کر دے، تاکہ تم میں نکھار آ جائے۔

"والثانی انها تصیر کفارة لذنوبکم فتمحصکم عن تبعات المعاصی والسیآت"

اور دوسری وجہ یہ ہے غزوہ احد میں تمہیں مصائب سے آزمایا گیا تا کہ وہ تمہاری لغزشوں کا کفارہ بن جائے اور تمہیں معاصی اور خطاؤں کے پیچھے پڑنے سے ہٹا کر صاف وستھرا کردے۔ (کبیر ج۹ص۵۰)

﴿وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ "اور اللہ جانتا ہے سینوں کی باتوں کو۔"

ایک چیز جب دوسری مصاحب ہو اور مذکر ہو تو اس کیلئے بولتے ہیں "ذو الشیء" اور جب مؤنث ہو تو اس کیلئے بولتے ہیں ﴿بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ سے مراد وہ اشیاء ہیں جو سینوں میں موجود ہیں۔ "وھی الاسرار والضمائر" یہ اسرار اور دل میں چھپی چیزیں ہیں۔ رب تعالی نے یہ ذکر فرما کر ﴿وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ (اور اللہ جانتا ہے سینوں کی باتوں کو یعنی سینوں میں بند راز اور چھپی ہوئی باتوں کو وہ جانتا ہے) یہ واضح کردیا کہ

"ان ابتلائه لم یکن لأنه یخفی علیه مافی الصدور اوغیر ذلک لأنه عالم بجمیع المعلومات وانما ابتلاء هم اما لمحض الالهیة اوللا ستصلاح"

رب تعالی نے بندوں کا امتحان اس لئے نہیں لیا کہ وہ ان کے سینوں کی چھپی باتوں کو نہیں جانتا، یا اس پر کوئی راز وغیرہ چھپے ہوئے ہیں۔ وہ تو تمام معلومات کو جانتا ہے، اس کے امتحان لینے کی وجہ یہ تھی کہ لوگ اسی کو خالص معبود سمجھیں، اور لوگ اپنی اصلاح کرلیں، اور ان کا آزمائش میں پورا اترنا دوسروں پر بھی واضح ہوجائے، ان کا کمال اور ان کے مدارج کی بلندی نکھر کر سامنے آجائے۔ (کبیر بمع وضاحت ج۹ص۵۰)

"سبحان اللہ" کیا شان ہے صحابہ کرام کی جن کو رب تعالی نے آزمائش میں کامیاب کرکے ان کے درجات کی بلندی کو واضح کردیا۔

فائدہ: "وَلِيَبْتَلِيَ" اور "وَلِيُمَحِّصَ" ذکر فرما کر یہ واضح کردیا "ان الله فرض علیکم القتال ولم ینصرکم یوم اُحد لیختبر صبرکم ولیمحص عنکم سیآتکم ان تبتم واخلصتم" (البحر المحیط ج۳ص۱۳۲)

کہ اللہ تعالی نے تم پر جہاد فرض کیا، ایک مرتبہ امداد فرمانے کے بعد دوبارہ امداد نہیں فرمائی تاکہ تمہارے صبر کی آزمائش ہوجائے، اور اگر تم رب تعالی کی طرف رجوع کرلو اور خلوص پیدا کرلو تو اللہ تعالی تمہاری لغزشوں کو دور فرمادے۔

موت کی جگہ کو مرنے والا ضرور پہنچ جاتا ہے:

روایت بیان کی گئی کہ بیشک ملک الموت (موت کا فرشتہ عزرائیل) حضرت سلیمان علیہ السلام کی مجلس میں حاضر ہوا، مجلس میں ایک شخص کو ڈراؤنی نظر سے دیکھا، جب ملک الموت اٹھ کر چلا گیا، تو اس شخص نے پوچھا یہ کون تھا؟ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بتایا کہ یہ ملک الموت تھا۔

"قال ارسلنی مع الریح الی عالم آخرفانی رایت منه مرأی هائلا" تو اس شخص نے کہا کہ آپ ہوا کو حکم دیں جو مجھے کہیں دور علاقہ میں پہنچادے کیونکہ میں نے اس کی بڑی ڈراؤنی نظر کو دیکھا، یعنی وہ مجھے بہت گھور گھور کر دیکھ رہا تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہوا کو حکم دیا کہ اس شخص کو کہیں دور جگہ میں پہنچادو ہوا نے آپ کے حکم کے مطابق اسے دور پہنچادیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گذرا کہ ملک الموت فرشتہ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہوا، اور کہنے لگا کہ مجھے رب تعالی نے حکم دیا تھا کہ فلاں جگہ فلاں وقت اس شخص کا روح قبض کرلو، میں نے اسے آپ کے پاس بیٹھے خیال کیا کہ یہ شخص وہاں اتنا جلدی کیسے پہنچے گا۔

"وقدارسلته بالریح الی ذلک المکان فوجدته هناک قضی امر الله عزوجل فی زمانه ومکانه من غیرا خلال بشیٔ من ذلک"

تحقیق ہوا نے اسے اس مقرر جگہ پر پہنچادیا، میں نے اسے وہاں پایا تو اس کے روح کو قبض کرلیا، اللہ تعالی کے حکم کے مطابق وقت مقرر اور مکان مقرر میں اسے پورا کرلیا گیا، اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔

(تفسیر ابی السعود ج ص ۱۰۲)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌO (آیة نمبر ۱۵۵)

(1) بیشک وہ جو تم میں سے پھر گئے جس دن دونوں فوجیں ملی تھیں انہیں شیطان نے ہی لغزش دی ان کے بعض اعمال کے باعث اور بیشک اللہ نے انہیں معاف فرمادیا، بے شک اللہ بخشنے والا حلم والا ہے۔ (کنزالایمان)

(2) بیشک وہ جو پھر گئے تم میں سے بعض جس دن ملے دولشکر، بیشک پھسلایا ان کو شیطان نے ہی، بوجہ بعض ان کے کسب کے، اور البتہ تحقیق معاف کردیا اللہ نے ان کو، بیشک اللہ بخشنے والا، بردبار ہے۔ (نجوم الفرقان)

''تسکین الجنان فی محاسن کنزالایمان'' کاایک ورق:

راقم نے تراجم کا جو تقابل جائزہ پیش کیا اسے دیکھئے

﴿بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا﴾

ان کے گناہ کی شامت سے	(محمود الحسن صاحب)
ان کے بعض کرتوتوں کے سبب	(عبدالماجد صاحب)
کچھ ان کے گناہ کی شامت سے	(شاہ عبدالقادر صاحب)
ان کے بعض اعمال کے باعث	(اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ)

جنگ احد میں نبی کریم ﷺ نے ایک درہ میں صحابہ کرام کی ایک جماعت کو کھڑا کیا کہ تم نے یہاں ہی کھڑے رہنا ہے، جب صحابہ کرام کو فتح حاصل ہوئی تو وہ جماعت بھی اس جگہ کو چھوڑ کر مال غنیمت جمع کرنے کیلئے دوسرے صحابہ کرام کے ساتھ شریک ہوگئے، یہ صحابہ کرام کی اجتہادی خطا تھی، ان کا خیال یہ تھا کہ شاید فتح تک ٹھہرنے کا ہمیں حکم دیا گیا، نبی کریم ﷺ کی اجازت کا انتظار نہ کرنے کی وجہ سے آزمائش میں آگئے، اسی درہ سے کفار نے حملہ کردیا، صحابہ کرام کو تکلیف پہنچی، اسی درہ کو چھوڑنے کا ذکر رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا﴾ ان کے بعض اعمال کی وجہ سے

شیطان نے انہیں پھسلا دیا، پھر بیشک اللہ تعالی نے انہیں معاف فرما دیا، اسی مقصد کو اعلی حضرت رحمہ اللہ نے صحابہ کرام کے ادب کا لحاظ کرتے ہوئے ''ان کے بعض اعمال کے باعث'' ترجمہ کیا۔

راقم نے لفظی ترجمہ کیا ''بوجہ بعض ان کے کسب کے'' ''ان کے بعض اعمال کی سامت سے'' اعلی حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ نہیں کیا جس میں گناہ کی نسبت صراحۃ صحابہ کرام کی طرف ہو، لطف کی بات یہ ہے کہ اعلی حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ پر اعتراض کرنا کہ ''اے محبوب'' کس عربی لفظ کا ترجمہ ہے، تو یہاں "گناہ" کس عربی لفظ کا ترجمہ ہے۔
(تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان ص ۹۳)

یہ بھی خیال رہے کہ عبدالماجد صاحب کا ترجمہ ''ان کے بعض کرتوتوں کے سبب'' اور ہی زیادہ سنگین ہے۔ مختصر مطلب تسکین الجنان کی عبارت سے واضح ہو رہا ہے، دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ﴾

''بیشک وہ جو پھر گئے تم میں سے بعض جس دن ملے دو لشکر''

"ھذا خطاب للمومنین خاصة یعنی الذین انھزموا یوم احد" یہ خطاب ہے مومنین کو خاص کر کے یعنی وہ حضرات جو احد کے دن پسپا ہو گئے تھے۔ ''منکم'' میں ''من'' تبعیضیہ ہے۔ جس کا معنی ہے بعض ''یعنی وہ جو تم میں سے پھر گئے بعض جس دن دو لشکر ملے ایک لشکر نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھا اور ایک لشکر ابو سفیان کے ساتھ تھا، نبی کریم ﷺ کا لشکر سات سو افراد پر مشتمل تھا۔ اور ابوسفیان کا لشکر تین ہزار افراد پر مشتمل تھا۔

"فذکر محمد بن اسحاق ان ثلث الناس کانوا مجروحین وثلثھم انھزموا وثلثھم ثبتوا"

محمد بن اسحاق نے بیان فرمایا ہے کہ مومنین کا تیسرا حصہ زخمی ہو گیا، یقیناً یہ لوگ وہی تھے جو ثابت قدم رہے اور تیسرا حصہ پسپا ہو گئے یعنی ادھر ادھر بکھر گئے، اور تیسرا حصہ ثابت قدم رہے، یہ وہ تھے جو زخمی نہیں تھے۔

قال القفال والذی تدل علیه الاخبار فی الجملة ان نفرا منھم تولوا وابعدوا فمنھم من دخل المدینة ومنھم من ذھب الی سائر الجوانب واما الاکثرون فانھم نزلوا عند الجبل واجتمعوا ھناک"

قفال کہتے ہیں کہ مختلف اخبار سے مسئلہ یوں واضح ہوا کہ جو لوگ پسپا ہونے والے یعنی ادھر ادھر بکھر جانے والے تھے ان میں سے بعض وہ تھے جو دور چلے گئے تھے، اور بعض وہ تھے جو مدینہ میں داخل ہو گئے تھے، یہ بھی خیال رہے کہ احد اس وقت مدینہ طیبہ سے صرف دو میل کے فاصلہ پر تھا، اب مکانات اور سڑکوں کی وجہ سے مسافت زیادہ

نظر آتی ہے۔مدینہ طیبہ میں سب سے پہلے جانے والے سعد بن عثمان تھے۔بعد میں کچھ اور حضرات بھی مدینہ طیبہ میں داخل ہوگئے۔اور بعض ان میں سے وہ تھے جو میدان کی اطراف میں ادھر ادھر بکھر گئے لیکن وہ زیادہ دور نہیں گئے۔اور ان میں اکثر حضرات وہ تھے جو میدان سے تو اگر چہ ہٹ گئے تھے لیکن وہاں ہی پہاڑ کے دامن میں جمع ہوگئے تھے۔جو لوگ میدان جنگ میں ثابت رہنے والے تھے،ان میں سے وہ لوگ جو نبی کریم ﷺ کی حفاظت کرنے والے اور آپ کے اردگرد جمع ہونے اور ثابت قدم رہنے والے چودہ تھے جن کے اسماء گرامی پہلے ذکر کیے جاچکے ہیں۔

"ومن المنهزمين عمر،الا انه لم يكن في اوائل المنهزمين ولم يبعد بل ثبت على الجبل الى ان صعد النبي ﷺ

"جو لوگ میدان سے ہٹ جانے والے تھے،ان میں حضرت عمر ﷺ بھی تھے،لیکن آپ جلدی میدان سے نہیں ہٹے تھے بلکہ کچھ دیر کے بعد میدان سے ہٹ کر پہاڑ پر چڑھ گئے تھے،یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ بھی پہاڑ پر چڑھ گئے۔ (ماخوذ از کبیر ج۹ص۵۹)

مقام توجہ: کل تعداد احد میں صحابہ کرام کی سات سو تھی۔کل شہید ستر تھے۔جن میں دس درہ میں قائم رہنے والے،ساتھ اور ثابت قدم رہنے والے بھی تھے۔باقی چھ سو تیس میں سے دو سو دس تقریبا ثابت قدم رہنے والے،اور دو سو دس ثابت قدم رہنے کی وجہ سے زخمی ہوگئے،کل ثابت رہنے والے چار سو نوے تھے اور ثابت قدم نہ رہنے والے،دائیں بائیں بکھر جانے والے دو سو دس تھے،ان میں سے بھی زیادہ پہاڑ کے پاس اپنا بچاؤ کر رہے تھے اور وہیں جمع تھے،اور ان میں ہی چالیس حضرات وہ تھے جو درہ چھوڑ کر مال غنیمت جمع کرنے میں شریک ہوگئے تھے۔ (راقم)

"ومن المهزومين كان عثمان انهزم مع رجلين من الانصار يقال لهما سعد وعقبة" جو لوگ ادھر ادھر بکھر جانے والے تھے ان میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی تھے جو انصار میں سے دو حضرات،سعد اور عقبہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ کچھ دور ہی چلے گئے تھے۔ (کبیر ج۹ص۵۰)

تنبیہ: حضرت عثمان ﷺ سے تعصب رکھنے والے شخص کو خاموش کرادینے والا جواب حضرت ابن عمر ﷺ کا پہلے بخاری کے حوالہ سے تعبیر کیا جاچکا ہے،شائد ان کا جواب حضرت عثمان ﷺ کے اپنے جواب سے ہی ماخوذ تھا،آیئے حضرت عثمان ﷺ کا حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو جواب دیکھیے۔

❁ ذكر ابو الليث سمرقندى بالاسناد عن جرير ان عثمان كان بينه وبين عبد الرحمن كلام فقال له عبدالرحمن بن عوف اتسبني وقد شهدت بدرا ولم تشهد وقد بايعت تحت الشجرة ولم تبايع وقد كنت تولى مع تولى يوم الجمع يعنى يوم احد،فرد عليه

عثمان فقال اما قولک انا شهدت بدرا ولم تشهد فانی لم اغب عن شیء شهده رسول اللهﷺ الاان بنت رسول اللهﷺ کانت مریضة وکنت معها امرضها فضرب لی رسول الله ﷺ سهمافی سهام المسلمین واما بیعة الشجرة فان رسول اللهﷺ بعثنی ربیئة علی المشرکین بمکة(الربیئة هو الناظر)فضرب رسول الله ﷺ یمینه علی شماله فقال هذه لعثمان فیمین رسول اللهﷺ یمینه علی شماله فقال هذه لعثمان فیمین رسول الله ﷺ وشماله خیرلی من یمینی وشمالی،واما یوم الجمع فقال الله تعالی"ولقد عفاالله عنهم"فکنت فیمن عفا الله عنهم فحج عثمان عبدالرحمن"

(قرطبی ج ۴ص ۲۴۴)

جریر روایت کرتے ہیں کہ حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے درمیان سخت کلامی ہوگئی تو ان کو عبدالرحمٰن بن عوف کہنے لگے تم میرے ساتھ سخت کلام کرتے ہو حالانکہ میں بدر میں موجود تھا تم نہیں تھے، پھر میں نے (کیکر کے) درخت کے نیچے بیعت کی تم نے نہیں کی، اور تم اس دن پھر گئے تھے جس دن دو لشکر جمع ہوئے، حضرت عثمان ﷛ نے ان کو جواب دیا، کہ جو تم نے میرے بدر میں حاضر نہ ہونے کی بات کی اس کے متعلق بات یہ ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ سے کسی غزوہ میں پیچھے نہیں رہا، مگر بدر میں مجھے رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی کی بیماری پر ان کی دیکھ بھال کیلئے مدینہ طیبہ میں چھوڑ دیا تھا، میں ان کی دیکھ بھال کرتا رہا، نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کے مال غنیمت کے حصہ میں میرا حصہ بھی رکھا، جہاں تک درخت کے نیچے بیعت کے متعلق تم نے جو بیان کیا ہے کہ میں اس میں حاضر نہیں ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے مکہ میں کفار کے ساتھ گفت شنید کیلئے بھیجا" ربیئة کا اصل معنی ہے" جاسوس دشمن کے حالات کو دیکھنے والا" (لیکن یہاں معنی گفت وشنید ہے) تو نبی کریم ﷺ نے اپنے ہی دائیں ہاتھ کو بائیں پر مارا پھر فرمایا یہ عثمان کا ہاتھ ہے، (یعنی اپنے ہی ہاتھ کو میرا ہاتھ قرار دیا) میرے اپنے دائیں اور بائیں ہاتھ سے میرے لئے نبی کریم ﷺ کا دائیاں اور بائیاں ہاتھ بہتر ہیں۔ جہاں تک دو لشکروں کے جمع ہونے کے دن تم نے ہمارے پسپا ہونے کا ذکر کیا ہے، وہ اللہ تعالی نے ہمیں معاف کردینے کا اعلان فرمادیا۔ ﴿وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ﴾ "اور تحقیق اللہ نے ان کو معاف کردیا ہے۔" وحضرت عثمان ﷛ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ﷛ پر غالب آگئے اور ان کو خاموش کرادیا۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ﴾ "بیشک اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔"

﴿إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ﴾للذنوب صغائرها وکبائرها(حلیم)لایعاجل بعقوبة المذنب" بیشک اللہ تعالی صغائر اور کبائر گناہوں کو بخشنے والا ہے۔ اسلئے وہ غفور ہے۔ اور کسی گنہگار کو جلدی عذاب نہیں دیتا بلکہ توبہ کا موقع

دیتا ہے، اسلئے وہ حلیم ہے۔ "وقد جاءت هذه الجملة كالتعليل للعفو عن هؤلاء المتولين" اور تحقیق یہ جملہ علت وسبب کے درجہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پھر جانے والوں کو معاف فرمادیا ہے کیونکہ وہ "غَفُوْرٌ" ہے، اور "حَلِيْمٌ" ہے۔ (روح المعانی ج۳ ص۹۹)

فائدہ جلیلہ: "لاتعيير بعد عفو الله تعالى عن الجميع، ونحن لاندعي العصمة في الصحابة ﷺ ولانشترطها في الخلافة"

اللہ تعالیٰ نے جب پھر جانے والے تمام صحابہ کرام کو معاف کردیا تو اب کسی صاحب کے فعل کو عار بنانا جائز نہیں۔ اور ہمارا یہ دعویٰ ہی نہیں کہ تمام صحابہ کرام معصوم تھے، اور نہ ہی ہمارے نزدیک کسی صحابی کے خلیفہ بننے کیلئے معصوم ہونا شرط ہے۔ (روح المعانی ج۳ ص۹۹)

حضرت عمر ﷺ کے پہاڑ میں چڑھ جانے میں تو کئی احتمال ہیں، ایک احتمال یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو پہاڑ پر چڑھ جانے کی ترغیب دلانی مقصود ہو کہ آپ بھی پہاڑ پر آجائیں، یہاں سے کفار پر حملہ بھی آسان ہے اور دفاع بھی آسان، اگر یہ احتمال ہو تو یہ ثابت قدمی کی اعلیٰ مثال ہے، راقم کے نزدیک یہی احتمال قوی ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ آپ بھی پسپا ہونے والوں میں تھے اس لئے پہاڑ پر چڑھ گئے تھے، یا بالفرض شیعہ کی بات کو تسلیم کیا جائے کہ آپ دور چلے گئے تھے، کسی صورت میں بھی آپ پر اعتراض کرنا اور عار دلانا جائز نہیں، اسلئے کہ رب تعالیٰ نے جب معاف کردیا تو دوسرے کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس میں اعتراض کرتا ہے، اور یہ وجہ آپ کے خلافت کے حقدار نہ ہونے پر کوئی دلیل نہیں۔ (راقم)

صحابہ کرام کا پھر جانا کون سا گناہ تھا؟

بعض حضرات نے تو یہ بیان کیا ہے کہ کبیرہ گناہ تھا، صحابہ کرام نے توبہ کرلی تھی اسلئے رب تعالیٰ نے انہیں معاف کردیا۔ لیکن راقم کو قرطبی رحمہ اللہ کی بحث پسند آئی کہ صحابہ کرام کا پھرنا گناہ نہیں تھا، لیکن نبی کریم ﷺ کے ثابت قدم رہنے کے باوجود آپ کو چھوڑنا بہت بڑی غلطی تھی، آیئے عجیب بحث آپ بھی دیکھیں، "وقيل لم يكن الانهزام معصية لانهم ارادوا التحصن بالمدينة" ایک قول یہ ہے کہ صحابہ کرام کا میدان کو چھوڑنا کوئی گناہ نہیں تھا کیونکہ انہوں نے ارادہ یہ کیا تھا کہ مدینہ طیبہ میں قلعہ بند ہو کر دشمن کے ارادوں کو خاک میں ملادیں گے، دشمن کو تہس نہس کر دیں گے، اصل وجہ ان کی احد کے مقام کو چھوڑنے کی وجہ یہ تھی کہ نبی کریم ﷺ کی شہادت کی خبر نے ان کے ہوش اڑادئے تھے، وہ یہ سمجھنے لگے کہ اب یہاں ٹھہرنے کا کیا مقصد، دشمن کے ارادوں کو ختم کرنا ضروری ہے کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ شہید ہو گئے تو یہ لوگ اسلام سے پھر جائیں گے۔ "ويجوز ان يقال لم يسمعوا

دعاء النبی ﷺ للھول الذی کانوا فیه" بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ تو صحابہ کرام کو بلا رہے تھے تو انہوں نے آپ کی شہادت کی خبر پر کیسے اعتبار کر لیا تھا؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ شدید ہولنا کی چھا گئی تھی، کیونکہ جب درہ والے حضرات نے درہ کو چھوڑا اور کافروں نے اچانک حملہ کیا تو اس وقت صحابہ کرام اس شدت میں نبی کریم ﷺ کی آواز نہ سن سکے، "ویجوز ان یقال زاد عدد العدو علی الضعف لانھم کانوا سبعمائة و العدد ثلاثة آلاف" اس عبارت کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھا جائے کہ ابتدائی دور میں صحابہ کرام پر ایک کو دس سے جنگ کرنا لازم تھا، بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس میں آسانی پیدا کرنے کیلئے ارشاد فرمایا۔

﴿اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ﴾
(الانفال آیۃ نمبر ۶۶)

"اب اللہ نے تم پر سے تخفیف فرمائی اور اسے معلوم ہے کہ تم کمزور ہو تو اگر تم میں سو صبر والے ہوں دو سو پر غالب آئیں گے" اس تخفیف کے بعد ایک صحابی کا دو کافروں کے مقابل ثابت قدم رہنا ضروری ہو گیا، اس سے زیادہ مقدار کے سامنے کھڑا ہونا لازم نہیں تھا، غزوہ احد اسی وقت درپیش آیا جب یہ آیۃ کریمہ نازل ہو چکی تھی، اس میں دشمن کی تعداد چار گنا سے بھی زائد تھی کیونکہ صحابہ کرام سات سو تھے اور کافر تین ہزار تھے، یہ تعداد دوگنا ہوتی تو پھر صحابہ کرام پر طعن ممکن تھا، جب رب تعالیٰ نے خود تخفیف فرمائی تو صحابہ کرام کا چار گنا سے زائد کے مقابل ثابت قدم نہ رہنا جائز تھا،

تنبیہ شدید:

لکن الانھزام عن النبی ﷺ خطأ لایجوز ولعلھم توھموا ان النبی ﷺ انحاز الی الجبل ایضا"
(قرطبی ج ۴ ص ۲۲۴)

نبی کریم ﷺ کے متعلق یہ کہنا کہ آپ بھی اپنی جگہ کو چھوڑ کر پسپا ہو گئے تھے یہ جائز نہیں۔ نبی کریم ﷺ کا پہاڑ پر چڑھنا بھی وہم ہی ہو سکتا ہے حقیقت نہیں، اگرچہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے پہاڑ پر چڑھنا ثابت کیا ہے اگر وہ ثابت ہو جائے تو اس کا وہی مطلب ہو سکتا ہے جو راقم نے بیان کیا ہے کہ زیادہ دفاع مقصود تھا، لیکن علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا قول زیادہ راجح نظر آتا ہے کیونکہ احادیث کی شروح سے یہی ثابت کہ آپ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے، (واللہ اعلم بالصواب)

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (آیۃ نمبر ۱۵۶)

(1) اے ایمان والو! ان کافروں کی طرح نہ ہونا جنہوں نے کہا نے اپنے بھائیوں کی نسبت جب وہ سفر یا جہاد کو گئے کہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے اس لئے کہ اللہ ان کے دلوں میں اس کا افسوس رکھے اور اللہ جلاتا اور مارتا ہے اور تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔ (کنزالایمان)

(2) اے ایمان والو نہ ہو جاؤ ان کی طرح جنہوں نے کفر کیا، اور انہوں نے کہا اپنے بھائیوں کے متعلق جب سفر کیا انہوں نے زمین میں، یا وہ ہوئے جہاد کرنے والے، اگر وہ ہوتے ہمارے پاس نہ مرتے اور نہ قتل کیے جاتے، تاکہ بنائے اللہ اسے حسرت ان کے دلوں میں، اور اللہ ہی زندہ کرتا ہے، اور مارتا ہے، اور اللہ جو تم عمل کرتے ہو دیکھ رہا ہے۔ (نجوم الفرقان)

شان نزول و مختصر مطلب:

منافقین ایمان والوں کو کافروں کے ساتھ جہاد کرنے پر عار دلاتے اور شہید ہونے والوں کے متعلق کہتے ﴿لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَهُمْ وَمَا قُتِلُوْا﴾ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کئے جاتے'' ان کے اس کہنے پر بعض نئے نئے ایمان قبول کرنے والوں کے دلوں میں سستی آجاتی اور ان کے دلوں میں ضعف آجاتا احد میں جب ستر صحابہ کرام شہید ہوگئے تو مؤمنوں کو منع کیا کہ کہیں تم بھی یہ نہ کہتے رہنا کہ وہ جہاد میں شریک نہ ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کئے جاتے، کافروں کے اس قول اور باطل گمان کو رب تعالی نے ان کے دلوں میں حسرت بنا دیا ہے، حالانکہ موت کا وقت مقرر ہے رب تعالی ہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، موت کے وقت آنے پر موت نے ضرور آنا ہے خواہ جنگ میں ہو یا گھر میں اور جب تک اس کی زندگی ہے اس نے ضرور زندہ رہنا ہے خواہ گھر میں ہو یا میدان جنگ میں۔ اور اللہ تعالی تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔
(ماخوذ از کبیر)

﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا﴾ اے ایمان والو! نہ ہوان کی طرح جنہوں نے کفر کیا۔

یہاں کافروں سے مراد کون لوگ ہیں؟ اس میں مفسرین کرام کے دو قول ہیں، زیادہ مفسرین کرام نے ﴿اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا﴾ سے مراد منافقین لیا ہے کہ یہ قول عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کا ہے۔ دوسرا قول علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے یہ ذکر کیا ہے:

"وقیل المراد بالذین کفروا سائر الکفار علی العموم ای لاتکونوا کالکفرة فی نفس الامر" (روح المعانی ج ۳ ص ۹۹)

کہ اس سے مراد تمام کافر ہیں علی العموم یعنی جو لوگ حقیقت میں کافر ہیں، ان کی طرح نہ ہو، اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے "اَلَّذِیۡنَ" موصول کو عہد خارجی کے درجہ میں رکھ کر خاص منافقین مراد لئے ہیں، اسی لئے آپ نے ترجمہ کیا "اے ایمان والوان کافروں کی طرح نہ ہونا"۔ (کنز الایمان)

لیکن راقم نے طلباء کرام کے فائدہ کیلئے دوسرے قول کے مطابق ترجمہ کیا ہے تا کہ طلباء کرام کو دوسری شق کا بھی پتہ چل جائے، راقم نے ترجمہ کیا اے ایمان والو! نہ ہوان کی طرح جنہوں نے کفر کیا۔ (نجوم الفرقان)

یہ ترجمہ تو لفظوں کے مطابق ہے، اگر مختصر کر کے بامحاورہ ترجمہ کریں تو راقم کا ترجمہ یوں ہوگا، "اے ایمان والو نہ ہو کافروں کی طرح"

﴿وَقَالُوۡا لِاِخۡوَانِھِمۡ اِذَا ضَرَبُوۡا فِی الۡاَرۡضِ اَوۡ کَانُوۡا غُزًّی لَّوۡ کَانُوۡا عِنۡدَنَا مَا مَاتُوۡا وَمَا قُتِلُوۡا﴾

"اور انہوں نے کہا اپنے بھائیوں کے متعلق، جب سفر کیا انہوں نے یا ہوئے جہاد کرنے والے، اگر وہ ہوتے ہمارے پاس تو وہ نہ مرتے اور نہ قتل کیے جاتے۔"

﴿وَقَالُوۡا لِاِخۡوَانِھِمۡ﴾ "فی النفاق والکفر وقیل فی النسب" ان کے بھائیوں سے مراد ان کے ہم عقیدہ لوگ ہیں جو منافقت اور کفر میں ان کے مشابہ تھے، یا ان کے نسبی بھائی تھے۔

تنبیہ: اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے، جنہوں کہا اپنے بھائیوں کی نسبت (کنز الایمان)

راقم نے بھی اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے اور انہوں نے کہا اپنے بھائیوں کے متعلق، اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ روح المعانی کی اس عبارت کے مطابق ہے "واللام تعليلة اى قالوا لأجلهم و جعلها ابن حاجب بمعنى "عن" "لاخوانهم" میں لام تعلیلیہ ہے، یعنی انہوں نے اپنے بھائیوں کے قتل (شہید) ہونے کی وجہ سے یہ کہا۔ اور علامہ ابن حاجب نے کہا ہے کہ لام بمعنی عن ہے۔ اس کے مطابق بھی یہی ترجمہ ہوگا" اور انہوں نے اپنے بھائیوں کے متعلق کہا" طلباء کرام خصوصی توجہ اس بات کی طرف رکھیں کہ یہ بحث لام کے متعلق جو ابھی تک بیان کی ہے اس کے مطابق یہ ضروری ہے کہ ان کے بھائی نسبی مراد ہیں، ہم عقیدہ نہیں۔ ان کے نسبی بھائی یعنی ان کے خاندان کے لوگ جو خلوص سے ایمان لے آئے تھے اور شہید ہو گئے تھے، ان کے متعلق انہوں نے یہ کہا کہ اگر وہ ہمارے ساتھ ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے۔ کیونکہ ان کے ہم عقیدہ منافقین شہید نہیں ہوئے۔

اور جب لا کو زائد مانا جائے جیسے "ردف لكم" میں لام زائد ہے اس کا مطلب ہے "ردفكم" اسی طرح جب یہاں معنی یوں کیا جائے ﴿وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ﴾ "اور کہا انہوں نے اپنے بھائیوں کو" اس صورت میں ان کے نسبی بھائی اور ہم عقیدہ بھائی دونوں ہی مراد ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے نسبی اور اپنے ہم عقیدہ بھائیوں کو یہ کہا وہ زمین میں سفر کرنے والے اور غزوہ میں جانے والے اگر ہمارے ساتھ ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے۔

دینی طلباء کرام کی خصوصی توجہ کیلئے:

- "فان واذاللشرط فى الاستقبال لكن اصل ان علم الجزم بو قوع الشرط واصل اذا الجزم"
  ان اور اذا دونوں ہی مستقبل میں شرط کیلئے آتے ہیں۔ لیکن "ان" اصل میں یہ ہے کہ اس میں جزم نہیں پایا جاتا بلکہ شک پایا جاتا ہے۔ یہ اس کا حقیقی معنیٰ ہے، لیکن مجازی معنی کے لحاظ پر بھی جزم کیلئے بھی آتا ہے۔ اس میں کافی تفصیل ہے۔
- "ولان اصل اذا الجزم بالوقوع غلب لفظ الماضى لدلالته على الوقوع قطعانظرا الى نفس اللفظ وان نقل ههنا الى معنى الاستقبال مع اذا"
  اور "اذا" میں اصل میں جزم پایا جاتا ہے کہ اس نے واقع ہونا ہی ہے۔ پھر اذا کے ساتھ غالبا لفظ ماضی ذکر کیا جاتا ہے تاکہ یقینی وقوع پر دلالت کرے۔
- "واذا جئ بها اى بان فى مقام التاكيد بعد واو الحال لمجرد الوصل والربط دون الشرط نحو زيد وان كثر ماله بخيل وفى غير ذلك اى غير المستقبل قليلا مع كونها للشرط"

اور اذا مقام تاکید میں واؤ حالیہ کے بعد صرف وصل اور ربط کیلئے آتا ہے اس میں شرط کا معنی نہیں پایا جاتا، جیسے کہا جاتا ہے "زید وان کثر ماله بخیل" زید اگر چہ کثیر مال رکھتا ہے لیکن بخیل ہے۔ اور اذا کا استعمال مستقبل کے بغیر بھی قلیل طور پر آتا رہتا ہے۔ (ماخوذ از تلخیص المفتاح و روح المعانی و تجرید)

اب اس تمہید کے بعد زیر بحث آیہ کریمہ میں دیکھیں کہ " اِذَا ضَــرَبُــوْا " میں اذا استعمال ہے، یہاں کون سا معنی لیا جائے، اس مقام پر تفسیر مظہری میں زیادہ زور اس پر دیا گیا کہ یہ حال کے معنی میں استعمال ہے، مطلب یہ ہوا کہ اے ایمان والو نہ ہو کافروں کی طرح جب وہ اپنے بھائیوں کو کہتے جب وہ سفر کرتے یا غزوہ کیلئے جاتے کہ وہ جو پہلے سفر میں اور غزوہ میں گئے وہ مر گئے یا مارے گئے اگر وہ نہ جاتے اور ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے، اس مقام پر روح المعانی میں اذا کے متعلق بہت طویل بحث کی گئی ہے، لیکن تفسیر ابی السعود نے مختصر اور خوبصورت انداز پر مسئلہ کا حل پیش کیا،

❁ "وایثار اذا المفیدة لمعنی الاستقبال علی اذا المفیدة لمعنی المضی لحکایة الحال الماضیة قال الزجاج اذاهھنا تنوب عما مضی من الزمان ومایستقبل یعنی انها لمجرد الوقت اویقصدبها الاستمرار"

یہاں "اذا" کا استعمال کیا گیا ہے حالانکہ "اذ" ماضی کیلئے آتا ہے، "اذ" پر "اذا" کو ترجیح اسلئے دی گئی ہے کہ یہ حال ماضیہ کی حکایت کیلئے آیا ہوا ہے زجاج نے بیان کیا ہے کہ یہ ماضی کے معنی کیلئے ہو یا استقبال کیلئے ہو یہاں مطلقا وقت کیلئے استعمال ہے۔ یا استمرار کا ارادہ کیا گیا ہے، اس تفصیل کے بعد مندرجہ ذیل معانی کئے جا سکتے ہیں۔ "جب ماضی میں وہ کہتے رہے" جب ماضی میں انہوں نے کہا۔ ہمیشہ ان کا بھائیوں کو یہی کہنا رہا۔

﴿ اِذَا ضَرَبُوْا فِی الْاَرْضِ ﴾ "جب انہوں نے سفر کیا زمین میں۔"

(ای سافروا فیها للتجارة او طلب معاش فماتوا) یعنی تجارت کیلئے یا اور مقاصد کیلئے وہ گھر سے دوسرے علاقہ میں سفر کر کے گئے، اور فوت ہو گئے، "اصل الضرب ایقاع شیء علی شیء" ضرب کا حقیقی معنی ایک چیز کا دوسری چیز پر واقع ہونا۔ زمین پر چلنے پر بھی "ضـــــرب" کا اطلاق اسی لئے ہے کہ انسان اپنا پاؤں زمین پر مارتا ہے، "ثم صار حقیقة فیه" پھر اس معنی کو بھی بطور حقیقت سمجھ لیا گیا۔ زمین کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اکثر سفر ان کے خشکی کے ہوتے تھے، "وقیل المراد من الارض مایشمل البر والبحر" بعض حضرات نے بیان کیا کہ زمین سے مراد عام ہے جو خشکی اور تری دونوں کو شامل ہے۔ (راقم کو یہی معنی بہتر نظر آتا ہے)

(روح المعانی ج ۳ ص ۹۹)

﴿ اَوْ كَانُوْا غُزًّى﴾ "یا ہوئے جہاد کرنے والے۔"

"غزى جمع غاز كالقول والركع والسجد جمع قائل وراكع وساجد" غزی جمع ہے غازی کی جسطرح قول جمع ہے قائل کی، اور رکع جمع ہے راکع کی اور سجد جمع ہے ساجد کی۔ غازی کی جمع غزاۃ بھی آتی ہے، جسطرح قاضی کی قضاۃ اور رامی کی رماۃ جمع آتی ہے۔ "الغزو کا کلام عرب میں اطلاق ''دشمن کے قصد کرنے پر ہوتا ہے۔ مغزی کا معنی مقصد۔ (کبیر ج۹ ص۵۵)

"غزى "بتشديد الزاء وقرأ الحسن والزهرى بتخفيف الزاى" (البحر المحیط ج۴ ص۱۳۶)

"غزی" میں زاء پر شد ہے، البتہ حسن بصری رحمہ اللہ علیہ اور زہری رحمہ اللہ نے زاء کو مخفف کر کے پڑھا ہے۔

﴿ لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا﴾

''اگر وہ ہوتے ہمارے پاس تو نہ مرتے اور نہ قتل کیے جاتے۔"

کافروں کا یہ کلام کن لوگوں کے متعلق تھا؟ جمہور حضرات نے تو یہ کہا کہ انہوں نے یہ کلام احد کے شہداء کے متعلق کیا، لیکن بکر بن سہل دمیاطی نے بیان کیا ہے کہ ان کا یہ قول'' سريه بير معونة" میں ستر قراء شہید ہونے والوں کے متعلق تھا۔ "وما قتلوا" میں تاء مخفف ہے۔ البتہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے تشدید سے پڑھا ہے البتہ کثرت والا معنی کثیر مقامات کے لحاظ پر ہوگا، کثیر مقامات میں کثیر لوگ مرنے والے اگر ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے، ایک محل میں مرنے والوں کے متعلق ان کا کلام نہیں تھا "لانه لايمكن التكثير فيه" کیونکہ ایک محل میں کثرت کا اس وقت پایا جانا ممکن نہیں۔ (البحر المحیط ج۴ ص۱۳۶)

تفسیر کبیر کی عظمت دینی طلباء کیلئے:

اذا کے متعلق مختصر بحث جو پہلے ذکر کی ہے اس کے متعلق ایک اور رخ سے انہوں نے ایک اعتراض اور اس کے تین جواب دیے ہیں، جس سے تفسیر کبیر کی عظمت سمجھ آئیگی، باقی آپ کے خوشہ چین ہیں۔

اعتراض: "وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ" ماضی پر دلالت کر رہا ہے "اِذَا ضَرَبُوْا" مستقبل پر دلالت کر رہا ہے (کیونکہ "اذا" استقبال کیلئے آتا ہے) "فكيف الجمع بينهما" ان دونوں کو ایک جگہ جمع کرنا کیسے صحیح ہے؟ اگر "اِذَا" کی جگہ "اِذْ" آتا تو کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ "اِذْ" ماضی کیلئے آتا رہتا ہے۔

پہلا جواب: "قَالُوْا" مجازی طور پر مستقبل کیلئے استعمال ہے، گویا کہ عبارت کا مطلب یوں ہو گیا

"لاتکونوا کالذین کفروا ویقولون لاخوانهم کذا و کذا" نہ ہو جاؤ ان کافروں کی طرح جو اپنے بھائیوں کو اس طرح کہیں گے۔ مستقبل کو ماضی سے تعبیر کرنے کے دو فائدے ہیں ایک یہ کہ جب کسی چیز کا مستقبل میں پایا جانا لازمی ہو اس وقت اسے ماضی سے تعبیر کر دیا جاتا ہے جیسا کہ "اتی امر اللہ" فصعق من فی السماوات" ان دونوں جگہ ماضی کے صیغے استقبال کیلئے استعمال ہیں۔ اگر مستقبل کا صیغہ استعمال کیا جاتا تو مبالغہ نہیں پایا جا سکتا تھا۔ مبالغہ ماضی کے صیغہ سے ہی حاصل ہو رہا ہے۔

❁ "دل ذلک علی ان جدهم واجتهادهم فی تقریر الشبهة قدبلغ الغایة وصار بسبب ذلک الجد هذاالمستقبل کالکائن الواقع"

اس کلام سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ ان کی کوشش اور اجتہاد شبہ کو ثابت کرنے میں اس انتہاء درجہ کو پہنچا ہوا تھا کہ ان کی اس کوشش سے یوں سمجھ آتا کہ مستقبل میر ان کا کہنا گویا کہ ابھی واقع ہو چکا ہے۔ مستقبل کو ماضی سے تعبیر کرنے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ

❁ "انہ لیس المقصود الاخیار عن صدور هذاالکلام بل المقصود الاخبارعن جدهم واجتهادهم فی تقریز هذه الشبهة'

مقصد بیان کرنے کا صرف یہ نہیں کہ یہ بتایا جائے وہ اسطرح کلام کرتے تھے، بلکہ بتانا یہ مقصود ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں شبہات ڈالنے کی کتنی بڑی کوشش کرتے تھے۔ اگرچہ اس جواب کے متعلق علامہ رازی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں "فهذاهو الجواب المعتمد عندی (واللہ اعلم) یہ جواب میرے نزدیک معتمد ہے، (واللہ اعلم بالصواب)، لیکن راقم کے عنوان کا تعلق تیسرے جواب سے ہے جو قریب ہی ان شاء اللہ آ رہا ہے۔

دوسرا جواب: "ان الکلام خرج علی سبیل حکایة الحال الماضیة" کہ یہ کلام حال ماضیہ کی حکایت ہے۔ "فالکافرون یقولون لو کانوا عندما ماتوا وماقتلوا فمن اخبر عنهم بعد ذلک لابد وان یقول قالوا" یعنی کافر لوگ ماضی میں یہ کہتے رہے اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کئے جاتے، اس کے بعد جب ان کی خبر دی گئی تو ماضی کا صیغہ ذکر کیا گیا۔

تیسرا جواب: قال قطرب کلمة "اِذْ" و "اِذَا" یجوز اقامة کل واحدة منهما مقام الأخری قطرب" بیان کرتے ہیں، "اِذْ" اور "اِذَا" ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ لھذا آیۃ کریمہ میں "اذا" کا استعمال مجازی طور پر "اذ" کی جگہ ہوا ہے، لھذا دونوں جملے "وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِم" اور "اِذَا ضَرَبُوْا" ماضی پر ہی دلالت کر رہے ہیں۔ اس

جواب کے متعلق علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے "واقول هذا الذی قاله قطرب کلام حسن" اور میں کہتا ہوں کہ جو قطرب نے بیان کیا ہے یہ جواب بہت حسین ہے۔

اس پر مزید آپ نے تبصرہ یہ فرمایا ہے کہ جب عربی لغت کو ایک مجہول شعر اور مجہول شاعر سے منقول ہونے کے باوجود ثابت کرتے ہیں "فلان یجوز اثباتها بالقرآن العظیم کان ذلک اولی" تو زیادہ ضروری یہ ہے کہ عربی لغت کو ہم قرآن پاک کے ذریعے ثابت کریں، زیادہ سے زیادہ یہاں کہا جا سکتا ہے کہ "اذا حقیقی معنی کے لحاظ سے استقبال کیلئے آتا ہے، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ مجازی معنی کے لحاظ سے ماضی کیلئے نہیں آتا کیونکہ "اِذْ" اور "اِذَا" دونوں میں بہت شدید مشابہت پائی جاتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں میں کثیر نحویوں کو دیکھتا ہوں وہ جب قرآن پاک کے الفاظ میں حیران ہوتے ہیں تو کسی نہ کسی شعر کو دلیل بناتے ہیں، جب ان کو کوئی شعر بطور دلیل مل جائے "فرحوا به" اس پر وہ خوش ہوتے ہیں۔

❁ "وانا شدید التعجب منهم فانهم اذا جعلوا ورود ذلک البیت المجهول علی وفقه دلیلا علی صحته فلان یجعلوا ورود القرآن به دلیلا علی صحته کان اَولی"

مجھے اس پر شدید تعجب ہوتا ہے کہ جب وہ ایک مجہول شعر سے قرآن پاک کے الفاظ صحت پر دلیل مانتے ہیں کتنا ہی اچھا ہوتا کہ وہ خود قرآن پاک کو ہی عربی لغت کی صحت وفصاحت وبلاغت کی دلیل بنائیں۔ (کبیر ج۹ ص۵۵)

راقم کے نزدیک تو عربی کی فصاحت وبلاغت کا اعلیٰ معیار ہی قرآن پاک کے نزول پر ہوا۔ ورنہ فصاحت وبلاغت کے دعویدار ایمان نہ لانے والے قرآن پاک جیسی کوئی صورت بنا کر دکھاتے، لیکن انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ حقیقی فصاحت وبلاغت تو اب سامنے آئی ہے ہم تو اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہیں۔

❁ "قال الواحدی فی الآیة محذوف یدل علیه الکلام والتقدیر اذا ضربوا فی الارض فماتوا او کانوا غزاة فقتلوا لو کانوا عندنا ما ماتوا وما قتلوا فقوله "وما ماتوا وما قتلوا" یدل علی موتهم وقتلهم"

واحدی فرماتے ہیں آیۂ کریمہ کا مفہوم یہ سمجھ آرہا ہے کہ جب انہوں نے زمین میں سفر کیا اور وہ مر گئے یا غزوہ میں گئے تو قتل کر دیئے گئے تو انہوں نے کہا "اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کئے جاتے"، "وما ماتوا اور وما قتلوا" کے الفاظ مبارکہ اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ ان لوگوں کے متعلق کلام ہے جو مر گئے تھے اور قتل کر دیئے گئے تھے۔ (کبیر ج۹ ص۵۵)

﴿ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ ﴾

''تا کہ بنائے اللہ اسے حسرت ان کے دلوں میں''

اس کی تفسیر میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ تقدیر عبارت کی یہ ہے ''انهم قالوا ذلک الکلام لیجعل الله ذلک الکلام حسرة فی قلوبهم'' بیشک انہوں نے یہ کلام کیا تا کہ اللہ تعالیٰ یہ کلام ان کے دلوں میں حسرت بنا دے، یہ اسی طرح ہے جس طرح کہا جاتا ہے ''ربیته لیؤذینی'' ''ونصرته لیقهرنی'' میں نے اس کی تربیت کی تا کہ وہ مجھے ایذاء پہنچائے، اور میں نے اس کی امداد کی تا کہ وہ مجھ پر قہر کرے۔ اسی طرح رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا﴾ تو اسے اٹھالیا فرعون کے گھر والوں نے کہ وہ ان کا دشمن اور ان پر غم ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا چیز حسرت بنی اور کن لوگوں کیلئے حسرت بنی؟ اس میں چند وجوہ بیان کی گئی ہیں۔

(۱) ایک ان میں سے یہ ہے کہ مرنے والے اور قتل ہونے والے حضرات کے اقارب نے جب سنا تو ان کے دلوں میں حسرت بڑھ گئی

''لان احدهم یعتقد انه لو بالغ فی منعه عن ذلک السفر وعن ذلک الغزو لبقی''

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو اس کا اعتقاد ہو گیا کہ اگر وہ ان لوگوں کو اس سفر یا اس غزوہ سے زبردستی روکتے تو وہ رک جاتے اور بچ جاتے، وہ شخص مر گیا یا قتل ہو گیا تو ہماری کمزوری کی وجہ سے کہ ہم اسے روک نہیں سکے۔ ان کے اس کلام کو سننے والے کا بھی عقیدہ یہ ہو جاتا کہ اس شخص کی موت یا قتل ہونے کا سبب ان لوگوں کا اسے نہ روکنا ہے، ''ومتی اعتقد فی نفسه ذلک فلاشک انه تزداد حسرته وتلهفه'' جب عقیدہ ہی ان لوگوں کا یہ ہو گیا تو یقیناً ان کی حسرت اور اس پر افسوس بڑھ گیا۔

''اما المسلم المعتقد فی ان الحیاة والموت لایکون الابتقدیر الله وقضائه، لم یحصل البتة فی قلبه شیٔ من هذاالنوع من الحسرة''

لیکن مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ بیشک حیات زندگی اور موت صرف اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اس کے فیصلہ پر موقوف ہے، اسی وجہ سے مومن کے دل میں اس قسم کی کوئی حسرت نہیں پائی جاتی۔

(۲) دوسری وجہ یہ تھی کہ

''انهم متی القوا هذه الشبهة علی اقویاء المسلمین لم یلتفتوا الیهم فیضیع سعیهم ویبطل کیدهم فتحصل الحسرة فی قلوهم''

کہ جب منافقین نے قوی مسلمانوں پر اس قسم کے شبہات ڈالے تو انہوں نے ان کی باتوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی تو منافقین کی ساری کوشش ضائع ہوگئی، ان کا مکروفریب برباد ہوگیا، ان کے دلوں میں حسرت پیدا ہوگئی۔

(۳) "ان جدھم واجتھادھم فی تکثیر الشبھات والقاء الضلالات یعمی قلوبھم فیقعون عندذلک فی الحیرۃ والخیبۃ وضیق الصدر وھو المراد بالحسرۃ کقولہ" ومن یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقا حرجا"

منافقین کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ زیادہ سے شبہات مسلمانوں کے دلوں میں ڈالے جائیں اور ان کو گمراہ کرنے والی باتوں سے پھیرا جائے یعنی ان کے دل اندھے ہوجائیں، اسی سوچ میں وہ ہروقت حیران رہتے اور ان کا دل تنگ رہتا اور خاص کر کے مسلمانوں کے ان کی باتوں کو نہ ماننے سے ان کو رسوائی حاصل ہوتی، اسی چیز کو رب تعالی نے "حسرت" سے تعبیر فرمایا، دوسرے مقام پر رب تعالی کا ارشاد اس کی تائید کررہا ہے۔ ﴿وَمَنۡ يُّرِدۡ اَنۡ يُّضِلَّهٗ يَجۡعَلۡ صَدۡرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا﴾ جس شخص کو وہ گمراہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اس کے سینہ کو تنگ کردیتا ہے۔

(۴) چوتھی وجہ اس میں یہ ہے کہ منافقین نے جب نئے نئے اسلام قبول کرنے والوں کے دلوں میں شبہات ڈالے تو وہ ان کی باتوں میں آگئے اور سمجھنے لگے کہ یہ ٹھیک کہتے ہیں تو یہ بڑے خوش ہوئے کہ ہمارا داؤ چل گیا، رب تعالی نے فرمایا ﴿لِيَجۡعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسۡرَةً فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ﴾ اس کا مطلب یہ ہوگیا "سیصیر ذلک حسرۃ فی قلوبھم اذاعلموا انھم کانوا علی الباطل فی تقریر ھذہ الشبھۃ" کہ جب ضعیف اعتقاد والے مؤمنین کے دلوں میں بھی ایمان راسخ (پختہ) ہوجائے گا تو وہ بھی سمجھ جائیں گے کہ یہ جھوٹے ہیں، ان کے شبہات باطل ہیں، تو ان کو بڑی حسرت ہوگی کہ ہائے جو کوشش اثر انداز ہوتی نظر آرہی تھی وہ بھی ضائع ہوگئی۔

(۵) پانچویں وجہ یہ ہے منافقین نے جب شبہات ڈالے کہ یہ لوگ جہاد چھوڑ دیں، لیکن مسلمانوں نے ان کے روکنے کے باوجود جہاد جاری رکھا، غزوات میں بلاخوف شریک ہوتے رہے،

"ووصلوا بسببہ الی الغنائم العظیمۃ والاستیلاء علی الاعداء والفوز بالأمانی بقی ذلک المتخلف عندذلک فی الخیبۃ والحسرۃ"

جب مسلمان کامیاب ہوجاتے، دشمن پر غلبہ حاصل کرلیتے اور مال غنیمت حاصل کرلیتے تو منافقین پیچھے رہ جانے کی وجہ سے محروم ہوجاتے تو ان کو اس پر حسرت ہوتی۔

(۶) "ان ھذہ الحسرۃ انما تحصل یوم القیامۃ فی قلوب المنافقین اذرأوا تخصیص اللہ المجاھدین بمزید الکرامات واعلاء الدرجات وتخصیص ھؤلاء المنافقین بمزید

الخزی و العقاب"
منافقین کو قیامت کے دن حسرت حاصل ہوگی جب وہ دیکھیں گے کہ اللہ تعالی نے جہاد کرنے والوں کو بہت بڑی کرامات اور بلندی درجات سے مختص کر دیا ہے، اور ہمیں رسوائی اور عذاب حاصل ہو رہا ہے تو ان کو حسرت ہوگی۔ وہ حسرت ان کی روز بروز بڑھتی چلی جائے گی۔

آیۃ کریمہ کی تفسیر میں دوسرا قول یہ ہے:

کہ اللہ تعالی کے ارشاد گرامی ﴿لِيَجْعَلَ اللّٰهُ﴾ میں لام کا متعلق اس نہی سے ہے جو سابقہ جملہ میں ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا

"لاتکونوامثلهم حتی یجعل الله انتفاء کونکم مثلهم حسرة فی قلوبهم لان مخالفتهم فیما یقولون ویعتقدون ومضادتهم مما یغیظهم"
اے ایمان والو تم ان کی مثل نہ ہو جاؤ تا کہ تمہارے ان کی طرح نہ ہونے سے ان کے دلوں میں رب تعالی حسرت بنا دے، اس لئے کہ جب ان کے قول اور اعتقاد کی مخالفت کرو گے تو تمہاری مخالفت کی وجہ سے ان کو غصہ آئے گا وہی ان کو حسرت دلائے گا۔ (ماخوذ از تفسیر کبیر بتقدیم وتاخیر ج۹ ص ۵۵،۵۶)

﴿وَاللّٰهُ يُحْيِیْ وَيُمِيْتُ﴾ "اور اللہ زندہ کرتا ہے، اور مارتا ہے۔"

اس کی تفسیر میں دو وجہ بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ان الفاظ مبارکہ سے منافقین کے شبہ کا جواب دیا گیا ہے" اس جواب کی تقریر یہ ہے" کہ زندہ کرنے اور مارنے والا صرف اللہ تعالی ہے، کسی اور چیز کو حیات اور موت میں کوئی تاثیر نہیں

"وان علم الله لایتغیروان حکمه لاینقلب، وان قضاء ہ لایتبدل، فکیف ینفع الجلوس فی البیت من الموت"
بیشک اللہ تعالی کا علم بدلتا نہیں، اور بیشک اس کا حکم نہیں بدلتا، اور بیشک اس کی تقدیر نہیں بدلتی، لھذا گھر میں بیٹھنا کسی کو موت سے بچانے کا نفع نہیں دے سکتا۔

اعتراض: اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالی کی تقدیر نہیں بدلتی لھذا اپنے آپ کو موت اور قتل سے بچانے کی کوشش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ کوئی اپنے آپ کو آخرت کے عذاب سے بچانے کی کوشش نہ کرے اور نہ ہی اچھے عمل کرے اور نہ ہی برے اعمال سے رکے، اسطرح تو انسان کا مکلف ہونا ہی ختم ہو جائے گا۔

جواب: **"ان حسن التکلیف عندنا غیر معلل بعلة ورعایة مصلحة بل عندنا انه یفعل مایشاء ویحکم مایرید"**

اللہ تعالیٰ بندوں پر جو احکام نافذ فرماتا ہے، یا جن کاموں سے روکتا ہے، ان کا نام ہی تکلیف ہے، ان سے ہی انسان کو مکلف بنایا جاتا ہے، لیکن تکلیف کی دارومدار کسی علت اور کسی مصلحت کی رعایت پر موقوف نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے ﴿اِنَّ اللّٰـهَ يَفْعَلُ مَايَشَاءُ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ جو چاہے وہ کرتا ہے ﴿اِنَّ اللّٰـهَ يَحْكُمُ مَايُرِيْدُ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے جو ارادہ رکھتا ہے، ﴿لَايُسْـئَلُ عَمَّايَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ﴾ اس سے نہیں پوچھا جائے گا وہ کیا کرتا رہا، ہاں البتہ بندوں سے پوچھا جائے گا وہ کیا کرتے رہے۔ ہاں البتہ اتنی بات یاد رکھی جائے، اللہ تعالیٰ حکیم ہے۔ "فان الحكيم لايامر بالقبائح ولاينهى عن المحاسن" بیشک حکیم برے کاموں کا حکم نہیں دیتا اور اچھے کاموں سے روکتا نہیں۔

دوسری وجۂ تفسیر:

یہ ہے کہ ﴿وَاللّٰهُ يُحْيِي وَيُمِيْتُ﴾ ان کے شبہ کے ازالہ کیلئے نہ ہو کیونکہ شبہ کا ازالہ تو پہلے ہی ﴿لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ سے کیا جا چکا ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب منافقوں کی طرح کلام کرنے سے منع کیا تو ساتھ ہی ارشاد فرمایا ﴿وَاللّٰهُ يُحْيِي وَيُمِيْتُ﴾ "بريد يحيى قلوب اوليائه واهل طاعته بالنور والفرقان ويميت قلوب اعدائه من المنافقين" یعنی ان الفاظ مبارکہ سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء اور اس کی طاعت کرنے والوں کے دلوں کو نور اور فرقان سے زندہ رکھتا ہے، اور اپنے دشمنوں یعنی منافقین کے دلوں کو مردہ کر دیتا ہے۔ (تفسیر کبیر بالوضاحۃ ج۹ ص۵۶،۵۷)

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ "اللہ جو تم عمل کرتے ہو دیکھ رہا ہے۔"

"المقصود منه الترغيب والترهيب" مقصد اس سے مؤمنین کو نیک اعمال کی، جہاد کی رغبت دلانا ہے کہ موت سے نہ ڈرو موت وحیات تو رب تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے، اور ساتھ ہی منافقوں کو ڈرایا گیا کہ تم اپنی جتنی حفاظتی تدابیر کر سکتے ہو کر لو، اللہ کی گرفت سے نہیں بچ سکو گے وہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

ابن کثیر اور حمزہ کی قراءت میں ﴿يَعْمَلُوْنَ﴾ پڑھا گیا ﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ کی مناسبت سے، اور باقی حضرات نے تاء سے پڑھا ہے ﴿وَلَاتَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ کی مناسبت سے۔ (ماخوذ از کبیر ج۹ ص۵۷)

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْمُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَO
(آیۃ نمبر ۱۵۷)

(1) اور بیشک اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی بخشش اور رحمت ان کے سارے دھن و دولت سے بہتر ہے (کنزالایمان)

(2) اور بیشک اگر تمہیں قتل کر دیا جائے اللہ کی راہ میں یا تم مر جاؤ، تو البتہ تھوڑی بخشش اللہ کی طرف سے اور تھوڑی رحمت بہت بہتر ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

اس آیۃ کریمہ میں منافقین کے شبہ کا دوسرا جواب دیا جا رہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ موت نے ضرور واقع ہونا ہے، اگر انسان نے قتل ہونا ہے یا مرنا ہے تو ضرور اس نے قتل ہونا ہے یا اس پر موت واقع ہونی ہے۔ اس سے اسے چھٹکارا حاصل نہیں۔ جب موت یا قتل اللہ تعالیٰ کی راہ میں واقع ہوں اور اس کی رضاء مندی حاصل کرنی مقصود ہو تو وہی بہتر ہے اس سے کہ دنیا کی طلب میں انسان اپنا سارا وقت لگا دے، جس کا موت کے بعد اسے کوئی فائدہ نہ ہو۔"وھذا جواب فی غایۃ الحسن و القوہ" یہ جواب بہت ہی حسین اور قوی ہے۔

مقصد عظیم:

وذلک لان الانسان اذا توجہ الی الجھاد اعرض قلبہ عن الدنیا و اقبل علی الآخرۃ ،فاذامات،فکانہ تخلص عن العدو دوصل الی المحبوب ،واذاجلس فی بیتہ خائفامن الموت حریصا علی جمع الدنیا،فاذامات فکانہ حجب عن المعشوق و القی فی دارالغربۃ،ولاشک فی کمال سعادۃ الأول و کمال شقاوۃ الثانی (کبیر ج ۹ ص ۵۷)

انسان کیلئے یہ ضروری ہے کہ جب جہاد کی طرف متوجہ ہو تو وہ دل دنیا سے ہٹا لے، اور آخرت کی طرف متوجہ ہو جائے، اس حال میں جب اس پر موت آجائے تو اس نے اپنے آپ کو دشمن سے چھڑا لیا ہے، اور وہ محبوب تک پہنچ گیا، یعنی رب تعالیٰ کا مقرب ہو گیا۔ اور جب موت سے ڈر کر گھر میں بیٹھ گیا اور دنیا کا مال جمع کرنے میں حریص ہو گیا تو اس کی موت جب اس حالت میں آئے تو اس نے اپنے آپ کو اپنے محبوب یعنی اللہ تعالیٰ سے دور کر لیا اور اپنے آپ کو اجنبی کر لیا۔ یقیناً پہلا مقام انتہائی سعادت کا مقام ہے اور دوسرا مقام انتہائی بدبختی ہے۔ "متم" میم کے پیش سے استعمال ہوا ہے جس طرح قال، یقول کا استعمال ہے "قلتم" کاف کے پیش سے، آتا ہے جمہور قراء نے اس مقام پر میم کے پیش سے ہی پڑھا ہے۔

اور دوسرا استعمال اس کا "خاف یخاف" اور "هاب یهاب" کی طرح ہے، "خفتم او هبتم" میں خاء اور هاء کے نیچے زیر ہے۔ اسی طرح مبرد کی قراءت میں "متم" میں بھی میم کے نیچے زیر ہے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ یہاں تو اختلاف ہے، پیش والی قراءت کو زیادہ پسند کیا گیا ہے کہ یہ "مات یموت" سے لیا ہوا ہے، لیکن "مات یمات" سے "متنا" میم کے کسرہ سے قرآن پاک میں کئی جگہ استعمال ہے۔ (ماخوذ از کبیر بالوضاحت ج۹ص ۵۷)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ﴾ میں لام موطأ للقسم ہے۔ تقدیر عبارت کی یہ ہے "والله لئن قتلتم "لمغفرة من الله ورحمة" میں لام ابتدائیہ ہے جو دلالت کر رہا ہے کہ یہ جواب قسم ہے، اور اس میں تاکید والا معنی بھی پایا گیا ہے۔ "مغفرة" مبتداء ہے اور "رحمة" کا اس پر عطف ہے۔ اور خبر اس کی "خیر" ہے۔ "من الله" صفت ہے "مغفرة" کی اور عربی قاعدہ کے مطابق جب معطوف علیہ کی صفت ساتھ ذکر کر دی گئی تو معطوف کی صفت بھی خود بخود سیاق وسباق سے سمجھ آ گئی یعنی معنوی لحاظ پر عبارت یوں ہوگئی "لمغفرة من الله ورحمة من الله" پھر یہ بھی خیال رہے کہ دونوں الفاظ مبارکہ پر تنوین تقلیل کیلئے ہے۔ اب اس ترکیب مذکور کے لحاظ پر مکمل معنی یہ ہوگیا۔ اور قسم ہے اللہ کی اگر تم قتل کردئے جاؤ اللہ کی راہ میں یا مر جاؤ تو یقیناً اللہ کی تھوڑی بخشش اور اللہ کی تھوڑی رحمت بہت بہتر ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر ج۹ص ۵۸۔ وتفسیر ابی السعود ج۲ص ۱۰۴)

﴿خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ﴾ حفص نے عاصم (رحمهما الله) کی روایت کے مطابق یاء سے غیب کے صیغہ سے پڑھا ہے، اس قراءت کے مطابق معنی یہ ہے

"ان مغفرة الله خير ممايجمعه هؤلاء المنافقون من الحطام الفانی"

بیشک اللہ کی بخشش اور رحمت بہتر ہے اس سے جو یہ منافقین دنیا کا فانی مال جمع کر رہے ہیں۔

لیکن بعض قراءتوں میں تاء سے خطاب کا صیغہ ﴿تَجْمَعُوْنَ﴾ ہے، اس صورت میں خطاب مؤمنین کو ہوگا۔

"فالمعنی انه تعالى كأنه يخاطب المؤمنين فيقول لهم مغفرة من الله خير لكم من الأموال التي تجمعونها في الدنيا"

اب اس کا معنی یہ ہوگا، اے مومنو اللہ کی بخشش تمہارے لئے تمہارے ان مالوں سے بہتر ہے جو تم جمع کرتے ہو۔ (کبیر ج۹ص ۵۸)

مغفرت ورحمت کے بہتر ہونے پر چند وجوہ:

(۱) جو شخص دنیا کا مال طلب کرتا ہے وہ طلب کے وقت اپنے آپ کو مشقت میں ڈالے ہوتا ہے اور اس کے حاصل کرنے میں تھکن میں ہوتا ہے "ولعله لاینتفع به غدا لأنه یموت قبل الغد" ہوسکتا ہے کل اس سے وہ فائدہ نہ حاصل کرسکے اور اس کی موت کل سے پہلے ہی آجائے۔

"واما طلب الرحمة والمغفرة فانه لابد وان ینتفع به لأن الله لایخلف وعده"

لیکن رحمت اور بخشش کی طلب میں نفع ضرور حاصل ہوتا ہے، اسلئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں فرماتا۔

اور رب تعالیٰ نے وعدہ یہ فرمایا ﴿فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ﴾ تو جو ایک ذرہ بھر بھلائی کرے اسے دیکھے گا،

(۲) اللہ تعالیٰ کی عطاء یعنی اس کی بخشش اور رحمت کل تک باقی رہیں گی، لیکن ہوسکتا ہے مال کل تک باقی نہ رہے۔ "فکم من انسان اصبح امیرا وامسی اسیرا" کتنے ہی انسان صبح امیر ہوتے ہیں اور شام کو قیدی ہوتے ہیں۔

"وخیرات الآخرة لاتزول لقوله" وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّکَ" ولقوله تعالی" ﴿مَا عِنْدَکُمْ یَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ﴾

نیکیاں باقی رہنے والی بہتر ہیں تمہارے رب کے ہاں۔ اور فرمایا، جو تمہارے پاس ہے وہ ختم ہوجائے گا، اور جو رب تعالیٰ کے ہاں ہے وہ ختم نہیں ہوگا۔

(۳) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مال کچھ دیر کیلئے باقی تو رہ جاتا ہے، لیکن حوادثات اس سے فائدہ حاصل نہیں کرنے دیتے کوئی شخص مریض ہوگیا اور اسے درد لاحق ہوگیا تو وہ اس سے نفع نہ حاصل کرسکا، "ومنافع الآخرة لیست کذلک" لیکن آخرت کے منافع یوں نہیں، بلکہ وہ ہمیشہ کیلئے نفع مند ہیں۔

(۴) بعض اوقات انسان اپنے مال سے کل نفع بھی حاصل کرلے گا لیکن دنیا کی لذات کے ساتھ تکالیف بھی پائی جاتی ہیں اور منافع نقصانات کے ساتھ ملے جلے ہوتے ہیں، یہ بہت واضح ہے، کوئی پوشیدہ بات نہیں لیکن اخروی منافع تکالیف اور نقصانات سے پاک ہیں۔

(۵) اگر کسی شخص کو منافع حاصل ہوں لیکن اسے تکالیف نہ حاصل ہوں، ایسا بہت کم ہے لیکن اگر ایسا ہوجائے تو پھر اس کے منافع بھی ختم ہوجائیں گے اور اس کی اپنی زندگی بھی ختم ہونے والی ہے، پھر اسے جب کوئی نعمت حاصل ہوتی ہے تو وہ جتنی دیر نعمت حاصل نہیں رہی اس پر افسوس کرتا ہے، لیکن اخروی نعمتیں دائمی (ہمیشہ رہنے والی) ہیں، اور انسان کی زندگی بھی آخرت میں ختم ہونے والی نہیں۔ اور نہ ہی کوئی وہاں افسوس حاصل ہوتا ہے۔

(۶) دنیاوی منافع حسی ہیں، اخروی منافع عقلی ہیں۔ حسی منافع گھٹیا ہیں، اور عقلی منافع اعلی ہیں۔ لھذا اخروی منافع کو فوقیت (بلندی) حاصل ہے۔

ان چھ وجوہ سے ہی آنے والے الفاظ مبارکہ کا مطلب آسانی سے سمجھ آسکتا ہے۔

﴿ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴾

''البتہ تھوڑی بخشش اللہ کی طرف سے اور تھوڑی رحمت بہت بہتر ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔''

اعتراض: ﴿ خَيْرٌ ﴾ اسم تفضیل ہے جو زیادہ بہتری پر دلالت کرتا ہے تو اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دنیاوی مال جمع کرنا اچھا ہے، لیکن اللہ کی بخشش اور اس کی رحمت زیادہ بہتر ہیں۔ حالانکہ دنیاوی مال جمع کرنا تو اچھا ہی نہیں۔ تو یہاں ﴿ خَيْرٌ ﴾ کا استعمال کس طرح صحیح ہے؟

جواب: "هذا وارد على حسب قولهم ومعتقدهم ان تلك الأموال خيرات فقيل المغفرة خير من هذه الاشياء التى تظنونها خيرات"

یہاں ﴿ خَيْرٌ ﴾ کا استعمال ان لوگوں کے اعتقاد کے مطابق ہے۔ وہ دنیاوی مال کو بہت نعمت سمجھتے تھے، اور اسے بہتر قرار دیتے تھے، لھذا آیۂ کریمہ میں بیان کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ یہ لوگ دنیا کے مال کے جمع کرنے کو اپنے اعتقاد کے مطابق بہتر قرار دیتے ہیں لیکن انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالی کی بخشش اور رحمت دنیا کے مال جمع کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔ بلکہ اس میں ان کو تنبیہ بھی کردی گئی کہ تم منافقت کو چھوڑ کر مخلص مؤمن بن جاؤ۔

تنبیہ: اگر ﴿ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴾ والی قراءت ہو اور خطاب مؤمنین کو ہو تو اس صورت میں مسئلہ واضح ہے کہ اے مؤمنو تمہارا حلال مال جمع کرنا اگرچہ بہتر ہے کیونکہ اس سے تم حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرتے ہو لیکن اس دنیاوی مال پر ہی بھروسہ نہ رکھو بلکہ زیادہ توجہ اللہ تعالی کی بخشش اور رحمت حاصل کرنے کی طرف کرو کیونکہ وہ زیادہ ہی بہتر ہے۔ (ماخوذ از کبیر بالوضاحت والتصرف ج۹ ص۵۸، ۵۹)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَی اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ O (آیة نمبر ۱۵۸)

(1) اور اگر تم مرو یا مارے جاؤ تو اللہ کی طرف اٹھنا ہے۔ (کنز الایمان)

(2) اور اگر تم مر جاؤ یا قتل کر دیے جاؤ تو اللہ کی طرف ہی تمہیں اٹھایا جانا ہے۔ (نجوم الفرقان)

مقام توجہ:

عام طور پر قرآن پاک کے نسخوں میں ﴿لَااِلَی اللّٰهِ﴾ رسم الخط ہے۔ پھر بعض اوقات ﴿لَا﴾ پر گول نشان لگا دیا جاتا ہے کہ یہ الف پڑھنے میں نہیں آ رہا، تفسیر کبیر کے متن میں، ﴿لَااِلَی﴾ نہیں لکھا گیا، بلکہ صرف ﴿لَاِلَی﴾ لکھا گیا ہے، الف نہیں لکھا گیا۔ (راقم)

مختصر مطلب:

اس آیۂ کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے "ان ترکتم الجهاد واحترزتم عن القتل والموت بقيتم اياما قليلة في الدنيا مع تلك اللذات الخسيسة ثم تتركونها لامحالة فتكون لذاتها لغيركم وتبعاتها عليكم" کہ اگر تم نے جہاد چھوڑ دیا اور تم نے اپنے گمان کے مطابق یہ سمجھا کہ تم نے اپنے آپ کو قتل ہونے اور مرنے سے بچا لیا حالانکہ حقیقت میں تمہاری موت کا وقت ہی نہیں آیا تھا، تو پھر بھی یہ یقین کر لو کہ تم نے دنیا میں تھوڑا وقت رہنا ہے اور یہ گھٹیا دنیاوی لذتیں تھوڑا عرصہ تمہیں حاصل رہیں گی، پھر یقیناً تم نے دنیا اور اس کی نعمتوں کو چھوڑ جانا ہے، اور تمہارے پیچھے آنے والوں کو وہ حاصل ہو جائیں گی،

"اما لو اعرضتم عن الذات الدنيا وطيباتها، وبذلتم النفس والمال للمولى يكون حشركم الى الله ووقوفكم على عتبة رحمة الله وتلذذكم بذكر الله"

اور اگر تم نے دنیا کی لذات کو چھوڑا اور دنیا کے رزق حلال کو بھی چھوڑ کر تم نے اپنے مال اور اپنی جانوں کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیا تو تمہیں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو گیا، اللہ کی رحمت کے دروازے کی دہلیز پر تمہیں کھڑا ہونا نصیب ہوگا، اور تمہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے لذت حاصل ہوگی۔ اب خود بخود سمجھ لیا جائے کہ دونوں مقامات میں کتنا بڑا فرق ہے۔ (ماخوذ از کبیر ج۹ ص۵۹)

چند دقائق:

(۱) یہاں ارشاد ہوا ﴿لَاِلَی اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ﴾ اور یہ نہیں فرمایا ﴿تُحْشَرُوْن لَاِلَی اللّٰهِ﴾ اس لئے کہ

﴿لَاِلَی اللّٰہِ﴾ کو پہلے ذکر کرنے سے حصر کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے، معنی یہ حاصل ہو گیا کہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہی تمہیں اٹھایا جاتا ہے، کسی اور کی طرف نہیں "وھذا یدل علی انه لاحاکم فی ذلک الیوم ولاضار ولانافع الاھو" اور یہ دلالت کرتا ہے اس پر کہ قیامت کے دن کوئی اور حاکم نہیں ہوگا، کوئی ضرر دینے والا، کوئی نفع پہنچانے والا سوائے اللہ تعالیٰ کے نہیں ہوگا۔ خود رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اسی پر دلالت کر رہا ہے۔ ﴿لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (سورۃ المؤمن، آیۃ نمبر ۱۶) آج کس کی بادشاہی ہے؟ ایک اللہ سب پر غالب کی، (کنز الایمان)

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ﴾ اور امر اس دن اللہ ہی کیلئے ہے۔

(۲) اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنا اسم گرامی "اللہ" ذکر کیا "وھذاالاسم اعظم الاسماء" یہ اسم گرامی رب تعالیٰ کے باقی تمام ناموں سے بہت عظیم نام ہے۔ یہ کمال رحمت اور کمال قہر پر دلالت کر رہا ہے۔

"فھو لدلالته علی کمال الرحمة اعظم انواع الوعد ولدلالته علی کمال القھر اشد انواع الوعید"

جب اس اسم گرامی کی دلالت رب تعالیٰ کی کمال رحمت پر ہے تو اس میں وعد کی بہت عظیم قسموں پر دلالت پائی گئی ہے اور کمال قہر پر دلالت کرنے کی وجہ سے اس میں رب کی تعالیٰ کی بہت شدید وعید کی قسموں کی دلالت بھی پائی گئی ہے۔

(۳) اس آیۃ کریمہ میں اسم "اللہ" پر لام تاکید کو داخل کیا گیا، ارشاد فرمایا ﴿لَاِلَی اللّٰہِ﴾ "وھذا ینبھک علی ان الالھیة تقتضی ھذاالحشر والنشر" یہ اس پر متنبہ (خبردار) کر رہا ہے کہ رب تعالیٰ کی "الھیۃ" (اس کا معبود ہونا) اس حشر و نشر کا تقاضا کر رہا ہے۔ جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ اَکَادُ اُخْفِیْهَا لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی﴾ (سورۃ طٰہٰ، آیۃ نمبر ۱۵) بیشک قیامت آنی والی ہے قریب تھا کہ میں اسے سب سے چھپاؤں کہ ہر جان اپنی کوشش کا بدلہ پائے۔ (کنز الایمان)

(۴) ﴿تُحْشَرُوْنَ﴾ مضارع مجہول کا صیغہ ہے، جس میں فاعل صراحۃ (ظاہر طور پر) ذکر نہیں کیا گیا، جس سے یہ ثابت کیا گیا ہے "ان فاعل ذلک الحشر ھو اللہ" اس حشر کا فاعل وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ ظاہر طور پر ذکر نہ کرنا ہی اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ عظیم اور کبیر ہے "شھدت العقول بانه ھو اللہ الذی یبدئ ویعید"، جس کی عظمت اور کبریائی پر عقلیں شاہد ہیں کہ وہ اللہ ہی ہے جو پیدا کرتا ہے اور اسی نے پھر اپنی طرف لوٹانا ہے۔ اس مقام پر ﴿تُحْشَرُوْنَ﴾ کا فاعل ظاہر نہ ذکر کرنا اس کی عظمت پر دلالت کر رہا ہے۔ اس کی نظیر اس آیۃ کریمہ میں بھی پائی گئی ہے۔

﴿وَقِیْلَ یَاَرْضُ ابْلَعِیْ مَاءَ کِ﴾ (سورۃ ھود، آیۃ نمبر ۴۴)

(اور حکم فرمایا گیا اے زمین اپنا پانی نگل لے) یہ حکم بھی صرف رب تعالیٰ ہی کا ہے جو اس کی عظمت پر دلالت کر رہا ہے۔

(۵) تمام کے اٹھائے جانے کو اٹھانے والے کی طرف منسوب کیا گیا، تو یقیناً وہ مخلوق سے تو نہیں، کوئی اور ہی ہے، وہ "اللہ" ہے۔ خود بخود عقل اس پر دلالت کر رہا ہے کہ تمام مخلوق رب تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں، اور اسی کی مشیت میں ہے، "فھم سواء کانوا احیاء وامواتا لایخرجون عن قھر الربوبیۃ و کبریاء الالھیۃ" اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے قہر اور اس کی الھیۃ کی کبریائی سے کوئی باہر نہیں، سب ہی زندہ اور مردہ اس میں برابر ہیں۔

(۶) ﴿تُحْشَرُوْنَ﴾ جمع کا صیغہ ہے، جس میں تمام کو خطاب کیا گیا ہے، یہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ تمام جہان والوں کو اٹھایا جائے گا، میدان قیامت میں کھڑا کر دیا جائے گا، اور عدل وانصاف کیا جائے گا۔

فیجتمع المظلوم مع الظالم والمقتول مع القاتل والحق سبحانہ وتعالی یحکم بین عبیدہ بالعدل المبرأ عن الجور، کما قال ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیَامَۃِ﴾ اور ہم عدل کی ترازوئیں رکھیں گے قیامت کے دن' یہ جو اس آیۃ کریمہ کے چند دقائق وفوائد ذکر کئے ہیں یہ تو سمندر میں سے ایک قطرہ کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس آیۃ کریمہ میں راز رکھے ہوئے ہیں۔

(کبیر ج۹ ص ۶۰)

ہاں ہاں یہ تو قرآن پاک کی عظمت ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ میں اسرار وکمالات کے موجزن دریا موجود ہیں۔

فائدہ جلیلہ: اللہ تعالیٰ کے کلام میں کتنی حسین اور مفید ترتیب رکھی گئی ہے، جس کی مثال نہیں ملتی،

"فانہ قال فی الآیۃ الأولی ﴿لَمَغْفِرَۃٌ مِنَ اللّٰہِ﴾ وھو اشارۃ الی من یعبدہ خوفامن عقابہ، ثم قال (ورحمۃ) وھو اشارۃ الی من یعبدہ لطلب ثوابہ، ثم قال فی خاتمۃ الآیۃ ﴿لَاِلَی اللّٰہِ تُحْشَرُوْنَ﴾ وھو اشارۃ الی من یعبداللہ لمجرد الربوبیۃ والعبودیۃ"

اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے حضرات کی تین قسمیں ہیں۔ بعض وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈر کر اس کی عبادت کرتے ہیں، ان کا تذکرہ پہلی آیۃ ﴿لَمَغْفِرَۃٌ مِنَ اللّٰہِ﴾ (البتہ بخشش ہے اللہ کی طرف) میں کیا گیا ہے۔ اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت ثواب اور جنت حاصل کرنے کیلئے کرتے ہیں ان کا تذکرہ "ورحمۃ" میں کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو رحمت حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت اس کی ربوبیت کی وجہ سے کرتے ہیں کہ وہ معبود حقیقی ہے اور ہم اس کے بندے ہیں ہمیں اس کی عبادت سے اس کا تقرب حاصل ہو جائے، ان

کا تذکرہ ﴿ لَاِلَی اللّٰہِ تُحْشَرُوْنَ﴾ میں کر دیا گیا ہے کہ ''البتہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہی تمہیں اٹھایا جائے گا''

''وھذا اعلی المقامات و ابعد النھایات فی العبودیۃ فی علو الدرجۃ، الاتری انہ لما شرف الملائکۃ قال ومن عندہ لایستکبرون عن عبادتہ، وقال للمقربین من اھل الثواب عند ملیک مقتدر''

جب عبادت صرف رب تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کیلئے ہو تو عابد کو اعلیٰ مقام حاصل ہوگا، عبودیت کی حد تک جو سب سے اعلیٰ درجہ ہے، اس تک وہ پہنچ جائے گا۔ رب تعالیٰ نے جب اپنے فرشتوں کو ان کے ذکر سے مشرف فرمایا تو یوں''ارشاد فرمایا:

''وَمَنْ عِنْدَہٗ لَایَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِہٖ وَلَایَسْتَحْسِرُوْنَ ○ یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ لَایَفْتُرُوْنَ ○ (سورۃ الانبیاء آیۃ ۱۹،۲۰)

اور اس کے پاس والے اس کی عادت سے تکبر نہیں کرتے اور نہ تھکیں، رات دن اس کی پاکی بولتے ہیں اور سستی نہیں کرتے۔ (کنز الایمان)

(ومن عندہ) اس کے پاس والے''یہ کون ہیں؟ ان کے متعلق صدر الافاضل حضرت مولنا نعیم الدین مراد آبادی رحمہ اللہ تفسیر خزائن العرفان میں فرماتے ہیں، یہ''اس کے مقربین میں جنہیں اس کے کرم سے اس کے حضور قرب و منزلت حاصل ہے۔ اور رب تعالیٰ نے اپنے اہل ثواب مقربین کا ذکر یوں فرمایا''

﴿اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَھَرٍ ○ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْکٍ مُّقْتَدِرٍ ○

بیشک پرہیزگار باغوں اور نہر میں ہیں، سچ کی مجلس میں عظیم قدرت والے بادشاہ کے حضور،

(کنز الایمان، سورۃ القمر، آیۃ نمبر ۵۴،۵۵)

یعنی جو عبادت صرف رب تعالیٰ کی رضاء کیلئے کرتے ہیں''عذاب کے ڈر یا ثواب کی امید کیلئے نہیں کرتے، ان کو اپنے رب تعالیٰ کے ہاں قرب حاصل ہوتا ہے، وہ بادشاہ اور قدرت والا رب ہے۔

''فبین ان ھؤلاء الذین بذلوا انفسھم و ابدانھم فی طاعتہ و مجاھدۃ عدوہ یکون حشرھم الیہ واستئناسھم بکرمہ وتمتعھم بشروق نور ربوبیتہ''

تو اسی سے واضح ہو گیا کہ بیشک وہ لوگ جنہوں نے اپنے نفسوں اور بدنوں کو صرف رب تعالیٰ کی طاعت کیلئے اور اس کے دشمن (نفس و شیطان) سے مقابلہ و مجاہدہ کیا، تو ان کا حشر رب تعالیٰ کی طرف ہی ہوتا ہے، اور ان کو اس کے کرم سے انس حاصل ہوتا ہے، اور انہیں نور ربانی سے منور ہونے کا نفع حاصل ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ بہت بڑی وسعت کا تقاضا کرتا ہے، لیکن مختصر طور پر اتنی مقدار ذکر کر دیا جس سے بصیرت حاصل ہو جائے۔ (کبیر ج۹ ص۵۹)

اسی آیۃ کی تشریح میں علامہ رازی رحمہ اللہ نے بغیر سند کے ایک روایت ذکر کی ہے "واللہ اعلم بالصواب"

یروی ان عیسی بن مریم صلوات اللہ علیہ وسلامہ مرباقوام نحفت ابدانھم واصفرت وجوھھم ورأی علیھم آثار العبادۃ فقال ماذاتطلبون؟فقالوا نخشی عذاب اللہ،فقال ھواکرم من ان لایخلصکم من عذابہ،ثم مربقوم آخرین فرأی علیھم تلک الآثار فسألھم فقالوا نطلب الجنۃ والرحمۃ،فقال ھواکرم من ان یمنعکم رحمتہ ثم مربقوم ثالث ورأی آثار العبودیۃ علیھم اکثر فسألھم فقالوا نعبدہ لأنہ الھناونحن عبیدہ لالرغبۃ ولالرھبۃ،فقال انتم العبید المخلصون والمتعبدون المحقون'

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کچھ لوگوں سے گذر ہوا، دیکھا کہ ان کے بدن کمزور ہو چکے ہیں اور چہرے زرد ہو چکے ہیں، اور ان پر عبادت کے آثار نمایاں ہیں، آپ نے ان سے پوچھا، تم کیا چیز طلب کرر ہے ہو، انہوں نے کہا ہم اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرر ہے ہیں۔ یعنی اس کے عذاب سے بچنے کا مطالبہ کرر ہے ہیں آپ نے فرمایا وہ تو مکرم ذات ہے، ہو سکتا ہے تمہارا یہ مطالبہ نہ قبول فرمائے، پھر آپ کا کچھ اور لوگوں سے گذر ہوا، ان پر آثار عبادت کو دیکھ کر ان سے پوچھا، تم کس لئے عبادت کرر ہے ہو؟ کہنے لگے کہ ہم جنت اور رحمت طلب کرر ہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ وہ مکرم ہے ہو سکتا ہے تمہیں جنت و رحمت نہ عطاء کرے۔ (آپ کا مطلب اصل میں یہ تھا کہ یہ ضروری نہیں کہ جو مطالبہ کیا جائے وہ مل بھی جائے، کبھی خلوص میں کمی ہوتی ہے، کبھی ریاء کاری دخل انداز ہوتی ہے، جس کی وجہ سے طلب کی ہوئی چیز نہ ملے، دعاء میں قبولیت کسی اور وجہ سے ہو جائے) پھر آپ کا گذر ایک اور قوم سے ہوا، ان پر آثار عبادت دیکھ کر ان سے پوچھا کہ تم عبادت کیوں کرر ہے ہو؟ انہوں نے کہا ہم اس کی عبادت اس لئے کرر ہے کہ وہ ہمارا الہ ہے، ہم اس کے بندے ہیں، ہم کسی چیز کی رغبت یا کسی چیز کے ڈر کی وجہ سے اس کی عبادت نہیں کرر ہے۔ تو آپ نے فرمایا تم اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے ہو، تم عبادت کا حق ادا کرر ہے ہو۔ (کبیر ج۹ ص۵۹)

طلباء کرام کے یاد کرنے کیلئے خوبصورت عبارت:

جس عبارت کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ عبارت تو علامہ اسمٰعیل حقی رحمہ اللہ کی ہے۔ البتہ اس کا مفہوم تفسیر کبیر سے ہی لیا ہے۔ اس لئے علامہ حقی رحمہ اللہ نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے یوں بیان کیا،

قال الامام فی تفسیرہ "الانسان اذاتوجہ الی الجھاد اعرض قلبہ عن الدنیا واقبل علی الآخرۃ فاذامات فکانہ تخلص من العدو ووصل الی المحبوب واذا جلس فی

بیته خائفا من الموت حریصا علی جمیع الدنیا فاذامات فکانه حجب عن المعشوق والقی فی دار الغربة ولاشک فی کمال سعادة الاول وکمال شقاوة الثانی" انتہی "فحشر الغافلین بالحجاب وحشر الواصلین باظهار الجناب فمن کان فی هذه الدنیا اعمی بحب المال والمنال کان فی الآخرة محجوبا عن مشاهدة الجمال" (روح البیان ج ۲ ص ۱۱۵)

انسان جب جہاد کی طرف متوجہ ہوتو اس کا دل دنیا سے اعراض کرلے، اور آخرت کی طرف متوجہ ہوجائے تو جب اس کی موت آئے گی تو دشمن سے اسے چھٹکارا حاصل ہوگا اور وہ اپنے محبوب حقیقی تک پہنچ جائے گا، یعنی اسے قرب الہی حاصل ہوگا، یقیناً اس میں اسے کامل سعادت حاصل ہوگی، اور اگر وہ موت سے ڈر کر گھر میں ہی بیٹھ رہا، اور دنیا کی زندگی اور دنیا کے مال ودولت پر حریص رہا تو جب اس کی موت آئے گی تو اپنے محبوب حقیقی سے دور ہوگا، اور گویا کہ اس نے اپنے آپ کو دار غربت میں ڈال دیا ہوگا، یہ اس کی بہت بڑی بدبختی ہوگی۔ لھذا پتہ چلا کہ واصلین کا حشر رب تعالیٰ کا قرب ہوگا۔ اور غافلین جو کہ دنیا کے مال واسباب سے اندھا دھند محبت کرتے رہے اور تقرب الہی حاصل کرنے میں ناکام رہے وہ آخرت میں رب کریم جو معبود حقیقی ہے اس کے جمال یعنی اس کے انوار کی تجلیات کے مشاہدہ سے دور رہیں گے۔

جانا زدر تو دور نتوانم بود | قانع بہشت وحور نتوانم بود

اے محبوب حقیقی تیرے در سے دور میں نہیں ہوسکتا | میں بہشت وحور پر قناعت نہیں کرسکتا

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَا نۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ وَشَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَوَكِّلِيۡنَ ۝ (آیۃ نمبر ۱۵۹)

(1) تو کیسی کچھ اللہ کی مہربانی ہے کہ اے محبوب تم ان کیلئے نرم دل ہوئے اور اگر تند مزاج سخت دل ہوتے تو وہ ضرور تمہارے گرد سے پریشان ہو جاتے تو تم انہیں معاف فرماؤ اور ان کی شفاعت کرو اور کاموں میں ان سے مشورہ لو اور جو کسی بات کو ارادہ پکا کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو بیشک توکل والے اللہ کو پیارے ہیں۔ (کنزالایمان)

(2) تو اللہ کی رحمت سے نرم ہوئے آپ ان کیلئے، اور اگر ہوتے آپ سخت مزاج، (اور) سخت دل البتہ ہٹ جاتے وہ آپ کے ارد گرد سے، تو آپ در گزر رکھیں ان سے، اور بخشش طلب کرو ان کیلئے، اور آپ مشورہ کر لیں ان سے کاموں میں، تو جب آپ پکا ارادہ کر لو تو توکل (بھروسہ) رکھو اللہ پر، بیشک اللہ محبت رکھتا ہے توکل رکھنے والوں سے۔ (نجوم الفرقان)

مختصر مطلب:

احد میں جب بعض صحابہ کرام سے درہ چھوڑنے کی اجتہادی خطاء ہوئی، اور کفار کے اچانک درہ سے حملہ کرنے کی صورت میں بعض صحابہ کرام جو پسپا ہو گئے تھے۔

"ثم عادوالم يخاطبهم الرسول الله ﷺ بالتغليظ والتشديد وانما خاطبهم بالكلام اللين"

پھر جب وہ لوٹ کر آگئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے سخت کلام نہیں فرمایا، ان پر شدید غصہ نہیں کیا، بلکہ ان سے نرم کلام فرمایا، رب تعالی نے اسی کی تعریف فرمائی کہ اللہ تعالی کی رحمت سے آپ ان پر نرم مزاج اور نرم دل واقع ہوئے، اگر آپ سخت مزاج ہوتے اور سخت دل ہوتے تو وہ آپ کو چھوڑ کر دور ہو جاتے، آپ کے پاس جمع نہ رہتے، پہلی آیات میں اللہ تعالی نے صحابہ کرام کے دنیا اور آخرت میں نفع کی راہنمائی فرما دی اس کی وجہ بھی حقیقت میں

نبی کریم ﷺ کا ان کو معاف کر دینا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مزید ان سے درگزر جاری رکھنے کا حکم دیا، اور ان کیلئے بخشش طلب کرنے کا ارشاد فرمایا، صحابہ کرام کی مزید دل جوئی اور ان سے محبت قائم رکھنے کیلئے ان سے مشورہ کرنے کا حکم دیا، پھر ساتھ ہی حکم فرمایا کہ آپ جب کوئی کام کرنے کا پختہ ارادہ کرلیں تو پھر اللہ تعالیٰ پر ہی کامل بھروسہ رکھو، جو لوگ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے محبت رکھتا ہے۔ (کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۴۰، ۴۱ (مع وضاحت)

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ﴾ "تو اللہ کی رحمت سے نرم ہوئے آپ ان کیلئے"

"فبما" میں "ما" زائد ہے، جیسا کہ "عما قلیل" اور "وجند ما ھنالک" اور فبما نقضھم، مما خطایاھم" میں "ما" زائد ہے، البتہ عرب حضرات بعض اوقات "زائد لفظ کو تاکید کیلئے بھی استعمال کر لیتے ہیں اگرچہ وہاں تاکید کی اتنی ضرورت نہ بھی ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ﴾ میں "ان" زائد ہے اور تاکید کیلئے استعمال ہے۔

"وقال المحققون دخول اللفظ المهمل الضائع فی کلام احکم الحاکمین غیر جائز، وههنا یجوز ان تکون (ما) استفهاما للتعجب"

محققین حضرات کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین کے کلام میں کسی لفظ کو مہمل، ضائع ماننا جائز نہیں، بہتر اور جائز صورت یہ ہے کہ "ما" استفہام تعجب کیلئے ہو، اسلئے کہ نبی کریم ﷺ نے جب صحابہ کرام کو پریشان کر دینے والی اجتہادی خطاء کر معاف کر دیا، کوئی سخت کلام نہیں فرمایا، ان کی کوئی سرزش نہیں کی تو ان کو بھی معلوم ہو گیا تھا "ھذا لایاتی الا بتایید ربانی وتسدید الھی" کہ یہ صرف تائید ربانی سے ہی حاصل ہوا، اور اسی نے اپنے محبوب ﷺ کو درست فیصلہ کرنے کی راہنمائی کی، یہ مقام تعجب تھا اس لئے "فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ" کا معنی یہ ہو گا "فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ" تعجب ہے اس پر کہ کتنی ہی اللہ کی رحمت ہے آپ پر جس کی وجہ سے آپ ان پر نرم دل ہو گئے، اس معنی کے متعلق علامہ رازی رحمہ اللہ نے فرمایا "ھذا ھو الاصوب عندی" یہ معنی میرے نزدیک بہت درست ہے۔ (کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۲، ۶۳)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"باء" اور "عن" اور "من" اور "کاف" کے ساتھ اکثر طور پر "ما" زائد ہوتا ہے۔ (البحر المحیط جلد ۳ صفحہ نمبر ۱۴۰)

راقم کے نزدیک زائد تحسین کلام کیلئے یا تاکید کیلئے ہو تو وہ زائد ضائع نہیں، بلکہ مقصد کیلئے ہے۔

﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾

''اور اگر ہوتے آپ سخت مزاج اور سخت دل تو البتہ وہ آپ کے اردگرد سے ہٹ جاتے۔''

"بین تعالی ان ثمرة اللین هی المحبة والاجتماع علیه وان خلافها من الجفوة والخشونة مؤد الی التفرق"

اللہ تعالی کے ارشاد سے یہ واضح ہورہا ہے کہ نرم دل اور نرم مزاج ہونا محبت اور لوگوں کے اپنے ساتھ اجتماع کا ذریعہ ہے، اور اس کے خلاف سخت مزاجی اور سخت دلی محبت کے توڑنے اور جدا ہونے کا سبب ہے، مطلب تقریباً واضح ہوگیا کہ نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے یہ واضح کردیا کہ اگر آپ صحابہ کرام کو ملامت کرتے، ڈانٹتے، جھڑکتے تو وہ بھی آپ کی مخالفت کرتے آپ سے دور بھاگتے اس کی وجہ یا ان کا ڈر ہوتا، یا حیاء کی وجہ سے آپ کے قریب نہ آتے، یہ کلمۂ اسلام میں بٹ جانے کا سبب بنتا، اس طرح اسلام کی بنیادیں ضعیف ہوجاتیں، اور دشمن دلیر ہوجاتے، لیکن آپ نے نرمی فرمائی، معاف کردیا تو مسلمانوں میں اجتماعیت برقرار رہی، اور حقوق اللہ پر عمل قائم ودائم رہا، ان کو چھوڑنے کا کوئی ذریعہ نہ بنا۔ (البحر المحیط جلد ۳ صفحہ نمبر ۱۴۱)

"الفظ" الغلیظ الجانب السئی الخلق" جس کا مزاج سخت ہو، یا بد مزاج ہو اس پر "فظ" کا اطلاق ہوتا ہے اصل میں "فظظ" ہے، پہلے ظاء کے نیچے زیر ہے، جیسے "حذر" ڈرنے والا اور "فرق" جدا ہونے والا اور ڈرنے والا، لیکن دو حرف ایک جنس کے ہوں تو ان میں ادغام ہوتا ہے، جیسے "صب" اصل میں "صبب" ہے اسی وجہ "فظ" اور "صب" ہوگیا "لَانْفَضُّوْا" اصل مادہ اس کا "ف ض ض" ہے، باب انفعال ہے، لام ابتدائیہ تاکید یہ استعمال ہے اصل میں "فض" کا معنی ہے متفرق ہوجانا، کہا جاتا ہے "انفض القوم" قوم متفرق ہوگئی۔

ارشاد باری تعالی ہے ﴿وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَائِمًا﴾ اور جب انہوں نے کوئی تجارت یا کھیل دیکھا اس کی طرف چل دیئے اور تمہیں خطبے میں کھڑا چھوڑ گئے، یعنی اس آیۃ میں بھی "اِنْفَضُّوْا" قوم کا دوران خطبہ حضور ﷺ سے ہٹ جانا اور تجارتی وفد کی طرف چلے جانے کا ذکر ہے اس طرح کہا جاتا ہے "فضضت الکتاب" میں نے کتاب کھولی "لا یفضض اللہ فاک" اللہ تمہارے منہ کو نہ کھولے "فظ" اور "غَلِيْظَ الْقَلْبِ" میں فرق "الفظ الذی یکون سیئی الخلق" "فظ" کا معنی ہے بد خلق ہونا، تیز مزاج ہونا "غَلِيْظَ الْقَلْبِ هو الذی لایتاثر قلبه عن شئی" جس شخص کا دل کسی چیز کے اثر کو قبول نہ کرے اسے "غَلِيْظَ الْقَلْبِ" کہا جاتا ہے۔

خیال رہے کہ بعض اوقات انسان تیز مزاج نہیں ہوتا اور کسی کو ایذا بھی نہیں دیتا لیکن وہ کسی پر رحم نہیں کرتا اور کسی پر نرم بھی نہیں ہوتا، اسی وجہ سے دونوں چیزوں کا ذکر کیا کہ نبی کریم ﷺ تند مزاج بھی نہیں تھے اور سخت دل بھی نہیں تھے بلکہ نرم دل تھے اور رحم فرمانے والے تھے۔ (ماخوذ از کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۳، ۶۲)

نبی کریم ﷺ کی نرم دلی اور حسن اخلاق:

﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (سورة الحجر، آية نمبر ۸۸)

''اور مسلمانوں کو اپنے رحمت کے پروں میں لے لو۔'' (کنز الایمان)

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾ (سورة الاعراف، آية نمبر ۱۹۹)

اے محبوب معاف کرنا اختیار کرو، اور بھلائی کا حکم دو، اور جاہلوں سے منہ پھیرلو۔ (کنز الایمان)

﴿اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (سورة القلم، آية نمبر ۴)

اور بیشک تمہاری خوبو بڑی شان کی ہے۔ (کنز الایمان)

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ (سورة التوبة، آية نمبر ۱۲۸)

بے شک تمہارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہے، تمہاری بھلائی کے نہایت چاہنے والے مسلمانوں پر کمال مہربان۔ (کنز الایمان) (منقول از کبیر جلد ۹ صفحہ ۶۱)

❁ عن عطاء بن يسار قال لقيت عبدالله بن عمرو بن العاص قلت اخبرني عن صفة رسول الله ﷺ في التوراة قال اجل والله انه لموصوف في التورة ببعض صفته في القرآن يا ايها النبي انا ارسلناك شاهدا ومبشرا ونذيرا وحرزا للاميين انت عبدی ورسولي سميتك المتوكل ليس بفظ ولا غليظ ولا سخاب في الاسواق ولا يدفع بالسيئة السيئة ولكن يعفو ويغفر ولن يقبضه الله حتى يقيم به الملة العوجاء بان يقولوا لا اله الا الله ويفتح بها اعينا عميا وآذانا صما وقلوبا غلفا''

(رواه البخاری، مشکوة باب فضائل سيد المرسلين)

عطاء بن یسار کہتے ہیں، میں نے عبداللہ بن عمرو بن العاص کو کہا کہ تم مجھے خبر دو رسول اللہ ﷺ کی کسی صفت کے متعلق جس کا ذکر توراۃ میں ہو، انہوں نے کہا ہاں (میں بتاتا ہوں) توراۃ میں آپ کی بعض وہ صفات بھی ذکر ہیں، جو قرآن پاک میں ہیں، یعنی قرآن پاک میں ہے ﴿يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّا اَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا

﴿وَنَذِيْرًا﴾ اور یہ تمام صفات توراۃ میں بھی ہیں، کہ آپ کو رب نے فرمایا اے نبی ہم نے آپ کو بھیجا شاہد بنا کر اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا'' اور آپ کو امیین کا محافظ بنایا، اور رب تعالی نے یوں فرمایا تو میرا بندہ ہے اور میرا رسول ہے، میں نے تمہارا نام متوکل رکھ دیا، آپ سخت مزاج نہیں، اور نہ ہی آپ سخت دل ہیں، اور نہ ہی آپ بازاروں میں چلانے والے ہیں، اور نہ ہی آپ برائی کو برائی سے دور کرنے والے ہیں، بلکہ معاف کر دیتے ہیں اور بخش دیتے ہیں، اللہ تعالی آپ کی روح کو اس وقت تک ہرگز قبض نہیں فرمائے گا یہاں تک کہ آپ کے ذریعے ٹیڑھی ملت کو درست کردے، کہ وہ کہیں ''لا الہ الا اللہ'' اور آپ کے ذریعے اندھی آنکھوں کو کھول دیا جائے، اور بہروں کو کان عطاء کر دیئے جائیں، اور بندوں کو کھول دیا جائے۔

وضاحت حدیث:

اگرچہ حدیث پاک میں سے دولفظوں ''لیس بفظ و غلیظ'' کو ذکر کرنا مقصد تھا، لیکن طلباء کرام کے فائدہ کیلئے مکمل حدیث نقل کر دی اور تمام کی تشریح بھی کی جا رہی ہے، جب عطاء بن یسار نے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف توراۃ میں بھی ہیں؟ تو انہوں نے جواب میں ''اجل'' کہا پہلے دولفظوں پر زبر اور تیسرا حرف ساکن ہے، اس کا معنی ہے ''ہاں'' یعنی آپ کے اوصاف توراۃ میں بھی مذکور ہیں۔ ﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا﴾ اے نبی ہم نے آپ کو شاہد بنا کر بھیجا ''شاهدا'' حال مقدرہ ہے فاعل سے یا مفعول سے، معنی یہ ہے کہ اے نبی آپ کو جن لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے خواہ آچکے ہیں یا ابھی انہوں نے آنا ہے آپ ان کی تصدیق و تکذیب پر شاہد ہیں

''مقبولا قولک عند اللہ لهم وعليهم كما يقبل الشاهد العدل فی الحكم''

اس حال میں کہ آپ کا قول اللہ تعالی کے ہاں تصدیق کرنے والوں کیلئے جزاء خیر اور تکذیب کرنے والوں کیلئے عذاب میں مقبول ہوگا جیسا کہ عادل گواہ کا قول فیصلہ کرنے میں مقبول ہوتا ہے

''او شاهدا لافعال امتک يوم القيامة'' یا اس کا معنی یہ ہے کہ آپ کو قیامت کے دن آپ کی امت کے افعال پر گواہ بنایا جائے گا

''او لجميع الانبياء فی تبليغهم كما قال اللہ تعالى'' ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاءِ شَهِيْدًا﴾ (سورة النساء آية نمبر ۴۱)

''یا اس کا معنی یہ ہے کہ آپ کو تمام انبیاء کرام کی تبلیغ پر شاہد بنایا جائے گا۔'' جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا (ترجمہ) تو کیسی

ہوگی جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں اور اے محبوب تمہیں ان سب کو گواہ۔ (کنز الایمان)

"اومز کیا لأمتک فی شهادتهم علی الامم تبلیغ رسالة الانبیاء الیهم کما قال الله تعالی ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (سورة البقرة آیة نمبر ۱۴۳)

اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے تمہیں کیا سب امتوں میں افضل کہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ۔

یا آپ کو اپنی امت کا شاہد بنایا گیا، کہ آپ کی امت جب انبیاء کرام کی تبلیغ پر گواہی دے گی کہ اے اللہ یہ کافر جو انبیاء کرام کی تبلیغ کا انکار کر رہے ہیں جھوٹے ہیں، تو وہ کفار نبی کریم ﷺ کی امت پر اعتراض کریں گے کہ یہ گواہی کیسے دے رہے ہیں یہ تو بعد میں آئے ہیں، مؤمنین بتائیں گے کہ ہمیں تو ہمارے نبی کریم ﷺ نے بتایا ہے، تو اس وقت نبی کریم ﷺ اپنی امت کی سچائی کی گواہی دیں گے۔

"او معناه شاهدا لقدرتنا وارادتنا فی الخلق کمایشیر الیه قوله (ومبشرا) ای للمؤمنین بالثوبة (ونذیرا) ای منذرا ومحفوفا للکافرین بالعقوبة"

اور آپ کے شاہد ہونے کا اور مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ مخلوق میں وہ ہمارے قدرت اور ارادہ کی گواہی دیں گے، اسی کی طرف آنے والے الفاظ (مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا) اشارہ کر رہے ہیں کہ آپ مؤمنوں کو بشارت دیں گے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال پر ثواب دینے کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ اس پر قادر بھی ہے، اور آپ کافروں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرائیں گے کہ وہ تمہیں عذاب دینے کا ارادہ رکھتا ہے، تم اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکو گے کہ وہ اس پر قادر ہے۔

تنبیہ: نبی کریم ﷺ کی گواہی میں جو احتمال بیان کئے گئے ہیں وہ تمام ہی آپ کو حاصل رہیں گے، اس لئے مرقاۃ میں ہے جہاں جہاں "او" آ رہا ہے اسے "واؤ" کے معنی میں لیا جائے تو زیادہ مناسب ہے، اگرچہ میں نے معنی ظاہر کے مطابق "یا" کیا ہے لیکن پسند یہی ہے کہ معنی "اور" کیا جائے۔ (راقم)

حرزا للامیین: آپ امی لوگوں کیلئے محافظ ہیں "حرز" حاء کے نیچے زیر ہے اور راء ساکن ہے "امیین" سے مراد عرب لوگ ہیں "وانما وسمعوا امیین لأن اغلبهم لا یقرؤن ولا یکون" ان کو امی کہا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے زیادہ لوگ لکھتے، پڑھتے نہیں تھے "اولانهم ینسبون الی ام القری وهی مکة" یا ان کو امی اس وجہ سے کہا گیا کہ وہ مکہ مکرمہ کی طرف منسوب تھے "او یکون نبیهم امیا" یہ اس وجہ سے ان کو امی کہا گیا کہ ان کے نبی امی ہیں، اس وجہ کے متعلق علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں "ولعل هذا الوجه فی هذا المقام اوجه

لیشمل جمیع الامۃ" یہ وجہ سب سے بہتر ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کی تمام امت کو شامل ہے، یہاں سے یہود کا یہ دعوی بھی رد ہو جائے گا کہ آپ صرف عرب کے نبی ہیں، نبی کریم ﷺ کی رسالت عامہ کا ذکر رب قدوس نے یوں فرمایا۔

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ (سورۃ النساء آیۃ نمبر)

"اور نہیں بھیجا ہم نے آپکو مگر تمام لوگوں کی طرف خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا۔" اور نبی کریم ﷺ نے اپنی رسالت عامہ کا یوں ذکر فرمایا "قال ﷺ لو کان موسی حیا لماوسعہ الا اتباعی " اگر موسی (علیہ السلام) زندہ ہوتے تو ان کو میری اتباع کے بغیر کوئی چارۂ کار نہ ہوتا۔ "قال ابن الملک ویجوز ان یکون المراد بالحرز حفظ قومہ من عذاب الاستقبال" ابن الملک رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کی صفت "حرز" کا مطلب یہ بھی ہے کہ آپ کی وجہ سے اللہ تعالی نے آپ کی امت کو تباہ و برباد کر دینے کے عذاب سے بچایا ہوا ہے۔ "او الحفظ لھم من العذاب مادام فیھم" اور یہ بھی مراد ہے کہ آپ کیوجہ سے اللہ تعالی آپ کی امت کو عذاب سے اس وقت تک بچائے رکھتا ہے جب تک ان میں موجود ہیں۔ جیسا کہ رب تعالی نے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ﴾ (الانفال آیۃ نمبر ۳۳)

اور نہیں کہ اللہ ان کو عذاب کرے جب تک اے محبوب آپ ان میں تشریف فرما ہیں۔

انت عبدی: توراۃ میں نبی کریم ﷺ کا اور وصف بیان کیا گیا "تم میرے عبد (بندۂ خاص) ہو یہ "عبد خاص" والا معنی اضافت سے سمجھ آیا، اور اضافت تشریفی ہے۔

ورسولی: اور آپ میرے خاص رسول ہیں، یہاں بھی اضافت تخصیص و تشریف پر دلالت کر رہی ہے جیسا کہ رب تعالی نے ارشاد فرمایا ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ﴾ (سورۃ الفتح، آیۃ نمبر ۲۸)

وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا۔ (کنز الایمان)

یعنی "رسولہ" میں بھی اضافت تشریفی ہے، مراد خاص رسول یعنی ہمارے نبی کریم ﷺ ہیں، طلباء کرام پر یہ بات مخفی نہیں کہ اضافت جب عہد کیلئے ہو تو مضاف خود بخود معین ہو جاتا ہے، اور خصوصی طور پر "اذا اطلق اسم الجنس فالمراد بہ الفرد الاکمل" جب اسم جنس کو مطلقا ذکر کیا جائے تو اس سے مراد فرد اکمل ہوتا ہے۔

سمیتک المتوکل: رب تعالی نے نبی کریم ﷺ کا وصف توراۃ میں بیان کیا "نام رکھا میں نے آپ کا متوکل۔

"ای خصصتک بھذا الوصف لکمال توکلک علی وتفویضک الی وتسلیمک لدی عملا بما فی القرآن" ﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ ﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ﴾

یعنی میں نے آپ کو اس وصف سے خاص کر دیا ہے کہ آپ نے مجھ پر کامل بھروسہ کیا، اور تمام امور آپ نے میرے سپرد کیے، اور تمام کام آپ نے میرے ذمہ کر دیئے، اس کی وجہ یہی ہے کہ آپ نے قرآن پاک پر کامل عمل فرمایا، کیونکہ آپ کو حکم دیا گیا (اور آپ بھروسہ کریں اللہ پر) اور آپ کو حکم دیا گیا ﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ﴾ اور بھروسہ کریں اس پر جو زندہ ہے جس پر موت نہیں آئے گی، تو آپ نے ان ارشادات پر عمل کرتے ہوئے کامل بھروسہ اللہ تعالیٰ پر کیا تو رب تعالیٰ نے آپ کا نام "متوکل" رکھ دیا۔

لیس بفظ: والمعنی لیس بسئی الخلق او القول" معنی یہ ہے کہ آپ تند مزاج نہیں، آپ کے قول میں سختی نہیں۔

ولا غلیظ: "ای ضخم کریہ المنظر او سیئ الفعل او غلیظ القلب وھو الاظھر لقولہ تعالیٰ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ"

آپ میں بدنما موٹاپہ نہیں، آپ کے افعال برے نہیں، آپ کا دل سخت نہیں، اس معنی کو علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے زیادہ بہتر قرار دیا، کہ یہ معنی رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ﴾ کے مناسب ہے۔

"ولا سخاب: بتشد الخاء فی الاسواق" آپ بازاروں میں چلانے والے نہیں۔

"قال الطیبی ای ھو لین الجانب تشریف النفس لا یرفع الصوت علی الناس لسوء خلقہ ولا یکثر الصیاح علیھم فی السوق لدنائتہ بل یلین جانبہ لھم ویرفق بھم"

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نرم مزاج ہیں، شریف النفس ہیں، اور آپ سخت مزاج نہیں کہ لوگوں پر آواز بلند کریں، اور آپ میں گھٹیا پن نہیں پایا گیا کہ آپ بازاروں میں چیخیں چلائیں بلکہ آپ نرم مزاج ہیں اور مہربانی فرمانے والے ہیں "ولا یدفع بالسیئۃ السیئۃ" اور آپ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے، حالانکہ برائی کا بدلہ برائی سے دینا جائز ہے، لیکن معاف کر دینا زیادہ ہی بہتر ہے۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ﴾ (سورۃ الشوری، آیۃ نمبر ۴۰)

اور برائی کا بدلہ اسی کے برابر برائی ہے تو جس نے معاف کیا اور کام سنوارا تو اس کا اجر اللہ پر ہے۔ (کنز الایمان)

"اطلاق السیئۃ علی جزائھا للمشاکلۃ" برائی کے بدلہ پر برائی کا اطلاق مشاکلت کیلئے ہے یا یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ بظاہر شکلاً بدلہ بھی برا نظر آتا ہو۔

"ولکن یعفو ای عن المسئی ویغفر ای یستر او یدعولہ بالمغفرۃ لقولہ تعالیٰ فاعف

عنهم و استغفر لهم"

لیکن آپ برائی سے درپیش آنے والوں کو معاف کر دیتے ہیں، اوران کو بخش دیتے ہیں، یعنی ان کی پردہ پوشی فرماتے اور رب تعالی سے بھی ان کی بخشش کی دعاء کرتے ہیں، رب تعالی نے بھی آپ کو یہی ارشاد فرمایا'' آپ ان کو معاف کردیں، اوران کیلئے بخشش طلب کریں'' وھذا اقرب مراتب معاملته مع المسیئین'' نبی کریم ﷺ کا برائی سے درپیش آنے والوں کو معاف کردینا یہ زیادہ قریب مرتبہ تھا، لیکن اس سے بھی بڑھ کر'' وکان قدیقا بلھم بالاحسان'' نبی کریم ﷺ کا وصف یہ تھا کہ آپ برائی سے درپیش آنے والوں پر احسان بھی فرماتے تھے۔

ولن یقبضه الله حتی یقیم به الملة العوجاء بان یقولو الااله الاالله''

اور آپ کا وصف یہ بیان کیا گیا کہ اللہ تعالی آپ کی روح کو قبض نہیں کرے گا یہاں تک کہ آپ کے ذریعے اللہ تعالی ٹیڑھی ملت کو سیدھا کردے گا، کہ وہ کہیں گے'' لا الہ الا اللہ''

اس سے مراد ملت ابراہیمی ہے کہ ایام فترت میں اس پر عمل چھوڑ دیا گیا تھا کیونکہ اس میں کہیں زیادتیاں کردی گئی تھیں، اور کہیں کمی کردی گئی تھی'' حتی قام الرسول ﷺ فاقامها الله و ادامها'' یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو آپ کے ذریعے ملت ابراہیمی کو پھر قائم و دائم کردیا گیا، اور آپ کے ذریعے پھر'' لا الہ الا اللہ'' کا دور شروع ہو گیا'' و یفتح بھا اعینا عمیا و آذانا صما و قلوبا غلفا'' اور اس کلمہ کے ذریعے دین کے اندھوں کو حق راہ دیکھنی نصیب ہوگئی، اور بہرے کانوں کو سننے کی طاقت مل گئی، اور جن دلوں پر پردہ چھایا ہوا تھا ان سے پردے ہٹ گئے۔

(مکمل تشریح حدیث ماخوذ از مرقاۃ جلد ۱۱ صفحہ نمبر ۵۳، ۵۴)

﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ ''تو آپ درگذر رکھیں ان سے۔''

جس آیۃ کریمہ کی وضاحت جاری ہے، اسی کا یہ حصہ بھی ہے، پہلے بیان فرمایا ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ﴾ جس کا مطلب بیان کیا جاچکا ہے کہ آپ نے احد میں صحابہ کرام کی اجتہادی خطاء کو معاف کردیا وہ آپ کی نرم طبیعت، حسن اخلاق کا ذریعہ تھا، اب دوبارہ پھر'' فَاعْفُ عَنْهُمْ'' ارشاد فرمایا، اسی وجہ سے **راقم** نے ترجمہ کیا ہے'' تو آپ درگذر رکھیں ان سے'' یعنی جس طرح آپ نے پہلے ہی معاف فرمادیا ہے اسی طرح معافی کو ہمیشہ کیلئے جاری رکھئے، راقم کا ترجمہ تقریبا تفسیر ابی السعود کی اس عبارت میں دیکھئے۔

(فاعف عنهم) لترتیب العفو او الأمر به علی ما قبله ای اذا کان الأمر کما ذکر فاعف عنهم فیما یتعلق بحقوقک کما عفا الله عنهم''

"فاء" ترتیب کیلئے "عفو" یا عفو کے امر کو ما قبل پر مرتب کیا، یعنی جب معاملہ اس طرح ہے جو ذکر کیا جا چکا ہے۔ یعنی آپ ان کیلئے نرم دلی کا مظاہرہ کر چکے ہیں، تو اس کے بعد بھی آپ کے اپنے حقوق جو ان پر ہیں ان میں بھی معافی جاری رکھیں اسی طرح جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا ہے۔

﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ "اور بخشش طلب ان کیلئے"

(وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ) الله فیما یتعلق بحقوقه تعالی اتماما للشفقة علیهم واکما لاللبر بهم"

اور آپ ان کیلئے حقوق اللہ کے ساتھ متعلق تمام چیزوں میں ان کیلئے بخشش طلب کریں کہ اے اللہ اگر ان سے حقوق اللہ میں کوئی کوتاہی ہو جائے تو ان کو معاف فرما دے، آپ کی دعا ان کیلئے کامل شفقت ہو گیا اور ان کیلئے آپ کی یہ دعا مکمل ان پر احسان ہوگا۔ (تفسیر ابی السعود)

تنبیہ: بعض حضرات نے احد میں صحابہ کرام کے پسپا ہونے کو اجتہادی خطاء تک محدود کیا، بعض حضرات نے اجتہادی خطاء کو بھی صرف درے سے ہٹنے والوں پر محدود کیا ہے، اور بعض حضرات نے گناہ کبیرہ قرار دیا ہے، جن حضرات نے گناہ کبیرہ قرار دیا ہے، انہوں نے اس آیۃ کریمہ سے یہ دلیل پکڑی ہے۔

"فی هذه الآیة دلالة قویة علی انه تعالی یعفو عن اصحاب الکبائر، وذلک لان الانهزام فی وقت المحاربة کبیرة لقوله تعالی "وَمَنْ یُوَلِّهِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ" (الی قوله) فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ" فثبت ان انهزام اهل احد کان من الکبائر ثم انه تعالی نص فی الآیة المتقدمة علی انه عفاعنهم وامر رسوله ﷺ فی هذا الآیة بالعفو عنهم ثم امره بالاستغفار لهم"

اس آیۃ کریمہ میں قوی دلالت اس پر پائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کبیرہ گناہ والے لوگوں کو بھی معاف فرما دیتا ہے، کیونکہ احد میں صحابہ کرام کا لڑائی سے پسپا ہونا گناہ کبیرہ تھا، اس پر دلیل ان حضرات نے قریب ہی آنے والی آیۃ ﴿وَمَنْ یُوَلِّهِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ﴾ سے پکڑی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا، اور نبی کریم ﷺ کو بھی معاف کر دینے اور ان کیلئے بخشش طلب کرنے کا حکم دیا، خیال رہے کہ علامہ رازی رحمہ اللہ کا موقف بھی یہی ہے اسی لئے آخر میں ذکر کیا "وذلک من ادل الدلائل علی ما ذکرنا" یہ دلیل ہماری بہت قوی دلیل ہے جو ہم نے احد سے پسپا ہونے والوں کو گناہ کبیرہ کا مرتکب قرار دیا ہے۔ (کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۵)

اگر چہ راقم کا ذہن اسکے خلاف ہے جو سابقہ اوراق میں سمجھ آ سکتا ہے، لیکن راقم سلف صالحین کی تحقیق

بحثوں پر بیخ پا بھی نہیں ہوتا، کہاں علامہ رازی رحمہ اللہ کہاں میرے جیسا، ہیچمدان ناقل جو آپ کے ارشادات کو کما حقہ ادا بھی نہ کر سکے، اللہ تعالیٰ سلف صالحین کے خلاف لب کشائی سے محفوظ رکھے۔ (راقم)

فائدہ جلیلہ:

فدلت هذه الآية على انه تعالى يشفع محمدا ﷺ في الدنيا في حق اصحاب الكبائر فبان يشفعه في حقهم في القيامة كان أولى"

یہ آیۂ کریمہ اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو آپ کی امت کیلئے دنیا میں شفاعت کرنے والا بنایا، اسی لئے فرمایا "وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ" اور آپ ان کیلئے بخشش طلب کریں، تو اسی سے واضح ہو گیا کہ قیامت کے دن اور بھی زیادہ آپ کو شفاعت کا حق حاصل ہوگا۔ (ماخوذ از کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۵)

ترتیب عجیب:

پہلے اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کرنے کا ذکر ان الفاظ مبارکہ سے ﴿وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ﴾ اور تحقیق اللہ نے ان کو معاف کر دیا، پھر نبی کریم ﷺ کو ان کیلئے بخشش طلب کرنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا "وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ" ان کیلئے بخشش طلب کرو۔

كأنه قيل له يا محمد استغفرلهم فاني قد غفرت لهم قبل ان تستغفرلهم واعف عنهم فاني قد عفوت عنهم قبل عفوك عنهم" وهذا يدل على كمال رحمة الله لهذه الامة وثالثها قوله تعالى وشاورهم في الأمر"

گویا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا اے محمد ﷺ آپ ان کیلئے بخشش طلب کرو، بیشک میں نے ان کی بخشش آپ کی ان کیلئے بخشش طلب کرنے سے پہلے ہی کر دی، اور آپ ان کو معاف کر دو، میں نے ان کو آپ کے معاف کرنے سے پہلے ہی معاف کر دیا، اس کے بعد تیسرے مرتبہ میں مشورہ کرنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ ان سے امور میں مشورہ کرو، مشورہ کرنے کے ذکر سے پہلے ایک اہم ذکر ضروری ہے۔ (ماخوذ از کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۵)

نرمی کر کے حقوق اللہ کو ضائع کرنا جائز نہیں:

العين والرفق انما يجوز اذالم يفض الى اهمال حق من حقوق الله فاما اذا أدى الى ذلك لم يجز"

دین میں اس طرح نرمی کرنا حرام ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے حقوق کو چھوڑنا لازم آئے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

﴿یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمَصِیْرُ﴾

اے غیب بتانے والے (نبی) کافروں پر اور منافقوں پر جہاد کرو اور ان پر سختی فرماؤ اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اور کیا ہی برا انجام۔ (سورۃ التحریم، آیۃ نمبر ۹)

رب تعالیٰ نے اور ارشاد فرمایا:

﴿اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْیَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾

(سورة النور، آیة نمبر ۲)

جو عورت بدکار ہو اور جو مرد تو ان میں ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ اور تمہیں ان پر ترس نہ آئے اللہ کے دین میں اگر تم ایمان لاتے ہو اللہ اور پچھلے دن پر اور چاہیے کہ ان کو سزا کے وقت مسلمانوں کا ایک گروہ حاضر ہو۔

(منقول از کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۲)

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ﴾ ''اور آپ مشورہ کریں ان سے کاموں میں۔''

''شَاوِرْهُمْ یشاور مشاروۃ شوارا'' اس کا معنی ماخوذ ہے ''شرت العسل'' سے اس کا مطلب ہے میں نے شہد نکالا، اسی کے مطابق اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ ہے ''اور کاموں میں ان سے مشورہ لو'' اور کبھی اس کا معنی لیا جاتا ہے ''شرت الدابۃ شوارا'' جب تم چوپائے کو کسی جگہ پیش کرو، تو اس وقت کہا جاتا ہے ''کانہ بالعرض یعلم خیرہ وشرہ'' یعنی جب چوپائے کو کسی جگہ لے جاؤ (چرانے وغیرہ کیلئے) تو اس جگہ کا اچھا ہونا یا اچھا نہ ہونا پتہ چل جاتا ہے اسی طرح

''فکذلک بالمشاورۃ یعلم خیر الأمور وشرھا''

مشورہ کرنے سے کاموں کی اچھائی اور برائی کا پتہ چلتا ہے۔

راقم نے اسی کے مناسب ترجمہ کیا ہے ''اور آپ مشورہ کریں ان سے کاموں میں۔

مشورہ نہ کرنے والے حاکم کو معزول کر دیا جائے:

قال ابن عطیۃ والشوری من قواعد الشریعۃ وعزائم الاحکام من لایستبشر اھل العلم والدین فعزلہ واجب، ھذا مالا خلاف فیہ''

ابن عطیہ رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ مشورہ کرنا شرعی قوانین سے ہے اور احکام میں پختہ ارادہ کرنے کا ذریعہ ہے جو شخص علماء اور دیندار لوگوں سے مشورہ نہیں کرتا ایسے شخص کو معزول کر دینا واجب ہے، اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں رب تعالی نے مؤمنین کی مدح اپنے اس قول سے فرمائی:

﴿وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوْا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ (سورة الشورى آية نمبر ۳۸)

اور وہ جنہوں نے اپنے رب کا حکم مانا اور نماز قائم رکھی اور ان کا کام ان کے آپس کے مشورہ سے ہے، اور ہمارے دیئے سے کچھ ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

مشورہ کرنے کی اہمیت سورۃ پاک کے نام سے ہی سمجھ آ رہی ہے، کہ اس ایک مضمون کی وجہ سے پوری سورۃ کا نام ہی الشوری رکھ دیا گیا۔ (راقم)

ایک اعرابی کہہ رہا تھا "ما غبنت قط حتی یغبن قومی" مجھے غبن نہیں کیا جائے گا جب تک میری قوم کو غبن نہ کیا گیا، یعنی مجھے بھٹکایا نہیں جا سکے گا جب تک میری قوم نہ بھٹک گئی، اس اعرابی سے پوچھا گیا اس کی وجہ کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا "قال لا افعل شیئا حتی اشاورهم" میں اس وقت تک کوئی کام نہیں کرتا یہاں تک کہ اپنی قوم سے میں مشورہ کر لیتا ہوں۔ (قرطبی جلد ۴ صفحہ نمبر ۲۵۰)

مشاورات کا عظیم قانون:

وقال ابن خويز منداد واجب على الولاة مشاورة العلماء فيما لا يعلمون ،وفيما اشكل عليهم من امور الدين، ووجوه الجيش فيما يتعلق بالحرب، ووجوه الناس فيما يتعلق بالمصالح، ووجوه الكتاب والوزراء والعمال فيما يتعلق بمصالح البلاد وعمارتها" (قرطبی جلد ۴ صفحه نمبر ۲۵۰)

ابن خویز منداد رحمہ اللہ نے فرمایا حکام کو جب مسائل کا علم نہ ہو، اور دینی مسائل کو سمجھنے میں انہیں مشکل درپیش آ رہی ہو تو ان پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ علماء کرام سے مشورہ کریں، اور جنگی امور کا مشورہ جنگ کرنے کے ماہرین سے کریں، اور نیکی کے کاموں اور ملک کے بہتری کے کاموں میں ملک کے سرکردہ نیک قبائل کے سردار آدمیوں سے مشورہ کرلے، اور ملک کو سنوارنے اور اس کی تعمیر و ترقی میں نیک عقلمند محررین اور عقلمند اور نیک وزراء اور نیک اور عقلمند حکومت میں کام کرنے والے عہدہ داروں سے مشورہ کر لے، بہت بڑا قانون سمجھ آ گیا کہ ماہر تعلیم سے تعلیمی امور کا مشورہ کر

لے، لیکن وہ تعلیم جو دین سے برگشتہ نہ کرے، دین سے دور صرف انگلش کے دلدادہ لوگوں نے آج ملک کو تباہی کے کنارہ پر کھڑا کر دیا، دین سے ناواقف لوگ آج یوں کہہ رہے ہیں، ہنود، یہود، قادیانی و عیسائی اور مسلم، سب ہی تو ہیں آپس میں بھائی بھائی، کاش کہ یہ لوگ سمجھیں کہ نبی کریم ﷺ نے صرف ایمان لانے والے اپنے دو چچا حضرت حمزہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو اپنے قریب کیا اور باقی کفار چچاؤں میں سے کسی کو اپنے قریب نہیں کیا، ہاں ہاں بات صرف یہی ہے۔

جس کے حضور ہو گئے اس کا زمانہ ہو گیا　　لپٹا جو دامن مصطفیٰ سے وہ یگانہ ہو گیا

آیئے دیکھئے اسی کا دوسرا رخ یہ ہے۔

وہ یوں ہی در بدر خوار پھرتے ہیں　　جو تجھ سے یار پھرتے ہیں

غرضیکہ ہر ماہر فن سے اس کے نیک تجربہ کار سے مشورہ لے (راقم) اور مشورہ دینے والا بھی نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی "المستشار مؤتمن" (جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امین ہے) کے مطابق مشورہ دینے کو امانت سمجھ کر اپنی سمجھ اور صوابدید کے مطابق ہی مشورہ دے "ماندم من استشار (رواه الطبرانی) جس شخص نے مشورہ طلب کیا وہ اپنے فعل میں نادم (پشیمان) نہیں ہوتا، اور بیان کیا جاتا ہے "من اعجب برأیہ ضل" جس نے صرف اپنی رائے پر ہی تعجب کیا وہ بھٹک گیا

"قال العلماء وصفة المستشار ان کان فی الاحکام ان یکون عالمادیّناوقلمایکون ذلک الا فی عاقل"

علماء نے بیان فرمایا کہ جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ عالم ہو اور دیندار ہو، یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب وہ عقلمند ہو۔

"قال الحسن ما کمل دین امرئی مالم یکمل عقله" حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس وقت تک کسی انسان کا دین مکمل نہیں ہوتا جب تک اس کا عقل کامل نہ ہو۔　(قرطبی جلد ۴ صفحہ نمبر ۲۵۰)

مشورہ میں خطاء کے واقع ہونے پر کوئی پکڑ نہیں:

فاذا استشیر من هذا صفته واجتهد فی الصلاح وبذل جهده فوقعت الاشارة خطاء فلا غرامة علیه قاله الخطابی وغیره.

علامہ خطابی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ جس سے مشورہ طلب کیا گیا اگر اس میں صفات مذکور پائی گئیں، اس نے مشورہ دینے میں پوری جد وجہد کی لیکن اس سے غلطی واقع ہو گئی تو اسے کسی قسم کا کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔

دنیاوی کاموں میں مشیر کیسا ہو؟

دنیاوی کام ہوں یا دینی ہوں جس سے مشورہ طلب کیا جائے اس کیلئے نیک ہونا دیندار ہونا ضروری ہے "وصفة المتشار فی امور الدنیا ان یکون عاقلا مجربا" دنیاوی کاموں کیلئے جس شخص سے مشورہ طلب کیا جائے اس کا عقلمند ہونا اور اس کام میں اسے تجربہ حاصل ہونا ضروری ہے جس کی کچھ مثالیں بیان کی جا چکی ہیں "وقال بعضهم شاور من جرب الامور فانه یعطیک من رأیه ما وقع علیه غالبا و انت تأخذه مجانا" بعض حضرات نے بیان کیا ہے جن کاموں کا کسی کو تجربہ ہو اسی سے مشورہ لیا جائے، اسلئے کہ وہ اپنے تجربات سے تمہیں اچھی رائے دے گا اور تم اس سے مفت ہی اس کی اچھی رائے سے فائدہ حاصل کرلو گے "شاور صدیقک فی الخفی المشکل واقبل نصیحة ناصح مفضل" اگر کسی کام میں خفاء پائی جائے یا تمہیں مشکل درپیش آئے تو اپنے دوست سے مشورہ کرلو اور فضیلت رکھنے والے صاحب کی نصیحت کو قبول کرلو

"وان باب امر علیک التوی فشاور لبیبا ولا تعصه"

اگر کسی کام کا دروازہ تم پر اٹک جائے، تو عقلمند شخص سے مشورہ کرو اور اس کی نافرمانی نہ کرو۔ (ماخوذ از قرطبی جلد صفحہ نمبر ۲۵۱)

مشاورات میں عظیم برکت ہے:

❁ قال ﷺ ماندم من استشار ولا خاب من استخار" نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے مشورہ کیا وہ پشیمان نہیں ہوا، اور جس نے استخارہ کیا وہ رسوا نہیں ہوا۔

❁ وروی سهل بن سعد الساعدی عن رسول الله ﷺ ما شقی قط عبد بمشورة وما سعد باستغناء رأی"

سہل بن ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مشورہ کرنے والا شخص بدبخت نہیں ہوتا، اور اپنی رائے سے عمل کرنے والا (مشورہ نہ کرنے والا) نیک بخت نہیں ہوتا۔

❁ وقد جعل عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ الخلافة وهی اعظم النوازل شوری"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کارناموں سے عظیم کارنامہ یہ ہے کہ اپنی شہادت سے پہلے شدید زخمی حالت میں مشاورتی کمیٹی قائم کردی کہ یہ خلافت کا معاملہ آپ لوگ باہمی مشورہ سے طے کرلو، اس مشاورتی کمیٹی میں آپ نے اپنے بیٹے کو نہیں رکھا تاکہ یہ سلسلہ موروثی نہ ہو جائے، بادشاہت قائم نہ ہو جائے۔

❁ قال البخاری وکانت الائمة بعد النبی یستشیرون الأمنا من اهل العلم فی الامور

المباحة لیاخذوا باسھلھا"
بخاری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ائمہ کرام حکام، خلفاء کرام مباح کاموں میں امین علماء کرام سے مشورہ کرتے تھے تاکہ آسان پر عمل کریں اور مشکل کو چھوڑ دیں۔

❁ وقال سفیان الثوری لیکن اھل مشورتک اھل التقوی والامانة ومن یخشی اللہ تعالی"
حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا تم اپنے مشورہ کیلئے متقی، پرہیزگار، امانت دار اور اللہ تعالی سے ڈرنے والوں کا انتخاب کرو۔

❁ وقال الحسن واللہ ما تشاور قوم بینھم الا ھداھم لأفضل ما یحضربھم"
حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں قسم ہے اللہ تعالی کی کہ مشورہ کرنے والی قوم کو اللہ تعالی نے ضرور ہدایت سے نوازا مشورہ کرنے سے ان کی رائے سے زیادہ فضیلت والا کام کرنے کی توفیق حاصل ہوئی۔

❁ روی عن علی بن ابی طالب ؓ قال قال رسول اللہ ﷺ ما من قوم کانت لھم مشورة فحضر معھم عن اسمه احمد او محمد فادخلوہ فی مشورتھم الاخیرلھم"
حضرت علی بن طالب ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب بھی کوئی قوم مشورہ کیلئے جمع ہوں تو اس میں ان لوگوں کو ضرور شامل کرلیا کرو جن کے ناموں میں محمد، احمد آئے تو اللہ تعالی ان لوگوں کو اس مشورہ میں ضرور ہی خیر و برکت عطاء فرمائے گا۔ (ماخوذ از قرطبی جلد ۴ صفحہ نمبر ۲۵۱)

نبی کریم ﷺ کو مشورہ کرنے کا حکم دینے میں حکمت:

اگرچہ اس میں کئی حکمتیں پائی گئی ہیں، لیکن ان میں سے عظیم حکمت یہ ہے۔

(۱) قال الحسن وسفیان بن عینة انما امر بذلک لیقتدی به وغیرہ فی المشاورة ویصیرسنة فی امة"
ان تمام وجوہ سے **راقم** کو یہ وجہ عظیم نظر آئی جو حضرت حسن بصری اور سفیان بن عیینہ رضی اللہ عنہما نے ذکر فرمائی کہ آپ کو صحابہ کرام سے مشورہ کرنے کا حکم دیا کہ آپ کی اقتداء اور لوگ بھی کریں، اور آپ کی امت کیلئے مشورہ کرنا سنت بن جائے، یعنی آپ کو مشورہ کرنے کا حکم تعلیم امت کیلئے تھا۔

(۲) ان مشاورة الرسول ﷺ ایاھم توجب علوشانھم ورفعة درجتھم وذلک یقتضی شدةمحبتھم له وخلوصھم فی طاعتھم"
نبی کریم ﷺ کو صحابہ کرام سے مشورہ کرنے کا حکم دے کر یہ واضح کر دیا کہ صحابہ کرام کو عظمت شان حاصل

ہے ان کے درجات میں بلندی پائی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کو نبی کریم ﷺ سے شدید محبت حاصل تھی، اور وہ آپ کی فرمانبرداری بہت خلوص و محبت سے کرتے تھے۔

(۳) نبی کریم ﷺ کو سب لوگوں سے کامل عقل حاصل تھی، مگر یہ کہ مخلوق کے علوم متناہی ہیں، ہوسکتا ہے کہ آپ کو امت کے فائدے کیلئے یہ حکم دیا گیا تھا کہ جب آپ کو اعلیٰ عقل حاصل ہے تو جن سے مشاورت کا حکم دیا گیا ہے ہوسکتا ہے کسی کو زیادہ تجربہ ہو، وہ اس تجربہ کی وجہ سے جو رائے دے اس میں دوسروں کا فائدہ ہو، تو آپ بھی بہتر سمجھیں تو تجربہ کار کی رائے کو تسلیم کرلیں۔

(۴) نبی کریم ﷺ نے غزوہ احد کا مشورہ کیا تو نوجوان صحابہ کرام اور شہادت سے سرشار حضرات نے میدان جنگ میں نکلنے کا مشورہ دیا، خود نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں رہ کر دفاعی جنگ کرنا چاہتے تھے "فلما خرج وقع ما وقع" جب آپ صحابہ کرام کے مشورہ سے میدان جنگ میں تشریف لے گئے وہاں نبی کریم ﷺ کا زخمی ہونا، ستر صحابہ کرام کا شہید ہونا، اور بہت صحابہ کرام کا زخمی ہونا جیسے واقعات درپیش آگئے، تو اس کے بعد اگر آپ صحابہ کرام سے مشورہ چھوڑ دیتے تو ان کے دلوں میں یہ بات آتی کہ غزوہ احد میں جو ہم نے مشورہ دیا تھا وہ نبی کریم ﷺ کی رائے کے خلاف تھا، اسی وجہ سے آپ نے ہم سے مشورہ کرنا چھوڑ دیا، اس طرح ان کے دل پریشان ہوئے۔

"فامره الله تعالى بعد تلك الواقعة بان يشاورهم ليدل على انه لم يتق في قلبه اثر من تلك الواقعة"

تو اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کے بعد نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ آپ اپنے صحابہ کرام سے مشورہ جاری رکھیں تا کہ ان کے دل سے یہ اثر ختم ہوجائے کہ شائد آپ ان سے اس کے بعد کبھی مشورہ نہیں کریں گے۔

(۵) **"وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ" لا لتستفيد منهم رأيا وعلما لكن لكي تعلم مقادير عقولهم وافهامهم ومقادير حبهم لك واخلاصهم في طاعتك فحينئذ يتميز عندك الفاضل من المفضول فبين لهم على قدر منازلهم"**

نبی کریم ﷺ کو جو مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ان کی رائے اور علم سے فائدہ حاصل کرنے کے محتاج تھے، بلکہ آپ کو اس لئے حکم دیا گیا کہ آپ اپنے صحابہ کرام کی عقلوں اور سمجھوں کا اندازہ کریں وہ بھی ایک دوسرے کی عقل و فہم کا اندازہ کرلیں، پھر آپ یہ بھی دیکھیں کہ وہ آپ سے کتنی قدر محبت کرتے ہیں، اور آپ کی اطاعت میں کتنے مخلص ہیں، اس طرح صحابہ کرام کے مدارج و مراتب واضح ہوجائیں گے کہ زیادہ مرتبہ والا کون ہے اور کم مرتبہ والا کون ہے۔

(۶) **وشاورهم في الامر لا لأنك محتاج اليهم ولكن لأجل انك اذا شاورتهم في الأمر**

اجتهد كل واحد منهم في استخراج الوجه الا صلح في تلك الواقعة فتصير الارواح متطابقة متوافقة على تحصيل اصلح الوجوه فيها وتطابق الارواح الظاهرة على الشئى الواحد مما يعين على حصوله وهذا هوالسر عند الاجتماع في الصلوات وهو السر في ان صلوة الجماعة افضل من صلوة المنفرد"

آپ کو مشورہ دینے کا حکم اس لئے نہیں دیا گیا کہ آپ کو ان کے مشورہ کی کوئی محتاجی تھی، بلکہ وجہ یہ تھی کہ آپ جب ان سے مشورہ طلب کرو گے تو ہر ایک اپنی رائے پیش کرنے میں مکمل اجتہاد کرے گا، پوری کوشش سے اس کام کیلئے بہتر رائے دے گا، اس طرح تمام روحوں، تمام شخصوں کا ایک کام کرنے میں اتفاق ہو جائے گا، جب نیک روحیں ایک کام میں متفق ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان نیک لوگوں کے اتفاق کی وجہ سے اس کام میں خیر و برکت حاصل ہوگی، یہی راز پایا گیا ہے اس میں کہ نمازوں کو سب مجتمع ہو کر ادا کرو، اور یہی راز یہی فائدہ اس سے حاصل ہوا کہ اکیلے نماز ادا کرنے سے جماعت سے نماز ادا کرنا زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔

(۷) لما امر الله محمدا عليه السلام بمشاورتهم دل ذلك على ان لهم عند الله قدرا وقيمة فهذايفيدان لهم قدراعندالله وقدراعندالرسول وقدراعندالخلق"

جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ آپ اپنے صحابہ کرام سے مشورہ کریں تو اسی سے پتہ چل گیا کہ صحابہ کرام کو اللہ تعالیٰ کے ہاں خصوصی قدر و منزلت پائی جاتی ہے، اور اسی سے یہ عظیم فائدہ حاصل ہو گیا کہ جن کی قدر و منزلت اللہ تعالیٰ کے حضور ہے، ان کو رسول اللہ ﷺ کے ہاں بھی خصوصی قدر و منزلت حاصل ہے ان کی قدر و منزلت مخلوق کے دلوں میں بھی راسخ ہو چکی ہے۔

راقم کہتا ہے اے طلباء کرام! "الخلق" پر الف لام عہد خارجی ہے، جس سے مراد نیک مخلوق، علم والی مخلوق، طاہر روح والی مخلوق، پاک اصل مخلوق ہے۔ بدطینت، جہلاء مراد نہیں، اے بدبخت انسان! خدارا خدا اور رسول سے مقابلہ کر کے اپنی عاقبت برباد نہ کر، صحابہ کرام کی گستاخی سے اپنی قبر انگاروں سے نہ بھر۔

(۸) عظیم بادشاہ بڑے بڑے اہم کاموں میں مشورہ صرف اپنے خواص اور مقربین سے کرتا ہے، صحابہ کرام سے اگرچہ اجتہادی خطاء ہوئی، وقتی طور پر پسپا بھی ہوئے لیکن جب انہوں نے رب تعالیٰ کی طرف رجوع کیا تو رب تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا، معاف کرنے کے بعد یہ بات ان کے دلوں میں آ سکتی تھی کہ اگرچہ ہمیں معاف تو کر دیا گیا ہے لیکن ہمارا وہ مرتبہ اور درجات پہلے حاصل تھے، وہ تمام ختم ہو چکے ہوں گے، تو رب تعالیٰ نے ان کو تسلی ہوئے فرمایا کہ میں نے تمہیں معاف کر دیا کیونکہ تم نے میری طرف رجوع کر لیا تو تمہارے مراتب کم نہیں کئے بلکہ اور زیادہ کر دیئے ہیں۔

"وذلک ان قبل هذہ الواقعة ماامرت رسولی بمشاورتکم وبعد هذا الواقعة امرته بمشاورتکم لتعلموا الکم الآن اعظم حالا مما کنتم قبل ذلک والسبب فیه الکم قبل هذہ الواقعة کنتم تعولون علی اعمالکم وطاعتکم والآن تعولون علی فضلی وعفوی فیجب ان تصیر درجتکم ومنزلتکم الآن اعظم مما کان قبل ذلک لتعلموا ان عفوی اعظم من عملکم وکرمی اکثر من طاعتکم"

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس واقعہ سے پہلے میں نے اپنے رسول (ﷺ) کو تمہارے ساتھ مشورہ کرنے کا حکم نہیں دیا تھا لیکن اس واقعہ کے بعد آپ کو تمہارے ساتھ مشورہ کرنے کا حکم دے دیا ہے، تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اب تمہارا حال اور مرتبہ پہلے سے بڑھ گیا ہے، کیونکہ پہلے تم اپنے اعمال اور اپنی طاعت پر اعتماد کرتے تھے، اب تمہیں میرے فضل اور میرے معاف کرنے پر اعتماد ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے اب تمہارے درجات اور مراتب پہلے سے بڑھ چکے ہیں، تمہیں یقین آنا چاہیے کہ میرا معاف کرنا تمہارے اعمال سے بہت عظیم ہے، اور میرا اکرم تمہاری طاعت سے زیادہ ہے۔

(ماخوذ از کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۷)

نبی کریم ﷺ کو امت سے مشاورت کب منع تھی؟

اتفقوا علی ان کل مانزل فیه وحی من عندالله لم یجز للرسول ان یشاور فیه الامة لأنه اذا جاء النص بطل الرأی والقیاس"

اس مسئلہ میں اہل علم کا اتفاق ہے، کسی کا کوئی اختلاف نہیں کہ جن احکام کو وحی کے ذریعے بیان فرما دیا ان میں رسول اللہ ﷺ کو امت کے حضرات سے مشورہ کرنا جائز نہیں تھا، کیونکہ نص (وحی کے ذریعے حکم قرآنی) کے آجانے کے بعد رائے، قیاس مشاورت باطل ہو جاتے ہیں۔ (کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۷)

مقام توجه: اس حکم سے پہلے بدر میں نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا، یقیناً وہ مشورہ بھی رب تعالیٰ کے مرضی کے مطابق ہی تھا، کیونکہ ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى﴾ کا وصف آپ کو حاصل تھا، خندق میں غطفان قبیلے سے صلح نہ کرنے کا مشورہ سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما کا نبی کریم ﷺ کا قبول فرمایا ﴿فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ﴾ ارشاد باری تعالیٰ، قیاس کرنے کا حکم دیتا ہے "وکان علیه الصلوة والسلام اولی الابصار" جب نبی کریم ﷺ بصیرت رکھنے والوں کے سردار ہیں تو یہ حکم آپ کیلئے بھی تھا، پھر استنباط کرنے والوں کی شان رب تعالیٰ نے بیان فرمائی۔

﴿لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ﴾ وکان اکثر الناس عقلا وذکاء وهذا یدل علی انه

كان ماموزا بالاجتهاد اذا لم ينزل عليه الوحي"

نبی کریم ﷺ سب لوگوں سے جب زیادہ عقلمند اور ذکی وذہین تھے تو یقیناً آپ کو بھی قیاس، استنباط واجتہاد کرنے کا حکم تھا، البتہ شرط یہی تھی کہ اس میں وحی نازل نہ ہوئی ہو، وحی کے نازل ہونے کے بعد قیاس یا مشاورت جائز نہیں تھا۔ (ماخوذ از کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۷)

علماء کرام اور طلباء کرام کیلئے لمحہ فکریہ:

قوله تعالى (وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ) يدل على وجوب استعمال اللين والرفق وترك الفظاظة والغلظة فى الدعاء الى الله تعالى كما قال الله تعالى (ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ) وقوله تعالى لموسى وهارون "فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا" لَعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ"

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی: ﴿وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (اگر آپ سخت مزاج اور سخت دل ہوتے تو وہ آپ کے اردگرد سے ہٹ جاتے) اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف جب کسی کو بلایا جائے تو اس شخص کیلئے واجب ہے کہ وہ نرم لہجہ، نرم رویہ، نرم طبیعت رکھتے ہوئے دعوت دین اسلام دیں، سخت مزاجی، سخت دلی کو چھوڑ دیں، اللہ تعالیٰ نے خود ہی اپنی راہ کی طرف بلانے کا طریقہ بتا دیا، (ترجمہ) اپنے رب کی راہ کی طرف بلاؤ پکی تدبیر اور اچھی نصیحت سے اور ان سے اس طریقہ پر بحث کرو جو سب سے بہتر ہو اور رب تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرمایا (ترجمہ) تو اس سے نرم بات کہنا اس امید پر کہ وہ دھیان کرے یا کچھ ڈرے۔

جب رب تعالیٰ نے دین اسلام کی تبلیغ کو نرمی اور اچھی نصیحت سے مشروط کر دیا ہے تو آئے دن مسائل میں جنگ وجدال کیوں؟ غلیظ زبانوں کا استعمال کیوں؟ جہلاء سے تقاریر کرانے کا رواج کیوں؟ (احکام القرآن للجصاص جلد ۲ صفحہ نمبر ۴۰)

علماء کرام! خدارا سوچیے تمہیں خریدنے والے یہود ونصاریٰ کے ایجنٹ ہیں، جو تمہیں لڑا رہے ہیں، وہ عقلمند ہیں جو اپنے مقاصد حاصل کر رہے ہیں، مجھے معاف کرتے ہوئے یوں کہنے دیجئے کہ بے وقوف وہی علماء وطلباء ہیں جو اغیار کے ہاتھوں کھلونا بنے ہوئے ہیں، ان کے ہاتھوں بک رہے ہیں جو ان کے بک بک کا ذریعہ بن رہا ہے، معمولی بات پر پورے پاکستان کے در و دیوار چاکنگ کر کے علماء کو لڑا کر قتل کرنے کا بہانہ بنایا جاتا ہے، علماء علماء کو نہیں قتل کر رہے بلکہ یہودیوں کے آلہ کار قتل کر کے ایک فرقہ کے مقتولوں کو دوسرے فرقہ کے ذمہ ڈال دیتے ہیں حالانکہ قاتل وہ خود ہوتے ہیں، علماء کرام اور طلباء کرام کی خدمت میں بصد ادب واحترام عرض ہے سمجھئے خدارا سمجھئے، اگر نہ سمجھے تو نیست

ونابود ہو جاؤ گے، قادیانیت چھا جائیگی، قادیانی دندنا رہے ہیں۔ (راقم)

مسئلہ عظیمہ:

فجائز حینئذ ان توافق آراؤھم رأی النبی وجائز ان یوافق رأی بعضھم رأیہ وجائز ان یخالف رأی جمیعھم فیعمل ﷺ حینئذ برأیہ یکون فیہ دلالۃ علی انھم لم یکونوا معتقین فی اجتہادھم بل کانوا مأمورین فیہ لفعلھم ما امروا بہ ویکون علیھم حینئذ ترک آرائھم واتباع رأی النبی ﷺ"

نبی کریم ﷺ جب صحابہ کرام سے مشورہ کرلیں تو ہوسکتا ہے کہ اس میں تمام صحابہ کرام کی بھی وہی رائے ہو اور بعض کی رائے آپ کی رائے کے موافق ہو، اور یہ احتمال بھی تھا کہ بعض کی رائے آپ کی رائے کے مخالف ہو اور بعض کی رائے آپ کی رائے کے موافق ہو، اور یہ احتمال بھی تھا کہ تمام کی رائے آپ کی رائے کے مخالف ہو، ان تمام صورتوں میں نبی کریم ﷺ کی رائے پر عمل کرنا ہی ضروری تھا، آپ کی رائے کو تائید ربانی حاصل تھی، صحابہ کرام اپنی رائے اور اجتہاد میں مکمل آزاد نہیں تھے، ان سے مشورہ کرنا اور ان کا اجتہاد کرنا ان کے اجر وثواب کیلئے تھا، اسی لئے صحابہ کرام کیلئے ضروری تھا کہ وہ اپنی آراء کو چھوڑ دیں اور نبی کریم ﷺ کی رائے کا احترام کریں اور اسی کی تابعداری کریں۔

(احکام القرآن للجصاص صفحہ نمبر ۴۱، جلد ۲)

دوحدیثوں میں تطبیق:

اخرجہ الامام احمد من قولہ ﷺ للعمرین رضی اللہ عنہما لواجتمعتما علی مشورۃ ما خالفتکما"

نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر اور حضرت ابوبکر ﷺ کو فرمایا اگر تم کسی مشورہ پر متفق ہو جاؤ تو میں اس کی مخالفت نہیں کروں گا۔

"واخرجہ ابن عدی والبیھقی من قولہ علیہ الصلوۃ والسلام عند نزول الآیۃ" اما ان اللہ ورسولہ یغنیان عنھا ولکن جعلھا اللہ تعالی رحمۃ لامتی"

جب اس آیۃ کریمہ میں نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ (آپ ان سے مشورہ کرو کاموں میں) تو اس کے نازل ہونے پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا "خبردار اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ دونوں ہی لوگوں سے مشاورت سے مستغنی ہیں، وہ محتاج نہیں، لیکن اللہ تعالی نے میری امت پر رحمت فرمائی کہ ان سے مشورہ کرنے کا

حکم دیا۔ بظاہران دونوں حدیثوں میں تعارض نظر آتا ہے کیونکہ پہلی حدیث پاک سے یہ سمجھ آرہا ہے کہ جب کسی مسئلہ میں حضرت ابوبکراور حضرت عمر رضی اللہ عنہما متفق ہو جائیں تو نبی کریم ﷺ اس مشورہ کوضرور مانتے ،دوسری حدیث سے سمجھ آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کسی کے مشورہ کے نہ محتاج تھے اور نہ پابند تھے،ان میں تطبیق یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اگر چہ کسی کے مشورہ کوقبول کرنے کے پابند نہ تھے،لیکن

"یحمل خبر عدم مخالفتهما لو اجتمعا علی الاشارة الی رفعة قدرهما وعلوشانهما وان اجتماعهما علی امر لایکون الاموافقا لما عندالله تعالی وهوالذی علیه المعول وبه العمل"

حضرت ابوبکراور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی قدرومنزلت کی بلندی اور رفعت شان کا یہ عالم تھا کہ اگر وہ کسی کام پر اتفاقی رائے قائم کر لیتے تو وہ اللہ تعالی کے ہاں مقبول ہوتا،اسی پر اعتماد کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے ان کے اتفاقی فیصلے کوقبول کیا،اور کبھی مخالفت نہیں کی۔(ماخوذازروح المعانی جلد۳صفحہ نمبر۱۰۷)

خیال رہے کہ حضرت ابوبکراور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے اجتماعی مشورے کوقبول کرنا غزوہ احد میں واقع نہیں ہوا،یہی رائے علامہ رازی رحمہ اللہ نے کبیر میں بیان کی ہے،آپ رقمطراز ہیں۔

"روی الواحدی فی الوسیط عن عمرو بن دینار عن ابن عباس انه قال الذی امر النبی ﷺ بمشاورتهم فی هذه الآیة هم الذین أمره بأن یعفو عنهم ویستغفرلهم وهم المنهزمون فهذا باطل ان عمر کان من المنهزمین فدخل تحت الآیة الاان ابابکر ماکان منهم فکیف یدخل تحت هذه الآیة ،والله اعلم" (کبیر جلد ۹ صفحه نمبر۶۷)

علامہ واحدی رحمہ اللہ نے وسیط میں عمرو بن دینار کی روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کوحضرت ابوبکراور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ کرنے کا حکم دیا،لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میرے نزدیک اس میں اشکال ہے،اسلئے کہ اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالی نے ان حضرات سے مشورہ کرنے کا حکم دیا جن کومعاف کرنے کا حکم دیا اوران کیلئے بخشش طلب کرنے کا حکم دیا،یہ وہ لوگ تھے جو پسپا ہونے والے تھے،حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تو ثابت رہنے والوں میں سے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ قریب پہاڑ پر چڑھ گئے تھے،کیا آپ دفاع کی خاطر گئے تھے،یا کہ پسپا ہونے والوں میں تھے،اگر پسپا ہونے والوں میں تھے تو آپ بھی ان لوگوں میں داخل تھے جن سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا۔

❀ وعن ابن عمر کتب ابو بکر ان رسول الله ﷺ کان یشاور فی الحرب فعلیک به" (مظہری جلد۲صفحہ نمبر۱۶۱)

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ کی طرف لکھا کہ نبی کریم ﷺ جنگوں میں تمہارے ساتھ مشورہ کرتے تھے، اس لئے تم بھی اپنے کاموں میں مشورہ جاری رکھو۔

❁ عن عائشه رضی الله عنها انها قالت ما رأیت رجلا اکثر استشارة للرجال من رسول اللهﷺ" (معالم التنزیل للبغوی بالاسناد جلد ۱ صفحه نمبر ۳۶۶)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کوئی اور شخص نہیں دیکھا جس نے اپنے معاملات میں دوسروں سے مشورہ کیا ہو، یعنی سب لوگوں سے زیادہ اپنے معاملات میں رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کرام سے زیادہ سے زیادہ مشورہ فرماتے تھے۔

﴿فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾

"تو جب آپ پکا ارادہ کرلو تو توکل (بھروسہ) رکھو اللہ پر۔"

(فَاِذَا عَزَمْتَ) فاذا قطعت الرأی علی شئی بعد الشوری (فتوکل علی الله) فی امضاء امرک علی الارشد لا علی المشورة" (مدارک التنزیل للنسفی)

مشورہ کے بعد جب کسی کام پر تمہاری رائے پختہ ہو جائے اور وہ کام کرنے کا تم پختہ ارادہ کرلو تو اس کام کے کرنے پر صرف مشورہ پر کامل اعتماد نہ رکھنا، بلکہ اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ رکھنا کہ وہی تمہاری راہنمائی فرمائے گا، اور تمہارے کاموں کو بخوبی سرانجام دے گا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ﴾ "بیشک اللہ محبت رکھتا ہے توکل کرنے والے سے۔"

اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنے کا مطلب:

"فوض امرک الیه واعتمد علیه" یعنی اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دو اور اس پر اعتماد رکھو، یہی وجہ ہے کہ غزوہ احد کے متعلق صحابہ کرام سے جب آپ نے مشورہ کیا تو صحابہ کرام نے احد میں جانے کا مشورہ دیا، آپ مدینہ طیبہ میں رہ کر دفاعی جنگ کرنا چاہتے تھے، لیکن آپ نے ہتھیار جب زیب تن کر لئے یعنی اپنے جسم مبارک کے ساتھ ہتھیار لگا لئے تو صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ مدینہ طیبہ میں رہ کر دفاعی جنگ کریں لیکن آپ نے فرمایا "لاینبغی لنبی ان یلبس لامته فیضعها" کسی نبی کی شان کے لائق نہیں کہ وہ اپنے ہتھیار زیب تن کرلے تو پھر ان کو اتار دے، آپ کے اس ارشاد کی تائید میں ہی رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ جب آپ کام کرنے کا پختہ ارادہ کرلو تو اللہ پر بھروسہ رکھو، یعنی اعتماد صرف رب تعالیٰ پر ہو، نہ اپنی رائے پر ہو اور نہ ہی مشورہ پر کامل

بھروسہ ہو، اسلئے کہ مشورہ دینے والے اس کے انجام کو نہیں جانتے وہ صرف اپنے خیال کے مطابق بہتر مشورہ دیتے ہیں۔

"وقد یتخبط العقل فی النظر وقد یفعل اللہ تعالی علی خرق العادۃ فلاوجہ للاعتماد علی الاراء"

انسانی عقل بعض اوقات نظر وفکر میں پھسل جاتی ہے کہ اللہ تعالی کی عادات کے خلاف کام کر دیتا ہے، اس لئے انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی آراء پر کامل بھروسہ رکھے، بلکہ صرف اللہ تعالی پر توکل رکھے۔ (تفسیر مظہری جلد ۲ صفحہ نمبر ۱۶۲)

توکل بمعنی التجاء الی اللہ:

"والتوکل ان یلتجئی الی اللہ خاصۃ ویطلب منہ ان یجعل عاقبتہ سعیہ خیرا ویحسن الظن بہ فی ذلک"

توکل یہ ہے کہ صرف اللہ تعالی کو ملجاٗ (جائے پناہ) بنائے، اور اسی سے اپنی کوشش، اپنے اعمال کی جزاء طلب کرے، اور اسی پر کمال حسن ظن رکھے کہ وہی معطی ہے۔

توکل بمعنی عدم معصیت:

قیل التوکل ان لاتعصی اللہ من اجل رزقک" بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ توکل یہ ہے کہ رزق حاصل کرنے کیلئے اللہ تعالی کی نافرمانی نہ کرو، یعنی رزق حلال طلب کرنا توکل ہے، اور حرام طریقہ سے رزق حاصل کرنا رب تعالی پر بھروسہ نہ ہونے کے مترادف ہے۔

توکل بمعنی صرف اللہ تعالی سے طلب:

قیل معناہ ان لایطلب لنفسک ناصرا غیر اللہ ولا لرزقک خازنا غیرہ ولا لعملک شاھدا غیرہ"

توکل کا اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالی کے بغیر اپنا کوئی ناصر نہ بنایا جائے، اپنا رزق حاصل کرنے میں کسی اور کو خازن نہ سمجھا جائے، اپنے اعمال کا کسی اور کو کوئی شاہد نہ بنایا جائے۔

❁ **عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ یدخلون الجنۃ سبعون الفامن امتی بغیر حساب ،قیل یا رسول اللہ من ھم قال ھم الذین لا یکتوون ولا یسترقون ولا یتطیرون وعلی ربھم یتوکلون"** (بخاری ومسلم) کذاروی البغوی عن عمران بن حصین)

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں سے ستر ہزار لوگ جنت میں بغیر حساب کے داخل ہونگے۔ آپ سے پوچھا گیا یارسول اللہ ﷺ وہ کون لوگ ہوں گے آپ نے

فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جو جانوروں کو داغ نہیں دیں گے، جنتر منتر نہیں کریں گے فال نہیں نکالیں گے اپنے رب پر بھروسہ ہی رکھیں گے۔

❁ رعن عمربن الخطاب قال قال رسول الله ﷺلوانک تتوکلون علی حق توکله لرزقکم کم یرزق الطیر تغدواخماصاوتروح بطانا" (رواہ الترمذی وابن ماجه)

حضرت عمر بن الخطاب ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ پر کامل توکل (بھروسہ) رکھو تو اللہ تعالیٰ تمہیں رزق دے گا جس طرح پرندوں کو رزق دیا جاتا ہے صبح وہ بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر واپس لوٹتے ہیں۔

سوال: حضرت ابن عباس ؓ کی روایت سے تو پتہ چلتا ہے کہ ظاہری اسباب چھوڑ دینے کا نام توکل ہے حالانکہ ہم کتنے ہی اسباب کا سہارا لیتے ہیں تو کس طرح ان میں تطبیق ہے؟

جواب: "قلت لا بل ترک الاعتمادعلی الاسباب الاتری ان الاستیشار من باب التشبت بالاسباب فالله سبحانه امر بالاستشارة ثم امر ترک الاعتماد"

ظاہری اسباب سے مطلقاً منع نہیں فرمایا گیا بلکہ اسباب پر مکمل اعتماد سے منع کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ پہلے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا، پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کا حکم دیا، تو کہ مکمل اعتماد مشورہ پر ہی نہ کیا جائے۔

"وقوله علیه الصلوة والسلام فی الحدیث وعلی ربهم یتوکلون لیس تفسیرا لقوله لایکتوون ولا یسترقون فان العطف یقتضی المغائرة"

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ﴿وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ﴾ "لا یکتوون ولا یسترقون" کی تفسیر نہیں کیونکہ عطف مغائرۃ کو چاہتا ہے، حدیث شریف میں جن ستر ہزار کا ذکر ہے اس سے مراد بھی "لاتشبثون غالبا" وہ لوگ ہیں جو اسباب پر مکمل اعتماد نہیں کرتے ہوں گے، اسباب کے بغیر تو حیات ہی ممکن نہیں، کھانا، پینا حیات کے اسباب ہیں، نماز روزہ جنت کے اسباب ہیں۔ (مظہری جلد۲، ۱۶۲)

"دلت الآیة علی انه لیساالتوکل ان یهمل الانسان نفسه کما یقول بعض الجهال والا لکان الأمر بالمشاورة منافیا للأمر بالتوکل بل التوکل هو ان یراعی الانسان الاسباب الظاهرة ولکن لا یعول بقلبه علیها بل یعول علی عصمة الحق" (کبیر جلد۹ صفحہ نمبر ۶۸)

یہ آیۃ کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ اسے توکل نہیں کہا جاتا کہ انسان یونہی اپنے آپ کو بیکار چھوڑ دے جیسا کہ بعض جاہلوں کا کہنا ہے، مشورہ کرنے کا حکم ہی بتا رہا ہے کہ توکل اسے نہیں کہا جاتا کہ انسان ظاہری اسباب کو اختیار ہی نہ کرے بلکہ ظاہری اسباب کو اختیار کر کے ان پر مکمل اعتماد نہ کرے، محافظ کارساز اللہ تعالیٰ کو سمجھے۔

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ O (آیۃ نمبر ۱۶۰)

(1) اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا، اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو ایسا کون ہے جو پھر تمہاری مدد کرے اور مسلمانوں کو اللہ ہی کا بھروسہ چاہئے۔ (کنزالایمان)

(2) اگر مدد کرے تمہاری اللہ تو کوئی نہیں غالب آ سکتا تم پر، اور اگر چھوڑ دے تمہیں تو کون شخص ہو گا وہ جو امداد کرے گا تمہاری اس کے بعد، اور اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو۔ (نجوم الفرقان)

ماقبل سے تعلق:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رب تعالیٰ نے مؤمنین کو بدر اور احد کی یاد دلائی کہ اللہ تعالیٰ نے بدر میں تمہاری امداد فرمائی تو کافر تم پر غالب نہیں آ سکے، اسی طرح رب تعالیٰ کی طرف سے جب بھی تمہیں امداد حاصل ہوگی تم پر کوئی غالب نہیں آ سکے گا، لیکن احد میں تمہاری اپنی کوتاہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا تھا تو تم پر بظاہر کچھ دیر کیلئے کفار کا غلبہ ہو گیا، اسی طرح جب بھی رب تعالیٰ کا ساتھ تمہیں حاصل نہ رہا تو تمہاری امداد کرنے والا اور کوئی نہیں ہوگا۔ (کبیر بالوضاحۃ جلد ۹، صفحہ نمبر ۶۸)

آیۃ کریمہ میں ترغیب وترہیب پائی گئی:

یعنی نیکیوں کی طرف رغبت دلائی گئی، اور معصیت سے ڈرایا گیا۔ رب تعالیٰ نے بدر کی امداد کو صبر اور تقویٰ پر موقوف فرمایا، تقویٰ گناہوں سے بچنا ہے۔

رب تعالیٰ نے حکم فرمایا:

﴿بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ﴾ (سورۃ آل عمران، آیۃ نمبر ۱۲۵)

کیوں نہیں اگر تم صبر کرو تقویٰ کرو اور کافر اسی دم تم پر آ پڑیں تو تمہارا رب تمہاری مدد کو پانچ ہزار فرشتے۔

اب اس زیر بحث آیۃ کریمہ میں بیان کیا ﴿مَنْ نَّصَرَهُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَهٗ﴾ جس کی اللہ تعالیٰ امداد فرمائے اس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا" اب اس دونوں مقدموں سے نتیجہ یہ حاصل ہوا۔

"ان من اتقی اللہ فقد فاز بسعادۃ الدنیا والآخرۃ فانہ یفوز بسعادۃ لاشقاوۃ معھا وبعز لاذل معہ ویصیر غالبا لایغلبہ احد"

جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے، یعنی گناہوں کو چھوڑتا ہے وہ دنیا وآخرت میں سعادت حاصل کر لیتا ہے، وہ نیک بختی میں اس طرح کامیاب ہوتا ہے کہ اسے بدبختی حاصل نہیں ہوتی، اور اس طرح کی عزت حاصل ہوتی ہے کہ وہ ذلیل نہیں ہوتا۔ اسے اللہ تعالی ایسا غلبہ عطاء کر دیتا ہے کہ کوئی اس پر غالب نہیں آسکتا۔

"واما من اتی بالمعصیۃ فان اللہ یخذلہ ومن خذلہ اللہ فقدوقع فی شقاوۃ لاسعادۃ معھاوذل لاعزمعہ"

لیکن جو شخص گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے تو بیشک اللہ تعالی اسے رسوا کر دیتا ہے، جس کو اللہ تعالی رسوا کرتا ہے وہ بدبختی میں مبتلاء ہو جاتا ہے، اسے سعادت حاصل نہیں ہوتا، اور اللہ تعالی اسے ذلت عطاء کر دیتا ہے اسے کوئی عزت حاصل نہیں ہوتی۔ (کبیر ج۹ص۶۸)

"وان یخذلکم" خذل (ن) خذلا، خذلانا" مدد چھوڑنا۔ خذل (تفعیل) عنہ اصحابہ، کسی کو مدد نہ دینے کی ترغیب دینا، کسی کو پسپائی اور جنگ بند کرنے آمادہ کرنا۔ "خاذل مخاذلۃ" مدد چھوڑنا "تخاذل القوم" بعض کا بعض کی مدد چھوڑنا۔ (المنجد)

مسئلہ: اسی آیہ کریمہ سے اہل علم نے یہ دلیل پکڑی ہے۔

" ان الایمان لایحصل الاباعانۃ اللہ والکفر لایحصل الابخذلانہ، والوجہ فیہ ظاھر لانھا دالۃ علی ان الامر کلہ اللہ " (کبیر ج ۹ص۶۹)

ایمان صرف اللہ تعالی کی امداد سے حاصل ہوتا ہے، اور جب رب تعالی اس کی امداد نہ فرمائے تو اسے کفر حاصل ہوتا ہے۔ اسلئے کہ تمام امور، تمام کام اللہ تعالی کے ہی قبضۂ قدرت میں ہیں۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

(فمن ذاالذی ینصرکم من بعدہ) ای بعد خذلانہ ای فلاناصرلکم (جلالین) "قولہ ای بعد خذلانہ" اشار بذلک الی ان الاستفھام انکاری بمعنی النفی ولم یقل فلاناصرلکم اشارۃ لعدم تقنیطھم من النصر تلطفابھم ای فارجعوا الیہ ینصرکم قال تعالی (وکان حقاعلینا نصر المؤمنین) (صاوی ج ۱ ص ۱۶۶)

اگر اللہ تعالیٰ نے تمہاری امداد چھوڑ دی جیسے احد میں کچھ دیر کیلئے چھوڑ دیں تھی تو کون امداد کرے گا تمہاری اسکے بعد، یعنی اس کی امداد چھوڑ دینے کے بعد تمہاری امداد کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ مفسر رحمہ اللہ "مِنْ بَعْدِهٖ" کی تفسیر "بعد خذلانہ" سے کر کے اس طرف اشارہ کیا کہ یہاں حذف مضاف ہے۔ اور ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُكُمْ﴾ کی تفسیر "فلاناصر لکم" سے کر کے یہ بتایا کہ "یہ استفہام انکاری ہے نفی کے معنی میں ہے، البتہ یہ نہیں فرمایا "فلاناصر لکم" "تمہاری امداد کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ یہ درحقیقت اپنے بندوں پر مہربانی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم یہ خیال نہ کرنا کہ ہم کسی اور سے امداد طلب کرتے شائد کوئی امداد کر دیتا، نہیں نہیں بات اصل میں یوں ہے کہ جب رب تعالیٰ نے تمہاری امداد چھوڑ دی تو پھر کوئی اور امداد کر سکے گا ہی نہیں۔ لھذا تم رب تعالیٰ کی طرف ہی رجوع کرو وہی تمہاری امداد فرمائے گا، اس نے خود ہی ارشاد فرمایا ﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ ہم نے ثابت کر رکھا ہے اپنے ذمۂ کرم پر ایمان والوں کی امداد کرنا۔

﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾

''اور اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہئے ایمان والوں کو۔''

یعنی جب یہ ثابت ہو گیا کہ تمام امور اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں، اور بیشک جو وہ ارادہ فرماتا ہے اسی کے مطابق فیصلہ فرماتا ہے "ولا دافع لحکمہ" "اللہ تعالیٰ کے حکم اور فیصلہ کو کوئی ٹالنے والا نہیں" "وجب ان لا یتوکل المؤمن الا علیہ" تو ایمان والوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ پر توکل رکھیں۔

دینی طلباء کرام یہ مسئلہ بھی ذہن میں رکھیں:

وقولہ "وعلی اللہ فلیتوکل المؤمنون" یفید الحصر ای علی اللہ فلیتوکل المؤمنون لاعلی غیرہ" (کبیر ج ۹ ص ۶۹)

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں (وَعَلَى اللّٰهِ) ظرف پہلے ذکر کی گئی، اور فعل "فَلْيَتَوَكَّلْ" بعد میں، اس لئے تقدیم ظرف حصر کا فائدہ دے رہی ہے۔ اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے حصر کا ہی ترجمہ کیا ہے، راقم نے بھی وہی نقل کیا ہے اور اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہئے ایمان والوں کو۔

❁ وعن صیب قال قال رسول اللہ ﷺ عجبا لأمر المؤمن ان امرہ کلہ لہ خیر ولیس ذلک لاحد الا للمؤمن ان اصابتہ سراء شکر فکان خیرا لہ وان اصابتہ ضراء صبر

فکان خیر اله" (رواه مسلم،مشکوۃ باب التوکل والصبر)

حضرت صہیب فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مؤمن کے کاموں پر تعجب ہے کہ بیشک اس کا ہر کام ہی بہتر ہے، سوائے مؤمن کے کسی اور کو یہ مقام حاصل نہیں، اس لئے کہ اگر اسے خوشی پہنچے تو وہ شکر کرتا ہے جو اس کیلئے بہتر ہوتا ہے، اور اگر اسے تکلیف پہنچے تو وہ صبر کرتا ہے جو اس کیلئے خیر ہے۔

❁ وعن ابی ذران رسول اللہ ﷺ قال انی لاعلم آیۃ لو اخذالناس بہا لکفتھم ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لایحتسب"

(رواہ احمد وابن ماجۃ والدارمی)مشکوۃ باب التوکل والصبر)

حضرت ابوذر ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک میں ایک آیۃ جانتا ہوں، اگر لوگ اس پر عمل کریں تو وہ ان کو کافی ہو جائے۔

وہ آیۃ کریمہ یہ ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًاo وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ (سورۃ الطلاق، آیۃنمبر ۳)

"اور جو اللہ سے ڈرے اللہ اس کیلئے نجات کی راہ نکال دے گا، اور اسے وہاں سے روزی دے گا جہاں اس کا گمان نہ ہو۔"

❁ وعن عمرو بن العاص قال قال رسول اللہ ﷺ ان قلب ابن آدم بکل وادشعبۃ فمن اتبع قلبہ الشعب کلھا لم یباک اللہ بای واداھلکہ ومن توکل علی اللہ کفاہ الشعب"

(رواہ ابن ماجہ،مشکوۃ باب التوکل والصبر)

حضرت عمرو بن العاص فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک انسان کا دل (غموں کی) ہر وادی سے معلق رہتا ہے، کسی شخص کا تمام وادیوں سے معلق رہے وہ کسی وادی میں ہلاک ہو جائے رب تعالیٰ کو کوئی پرواہ نہیں، جو اللہ پر توکل رکھے اللہ تعالیٰ اسے ان (غموں کی) وادیوں سے کفایت کر جائے گا"

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ (آیۃ نمبر ۱۶۱)

(1) اور کسی نبی پر یہ گمان نہیں ہوسکتا کہ وہ کچھ چھپار کھے اور جو چھپار کھے وہ قیامت کے دن اپنی چھپائی چیز لے کر آئے گا پھر ہر جان کو ان کی کمائی بھر پور دی جائے گی اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔ (کنزالایمان)

(2) نہیں کسی نبی کیلئے کہ وہ خیانت کرے، اور جو خیانت کرے لے آئے گا'' وہ چیز جو خیانت کی اس نے'' قیامت کے دن پھر پورا پورا دیا جائے گا ہر شخص کو جو اس نے کسب کیا اور ان پر کچھ ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (نجوم الفرقان)

آسان اور مختصر مطلب:

ای ماصح ولا استقام لنبی من الانبیاء ان یخون فی المغنم لان الخیانۃ تنافی النبوۃ"

یعنی تمام انبیاء کرام میں سے کسی نبی کی شان کے لائق غنیمت حاصل ہے، اس لئے نبوت اور خیانت ایک شخص میں جمع نہیں ہوسکتیں۔ اگر بالفرض کسی نے امر نبوت کے احکام پہنچانے میں کوتاہی کی جسے خیانت سے تعبیر کردیا گیا تو قیامت کے دن اس سے پوچھا جائے گا کہ تو نے احکام خداوندی کیونکہ بجانہیں لائے، پھر ہر نفس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کسب کیا، کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (ماخوذ از روح المعانی وکبیر)

اس آیۃ کریمہ کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں:

﴿وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ﴾ ''نہیں کسی نبی کیلئے کہ وہ خیانت کرے۔''

"الغلول ھو الخیانۃ" غلول کا معنی ہے خیانت کرنا۔ اصل میں اس کا معنی یہ ہے کہ کسی چیز کو مخفی طور پر پکڑنا۔ جو کینہ سینہ میں چھپا ہوا سے بھی "غل" (غین کی زیر سے) کہا جاتا ہے۔ غلالہ اس کپڑے کو کہا جاتا ہے جو کپڑوں کے نیچے پہنا جاتا ہے۔ اور وہ پانی جو درختوں کی جڑوں میں جاری ہوتا ہے وہ درختوں میں پوشیدہ ہوتا ہے اسے "غلل" کہا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے "تغلل الشیٔ اذا تخلل وخفی" جب کسی چیز میں خلل واقع ہو اور مخفی ہو اس کیلئے بولتے ہیں "تغلل الشیٔ"

قال النبی ﷺ "من بعثناه علی عمل فغل شیئا جاء یوم القیامة یحمله علی عنقه"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص کو ہم نے کسی عمل کیلئے (صدقات کی وصول کیلئے) بھیجا تو اس نے خیانت کی تو قیامت کے دن وہ چیز اپنی گردن پر اٹھا کر لائے گا۔اور ارشاد فرمایا "ھدایا الولاۃ غلول" حکام اگر عطیات کو اپنے ذاتی ہدیئے سمجھیں تو یہ خیانت ہے۔اور ارشاد فرمایا "لیس علی المستعیر غیر المغل ضمان" بغیر خیانت کے جو چیز مانگ کر لی جائے اس پر کوئی ضمان نہیں۔

مختلف قرأتوں کے لحاظ پر مختلف معانی:

ابن کثیر اور عاصم اور ابو عمر کی قراءت میں "یغل" میں یاء پر فتحہ اور غین پر ضمہ ہے، اس قراءت کے مطابق معنی یہ ہے "ما کان للنبی ان یخون" نبی کی شان کے لائق نہیں کہ وہ خیانت کرے۔اور باقی حضرات نے "یغل" کو یاء کے ضمہ اور غین کے فتحہ سے پڑھا ہے، اس صورت میں معنی یہ ہے "ما کان للنبی ان یخان" نبی کی شان کے لائق نہیں کہ نبی کی خیانت کی جائے۔(وہ خاموش ہو کر حق بیان نہ کریں) شان نزول میں مختلف قول ہیں، بعض پہلی قراء ت کے مطابق ہیں اور بعض دوسری قراءت کے مطابق ہیں۔

پہلی قراءت کے مطابق چند روایات:

(۱) نبی کریم ﷺ کو بعض غزوات میں مال غنیمت حاصل ہوا، وہ مال غنیمت جمع کر لیا گیا۔لیکن کچھ موانع کی وجہ سے تقسیم میں تاخیر ہوگئی، تو کچھ لوگ کہنے لگے کہ آپ مال غنیمت کیوں تقسیم نہیں کرتے، تو آپ نے فرمایا "لو کان لکم مثل احد ذھبا ماحبست عنکم منه درھما اتحسبون انی اغلکم مغنمکم" اگر تمہارا احد پہاڑ کی طرح سونا ہو تو میں اس سے ایک درہم بھی نہیں روکوں گا، کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ میں تمہاری امانت میں خیانت کروں گا، تو اس پہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ اداء وحی کے متعلق نازل ہوئی، نبی کریم ﷺ قرآن پاک پڑھتے تھے اور اس میں کافروں کے دین اور ان کے مذہب کو باطل قرار دیا گیا، فسالوہ ان یترک ذلک فنزلت ھذہ الآیۃ" تو انہوں نے مطالبہ کیا کہ ہمارے دین اور ہمارے معبودوں کو باطل نہ کہا جائے، تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ نبی کریم ﷺ تبلیغ دین میں کوئی خیانت نہیں کرتے۔

(۳) حضرت عکرمہ ﷺ کا قول یہ ہے کہ یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ بدر میں ایک سرخ رنگ کی چادر گم ہوگئی "فقال بعض الجهال لعل النبی ﷺ اخذها فنزلت هذه الآية" بعض جاہلوں نے کہا کہ ہوسکتا ہے وہ نبی کریم ﷺ نے لے لی ہو، تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی، کہ نبی کی شان کے لائق نہیں کہ وہ غنیمت میں خیانت کریں۔

(۴) حضرت ابن عباس ﷺ نے ایک اور وجہ شان نزول کی یہ بیان کی۔

"ان اشراف الناس طمعوا ان يخصهم النبی عليه الصلوة والسلام من الغنائم بشئ زائد فنزلت هذه الآية"

کہ بعض بڑے لوگوں نے لالچ کی کہ ہمیں مال غنیمت میں سے نبی کریم ﷺ زیادہ حصہ دیں، تو اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ نبی بے انصافی کر کے مال غنیمت میں خیانت کا ارتکاب نہیں کر سکتے۔

(۵) روی انه عليه الصلوة والسلام بعث طلائق فغنموا غنائم فقسمها ولم يقسم للطلائع فنزلت هذه الآية"

اس آیۃ کریمہ کے نزول کا تعلق بدر کے واقعہ سے ہے کہ جن لوگوں کو دشمن کے حالات کا جائزہ لینے کیلئے بھیجا ہوا تھا وہ واپس جنگ میں شریک نہ ہو سکے، ان کیلئے ابتدائی طور مال غنیمت مقرر نہیں کیا گیا تھا تو رب تعالیٰ نے یہ آیۃ کریمہ نازل فرما کر ان کا حصہ مقرر کرنے کے متعلق ارشاد فرمایا تا کہ ان کے معاملہ میں خیانت نہ ہو۔

(۶) احد میں جن حضرات کو درہ میں کھڑا کیا تھا، فتح حاصل ہونے پر وہ مال غنیمت جمع کرنے میں شریک ہو گئے تھے۔

"وقالوا نخشى ان يقول النبی ﷺ من اخذ شيئا فهوله وان لايقسم الغنائم كما لم يقسمها يوم بدر فقال عليه الصلوة والسلام ظننتم انا نغل فلانقسم لكم فنزلت هذه الآية"

اور ساتھ ہی یہ کہنے لگے ایسا نہ ہو کہ نبی کریم ﷺ نے بدر میں جو اعلان فرمایا تھا "من قتل قتيلا فله سلبه" جس نے کسی (کافر شخص) کو قتل کیا اس کا سامان اسی کیلئے ہے، وہی اعلان یہاں بھی فرمائیں، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا گمان تھا کہ ہم تمہارے معاملہ میں خیانت کریں گے اور مال غنیمت تقسیم نہیں کریں گے، آپ کے اس ارشاد گرامی کے مطابق نازل ہوئی کہ نبی غنیمت کے معاملہ میں خیانت نہیں کرتے۔ (کبیر ج۹ ص ۷۰)

دوسری قراءت کے مطابق معانی:

یعنی نبی کی شان کے لائق نہیں کہ ان کے مال غنیمت کی خیانت کی جائے وہ یوں ہی خاموش رہیں اور ان کو

منع نہ کریں۔اس پر چند احادیث دیکھیں۔

❁ قال الامام احمد عن ابی مالک الاشجعی عن النبی ﷺ قال اعظم الغلول عندالله ذراع فی الارض تجدون الرجلین جارین فی الارض اوفی الدار فیقطع احدھما من حظ صاحبه ذراعا فاذاقطعه طوقه من سبع ارضین یوم القیامة"

مسند امام احمد میں حضرت ابو مالک اشجعی کی روایت بیان کی گئی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا زمین کے ایک ذراع (ڈیڑھ فٹ) کی خیانت بھی اللہ تعالی کے ہاں بہت بڑا جرم ہے،تم دو شخصوں کو پاؤ گے کہ وہ زمین یا مکان میں ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں،ایک نے دوسرے کے حصہ سے ایک ذراع کاٹ لیا،جب اس نے دوسرے کا حصہ کاٹ لیا تو قیامت کے دن اس کے گلے میں سات زمینوں کا طوق ڈال دیا جائے گا۔

❁ قال الامام احمد عن عبدالرحمن بن جبیر قال سمعت المستورد رضی اللہ عنہ بن شداد یقول سمعت رسول الله ﷺ یقول من ولی لنا عملا ولیس له منزل فلیتخذ منزلا،اولیست له زوجة فلیتزوج ،اولیس له خادم فلیتخذ خادما،اولیس له دابة فلیتخذ دابة،ومن اصاب شیئا سوی ذلک فھو غال"

حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں حضرت عبدالرحمٰن بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کی،وہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جسے ہم عامل بنائیں (اور جتنا حق ہم اسے دیں) کہ وہ (اپنے عمل اور مزدورں سے) اپنا گھر بنالے جب کہ اس کے پاس گھر نہ ہو،یا اس کی زوجہ نہ ہو تو شادی کر لے،یا اس کا خادم نہ ہو تو خادم حاصل کر لے،یا اس کے پاس سواری نہ ہو تو وہ سواری لے لے (یہ تو اسے حق حاصل ہے کہ ہم نے اسے اجازت دے دی) جس نے اس کے سوا اور کوئی چیز لے لی تو وہ خیانت کرنے والا ہوگا۔

❁ قال ابن جریر عن عکرمة عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ لأعرفن احدکم یاتی یوم القیامة یحمل شاة لھا لغاء ینادی یامحمد یامحمد فاقول لااملک لک من الله شیئا قدبلغتک،ولأعرفن احدکم یاتی یوم القیامة یحمل جملا له رغاء یقول یامحمد یامحمد فاقول لااملک لک من الله شیئا قد بلغتک،ولأعرفن احدکم یاتی یوم القیامة یحمل فرساله حمحمة ینادی یامحمد یامحمد فاقول لاأملک لک من الله شیئا قد بلغتک"

ابن جریر نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہ) سے روایت کی،رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں

ضرور بر ضرور تم میں سے قیامت کے دن اس شخص کو پہچانوں گا، جس نے (مال غنیمت میں خیانت کی) بکری اٹھار کھی ہوگی وہ بکری اپنی آواز دے رہی ہوگی (میں میں کر رہی ہوگی) وہ شخص پکار رہا ہوگا اے محمد، اے محمد، تو میں کہوں گا آج میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے نہیں چھڑا سکتا کیونکہ میں نے تمہیں اس کے احکام پہنچا دئے تھے، اور میں ضرور بر ضرور پہچانوں گا تم میں سے اس شخص کو قیامت کے دن آئے گا اس نے اونٹ اٹھایا ہوگا وہ اونٹ اپنی آواز دے رہا ہوگا، (یعنی بڑ بڑا رہا ہوگا) وہ شخص کہے گا یا محمد یا محمد تو میں کہوں گا میں اللہ تعالیٰ سے تمہیں نہیں چھڑاؤں گا کیونکہ میں نے اس کے احکام تمہیں اللہ تعالیٰ سے نہیں چھڑاؤں گا کیونکہ میں نے تمہیں اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچا دئے تھے۔

❁ **قال الامام احمد استعمل رسول الله ﷺ رجلا من الأزد يقال له ابن اللتبية على الصدقة فجاء فقال هذا لكم وهذا اهدى لى فقام رسول الله ﷺ على المنبر فقال مابال العامل نبعثه على عمل فيقول هذا لكم وهذا اهدى لى أفلاجلس فى بيت ابيه وامه فينظر ايهدى اليه ام لا؟ والذى نفس محمد بيده لاياتى احدكم منها بشئ الاجاء به يوم القيامة على رقبته ان كان بعيراله رغاء اوبقرة لها خوار، اوشاة تيعر، ثم رفع يديه حتى رأينا عفرة ابطيه ثم قال اللهم هل بلغت؟ ثلاثا"**

حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں حدیث ذکر کی کہ رسول اللہ ﷺ نے ازد قبیلہ سے ایک شخص کو صدقہ وصول کرنے پر عامل بنایا اسے ابن لتبیہ کہا جاتا تھا۔ تو وہ آیا اس نے کہا یہ تمہارا (مال) ہے، اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا، تو نبی کریم ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے تو آپ نے فرمایا اس عامل کا کیا حال ہے کہ ہم اس کو عمل پر بھیجتے ہیں تو وہ کہتا ہے یہ (مال) تمہارا ہے اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا ہے، وہ اپنے ماں، باپ کے گھر کیوں نہیں بیٹھا تھا کہ وہ دیکھتا اسے ہدیہ دیا جاتا یا نہ دیا جاتا، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم میں سے کوئی ایک بھی قیامت کے دن نہیں آئے گا مگر یہ کہ (خیانت کا) اس کی گردن پر اونٹ ہوگا جو اپنی آواز دے رہا ہوگا، یا گائے اٹھائے ہوگا جو اپنی آواز دے رہی ہوگی، یا بکری کو اٹھائے ہوگا وہ بکری آواز دے رہی ہوگی، پھر آپ نے اپنے ہاتھ اٹھائے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی، آپ نے تین مرتبہ یہ کہا، اے اللہ کیا میں نے احکام پہنچا دئے ہیں۔

❁ **قال ابوعيسى الترمذى عن معاذ بن جبل قال بعثنى رسول الله ﷺ الى اليمن فلما سرت ارسل فى أثرى فرددت فقال اتدرى لم بعثت اليك؟ لاتصيبن شيئا بغير اذنى فانه غلول (ومن يغلل يات بما غل يوم القيامة) لهذا دعوتك فامض لعملك"**

حضرت معاذ بن جبل ؓ فرماتے ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے یمن کی طرف بھیجا، جب میں چلا تو میرے

پیچھے ایک شخص کو بھیجا مجھے واپس بلایا گیا، پھر آپ نے فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ آپ کو واپس کیوں بلایا گیا؟ (اس کی وجہ یہ بتانا مقصود تھا) کہ میری اجازت کے بغیر ہرگز کوئی چیز نہ لینا کیونکہ وہ خیانت ہوگی۔ (پھر آپ نے بطور دلیل یہی زیر بحث آیۃ کریمہ پڑھی) ﴿وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَاغَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ (اور جس نے خیانت کی وہ لے آئے گا وہ چیز جواس نے خیانت کی قیامت کے دن) میں نے اسی وجہ سے تمہیں بلایا تھا، اب تم اپنے کام کیلئے چلے جاؤ (جس کیلئے تمہیں بھیجا تھا)

قال الامام احمد عن ابی هريرة قال قام فينا رسول الله ﷺ يوما فذكر الغلول فعظمه وعظم امره ثم قال لاألفين احدكم يجئ يوم القيامة علی رقبته بعير له رغاء فيقول يارسول الله اغثنی فاقول لااملک لک من الله شيئا قد بلغتک لاألفين احدكم يجئ يوم القيامة علی رقبته فرس لها حمحمة فيقول يارسول الله اغثنی فاقول لااملک لک من الله شيئا قد بلغتک، لاألفين احدكم يجئ يوم القيامة علی رقبته صامت فيقول يارسول الله اغثنی فاقول لااملک لک من الله شيئا قد بلغتک" (بخاری ومسلم)

امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت ابوہریرہ ﷺ سے روایت ذکر کی جو بخاری ومسلم نے بھی ذکر کی، آپ فرماتے ہیں ایک دن رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے آپ نے مال غنیمت کی خیانت کا ذکر کیا، اس نے اس کی عظمت اوراس کے معاملہ (خیانت) کی عظمت کو ذکر کیا، پھر فرمایا ہرگز میں سے کسی ایک کو قیامت کے دن نہ پاؤں کہ اس کی گردن پر اونٹ آواز دے رہا ہو (بربڑا رہا ہو) وہ شخص کہے یارسول اللہ میری فریاد کو پہنچو، میں کہوں گا میں تمہارے لئے کسی چیز کا آج اللہ تعالی سے مالک نہیں بیشک میں نے اس کے احکام تمہیں پہنچا دئے تھے، ہرگز میں تم میں سے کسی ایک کو قیامت کے دن نہ پاؤں کہ اس کی گردن پر گھوڑا ہنہنا رہا ہو، وہ کہے یارسول اللہ میری فریاد کو پہنچو، میں کہوں گا آج میں تمہاری کوئی امداد نہیں کروں گا کیونکہ میں نے تمہیں رب تعالی کے احکام پہنچا دئے تھے، ہرگز میں تم میں سے کسی ایک کو قیامت کے دن نہ پاؤں کہ اس کی گردن پر مال (سونا، چاندی) ہو، وہ کہے یارسول اللہ میری فریاد کو پہنچو، میں کہوں گا میں اللہ تعالی سے آج تمہیں نہیں چھڑاؤں گا کیونکہ میں نے تمہیں اس کے احکام پہنچا دئے تھے۔ (احادیث مذکورہ منقول ابن کثیر وصابونی)

روی ان النبی ﷺ لما وقعت غنائم هوازن فی يده يوم حنين، غل رجل بمخيط فنزلت هذه الآية"

روایت کی گئی کہ نبی کریم ﷺ نے حنین کے دن جب ہوازن قبیلہ سے مال غنیمت حاصل کیا، تو ایک شخص نے مال غنیمت میں سے ایک سوئی جمع نہیں کرائی تو یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

❁ واعلم ان النبی ﷺ عظم امر الغلول و جعله من الکبائر "یقین کرلو کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے خیانت کو بہت عظیم اور گناہ کبیرہ قرار دیا۔

❁ عن ثوبان عن رسول الله ﷺ انہ قال "من فارق روحه جسده هو بریٔ من ثلاث دخل الجنة الکبر والغلول والدین"

حضرت ثوبان ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کا روح اس کے جسم سے جدا ہو جائے (فوت ہو جائے) وہ تین چیزوں سے بچا رہا تو جنت میں داخل ہوگا، وہ تین چیزیں یہ ہیں تکبر، خیانت اور قرضی"

❁ عن عبدالله بن عمرو ان رجلا کان علی ثقل النبی ﷺ یقال له کرکرة فمات فقال النبی ﷺ هو فی النار فذهبوا ینظرون فوجدوا علیه کساء و عباء ة قدغلهما"

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ایک شخص کو نبی کریم ﷺ کے مال غنیمت پر مقرر کیا ہوا تھا، اسے کرکرہ کہا جاتا تھا وہ مرگیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا وہ آگ میں جائے گا۔ لوگ اسے دیکھنے کیلئے گئے تو دیکھا کہ اس نے ایک چادر اور ایک اونی کپڑا خیانت کرلیا تھا۔ (منقول از کبیر ج ۹ ص ۷۰)

❁ واخرج الطبرانی عن کثیر بن عبدالله عن ابیه عن جده ان النبی ﷺ قال لا اسلال ولا اغلول "ومن یغلل یات بما غل یوم القیامة"

طبرانی نے کثیر بن عبداللہ سے روایت ذکر کی جو انہوں نے اپنے باپ، دادا سے بیان کی کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا کوئی شخص مال غنیمت میں چپکے سے کوئی نہ کھسکا لے اور نہ ہی خیانت کرے، (اور جو شخص خیانت کرے گا وہ خیانت کی ہوئی چیز قیامت کے دن لائے گا۔

❁ واخرج عبدالرزاق المصنف وابن جریر وابن المنذر عن قتادة قال...... ذکر لنا ان نبی الله ﷺ کان یقول اجتنبوا الغلول فانه عار وشنار ونار"

حضرت قتادہ ﷺ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا مال غنیمت کی خیانت سے بچ جاؤ کیونکہ یہ عار اور آگ میں جھلس جانے کا ذریعہ ہے۔ (منقول از درمنثور)

❁ واخرج ابن ابی شیبة واحمد ومسلم وابوداود عن عدی بن عمیرة الکندی قال قال رسول الله ﷺ یاایها الناس من عمل منکم لنا فی عمل فکتمنا منه مخیطا فما فوقه فهو غل وفی لفظ فانه غلول یاتی یوم القیامة"

عدی بن عمیرہ کندی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے لوگو جس شخص نے تم میں سے کوئی عمل کیا (یعنی جسے ہم نے عامل بنایا) تو اس نے ہم سے ایک سوئی یا اس سے زائد کوئی چیز چھپائی تو وہ

خیانت ہوگی وہ خیانت کی ہوئی چیز وہ قیامت کے دن لائے گا۔ (منقول از در منثور)

مسئلہ: مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے کھانے کی اشیاء اور چوپاؤں کا چارا بقدر ضرورت استعمال کرنا جائز ہے۔

"قال عبد الله بن ابی اوفی اصبنا طعاما یوم حنین فکان الرجل یاتی فیاخذ منه قدر الکفایة ثم ینصرف"

عبداللہ بن ابی اوفی کہتے ہیں حنین کے دن ہم نے طعام پایا، جس شخص کو جتنا طعام ضرورت ہوتا وہ بقدر ضرورت لے لیتا، پھر واپس ہو جاتا۔

❁ وعن سلمان انه اصاب یوم المدائن ارغفة وجبنا وسکینا فجعل یقطع من الجبن ویقول کلوا علی اسم الله"

حضرت سلمان فارسی ﷺ فرماتے ہیں مدائن کے دن ہم نے روٹیاں اور پنیر اور چھری پائی، وہ پنیر کو چھری سے کاٹتے ہوئے فرمانے لگے، اللہ کا نام لے کر کھاؤ۔ (کبیر ج۹ ص۱۷)

کافر کے ہتھیار سے کافر کو قتل کرنا جائز ہے:

"روی عن البراء بن مالک انه ضرب رجلا من المشرکین یوم الیمامة فوقع علی قفاه فاخذ سیفه وقتله به"

براء بن مالک ﷺ فرماتے ہیں کہ انہوں نے یمامہ کے دن مشرکوں کے ایک شخص کو گردن کے پچھلے حصہ پر مارا اور اسی کی تلوار لے کر اسے قتل کر دیا۔ (کبیر ج۹ ص۱۷)

نبوت اور خیانت کا اجتماع ممکن نہیں:

اس کی وجہ یہ ہے کہ خیانت دنیا میں عار کا سبب ہے، اور آخرت میں نار (آگ) کا سبب ہے، جو نفس خیانت کی طرف رغبت کرتا ہے وہ بہت ہی گھٹیا ہوتا ہے، اور نبوت انسانیت کا بہت ہی اعلی منصب ہے "فلا تلیق الا بالنفس التی تکون فی غایة الجلالة والشرف" یہ عظیم منصب تو صرف اسے حاصل ہوگا جسے بہت بڑی بزرگی اور شرافت حاصل ہوگی۔

"والجمع بین الصفتین فی النفس الواحدة ممتنع فثبت ان النبوة والخیانة لاتجتمعان"

ایک ہی شخص میں نبوت اور خیانت کبھی جمع نہیں ہوسکتیں، یہ حکم ایسا ہی ہے، جیسا کہ اللہ تعالی نے

فرمایا﴿مَا کَانَ اللّٰہُ اَنْ یَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ﴾ اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں کہ وہ اپنی اولاد بنائے۔" "یعنی الالھیة والتخاذ ال ولد لا یجتمعان" یعنی وہ ذات جو معبود حقیقی ہے اس کے ساتھ اولاد کے جمع ہونا ممکن نہیں۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

علامہ رازی رحمہ اللہ علیہ نے بہت خوبصورت انداز پر لام کے زائد ہونے کا تذکرہ کیا، لیکن لفظ زائد کی جگہ منقول کا لفظ ذکر فرمایا، عبارت ملاحظہ ہو۔

"وقیل اللام منقولة والتقدیر وماکان النبی لیغل، کقوله(ماکان الله ان یتخذ من ولد)ای ماکان الله لیتخذ ولدا"

بعض حضرات نے کہا"للبنی" میں لام منقول ہے، اصل عبارت یوں ہے"وماکان النبی للیغل" نبی خیانت نہیں کرتا۔ یہ اسی طرح ہے جیسا کہ ﴿وَمَا کَانَ اللّٰہُ اَنْ یَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ﴾ میں لام منقول ہے، یہ بھی معنوی لحاظ پر یوں ہے۔

﴿مَا کَانَ اللّٰہُ لِیَتَّخِذَ وَلَدًا﴾ "اللہ تعالیٰ اپنی اولاد نہیں بناتا۔ (کبیر ج ۹ ص ۷۱)

غلول کا اطلاق کس چیز پر:

"ان الغلول ھو الخیانة الا انه فی عرف الاستعمال صار مخصوصا بالخانة فی الغنیمة وقد جاء ھذا ایضا فی غیر الغنیمة"

غلول کا معنی خیانت ہے، لیکن عام طور پر عرف میں مال غنیمت میں خیانت کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن غنیمت کے بغیر مطلقاً خیانت کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ (کبیر ج۹ ص۷۲)

﴿وَمَنْ یَّغْلُلْ یَاْتِ بِمَا غَلَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾

"اور جو خیانت کرے لے آئے گا وہ چیز" جو خیانت کی اس نے" قیامت کے دن"

اس کے دو مطلب بیان کیے گئے ہیں، ایک یہ کہ وہی چیز جو اس نے خیانت کی تھی قیامت کے دن وہی اس کی گردن پر سوار ہوگی تا کہ اس کی رسوائی زیادہ ہو، جیسا کہ پہلے احادیث میں مذکور ہے کہ اس پر بکری، اونٹ، گھوڑا سوار ہوں گے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اسے خیانت کا گناہ حاصل ہوگا۔ (خازن ج۱ ص۲۹۷)

﴿ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ﴾

''پھر پورا پورا دیا جائے گا ہر شخص کو جو اس نے کسب کیا''

یعنی جیسا عمل اس نے کیا ایسا ہی اسے بدلہ دیا جائے گا، اگر اس نے نیک عمل کیا تو اسے اجر وثواب عطاء کیا جائے گا، اور اگر اس نے برا عمل کیا تو اسے عذاب دیا جائے گا۔ (خازن)

﴿وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ ''اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

یعنی قیامت کے دن عدل وانصاف کیا جائے گا، کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا، ایسا بھی نہیں ہوگا کہ کسی کے اعمال کا اسے بدلہ ہی نہ دیا جائے یا سے کم بدلہ دیا جائے۔

❁ عن زيد بن خالد الجهني قال ان رجلا من اصحاب رسول الله ﷺ تو فى يوم خيبر فذكر لرسول الله ﷺ قال صلوا على صاحبكم فتغيرت وجوه الناس لذلك فزعم زيد ان رسول الله ﷺ قال "ان صاحبكم قد غل فى سبيل الله، قال ففتشنا متاعه فوجدنا حرزا من حرز اليهود لايساوى درهمين"

زید بن خالد جہنی فرماتے ہیں کہ بیشک رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام میں سے ایک شخص خیبر کے دن فوت ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ سے ان کا تذکرہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا تم اپنے صاحب پر نماز جنازہ پڑھو، لوگوں کے چہروں کے رنگ آپ کے اس ارشاد پر بدل گئے (یعنی پریشان ہو گئے کہ آپ خود جنازہ کیوں نہیں بڑھ رہے) زید (راوی) کا گمان یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ تمہارے اس صاحب نے اللہ کی راہ میں خیانت کر لی ہے، وہ کہتے ہیں ہم نے ان کے سامان کی تفتیش کی تو اس میں یہود کے منکوں میں سے کچھ منکے پائے گئے جو دو درہم کے برابر بھی نہیں تھے یعنی اتنی مقدار خیانت کرنے پر نبی کریم ﷺ نے خود نماز جنازہ ادا کرنے سے انکار فرما دیا، البتہ صحابہ کرام کو اجازت دے دی۔

(معالم التنزیل للبغوی ج ۱ ص ۳۶۶)

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ٥

(آیہ نمبر ۱۶۲)

(1) تو کیا جو اللہ کی مرضی پر چلا وہ اس جیسا ہوگا جس نے اللہ کا غضب اوڑھا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور کیا بری جگہ پلٹنے کی۔ (کنزالایمان)

(2) تو کیا جس نے تابعداری کی اللہ کی رضاء کی وہ اس جیسا ہوگا جو لوٹا اللہ کی ناراضگی سے، اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے، اور کتنی بری جگہ ہے اس کے پلٹنے کی۔ (نجوم الفرقان)

﴿اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ﴾ ''تو کیا جس نے تابعداری کی اللہ کی مرضی کی۔''

یعنی اللہ تعالیٰ کی طاعت کر کے اسے راضی کیا، اس سے مراد مہاجرین وانصار صحابہ کرام ہیں۔

﴿كَمَنْ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾

''وہ اس جیسا ہوگا جو لوٹا اللہ کی ناراضگی سے۔''

"(كَمَنْ بَآءَ)" "رجع" (بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ) بالمعاصی والغلول وهم المنافقون وبعض الفساق"

وہ اس جیسا ہوگا جو لوٹا اللہ کی ناراضگی سے گناہوں اور خیانت کی وجہ سے، یعنی منافقین اور بعض فاسق لوگ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی ایسا نہیں ہوسکتا کہ اللہ کی طاعت کرنے والے، اس کی مرضی کے مطابق کام کرنے والے اور اس کے نافرمان، خیانت کرنے والے، یعنی منافقین اور فاسق لوگ برابر ہو جائیں۔

﴿وَمَاْوٰهُ جَهَنَّمُ﴾ ''اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ کے نافرمان اور معصیت کے مرتکب کا ٹھکانا جہنم ہے۔

﴿وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾ ''اور کتنی بری جگہ ہے اس کے پلٹنے کی۔''

یعنی نافرمان اور خیانت کرنے والے فاسقوں نے جہنم کی طرف پلٹ کر جانا ہے، یہ ان کا ٹھکانا اور پلٹنے کی جگہ بہت ہی بری ہے۔ (ماخوذ از مظہری)

آیہ کریمہ کا حکم عام ہے:

اگر چہ بظاہر نزول کے لحاظ سے خاص ہے، لیکن حکم کے لحاظ پر عام ہے جو تا قیامت آنے والے لوگوں کو شامل ہے۔ جس شخص نے خیانت کو چھوڑ کر اللہ تعالی کی رضاء کی تابعداری کی وہ اس جیسا نہیں ہو سکتا جس نے خیانت کی، جس نے ایمان لا کر اور طاعت کا عمل کر کے اللہ کو راضی کیا وہ اس شخص جیسا نہیں جس نے کفر و شرک کر کے اور معصیت یعنی گناہوں کا ارتکاب کر کے رب تعالی کو ناراض کیا۔ مہاجرین وانصار جنہوں نے رب تعالی کی رضاء کیلئے کام کئے وہ منافقین کی طرح نہیں ہو سکتے جنہوں نے رب تعالی کو ناراض کیا، اسی طرح وہ لوگ جنہوں نے مشرکوں پر حملہ کیا اور ثابت قدم رہے، ان کا یہ فعل اللہ تعالی کی رضاء کیلئے تھا، وہ ان حضرات کی طرح نہیں جو وقتی طور پر پسپا ہو گئے وہ بظاہر اللہ تعالی کو ناراض کرنے کا ذریعہ بنے۔

یہ آیہ کریمہ عام ہے:

لان کل من اقدم علی الطاعة فهو داخل تحت قوله(افمن اتبع رضوان الله)وكل من اخلدالی متابعة النفس والشهو فهو داخل تحت قوله(كمن باء بسخط من الله)

یعنی ہر وہ شخص جس نے اللہ تعالی کی طاعت کی وہ ﴿اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ﴾ میں داخل ہے، اور ہر وہ شخص جس نے اپنے نفس اور خواہشات کی تابعداری کی، رب تعالی کے احکام کی نافرمانی کی وہ ﴿كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ میں داخل ہے۔ (کبیر ج ۹ ص ۷۴)

ضابطہ: **ان الآية نازلة فی واقعة معينة لكنک تعلم ان عموم اللفظ لايبطل لأجل خصوص السبب"**

بیشک آیہ کریمہ اگر چہ ایک خاص واقعہ کے حق میں نازل ہوئی، لیکن یہ ضابطہ یاد رکھو کہ خصوصی اسباب کی وجہ سے عموم الفاظ باطل نہیں ہوتے۔ (کبیر ج ۹ ص ۷۴)

اعلی حضرت اور علامہ رازی رحمهما الله:

علامہ رازی رحمہ اللہ نے "باء" کا معنی "احتمل، رجع" تحریر کیا ہے، یعنی جس نے اللہ کے غضب کو اٹھایا، اور اللہ کے غضب سے لوٹا، اعلی حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ " احتمل " کے مطابق ہے "اوڑھا" راقم کا ترجمہ ہے "لوٹا" جو "رجع" کا ترجمہ ہے، طلباء کرام دونوں معانی ذہن میں رکھیں۔

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ۝ (آیۃ نمبر ۱۶۳)

(1) وہ اللہ کے یہاں درجہ درجہ ہیں، اور اللہ ان کے کام دیکھتا ہے۔ (کنزالایمان)

(2) وہ درجہ بدرجہ ہیں اللہ کے ہاں، اور اللہ دیکھنے والا ہے جو وہ عمل کرتے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

﴿هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ "وہ درجہ بدرجہ ہیں اللہ کے ہاں۔"

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا، اس سے مراد عام ہے، "یعنی اھل الخیر واھل الشر درجات" یعنی نیک لوگوں اور برے لوگوں کیلئے مختلف درجات ہیں۔ ابوعبیدہ اور کسائی رحمہما اللہ نے "دَرَجٰتٌ" کا معنی "منازل" بیان کیا ہے کہ لوگوں کے آخرت میں مختلف درجہ کے مقامات ہوں گے، نیک لوگوں کے کسی کے اعلیٰ مقامات ہوں گے، کسی کے کم درجہ کے، اسی طرح برے لوگوں میں سے کسی کا مقام شدید عذاب والا ہوگا، اور کسی کا کم عذاب والا ہوگا۔ "درجاتھم فی الجنۃ ودرکاتھم فی النار" جنت میں لوگوں کے مراتب اور منازل کیلئے لفظ "دَرَجٰتٌ" استعمال ہوتا ہے، اور جہنم میں مختلف مراتب ومنازل کیلئے لفظ "درکات" استعمال ہوتا ہے۔ اور رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا﴾ (اور ہر ایک کیلئے درجات ہیں جو انہوں نے عمل کیا) کا بھی یہی مطلب ہے۔

﴿وَاللّٰهُ بَصِیْرٌ بِمَا یَعْمَلُوْنَ﴾ "اور اللہ دیکھنے والا ہے جو وہ عمل کرتے ہیں۔"

یعنی ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ دیا جائے گا "لا یظلمھم خیرا ولا یزید ھم شرا بل یجازی کل عامل بعملہ" کسی کی نیکی کو ضائع کر کے کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی کسی کے شر کو بڑھا کر کسی پر ظلم کیا جائے گا، ہر عمل کرنے والے کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔ (ماخوذ از ابن کثیر (وصابونی ج ا ص ۳۴۳)

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ "ھم" ضمیر ﴿اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ﴾ کی طرف فقط لوٹ رہی ہے، انہوں نے دلیل یہی پیش کی ہے۔

"ان الغالب فی العرف استعمال الدرجات لاھل الثواب والدرکات لاھل النار"

عام عرف میں ثواب والوں کیلئے درجات کا استعمال کیا جاتا ہے، اور جہنم والوں کیلئے درکات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ (خازن ج ا ص ۲۹۹)

جنتی لوگوں کی چار قسمیں ہیں:

(۱) انبیاء کرام اور اللہ کے رسول، (۲) اولیاء کرام جو انبیاء کرام کے متبعین ہیں ان کو رب تعالی کی طرف سے بصیرت اور دلائل حاصل ہیں۔

(۳) مؤمنین جو اللہ تعالی پر صدق دل سے ایمان لانے والے ہیں اور انبیاء کرام کی تصدیق کرنے والے ہیں۔

(۴) علماء کرام جو دلائل عقلیہ سے رب تعالی پر ایمان لانے والے ہیں۔

اللہ تعالی نے پہلے طبقہ کی شان بیان کی ﴿یَرْفَعُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾ یہ چار طبقہ کے لوگ قیامت کے دن جنات عدن میں ہوں گے، ایک سفید بلند مقام پر رب تعالی کی زیارت کریں گے، ان کے علیحدہ علیحدہ چار مقام ہوں گے۔ "طائفة منهم اصحاب منابر وهی الطبقة العلياء الرسل والانبياء" ایک گروہ ان میں سے نورانی منبروں پر ہوں گے، یہ طبقہ وہ ہوگا جو بلند مقام رکھتے ہوں گے، یعنی اللہ کے رسول اور انبیاء کرام ہوں گے۔

"والطائفة الثانية هم الاولياء ورثة الانبياء قولا وعملا وحالا وهم اصحاب الاسرة والعرش"

دوسرا طبقہ اولیاء کرام کا ہے جو انبیاء کرام کے اقوال و اعمال و حالات میں وارث ہیں، یہ نورانی تخت پر جلوہ گر ہوں گے۔

"والطبقة الثالثة العلماء بالله من طريق النظر البرهانی العقلی وهم اصحاب الكرسی"

تیسرہ طبقہ علماء جو نظر و فکر کر کے دلائل عقلیہ سے حق راہ کو بیان کرتے ہیں، خود بھی حق راہ پر قائم رہتے ہیں، ان کو قیامت کے دن نورانی کرسیاں عطاء کی جائیں گی، جن پر وہ جلوہ افروز ہوں گے۔

"والطبقة الرابعة هم المؤمنون المقلدون فی توحيدهم ولهم المراتب وهم فی المحشر مقدمون علی اصحاب النظر العقلی وهم فی الكثيب يتقدمون علی المقلدين"

چوتھا طبقہ ان مؤمنین کا ہوگا جو خود تو اصحاب علم نہیں ہوں گے، لیکن علم والوں کے مقلد اور تابع ہو کر اللہ تعالی کی وحدانیت پر ان کا ایمان ہوگا، یہ محشر میں عقلی دلائل سے رب تعالی کو ماننے والے لیکن حق راہ پر چلنے والوں سے نورانی بلند مقام پر مقدم ہوں گے، جن کا تذکرہ پہلے تیسرے درجہ میں کیا جا چکا ہے۔

قیامت کہ نیکاں باعلی رسند ‏ ‏ ‏ ‏ زقعر ثرا بر ثریا رسند

قیامت کے دن نیک لوگ بلند مقام تک پہنچیں گے   یعنی زمین سے ثریا ستاروں تک پہنچیں گے۔

اس لئے اے انسان تو کچھ اچھے عمل کر لے، تا کہ قیامت کے دن تجھے اپنے برے اعمال پر ندامت نہ ہو۔

ترا خود بماند سراز ننگ پیش   کہ کردت برآید عملھای خویش

تیرا سر خود ہی شرم سے جھک جائے گا   جب تیرے عمل تیرے سامنے آجائیں گے۔

مخلوق کے مختلف درجات کی وجوہ:

(۱) فمنها بالسن ولكن فى الطاعة والاسلام فيفضل الكبير السن على الصغير السن اذا كانا على مرتبة واحدة من العمل"

کبھی عمر کے لحاظ پر زیادہ مرتبہ حاصل ہو جاتا، اسلئے کہ کم عمر والا اور زیادہ عمر والا جب ایک جیسی رب تعالی کی طاعت کرتے ہیں، اور ایک جیسا ہی اسلام کے احکام پر عمل کرتے ہیں، تو یقیناً جب ان کے اعمال ایک مرتبہ کے ہوں گے تو زیادہ عمر والا اپنے زیادہ اعمال کی وجہ سے بلند درجہ رکھتا ہوگا۔

(۲) ومنها بالزمان فان العمل فى رمضان وفى يوم الجمعة وفى ليلة القدر وفى عشر ذى الحجة وفى عاشوراء اعظم من سائر الايام والازمان"

اور وجہ بلندی درجات کی یہ ہوگی کہ بعض لوگ وہ ہوں گے جنہوں نے مبارک دنوں اور مبارک اوقات میں عبادات کی ہوں گی، جن کی وجہ سے ان کے درجات بلند ہوں گے، یقیناً رمضان شریف میں غیر رمضان کی بنسبت عبادت افضل ہے، جمعہ کے دن اور دنوں سے عبادت افضل ہے، لیلۃ القدر کی عبادت ہزار مہینہ سے بہتر ہے، اور ذی الحج کے دس دنوں کی عبادت افضل ہے، عاشوراء کے دن ورات کی عبادت بہت افضل ہے۔ اس طرح کے فضیلت والے دنوں اور فضیلت والے وقتوں میں رب تعالی کو یاد کرنے والوں کو بلند درجات حاصل ہوں گے۔

(۳) ومنها بالمكان فالصلوة فى المسجد الحرام افضل منها فى مسجد المدينة وهى من الصلوة فى المسجد الاقصى وهى منها فى سائر المساجد"

کبھی مکان کی شرافت و بلندی عبادات میں کمال پیدا کر دیتی ہے جس کی وجہ سے انسان کو بلند درجہ حاصل ہو جاتا ہے، مسجد حرام میں نماز افضل ہے، کیونکہ ایک لاکھ کا ثواب حاصل ہوتا ہے، پھر مسجد نبوی میں نماز ادا کرنا افضل ہے کیونکہ وہاں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کا ثواب حاصل ہوتا ہے پچاس ہزار والی روایت ترمذی شریف میں

موجود ہے، پھر مسجد اقصی میں نماز ادا کرنا افضل ہے، مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد اقصی کے بعد دوسری مساجد کا مقام ہے۔

محبت کی بات:

جواہر البحار جلد رابع ص ۸ پر یوں تحریر کیا گیا کہ مسجد نبوی میں نماز ادا کرنا تعداد کے لحاظ پر ثواب اس میں کم ہے بنسبت مسجد حرام کے، لیکن نبی کریم ﷺ کے قرب کی وجہ سے مسجد نبوی میں ادا کی ہوئی نماز ''پچاس ہزار کا درجہ رکھنے کے باوجود مسجد حرام میں نماز ادا کرنے پر جب کہ وہ ایک لاکھ کا درجہ رکھتی ہے'' بلند درجہ رکھتی ہے جیسا کہ منی میں آٹھ ذی الحج کی نمازیں حاجیوں کیلئے مسجد حرام میں ادا کرنے سے افضل ہیں، حالانکہ منی میں ادا کی ہوئی ایک نماز کا ثواب ایک کا ہی حاصل ہوگا، لیکن وہ ایک کا ثواب اس دن ایک لاکھ کے ثواب پر بھاری ہوگا۔

(۴) **ومنهابالاحوال فان الصلوة بالجماعة افضل من صلوة الشخص وحده"**

بلند درجہ حاصل ہونے کی اور وجہ یہ ہے کہ بعض احوال فضیلت کا سبب ہوتے ہیں، کیونکہ جماعت سے نماز ادا کرنا اکیلے نماز ادا کرنے سے افضل ہے۔

(۵) **ومنهابنفس الاعمال فان الصلوة افضل من اماطة الاذى"**

کبھی اعمال بعض دوسرے بعض پر فضیلت رکھتے ہیں، جن کی وجہ سے درجات کی بلندی حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ نماز ادا کرنا افضل ہے بنسبت اس کے کہ ایذاء پہنچانے والی چیز کو راستہ سے ہٹا دیا جائے۔

(۶) **ومنهافي العمل الواحدفالمتصدق على رحمه صاحب صلة رحم رصدقة، وكذامن اهدى هدية لشريف من اهل البيت افضل من ان يهدى لغيره واحسن اليه"**

بعض اوقات ایک ہی عمل ہوتا ہے، لیکن وہ مختلف حیثیات سے مختلف درجات رکھتا ہے، جیسا کہ صدقہ کرنا اپنے ذی رحم پر زیادہ فضیلت رکھتا ہے بنسبت غیر کو صدقہ ادا کرنے سے، اسی طرح ہدیہ دینا اپنے اقرباء اور اپنے گھر والوں کو افضل ہے اوروں کو دینے سے، کیونکہ اپنوں پر احسان کرنا افضل ہے غیروں سے۔

خوش قسمت انسان:

ومن الناس من يجمع في الزمن الواحد اعمالا كثيرة فيصرف سمعه وبصره ويده فيماينبغي في زمان صومه وصدقته بل في زمان صلوته في زمان ذكره في زمان نيته من فعل وترك فيؤجرفي الزمان الواحد من وجوه كثيرة فيفضل غيره ممن ليس كذلك"

بعض خوش قسمت انسان ہوتے ہیں جو ایک ہی زمانے میں کثیر اعمال جمع کر لیتے ہیں، کان ان کے نیکی کی

باتوں کو سنتے ہیں، نظر ان کی نیکی کے کاموں کی طرف اٹھتی ہے، وہ اپنے ہاتھوں سے بھی نیک کام کرتے ہیں، روزہ بھی رکھتے ہیں اور صدقہ بھی کرتے ہیں، نماز بھی ادا کرتے ہیں، رب تعالیٰ کا ذکر بھی کرتے ہیں، وہ ایک ہی وقت میں بہت ہی زیادہ نیکیاں حاصل کر لیتے ہیں، لیکن جن کو یہ مقام حاصل نہیں وہ اس سے محروم رہتے ہیں۔

بضاعت بچند اکہ آری بری　　　　اگر مفلسی شرمساری بری

جتنا نیکیوں کا سرمایہ لائے گا اتنا ہی بلند مقام حاصل کرے گا　　اگر نیکیوں کے سرمایہ سے خالی رہا تو شرمندگی اٹھائے گا۔

❁ قال رسول الله ﷺ لیس من یوم یاتی علی ابن آدم الاینادی فیه یاابن آدم اناخلق جدید وانا فیما نعمل علیک غدا شهید، فاعمل فی خیر اشهدلک به غدافانی لوقدمضیت لم ترنی ابداویقول الله مثل ذلک"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، انسان کو ہر دن اور ہر رات پکارا جاتا ہے، اے ابن آدم ہم نئی خلق میں ہوتے ہیں، ہم تجھ پر کل گواہ ہوں گے جو تو عمل کرتا رہا، میری رضاء کیلئے اچھے عمل کر، تا کہ میں کل ان کو تجھ پر گواہ بناؤں، اگر تو میری رحمت سے محروم رہا تو وہ رحمت تجھے کبھی نظر نہیں آئے گی۔

پیاری نصیحت:

فاعمل یا اخی عمل من یعلم انه راجع الی الله وقادم علیه یجازی علی الصغیر والکبیر والقلیل والکثیر"

اے میرے بھائی اس دنیا میں اچھے عمل کر لے، جب تو جانتا بھی ہے کہ تیرے اعمال تیرے رب کے حضور پیش ہونے ہیں، اس لئے نیکی کے اعمال کی طرف پیش پیش ہو کہ رب تعالیٰ کی طرف سے ہر چھوٹے اور بڑے، تھوڑے اعمال اور زیادہ اعمال پر تجھے جزا دی جائے گی۔ (روح البیان ج ۲ ص ۱۱۹، ۱۲۰)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

٥

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍO (آیۃ نمبر ۱۶۴)

(1) بیشک اللہ کا بڑا احسان ہوا مسلمانوں پر کہ ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے، اور انہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے اور وہ ضرور اس سے پہلے گمراہی میں تھے۔ (کنز الایمان)

(2) تحقیق قسم ہے بڑا احسان کیا اللہ نے ایمان والوں پر، جب ان میں، ایک رسول معظم بھیجا ان کی جانوں میں سے، وہ تلاوت کرتا ہے ان پر اس کی آیتیں، اور پاک کرتا ہے ان کو، اور سکھاتا ہے ان کو کتاب وحکمت، اور بیشک وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ (نجوم الفرقان)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ کا ترجمہ راقم نے کیا ہے "تحقیق قسم ہے بڑا احسان کیا اللہ نے ایمان والوں پر۔" یہ ترجمہ روح المعانی سے لیا گیا ہے اور طلباء کرام یہ بھی یاد رکھیں کہ "لَقَدْ" میں لام موطأ للقسم ہے

"والجملة جواب قسم محذوف ای واللہ "لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ"

یہاں قسم محذوف ہے، اور "مَنَّ اللّٰهُ" جملہ جواب قسم ہے" معنوی طور پر عبارت یوں ہوگی ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ قسم ہے اللہ کی تحقیق بڑا احسان کیا اللہ نے ایمان والوں پر۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ فرمایا "بڑا احسان ہوا" یہ ترجمہ قرطبی کے ان الفاظ سے لیا گیا۔ "بین اللہ تعالی عظیم منة علیهم ببعثه محمدا" کو مبعوث فرما کر بہت بڑا احسان کیا" اور "رَسُوْلً" کا ترجمہ "راقم" نے کیا "ایک رسول معظم" کیونکہ "رَسُوْلً" پر تنوین تعظیم کیلئے ہے۔ یہ ترجمہ روح المعانی کے ان الفاظ میں دیکھئے "رَسُوْلًا" عظیم القدر، جلیل الشان" عظیم قدر والے اور جلیل شان والے رسول کو بھیجا۔ اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ﴿وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ کا ترجمہ کیا ہے۔ "اور وہ ضرور اس سے پہلے گمراہی میں تھے" "راقم" نے بھی تقریباً یہی ترجمہ نقل کیا ہے، یہ ترجمہ بھی روح المعانی کی اس عبارت میں دیکھئے۔

"(وان) هی المخففة واللام هی الفارقة، والمعنی ان الشان کانوا من قبل الخ" والی

هذا ذهب بعض المحققین و ذکر مثله مکی الا انه قال "التقدیر و انهم کانوا من قبل فجعل اسمها ضمیرا عائدا علی المؤمنین"

یعنی "ان "حقیقت میں حرف مشبہ بالفعل ہے،اوراس میں "نون "مشدد ہے،لیکن مخفف کر کے ساکن کر دیا ہے اسی وجہ سے اس کے بعد "لام "لفی" پرداخل کیا گیا ہے،تاکہ اس سے پتہ چل جائے کہ یہ "ان" "مخففة من المثقلة" ہے۔محققین کا یہی قول ہے۔کہ "ان " کا اسم ضمیر شان ہے،اصل میں "انهم" تحقیق "بے شک "ضرور وہ اس پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ (روح المعانی ج۳ص۱۱۲)

طلباء کرام یہ بھی خیال رکھیں کہ ایک ترکیب میں اس جملہ کو "حالیہ" بنایا گیا ہے،اس کے مطابق ترجمہ یہ ہوگا "حالانکہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ (روح المعانی)ج۳ص۱۱۵)

اور قرطبی میں ایک ترکیب اور بھی بیان کی گئی ہے کہ "ان" نافیہ ہے،"ما" کے معنی میں،اور "الا" محذوف ہے،اس صورت میں معنی یہ ہوگا ﴿مَا كَانُوْا مِنْ قَبْلُ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ نہیں تھے اس سے پہلے مگر وہ کھلی گمراہی میں۔
(قرطبی ج۴ص۲۶۵)

ماقبل سے تعلق:

چند وجوہ سے ماقبل سے رابطہ قائم کیا گیا ہے۔

(۱) اس سے پہلی آیہ کریمہ میں ایک قول بیان کیا گیا کہ بعض جہال ومنافقین نے ایک چادر کے گم ہونے پر (معاذ اللہ) اس خیانت کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف کردی،تو رب تعالی اس کا رد کیا کہ نبی کی شان کے لائق نہیں کہ وہ خیانت کریں۔تو اس آیہ کریمہ میں اس کی مزید تاکید کی،کہ یہ رسول معظم تمہارے شہر میں پیدا ہوئے،تم میں آپ نے جوانی گزاری

"ولم یظهر منه طول عمره الا الصدق و الامانة و الدعوة الی الله و الا عراض عن الدنیا فکیف یلیق بمن هذا حاله الخیانة"

اتنی عمر میں یعنی چالیس سال کے بعد اعلان نبوت فرمایا کیا ان چالیس سالوں میں تم نے ان میں سوائے سچائی اور امانت کے کچھ دیکھا،ہاں ہاں آپ نے تو اللہ تعالی کی وحدانیت اور اس کی عبادت کی دعوت دی خود دنیا سے اعراض کیا مقصد دنیا کا مال ودولت جمع کرنا نہیں تھا بلکہ اللہ تعالی کی رضاء کی خاطر اس کی عبادت میں مشغولیت تھی،جس ذات کے یہ اوصاف تھے بھلا اس سے خیانت ہو سکتی ہے؟نہیں نہیں وہ تو امین ہے،(معاذ اللہ) خائن نہیں۔

(۲) اللہ تعالی نے جب ان لوگوں کی خطاء کو بیان کیا کہ تم نے میرے نبی کی طرف خیانت کو منسوب کیا،یہ تمہارا

قول باطل ہے، اس میں یا جہالت کا دخل ہے یا منافقت کا۔ اس کے بعد گویا کہ رب تعالیٰ نے یوں فرمایا''

لا اقطع بذلک ولا اکتفی فی حقه بان ابین براء ته عن الخاینة والغلول ولکنی اقول ان وجوده فیکم من اعظم نعمتی علیکم فانه یزکیکم عن الطریق الباطلة ویعلمکم العلوم النافعة لکم فی دنیا کم وفی دینکم فای عاقل یخضر بباله ان ینسب مثل هذا الانسان الی الخیانة"

میں صرف اسی پر قناعت نہیں کرتا اور نہ ہی صرف اسے کافی سمجھتا ہوں کہ صرف اتنا ہی بیان کر دوں کہ آپ خیانت سے پاک تھے، بلکہ میں تمہیں یہ بتاتا ہوں کہ میرے معظم نبی کا تم میں پایا جانا میرا تم پر بہت بڑا احسان ہے، تم پر میرا بڑا انعام ہے، کیونکہ میرے نبی تمہیں باطل طریقہ سے پاک کرتے ہیں۔ اور تمہیں وہ علوم سکھاتے ہیں جو تمہارے لئے دین اور دنیا میں نفع مند ہیں، تو کون سا وہ شخص ہوگا جو عقل رکھنے والا ہو وہ اتنے بڑا عظیم انسان کامل، نبی محتشم کی نسبت خیانت کی طرف کرے گا؟ ہاں حقیقت یہ ہے کہ کوئی ایسا جملہ زبان پر لانا جس سے مصطفیٰ کریم ﷺ کی شان میں حرف آئے، اس سے اپنی عاقبت کو ہی برباد کرنا ہے، آپ کی شان کو تو رب قدوس بیان کرتا ہے، دنیا والا آپ کی شان کو بیان کرے تو وہ خوش قسمت ہے، اور نہ بیان کرے تو وہ بدقسمت ہے۔ بات تو اتنی ہی ہے۔ (راقم)

(۳) کانه تعالی یقول انه منکم ومن اهل بلدکم ومن اقاربکم وانتم ارباب الخمول والدناءة فاذا شرفه الله تعالی وخصه بمزایا الفضل والاحسان من جمیع العالمین حصل لکم شرف عظیم بسبب کونه فیکم فطعنکم فیه واجتهاد کم فی نسبة القبائح الیه علی خلاف العقل"

رب تعالیٰ نے گویا کہ یوں بیان فرمایا کہ میرے نبی تم میں سے ہیں۔ اے عربو میرے نبی تمہارے شہر تمہارے علاقہ کے ہیں۔ میرے نبی تمہارے رشتہ دار ہیں۔ لیکن تم گمنام تھے تم گھٹیا تھے، یعنی خاندانی بلندی بیشک تمہیں حاصل تھی لیکن کفر نے تمہیں گھٹیا بنا رکھا تھا، تمہارا اسلامی چرچا نہیں تھا، کافر خواہ مشہور بھی ہو وہ اللہ کے ہاں گمنام ہوتا ہے، سب جہان والوں پر جب اللہ تعالیٰ نے تمہارے ہی خاندان سے ایک فرد عظیم کو مشرف بنایا، بہت بڑے فضل سے نوازا، اور اس ذات کو اپنے خصوصی انعام واحسان سے نواز، تو اس محسن انسانیت کی وجہ سے تمہیں بھی بڑی شرافت مل گئی، تمہارا مرتبہ بھی بلند ہو گیا، اسلام میں تمہارا چرچا ہو گیا، کیونکہ وہ میرے معظم نبی تم میں موجود ہیں، تمہارے خاندان سے ہیں۔ لھذا کوئی مسلمان آپ کی شان میں نازیبا الفاظ بول کر اپنے آپ کو جہنم کا ایندھن نہ بنائے ہاں منافق تو منافق ہے، اسلام کا لبادہ اوڑھ کر، شان مصطفیٰ کریم ﷺ میں ایسے الفاظ ذکر کرے، جن میں گستاخی کا پہلو نکلے اور آپ کی

شان میں بلند وبالا الفاظ استعمال کرنے سے وہ آگ بگولا ہو جائے تو اس کا طریقہ ہی یہی ہے، وہ ہے ہی منافق، مؤمن اور منافق میں فرق کو پہچانئے۔ (راقم)

(۴) جب نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ نے شرافت ومنقبت عطاء فرمائی، اور آپ کی وجہ سے آپ کی امت کو شرافت ومنقبت حاصل ہوگئی "وجب علی کل عاقل ان بعینه باقصی مایقدر علیه" تو ضروری ہے ہر عقلمند شخص کیلئے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی اپنی قدرت وسعت کے مطابق زیادہ سے زیادہ امداد کرے۔

"فوجب علیکم ان تحاربوا اعداء ہ وان تکونوا معه بالید واللسان والسیف والسنان والمقصود منه العود الی ترغیب المسلمین فی مجاهدة الکفار"

لھذا تم پر واجب ہے کہ تم نبی کریم ﷺ کے دشمنوں یعنی کفار سے لڑائی کرو، اور نبی کریم ﷺ کا ہاتھ اور زبان اور تلوار اور نیزے سے ساتھ دو، آیۃ کریمہ کے مقاصد میں سے ایک یہ مقصد بیان کرنا بھی مقصود ہے کہ مسلمانوں کو کفار سے جہاد کرنے کی رغبت دلائی جائے۔ (کبیر ج۹ ص۷۷، ۷۸)

لفظ "مَنّ" کے معانی:

"واصل المن القطع" اصل میں "من" جو بنی اسرائیل پر آسمانوں سے نازل ہوا ﴿وَاَنْزَلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰی﴾ (اور ہم نے نازل کیا تم پر من اور سلوی)

(۲) "وثانیھا ان تمن بما اعطیت" دوسرا معنی ہے کسی پر احسان کر کے جتلانا، رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، "لاتبطلوا صدقاتکم بالمن والاذی" (نہ باطل کرو تم اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور ایذاء پہنچا کر)

(۳) وثالثھا القطع تیسرا معنی ہے قطع کرنا، ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ﴾ (سورۃ التین، آیۃ نمبر۶) انہیں بے حد ثواب ہے، (سورۃ القلم، آیۃ نمبر۳) اور ضرور تمہارے لئے بے انتہاء ثواب ہے) یعنی آپ کیلئے منقطع نہ ہونے والا اجر ہے۔

(۴) "ورابعھا الانعام والاحسان الی من لاتطلب الجزاء منه" چوتھا معنی "من" کا یہ لیا گیا ہے کہ انعام واحسان کرنا جس کی جزاء نہ طلب کی جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ھٰذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ اَوْاَمْسِکْ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ (سورۃ ص، آیۃ نمبر۳۹)

یہ ہماری عطاء ہے اب تو چاہے تو احسان کر یا روک رکھ تجھ پر کچھ حساب نہیں۔ (کنز الایمان)

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَاتَمْنُنْ تَسْتَکْثِرُ﴾ اور زیادہ لینے کی نیت سے کسی پر احسان نہ کرو۔

فائدہ: یہاں چوتھا معنی معتبر ہے یعنی رب تعالی کا مؤمنین پر بہت بڑا انعام، بہت بڑا فضل واحسان ہے کہ اس نے ان میں اپنے رسول معظم کو مبعوث فرمایا، جس پر اس نے کوئی اجر طلب نہیں کیا، بھلا اتنے بڑے انعام پر کوئی اجر دے بھی سکتا ہے، نہیں نہیں کسی کے بس کی بات ہی نہیں کہ وہ اس احسان عظیم کا بدلہ دے سکے۔ (راقم)

بعثت رسول کل جہانوں پر احسان ہے:

"ان بعثة الرسول احسان الی کل العالمین" بیشک رسول اللہ ﷺ کو رب تعالی کا بھیجنا تمام جہانوں پر احسان عظیم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو اس لئے مبعوث فرمایا گیا کہ آپ ان کو اس راہ حق کی دعوت دیں جو ان کو اللہ تعالی کے عذاب سے چھڑائے اور ثواب تک پہنچائے۔

وھذا عام فی حق العالمین لأنہ مبعوث الی کل العالمین، کما قال اللہ تعالی ﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ﴾

یہ احسان عظیم سب جہانوں کی مخلوق پر ہے، کیونکہ آپ کو تمام جہانوں کا رسول بنا کر بھیجا گیا۔

رب تعالی نے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا وَّلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ﴾ (سورۃ سبا، آیۃ نمبر ۲۸)

اور اے محبوب ہم نے تم کو نہ بھیجا مگر ایسی رسالت سے جو تمام آدمیوں کو گھیرنے والی ہے، خوشخبری دیتا اور ڈر سناتا، لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔ (کنز الایمان)

اس آیۃ کریمہ کے ﴿وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ﴾ سے ہی مسئلہ کھل کر واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ تمام مخلوق کے رسول ہیں کیونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے، جب آپ تمام انسانوں کے رسول ہیں تو یقیناً تمام مخلوق کے رسول ہیں، اسلئے آپ کا تشریف لانا تمام انسانوں پر احسان عظیم ہے

"لما لم ینتفع بھذا الانعام الا اھل الاسلام فلھذا التاویل خص تعالی ھذا المنة بالمؤمنین"

لیکن اس عظیم انعام سے نفع اہل اسلام نے حاصل کیا، اکثر لوگوں نے آپ کو نہ جانا کہ آپ سید الکائنات ہیں، آپ محسن عظیم ہیں تو وہ اپنی اس غفلت کی وجہ سے آپ کے انعام واحسان سے کامل فائدہ حاصل نہ کر سکے اسی وجہ سے ایمان والوں کا خصوصی ذکر کیا گیا، یہ اسی طرح ہے جیسا کہ قرآن پاک کے متعلق فرمایا "ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ" **مع انہ ھدی للکل، کما قال اللہ تعالی** "ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ" یہ ہدایت ہے پرہیزگاروں کیلئے، حالانکہ قرآن پاک تمام لوگوں کیلئے ہدایت ہے، کیونکہ رب تعالی نے خود ارشاد فرمایا "ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ" کہ قرآن پاک تمام لوگوں کیلئے ہدایت

ہے، لیکن اس ہدایت کو قبول کرنے والے متقین تھے، اس لئے ان کا خصوصی ذکر "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" سے کر دیا۔
اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا﴾ (سورۃ النازعات، آیہ نمبر ۴۵)
تم تو فقط اسے ڈرانے والے ہو جو اس سے ڈرے، حالانکہ ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ تمام لوگوں کیلئے نذیر (ڈرانے والے) کا ذکر ہے، لیکن اس ڈر سے فائدہ ان لوگوں نے ہی حاصل کیا جن کو خوف خدا حاصل ہوا۔
(ماخوذ از کبیر ج ۹ ص ۷۸)

تمام رسولوں کی بعثت احسان ہے لیکن احسان عظیم بعثت مصطفیٰ ﷺ ہے:

اعلم ان بعثة الرسول احسان من الله الى الخلق ثم انه لما كان الانتفاع بالرسول اكثر كان وجه الانعام فى بعثة الرسل اكثر"

تمام رسولوں کا بھیجنا اللہ تعالیٰ کا مخلوق پر احسان ہے لیکن ہمارے رسول اللہ ﷺ احسان عظیم ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ رسولوں کی وجہ سے لوگوں کو نفع حاصل ہوا جس کی وجہ سے وہ ان کے محسن ٹھہرے، جب سب سے زیادہ نفع زیادہ انسانوں کو نبی کریم ﷺ سے حاصل ہوا تو آپ کا محسن عظیم ہونا بھی روز روشن کی طرح واضح ہو گیا۔ (کبیر ج ۹ ص ۷۸)

آپ کی بعثت کے احسان عظیم ہونے پر دو وجہ سے دلیل:

"احدهما المنافع الحاصلة من اصل البعثة" ایک دلیل یہ ہے کہ آپ کو بھیجنے میں ہی منافع حاصل ہیں، یعنی آپ کی اصل بعثت میں منافع پائے گئے۔ "والثانى المنافع الحاصلة بسبب مافيه من الخصال التى ماكانت موجودة فى غيره" دوسری دلیل یہ ہے کہ آپ کی صفات خصوصیہ وہ ہیں جو دوسروں کو حاصل نہیں، ان صفات کی وجہ سے مخلوق کو منافع حاصل ہیں۔

اصل بعثت کی وجہ سے منافع:

"رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا" ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (سورۃ النساء، آیہ نمبر ۶۵) رسول بشارت دیتے اور ڈر سناتے تا کہ لوگوں کو اللہ کے ہاں رسولوں کے بعد حجت نہ رہے۔

بعثت رسول سے انتفاع کی چند وجوہ:

(۱) مخلوق پیدائشی طور پر صفت نقصان میں ہوتی ہے، اور اس میں سمجھ کی کمی ہوتی ہے۔ بلکہ عقل ابتدائی طور پر نہ

ہونے کے برابر ہوتی ہے

"فھو صلوات الله علیه والسلام اور دعلیھم وجوه الدلائل ونقحھا و کلما خطر ببا لھم شک او شبھة ازالھا واجاب عنھا"

تو اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ ان پر دلائل قائم کرتے ہیں۔ خالص اور پختہ دلائل ہوتے ہیں، جب بھی ان کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں تو وہ ان کو زائل کرتے ہیں۔

(۲) مخلوق کو اگر چہ معلوم ہوتا ہے کہ مولی کی خدمت کرنی چاہیے، لیکن وہ خدمت کی کیفیت کو نہیں جانتے کہ خدمت کا حق کس طرح بجالایا جائے،

"فھو ﷺ شرح تلک الکیفیة لھم حتی یقدموا علی الخدمة آمنین من الغلط ومن الاقدام علی مالاینبغی"

تو نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا جنہوں نے اس کیفیت کی ان کیلئے وضاحت فرمائی، تا کہ وہ اپنے مولی کی خدمت کا حق اس طرح بجالانے کا حق ہے۔ اور وہ اس خدمت کی غلطی سے محفوظ رہیں۔ اور نامناسب طریقہ کی طرف قدم نہ بڑھائیں۔

(۳) مخلوق میں سستی، غفلت، کسی کام میں تاخیر اور ملال پیدائشی طور پر پائے جاتے ہیں۔

"فھو ﷺ یورد علیھم انواع الترغیبات والترھیبات حتی انه کلما عرض لھما کسل اوفتور نشطھم للطاعة ورغبھم فیھا"

تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا، جنہوں نے ان کو نیکی کے کاموں کی رغبت دلائی، اور گناہوں سے ڈرایا ، یہاں تک کہ جب ان کو سستی یا فتور عارضی ہوئے تو نبی کریم ﷺ نے ان کو طاعت کیلئے چست کیا، اور ان کو ان کاموں کی رغبت دلائی۔

(۴) مخلوق کے عقل کے انوار بصر کے انوار کے قائم مقام ہوتے ہیں۔ نظر کے نور سے انسان اس وقت تک فائدہ حاصل نہیں کرسکتا جب تک سورج کی روشنی نہ ہو۔

"ونوره ﷺ عقلی الھی یجری مجری طلوع الشمس فبقوی العقول بنور عقله ویظھر لھم من لوائح الغیب ماکان مستترا عنھم قبل ظھوره فھذا اشارة حقیقیة الی فوائد اصل البعثة"

نبی کریم ﷺ کا نور عقل الہی ہے جو دنیا میں روشنی بکھیر رہا ہے جیسا کہ سورج سے روشنی سے دن روشن ہو جاتا ہے، اسی

طرح نبی کریم ﷺ جو عقل الٰہی ہیں آپ کے نور سے لوگوں کی عقلوں کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ آپ کی تشریف آوری سے پہلے جو چیزیں لوگوں پر غائب تھیں وہ آپ کے آنے سے ان پر ظاہر ہو گئیں۔ یہ آپ کی اصل بعثت کے فوائد اسی آیۃ کریمہ سے حاصل ہوئے۔ (کبیر ج۹ ص ۷۸، ۷۹،)

سبحان اللہ! کیا خوب علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ آپ کے آنے سے لوگوں پر غیبی چیزوں کو ظاہر کر دیا، یعنی آپ کے وسیلہ جلیلہ سے آپ کی امت کو بھی بعض علوم غیبیہ عطاء کر دئے گئے، عجیب ہیں ان لوگوں کے نظریات جو نبی کریم ﷺ کے علوم غیبیہ میں شک میں مبتلاء رہ کر اپنی عاقبت کو برباد کرتے رہتے ہیں۔

آپ کی صفات سے حاصل ہونے والے فوائد:

(۱) اس آیۃ کریمہ میں بیان فرمایا "مِنْ اَنْفُسِهِمْ" (کہ آپ ان سے ہی تشریف لائے) جب نبی کریم ﷺ ان کے شہر میں پیدا ہوئے اور ان لوگوں میں ہی آپ نے پرورش پائی وہ آپ کے تمام افعال واقوال (آپ کے کاموں، آپ کی باتوں) پر مطلع تھے، انہوں نے نبی کریم ﷺ کی اول عمر سے لے کر آخر عمر تک سوائے سچائی اور درگذر کے کسی چیز کا مشاہدہ نہیں کیا، کیونکہ آپ کو دنیا سے کوئی محبت نہ تھی، آپ دنیا سے دور رہتے تھے، اور جھوٹ آپ کے قریب نہیں آسکتا تھا، اور سچائی ہی آپ کا شیوہ تھی۔

"ومن عرف من احواله من اول العمر الى آخره ملازمته الصدق والامانة وبعده عن الخيانة والكذب يغلب على ظن كل احد انه صادقه في هذا الدعوى"

جب نبی کریم ﷺ نے نبوت کا دعویٰ فرمایا تو لوگوں کو یقین ہو گیا، بعض کو غالب گمان حاصل ہو گیا کہ آپ اپنے اس دعویٰ میں سچے ہیں کیونکہ وہ لوگ آپ کی ساری زندگی کا مطالعہ کر چکے تھے ان کو معلوم تھا کہ آپ نے ہمیشہ ہمیشہ سچ بولا، آپ نے ہمیشہ امانت کا پاس کیا، آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، آپ نے کبھی امانت میں خیانت نہیں کی، تو آپ اپنی نبوت کے دعویٰ میں بھی یقیناً سچے ہیں۔

(۲) "مِنْ اَنْفُسِهِمْ" سے ہی اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ وہ لوگ جانتے تھے کہ آپ نے نہ ہی کسی کی شاگردی حاصل کی، اور نہ ہی کسی سے کوئی کتاب پڑھی، اور نہ ہی کسی درس میں داخلہ لیا، اور نہ ہی کسی سے اسباق کا تکرار کیا، اور بیشک آپ نے چالیس سال تک کوئی نبوت ورسالت کی بات نہیں کی، پھر چالیس کے بعد آپ نے نبوت کا دعویٰ کیا، اور آپ نے اپنی زبان مبارک سے وہ علوم ظاہر فرمائے جو جہان والوں میں سے کسی ایک نے بھی ظاہر نہیں کئے، پھر آپ نے متقدمین کے واقعات بیان فرمائے، اور پہلے انبیاء کرام کے واقعات اس طرح بیان فرمائے جیسے

ان کی کتب میں موجود تھے، ہر وہ شخص جو عقل سلیم رکھتا تھا اسے پتہ چل گیا "ان هذا لایتأتی الابالوحی السماوی والالهام الالهی" کہ بیشک آپ کو یہ علوم صرف آسمانی وحی اور الہام الٰہی سے حاصل ہوئے ہیں۔

(۳) "انه بعدا دعاء النبوة عرضوا علیه الاموال الکثیرة والازواج لیترک هذه الدعوی فلم یلتفت الی شیء عن ذلک"

آپ نے نبوت کا دعوی کیا تو آپ کو بہت بڑے مال کی پیشکش کی گئی، اور آپ کو یہ کہا گیا جس خاندان کی اور جس گھر کی آپ لڑکی پسند کریں آپ کو اسی سے شادی کرادی جائے گی۔ لیکن آپ یہ دعوی نبوت چھوڑ دیں، آپ نے ان کی ہر قسم کی پیشکش کو ٹھکرا دیا، رب تعالی کے احکام لوگوں تک پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھا، آپ نے فقر پر قناعت کی یعنی آپ نے غریبانہ زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی، اور آپ نے ہر قسم کی مشقت پر صبر کیا۔

❁ "ولما علا امره وعظم شانه واخذ البلاد وعظمت الغنائم لم یغیر طریقه فی البعد عن الدنیا والدعوة الی الله والکاذب انما یقدم علی الکذب لیجد الدنیا فاذا وجدها تمتع بها وتوسع فیها فلما لم یفعل شیئا من ذلک علم انه کان صادقا"

جب آپ کے معاملات بڑھتے چلے گئے، آپ کی عظمت شان نکھرتی چلی گئی، اور آپ نے مختلف شہروں کو فتح کرلیا، آپ کے پاس کثیر مال غنیمت آ گیا، لیکن آپ جس طرح پہلے دنیا سے دور تھے اسی طرح دور رہے، اللہ تعالی کی طرف دعوت کا سلسلہ جاری رکھا، آپ کے طور طریقہ نہیں بدلے، جھوٹا شخص دنیا کا مال بٹورنے کیلئے مختلف جھوٹے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے، جب وہ دنیا کا مال پالیتا ہے اور اسے مالی وسعت مل جاتی ہے، تو وہ اپنے طور طریقے بدل لیتا ہے۔ تو اسی سے واضح ہو گیا کہ میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ اللہ تعالی کے سچے نبی ہیں۔

(۴) ان الکتاب الذی جاء به لیس فیه الاتقریر التوحید والتنزیه والعدل والنبوة والبات المعاد وشرح العبادات وتقریر الطاعات ومعلوم ان کمال الانسان فی ان یعرف الحق لذاته والخیر لأجل العمل به ولما کان کتابه لیس الافی تقریر هذین الامرین علم کل عاقل انه صادق فیما یقوله"

بیشک آپ نے جو کتاب رب تعالی کی طرف سے پیش کی اس میں توحید اور اللہ تعالی کا ہر نقص سے پاک ہونے کا تذکرہ ہے۔ عدل اور نبوت کا ذکر اس میں موجود ہے، قیامت کا ذکر اس میں پایا گیا ہے۔ عبادات کی وضاحت اور طاعات کا بیان اس میں ہے۔ اور یہ بات یقینی طور پر معلوم ہے کہ انسان کو کمال اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ حق کو لذاتہ پہچانے، اور خیر کو اس پر عمل کرنے کیلئے

پہچانے، جب اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ان دونوں چیزوں کا ذکر ہے یعنی حق اور خیر کا تو ہر عقلمند شخص کو معلوم ہو گیا کہ آپ اپنے دعویٰ نبوت میں سچے ہیں۔

(۵) نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے عرب حضرات کا دین سب سے گھٹیا دین تھا، کیونکہ وہ بت پرست تھے، ان کے اخلاق بڑے پست اور رذیل تھے، لوٹ مار کرنا، قتل و غارت ان کا عمل تھا، اور ردی طعام، ناپاک یعنی حرام طعام کھانا ان کا طریقہ تھا۔

❁ "ثم لما بعث الله محمد ﷺ نقلهم الله ببركة مقدمة من تلك الدرجة التي هي اخس الدرجات الى ان صاروا افضل الأمم في العلم والزهد والعبادة وعدم الالتفات الى الدنيا وطيباتها ولاشك ان فيه اعظم المنة"

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی محمد رسول اللہ ﷺ کو بھیجا، تو آپ کے آنے کی برکت کی وجہ سے ان کے گھٹیا درجات جاتے رہے وہ علم وزہد اور عبادت میں تمام امتوں سے افضل ہو گئے، ان کی دنیا کی طرف توجہ ختم ہو گئی، صرف اور صرف حلال مال پر گذر اوقات کی، خواہ وہ حلال مال ان کو کم ہی حاصل ہوا، اس میں کوئی شک نہیں، یہ یقین کے درجہ تک پہنچی ہوئی بات ہے کہ آپ کا تشریف لانا مؤمنوں کیلئے بہت بڑا احسان ہے۔

جب تمام وجوہ مذکورہ کا تمہیں پتہ چل گیا کہ بیشک نبی کریم ﷺ ان میں پیدا ہوئے، انہیں میں پرورش پائی، ان لوگوں نے آپ کے احوال کا مشاہدہ کیا، ان دلائل پر مطلع ہو گئے، تو ان کو آپ کے احوال کے مشاہدہ سے ایمان لانا آسان ہو گیا، اگر وہ لوگ آپ کے احوال کو نہ جانتے تو شائد ایمان لانے میں وہ مضطرب و پریشان ہوتے

"فلهذه المعاني من الله عليهم بكونه مبعوثا، فقال" "اِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ اَنْفُسِهِمْ"

ان اسباب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا مومنوں پر بہت بڑا احسان ہے کہ اپنے رسول معظم کو ان کے نفوس سے ہی بھیجا۔

"فيه وجه آخر من المنة وذلك لانه صار شرفا للعرب وفخرا لهم، كما قال الله تعالى وانه لذكر لك ولقومك"

آپ کے تشریف لانے سے مومنوں پر اور بڑا احسان یہ بھی تھا کہ ان کو عرب میں ایک خاص شرافت حاصل ہو گئی۔ اور آپ کی وجہ سے ان کو مقام افتخار (فخر کرنے کا ذریعہ) حاصل ہو گیا۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ﴾ یہ افتخار اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وجہ سے بھی حاصل تھا، لیکن وہ مومنین کے ساتھ خاص نہ تھا، بلکہ عرب اور یہود و نصاریٰ اس میں مشترک تھے۔ پھر یہود موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ پر فخر کرتے تھے، اور نصرانی

عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل پر فخر کرتے تھے، لیکن عرب حضرات کو ان کے مقابل کوئی مقام فخر حاصل نہ تھا۔

"فلما بعث الله محمدا ﷺ وانزل القرآن صار شرف العرب بذلک زائدا علی شرف جمیع الأمم"

جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا اور قرآن پاک نازل فرمایا تو تمام عرب حضرات کو دوسری تمام امتوں پر شرف حاصل ہوگیا۔ یہ تمام فوائد جو ابھی تک ذکر کئے گئے ہیں یہ "مِنْ اَنْفُسِهِمْ" (انہیں سے (آپ تشریف لائے) سے حاصل ہوئے۔

ابھی بیان کیا گیا ہے کہ انسان کا کمال دو چیزوں میں ہے۔ ایک حق کو لذاتہ پہچانتے ہیں، اور دوسرا بھلائی کا حصول کہ وہ بھلائی نیکی کے کام کرے۔ اسی مسئلہ کو یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے "للنفس الانسانیة قوتان نظریة وعملیة" نفس انسانیت کو دو قوتیں حاصل ہیں، ایک قوت نظریہ، اور دوسری قوت عملیہ، تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب نازل فرما کر دونوں قوتوں کی تکمیل فرمادی۔

❁ "فقوله تعالیٰ (یَتْلُوْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ) اشارة ای کونه مبلغا لذلک الوحی من عند الله الی الخلق، وقوله (وَیُزَکِّیْهِمْ) اشارة تکمیل القوة النظریة بحصول المعارف الالهیة والکتاب اشارة الی محاسن الشریعة واسرارها وعللها ومنافعها"

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: ﴿یَتْلُوْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ﴾ "آپ تلاوت کرتے ہیں ان پر اس کی آیتیں" اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی وحی کو مخلوق تک پہنچاتے ہیں۔ یہ درحقیقت مخلوق کی قوت عملیہ کی تکمیل ہے کہ وہ کتاب اللہ کے احکام پر عمل کریں۔

اور (وَیُزَکِّیْهِمْ) (اور پاک کرتا ہے ان کو) سے اس طرف اشارہ کیا جارہا ہے کہ ان لوگوں کو آپ معارف الٰہیہ عطاء فرما کر ان کی قوت نظریہ کی تکمیل فرماتے ہیں۔ اور "وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ" (اور وہ سکھاتا ہے ان کو کتاب) سے اشارہ ہے معرفت تاویل کی طرف۔

"وبعبارة اخری (الْکِتٰبَ) اشارة الی ظواهر الشریعة (والحکمة) اشارة الی محاسن الشریعة واسرارها عللها ومنافعها"

اسے یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ "وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ" سے اشارہ ظاہر شریعت کی طرف ہے کہ آپ ان کو شریعت کے احکام سکھاتے ہیں، اور "وَالْحِکْمَةَ" سے اس طرف اشارہ پایا گیا ہے کہ آپ ان کو شریعت کے محاسن اور اس کے راز اور اس کی علتیں اور منافع سکھاتے ہیں۔ ان تمام نعمتوں کی تکمیل اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد گرامی سے

فرمائی ''وَاِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ''اور بیشک وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

''ان النعمة اذا وردت بعد المحنة کان توقعا اعظم،فاذا کان وجه النعمة العلم

• والاعلام وورد اعقیب الجهل والذهاب عن الدین کان اعظم''

قانون یہی ہے کہ جب نعمت کا حصول محنت کے بعد ہو تو اس پر عظیم توقع مرتب ہوتی ہے،اور عظیم فوائد اس پر مرتب ہوتے ہیں،جب جہالت اور دین کے جانے کے بعد رب تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کے ذریعے ان کو علم عطاء فرمایا اور ان کو معلم بنایا تو یقیناً آپ ایمان والوں کیلئے بہت بڑی نعمت ثابت ہوئے۔ (ماخوذ از کبیر ج ص ۷۸ تا ۸۰)

میلاد النبی ﷺ کے متعلق کچھ ذکر خیر:

سب سے بڑی بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ آجکل مختلف عنوانات سے ربیع الاول میں جلسے ہو رہے ہیں،کسی کا نام ''پیغمبر انقلاب کانفرنس''کسی کا نام ذکر'' ولادت مصطفیٰ ﷺ کانفرنس''اور کسی کا نام ''سیرت النبی ﷺ کانفرنس''کسی کا نام،حسن قراءۃ وحمد ونعت کانفرنس یہ عنوانات ان حضرات نے قائم کر رکھے ہیں جو بات بات پر بدعت کا فتویٰ دیتے ہیں،اور ''میلاد النبی ﷺ'' کے نام سے کئے جانے والے جلسہ سے پتہ نہیں کیوں ناراض ہوتے ہیں،جب ان کا کوئی عنوان کسی حدیث پاک سے ثابت نہیں۔لیکن میلاد النبی ﷺ کا عنوان تو صحاح ستہ میں سے ترمذی رحمہ اللہ نے خود قائم کیا ہے۔''باب میلاد النبی ﷺ''اسی باب میں یہ حدیث ذکر کی:

''عن المطلب ابن عبد الله بن قیس بن مخرمة عن ابیه عن جده قال ولدت انا ورسول الله اعام الفیل قال وسأل عثمان بن عفان قباث بن اشیم اخابنی یعمر بن لیث انت اکبرام رسول الله ﷺ فقال رسوال الله ﷺ اکبر منی وانا اقدم منه فی المیلاد وقال ورأیت خذق اخضر محیل'' (ترمذی ج ۲ ص ۲۰۲)

عبد المطلب بن عبد اللہ بن قیس بن مخرمہ اپنے باپ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میری اور رسول اللہ ﷺ کی ولادت عام الفیل ابرہیہ کے ہاتھیوں پر حملہ کرنیوالے سال میں ہوئی وہ کہتے ہیں عثمان بن عفان نے بنی یعمر بن لیث کے بھائی قباث بن اشیم سے پوچھا کیا تم بڑے ہو یا رسول اللہ ﷺ بڑے ہیں؟ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ مجھ سے بڑے ہیں۔لیکن ولادت میری آپ سے پہلے ہوئی''میں نے ابابیل پرندوں کی سبز رنگ کی بیٹ (فضلہ) متغیر (بدلی ہوئی) دیکھی۔

راقم نے کبھی کسی عنوان پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ خیال یہ ہوتا ہے کے میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کا

ذکر ہوتا رہے خواہ کسی نام سے بھی ہوتا رہے۔ میلادالنبی ﷺ کے محافل و مجالس میں آپ کے فضائل کو ذکر کیا جاتا ہے۔ ابھی جو آیہ کریمہ زیر بحث ہے اس میں نبی کریم ﷺ کی فضیلت کا ہی ذکر تو موجود ہے، قرآن پاک نبی کریم ﷺ کے اوصاف کے ذکر سے بھرا ہوا ہے، اس کا نام میلادالنبی ﷺ کا ذکر ہی تو ہے۔

میلادالنبی ﷺ کا جلسہ جو رب تعالیٰ نے قائم کیا:

وَاِذْاَخَذَاللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآاٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَامَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ قَالَ ءَ اَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْھَدُوْا وَاَنَامَعَکُمْ مِّنَ الشّٰھِدِیْنَ O (سورۃ آل عمران، آیۃ نمبر ۸۱)

اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں، پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول کہ تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائے تو تم ضرور بر ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا فرمایا کیوں تم نے اقرار کیا اور اس پر بھاری ذمہ اٹھایا سب نے عرض کی ہم نے اقرار کیا فرمایا تو ایک دوسرے پر گواہ ہو جاؤ اور میں آپ تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔ (کنزالایمان)

حضرت علی ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ نے حضرت آدم اور ان کے بعد جس کسی کو نبوت عطاء فرمائی ان سے سید انبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ کی نسبت عہد لیا اور ان انبیاء نے اپنی قوموں سے عہد لیا کہ اگر ان کی حیات میں سید عالم ﷺ مبعوث ہوں تو آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی نصرت کریں اس سے ثابت ہوا کہ حضور تمام انبیاء میں سب سے افضل ہیں۔ "ثُمَّ جَاءَ کُمْ رَسُوْلٌ" سے مراد سید عالم ﷺ ہیں۔ "لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ" تو تم ضرور بر ضرور اس پر ایمان لانا" یعنی اس طرح ایمان لانا کہ ان کے صفات و احوال کو یوں تسلیم کرنا جو آپ کے مطابق ہوں اور کتب انبیاء کرام میں موجود ہوں۔ قرآن و حدیث میں ان کا تذکرہ ہو۔ (ماخوذ از خزائن العرفان)

آیۃ کریمہ کی مکمل تفسیر اپنے محل میں بیان ہو چکی ہے، یہ جلسہ ارواح انبیاء کرام میں کیا گیا۔

نبی ﷺ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے:

﴿مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ﴾ (سورۃ النساء، آیۃ نمبر ۸۰) "جس نے رسول کا حکم مانا بیشک اس نے اللہ کا حکم مانا"

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو راضی کیا جائے:

﴿یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ لَکُمْ لِیُرْضُوْکُمْ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗٓ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْہُ اِنْ کَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ﴾ (سورۃ التوبۃ، آیۃ نمبر ۶۲)

تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں اٹھاتے ہیں کہ تمہیں راضی کرلیں اور اللہ ورسول کا حق زائد تھا کہ اسے راضی کرتے اگر ایمان رکھتے تھے۔ (کنزالایمان)

منافقین اپنی مجالس میں سید عالم ﷺ پر طعن کیا کرتے تھے اور مسلمانوں کے پاس آکر اس سے مکر جاتے تھے اور قسمیں اٹھا اٹھا کر اپنی بریت ثابت کرتے تھے، اس پر یہ آیۃ نازل ہوئی اور فرمایا گیا کہ مسلمانوں کو راضی کرنے کیلئے قسمیں اٹھانے سے زیادہ اہم اللہ اور اس کے رسول کو راضی کرنا تھا اگر ایمان رکھتے تھے تو ایسی حرکتیں کیوں کیں جو خدا اور رسول کی ناراض کا سبب ہوں۔

فائدہ: اس آیۃ کریمہ سے یہ پتہ چلا کہ اس وقت جلسے دو قسم کے ہوتے تھے ایک وہ جس میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف بیان ہوتے تھے، وہ جلسہ اللہ نے منعقد فرمایا، انبیاء کرام نے آپ کے اوصاف بیان کئے، صحابہ کرام نے آپ کے اوصاف کا تذکرہ کیا، خود نبی کریم ﷺ نے اپنے اوصاف اور اپنی ولادت کا ذکر کیا، محدثین کرام نے آپ کی ولادت کا ذکر کیا، جیسا کہ ترمذی کی حدیث بیان کی جاچکی ہے۔

اور دوسرا جلسہ منافقین کا ہوتا تھا جو نبی کریم ﷺ کے خلاف ان کا کلام ہوتا تھا، پھر اس کا انکار بھی کرتے تھے کہ نہیں ہم تو نبی کریم ﷺ کے اوصاف بیان کررہے تھے، آج کل بھی یہی طریقہ چلا آرہا ہے، ربیع الاول میں جلسے دو قسم کے ہی ہورہے ہیں، ایک اہل سنت وجماعت کا جس میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف وفضائل بیان ہوتے ہیں، اور کچھ حضرات کی مجالس میں کفر وشرک وبدعات کا ذکر ہوتا ہے، بتوں کے حق میں نازل ہونے والی آیات انبیاء کرام اور اولیاء کرام پر چسپاں کی جاتی ہیں، اور کافروں اور مشرکوں کے حق میں نازل ہونے والی آیات کی لپیٹ میں مسلمانوں کو لیا جاتا ہے۔ یہ ظلم عظیم نہیں تو اور کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے میلاد کا ذکر کیا:

مجموعی طور پر تمام انبیاء کرام کا ذکر اس آیۃ کریمہ میں کیا ﴿تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ﴾ (سورۃ البقرۃ، آیۃ ۲۵۳) ''یہ رسول ہیں ہم نے فضیلت دی بعض کو بعض پر۔''

آدم کا تذکرہ آپ کی تخلیق سے پہلے یوں کیا:

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ (سورۃ البقرۃ آیۃ نمبر ۳۰)

''آپ کی تخلیق کے بعد آپ کا ذکر رب قدوس نے یوں کیا''

﴿قَالَ یٰۤاِبۡلِیۡسُ مَامَنَعَکَ اَنۡ تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِیَدَیَّ﴾ (سورۃ ص، آیۃ نمبر ۷۵)

فرمایا اے ابلیس تجھے کس چیز نے روکا سجدہ کرنے سے اسے جسے میں نے دست قدرت سے بنایا۔

حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر فرماتے ہوئے یوں فرمایا:

﴿اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖۤ اَنۡ اَنۡذِرۡ قَوۡمَکَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ﴾ (سورۃ نوح، آیۃ نمبر ۱)

بیشک ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا کہ ان کو ڈرا اس سے پہلے کہ ان پر دردناک عذاب آئے۔ (کنز الایمان)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر یوں فرمایا:

﴿وَاذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ اِبۡرٰہِیۡمَ اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیۡقًا نَّبِیًّا﴾ (سورۃ مریم، آیۃ نمبر ۴۱)

''اور کتاب میں ابراہیم کو یاد کرو بیشک وہ صدیق تھا (اور) نبی'' (کنز الایمان)

حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَامۡرَاَتُہٗ قَآئِمَۃٌ فَضَحِکَتۡ فَبَشَّرۡنٰہَا بِاِسۡحٰقَ وَمِنۡ وَّرَآءِ اِسۡحٰقَ یَعۡقُوۡبَ﴾ (سورۃ ہود، آیۃ نمبر ۷۱)

''اور اس کی بی بی کھڑی تھی وہ ہنسنے لگی تو ہم نے اسے اسحاق کی خوشخبری دی اور اسحاق کے پیچھے یعقوب کی۔''

اس پہلے آیۃ نمبر ۶۹ میں یوں ذکر کیا ﴿وَلَقَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُنَاۤ اِبۡرٰہِیۡمَ بِالۡبُشۡرٰی قَالُوۡا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ﴾ اور بیشک ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس مژدہ لے کر آئے، انہوں نے سلام کہا، آپ نے (بھی) سلام کہا۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا تذکرہ یوں کیا:

﴿وَاذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ اِسۡمٰعِیۡلَ اِنَّہٗ کَانَ صَادِقَ الۡوَعۡدِ وَکَانَ رَسُوۡلًا نَّبِیًّا﴾ (سورۃ مریم، آیۃ نمبر ۵۴)

''اور کتاب میں اسمٰعیل کو یاد کرو بیشک وہ وعدے کا سچا تھا اور رسول تھا غیب کی خبریں بتاتا'' (کنز الایمان)

حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر یوں فرمایا:

﴿وَاذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ اِدۡرِیۡسَ اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیۡقًا نَّبِیًّا ٭ وَّرَفَعۡنٰہُ مَکَانًا عَلِیًّا ٭﴾ (سورۃ مریم، آیۃ نمبر ۵۶، ۵۷)

اور کتاب میں ادریس کو یاد کرو بیشک وہ صدیق تھا غیب کی خبریں دیتا، اور ہم نے اسے بلند مکان پر اٹھالیا۔

حضرت اسمعیل، حضرت ادریس اور حضرت ذوالکفل علیہم السلام کا تذکرہ یوں کیا:

﴿وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِدْرِیْسَ وَذَاالْکِفْلِ کُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیْنَ ۝ وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِیْ رَحْمَتِنَا اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ (سورۃ الانبیاء، آیۃ نمبر ۸۵، ۸۶)

اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل کو یاد کرو وہ سب صبر والے تھے، اور انہیں ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا بیشک وہ ہمارے قرب خاص کے سزاواروں میں ہیں۔ (کنزالایمان)

حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہم السلام کا ذکر یوں کیا:

﴿وَزَکَرِیَّا اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَوَهَبْنَا لَهٗ یَحْیٰی﴾ (سورۃ الانبیاء، آیۃ نمبر ۸۹، ۹۰)

''اور (یاد کرو) زکریا کو جب اس نے اپنے رب کو پکارا اے میرے رب! مجھے اکیلے نہ چھوڑ اور تو سب سے بہتر وارث ہے، تو ہم نے اس کی دعاء قبول کی اور اسے یحییٰ عطاء فرمایا۔''

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام کا ذکر یوں فرمایا:

﴿وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ مُوْسٰی اِنَّهٗ کَانَ مُخْلَصًا وَّکَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا ۝ وَنَادَیْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَیْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِیًّا ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِیًّا﴾

اور کتاب میں موسیٰ کو یاد کرو بیشک وہ چنا ہوا تھا اور رسول تھا غیب کی خبریں بتانے والا، اور اسے ہم نے طور کی داہنی جانب سے ندا فرمائی اور اسے اپنے راز کہنے کو قریب کیا، اور اپنی رحمت سے اس کا بھائی ہارون عطاء کیا غیب کی خبریں بتانے والا نبی۔ (کنزالایمان، سورۃ مریم آیۃ نمبر ۵۱ تا ۵۳)

حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر یوں فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ عِلْمًا وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰی کَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَوَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ﴾ (سورۃ النمل آیۃ نمبر ۱۵، ۱۶)

''اور بیشک ہم نے داود اور سلیمان کو بڑا علم عطاء کیا اور دونوں نے کہا سب خوبیاں اللہ کو جس نے ہمیں اپنے بہت سے ایمان والے بندوں پر فضیلت بخشی، اور سلیمان داود کا جانشین ہوا۔''

حضرت ایوب علیہ السلام کا ذکر فرمایا:

﴿وَاذْکُرْ عَبْدَنَآ اَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ﴾ (سورۃ ص آیۃ نمبر ۴۱)

''اور یاد کرو ہمارے بندہ ایوب کو جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے شیطان نے اورایذ الگادی''

حضرت یسع علیہ السلام کا ذکر یوں فرمایا:

﴿وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَاالْكِفْلِ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ۝﴾ (سورۃ ص آیۃ نمبر ۴۸)

اور یاد کرو اسماعیل اور یسع اور ذوالکفل کو اور سب اچھے ہیں۔

حضرت عیسی، حضرت الیاس، حضرت یونس اور انبیاء کرام کا تذکرہ یوں کیا:

"وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (سورۃ الانعام، آیۃ نمبر ۸۳تا۸۶)

''اور یہ ہماری دلیل ہے کہ ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم پر عطاء فرمائی، ہم جسے چاہیں درجوں بلند کریں، بے شک تمہارا رب علم وحکمت والا ہے، اور ہم نے انہیں اسحاق اور یعقوب عطاء کئے ان سب کو ہم نے راہ دکھائی، اور ان سے پہلے نوح کو راہ دکھائی اور اس کی اولاد میں سے داود اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسی اور ہارون کو اور ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ اور زکریا اور یحیی اور عیسی اور الیاس کو یہ سب ہمارے قرب کے لائق ہیں۔ اور اسماعیل اور یسع اور یونس اور لوط کو اور ہم نے ہر ایک کو اس کے وقت میں سب پر فضیلت دی۔''

تمام انبیاء کرام کا ذکر یوں فرمایا:

"وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝" (سورۃ النساء آیۃ نمبر ۱۶۴)

اور کچھ رسولوں کا ذکر ہم نے آپ سے کردیا، اور کچھ رسولوں کا ذکر ہم نے آپ سے نہیں کیا، اور موسی سے حقیقی طور پر کلام فرمایا۔

اور ذکر یوں کیا:

﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ (سورۃ الانعام، آیۃ نمبر ۱۲۴)

''اللہ خوب جانتا ہے جہاں اپنی رسالت رکھے،

محافل میلاد النبی ﷺ میں کیا ہوتا ہے؟:

نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت کی مجالس میں آپ کے اوصاف کا ذکر ہوتا ہے، آپ کے معجزات کا ذکر ہوتا ہے، آپ کی نعت خوانی اور صلوۃ وسلام ہوتا ہے۔ ابھی تک جن آیات کو ذکر کیا ان میں انبیاء کرام کا ذکر خیر موجود ہے، صرف ایک ایک مثال پیش کی گئی، ورنہ ذکر انبیاء کرام میں کئی کئی آیات کریمہ کا ذکر ہے۔ راقم کی کتاب ''**تذکرۃ الانبیاء**'' کا مطالعہ کروتو آپ کو پتہ چل جائے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے کتنے کتنے اوصاف ذکر فرمائے جو ایک جزء ہے محفل میلاد النبی ﷺ کا۔

آیئے ذرا دیکھئے:

رب تعالیٰ نے حضرت یحیی علیہ السلام کی ولادت کا ذکر اس انداز پر کیا کہ جس سے محفل میلاد النبی ﷺ کا سارا نقشہ نظر آجاتا ہے۔ ﴿یٰزَکَرِیَّآ اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمِ اسْمُہٗ یَحْیٰی لَمْ نَجْعَلْ لَّہٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا﴾ ''اے زکریا ہم تجھے خوشی سناتے ہیں ایک لڑکے کی جن کا نام یحیی ہے اس کے پہلے ہم نے اس نام کا کوئی نہ کیا۔ ﴿قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْکِبَرِ عِتِیًّا﴾ عرض کی اے میرے رب میرے لڑکا کہاں سے ہوگا میری عورت تو بانجھ ہے اور میں بڑھاپے سے سوکھ جانے کی حالت کو پہنچ گیا۔ ﴿قَالَ کَذٰلِکَ قَالَ رَبُّکَ ھُوَ عَلَیَّ ھَیِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُکَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَکُ شَیْئًا﴾ فرمایا ایسا ہی ہے، تیرے رب نے فرمایا وہ مجھے آسان ہے، اور میں نے تو اس سے پہلے تجھے اس وقت بنایا جب تو کچھ بھی نہ تھا۔ ﴿قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْٓ اٰیَۃً قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا﴾ عرض کی اے میرے رب مجھے کوئی نشانی دیدے فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تو تین رات دن لوگ سے کلام نہ کرے بھلا چنگا ہوکر۔ ﴿فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِہٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓی اِلَیْھِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُکْرَۃً وَّعَشِیًّا﴾ تو اپنی قوم پر مسجد سے باہر آیا تو انہیں اشارہ سے کہا کہ صبح وشام تسبیح کرتے رہو۔ ﴿یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ وَّاٰتَیْنٰہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا﴾ اے یحیی کتاب مضبوط تھام، اور ہم نے اسے بچپن ہی میں نبوت دی ﴿وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَکٰوۃً وَکَانَ تَقِیًّا﴾ اور اپنی طرف سے مہربانی اور ستھرائی اور کمال ڈر والا تھا۔ ﴿وَّبَرًّا بِوَالِدَیْہِ وَلَمْ یَکُنْ جَبَّارًا عَصِیًّا﴾ اور اپنے ماں باپ سے اچھا سلوک کرنے والا تھا زبردست ونافرمان نہ تھا ﴿وَسَلٰمٌ عَلَیْہِ یَوْمَ وُلِدَ وَیَوْمَ یَمُوْتُ وَیَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا﴾ اور سلامتی ہو اس پر جس دن پیدا ہوا اور

جس دن مرے گا اور جس دن مردہ اٹھایا جائے گا۔ (سورۃ مریم، آیۃ نمبر ۷ تا ۱۵)(ترجمہ کنزالایمان)

ان آیات کریمہ کو پڑھیے، بار بار پڑھیے، انصاف کی نگاہ سے دیکھیے، کیا رب تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو ان کے بیٹے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کی خبر نہیں دی؟ یقیناً خبر دی ہے۔ پھر خود ہی رب تعالیٰ نے نام بھی رکھا اور بتایا کہ اس سے پہلے کوئی یحییٰ نہیں تھا، یہ پہلا نام ہی یحییٰ آپ کے سامنے آیا ہے۔ جب حضرت زکریا علیہ السلام نے بیٹے کی پیدائش پر خوشخبری پر تعجب کرتے ہوئے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے رب کائنات بیٹا کیسے پیدا ہوگا جبکہ میری عورت بانجھ ہے میں خود بڑھاپے کی اس عمر میں ہوں کہ بیٹے کا پیدا ہونا تصور میں نہیں آسکتا۔ تو رب تعالیٰ نے فرمایا میری قدرت سے کچھ بعید نہیں۔ جب تم کچھ بھی نہیں تھے تو تمہیں بھی تو میں نے ہی پیدا کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر کہ بیٹا تمہارا ضرور پیدا ہونا ہے تو خوش ہو کر حضرت زکریا علیہ السلام نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ مجھے کوئی نشانی بتادے کہ میرے بیٹے کا حمل ماں کے شکم میں قرار پکڑ گیا۔ تو رب تعالیٰ نے فرمایا کہ تم قدرتی طور پر تین دن، تین رات کوئی بات نہیں کرسکو گے حالانکہ تم اچھے بھلے ہوگے، لیکن اللہ تعالیٰ کی تم عبادت کرسکو گے، آپ نے اشارہ سے لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ کی صبح وشام تسبیح بیان کرنے کا حکم دیا۔ پھر حضرت یحییٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ کتاب پر مضبوطی سے عمل کرو، پھر رب تعالیٰ نے فرمایا نے ان کو بچپن میں نبوت عطاء کی، اور پھر ارشاد فرمایا کہ ہم نے ان کے دل میں رقت ورحمت اور مہربانی رکھی۔ اور پھر ارشاد فرمایا کہ ہم نے ان کو ماں باپ کا فرمانبردار بنایا، سرکش اور نافرمان نہیں بنایا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ ولادت کے دن سلام بھیجا، اور فرمایا وفات کے دن آپ پر سلام ہو۔ اور جس دن آپ کو اٹھایا جائے اس دن آپ پر سلام ہو۔

خدارا انصاف کیجیے! کیا آجکل علماء کرام میلاد النبی ﷺ کے مجالس میں وہی کچھ نہیں بیان کرتے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت میں ذکر کیا؟ یقیناً وہی کچھ بیان کرتے ہیں جو رب تعالیٰ نے بیان فرمایا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنا یوم ولادت یوں بیان کرتے ہیں:

"قَالَ اِنِّی عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا o وَجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا o وَبَرًّا بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا o وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا o (سورۃ مریم، آیۃ نمبر ۳۰ تا ۳۳)

آپ نے کہا بیشک میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا۔ اور اس نے مجھے

برکت والا بنایا جہاں بھی میں ہوں، اور مجھے نماز اور زکوۃ کی تاکید فرمائی جب تک زندہ رہوں، اور مجھے اپنی ماں سے اچھا سلوک کرنے والا بنایا، اور مجھے زبردست، بدبخت نہ کیا۔ اور وہی سلامتی مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن مروں اور جس دن زندہ اٹھایا جاؤں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی پیدائش کے ذکر میں اپنے اوصاف ذکر فرمائے، اور اپنی پیدائش اور وفات اور اٹھائے جانے پر سلام کا ذکر فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا نوح علیہ السلام پر سلام:

﴿سَلٰمٌ عَلٰی نُوْحٍ فِی الْعٰلَمِیْنَ ٥ اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ٥ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ٥﴾ (سورة الصافات، آیة نمبر ۷۹ تا ۸۱)

''نوح پر سلام ہو جہان والوں میں، بیشک ہم ایسا ہی صلہ دیتے ہیں نیکوں کو، بیشک وہ ہمارے اعلیٰ درجہ کے کامل الایمان بندوں میں ہے۔''

اللہ تعالیٰ کا ابراہیم علیہ السلام پر سلام:

﴿سَلٰمٌ عَلٰی اِبْرٰهِیْمَ ٥ کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ٥ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ٥﴾ (سورة الصافات، آیة نمبر ۱۰۹ تا ۱۱۱)

سلام ہو ابراہیم پر، ہم ایسا ہی صلہ دیتے ہیں نیکوں کو، بیشک وہ ہمارے اعلیٰ درجہ کے کامل الایمان بندوں میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام پر سلام:

﴿سَلٰمٌ عَلٰی مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ ٥ اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ٥ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ٥﴾ (سورة الصافات آیة نمبر ۱۲۰ تا ۱۲۲)

سلام ہو موسیٰ اور ہارون پر، بیشک ہم ایسا ہی صلہ دیتے ہیں نیکوں کو بیشک وہ دونوں ہمارے اعلیٰ درجہ کے کامل الایمان بندوں میں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا حضرت الیاس علیہ السلام پر سلام:

﴿سَلٰمٌ عَلٰی اِلْ یَاسِیْنَ ٥ اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ٥ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ٥﴾ (سورة الصافات، آیة نمبر ۱۳۰ تا ۱۳۲)

"سلام ہوالیاس پر، بیشک ہم ایسا ہی صلہ دیتے ہیں نیکوں کو، بیشک وہ ہمارے اعلیٰ درجہ کے کامل الایمان بندوں میں ہے۔"

اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کا صلوۃ وسلام نبی کریم ﷺ پر اور بندوں کو حکم:

﴿إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰئِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۝﴾

(سورۃ الاحزاب، آیہ نمبر ۵٦)

بیشک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبی پر، اے ایمان والو آپ پر درود اور خوب سلام بھیجو۔

بحث مذکور سے نتیجہ واضح ہوا:

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کی ولادت باسعادت کا تذکرہ کیا اور انبیاء کرام پر سلام بھیجا، اور نبی کریم ﷺ پر صلوۃ وسلام بھیجا، اور اس کے فرشتوں نے بھی آپ پر صلوۃ وسلام بھیجا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو بھی حکم دیا کہ تم بھی میرے نبی پر صلوۃ وسلام بھیجو۔

صحابہ کرام کا ذکر انبیاء کرام:

۞ "عن ابن عباس ﷺ قال جلس ناس عن اصحاب النبی ﷺ ینتظرونه قال فخرج حتی اذادنا منهم سمعهم یتذاکرون فسمع حدیثهم فقال بعضهم عجبا ان الله اتخذابراهیم من خلقه خلیلا وقال آخر ماذا باعجب من کلام موسی کلمه الله تکلیما وقال آخر فعیسی کلمة الله وروحه وقال آخر آدم اصطفاه الله فخرج علیهم فسلم وقال قد سمعت کلامکم وعجبکم بان الله اتخذابراهیم خلیلا وهو کذلک وموسی نجی الله وهو کذلک وعیسی روح الله وهو کذلک وآدم اصطفاه الله وهو کذلک الاوانا حبیب الله ولافخر وانا حامل لواء الحمد یوم القیامة ولافخر وانا اول من یحرک حلق الجنة فیفتح الله لی فیدخلنیها ومعنی فقراء المؤمنین ولافخر وانا اکرم الاولین والآخرین ولافخر۔ (دارمی ترمذی)

حضرت ابن عباس ﷺ فرماتے ہے:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم ﷺ کی انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے

،جب آپ صحابہ کرام کے قریب ہوئے تو آپ نے ان کو مذاکرہ کرتے ہوئے سنا،آپ نے ان کے کلام کوسنا ان میں سے بعض حضرات نے تعجب کرتے ہوئے یہ کہا بیشک اللہ تعالی نے اپنی مخلوق میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا ،دوسرے کہنے لگے یہ کوئی اس سے زیادہ متعجب نہیں کہ اللہ تعالی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے (بلاوسطہ) کلام فرمایا،دوسرے کہنے لگے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کلمۃ اللہ اور روح اللہ بنایا، کچھ اور حضرات کہنے لگے حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے صفی اللہ بنایا۔

اتنے میں نبی کریم ﷺ ان کے سامنے جلوہ گر ہوئے ،سلام کہنے کے بعد ارشاد فرمایا میں نے تمہارا کلام سنا،اور تمہارے اظہار تعجب کو سنا (جوتم نے کہا) بیشک اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا یقیناً ایسا ہی ہے ،اور موسیٰ علیہ السلام نجی اللہ ہیں یقیناً ایسا ہی ہے،اور عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ ہیں یقینی طور پر یہ درست ہے کہ آپ اسی طرح ہیں، اور آدم علیہ السلام صفی اللہ ہیں۔ محقق بات ہے کہ آپ صفی اللہ ہیں۔خبردار (غور سے سنو آگاہ رہو) میں اللہ کا حبیب ہوں، مجھے اس پر کوئی فخر نہیں، قیامت کے دن لواء حمد میرے ہاتھ میں ہوگا مجھے اس پر کوئی فخر نہیں،سب سے پہلے شفاعت کرنے والا میں ہی ہوں گا،اور سب سے پہلے میری شفاعت کو ہی قبول کیا جائے گا،اس پر مجھے کوئی فخر نہیں،سب سے پہلے جنت کے دروازوں کے حلقوں کو میں ہی حرکت دینے والا ہوں گا،اللہ تعالیٰ میرے لئے جنت کے دروازے کھول دے گا،اور جنت میں داخل کرے گا کہ میرے ساتھ غریب ایمان دار لوگ ہوں گے، مجھے اس پر کوئی فخر نہیں، میں تمام پہلے آنے والے اور بعد میں آنے والوں میں مکرم ہوں گا مجھے اس پر کوئی فخر نہیں۔

حدیث پاک کی مکمل تفصیل **راقم** کی کتاب "**شمع ھدایت**" میں دیکھئے،حدیث پاک سے اتنا واضح ہوگیا کہ صحابہ کرام نے ذکر انبیاء کرام ایک مجلس میں کیا جو محفل میلاد النبی ﷺ کا حصہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے سن کر منع نہیں فرمایا، بلکہ اپنے اوصاف حمیدہ بیان کر کے اپنے منصب کی حقیقت کو بیان فرمادیا۔

اعتراض: نبی کریم ﷺ نے تو انبیاء کرام کو ایک دوسرے پر فضیلت دینے سے منع فرمایا آپ نے ارشاد فرمایا" لا تفضلو ابین الانبیاء" مجھے انبیاء کرام کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو۔ (مسلم شریف ج ۲ کتاب الفضائل)

جواب: آپ کا یہ کلام عجز وانکسار پر مبنی ہے،لیکن دوسرے حدیث پاک میں آپ نے اپنی حقیقت کو یوں بیان فرمایا

❁ عن ابی سعید قال قال رسول اللہ ﷺ انا سید ولد آدم یوم القیامۃ ولا فخر و بیدی لواء الحمد ولا فخر ومامن یومئذ آدم فمن سواہ الا تحت لوائی۔

(مشکوۃ شریف باب فضائل سید المرسلین)

حضرت ابوسعید (خدری) ﷺ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں تمام انسانوں کا قیامت کے دن سردار ہوں گا، اس بات پر کوئی فخر نہیں، اس دن تمام آدم علیہ السلام اور ان کے سوا میرے جھنڈے کے نیچے ہی ہوں گے۔

تشریح: جو تمام قوم سے فضیلت و خیریت میں برتر ہو اسے "سید" کہتے ہیں، یہ معنی علامہ ہروی رحمۃ اللہ نے بیان فرمایا، اور سید کا مطلب یوں بیان کیا گیا۔

" ھو الذی یفزع الیه جی النوائب و الشدائد فیقوم بامرنم ویتحمل عنھم مکار ھھم وید فعھا عنھم. (نووی شرح مسلم کتاب الفضائل ج ۲)

''سید اسے کہتے ہیں جس کی طرف قوم اپنے مصائب و آلام میں پناہ پکڑے، وہ ان کی حاجات کو پورا کرے، خود مشقتیں برداشت کر کے ان کی تکالیف کو دور کرے''

اعتراض: حدیث شریف میں " ولد آدم" ذکر ہے، جس کا مطلب ہے'' مجھے اولاد آدم پر فضیلت حاصل ہے''اس حدیث پاک سے نبی کریم ﷺ کی فضیلت حضرت آدم علیہ السلام پر ثابت نہیں، اگر چہ دوسرے انبیاء کرام پر فضیلت ثابت ہے۔

پہلا جواب: "فانھم یستعملون ولد آدم بمعی نوع الانسان" (نبراس)

بیشک عرب حضرات "ولد آدم " نوع انسان، کے معنی میں لیتے ہیں، یعنی عام محاورہ کے مطابق صرف اولاد آدم معنی نہیں، بلکہ تمام انسان مراد ہیں، جس میں آدم علیہ السلام بھی ہیں، اس طرح اب معنی یہ ہوگا کہ'' مجھے تمام انسانوں پر فضیلت حاصل ہے''

دوسرا جواب: "ان للحدیث تتمته موضحة للمطلوب و ھو قوله علیہ السلام و مامن نبی یومئذ آدم فمن سواہ الاتحت لوائی" (نبراس)

مطلب کو واضح کرنے کیلئے حدیث پاک کے آخری الفاظ سے تکمیل ہو رہی ہے کہ آدم علیہ السلام اور ان کے سوا تمام ہی میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے، یعنی تمام انسان بمع انبیاء کرام کے میرے جھنڈے کے نیچے پناہ لینے پر مجبور ہوں گے، (اس سے حضرت آدم علیہ السلام پر آپ کی فضیلت ثابت ہوگئی)

﴿یَوْمَ الْقِیَامَةِ﴾ حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے قیامت کے دن کا ذکر فرمایا کہ مجھے قیامت کے دن سرداری حاصل ہوگی، حالانکہ آپ کو دنیا میں بھی تمام پہ سیادت حاصل ہے، پھر قیامت کے دن کے ذکر کرنے کا کیا مطلب؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قیامت میں آپ کی فضیلت تمام پر ظاہر ہو جائے گی۔

"ان فی یوم القیامة یظهر سودده لکل احد ولا یبقی منازع ولامعاند" (نووی)
بیشک قیامت کے دن آپ کی سرداری ظاہر ہو جائے گی، کوئی جھگڑا کرنے والا جھگڑا نہیں کرے گا، اور کوئی شخص عناد نہیں کرے گا، کیونکہ دنیا میں کفار، مشرکین نے آپ کی فضیلت کو تسلیم نہیں کیا۔

دنیا میں اگرچہ بہت لوگ آپ کے وسیلہ جلیلہ کے بغیر براہ راست خدا تک رسائی حاصل کرنے کے دعویدار ہیں لیکن قیامت کے دن تمام کو ہی میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کا وسیلہ تلاش کرنا پڑے گا، جب تمام امتوں کو ان کے انبیاء کرام فرمائیں گے " اذهبوا الی غیری " میرے بغیر کسی اور کا وسیلہ تلاش کرو، اس وقت میرے حبیب پاک ﷺ کی زبان پر ہوگا "انــا لهــا" کہ اس شفاعت کا میں ہی حقدار ہوں، آپ ہی شفاعت فرمائیں گے، اس وقت آپ کی شان رسالت کی فوقیت واضح ہو جائے گی، کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہوگی۔

"خلیل ونجی، کلیم ومسیح سبھی سے کہیں سے نہ بنی یہ بے خبری کہ خلق پھری کہاں سے کہاں تمہارے لئے"

نبی کریم ﷺ کی سرداری کا قیامت کے دن ذکر کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ رب تعالیٰ اپنے متعلق قیامت کے دن فرمائے گا " لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ " آج کسی کی بادشاہی ہے؟ اللہ واحد وقہار کی، اگرچہ آج بھی ہر قسم کی بادشاہی اسی کو حاصل ہے، اور تمام چیزیں اسی کی ملکیت میں ہیں، لیکن دنیا میں لوگ دعویدار موجود ہیں کہ اس زمین کا میں مالک ہوں، اس مکان کا میں مالک ہوں، اس بادشاہی کا میں مالک ہوں۔ لیکن قیامت کے دن سب دعوے ختم ہو جائیں گے وہاں صرف رب ذوالجلال کی بادشاہی ہوگی، مجازی طور پر بھی کوئی اپنی ملکیت اور بادشاہی کا ذکر نہیں کرے گا۔

"ولافخر" ای ولا اقوله تفاخرا بل اعتدادا بفضله وتحدثا بنعمته وتبلیغالما امرت به"
یعنی نبی کریم ﷺ نے اپنی سیادت کو دو وجہ کے پیش نظر بیان کیا،

پہلی وجہ: آپ پر اپنے مراتب بیان کرنے ضروری ہوتے ہیں تا کہ آپ کی امت آپ کو پہچان لے، اور آپ پر اعتقاد رکھے، اور آپ کی عزت وتکریم کرنے کا جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا اسی طرح اس پر عمل کر سکے۔

دوسری وجہ: "امتثالا لامر اللہ تعالیٰ" "وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ" (نووی) آپ نے اپنے مراتب اللہ تعالیٰ کے حکم کی تابعداری کرتے ہوئے بیان فرمائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ" اپنے رب کی نعمتوں کو خوب بیان کرو۔

نبی کریم ﷺ کی ولادت پر خوشی منانا:

''حصول نعمت پر تعریف کرنا باعث شکر ہے''

❁ عن جابر بن عبدالله مرفوعا من اعطی عطاء فوجد فلیجز به فان لم یجد فلیثن به فمن اثنی به فقد شکر و من کتمه فقد کفر''

حضرت جابر بن عبداللہ ﷺ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ جس شخص کو کوئی عطیہ دیا جائے وہ اگر بدلہ دینے کی صلاحیت رکھتا ہو تو اس کا بدلہ دے، اگر بدلہ دینے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس کی تعریف کرے، یہ تعریف کرنا شکریہ ادا کرنا ہوگا، جس شخص نے اسے چھپایا اس نے ناشکری کی۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ حصول نعمت پر تعریف کرنا ذریعہ شکر ہے، اور شکر کرنے سے حصول نعمت میں زیادتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ﴾ اور یاد کرو جب تمہارے رب نے سنا دیا کہ اگر احسان مانو گے (شکریہ ادا کرو گے) تو میں تمہیں اور دوں گا۔

اس آیۃ سے معلوم ہوا کہ شکر سے نعمت زیادہ ہوتی ہے، شکر کی اصل یہ ہے کہ آدمی نعمت کا تصور اور اس کا اظہار کرے اور حقیقت شکر یہ ہے کہ منعم کی نعمت کا اس کی تعظیم کے ساتھ اعتراف کرے، اور نفس کو اس کا خوگر بنائے، یہاں ایک باریکی ہے وہ یہ کہ بندہ جب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے طرح طرح کے فضل و کرم و احسان کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے شکر میں مشغول ہوتا ہے، اس سے نعمتیں زیادہ ہوتی ہیں، اور بندے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھتی چلی جاتی ہے یہ مقام بہت برتر ہے اور اس سے اعلیٰ مقام یہ ہے کہ منعم کی محبت یہاں تک غالب ہو کر قلب کی نعمتوں کی طرف التفات باقی نہ رہے، یہ مقام صدیقوں کا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمیں شکر کی توفیق عطاء فرمائے۔ (خزائن العرفان)

نبی کریم ﷺ کی آمد باسعادت بھی نعمت ہے:

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا﴾ (سورة آل عمران، آیة نمبر ۱۰۳)

اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے، جب تم (آپس میں ایک دوسرے کے) دشمن تھے، تو الفت ڈال دی اس نے تمہارے دلوں کے درمیان، تو ہو گئے تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی۔

یعنی اسلام کی بدولت عداوت دور ہو گئی، آپس میں دینی محبت پیدا ہو گئی، حتیٰ کہ اوس اور خزرج کی وہ مشہور لڑائی جو ایک سو بیس سال سے جاری تھی اور اس کے سبب رات دن قتل و غارت کی گرم بازاری رہتی تھی، سید عالم ﷺ کے ذریعہ

اللہ تعالیٰ نے مٹادی اور جنگ کی آگ ٹھنڈی کردی، اور جنگجو قبیلوں میں الفت ومحبت کے جذبات پیدا کردیے۔
(خزائن العرفان)

اس آیۃ کریمہ سے پتہ چلا کہ نبی کریم ﷺ کا تشریف لانا بہت بڑی نعمت ہے جس کی وجہ سے صدیوں پرانی عداوتیں، رنجشیں ختم ہوگئیں۔ نعمت کے حصول پر تذکرہ کرنا اور نعمت دینے والے کی تعریف کرنا ضروری ہے تاکہ شکریہ ادا ہو سکے اور نعمتوں کی زیادتی ہو سکے۔ واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کی آمد باسعادت کا تذکرہ کرنا اور اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنا اس عظیم نعمت کا شکریہ ادا کرنا ہے جو یقیناً اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی خوشنودی اور رضامندی کا سبب ہے۔

دوسری دلیل: (اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا)

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۝﴾ (سورۃ یونس آیۃ نمبر ۵۸)

تم فرماؤ اللہ ہی کے فضل اور اسی کی رحمت اور اسی پر چاہئے کہ خوشی کریں، وہ ان کے سب دھن دولت سے بہتر ہے۔ (کنزالایمان)

اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے رحمت پر خوشی کرنے کا حکم فرمایا، رحمت سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں، جیسا کہ روح المعانی میں ہے "واخرج ابو الشیخ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ان الفضل العلم والرحمة محمد ﷺ" آیۃ کریمہ میں فضل سے مراد علم اور رحمت سے مراد حضرت محمد ﷺ ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے علم کے حصول اور رحمت کے حصول پر خوشی منانے کا خود حکم دیا ہے۔

آپ تمام جہانوں کیلئے رحمت ہیں:

دوسرے مقام پر اور زیادہ طور پر آپ کو خطاب فرماتے ہوئے رب کریم نے آپ کو رحمت کائنات کہا ہے۔

﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۝﴾ (سورۃ الانبیاء، آیۃ نمبر ۱۰۷)

اور ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہانوں کیلئے۔ (کنزالایمان)

تفسیر روح المعانی میں اس آیۃ کریمہ کی تفسیر اس طرح بیان کی گئی:

"والذی اختارہ انه ﷺ انما بعث لکل فرد فرد من العالمین ملائکتهم انسهم وجنهم ولا فرق بین المؤمن والکافر من الانس والجن فی ذلک"

مختار مذہب اس میں یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو جہان کے ہر فرد کیلئے رحمت بنا کر مبعوث کیا، ملائکہ ہوں یا

انسان ہوں یا جن سب کیلئے آپ رحمت ہیں، بلکہ انسانوں اور جنوں میں مومنوں اور کافروں سب کیلئے آپ رحمت ہیں۔

بلکہ روح المعانی میں آپ کی رحمت کی وسعت کو یوں بیان کیا گیا "کل خیر فی العالم فمن آثار النبوة و کل شر وقع فی العالم او سیقع فسبب خفاء آثار النبوة ودروسها فالعالم جسد وروحه النبوة و لا قیام للجسد بدون روحه" جہاں میں جو بھی ہے وہ آثار نبوت کی وجہ سے ہے، اور جہاں میں جو شر بھی واقع ہوا یا واقع ہوگا وہ آثار نبوت کے مخفی ہونے اور مٹ جانے کی وجہ سے، کیونکہ تمام جہان جسم ہے اور نبوت اس کی روح ہے، اسی لئے کہ جسم بغیر روح کے قائم نہیں رہ سکتا۔

سؤال: نبی کریم ﷺ کافروں کیلئے کیسے رحمت ہیں؟

جواب: پہلے کفار کو طرح طرح کے عذاب دیئے گئے، کسی قوم کو بندر بنا دیا گیا، کسی قوم کو خنزیر بنا دیا گیا، کئی قوموں کو تباہ و برباد کر دیا گیا، لیکن نبی کریم ﷺ کی قوم کے کفار عذاب کا مطالبہ بھی کرتے رہے، لیکن آپ کی رحمت سے رب تعالیٰ نے ان کی شکلوں کو تبدیل نہیں کیا اور ان کو تباہ و برباد نہیں کیا۔

﴿وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ﴾ (سورة الانفال، آیة نمبر ۳۲، ۳۳)

اور جب بولے کہ اے اللہ اگر یہی (قرآن) تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، یا کوئی دردناک عذاب ہم پر لا، اور اللہ کا کام نہیں کہ انہیں عذاب کرے جب تک اے محبوب تم ان میں تشریف فرما ہوں۔ (کنز الایمان)

یعنی آپ رحمۃ للعلمین ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے ہم ان کے مطالبہ کے باوجود ان کو عذاب نہیں دیں گے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

کہ مجھ سے سوال یہ کیا گیا کہ ربیع الاول میں نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت کے سلسلہ میں کئے جانے والے اعمال کا شرع میں کیا حکم ہے؟ اچھا ہے یا برا، اس کے کرنے والے کو ثواب حاصل ہوگا یا نہیں؟ آپ نے اس کا جواب یہ دیا کہ نبی کریم ﷺ کی ولادت کے متعلق ابتدائی واقعات کو بیان کرنا اور آپ کی ولادت پاک پر ظاہر شدہ علامات کو بیان کرنا، پھر کھانے کیلئے دستر خوان بچھانا، یعنی کھانے کی اشیاء تقسیم کرنا اور غیر شرع حرکات کئے بغیر واپس لوٹ جانا اچھا کام ہے۔

"هو من البدع الحسنة التی یثاب علیها صاحبها من تعظیم قدر النبی ﷺ واظهار

الفرح والا ستبشار بمولده الشریف"(الحاوی للفتاوی جلد اول صفحہ نمبر ۱۸۹)
یہ تمام جن کا ذکر کیا ہے یہ اچھی بدعات سے ہیں، ان پر عمل کرنے والے کو ثواب حاصل ہوتا ہے، کیونکہ اس میں نبی کریم ﷺ کی قدر و منزلت کی تعظیم پائی جاتی ہے، اور آپ پر فرحت و خوشی کا اظہار ہے، فرحت وخوشی کا اظہار زیادہ نعمتوں کے حصول کا سبب ہے۔

ساتویں صدی ہجری میں نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت کے واقعات پر مشتمل شیخ ابوالخطاب بن وحید نے ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام "التنویر فی مولد البشیر والنذیر" رکھا اس پر اس کے وقت کے بادشاہ مظفر ابو سعید میلاد النبی ﷺ کی محافل منعقد کرتا اور بہت مٹھائی، مکھن، مرغ اور بکرے کا گوشت اس کے دستر خوان پر ہوتا، جس میں تیس ہزار طشت مٹھائیوں کے ہوتے۔

"وکان یحضر عندہ فی المولد اعیان العلماء والصوفیة" (الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۹۰)

''اس کی محافل میلاد میں بڑے جلیل القدر علماء کرام اور صوفیاء عظام شریک ہوتے۔''

علماء ومشائخ کا شریک ہونا ہی جواز کی علامت ہے، ناجائز کام اتنے جلیل القدر علماء اور مشائخ کا شریک ہونا عقل سے دور ہے۔

یہودیوں کے آلہ کار لوگوں کی کذب بیانی:

ہر سال کسی نہ کسی جگہ سے عید میلاد النبی ﷺ کی مخالفت میں کوئی نہ کوئی اشتہار، کتابچہ چھاپ کر لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، عام طور پر فتنہ یوں پھیلایا جاتا ہے''امام الانبیاء کی ہجرت کے ۶۰۴ سال بعد عیسائیوں کی دیکھا دیکھی عراق کے اربل بادشاہ ملک مظفر ابوسعید جو ایک نہایت بے دین، بڑا عیاش، فضول خرچ اور عیاش طبع تھا، اس نے اپنے دنیا پرست کذاب مولوی عمر بن حسن بن دحیہ کے ساتھ مل کر عید میلاد النبی ﷺ کی اس رسم کو ایجاد کیا (بحوالہ تاریخ ابن خلکان) اور لالچی مولوی نے ایک ہزار دینار لے کر عید میلاد النبی ﷺ کے حق میں فتوی دیا، اس طرح یہ عید رفتہ رفتہ مسلمانوں کے گھر گھر میں گھس گئی اور سادہ دل لوگوں نے عقیدت احترام اور پیار محبت میں غلو کر کے اس کو دین کا حصہ بدعت بنا لیا، یہ اس پمفلٹ کی عبارت تھی جو ہر سال میلاد النبی ﷺ کے موقع پر تقسیم کیا جاتا ہے۔

آیئے دیکھیے یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے:

﴿لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ﴾ ''جھوٹوں پر اللہ تعالی کی لعنت ہو۔''

"الکذب مقراض الایمان" "جھوٹ ایمان کی قینچی ہے۔"

آیئے اس جھوٹ کو علامہ حافظ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ کی کتاب الحاوی للفتاوی میں دیکھئے:

"حسن المقصد فی علم المولد صاحب اربل الملک المظفر ابو سعید کو کبری بن زین الدین علی بن بکتکین احد الملوک الامجاد والکبراء الاجواد وکان له آثار حسنته"

نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت کے موقع پر خوشی کا اظہار کر کے اچھا عمل کرنے والا اربل بادشاہ مظفر ابوسعید کو کبری بن زین الدین علی بن بکتکین تھا جو بزرگ اور بڑے اور سخی بادشاہوں سے تھا، اس کے بہت اچھے اعمال تھے۔ (الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۸۹)

اور یہ بھی بہت واضح بات ہے کہ کرکٹ کا شائق کرکٹ گراؤنڈ تعمیر کراتا ہے، کلب کا دلدار کلب تعمیر کراتا ہے، یعنی جس کو کسی کام سے محبت ہو وہی کام کرتا ہے، یقیناً نیک شخص ہی نیک کام کرتا ہے اور مساجد تعمیر کراتا ہے۔

"وھو الذی عمر الجامع الظفری بسفح قاسیون"

بادشاہ مظفر نے قاسیون کے پہلو میں جامع مسجد تعمیر کرائی، جس کا نام جامع مسجد ظفری رکھا گیا۔

(الحاوی للفتاوی حوالہ مذکور)

آیئے ابن جوزی اور ابن تیمیہ کے شاگرد حافظ ابن کثیر کا قول علامہ سیوطی رحمہ اللہ سے ہی سنئے۔

❁ قال ابن کثیر فی تاریخه کان یعمل المولد الشریف فی ربیع الاول ویحتفل به احتفالا ھائلا وکان شھما شجاعا بطلا عاقلا عالما عادلا رحمه الله واکرم مثواه، قال وصف له الشیخ ابو الخطاب بن دحیة مخلدا فی المولد النبوی سماه التنویر فی مولد البشیر النذیر فاجازه علی ذلک بالف دینار وقد طالت مدته فی الملک الی ان مات وھو محاصر للفرنج بمدینة عکا سنة ثلاثین وستمائه محمود السیرة والسریرة" (الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۸۹)

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں، بادشاہ مظفر ربیع الاول میں میلاد النبی ﷺ کی بڑی بڑی محفلیں قائم کرتا تھا جو بہت ذہین تیز فہم، بہادر، بطل حریت، عقلمند، عالم، عادل تھا اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے اور اس کا اچھا ٹھکانا بنائے، حافظ ابن کثیر نے ہی یہ بھی بیان کیا ہے کہ شیخ ابو الخطاب بن دحیہ رحمہ اللہ نے ولادت نبوی میں ایک بڑی مجلد کتاب تحریر کی جسکا نام "التنویر فی مولد البشیر النذیر" رکھا۔ جس پر بادشاہ مظفر نے ایک ہزار دینار انعام دیا، وہ بہت دیر بادشاہی کرنے کے بعد فوت ہوئے، یعنی ان کی بادشاہی کی مدت لمبی تھی، اس نیک بادشاہ نے عکا شہر میں انگیزوں کا

محاصرہ جاری رکھا۔اس کی وفات چھ سو تیس ہجری میں ہوئی، جس کی سیرت بھی اچھی تھی، اوراس کی بادشاہت بھی قابل تعریف تھی ۔خدرا انصاف کیجئے کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ اور حافظ ابن کثیر کی بات معتبر ہے کہ وہ بادشاہ نیک تھا یا آجکل کے یہودیوں کے آلہ کار لوگوں کی بات معتبر ہے کہ وہ برا تھا اور عیاش تھا، آجکل تو کتابوں سے اوراق نکال دینے کو رواج دے دیا گیا کیا ایسے ہتھکنڈوں سے دین اسلام مٹ جائے گا، اے مسلمانوں ہوشیار رہیں ایک قرآن پاک القدس سے چھاپا گیا ہے جس میں کئی سورتوں کو نکال دیا گیا ہے، جس قرآن کا محافظ رب تعالیٰ ہو اس کی سورتوں کو نکال کر یہودی اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے؟ نہیں نہیں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے، اوران کے آلہ کار بھی شان مصطفیٰ کریم ﷺ کو کم کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔

تاریخ ابن خلکان کی طرف منسوب کرنا بھی جھوٹ ہے:

ہاں ہوسکتا ہے تاریخ ابن خلکان کی عبارات کو بدل کر اپنا الوسیدھا کرنے کی کوشش کی گئی ہو تو کچھ کہہ نہیں سکتا ورنہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ تاریخ ابن خلکان کے متعلق یوں رقمطراز ہیں۔

- **"قال ابن خلكان فى ترجمة الحافظ ابى الخطاب بن دحية كان من اعيان العلماء ومشاهير الفضلاء قدم من المغرب داخل الشام والعراق واجتاز باربل سنة اربع وستمائة فوجد ملكها المعظم مظفرالدين بن زين الدين يعنى بالمولدالنبوى فعمل كتاب التنوير فى مولد البشير النذير وقرأ عليه بنفسه فأجازه بالف دينارقال وقد سمعناه على السلطان مجالس ستة فى سنة خمس وعشرين وست مائة"**

(الحاوی للفتاوی جلد اول ۱۹۰)

ابن خلکان نے اپنی تاریخ میں حافظ ابوالخطاب بن دحیہ کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ بڑے عظیم علماء میں سے تھے اور مشہور فضلاء میں سے تھے، وہ مغربی علاقہ سے آئے اور شام وعراق میں داخل ہوئے چھ سو چار ہجری میں ان کا اربل بادشاہ پر گذر ہو، تو انہوں نے اس عظیم بادشاہ کو نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت پر عظیم اہتمام کرتے ہوئے پایا تو عظیم عالم حضرت علامہ حافظ ابوالخطاب نے ایک کتاب میلادالنبی ﷺ کے موضوع پر لکھی جو خود ہی بادشاہ مظفر الدین بن زین الدین کو پڑھ کر سنائی ،اس کتاب کا نام رکھا "**التنوير فى مولد البشير النذير**" بادشاہ نے اس کتاب پر ایک ہزار دینار انعام دیا، ہم نے چھ سو پچیس ہجری میں بادشاہ کے پاس چھ مجالس میں اس کتاب کو سنا۔

اعتراض: میلادالنبی ﷺ کی محافل اور خوشی ومسرت بدعت ہے، بدعت پر عمل کرنا گمراہی ہے یہ کام تو دین دار

علماء کرام کا نہیں بلکہ جاہل اور باطل راہ پر چلنے والے عوام کا ہے۔

جواب: ہر بدعت کو ضلالت و گمراہی سے تعبیر کرنا کسی طرح بھی درست نہیں، بلکہ بدعت پانچ قسم کی ہے۔

نمبر 1 واجب: جس طرح قرآن پاک اور حدیث پاک سمجھنے کیلئے علم نحو کا پڑھنا۔

نمبر 2 حرام: اللہ تعالیٰ کا بندوں کی طرح جسم ثابت کرنا، بندے کو پتھر کی طرح غیر مختار سمجھنا وغیرہ۔

نمبر 3 مستحب: دینی مدارس قائم کرنا، مساجد بنانا، سرائے بنانا اور ہر بہتر کام جو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے زمانہ میں نہیں تھا۔

نمبر 4 مکروہ: ہر ایسا کام جس سے سنت کی ترک لازم آئے تو اگر سنت غیر مؤکدہ کی ترک لازم آئے تو مکروہ تنزیہی اور اگر سنت مؤکدہ کی ترک لازم آئے تو مکروہ تحریمی۔

نمبر 5 مباح: جیسے صبح کی نماز یا عصر کے بعد مصافحہ کرنا، لیکن بغیر سلام کے، اگر سلام بھی کرے تو مستحب ہوگا،
(ماخوذ از حاشیہ مشکوٰۃ صفحہ نمبر ۲۸ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ بحوالہ مرقاۃ)

بیہقی نے مناقب امام شافعی رحمہ اللہ میں امام شافعی رحمہ اللہ کا قول نقل کیا:

المحدثات من الامور ضربان احدھما ما احدث ممایخالف کتابا او سنۃ او اثرا او اجماعا فھذا البدعۃ الضلالۃ والثانی ما احدث من الخیر لا خلاف فیہ لواحد من ھذا محدثۃ غیر مذمومۃ. (الحاوی للفتاوی جلد اول صفحہ نمبر ۱۹۲)

نئے امور یعنی بدعات کی دو قسمیں ہیں، ایک ان میں سے یہ ہے کہ ایسا نیا کام جو قرآن یا حدیث پاک یا آثار صحابہ یا اجماع امت کے مخالف ہو، یہ بدعت گمراہی ہے، یعنی ناجائز ہے، اس سے اجتناب ضروری ہے۔

دوسری قسم ان میں سے یہ ہے کہ کوئی نیا کام ہو لیکن نیکی کا کام ہو، اس کے جائز ہونے میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں، بلکہ بالاتفاق جائز ہے اور مستحسن ہے، اس پر عمل کرنا باعث ثواب ہے، اور یہ بدعت کسی طرح بھی بری نہیں۔

❁ **عن ابن عباس قال کان اھل الجاھلیۃ یأکلون اشیاء ویترکون اشیاء تقذرا فبعث اللہ نبیہ وانزل کتابہ واحل حلالہ وحرم حرامہ فما احل فھو حلال وما حرم فھو حرام وما سکت عنہ فھو عفو وتلا قل لا اجد فیما اوحی ای محرما علی طاعم یطعمہ الا ان یکون میتۃ الآیۃ.** (رواہ ابو داؤد، مشکوۃ باب مایحل اکلہ وما یحرم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں زمانہ جاہلیت میں لوگ بعض چیزوں کو کھاتے تھے، اور بعض چیزوں کو ناپسند سمجھ کر چھوڑ دیتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا، اور اپنی کتاب کو نازل

کیا، اور کچھ چیزوں کو حلال کیا اور کچھ چیزوں کو حرام کیا، جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا وہ حلال ہیں، اور جن چیزوں کو رب تعالیٰ نے حرام کیا ہے وہ حرام ہیں، اور جن چیزوں سے رب تعالیٰ نے سکوت اختیار کیا (نہ حلال کیا اور نہ حرام) وہ معاف ہیں، یعنی وہ مباح ہیں نہ حلال ہیں اور نہ حرام ہیں، پھر آپ نے بطور دلیل یہ آیۃ کریمہ تلاوت کی۔

"قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗۤ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ O (الانعام، آیۃ نمبر ۱۴۵)

فرمادو میں نہیں پاتا اس میں جو میری طرف وحی کی گئی کسی کھانے والے پر کوئی کھانا حرام ہو، سوائے مردہ جانور کے یا بہنے والے خون، یا خنزیر کے گوشت کے تو بیشک وہ ناپاک ہے یا فسق ہے جس پر ذبح کے وقت اللہ کے غیر کا نام لیا گیا ہو، جو شخص مجبور ہو گیا وہ خود خواہش نہ کرے اور نہ حد سے تجاوز کرے تو بیشک تمہارا رب بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

❁ ابن ماجہ اور ترمذی کی حدیث جو، مشکوۃ میں حضرت سلمان ﷛ سے مروی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں

"فقال الحلال ما احل الله فی کتابه والحرام ما حرم الله فی کتابه وما سکت عنه فهو مما عفی عنه" (مشکوۃ کتاب الاطعمۃ)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا حلال وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال کیا، اور حرام وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام کیا ہے، اور جس سے سکوت اختیار کیا ہے وہ معاف ہے۔

نئے کاموں کے ایجاد کیلئے نبی کریم ﷺ نے ضابطہ بیان فرمایا:

قال رسول الله ﷺ من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها من بعده من غیر ان ینقص من اجورهم شیء ومن سن فی الاسلام سیئة کان علیه وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غیر ان ینقص من اوزارهم شئی.

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص اسلام میں اچھا طریقہ ایجاد کرتا ہے، اسے اس کا ثواب ملے گا۔ اور اس کے بعد جتنے آدمی اس پر عمل کریں گے ان کے مطابق بھی اس کا ثواب ملے گا، اور ان عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی، اور جو شخص اسلام میں برا طریقہ رائج کرتا ہے، اس کو اس برے طریقہ کے رواج دینے کا گناہ ہوگا، اور جتنے آدمی اس پر عمل کریں گے ان کے عمل کے مطابق بھی اسے گناہ ہوگا اور ان عمل کرنے والوں کے گناہوں میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ (مشکوۃ شریف کتاب العلم)

اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ اسلام میں اچھا طریقہ رائج کرنا منع نہیں بلکہ نیکیوں کا سبب ہے اور برا طریقہ رائج کرنا گناہوں کا سبب ہے، اس سے بچنا ضروری ہے۔ یہ سوال نہایت لغو اور بے حقیقت ہے کہ اسلام کیا اس وقت مکمل نہیں تھا؟ ہاں ہاں اسلام مکمل ہی تھا اسی لئے تو نبی کریم ﷺ نے خود اپنی امت کیلئے ایک ضابطہ و قانون پیش فرما دیا، تا کہ اسی قانون پر عمل کرنے والوں کو کوئی شخص غیر اسلامی شعار پر عمل کرنے کا طعنہ نہ دے سکے، بلکہ ایسا اعتراض علم شریعت سے بے خبری کی علامت ہے۔

میلاد النبی ﷺ پر انعقاد محافل اور ہر جائز خوشی مستحب ہے:

علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ان الطلب فی المندوب تارة یکون بالنص وتارة یکون بالقیاس وھذا وان لم یرد فیه نص ففیه القیاس علی الاصلین" (الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۹۲)

مستحب کبھی نص سے ثابت ہوتا ہے اور کبھی قیاس سے، اس میں اگر چہ نص تو وارد نہیں، لیکن دو اصل یعنی دو علتیں اور وجہ موجود ہیں جن سے استحباب ثابت ہوتا ہے۔

پہلی وجہ یہ بیان فرمائی:

"ان النبی ﷺ قدم المدینة فوجد الیھود یصومون یوم عاشوراء فسألھم فقالوا ھو یوم اغرق اللہ فیه فرعون ونجی موسی علیہ السلام فنحن نصومه شکر اللہ تعالی. (الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۹۴)

بیشک نبی کریم ﷺ جب مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو یہود کو عاشوراء کے دن روزہ رکھتے ہوئے پایا آپ نے ان سے روزہ رکھنے کی وجہ پوچھی انہوں نے کہا یہ وہ دن ہے کہ اس میں اللہ تعالی نے فرعون کو غرق کیا اور موسی علیہ السلام کو نجات دی اس لئے ہم اللہ تعالی کا شکر ادا کرنے کیلئے روزہ رکھتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے ان کے اس قول کو رد نہیں کیا، بلکہ دوسرے مقامات پر ذکر ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ہم زیادہ حق رکھتے ہیں کہ ہم بھی روزہ رکھیں یہ ایک روزہ رکھتے ہیں ہم دو روزے رکھیں گے۔

مقرر دن میں اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا:

مندرجہ بالا بحث ذکر کرنے کے بعد علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں **"فیستفاد منه فعل الشکر للہ علی ما من به فی یوم معین من اسداء نعمة او دفع نعمة"** (الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۹۶)

اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں واحسانات کی تکمیل اور مصائب کے مندفع کرنے کا معین دن میں شکریہ ادا کرنا جائز ہے، کیونکہ معین دن میں ہی روزہ رکھا جاتا تھا جو حصول نعمت اور اندفاع مصائب کا شکریہ تھا۔اس کے بعد مزید فرماتے ہیں۔

"ای نعمة اعظم من النعمة ببروزهذاالنبی نبی الرحمة فی ذلک الیوم وعلی هذافینبغی ان یتحری الیوم بعینه حتی یطابق قصة موسی فی یوم عاشوراء"

(الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۹۶)

نبی کریم ﷺ جو سراپا رحمت ہیں اس دن میں آپ کی تشریف آوری جو نعمت عظمیٰ ہے، اس نعمت سے بڑھ کر اور کیا عظیم نعمت ہو سکتی ہے، لھذا ضروری ہے کہ اس دن زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کی جائے تا کہ یوم عاشوراء میں موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے مطابقت ہو جائے۔

نبی کریم ﷺ نے ہر پیر کے دن اپنا یوم ولادت منایا:

وان کان النبی ﷺ لم یزدفیه علی غیره من الشهور شیئا من العبادات وماذاک الالرحمته ﷺ بامته ورفقه بهم لأنه علیه الصلوة والسلام کان یترک العمل خشیة ان یفرض علی امته رحمة منه بهم لکن اشار علیه السلام الی فضیلة هذا الشهر العظیم بقوله للسائل الذی سأله عن صوم یوم الاثنین ذاک یوم ولدت فیه" (الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۹۴)

اگر چہ نبی کریم ﷺ نے اس ماہ میں بنسبت اور مہینوں کے زیادہ عبادات نہیں کہیں، صرف اپنی امت پر رحمت اور مہربانی کرتے ہوئے کیونکہ نبی کریم ﷺ امت پر رحمت فرماتے ہوئے ان پر فرض ہو جانے کے ڈر سے کئی اعمال ترک فرما دیتے تھے، لیکن آپ نے اس ماہ کی فضیلت کی طرف اشارہ فرما دیا، جب آپ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ آپ پیر کو روزہ کیوں رکھتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ یہ میری پیدائش کا دن ہے، یعنی آپ نے پیر کو اپنی پیدائش کا شکریہ ادا کرنے کیلئے روزہ رکھا اور اس طرح اظہار مسرت کیا۔

آیئے حدیث مسلم کے اصل الفاظ مبارکہ دیکھئے:۔

❁ عن ابی قتادة ان رسول الله ﷺ سئل عن صوم الاثنین فقال فیه ولدت وفیه انزل علی" (اخرجه مسلم بالاسنادج اص ۳۶۸ باب استحباب صیام ثلاثة ایام من کل شهر الخ۔ ومشکوة باب صیام التطوع)

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ سے پیر کے دن روزہ رکھنے کے متعلق سوال کیا گیا آپ نے فرمایا، اس دن میں میری پیدائش ہے، اور اسی دن مجھ پر قرآن نازل کیا گیا۔) یعنی اس دن ابتداء انزول قرآن ہوا)

جائز کاموں سے اظہار مسرت کرے:

فینبغی ان یقتصر فیه علی مایفهم الشکر لله تعالی من التلاوة والاطعام والصدقة وانشادالشعر من المدائح النبوية. (الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۹۴)

ضروری ہے کہ صرف ان کاموں پر ہی اکتفاء کرے جن سے اللہ تعالی کا شکر یہ ادا کرنا سمجھا جاسکے، تلاوت قرآن پاک کرے، طعام کھلائے، صدقہ وخیرات کرے، نبی کریم ﷺ کی مدح وتوصیف نعت خوانی کی صورت میں کی جائے۔

مباح کام کرنے میں کوئی حرج نہیں:

''فینبغی ان یقال ماکان من ذلک مباحا بحیث یقتضی السرور بذلک الیوم لاباس بالحاقه'' (الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۹۶)

ضروری ہے کہ یہ بیان کیا جائے کہ جوکام مباح ہیں یعنی ان کاموں کے کرنے میں شرعا ممانعت نہیں، لیکن ان کے کرنے سے خوشی ومسرت حاصل ہوتی ہو، ایسے کام میلاد النبی ﷺ کے دن کرنے میں کوئی حرج نہیں،

حرام، مکروہ، خلاف اولی کاموں سے بچنا ضروری ہے:

وماکان حرام اومکروها فیمنع وکذا ماکان خلاف الاولی (الحاوی للفتاوی ج ۱ ص ۱۹۶)

جو کام حرام، مکروہ، یا خلاف اولی ہوں (یعنی بہتر نہ ہوں) وہ میلاد النبی ﷺ کے دن منع ہیں۔ مثلا ناچ، گانا، ڈھول، باجا، خوشی کے اظہار میں نمازوں کو ضائع کرنا، یہ سب کام میلاد النبی ﷺ کے دن ناجائز ہیں۔

خرابی کو دور کیا جائے، اچھائی کو ختم نہ کیا جائے:

خدرا! انصاف کریں کہ اگر نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت کی خوشی میں جلوس نکالا جائے، جس میں نعت خوانی ہو اور تلاوت قرآن پاک ہو اور تقاریر ہوں، نمازیں بھی قضاء نہ ہونے دی جائیں اس میں کیا خرابی ہے۔ اگر کوئی غیر شرعی حرکت ان نیک محافل یا جلوسوں میں شامل ہو جائے۔ تو صرف اسی کو ختم کرنے پر زور دیا جائے نہ کہ استحبابی کاموں کو بھی حرام بنانے پر زور دیا جائے، جھوٹے خداؤں کی وجہ سے حقیقی خدا کو چھوڑ دینا، اور جھوٹے نبیوں کی وجہ سے حقیقی انبیاء کرام کو نہ ماننا اور ان پر ایمان نہ لانا عقل ودانش کا کام نہیں، بلکہ جہالت وحماقت ہے۔

دوسری وجہ جس پر میلادالنبی ﷺ کی خوشی کا مستحب ہونا قیاس کیا گیا:

اخرجه البيهقي عن انس ان النبي ﷺ عق عن نفسه بعد النبوة مع انه قدورد ان جده عبدالمطلب عق عنه في سابع ولادته والعقيقة لاتعاد مرة ثانية فيحمل ذلك على ان الذى فعله النبي ﷺ اظهارا للشكر على ايجاد الله اياه رحمةللعالمين وتشريع لامته كما كان يصلي على نفسه لذلك فيستحب لنا ايضا اظهار الشكر بمولده بالاجتماع واطعام الطعام ونحوذلك من وجوه القربات واظهار المسرات.

(الحاوی للفتاوی ج ص ۱۹۶)

بیہقی نے حضرت انس ؓ سے روایت بیان کی کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے بعداز اعلان نبوت اپنا عقیقہ خود کیا حالانکہ یہ بھی ثابت ہے کہ آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب نے آپ کا عقیقہ آپ کی ولادت کے ساتویں دن کر دیا تھا، عقیقہ ایک مرتبہ ہی ہوتا ہے۔ دوبارہ نہیں ہوتا، نبی کریم ﷺ کے اس فعل کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رحمۃ للعلمین بنایا، اس لئے آپ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور نیز اپنی امت کیلئے مشروع فرمایا جیسا کہ آپ خود اپنی ذات پر درود پاک پڑھتے تھے تاکہ امت کو سنت کا ثواب بھی حاصل ہو جائے، اس وجہ سے اب ہمارے لئے بھی مستحب ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کی ولادت کے دن اجتماعات منعقد کر کے اور طعام کھلا کر اور ہر قسم کی نیکی کے کام کر کے اور مسرت کا اظہار کر کے شکریہ ادا کریں۔

نبی کریم ﷺ کی ولادت پر اللہ تعالیٰ نے قوم کو لڑکے عطاء کئے:

نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے قوم طرح طرح کی برائیوں میں مبتلاء تھی، ان برائیوں میں سے ایک بیٹیوں کو زندہ دفن کرنا تھا، کئی اعلیٰ خاندان اپنی بیٹیوں کو عار کے پیش نظر زندہ درگور کر دیتے، ایک شخص ان میں ایسا تھا کہ اگر اپنی کسی بیٹی کو زندہ رکھنا چاہتا تو اسے اون یا بکری کے بالوں کا جبہ (کوٹ) پہنا دیتا اور اپنے ساتھ جنگل میں اونٹ چرانے پر اسے مقرر کر دیتا، تاکہ کوئی شخص اس کو دیکھ نہ سکے اور یہ نہ کہے کہ اس کی بیٹی زندہ ہے۔ اور اگر وہ کسی بیٹی کو قتل کرنے کا ارادہ کرتا تو اسے چھ سال تک مہلت دیتا، جب چھ سال کی ہو جاتی تو اس کی ماں کو کہتا اسے غسل کراؤ، خوشبو لگاؤ، اچھا لباس پہناؤ، مزین کرو، پھر اسے اپنے ساتھ جنگل میں لے جاتا، اس کیلئے ایک گڑھا کھودتا اور اسے کہتا اس میں دیکھو اس طرح اس کو دھکا دے کر نیچے گڑھے میں گرا دیتا اور مٹی اس پر ڈال کر یعنی سطح زمین کے برابر کر کے واپس آجاتا۔ (روح المعانی ج ص ۳۰)

جاء قيس بن عاصم التميمي الى رسول الله ﷺ فقال انى وأدت ثمان بنات لى فى الجاهلية "(روح المعانی ج ص ۳۰)

قیس بن عاصم تمیمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے عرض کیا کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں اپنی آٹھ بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا۔

معاشرہ کی یہ حالت تھی کہ عورت کا چوپاؤں سے بھی کم مرتبہ تھا، لیکن نبی کریم ﷺ نے عورت کو اسلام میں عزت عطاء فرمائی، بیٹی ہونے کی حیثیت سے، زوجہ ہونے کی حیثیت سے، ماں ہونے کی حیثیت سے جن حقوق کی مالک ہے۔ وہ حقوق نبی کریم ﷺ نے بیان فرما کر عورت کو بلند مقام دیا۔ لیکن افسوس آج مسلمان عورت غیر مسلموں کو دیکھ کر اسلامی شعار کو چھوڑ کر پھر حیوانیت کی طرف جانا پسند کر رہی ہے، بے حیائی اور عریانی، اور مردوں سے آزادانہ میل جول فیشن بن چکا ہے۔ جس معاشرہ سے غیر مسلم جو اس فیشن کے موجد ہیں وہ بیزار ہو چکے ہیں، وہ آج مسلمانوں کو پسند ہے، اللہ تعالیٰ ان بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ راست پر لائے، آمین۔

عرض کر رہا تھا کہ اہل عرب اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کرتے تھے گویا ان کے گھر بیٹی کے پیدا ہونے پر صف ماتم بچھ جاتی، ان کو خوشی نہ حاصل ہوتی بلکہ غم لاحق ہوتا۔ لیکن جس سال نبی کریم ﷺ کی ولادت ہوئی وہ تو ہر طرف خوشی منانے کا سال تھا، اور آپ کی پیدائش پر ہی قوم آپ کی شان کو مکمل طور پر سمجھ لیتی یہ بھی مشکل تھا، نیز آپ رحمۃ للعالمین بن کر تشریف لائے آپ کی آمد کے سال بیٹیوں کا پیدا ہونا قوم کیلئے غم کا سبب بنتا اور ان کا زندہ دفن کیا جانا آپ کی شان رحمت کے خلاف تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس سال جن لوگوں کو اولاد عطاء کی ان کو بیٹے دیئے بیٹیاں نہیں دیں۔

"وکان قداذن الله تعالی تلک السنة لنساء الدنیا ان یحملن ذکورا کرامة لمحمد ﷺ

اب واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شان الوہیت کے مطابق نبی کریم ﷺ کی ولادت پر لوگوں میں بیٹے تقسیم فرمائے، کیونکہ اپنی اپنی استطاعت کے مطابق ہی کسی چیز کو تقسیم کیا جاتا ہے، انسان کو یہ استطاعت نہیں وہ اپنی استطاعت کے مطابق مٹھائی اور کھانے تقسیم کرتا ہے۔ (انوار محمدیہ، مواہب لدینہ)

نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا اسراف نہیں:

اعتراض: میلاد النبی ﷺ کی خوشی میں چراغاں کیا جاتا ہے، جھنڈیاں لگائی جاتی ہیں، ان پر پیسے خرچ ہوتے ہیں جو اسراف ہے اور اسراف شرعاً ناجائز ہے۔

جواب: جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ میلاد النبی ﷺ پر جائز طریقہ سے اظہار مسرت مستحب ہے، تو یقیناً مستحب کام پر خرچ ہونے والے پیسے بھی مستحب ہوں گے، ثواب کا ذریعہ ہوں گے۔

نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں مسجد نبوی کی دیواریں کچی تھیں، اور کھجور کی شاخوں کا چھت تھا جو بارش میں ٹپکتا تھا، نبی

کریم ﷺ ایک مرتبہ اعتکاف میں تھے، بارش کی وجہ سے چھت ٹپکنا شروع ہوگیا۔ نبی کریم ﷺ کی پیشانی پر سجدہ کرنے کی وجہ سے کیچڑ ظاہر ہو رہا تھا لیکن آج مسجد کی تزیین پر لاکھوں روپے خرچ ہو رہے ہیں لیکن تمام مکاتب فکر کے علماء یہی کہتے ہیں کہ جس نے جنت میں گھر بنانا ہے وہ مسجد پر پیسے خرچ کرے، کسی نے کبھی نہیں کہا چپس، رنگ وروغن، شیشے، شیشہ نگاری، قالین، ہیٹر، پنکھے ضرورت سے زائد چیزیں ہیں، ان پر پیسے خرچ کرنا اسراف ہے، لیکن حقیقت بھی یہی ہے ان کو اسراف کہنا نادانی ہوگی، کیونکہ مساجد کی شان وشوکت اپنے گھروں سے بڑھ کر ہونی چاہئے، جب مکان کچے اور سادہ ہوتے تھے اس وقت مساجد بھی اسی طرح ہوتی تھیں، جیسے مکانات بلند وبالا، پختہ، مزین بننے لگے تو ضروری ہوگیا کہ اسی طرح مساجد کو خوبصورت بنایا جائے تاکہ اپنے مکانات سے خانہ خدا کی حالت کم نظر نہ آئے، اسی طرح خوشی منانے کے ہر زمانہ میں طور وطریقے مختلف ہوتے ہیں۔ اب جبکہ بڑے بڑے مبلغین کو دیکھتے ہیں کہ اپنے بیٹوں کی پیدائش اور ان کی سالگرہ پر اور بیٹوں، بیٹیوں کی شادی پر، حج پر جاتے وقت، اور حج سے واپسی پر، اور کسی عزیز کی بیرون ملک سے واپسی پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں، چراغاں کرتے ہیں، گلے میں ہار ڈالتے ہیں اور ان کو جائز بھی سمجھتے ہیں، اسراف نہیں کہتے تو نبی کریم ﷺ کی ولادت پر زیادہ سے زیادہ خوشی کیوں نہ منائی جائے۔ کیونکہ یہ خوشی اسی کی کی جاتی ہے جس سے محبت ہوتی ہے، نبی کریم ﷺ تو آپ کے اپنے ہی ارشاد کے مطابق سب سے زیادہ محبت کی جائے، آپ فرماتے ہیں۔

﴿لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ﴾

''کوئی آدمی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے والد اور اولاد اور تمام لوگوں سے مجھے زیادہ محبوب نہ سمجھے۔''

اپنی اولاد سے بڑھ کر نبی کریم ﷺ سے محبت اور اولاد کی پیدائش پر خوشی کرنے سے زیادہ خوشی نبی کریم ﷺ کی ولادت پر کرنا ہی ایمان ہے، ورنہ روح ایمان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے،

ویچ کس جود وانفاق فی سبیل اللہ را اسراف نہ گفتہ لاسرف فی الخیر

کسی صاحب علم نے یہ نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنا اسراف ہے۔ (تحفہ اثنا عشریہ ص ۳۱۱)

''قیل لاخیر فی سرف ولاسرف فی خیر'' بیان کیا گیا ہے اسراف میں کوئی بھلائی نہیں۔ اور نیکی میں خرچ کرنا اسراف نہیں۔ (مرقاۃ ج ۸ ص ۲۶۸)

راقم کو اس وقت حوالہ تو یاد نہیں لیکن مسئلہ سو فیصد یاد ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے کسی نے کہا ''لاخیر فی الاسراف'' اسراف میں کوئی نیکی نہیں۔ تو آپ نے فی البدیہہ جواب دیا ''لااسراف فی

الخیر" نیکی کے کام میں اسراف نہیں۔

اعتراض: نبی کریم ﷺ کی ولادت بارہ ربیع الاول کو منائی جاتی ہے۔ حالانکہ علم تقویم کے لحاظ سے آپ کی ولادت کی تاریخ ۹ ربیع الاول بنتی ہے، بارہ کو میلاد النبی منانا درست نہیں۔

پہلا جواب: جب کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو جمہور کے قول کو ترجیح دی جاتی ہے۔

"والاکثرون انه ولد عام الفیل وانه بعد الفیل بخمسین یوم وانه فی شهر ربیع الاول یوم الاثنین لثنتی عشرة خلت منه عند طلوع الفجر"

اکثر حضرت یعنی جمہور کا قول یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ عام الفیل (ہاتھی والے سال) میں واقعہ فیل کے پچاس دن بعد پیدا ہوئے، بیشک آپ ربیع الاول کے مہینہ میں پیر کے دن بارہ ربیع الاول صبح صادق کے وقت پیدا ہوئے۔

وعن ابن عباس رضی الله عنهما قال ولد ﷺ یوم الاثنین واستنبئ یوم الاثنین وخرج مهاجرا من مكة الی المدینة یوم الاثنین ودخل المدینة یوم الاثنین ورفع الحجر یوم الاثنین وکذافتح مكة ونزول سورة المائدة یوم الاثنین"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ پیر کے دن پیدا ہوئے۔ آپ نے اعلان نبوت پیر کے دن کیا، اور مکہ سے مدینہ طیبہ ہجرت پیر کے دن کی، اور مدینہ طیبہ میں آپ پیر کے دن پہنچے، آپ نے حجر اسود کو چادر میں لے کر قریش کے سرکردہ سرداروں کو چادر پکڑنے کی دعوت دی اور خود حجر اسود کو کعبہ شریف کی دیوار میں نصب کر کے ان کے نزاع کو ختم کیا وہ بھی پیر کا دن تھا۔ آپ نے مکہ شریف کو فتح کیا وہ بھی پیر کا دن تھا، اور آپ پر سورۃ مائدہ بھی پیر کے دن نازل ہوئی۔

دوسرا جواب: علم تقویم کی وجہ سے حساب درست نہیں ہو رہا اس کی وجہ کیا ہے' علامہ رازی رحمہ اللہ نے اور قرطبی رحمہ اللہ نے ﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا "الآیة﴾ (سورۃ توبہ، آیۃ نمبر ۳۶، ۳۷) کے تحت لکھا وہ ضیاء القرآن کے الفاظ میں دیکھئے:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے سال کے یہ چار مہینے (رجب، ذیقعد، ذی الحجہ، محرم) حرمت اور عزت والے شمار ہوتے تھے، اور ان میں لڑائی کرنے کی سخت ممانعت کر دی گئی تھی، نیز فریضہ حج کی ادائیگی کیلئے ماہ ذی الحجہ کی تاریخیں مقرر تھیں، کچھ عرصہ بعد اہل عرب پر اس حکم کی پابندی گراں گذرنے لگی ان کا پیشہ قزاقی، رہزنی اور مار دھاڑ بن کر رہ گیا تھا، تین ماہ تک متواتر (ذی قعد، ذی الحجہ محرم) ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنا ان کیلئے نا قابل برداشت تھا اس لئے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان مہینوں میں سے جس کو چاہا حلال کر لیا اور اس میں جی بھر کر قتل و غارت کی اور

اس کی جگہ سال کے کسی دوسرے مہینہ کو حرام کر دیا۔ حرمت والے مہینوں کی تعداد بھی چار رہی اور ان کا کام بھی بن گیا، نیز حج علاوہ ایک عبادت کے ان کیلئے ایک بہت بڑا تجارتی میلہ بھی تھا، دور دراز سے تجارتی قافلے آتے جس سے انہیں بہت نفع ہوتا لیکن حج کا فریضہ کیونکہ قمری سال کے ذی الحجہ کے مہینہ میں ادا کیا جاتا تھا، اس لئے یہ ایسے موسم میں بھی آجاتا، جبکہ سخت سردی یا گرمی ہوتی اور موسم اس ناسازگاری کی وجہ سے ان کا کاروبار ماند پڑ جاتا، اور انہیں دل خواہ نفع نہ ہوتا، اس مشکل کا حل انہوں نے یہ تجویز کیا کہ حج ہمیشہ معتدل موسم میں ادا کیا جائے، اس کیلئے انہوں نے حج کی مقررہ تاریخوں کو بدل دیا اور قمری سال کے بارہ مہینوں میں کبیسہ کا ایک مہینہ بڑھا دیا۔ اس طرح تینتیس سال کے بعد صرف ایک بار حج اپنی صحیح تاریخوں ۹، ۱۰، ذی الحجہ کو ادا کیا جاتا۔ ان دونوں صورتوں میں چونکہ صرف اپنی ذاتی سہولتوں اور مالی منفعتوں کیلئے، وہ اللہ تعالیٰ کے اٹل اور محکم احکام رد و بدل کر لیا کرتے تھے، اس ان کے اس فعل کو "زیادۃ فی الکفر" کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔

۱۰ھ میں جب رحمت عالمیان ﷺ حجۃ الوداع کیلئے مکہ تشریف لے گئے تو اس سال ان کے دستور کے مطابق بھی حج ۹۔۱۰۔ ذی الحجہ کو ادا ہونا قرار پایا تھا، اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا "ان الزمان قد استدار کھیئۃ یوم خلق السماوات والارض" (بخاری کتاب التفسیر ج ۲) یعنی اس سال بھی حج انہی تاریخوں میں ادا کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم ازلی میں اس کیلئے مقرر فرمائی تھیں، اس میں مسلمانوں کیلئے درس عبرت ہے کہ وہ اپنی ذاتی مصلحتوں اور دوسرے وجوہ کیلئے احکام الٰہی رد و بدل نہ کریں۔ (ضیاء القرآن ج ۲ ص ۲۰۳)

خلاصہ جواب:

نبی کریم ﷺ نے جب حجۃ الوداع فرمایا اس وقت قدرتی طور پر صحیح تاریخ ۹ ذی الحج جمعہ کے دن مقام عرفات پر کھڑے ہونے کا دن تھا، اسی طرح جب آپ پیدا ہوئے قدرتی طور پر صحیح تاریخ ۱۲ ربیع الاول تھی۔ درمیان میں کوئی مستقل کیلنڈر نہیں تھا، ہر سال ایک مہینہ بڑھایا جاتا جس کا نام کبیسہ رکھا جاتا۔ نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے دور میں یہ موجودہ کیلنڈر نہیں تھا، بلکہ بعض لوگ حساب ولادت نبوی کے سال سے کرتے، اور بعض لوگ آپ کی بعثت کے سال (یعنی آپ کے اعلان نبوت کے سال) سے کرتے، اور بعض لوگ عام فیل سے حساب کرتے، اور بعض ہجرت کے سال سے حساب کرتے۔ یہ موجود کیلنڈر حضرت عمر ؓ کے زمانہ میں جاری کیا گیا۔ اس لئے علم تقویم سے حساب درست نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن پھر بھی راقم کا موقف یہ ہے کہ اگر کوئی ۹ ربیع الاول آپ کی

پیدائش کا دن مان کر خوشی کا اظہار کرے تو مجھے اس سے بھی اتفاق ہوگا، اگر کسی کو ۹ ربیع الاول بھی اور ۱۲ ربیع الاول بھی غم ہی لاحق ہو تو وہ شیطان کا ساتھی ہے۔علامہ ابوالقاسم سہیلی لکھتے ہیں۔

"ان ابلیس لعنه الله رن اربع رنات انة حین لعن انه حین احبط ورنة حین ولد رسول الله ﷺ ورنة حین انزلت فاتحة الکتاب قال والرنین والنحاء من عمل الشیطان"

ابلیس ملعون زندگی میں چار مرتبہ چیخ مار کر رویا، پہلی مرتبہ جب اس کو ملعون قرار دیا گیا، دوسری مرتبہ جب اسے بلندی سے پستی کی طرف دھکیلا گیا، تیسری مرتبہ سے جب سرکار دو عالم کی ولادت باسعادت ہوئی، چوتھی مرتبہ جب سورۃ فاتحہ نازل ہوئی۔ (روضی الانف جلد اول ص ۱۸۱)

علامہ ابن کثیر نے بھی علامہ سہیلی کی اس عبارت کو" السیرۃ النبویہ ص ۲۱۲ ج ۱ "میں جوں کا توں نقل کیا، اور ابن سید الناس نے "عیون الاثر" ص ۲۷ ج ۱ میں بھی اس روایت کو بعینہ درج کیا ہے۔ (ضیاء النبی ج ۲ ص ۵۶)

علم کے بحر بیکراں مفکر اسلام، مفسر قرآن کی تحقیق:

حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ ضیاء النبی میں یوں رقمطراز ہیں:

"اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ محسن انسانیت ﷺ کو یوم میلاد دوشنبہ کا دن تھا، اس پر بھی علماء امت کا تقریبا اتفاق ہے کہ ربیع الاول کا بابرکت مہینہ تھا، ماہ رمضان اور ماہ محرم کے اقوال کو اہل تحقیق نے درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا، البتہ ماہ ربیع الاول کی کون سی تاریخ تھی جب مہتاب رشد و ہدایت نے جلوہ بار ہو کر ظلمت کدہ عالم کو منور فرمایا اس بارے میں علماء کرام کے متعدد اقوال ہیں، ہم یہاں علماء محققین کی آراء ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، جن کے مطالعہ سے وہ بآسانی صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں گے۔

(۱) امام ابن جریر طبری جو فقید المثال مفسر، بالغ نظر مؤرخ بھی ہیں، وہ اس بارے میں لکھتے ہیں،

"ولد رسول الله ﷺ یوم الاثنین عام الفیل لاثنتی عشرة لیلة مضت من شهر ربیع الاول"

رسول کریم ﷺ کی ولادت سوموار کے دن ربیع الاول شریف کی بارھویں تاریخ کو عام الفیل میں ہوئی (تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۲۵)

(۲) علامہ ابن خلدون جو علم تاریخ اور فلسفہ تاریخ میں امام تسلیم کئے جاتے ہیں بلکہ فلسفہ تاریخ کے موجد بھی ہیں وہ لکھتے ہیں۔"ولد رسول الله ﷺ عام الفیل لاثنتی عشرة لیلة خلت من ربیع الاول لاربعین سنة من ملک کسری انوشیروان"

رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت عام الفیل کو ماہ ربیع الاول کی بارہ تاریخ کو ہوئی، نوشیروان کی حکمرانی

کا چالیسواں سال تھا۔ (تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۷۱۰)

(۳) مشہور سیرت نگار علامہ ابن ہشام متوفی ۲۱۳ھ عالم اسلام کے سب سے پہلے سیرت نگار امام محمد بن اسحاق سے اپنی السیرۃ النبوۃ میں رقمطراز ہیں۔

"ولد رسول اللهﷺ یوم الاثنین عشرة لیلة خلت من شهر ربیع الاول عام الفیل"

رسول کریمﷺ سوموار بارہ ربیع الاول کو عام الفیل میں پیدا ہوئے۔ (السیرۃ النبویۃ لابن ہشام)

(۴) علامہ ابوالحسن علی بن محمد الماوردی جو علم سیاست اسلامیہ کے ماہرین میں سے ہیں اور جن کی کتاب "الاحکام السلطانیہ" آج بھی علم سیاست کے طلبہ کیلئے بہترین ماخذ ہے، اپنی کتاب اعلام النبوۃ میں ارشاد فرماتے ہیں، واقعہ اصحاب فیل کے پچاس روز بعد اور آپ کے والد کے انتقال کے بعد حضور علیہ الصلوۃ والسلام بروز سوموار بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے۔ (اعلام النبوۃ ص ۱۹۲)

علوم قرآن وسنت اور فن تاریخ کے یہ وہ جلیل القدر علماء ہیں جنہوں نے بارہ ربیع الاول کو یوم میلاد مصطفیٰ علیہ اطیب التحیۃ والثناء تحریر کیا ہے اور دیگر اقوال کا ذکر تک نہیں کیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک صحیح اور معتمد علیہ قول یہی ہے اور حاضر کے سیرت نگار محمد الصادق ابراہیم عرجون جو جامعہ ازہر مصر کے کلیۃ اصول الدین کے عمید رہے ہیں اپنی کتاب محمد رسول اللہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

❁ وقد صح عن طرق کثیرة ان محمدﷺ ولد یوم الاثنین الاثنتی عشرة مضت من شهر ربیع الاول عام الفیل فی زمن کسری انوشیروان ویقول اصحاب التوفیقات التاریخیة ان ذلک یوافق الیوم المکمل للعشرین عن شهر اغسطس ۵۷۰ بعد میلاد المسیحؑ"

کثیر تعداد ذرائع سے یہ بات صحیح ثابت ہو چکی ہے کہ حضور نبی کریمﷺ بروز دوشنبہ بارہ ربیع الاول عام الفیل کسریٰ نوشیروان کے عہد حکومت میں تولد ہوئے، اور ان علماء کے نزدیک جو مختلف سمتوں کی آپس میں تطبیق کرتے ہیں انہوں نے عیسوی تاریخ میں ۲۰ اگست ۵۷۰ء بیان کی ہے۔ (محمد رسول اللہ ج ۱ ص ۱۰۲)

ان کے علاوہ علامہ محمد رضا جو قاہرہ یونیورسٹی کی لائبریری کے امین تھے انہوں نے اپنی کتاب محمد رسول اللہ میں لکھا ہے۔

❁ ولدالنبیﷺ فی فجر یوم الاثنین لالنتی عشرة لیلة مضت من ربیع الاول عشرین اغسطس ۵۷۰ واهل مکة یزورون موضع مولده فی هذاالوقت"

حضور نبی کریمﷺ سوموار کے دن فجر کے وقت ربیع الاول کی بارہ تاریخ کو بمطابق بیس اگست ۵۷۰) پیدا ہوئے، اہل مکہ سرکار دو عالمﷺ کے مقام ولادت کی زیارت کیلئے اسی تاریخ کو جایا کرتے ہیں۔

(محمد رسول اللہ ج ۲ ص ۱۹)

اب ہم چند دوسرے حوالے قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔علامہ ابن جوزی میلاد مصطفیٰ علیہ اطیب التحیۃ والثناء کی تاریخ کے بارے میں اپنی تحقیق یوں قلمبند فرماتے ہیں۔

❁ ولد ﷺ یوم الاثنین لعشر خلون من ربیع الاول عام الفیل وقیل للیلتین خلتا منه قال ابن اسحاق ولد رسول الله ﷺ یوم الاثنین عام الفیل لاثنتی عشرۃ لیلة مضت من شهر ربیع الاول"

حضور نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت بروز سوموار دس ربیع الاول کو عام الفیل میں ہوئی، یہ بھی کہا گیا ہے کہ ربیع الاول کی دوسری تاریخ تھی اور امام ابن اسحاق فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کی ولادت مبارکہ روز دوشنبہ بارہ ربیع الاول عام الفیل کو ہوئی۔ (الوفا لابن جوزی ص ۹۰)

امام الحافظ ابوالفتح محمد بن محمد بن عبداللہ بن محمد بن یحیی بن سیدالناس الشافعی الاندلسی اپنی سیرت کی کتاب "عیون الاثر" میں تحریر فرماتے ہیں

❁ "ولد سیدنا ونبینا محمد رسول الله ﷺ یوم الاثنین لاثنتی عشرۃ لیلة مضت من شهر ربیع الاول عام الفیل قیل بعد الفیل بخمسین یوما"

ہمارے آقا اور ہمارے نبی محمد رسول اللہ سوموار کے روز بارہ ربیع الاول شریف کو عام الفیل میں پیدا ہوئے، بعض نے کہا ہے کہ واقعہ فیل کے پچاس روز بعد حضور کی ولادت ہوئی۔ (عیون الاثر جلد اول ص ۲۶)

اس کے بعد انہوں نے ربیع الاول کی دو اور آٹھ تاریخ کے قول نقل کیے ہیں، ابن ابی شیبہ نے اپنی تصنیف میں یہی تاریخ روایت کی ہے۔

❁ "رواه ابن ابی شیبة فی مصنفه عن عفان عن سعیدبن میناء عن جابر وابن عباس انهماقالا ولد رسول الله ﷺ عام الفیل یوم الاثنین الثانی عشرمن شهر ربیع الاول وفیه بعث فیه عرج به الی السماء وفیه هاجر وفیه مات وهذا هوالمشهور عند الجمهور"

حضرت جابر اور ابن عباس دونوں سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ عام الفیل روز دوشنبہ بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے، اور اسی روز حضور کی بعثت ہوئی، اسی روز معراج ہوا، اور اسی روز ہجرت کی، اور جمہور اہل اسلام کے نزدیک یہی تاریخ بارہ ربیع الاول مشہور ہے (واللہ اعلم بالصواب)

(سیرت ابن کثیر ج اص ۱۹۹)

اس حدیث کے پہلے راوی ابوبکر بن ابی شیبہ ہیں، ان کے بارے میں ابوزرعہ رازی متوفی ۲۶۴ھ کہتے ہیں کہ میں نے ابوبکر بن ابی شیبہ سے بڑھ کر حافظ حدیث نہیں دیکھا، محدث ابن حبان فرماتے ہیں ابوبکر عظیم حافظ حدیث

تھے، دوسرے راوی عفان ہیں ان کے بارے میں محدثین کی رائے ہے کہ عفان ایک بلند پایہ امام ثقہ صاحب ضبط واتقان ہیں، تیسرے راوی سعید بن میناء ہیں، ان کا شمار بھی ثقہ راویوں میں ہوتا ہے، یہ صحیح الاسناد روایت دو جلیل القدر صحابہ حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ مرفوع روایت کی موجودگی میں کسی مؤرخ یا ماہر فلکیات کا یہ کہنا کہ بارہ ربیع الاول تاریخ ولادت نہیں، ہرگز قابل تسلیم نہیں۔ مولنا سید عبدالقدوس ہاشمی عالم دین ہونے کے علاوہ فن تقویم میں بھی ید طولی رکھتے تھے، انہوں نے اس فن پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام تقویم تاریخی ہے، ان کے نزدیک بھی صحیح تاریخ ولادت بارہ ربیع لاول ہے، اہل حدیث کے مشہور عالم نواب سید محمد صدیق حسن خان لکھتے ہیں کہ ولادت شریف مکہ مکرمہ میں وقت طلوع فجر روز دوشنبہ شب دواز دہم ربیع الاول عام الفیل کو ہوئی جمہور علماء کا یہی قول ہے، ابن جوزی نے اس سے اتفاق کیا ہے۔ (الشمامۃ العنبریہ حوار خیر البریہ ص ۷)

علماء دیوبند کے مفتی اعظم مفتی محمد شفیع سیرت خاتم الانبیاء میں رقمطراز ہیں۔ الغرض جس سال اصحاب فیل کا حملہ ہوا اس کے ماہ ربیع الاول کی بارھویں تاریخ کے انقلاب کی اصل غرض آدم واولاد آدم کا فخر، کشتی نوح کی حفاظت کا راز، ابراہیم کی دعاء موسی وعیسی کی پیش گوئیوں کا مصداق یعنی ہمارے آقائے نامدار محمد رسول اللہ ﷺ رونق افزائے عالم ہوتے ہیں۔ (سیرت خاتم الانبیاء ص ۱۸ بحوالہ ضیاء النبی ج ۲ بحذف ص ۳۳ تا ۳۸)

دو سیرت نگاروں کی غلط فہمی کی وجہ سے سکولی طبقہ غلط فہمی کا شکار رہا:

برصغیر پاک وہند کے بعض سیرت نگاروں نے محمود پاشا فلکی کے حوالے سے لکھا کہ بارہ ربیع الاول کو پیر کا دن نہیں تھا، بلکہ پیر کا دن نو ربیع الاول کو بنتا ہے لھذا نو تاریخ صحیح ہے، لیکن دلچسپ صورت حال یہ ہے کہ ان لوگوں کو محمود پاشا کے اصلی وطن کا بھی حتمی علم نہیں۔ علامہ شبلی نعمانی اور قاضی سلیمان منصور پوری نے محمود پاشا کو مصر کا باشندہ لکھا ہے ان دو سیرت نگاروں پر ہی زیادہ سکولی طبقہ ان کی سیرتوں پر انحصار کئے ہوئے ہیں حالانکہ یہ خود جا بجا ٹھوکریں کھاتے رہے۔ مفتی محمد شفیع صاحب انہیں مکی لکھتے ہیں، مولنا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے قسطنطنیہ کا مشہور ہیئت دان اور منجم بتایا ہے۔ مجھے بڑی کوشش کے باوجود محمود پاشا فلکی کی کتاب یا رسالہ نہیں مل سکا، البتہ معلوم ہوا کہ پاشا فلکی کا اصل مقالہ فرانسیسی زبان میں تھا، جس کا ترجمہ سب سے پہلے احمد زکی آفندی نے نتائج الافہام کے نام سے عربی میں کیا اس کو مولوی سید محی الدین خان جج ہائی کورٹ حیدر آباد نے اردو کا جامہ پہنایا، اور ۱۸۹۸ میں نولکشور پریس نے شائع کیا لیکن اب یہ ترجمہ نہیں ملتا۔ محمود پاشا فلکی نے اگر علم فلکیات کی مدد سے کچھ تحقیقات کی بھی ہیں، صحابہ کرام، تابعین اور

دیگر قدماء کی روایات کو جھٹلانے کیلئے ان پر انحصار کرنا کسی طرح مناسب نہیں، کیونکہ سائنسی علوم کی طرح فلکیات کی کوئی بات قطعی نہیں ہوتی۔ (ضیاء النبی ج۲ص ۳۸،۳۹)

مقام توجہ: اس سلسلہ میں غور طلب امر یہ ہے کہ سن ھجری کا استعمال حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں شروع ہوا اور پہلی مرتبہ یوم الخمیس (جمعرات کے دن) ۲۰ جمادی الاول ۱۷ھ ۱۲ جولائی ۶۳۸ء کو مملکت اسلام میں اس کا نفاذ ہوا، اس کے بعد کا تاریخی ریکارڈ ملتا ہے، لیکن اس سے پہلے کا تقویمی ریکارڈ دستیاب نہیں، اور بعثت نبوی سے قبل عرب میں کوئی باقاعدہ کیلنڈر رائج نہیں تھا، عرب اپنی مرضی سے مہینوں میں ردوبدل کرلیا کرتے تھے (راقم نے ضیاء القرآن کے حوالہ سے پہلے ہی ذکر کردیا ہے) (ضیاء النبی ج۲ص ۳۹)

محمود پاشا سے قبل بھی کچھ لوگوں نے نجوم کے حسابات سے یوم ولادت معلوم کرنے کی کوشش کی، علامہ قسطلانی لکھتے ہیں، اہل زیچ کا اس قول پر اجماع ہے کہ آٹھ ربیع الاول کو پیر کا دن تھا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو شخص بھی علوم نجوم اور ریاضی کے ذریعہ حساب لگا کر تاریخ نکالے گا مختلف ہوگی، پس ہمیں قدیم سیرت نگاروں، محدثین ،مفسرین، تابعین اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی بات ماننا پڑے گی۔

مندرجہ بالا بحث سے ثابت ہوگیا:

کہ حضور پاک صاحب لولاک محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ علیہ التحیۃ والثناء ۱۲ ربیع الاول عام الفیل پیر کے دن صبح کے وقت اس جہان ہست و بود میں اپنے وجود عنصری کے ساتھ تشریف لائے۔ (ضیاء النبی ج۲ص ۳۹)

مزید بحث ضیاء النبی میں دیکھیں، اور مدارج النبوۃ میں دیکھیں، راقم نے تذکرۃ الانبیاء میں کچھ احوال ذکر کیے۔ یہاں مختصر بحث کی جارہی ہے۔

میلاد النبی ﷺ کو عید کہنے کی وجہ:

عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام میں صرف دو عیدیں ہیں یہ تیسری عید کہاں سے آئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کہنا کہ عیدیں صرف دو ہیں یہ احادیث اور کتب فقہ کی کی توجہ نہ کرنے وجہ سے وہ لوگ غلطی کا شکار ہوئے کاش کہ وہ کتب کا مطالعہ کریں، یوں ہی تخریب کاری ان کا وطیرہ ہے۔ درمختار باب العیدین میں عید کی وجہ بیان کرتے ہوئے اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

"سمی به لان الله فیه عوائد الاحسان ولعوده بالسرور غالبا اوتفاؤلا ویستعمل فی کل یوم فیہ مسرۃ ولذاقیل عید وعید وعید صرن مجتمعۃ. وبجه الحبیب ویوم العید والجمعۃ"
عید کو اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے احسانات لوٹ کر آتے ہیں اور ان کے آنے سے سرور بھی غالبا لوٹ آتا ہے۔ یا نیک شگونی کی وجہ سے عید کہا جاتا ہے، یعنی اللہ کرے خوشی لوٹ آئے، کیونکہ عید کا معنی ہی ''لوٹنا'' ہے، ہر مسرت کے موقع پر لفظ عید کا استعمال کیا جاسکتا ہے، کسی شاعر نے کیا خوب کہا: آج تو تین عیدیں جمع ہوگئیں حبیب کے چہرہ کا دیدار، اور عید کا دن اور جمعہ۔

جب ہر مسرت کے دن کو عید کہا جاسکتا ہے تو نبی کریم ﷺ کی ولادت کے دن سے بڑھ کر مسرت کا دن اور کونسا ہوسکتا ہے؟ جب اس سے زیادہ قدر و منزلت والا اور کوئی دن نہیں تو اس دن سے بڑھ کر کسی دن میں مسرت بھی زیادہ نہیں ہوسکتی تو اس طرح اس دن کے عید ہونے سے، اور کوئی بڑی عید بھی نہیں ہوسکتی، البتہ نبی کریم ﷺ کی ولادت پر فرحت اور سرور حاصل ہو تو عید کہا جاسکتا ہے، نہ ہو تو عید کہنا بھی مشکل ہی نظر آتا ہے، اصل اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔

جسے چاہا در پہ بلالیا جسے چاہا اپنا بنا لیا۔
یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔

عن ابن عباس انه قرأ "الیوم اکملت لکم دینکم" الآیۃ وعنده یهودی فقال لو نزلت هذه الآیۃ علینا لاتخذناها عیدا فقال ابن عباس فانها نزلت فی یوم عیدین فی یوم جمعۃ ویوم عرفۃ" (رواه الترمذی، مشکوۃ باب الجمعۃ)
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بیشک یہ آیۃ ہم پر بھی اس دن نازل ہوئی جس دن دو عیدیں تھیں۔ ایک جمعہ کا دن اور ایک ذی الحج کی نو تاریخ تھی۔ یعنی ہم ہر ذوالحج کی نو تاریخ کو عید مانتے ہیں۔ اور یہ آیۃ بھی حجۃ الوداع کے موقع پر یوم عرفہ کو نازل ہوئی، اور وہ دن جمعہ کا دن تھا جبکہ ہم ہر جمعہ کے دن کو بھی عید مانتے ہیں۔

بخاری ج ۲ کتاب التفسیر میں یہی حدیث طارق بن شہاب ﷺ سے مروی ہے کہ یہود نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہی بات کہی اور آپ نے وہی جواب دیا جو حضرت ابن عباس ﷺ نے جواب دیا۔ واضح ہوا کہ ہر مسرت کا دن عید کا دن ہے، حبیب کے چہرہ کی زیارت کا دن، جمعہ کا دن، عرفہ کا دن، عید الفطر کا دن عید الاضحیٰ کا دن سب عید کے دن ہیں، اس لئے ولادۃ النبی ﷺ کا دن مسرت کا دن ہے، لھذا ایمان والوں کیلئے عید کا دن ہے۔

اعتراض: جب ایک ہی دن ولادت اور وفات کا ہے تو خوشی منائی جاتی ہے، غم نہیں کیا جاتا، اس کی کیا وجہ

ہے؟ ویسے یہ اعتراض میں نے سنجیدہ الفاظ میں نقل کیا ہے ورنہ جہلاء عام لوگوں کو ان الفاظ سے ورغلاتے ہیں آپ نے کبھی یہ بھی سنا کہ ایک گھر سے میت کا جنازہ نکل رہا ہو اور لوگ خوشیاں منا رہے ہوں۔

پہلا جواب: تحقیق کی رو سے آپ کا وصال ۱۲ ربیع الاول کو نہیں بنتا۔ اس لئے کہ اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ آپ نے حجۃ الوداع کیا اس وقت حقیقی طور پر ذی الحج کی ۹ تاریخ جمعہ کو تھی۔ اور اس مسئلہ میں بھی اتفاق ہے کہ نبی کریم ﷺ کا حجۃ الوداع کے بعد آنے والے ربیع الاول میں وصال ہوا، اور یہ بات بھی اتفاقی ہے کہ آپ کا وصال سوموار کو ہوا۔

آیئے! اب آپ حساب کریں کہ حجۃ الوداع کی آٹھ تاریخ جمعرات تھی، اور انتیس تاریخ بھی جمعرات تھی، اگر چاند انتیس کا تھا تو محرم کی پہلی تاریخ جمعہ تھا اور انتیس تاریخ بھی جمعہ تھا، اگر مہینہ انتیس دنوں کا تھا تو صفر کی پہلی تاریخ ہفتہ کا دن تھا اور انتیس تاریخ بھی ہفتہ کا دن تھا۔ اس لحاظ پر ربیع الاول کی پہلی تاریخ اتوار کا دن تھا۔ لیکن تین چاند لگاتار انتیس کے نہیں ہوتے، اگر ان میں سے ایک مہینہ آپ تیس کا مانیں تو ربیع الاول کی پہلی تاریخ پیر کو ہوگی، اس طرح بارہ ربیع الاول جمعہ کے دن بنتی ہے۔ اگر آپ تین چاندوں میں سے دو چاند تیس کے بناتے ہیں تو ربیع الاول کی پہلی تاریخ منگل کو ہوگی، اس صورت میں ہفتہ کے دن بارہ ربیع الاول بنتی ہے۔ اگر تینوں چاند انتیس کے ہی مانیں تو بارہ ربیع الاول جمعرات کو ہوگی۔ لیکن چشتیائے کرام بزرگان دین تینوں چاند انتیس کے لے کر دو ربیع الاول پیر کا دن آپ کا یوم وصال مانتے ہیں۔

گولڑہ شریف میں سید الاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ رحمہ اللہ دو ربیع الاول کو ہی آپ کا یوم وصال مناتے رہے، جس پر آج تک عمل جاری ساری ہے۔

دوسرا جواب: اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آپ کی پیدائش اور وصال کا دن ایک ہی ہے تو خوشی منانے اور غم نہ کرنے کی وجہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ یوں بیان فرماتے ہیں۔

۞ والشريعة حثت على اظهار شكر النعم والصبر والسكون والكتم عندالمصائب وقد امر الشرع بالعقيقة عندالولادة وهى اظهار شكر وفرح بالمولود ولم يأمر عندالموت بذبح ولا بغيره بل نهى عن النياحة واظهار الجزع فدلت قواعد الشريعة على انه يحسن فى هذا الشهر اظهار الفرح بولادته ﷺ دون اظهار الحزن فيه بوفاته"

(الحاوی للفتاوی ج اص ۱۹۳)

شریعت نے نعمتوں کے شکریہ کو ظاہر کرنے پر برانگیختہ کیا ہے، اور مصائب و آلام کے چھپانے اور ان پر

صبر وسکون کا حکم دیا ہے اور بچے کی ولادت پر خوشی منانے اور شکر کو ظاہر کرنے کیلئے شریعت نے عقیقہ کرنے کا حکم دیا ہے حالانکہ موت کے وقت ذبح وغیرہ کرنے کا کوئی حکم نہیں دیا گیا، بلکہ نوحہ کرنے اور جزع کرنے سے منع کیا گیا ہے، یہ قوانین شریعت اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی ولادت پر خوشی کا اظہار کرنا مستحسن طریقہ ہے لیکن آپ کی وفات پر غم کا اظہار اچھا نہیں۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اولم ولو بشاة" ولیمہ کرو اگر چہ ایک بکری (ذبح کرنے) سے ہو، اس سے بھی پتہ چلا کہ نعمت کے حصول پر شکریہ ادا کرنا شرعاً اچھا طریقہ ہے۔

تیسرا جواب: وفات پر غم نہ کرنے کی یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو قبر شریف میں دنیاوی زندگی سے بھی اعلیٰ زندگی حاصل ہے جب آپ زندہ ہیں تو غم کا کیا مقصد۔ انبیاء کرام کی مکمل زندگی کی بحث **"نجوم الفرقان جلد چہارم"** میں دیکھیے، یہاں صرف معترضین کے عالم اعزاز علی دیوبندی صاحب کی حاشیہ نور الایضاح کی عبارت دوبارہ تحریر کر رہا ہوں تا کہ مسئلہ سمجھنا آسان ہو۔

- "مثله ﷺ بعد وفاته كمثل شمع فى حجرة اغلق بابها فهو مستور عمن هو خارج الحجرة ولكن نوره كما كان بل ازيد وهذا حرم نكاح ازواجه بعده ﷺ لم يجر احكام الميراث فيما تركه لانهما من احكام الموت"

نبی کریم ﷺ کی مثال دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد اس طرح ہے جس طرح ایک شمع کو باہر سے کمرہ میں لے جائیں اور اس کا دروازہ بند کر دیا جائے اگر چہ وہ شمع کمرے سے باہر والوں سے چھپ گئی لیکن اس کی روشنی اسی طرح ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ کیونکہ باہر روشنی کم تھی اندر جا کر زیادہ ہو گئی (اسی طرح نبی کریم ﷺ قبر شریف میں اگر چہ باہر والے لوگوں سے مستور ہیں لیکن آپ کی زندگی پہلے سے بھی زیادہ ارفع وبلند ہے) اسی وجہ سے آپ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے باوجود آپ کی ازواج مطہرات سے نکاح کرنا حرام ہے، اور آپ کے ترکہ پر وراثت کے احکام جاری نہیں ہوئے، کیونکہ یہ دونوں کام مردوں سے تعلق رکھتے ہیں آپ تو زندہ ہیں۔

اہل سنت وجماعت سے دردمندانہ اپیل:

میلاد النبی ﷺ کے جلوس میں نمازوں کو ضائع نہ ہونے دیں۔ ناچ، گانا، ڈھول، باجے بھنگڑا وغیرہ نہ پایا جائے۔ مساجد کے قریب سے گزرتے ہوئے نمازوں کے اوقات میں لاؤڈ سپیکرز کا آواز پست رکھا جائے۔ نعت خوانی، ذکر، تقاریر، پر مشتمل جلوس، حدود سے تجاوز کر کے اغیار کو اعتراضات کا موقع نہ دیا جائے۔ تمام رات محافل نعت

منعقد کر کے صبح نماز کو قضاء کرنا حماقت ہے، عقل ودانش کا کام نہیں۔ محفل نعت کا انعقاد اتنی دیر ہو کہ صبح کی نماز باجماعت ادا کی جائے۔ محفل نعت میں پیسے دینے والوں کے صرف نام شامل کر کے قرعہ اندازی کر کے کسی ایک کو عمرہ کا ٹکٹ دینا **خالص جوأبازی** ہے، اس سے بچنا ضروری ہے، ہاں سب شرکاء محفل کے نام شامل کر کے قرعہ اندازی کے ذریعے کسی کو عمرہ کیلئے بھیجنا جائز ہے۔

لمحات فکر:

کبھی آپ نے یہ بھی سوچا آپ کے اغیار اپنا تمام پیسہ دینی مدارس پر خرچ کر رہے ہیں، آپ ایک رات کی محفل نعت پر لاکھوں روپے خرچ کر ڈالتے ہیں، آپ کی توجہ دینی مدارس کی طرف جب تک نہیں ہوگی آپ کے اغیار آپ سے بازی لے جاتے رہیں گے۔ پیسے مقرر کر کے نعت خوانوں اور مقررین کا محافل میں جانا بہت برا طریقہ ہے، ایسے پیشہ ور دین کے ڈاکوؤں سے بچ کر رہیں، صحیح علماء سے تقاریر کرائیں، نعت خوانوں کو بلائیں ،فن کاروں اور مداریوں کو نہ بلائیں۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

اَوَلَمَّآ اَصَابَتۡکُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ قَدۡ اَصَبۡتُمۡ مِّثۡلَیۡهَا قُلۡتُمۡ اَنّٰی هٰذَا قُلۡ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِکُمۡ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ O (آیۃ نمبر ۱۶۵)

(1) کیا جب تمہیں کوئی مصیبت پہنچے کہ اس سے دونی تم پہنچا چکے ہو تو کہنے لگو کہ یہ کہاں سے آئی، تم فرمادو کہ وہ تمہاری ہی طرف سے آئی بیشک اللہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ (کنزالایمان)

(2) کیا جب پہنچی تمہیں کوئی مصیبت، تحقیق پہنچا چکے ہو تم اس کی دو مثل، تم نے کہا، کہاں سے آئی ہے یہ؟ آپ فرمادیں وہ تمہارے اپنے نفسوں کی طرف سے ہی آئی ہے، بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (نجوم الفرقان)

مقام توجہ:

اس آیۃ کریمہ میں مودودی صاحب نے "قل" کا ترجمہ کیا "اے نبی ان سے کہو" یعنی "قل" میں خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، اس ترجمہ پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں، ہم تو حق بات کو حق کہنے کے عادی ہیں بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ یہاں بہت اچھا ترجمہ "قـل" کا کیا گیا ہے، لیکن تعجب یہ ہے کہ اس ترجمہ پر کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا، لیکن اعلیٰ حضرت مولنا احمد رضاء خان بریلوی رحمہ اللہ جب "قل" اے محبوب آپ فرمادیں" تو معترضین سیخ پا ہو جاتے ہیں کہ یہ ترجمہ مولوی بریلوی کا خود ساختہ ہے، کتنی بیہودگی، کتنی دیوانگی۔

شان نزول:

جب احد میں صحابہ کرام کو کچھ تکالیف اٹھانی پڑیں تو وہ تعجب سے ایک دوسرے سے سؤال کرنے لگے کہ ہم اسلام کے خدمت گذار ہیں جو دین حق ہے اور ہمارے ساتھ رسول اللہ ﷺ بھی ہیں، جبکہ ہمارے مقابل لوگ اللہ تعالیٰ سے شریک ٹھہرانے والے دین کے مددگار ہیں تو ان لوگوں کی طرف سے ہمیں کیسے تکالیف پہنچائی گئیں، جبکہ ہمارے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا وعدہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری امداد فرمائے گا۔ تو اس وقت یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی کہ تم نے ان کو

دوگنی شکست دی ہے بدر میں تم نے کافروں کے سرکردہ ستر لوگ قتل کر دئے تھے اور ستر قیدی بنا لئے تھے، پھر احد میں بھی ابتدائی طور پر کامیابی تم کو ہی حاصل رہی، بعد میں تم اپنی غلطی کی وجہ سے ہی تکالیف میں آ گئے۔

"فلماهزمتموهم مرتين فأى استبعاد فى ان يهزموكم مرة واحدة"

جب تم نے کافروں کو دو مرتبہ شکست دی تو کون سی بات ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے تمہیں نیچا کر دیا۔

(ماخوذ از کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۸۱)

زجاج کی غلطی علامہ واحدی کی گرفت:

زجاج نے کہا کہ مسلمانوں نے کافروں کو بدر میں شکست دی، پھر احد میں بھی ایک مرتبہ شکست دی

"ثم لماعصواهزمهم المشركون"

پھر جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی تو کافروں نے ان کو شکست دے دی۔

"فانهزام المشركين حصل مرتين وانهزام المسلمين حصل مرة واحدة وهذااختيار الزجاج"

مشرکوں کو دو مرتبہ شکست حاصل ہوئی اور مسلمانوں کو ایک مرتبہ شکست حاصل ہوئی۔

زجاج کا یہ قول دو وجہ سے سنگین ہے ایک تو صحابہ کرام کی اجتہادی خطا کو اس نے رسول اللہ ﷺ کی دیدہ دانستہ نافرمانی قرار دیا ہے، اور **دوسری وجہ** اس اس کے قول کے سنگین ہونے کی یہ ہے کہ اس نے کہا کہ مسلمانوں کو شکست ہوئی، اس دوسری غلطی پر علامہ واحدی نے یوں گرفت فرمائی۔

وطعن الواحدى فى هذاالوجه فقال كماان المسلمين نالوامن المشركين يوم بدرفكذلك المشركون نالوامن المسلمين يوم احدولكنهم ماهزموا المسلمين البتة،امايوم احدفالمسلمون هزموا المشركين اولاثم انقلب الامر"

کہ زجاج نے جو یہ کہا ہے کہ احد میں مسلمانوں کو شکست حاصل ہوئی یہ غلط ہے، صرف یوں کہا جا سکتا ہے کہ بدر میں کافروں کو مسلمانوں کی طرف سے تکلیف پہنچی اور احد میں مسلمانوں کو مشرکین کی طرف سے تکلیف پہنچی، لیکن مسلمانوں کو شکست بالکل نہیں ہوئی، میدان میں جم کر رہنا مسلمانوں کو ہی حاصل رہا، ابتدائی طور پر مسلمانوں کو ہی برتری حاصل رہی، بعد میں معاملہ الٹ ہو گیا کہ وقتی طور پر مشرکین کو کچھ برتری حاصل ہو گئی، اس کی وجہ بھی صحابہ کرام کی اجتہادی خطاء تھی کہ انہوں نے درے کو چھوڑ

دیا تھا۔ (ماخوذ از کبیر بوضاحت جلد صفحہ نمبر ۸۱)

﴿قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ﴾ ''اے محبوب آپ فرما دیجئے وہ تمہارے نفسوں کی طرف سے۔''

یعنی احد میں جو تمہیں مصیبت پہنچی وہ تمہاری اپنی جانب سے کہ تم نے اجتہادی خطاء کی، ایک دوسرے سے نزاع کیا بعض نے کہا یہیں رک جاؤ، بعض نے کہا اب رکنے کی ضرورت نہیں ہمیں فتح حاصل ہو چکی ہے، بس یہی وجہ تھی تمہیں مصیبت پہنچنے کی، اس میں رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کو سمجھنے میں تم نے غلطی کی وہ تمہاری غلطی تمہیں تکالیف پہنچنے کا ذریعہ بن گئی۔

ایک اور وجہ عظیم:

ماروی عن علی رضی اللہ عنہ انه قال جاء جبریل علیہ السلام الی النبی ﷺ یوم بدر فقال یامحمدان الله قدکره ماصنع قومک فی اخذهم الفداء من الاساری وقدامرک ان تخیرهم بین ان یقدموا الاساری فیضربوا اعناقهم، وبین ان یاخذوا الفداء علی ان تقتل منهم عدتهم فذکررسول الله ﷺ ذلک لقومه، فقالوا یارسول الله ﷺ عشائرنا واخواننا نأخذ الفداء منهم، فنتقوی به علی قتال العدو ونرضی ان یتشهد منا بعددهم فقتل یوم احد سبعون رجلا عدد اساری اهل بدر فهو معنی قوله قل هو من عند انفسکم ای بأخذ الفداء واختیارکم القتل"

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، بیشک آپ نے فرمایا کہ جبریل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس بدر کے دن آئے، تو کہنے لگے اے محمد (ﷺ) بیشک اللہ تعالی نے آپ کی قوم کا قیدیوں سے فدیہ لینا ناپسند کیا ہے، اور تحقیق وہ تمہیں حکم دیتا ہے آپ اپنی قوم کو اختیار دے دیں یا تو وہ قیدیوں کی گردنیں اڑا دیں، یا ان سے فدیہ لے لیں لیکن ان کو قیدیوں کی تعداد میں شہید ہونا پڑے گا، نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کو رب تعالی کا یہ پیغام سنا دیا، تو انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ یہ ہمارے قبیلہ کے لوگ ہیں، ہمارے خاندانی بھائی ہیں، ہم ان سے فدیہ لے لیتے ہیں، اور دشمن سے ہم جنگ کرنے کی بھی طاقت رکھتے ہیں، اور ہم اس پر راضی ہیں یعنی ہم اسے خوشی سے قبول کرتے ہیں کہ ان قیدیوں کی تعداد میں ہم شہید ہو جائیں، ان کے اسی فیصلہ کے مطابق احد کے دن ستر صحابہ کرام شہید ہو گئے کیونکہ بدر میں ستر قیدیوں

سے فدیہ لیا گیا تھا، یہی مطلب ہے رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی کا ﴿قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ﴾ کہ یہ تمہارا اپنا ہی فیصلہ تھا کہ اب ہم ستر قیدیوں کا فدیہ لے لیتے ہیں، اور بخوشی ہم میں ستر آدمی شہید ہونے کو قبول کرتے ہیں۔ (تفسیر کبیر جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۸۲ رواہ البیہقی، قرطبی)

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ "بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔"

یعنی بیشک وہ قادر ہے تمہاری امداد پر اگر تم ثابت رہتے اور صبر کرتے جیسے وہ قادر ہے تمہاری امداد کے چھوڑ دینے پر جب تم نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کے خلاف در ے کو چھوڑ دیا۔

واجتج اصحابنا بهذا علی ان فعل العبد مخلوق لله تعالیٰ قالوا ان فعل العبد شیء فیکون مخلوقا لله تعالی قادرا علیه"

اسی سے علماء اہل سنت نے یہ دلیل پکڑی ہے کہ بیشک بندے کا فعل اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، کیونکہ بندے کا فعل بھی شئی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے۔

اسی سے یہ بھی فائدہ حاصل ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کو پیدا کرنے پر قادر ہے تو معتزلہ کا مذہب خود بخود باطل ہو گیا کہ بندہ اپنے افعال کا خالق ہے، کیونکہ بندے کو اگر اپنے افعال کا خالق مانا جائے تو رب تعالیٰ کا خالق نہ ہونا ثابت ہوگا کیونکہ ایک چیز کی خلق کے بعد دوبارہ خلق نہیں، بندہ جب خود اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے تو اللہ تعالیٰ ہی اس کے افعال کا بھی خالق ہے۔ (کبیر جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۸۲)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن

فخر اہلسنت استاذ الاساتذہ حضرت علامہ مولانا عبد الرزاق بھترالوی، حطاروی کی علمی شاہکار

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد اول)	200/=	اذان کے ساتھ درود شریف مستحب ہے	21/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد دوم)	200/=	سبز عمامہ کی برکات سے کذاب جل اٹھے	24/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد سوم)	200/=	انگوٹھے چومنا مستحب ہے	21/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد چہارم)	200/=	نماز کے بعد ذکر و دعا مستحب ہے	40/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد پنجم)	200/=	تکریم والدین مصطفیٰ ﷺ	20/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد ششم)	200/=	احکام مساجد	24/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد ہفتم)	200/=	نماز حبیب کبریاء	150/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد ہشتم)	200/=	نور الایضاح (عربی حاشیہ)	69/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد نہم)		تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان	120/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد دہم)		السراجی فی المیراث (اردو)	33/=
شمع ہدایت	120/=	تلخیص المفتاح (عربی حاشیہ)	45/=
مراح الارواح (اردو حاشیہ)	36/=	کنز الدقائق (عربی حاشیہ)	270/=
تذکرۃ الانبیاء (مجلد خاص)	360/=	المظہر النوری علی المختصر القدوری	150/=
موت کا منظر مع احوال حشر و نشر	210/=	ایصال ثواب مستحب ہے	27/=
اقامت بیٹھ کر سننا مستحب ہے	21/=	جواہر السنایہ فی شرح ہدایہ جلد اول	200/=
اسلام میں عورت کا مقام	150/=	جواہر السنایہ فی شرح ہدایہ جلد دوم (زیر ترتیب)	